ادب لطیف

فنکار

اقبال

کرشن چندر — بلوی

سلام مچھلی شہری — مدھوسودن

ابراہیم جلیس — ریاض رؤف

سری نواس لاہوتی — رام پرکاش اشک

ظہیر کاشمیری — لطیف ساجد

ساحر لدھیانوی

دسمبر ۱۹۴۶

مکتبہ اردو لاہور

نیا اردو ادب

اردو ادب کے وسیع میدان میں ہم نہتے نہیں اترے تھے۔ بلکہ ہمارے پیش نظر ادب کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے کا صحت مند انقلابی پروگرام تھا۔ ہم نے اپنا دراز سفر جاری کیا تو سیاسی، سماجی حالات اور دیگر صحافتی حد بندیوں نے قدم قدم پر ہمارے راستے میں رکاوٹ ڈالی، لیکن بے لوث جذبہ خدمت کے بل بوتے پر ہماری پیش قدمی جاری رہی۔ ہنوز ہمارے مطبوعات کی ایک طویل فہرست ہے۔ جس میں اردو ادب کا مستقبل دھڑک رہا ہے۔ ذیل کی فہرست میں ہمارے ماضی، حال اور مستقبل کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھئے۔

مکتبہ اردو، ہندوستان کے نامور لکھنے والوں کی طرف دست تعاون بڑھاتا ہے۔

تاریخ

کمپنی کی حکومت	باری	۳/-/-
انقلاب فرانس	"	-/۸/-
تاریخ کیا ہے ؟	"	-/۸/-
اسلام کا تاریخی کارنامہ	ایم این رائے	۱/۴/-
تاریخ عالم	باری	
تاریخ یونان	جے - بی بیوری	"
تزک بابری	ظہیر الدین بابر	"
سلطنت روما	جے بی بیوری	"
انقلاب کی تاریخ	گوپال متل	

سوانح

گورکی کی ڈائری	حسن عباس	-/۸/-
کارل مارکس	باری	-/۸/-
استالین	مارشل وارشلوف	-/۸/-
ساتا ہری	خلیل احمد	(زیر طبع)
عصمت انونو	ثریا اندریمان	-/۸/-
محمد عربی	باری	-/۸/-
رضا شاہ پہلوی	محمد اشرف عطا	-/۸/-
ٹراٹسکی	نریندر ناتھ سیٹھ	-/۸/-
ہمارا لینن	ماڈل ملیح آبادی	-/۸/-
لینن (بحیثیت ایک انسان)	کلارا زٹکن	-/۸/-
کولمبس	میلا رام وفا	-/۸/-
سیرت امام ابن تیمیہ :	غلام جیلانی برق	۲/۴/-
ہندوستان کے لیڈر	یوسف مہر علی	-/۸/-
سبھاش بوس	گوپال متل	-/۸/-
گاندھی	"	-/۸/-
جواہر لعل نہرو	"	-/۸/-
ابوالکلام آزاد	عبد اللہ بٹ	-/۸/-
تانیا	پی-لیٹوف	-/۸/-
Aspects of Abul Kalam Azad		1-12
ٹالسٹائی	جیرلڈ ابراہم	-/۸/-
نپولین	ایمہ-اے-ایل فشر	(زیر طبع)

افسانے

نئے زاوئے	(مرتبہ) کرشن چندر	۵/-/-
منٹو کے افسانے	سعادت حسن منٹو	۳/۸/-
رنگ و بو	سید فیاض محمود	۳/-/-
طلسم خیال	کرشن چندر	۱/۱۲/-
ٹوٹے ہوئے تارے	" "	۱/۱۲/-
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	۲/-/-
کونپل	اوپندر ناتھ اشک	۱/۱۲/-
صحرانورد کے خطوط	میرزا ادیب	۳/۸/-
عورتوں کے افسانے	کوثر چاندپوری	۲/۸/-
دنیا کی حور	"	۱/۱۲/-
لق لق کے افسانے	حاجی لق لق	۱/۸/-
پرواز لق لق	"	۱/۸/-
سرکش روحیں	خلیل جبران	۱/۴/-
پھول اور کانٹے	گوپال متل	-/۸/-
منظر و پس منظر	اختر اورینوی	۱/۸/-
بگولے	احمد ندیم قاسمی	۲/-/-
طلوع و غروب	"	۱/۱۲/-
۳ پیسے کی چھوکری	قاضی عبدالغفار	/۸/-
رفیق تنہائی	علی عباس حسینی	۱/-/-
گرہن	راجندر سنگھ بیدی	/۸/-
شبستان الم	زبیدہ سلطانہ	۱/۸/-
الاؤ	سہیل عظیم آبادی	۱/۸/-
ایک لڑکی	(خواجہ) احمد عباس	/۸/-
زندہ چین	(مترجمہ) تمنائی	۱/۸/-
خونی	اختر انصاری	/۱۲/-
کرفیو	شفیق الرحمن	۲/-/-
ان کہی	ممتاز مفتی	۲/۸/-
کلیاں اور کانٹے	اختر اورینوی	۱/۱۲/-
زندگی کے موڑ پر	کرشن چندر	۲/-/-
چٹان	اوپندر ناتھ اشک	۱/۱۲/-
پردہ سیمیں	ڈاکٹر محمد نصیر الدین	۳/-/-
چاند کا گناہ	راجہ مہدی علی خاں	۳/-/-
جگا	بلونت سنگھ	۲/۱۲/-
بھنور	شیر محمد اختر	۱/۴/-
ایک بات	عصمت چغتائی	(زیر طبع)
بد تمیز	سعادت حسن منٹو	
چراغ تلے	کرشن چندر	
دو پٹ	شکیلہ اختر	
ناگن کالی رات	وقار انبالوی	

نغمۂ بیداریٔ جمہور ہے سامانِ عیش
قصۂ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک
(اقبالؔ)

ادبِ لطیف

ادارہ
چودھری برکت علی
احمد ندیم قاسمی

زرِ سالانہ
چھ روپیہ
فی پرچہ آٹھ آنہ

نومبر سنہ ۱۹۴۴ء

جلد ۲۰
شمارہ ۲

بسے گذشت کہ آدم دریں سرائے کہن
مثالِ دانہ تہِ سنگِ آسیا بودست
فریبِ زاری و افسونِ قیصری خوردست
اسیرِ حلقۂ دامِ کلیسیا بوداست
غلامِ گرسنہ دیدی کہ بردرید آخر
قمیصِ خواجہ کہ رنگیں زخونِ ما بودست
شرارِ آتشِ جمہور کہنہ ساماں سوخت
ردائے پیرِ کلیسا، قبائے سلطاں سوخت
(اقبالؔ)

چودھری برکت علی بی اے، پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ادبِ لطیف لاہور سے شائع کیا

احمد ندیم قاسمی

شفقِ سرخ

ہر نئی پود نے اک تازہ صنم ڈھال لیا   نت نئے بت تھے نئے مندر تھے نئے پوجا کے اصول
سنکھ بجتے رہے، جلتے رہے رنگیں فانوس   روح گھلتی رہی، ہوتا رہا انسان ملول
قصرِ شاہی سے گرائے گئے نیلم، پکھراج   سنگریزوں کو نگلتے رہے مجبور عوام
خشک کانٹوں میں بدلتے رہے خیرات کے پھول   سوکھے جبڑوں کو جکڑتی رہی زرتار لگام
حسن بکتا رہا زربفت کے پردوں سے ادھر   عشق سنتا رہا بجتے ہوئے فولاد کا شور
قافلے لٹتے رہے، منزلیں بیگانہ رہیں   چاند بجھتے رہے، تکتے رہے محبوس چکور
ہر نیا دور صد امید بداماں آیا   زندگی خستہ و درماندہ و مجبور رہی
اک شہنشاہ اٹھا۔ ایک شہنشاہ بڑھا   اسی چکر میں ازل سے یہ زمیں چور رہی
ناگہاں ایک دھواں دھار دریچہ کھڑکا   شوخ سی شمع بڑھی، لو کی زباں لہراتی
سرسراتی ہوئی ظلمت کے نشیبوں سے اٹھی   شفقِ سرخ، نئی صبح کے نغمے گاتی ۔
اک نئے دور کا پرتو ہے افق کی لالی   اک نئے حسن کی خاطر یہ حنا بندی ہے
ایک ہی سطح پہ اترے ہیں نشیب اور فراز   اب کس انسان کو دعوائے خداوندی ہے
ابنِ آدم! تیری جلسی ہوئی شریانوں میں   خونِ تازہ کی نئی لہر ہے چلنے والی

یہ حکومت ہے یہ قوت ہے سنبھل اور سنبھال
اب نئے روپ میں تقدیر ہے ڈھلنے والی

ساحر لدھیانوی

فن کار

میں نے جو گیت تیرے پیار کی خاطر لکھے
آج اُن گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں

آج دُکّان پہ نیلام اُٹھے گا اُن کا
تُو نے جن گیتوں پہ رکھی تھی محبت کی اساس
آج چاندی کے ترازو میں تُلے گی ہر چیز
میرے افکار، مری شاعری، میرا احساس

جو تیری ذات سے "منسوب" تھے اُن گیتوں کو
مفلسی جنس بنانے پہ اُتر آئی ہے
بھوک۔ تیرے رُخِ رنگیں کے فسانوں کے عوض
چند اشیائے ضرورت کی تمنّائی ہے

دیکھ! اس عرصہ گہۂ محنت و سرمایہ میں
میرے نغمے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے
تیرے جلوے کسی زردار کی میراث سہی
تیرے خاکے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے

آج اُن گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے

کرشن چندر

ایک سوریئلی تصویر

جس کی ابھی تک کوئی ابتدا ہے نہ انتہا
اور جو ہر وقت آنکھوں کے آگے ناچتی رہتی ہے!

اس دن میں بہت اداس تھا کیونکہ اس روز میں نے ایک کتاب میں جرمنوں کے ان وحشیانہ مظالم کا حال پڑھا تھا جو انہوں نے جنگ کے دوران میں یوکرین کے معصوم بچوں پر روا رکھے۔ یوں تو ہر آدمی موت کے سامنے معصوم ہوتا ہے، اور زندگی کی آخری حد پر اس کی حیثیت ایک ننھے بچے سے بڑھ کر نہیں ہوتی، میں نے بڑے بڑے مجرموں اور پھانسی پر لٹکنے والے قاتلوں کو موت کی تاریک سرنگ کی دہلیز پر ایک معصوم بچے کی طرح مغموم اور پریشان دیکھا ہے، منہ میں انگلی ڈالے ہوئے جیسے انہوں نے کبھی کوئی جرم نہ کیا ہو، جیسے ان کی نگاہوں میں ابھی وہ حیرت و استعجاب باقی ہے، جس سے انہوں نے اپنی زندگی کے پہلے روز دنیا کو دیکھا تھا۔

لیکن بچوں کا معاملہ اور ہے، اگر عادی مجرم موت کے سامنے اس قدر معصوم ہو سکتے ہیں، تو اس نو زائیدہ کلی کی لطافت کا کیا کہنا جو ابھی موت اور زیست میں امتیاز ہی نہیں کر سکتی جس کی دنیا ابھی گناہ و سزا اور قتل اور خون کے تصور سے ملوث ہی نہیں ہوئی، اس لطافت کو کچلنے کے لئے کسی غیر معمولی طاقت کی ضرورت ہے، ایسی طاقت جس میں انسانیت کی ایک رمق بھی باقی نہ ہو، ایسی قوت جو انسان کے سینے سے نہیں، کسی بھی ذی حس کے سینے سے نہیں، بلکہ ایک سنگلاخ چٹان کی چھاتی سے پھوٹ کر نکلتی ہے، یہ وحشی بربری قوت انسان کی دنیا میں کیسے آ گئی؟ اس دن اس وقت کتاب الٹ کر ــــ میں یہی سوچ رہا تھا، سالہا سال، صدہا برس پیچھے زمانے کے کہنہ اور شکستہ زینے پر میرا ذہن دوڑتا گیا، ایک جنگ کے بعد دوسری جنگ کے مناظر دیکھتا گیا، یہ شقاوت نئی نہ تھی، کبھی اس کا نام جرمن تھا، تو کبھی تاتاری، کبھی روسی تو کبھی انگریزی، کبھی امریکن کبھی ہندی، کبھی ایرانی، لیکن تھا یہ وہی جذبہ جو انسان کے سینے سے نہیں چٹان کی چھاتی چیر کر نکلا ہے! لیکن آدمیوں کی بستی میں اس کا کیا کام، قرنہا قرن سے یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ میں نے تم نے اور اس نے جسے سب لوگ تاریخ کہتے ہیں اسے اپنے ہاں کیوں جگہ دے رکھی ہے۔

یہی سوچ کر میں اداس تھا کتاب بند کر کے میں نے تپائی پر رکھ دی، اور اس بچی کی طرف دیکھنے لگا جو میری گود میں لیٹی ہوئی ایک چھوٹی سی کٹوری سے آلوؤں کا بھرتا نکال کر کھا رہی تھی۔ وہ مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر مسکرائی، اس کی ننھی ننھی باچھوں سے بھرتا لگا ہوا تھا اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا کر کہا: "تاؤ"

میں نے کہا: "نہیں تم تاؤ"

"نہیں تم" اس نے اصرار کیا اور اپنی انگلیاں میرے منہ میں ڈال دیں اور میری زبان ٹٹولنے لگی۔ بولی "تاؤ"

آلوؤں کا بھرتا کوئی بڑی چیز نہیں۔ بچی کا اپنے باپ سے پیار کرنا بھی ایک معمولی سی بات ہے، اتنی معمولی کہ اس سے کسی کہانی سننے والے کو کوئی لطف نہیں آ سکتا۔ مجھے بھی اس وقت کوئی لطف حاصل نہیں ہو رہا تھا، اک بے کیف اداسی طاری تھی، اب بھی یاد کرتا ہوں تو وہی تلخی تازہ ہو جاتی ہے، آلوؤں کا بھرتا گویا کونین کی طرح تلخ تھا کیونکہ یوکرین میں بچوں پر گولی چلائی گئی تھی، ہاتھوں سے ان کی آنکھیں نکال لی گئی تھیں، ان کی لاشوں کو ننگا کر کے برف پر پھینک دیا گیا تھا اور یہاں میری بچی مجھے نہایت اطمینان سے کہہ رہی تھی "تاؤ" مگر اس میں کیا اس کا قصور تھا؟ آلو کے بھرتے کا، کانسی کی کٹوری کا؟ یا ننھی کی محبت بھری نگاہوں کا؟

جس جرمن نے گولی چلائی تھی، جس آدمی نے پہلی بار گولی چلائی تھی، جو آج بھی سنگینوں سے اپنے بچوں کو تہ تیغ کر رہا تھا، اسے اسی محبت بھری نگاہ نے، اسی آلو کے بھرتے نے، اسی کانسی کی کٹوری نے جنم دیا تھا، پھر وہ محبت، وہ معصومیت کیوں کر فنا ہو گئی... کیوں کر... کیوں کر ..... میرے خدا؟

میں نے بچی کو صوفے پر لٹا دیا اور گھر سے باہر نکل کھڑا ہوا، ابھی دروازے ہی میں تھا۔ کہ بچی نے پکارا، میں نے مڑ کر دیکھا، وہ اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے، ایک میں کانسی کی کٹوری، دوسرے میں آلوؤں کا بھرتا لئے کہہ رہی تھی "تاؤ"

بے وقوف کچھ بھی سمجھتی نہیں، خود جنم لے کر جنم دیتی ہے، آدمی کی ماں بن کر چٹانوں کی تخلیق کرتی ہے اب کوئی تجھ سے کیا کہے "تاؤ"! آج آلو کا بھرتا کھلا رہی ہے، کل کو گولی چلائے گی۔ نہیں نہیں میں نہیں کچھ کھاتا واتا!

میں جب اداس ہوتا ہوں تو ہمیشہ غریب گھر کا رخ کرتا ہوں، شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو کہ میں اس غریب گھر کے سامنے سے نہ گزروں، پہلے لوگ اسے غریب گھر کہ

سکتے ہیں۔ پھول گیٹ کے باہر، پتھر پل کے پار یہ غریب گھر واقع ہے۔ اس کے سامنے ٹین کی چھت والی دکانیں ہیں جن میں جوتے بنانے والے چمار، سائیکل، گراموفون، سنگر مشین درست کرنے والے لوہے، درزی، موچیاں، مثلیں اور دستاویزیں ٹائپ کرنے والے فن کار کام کرتے ہیں۔ اکثر پتھر پل کے قریب ایک ایرانی کا ہوٹل ہے جہاں چائے کے گندے پیالوں میں غیر ملیح شدہ چیچے کھڑکھڑاتے ہیں اور بھورے رنگ کے سیال سے پرانے گڑ کی مہک آتی ہے۔ ہوٹل کے باہر ہمیشہ گوشت کے جلنے کی بو آتی ہے۔ یہاں لوگ آگ کے قریب کھڑے ہو کر کباب کھاتے ہیں اور کباب کھا کر سگریٹ اور پان سے لطف اٹھاتے ہیں۔ دو چار پنشن یافتہ بیرے پل پر بیٹھے رہتے ہیں اور اپنے انگریز مالکوں کی غیر معقول داستانوں کو ماضی کے کھنڈروں سے کھود کھود کر بیان کرتے رہتے ہیں۔ دو کوڑھی، ایک مرد، ایک عورت ہمیشہ قریب قریب بیٹھتے ہیں۔ آپس میں ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے ہوئے راہگیروں کی طرف اس انداز سے دیکھتے ہیں گویا وہ ان کی تنہائی میں مخل ہوئے ہوں۔ کبھی کبھی عورت کوڑھی کے سر سے جوئیں چننے میں مصروف ہوتی ہے۔ پل کی محراب کے نیچے دھوبی کپڑوں کو پتھروں پر کوٹتے نظر آتے ہیں اور چھو، چھو کرتے ہوئے اپنی کمر کھجانے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ اپنا ہات روک کر نالے کے قریب نیم کے پیڑ سے لگے ہوئے جھولے کی طرف دیکھتے ہیں۔ جہاں ان کی لڑکیاں اور بہوئیں جھولا جھول رہی ہوتی ہیں، اور ننھے بچے گو پھیلے سے مٹی دیواروں پر چڑیوں کو نشانہ بنانے کی فکر میں غلطاں نظر آتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دروازوں والے گھروں کے پنجروں میں سے زرد رو عورتیں جھانکتی ہیں، بھوری عورتیں جنہوں نے ایک عجیب سا گون پہن رکھا ہوتا ہے، اور لمبی ناک والے پارسی لڑکے اپنے پچکے ہوئے گالوں میں کریہہ دانت چھپائے زنگ دار بیلون اڑاتے نظر آتے ہیں۔ پارسی لوگوں کے گھروں کے باہر دہلیز پر اور دہلیز سے باہر فرش پر کھریا مٹی یا چاک سے پھول پتیاں بنی ہوتی ہیں یہ ہر پارسی گھر کا امتیازی نشان ہے، اس سبز رنگ کے گھر کے پاس جس کی دیواریں چھوٹی چھوٹی ہیں اور جس کی جھکی ہوئی بھوری چھت پر سے بجلی کے کھمبے کے تار گزرتے ہیں، مجھے ہر شام کو جب میں اس طرف کا رُخ کرتا ہوں وہ لڑکی دکھائی دیتی ہے، سپید ریشمیں ساری میں ملبوس، سپید سینڈل پہنے وہ پارسی لڑکی کھڑی ہوتی ہے، جس کی تبسم کناں آنکھیں مجھے اس قدر پسند ہیں، وہ یہاں اکثر کھڑی ہوتی ہے۔ اُس وقت جب میں یہاں سے گزرتا ہوں یہ بھی اپنا بہترین لباس پہنے اپنے امریکن محبوب کی آمد کی منتظر ہوتی ہے۔ میں اس طرح آتا ہوں گویا میں ہی اس کا محبوب ہوں، یہ میری طرف اس طرح دیکھتی ہے جیسے عمر بھر اس امر کا امکان نہیں۔ کیوں نہیں؟ میں اسے پسند کرتا ہوں۔ یہ مجھے کیوں پسند نہیں کرتی، کیوں نہیں؟ میں اور امریکن سپاہی دونوں اس کے محبوب کیوں نہیں ہو جاتے ہیں امیبا کی طرح یہ لڑکی ایک سے دو کیوں نہیں ہو جاتی بلفظِ الفنون؟ اور کیوں جب یہ ایک سے دو ہوتی ہے تو کوکھ کی اہرامی تاریکی میں نو مہینے تک ایک بیج کی پرورش کرتی ہے، اور جب اپنا حمل پیش کرتی ہے، تو خود ریشم کے پتنگے کی طرح مر جا چکی ہوتی ہے، اور راہگیر، مسافر، اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے والا تماشائی گزر چکا ہوتا ہے۔

اس پتھر کے پل کے پار غریب گھر ہے۔ غریب گھر میں دو دو یہ بارکیں بنی ہوئی ہیں ان بارکوں کا رنگ سیاہ ہے، ان بارکوں کو ایک پارسی لکھ پتی بومن جی گوڈن والا نے تعمیر کرایا تھا۔ غریب گھر! کیا لکھ پتی ہمیشہ غریب گھر ہی تعمیر کرا سکتے ہیں، کیا بینکر صرف جنگ کرا سکتے ہیں، کیا ایسی دولت سچ مچ زندگی چوس لیتی ہے اور سیاہ رنگ کی بارکیں تعمیر کرتی ہے، اس غریب گھر کے دروازے پر لوہے کا کٹہرہ ہے اور لوہے کے کٹہرے کے باہر بازار ہے، اور مٹیالے رنگ کی دکانیں ہیں، اور تنگ دروازوں والے نیچی چھتوں والے گھر ہیں جن میں سے زرد رو عورتیں جھانکتی رہتی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس لوہے کے کٹہرے کے دونوں طرف غریب گھر ہے، ایک غریب گھر تو بومن جی گوڈن والا نے تعمیر کیا ہے لیکن یہ دوسرا غریب گھر جو اس غریب گھر کے باہر ہے کس نے بنایا ہے؛ بس کہانی سننے آتے ہو، جواب نہیں دے سکتے! گونگے ہو؟ بہرے ہو؟ اندھے ہو؟ اس غریب گھر کو نہیں، دیکھتے جو تمہارے ارد گرد، ہر جگہ، حتےٰ کہ تمہارے اندر بھی موجود ہے؟ میں پگلا ہوں؟ ہا ہا؟ میرے اللہ اس سے بہتر مذاق تجھے کبھی نہ سوجھا ہوگا۔

لیکن، نہیں، میں اب کچھ نہ کہوں گا، اور سیدھا اس لوہے کے کٹہرے کے پاس پہنچ جاؤں گا جو غریب گھر کے باہر ہے اور بازار کی سڑک کو اس سے جدا کرتا ہے۔ میں اسی وقت یہاں آتا ہوں جب میں بہت اداس ہوتا ہوں، یہاں غم غلط کرنے کے لئے ایک دوست غمگسار ہستی موجود ہے، یہ ہستی غریب گھر کے اندر نہیں، غریب گھر کے باہر رہتی ہے یعنی اس لوہے کے کٹہرے اور بازار کی سڑک کے درمیان زمین کے اس ٹکڑے پر جو دونوں غریب گھروں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔

یہ ہستی یہاں کیوں رہتی تھی۔ اس لئے کہ وہ اس قدر نادار تھی کہ غریب گھر کی بارکیں بھی اسے پناہ دینے سے عاجز تھیں۔ اس کی ٹانگیں نہ تھیں، صرف دو بازو اور ایک کھاہوا جسم جس پر سوکھے سوکھے پستان مردہ چوہوں کی طرح لٹکے ہوئے تھے، چہرے پر ان گنت جھریاں، دانت غائب اور سر کے بال سفید، الجھے ہوئے، مٹیالے، پریشان، ان بالوں میں کنگھی نہ ہوتی تھی کبھی نہ ہوئی ہوگی اس ہستی کا چہرہ عورت کا سا تھا، سراٗمن شائین کا سا یعنی اگر آئین شٹائین اپنے سفید بالوں میں کبھی کنگھی نہ کرتا تو ـــــ اور اگر وہ کسی غریب گھر کے آہنی کٹہرے کے باہر آ کر رکتا تو ـــــ تو وہ آئین [illegible]

رنگ کے الجھے بالوں والی بے دھڑکی بڑھیا ہوتا ہے نا ٹھیک!

یہ بسم اللہ خوان میرا دوست تھا، وہ عورت جس کا دھڑ نہ تھا، وہ سر جو آئین سٹائین کا تھا، وہ آنکھیں جو گویا کسی کی نہ تھیں، کم از کم میں نے ایسی آنکھیں تو کسی انسان کے چہرے پر نہیں دیکھیں، یہ مت پوچھو کیا تھا ان آنکھوں میں، یہ پوچھو کیا نہ تھا ان آنکھوں میں کائنات کی ساری خوبصورتی اور ساری ہولناکی ان آنکھوں میں سمٹ کر اتر آئی تھی، نجانے کیسے؟ وہ ہمراز غمگسار آنکھیں، سب کچھ سمجھ کر معصوم رہنے والی آنکھیں جیسے انہوں نے موت اور زیست کا معمہ بنایا تھا۔ اور اب مجھ سے توتلے انداز میں کہہ رہی "نغس تاؤ"! ــــ غریب گھر کے باہر دہلیز پر سونے والی لڑکی بھی اس قدر معصوم کیسے ہو سکتی ہے سمجھ میں نہ آتا تھا۔ شاید اسی لئے دونوں دنیاؤں نے اسے دھتکار دیا تھا کہ وہ اسے سمجھ نہ سکتی تھیں، اس آہنی کٹہرے کے دونوں طرف جو دنیا میں تھیں وہ ان میں سے کسی کی مخلوق نہ معلوم ہوتی تھی بلکہ وہ ان دونوں کے بیچ میں آہنی کٹہرے سے لگی سمٹی سمٹائی، وہ گز زمین پر گھسٹتی ہوئی اپنے پر شکن چہرے کو لئے اپنی ان گنت جھریوں کو سہلاتی ہوئی الگ بیٹھی تھی۔ اور دونوں دنیاؤں کا تماشہ دیکھتی تھی۔ میں نے اسے کبھی بھیک مانگتے نہیں دیکھا کئی بار میں اس کے سامنے سے گزرا تھا۔ پڑھتی انداز میں اسے گھورتا ہوا گزر جاتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی ہاتھ نہیں پھیلائے۔ دونوں دنیاؤں کی دھتکاری ہوئی کتیا اس قدر مغرور کیوں تھی۔

کیوں؟ کیوں؟ میرے خدا!

ایک روز میں نے اسے ایک آنہ دیا۔ اس نے اسے اسی طرح کشکول میں پڑے رہنے دیا۔ اور پھر نگاہیں پھیر کر حلوائی کے لونڈے کو آواز دینے لگی "ابے گڈو بٹی کے لئے گلاب جامن لے آئیو"

دوسرے روز میں نے اسے پھر ایک آنہ دیا۔

ابے گڈو لال کے لئے امرتی لے آئیو۔

تیسرے روز میں نے اسے پھر ایک آنہ دیا۔

ابے گڈو شیریں کے لئے لڈو لے آئیو۔

چوتھے روز میں نے اسے پھر ایک آنہ دیا۔

ابے گڈو ہولی کے لئے تھوڑی سی ملائی لے آئیو۔

اس کے چار بچے تھے۔ بٹی، لال، شیریں، ہولی۔ آدمی کے نہیں بلی کے۔ بلی کا نام گل تھا۔ اور وہ ایک سیاہ و سپید رنگ کا پھول تھی جس کی ہتھیلیوں میں کانٹے چھپے ہوئے تھے۔ ملائم سموروں کے اندر۔ گل بڑھیا کے کشکول کے سامنے پڑی رہتی، ایک نوابزادی کی طرح سست کاہل اونگھتی ہوئی۔ اور اس کے بچے بڑھیا کے چاروں طرف کھیلتے وہ اس کے سوکھے پستانوں سے اچھلتے ہوئے اس کی ناک پر کود جاتے اور وہاں سے جست لگا کر اس کے سپید گھنے بالوں کے جنگل میں اچھلنے لگتے، ان میں بٹی خاص طور پر بڑی شریر تھی اور بڑھیا کی پیاری تھی۔ میں نے بٹی کو اکثر بڑھیا کے سر پر بیٹھے دیکھا تھا، بٹی کو گلاب جامن بہت بھاتے تھے۔

"اور تم کیا کھاتی ہو" ہم سب دوست بن گئے۔ تو میں نے اس سے پوچھنے کی جرأت کی۔

وہ ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولی "میں ادھر کا ــــ اور ادھر کا ــــ دونوں طرف کا کوڑا کرکٹ کھاتی ہوں۔

تم غریب گھر کے اندر کیوں نہیں رہتی ہو۔

وہاں تو عیسائی لوگ رہتے ہیں اور غریب پارسی۔

تم کون ہو؟

میں ــــ میں پوجا ہوں۔

پوجا؟

ہاں پوجا! ایک دن میری ماں مجھے اس غریب گھر کے دروازے پر چھوڑ گئی تھی، اس دن شہر میں گنپتی پوجا کا تیوہار منایا جا رہا تھا۔ یہاں ایک کوڑھی بیٹھا تھا اس نے مجھے پالا پوسا، اور میرا نام پوجا رکھ دیا۔ میری ماں نے گنپتی پوجا کی تھی نا، جبھی تو اس نے ایسی سندر ناری کو جنم دیا تھا۔ ہاہاہا!!

کون تھی تمہاری ماں۔

یہ اپنی ماں سے پوچھو کہ ماں کون ہوتی ہے! میری ماں کو کس نے دیکھا ہے۔

"اور یہ ہے بھی سچ۔ پوجا کی ماں کو کس نے دیکھا ہے، وہ تاریکی کی چادر اوڑھے پربھات کی پہلی چھاؤں میں جب آکاش پر تاروں کے پاؤں بھی ڈگمگا رہے تھے، بیمار ہولے ہولے قدموں سے آئی تھی۔ اس وقت کوڑھی بھی سو رہا تھا اور لوہے کا کٹہرہ بھی بند تھا، اس وقت وہ دیوی آئی تھی جس کا دل لوہے کا تھا۔ اور اس نے اپنی بچی کو لوہے کے کٹہرے کے حوالے کر دیا۔ اور خود اس پربھات کی چھاؤں میں گم ہو گئی، کیونکہ گنپتی نے اسے جو بیٹی دی تھی اس کا دھڑ نہیں تھا۔ اور اس کے بال جنم سے سفید تھے۔

پتہ نہیں یہ گنیش مہاراج یہاں سونڈ لگانا کیسے بھول گئے" یہ کہہ کر وہ اپنی چھوٹی سی ناک تھپتھپانے لگی پھر مسکرا کر بولی "کہتے ہیں گنیش پوجن کے روز میں کوڑھی کی کتیا کے آغوش میں لیٹی اس کا دودھ پی کر سو گئی تھی۔ اور جب کوڑھی اٹھا اس وقت بھی میں سو رہی تھی۔ اور مندروں میں گنیش پوجن ہو رہا تھا۔ کوڑھی نے مجھے اپنی گود میں اٹھا لیا۔

اور ــــــ پوچھا! سمجھے!

اس کی آنکھیں جیسے ہنس رہی ہوں، میں اس روز چپکے سے چلا گیا، اس کے بوڑھے چہرے پر وہ آنکھیں ابھی تک جوان تھیں، وہ آنکھیں جو میری محبوب کی آنکھوں کی طرح تبسم کناں تھیں، نہیں نہیں یہ میری محبوب نہیں ہو سکتی۔ وہ تو پتھر کے پل کے اس پار آتی یا کے دو ٹکڑے ہو سکتے ہیں، دو شخصیتیں بن سکتی ہیں۔ لیکن یہاں تو پتھر کا پل بیچ میں حائل ہے، نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ پر یہ آنکھیں اس قدر جوان کیوں ہیں اس قدر فہمیدہ، اس طرح ہر وقت مسکرانے والی آنکھیں......!

لیکن اس روز کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ وہ جو کوڑا کرکٹ کھا کر مفرد تھی۔ وہ جسے آج تک کسی نے بھیک مانگتے نہ دیکھا وہ جس کا نام پوچھا تھا۔ اور جو ایک کوڑھی کی پروردہ تھی۔ اب میری دوست اور ہمراز تھی وہ سدا خوش رہتی تھی، اور جب کبھی میں بہت اداس ہوتا تو ہمیشہ اس کے پاس آیا کرتا!

ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔ "تم اس قدر خوش کیوں ہو؟"

کیوں کا کیا مطلب؟

یہی۔ کہ بس۔ تمہیں کبھی اداس نہیں دیکھا۔

اس کی آنکھوں کی پتلیاں ناچنے لگیں، سر کے بال اور بھی اوپر کی جانب کھڑے ہوتے گئے، جیسے ان کی جڑوں میں برقی بٹن لگے ہوں۔ وہ بولی۔ کوڑھی بابا ہمیشہ رہتا تھا۔ اور اس کی ٹانگ پر ناسور تھا میں ہمیشہ ہنستی ہوں کیونکہ میرے دھڑ ہی نہیں ہے ہا ہا ہا! گلاب جامن کھاؤ گی۔ دیکھو دھڑ نہ ہونے پر بھی میرے بچے کس قدر پیارے ہیں ادھر آؤ۔ لال، شیریں، ہولی، بٹی۔ بٹی بٹی، بیٹا، وہ اپنے ہاتوں سے انہیں اچھالنے لگی، کشکول میں تھوڑا سا دودھ پڑا تھا اور زمین پر ڈبل روٹی کے چند باسی ٹکڑے۔ وہ انہیں دودھ میں ڈال کر گھولنے لگی۔

خوب! میں نے کہا۔ مزے ہیں تمہارے اس جنگ کے زمانے میں بھی ہمیں تو دودھ بھی نہیں ملتا۔

وہ بولی۔ یہ دودھ میرے لئے نہیں ہے۔ گُل کے لئے ہے!

میں نے گُل کی طرف دیکھا۔ وہ آج خلاف معمول کشکول سے دور ایک لال رنگ کے کپڑے میں سمٹی ہوئی، ایک تکلیف دہ لہجے میں خر خر کر رہی تھی۔

گُل کو کیا ہوا ہے ـــ میں نے پوچھا۔

وہ مسکرا کر کہنے لگی "جھول دے گی وہ ایک دن میں"

میں نے دو آنے کشکول کے پاس رکھ دئے۔ وہ کہنے لگی۔ نہیں تم سے ایک آنہ ہی لیتی ہوں۔ یہ لے جاؤ۔ پر کل ضرور آنا۔ کل گنیش پوجن ہے۔ میرا جنم دن ہے مٹھائی کھلاؤں گی اُجلے کپڑے پہن کر آنا۔ اور حجامت بنوا کر آنا! ہا ہا ہا!!

× × × × × ×

بجے، بھرتے اور تاؤ کو چھوڑ کر جب غریب گھر کا رخ کیا تو راستے میں ڈھول تاشوں اور بیل گاڑیوں کا ایک غول بیابانی ملا۔ عورتیں زیوروں سے لدی پھندی تھیں بیل گاڑیاں جھنکاریوں سے سجی ہوئی تھیں۔ اور بیلوں کے سینگوں پر سنگوٹیاں چڑھی ہوئی تھیں اور ان کے جسموں کو نسوانی ہاتوں نے رنگا رنگ نقش و نگار سے سجایا تھا۔ آج گنیش پوجن تھا۔ اور اس لئے آج عورتوں کی آنکھوں میں کاجل گہرا تھا۔ لبوں پر گیت تھے اور سینوں میں ایک نامعلوم سی تھرتھری جیسے کسی انجانے ان دیکھے۔ ان بوجھے محبوب سے گلے ملنے کی تمنا ان کے سینوں کو ٹٹول رہی ہو، ڈھول کے شور میں گنپتی پوجن کا گیت گم ہو رہا تھا۔ پھول گیٹ پر بندھن واریں...... اور پل کے اس پار تیری تبسم کناں شبنم فشاں آنکھیں جانتا ہوں تجھے میرا انتظار نہیں ہے، جانتا ہوں کہ تیرے سینے کے عنبر کو میری نگاہوں کے شعلے نہیں چھو سکتے، جانتا ہوں کہ تیری گردن کے خم کی ملائم برفیلی لذت سے میری انگلیوں کا لمس ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناآشنا رہے گا۔ اور میں تنہا بھوکا پیاسا اس پتھر کے پل پر سے گزر جاؤں گا۔ ایک گداگر جو دوسرے گداگر سے ملنے جا رہا ہے۔

پتھر کے پل کے اس پار وہ بیٹھی ہے، ہنس رہی ہے بلی کے بچوں کو کھلا رہی ہے آج گنپتی پوجن ہے اور اس نے ہر بچے کے گلے میں لال، نیلے، پیلے اور دوسرے رنگوں کے چیتھڑے باندھے ہیں، آج بھی پٹی اس کے سر پہ بیٹھی ہے اور بلی کے گردن میں ایک خوشرنگ بو لگی ہے۔

میں نے اس خوشرنگ دلو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ تم نے یہ فیتہ کہاں سے لیا۔

وہ بولی، اس لڑکی سے لیا ہے جس کی طرف تم ہر روز گھور کر دیکھتے ہو۔

جھوٹ! میں نے کہا۔

نہیں سچ کہتی ہوں۔ اس سے مانگ کر حاصل کیا ہے۔ عمر میں آج پہلی بار بھیک مانگی ہے

کیوں،

وہ بولی۔ آج گنپتی پوجن ہے۔ اور مجھے اس کی آنکھوں میں ـــــ وہ چپ ہو گئی۔ لبوں پر ایک پر اسرار تبسم تھا۔

کہو کہو!

وہ ایک عرصے کے بعد بولی۔ کچھ نہیں...... [illegible]

نہیں کھلاؤ گی، گو دودھ تھا۔

ہاں، پر کیوں نہیں!

گل مر گئی ہے، اس نے آہستہ سے کہا۔ اور بچوں کو بھوک لگی ہے۔

میں نے دیکھا۔ گلی ایک کونے میں لال رنگ کے کفن میں مستور غریب گھر کی دیوار سے لگی پڑی ہے۔

"اور اس کے پیٹ کے اندر جو بچے تھے" میں نے پوچھا۔ اور بلی سے پیار کرنے لگا۔

بس کو کھا اندھی ہو گئی۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔

بلی بڑھیا کے سر سے اچھل کر سڑک کی طرف بھاگی۔ ادھر سے ایک موٹر آ رہی تھی تیزی سے۔

ارے .....

آن واحد میں میں نے اسے سڑک کے بیچوں بیچ گھسٹتے ہوئے دیکھا بس ایک لمحے کی بات تھی، اور پھر موٹر کا پہیہ اس کے سر پر سے گزر گیا، چیخ کی سی آواز آئی، پھر بریکوں کا شور، بھاگم بھاگ، لوگوں کا مجمع، ہجوم کے مختلف شور..... پہلے چند لمحے تو میں زمین میں گڑا رہا پھر تیزی سے بھاگا۔ اور ہجوم کو چیر کر اس تک پہنچا۔ اور اسے پہیئے کے نیچے سے کھینچ کر نکالنے لگا لیکن جب تک اسے باہر نکالا جائے وہ مر چکی تھی۔ اور اس کی گردن اور اس کے بازو اندر کی طرف مڑے ہوئے تھے، آئین سٹائین کا سا سر چیخ گیا تھا۔ اور بھیجا سپید! ملگجے بالوں کے باہر ابل رہا تھا۔

میں نے اس کی گردن سیدھا کرنے کی کوشش کی اور اس کے بازو الگ کیے۔ تو دیکھا کہ اس نے اپنے بازوؤں اور سینے کے ہالے میں بلی کو چھپا رکھا ہے۔ بلی اس کے منہ سینے سے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ہماری مرگئی یہ بھی۔ جب میں نے اسے آہستہ سے چھوا۔ وہ اکدم اچھل کر ایک طرف ہو گئی۔ اور بولی "میاؤں"۔ اب بلی حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگی، پھر وہ بڑھیا کا سر سونگھنے لگی، اور اس کے سر کے گرد طواف کرنے لگی۔ اور بے چینی سے کہنے لگی "میاؤں..... میاؤں۔

کار میں ریڈیو ابھی تک بند نہ ہوا تھا "یوکرین کی فوجوں نے دشمن کو اپنے علاقے سے باہر نکال دیا۔ اب یوکرین آزاد ہے۔ دشمن کے چنگل سے آزاد ہے"۔

بٹن گھما کر کار کے مالک نے ریڈیو بند کر دیا۔

لوگ سوال کر رہے تھے، یہ سڑک کے بیچ میں کیسے آ گئی؟ لوگ پوچھ رہے تھے: اس بلے دھڑ عورت کے پاؤں کہاں سے آ گئے تھے کس طرح وہ ایک بلی کے بچے کو بچانے کی خاطر عین سڑک کے درمیان آن پہنچی تھی، وہ جو دن بھر میں ایک گز بھی نہ چل سکتی تھی کس طرح چند لمحوں میں اس فاصلے کو طے کر کے موٹر کے پہیئوں میں آ گھسی تھی۔

عجب سوزیلی منظر تھا، وہ سپید مٹیالے سے بال، پرشکن چہرہ، لاغر جسم سوکھے پستان، اور بلی کی گردن میں رنگین فیتہ اور بھیجا بالوں سے باہر، ایسی تصویر تو غالباً پی کاسو نے بھی نہ بنائی ہو گی۔ ڈالی کے ذہن میں ایسا محیر العقول مرقع کبھی نہ آیا ہو گا۔ میں مسکرانے لگا۔ کیونکہ یہ رونے کا مقام نہ تھا۔

لوگ پوچھ رہے تھے۔ یہ کیسے ہوا۔ یہ کیسے ہوا۔ یقیناً یہ ایک معجزہ تھا ایک معجزہ!

یقیناً یہ ایک معجزہ ہے۔ کوئی میرے دل کے اندر بار بار کہہ رہا تھا۔ لیکن معجزہ نہیں ہے۔ کہ بڑھیا نے بلی کے بچے کو اپنی جان دے کر بچایا ہے۔

معجزہ شاید یہ ہے۔ کہ اس نے تمہاری بچی کو بچایا ہے۔ اس داڑھی والے بزرگ کی بچی کو بچایا ہے۔ اس ادھیڑ عمر کے درزی کی بچی کو بچایا ہے۔ بڑھیا نے ان تمام بچوں کو بچانے کی سعی کی ہے جن کی معصومیت شب و روز ان سے چھین رہی ہے۔ جن کی آنکھیں شب و روز ظالم ہاتوں سے نکالی جاتی ہیں۔ جن کے سینے میں شب و روز دشمن کی گولیاں پیوست ہوتی ہیں۔

"میاؤں"۔ "میاؤں"

لوگ کہہ رہے تھے۔ کمبخت نے ایک بلی کے بچے کو بچانے کے لئے اپنی جان دے دی!

کمبخت گداگر عورت.....؟

میرا جی چاہتا تھا۔ کہ میں اس وقت ان لوگوں سے کچھ کہوں، میں کیا کہنا چاہتا تھا۔ میں بتاؤں میں کیا کہنا چاہتا تھا ان سے، میں ان سے یہ کہنا چاہتا تھا۔ کہ ہاں یہ بھی گداگر عورت ہے جسے دنیا نے کچھ نہ دیا تھا جسے اس کی ماں نے اپنی تخلیق پر شرمندہ ہو کر آہنی کٹہرے کے حوالے کر دیا تھا جسے ایک کوڑھی نے پالا تھا جس کی ٹانگیں نہ تھیں جس کا دھڑ لمبے کا تھا جس کی کوکھ اندھی تھی۔ وہ آج مر گئی ایک بچے کے لئے، ایک حسین خیال کے لئے، ایک سہانی امید کے لئے، اگر یہ موت ہے؟ تو صلیب کسے کہتے ہیں۔ زندگی کسے کہتے ہیں، حیات جاوداں کسے کہتے ہیں۔ کیا تم اس عورت کے چہرے کی مسکراہٹ نہیں دیکھ سکے اس کی آنکھوں کا روشن تبسم نہیں پہچان سکے۔ جو ہر وقت، ہر لمحے، ہر صدی تاریخ کے ہر صفحے پر انسان کی محبت کے راگ گاتا ہے اور معصومیت کے اس سرچشمے کو بچانے کی کوشش کرتا ہے جو انسان کے سینے میں شب و روز سوکھتا جاتا ہے۔

"میاؤں! میاؤں!"

یکایک میرے دل پر اک عجیب کپکپی سی طاری ہو گئی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں بھوکا تھا، ننگا تھا، تنہا تھا، بے یار و مددگار تھا جیسے یہ سب لوگ میری طرح بھوکے ننگے پیاسے تھے۔ اور راس گڈا گڑھ صورت نے جس کپڑے پہنائے تھے، ہمارے بالوں میں کنگھی کی تھی اور ان میں لال پیلے رنگ کے فیتے سجائے تھے اور پھر اپنے سر پہ بٹھایا تھا۔ اور میں اپنے آپ سے اور ان تمام لوگوں سے جو اک ہجوم کی صورت میں اس بڑھیا کے گرد جمع تھے کہنا چاہتا تھا اسے دیکھتے نہیں! اسے دیکھتے نہیں! آج محبت نے موت پر فتح پائی ہے آج ظلم کا جال ٹوٹ رہا ہے آج آزادی کا ڈنکا بج رہا ہے آج لوکرین میں دشمن پیچھے ہٹ رہا ہے اور معصوم بچے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ابلی سے بچے۔ آدمی کے بچے.....!

میاؤں۔ میاؤں۔

میں ان سے یہ سب کچھ کہنا چاہتا تھا۔ یہ سب کچھ لیکن میں اس وقت کچھ نہ کہہ سکا۔ کیونکہ وہ لوگ اجنبی تھے۔ وہ لوگ بڑھیا کو جانتے نہ تھے۔ وہ اسے احمق سمجھ رہے تھے۔ وہ لوگ ریس جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ وہ لوگ تیوہار کی خوشیوں میں مگن تھے۔

اور کار کا مالک کہہ رہا تھا۔ اس حرامزادی کو آج ہی مرنا تھا۔ اب ریس میں جانے کے بجائے تھانے میں رپورٹ کے لئے جانا پڑے گا۔

اور پولیس کا سپاہی بھنگی سے کہہ رہا تھا۔ ابے۔ اس چیتھڑے کو اس کمبخت بڑھیا کے سر پر ڈال دو۔ اور اسے سڑک کے کنارے رکھ دو۔ ابھی تھوڑی دیر میں بیل گاڑی آتی ہوگی۔ کول کول۔ ٹیلوک۔ ڈیلوک۔ سپورٹنگ ٹائمز..... لڑکے چیخ چیخ کر ریس سپلیمنٹ فروخت کرتے ہوئے ادھر آ رہے تھے۔ لوگ جلدی جلدی جیب سے نقدی نکال کر انہیں خریدنے لگے۔ اب اُن کے ذہن میں گھوڑے جاکی اور لوٹ کی تصویریں گھوم رہی تھیں۔

ایک بازاری کتا دم ہلاتے ہوئے کار کے قریب آیا۔ پہلے اس نے دائیں طرف کے پچھلے پہیئے کو سونگھا۔ اور ٹانگ اٹھا کر پیشاب کر دیا۔ پھر وہ دوسرے پہیئے کی طرف گیا اور وہاں بھی اس نے پیشاب کیا۔ پھر وہ تیسرے پہیئے کی طرف گیا۔ وہاں بھی اس نے ٹانگ اٹھا کر پیشاب کیا۔ پھر وہ چوتھے پہیئے کی طرف مڑا اور پیشاب کر کے دم ہلاتا ہوا چلا گیا۔ لوگ بھی پمفلٹ خرید کر جا چکے تھے۔

پولیس والا کار کے مالک کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اور کار چل دی۔

سڑک کے ایک کونے میں ایک لال پیلے نیلے اودے رنگوں والا چیتھڑا ابھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

میاؤں۔ میاؤں۔

مندروں میں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

کول کول.... "

ڈیلوک ڈیلوک.....

" سپورٹنگ ٹائمز

x x x x x x

یکایک مجھے معلوم ہوا کہ میں چیتھڑوں کے بیچ میں کھڑا ہوں دنیا کی کوکھ اندھی ہو چکی ہے اور آج گنپتی پوجن ہے.....!

کارل مارکس

آں کلیمِ بے تجلّی، آں مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

اقبال

منکرِ دارائیِ عرشِ بریں
اولیں پیغمبرِ فرشِ زمیں

جوشؔ۔

سوویٹ روس

دنیا کے جن اہم مسائل —— بے روزگاری، افلاس، جہالت، غلامی اور توہمات وغیرہ کو سوویٹ روس نہایت جوانمردی اور اخلاقی جرأت سے حل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دنیا بھر کے سرمایہ دار ممالک ان مسائل کو اسلحہ جات جنگ، لغو پروپیگنڈا اور پیچیدہ فلاسفی کے ذریعے معرضِ التوا میں ڈال کر آئندہ نسلوں کے لئے دلدل پیدا کر رہے ہیں۔

(برنارڈ شا)

سلام مچھلی شہری

بنگال کی رقاصہ

——— آپ بنگال سے کل آئی ہیں۔
آپ کو گانے سے دلچسپی ہے۔
جی ——— تو کچھ رقص بھی فرماتی ہیں۔

اور ——————— ؟
بیٹھئے ——— آپ کو کیا پیش کروں؟
چائے کا وقت تو ہے!
——— جی، یہ ٹیگور کی تصویریں ہیں!
ودمنٹ، آپ اگر معاف کریں۔
منتظر آج کا اخبار ہے میرا ——————— لیکن
بھوک اور موت کی تصویروں میں کیا رکھا ہے
ان لکیروں میں تو مبہم سا کوئی رنگ نہیں
یہ لکیریں تو سمجھ میں مری آجاتی ہیں ———!
انہیں سوکھے ہوئے اجسام کے پس منظر ہیں۔
ایک ٹینک - ایک جہاز - ایک زنجیر ———!!!

آئیے چائے پئیں
یہ حسیں سٹ مرے ایک دوست نے کلکتے سے
جنگ سے پہلے مجھے عید کے دن بھیجا تھا۔
سبز، ہلکی سی لکیروں میں گلابی نقطے
دور سے کتنے بھلے لگتے ہیں ———!
ان لکیروں کے بھی کچھ معنی ہیں
اور بکھرے ہوئے نقطوں کے بھی
دور سے کتنے بھلے لگتے ہیں۔
پاس سے آنکھ جلی جاتی ہے
[illegible]

چند افسردہ لاشیں، چند تڑپتی آنکھیں ———!
برق کی خونی شعاعیں کہ بموں کے ٹکڑے ——— !!!

جی ——— یہ پیانو مرے اک دوست کا ہے
آپ گائیں گی ؟
بہت خوب ———، مگر
پہلے اک رقص کہ یہ فن بھی تو پروردہ ہے
میرے بنگال مرے ملک کے دیوتاؤں کا ———!
ناچئے۔ ناچئے
دیوداسی کی پرستش کی طرح
چاند اور تاروں کی لرزش کی طرح۔
ناچئے ناچئے ——————— پائل کے بغیر
جسم عریاں ہی رہے۔
شعلہ افشاں ہی رہے۔
ناچئے۔ ناچئے
بھوک اور موت کا رقص
میرے بنگال کا رقص
ناچئے۔ سوچتی کیا ہیں ——— اٹھئے!
آپ بنگال سے کل آئی ہیں۔
نغمہ و رقص کا پیکر بن کر
جسم کو بیچئے ——————— پتھر بن کر
ناچئے۔ ناچئے ———————
میں پاگل ہوں۔
یونہی بکا کرتا ہوں ———————!

باری

نئی تاریخ

جب کوئی مورخ کسی خاص زمانہ کے لوگوں کے حالات کو اس طرح پیش کرے کہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ وہ لوگ کس طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے بادشاہوں کی لمبائی کتنی تھی وہ کس قسم کے مکانوں میں رہتے تھے وغیرہ وغیرہ تو ہم اس مورخ کو مورخ نہیں کہیں گے بلکہ اسے وقائع نگار کا نام دیا جائے گا۔ وقائع نگار حوادث کے اسباب و نتائج سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس مورخ کا یہ کام ہے کہ وہ حوادث کے اسباب و نتائج پر بحث کرے۔ کسی مورخ کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ وقائع نگار بھی ہو۔ وقائع نگاری کی طرح سوانح نگاری کو بھی تاریخ خیال کئے جانے سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ سوانح نگار کسی مخصوص عہد کی "تاریخ" کو اس عہد کے مشاہیر تک ہی محدود رکھتا ہے۔ وہ مشاہیر کو دیوتاؤں کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ سوانح نگار کے سامنے نوع انسانی کی جماعتی شکل نہیں ہوتی۔ وہ صرف جماعت کے فرد یا چند افراد کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیتا ہے۔ سوانح نگار بہت بڑا ادیب ہو سکتا ہے لیکن ہم اسے مورخ نہیں کہہ سکتے کیونکہ مورخ کا کام ان مشاہیر کے کارناموں کے اسباب و نتائج پر بحث کرنا ہے۔

یونانی اور رومی تاریخ نگاروں کے بعد عرب تاریخ نگاروں کی ایک جماعت دکھائی دیتی ہے۔ اس جماعت نے تاریخ نگاری کے فن میں حیرت انگیز اضافہ کیا۔ اسی جماعت کے ایک فرد ابن خلدون نے تاریخ نگاری کو سائنس بنا دیا۔ وہ پہلا مورخ ہے جو نہ صرف حوادث کے اسباب و نتائج پر بحث کرتا ہے بلکہ ایک مخصوص زمانہ کے حالات کو اس زمانہ کے معاشی اسباب کا مظہر بتاتا ہے۔ ابن خلدون نے یورپ کے تاریخ نگاروں میں تنقیدی روح پیدا کر دی۔ ابن خلدون کو کارل مارکس کا پیشرو کہا جا سکتا ہے۔ مارکس کی تاریخی مادیت یہ مانتی ہے کہ انسان کے مجلسی ارتقا میں معاشی عناصر کا بہت بڑا حصہ ہے۔ دنیا کے بیشتر ملکوں کے مورخوں نے اپنی تاریخ کو اسی نظریہ کی روشنی میں مرتب کرنا شروع کر دیا۔

ہندوستان میں تاریخ نگاری نے ترکوں، افغانوں اور مغلوں کے عہد حکومت میں بہت زیادہ ترقی کی۔ ہندوستان کے فارسی مورخوں (فارسی زبان میں لکھنے والے) کی صف میں جہاں وقائع نگاروں کی کثرت ہے وہاں کئی ایک بلند مرتبہ مورخ بھی دکھائی دیتے ہیں جو حوادث کے اسباب و نتائج پر بھی بحث کرتے ہیں۔ ازمنہ وسطیٰ کے فارسی مورخوں میں سجان رائے بٹالوی ایک نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی خلاصۃ التواریخ پرانے زمانہ سے لے کر اورنگ زیب کی تخت نشینی تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ خلاصۃ التواریخ میں سجان رائے سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ جغرافیائی اور تمدنی کوائف بھی پیش کرتا ہے۔ بھیم سین کی "تاریخ دلکشا" اورنگ زیب کی تخت نشینی سے شاہ عالم کے عہد حکومت تک کے حالات پیش کرتی ہے۔ مورخ اپنے عہد کے رسم و رواج اور اپنے زمانہ کی معاشرت پر بھی بحث کرتا ہے۔ تاریخ دلکشا ہندوستان کے ایک مخصوص عہد کے تہذیبی اور تمدنی حالات کے لئے ایک مستند حیثیت رکھتی ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد حکومت میں انگریزی کے ساتھ ساتھ فارسی زبان میں بھی تاریخ نگاری کا سلسلہ جاری رہا۔ برطانوی ہندوستان میں جب انگریزی کو ذریعہ تعلیم کی عمومی حیثیت حاصل ہو گئی تو اسکولوں اور کالجوں کے لئے تاریخ کی درسی کتابیں لکھی جانے لگیں۔ ان کتابوں کے ساتھ ہی بعض ہندوستانیوں نے ہندوستان کی تاریخ کے خاص خاص ادوار پر مبسوط کتابیں لکھنا شروع کیں۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی تاریخ نگاری کا آغاز ہوا۔ آج انگریزی، اردو اور دوسری صوبائی زبانوں میں ہندوستان کی تاریخوں کے انبار لگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کتابیں خاص خاص مقاصد کے حصول کے لئے لکھی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والوں کو ہندوستان کی تاریخ ایک ایسے خودرو جنگل کی مانند دکھائی دیتی ہے جس میں ایک واقعہ کا دوسرے واقعہ کے ساتھ کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے چھ ہزار سال کی تاریخ میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس تسلسل کو واضح کیا جائے اور ان معاشی اسباب کو اجاگر کیا جائے جن کی بدولت ہندوستان کی سیاسی مرکزیت اس ملک کی مختلف سمتوں کو نصیب ہوتی رہی۔

ہندوستان کے موجودہ تاریخ نگاروں کی ایک جماعت ہندوستان کی تاریخ کا آغاز آریوں کی آمد سے شروع کرتی ہے۔ یہ جماعت آریائی آمد سے پہلے کے ہندوستان کو جنگلیوں، وحشیوں اور بربریوں کا مسکن بتاتی ہے۔ دوسری جماعت اپنی تمام تر سرگرمیوں کو ازمنہ وسطیٰ کے تاجداروں کی داستانوں پر مرتکز کئے ہوئے ہے۔ تیسری جماعت ہندوستان میں مغلی راج کی برکتوں کے راگ الاپتی جا رہی ہے۔ چوتھی جماعت بدیشی راج کو ڈراونی شکل میں پیش کر رہی ہے۔

ہندوستان کی تاریخ نگاری ایک ایسی جماعت کی منتظر ہے جو تاثرات اور نفسانیات

کی مدد سے لوگوں کو بتائے کہ ہندوستان میں آریوں کے داخل ہونے سے صدیوں پہلے پنجاب اور سندھ کی تہذیب اشوریا اور کلدہ کی تہذیبوں کے ہم پلہ تھی۔ جو نہایت جرأت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرے کہ شاہی خاندانوں کے عروج و زوال کی کہانی سارے ہندوستان کی تاریخ نہیں کہلائی جا سکتی۔ اس جماعت کا یہ فرض ہے کہ وہ برطانی راج کی "برکتوں اور لعنتوں" کی ہیجان پسندی سے ہٹ کر ہندوستان کے اس عہد کی تاریخ کو بین الاقوامی معاشی تحریکوں کی روشنی میں پیش کرے۔

"تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کا شیوہ عام ہو چکا ہے تاریخ کی مسخ شدہ صورت کی مثال وہ کتابیں ہیں۔ جو ہمارے سکولوں اور کالجوں میں نصاب کے طور پر پڑھائی جاتی ہیں۔ ان کتابوں میں بتایا جاتا ہے کہ "آریوں کی آمد سے پہلے ہندوستان شودروں، داسیوں اور راکشسوں سے آباد تھا۔ آریوں نے یہاں آباد ہونے سے اس ملک کو اتنا پُر کر دیا کہ دیوتاؤں تک نے بھی اسے اپنا مسکن بنا لیا۔ لوگ صدیوں سے پُرامن زندگی بسر کرتے چلے آ رہے تھے کہ از منہ وسطیٰ میں شمال مغربی درّوں کی راہ سے ایسے لوگ ہندوستان میں داخل ہوئے جنہوں نے امن کے پجاریوں سے چین اور سکھ چھین لیا۔ چور، ٹھگ، راہزن، لٹیرے، جلاد، بے رحم، غارت گری، لوٹ مار، فسادات جیسے الفاظ بار بار پیٹ ——— یہ ہیں وہ الفاظ جو طالب علم کو اپنی درسی کتاب کے ہر صفحہ پر بار بار پڑھنے پڑتے ہیں۔ ان کتابوں میں اورنگ زیب کی موت کے بعد لڑائیوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو ۱۸۵۷ء کے بعد ختم ہوتا ہے۔ برٹش انڈیا کی تاریخ کو گورنر جنرلوں کی کہانی بنا دیا گیا ہے۔ اس عہد کے بین الاقوامی سیاسی سائنسی اور تہذیبی حالات کا ذکر تک نہیں کیا جاتا۔

ہندوستان کی سماجی اور معاشی تاریخ خرافات کے ان انبار تلے دبی پڑی ہے، نئی تاریخ لکھنے والوں کا یہ کام ہے کہ وہ اسے اس ڈھیر میں سے نکال کر لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ ہندوستان کی تاریخ کی مروجہ کتابوں کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ان میں صوبوں کی تاریخ نظر انداز کر دی جاتی ہے۔ اس لئے نہ صرف ہندوستان کو بلکہ ہندوستان کے ہر صوبے کو نئی تاریخ کی ضرورت ہے۔

شاعرِ فردا

لطیف ساحل

تیرے اس گریۂ پیہم سے بھلا کیا ہوگا — اشکِ غم گرمیٔ احساس بجھانے سے رہے
نوجوانی کے سسکتے ہوئے پیاسے ارماں — سینۂ زیست میں طوفان اٹھانے سے رہے
تجھ کو معلوم ہے؟ اس غمکدۂ ہستی میں — زندگانی کبھی ہم رنگِ تمنا بھی ہوئی؟
قلبِ انساں کی تمناؤں کی رنگین بہار — ان خزاں بار فضاؤں کو گوارا بھی ہوئی؟
دیکھ اس عکدۂ زیست کے ویرانے میں — کتنے ارمانوں کا دم گھونٹ کے بیٹھے ہوں میں
بل نہ آیا کبھی پیشانیٔ ناداری پر — زہر پی پی کے حوادث کا بھی سرشار ہوں میں
کتنے طوفان مری کشتیٔ خودداری کو — انتقامانہ تحکم سے بلاتے ہی رہے
کتنے سرمایہ پرستی کے سبک سیر خیال — تندخوئی کو مری وجد میں لاتے ہی رہے
لیکن اے دوست زمانے کا عمل سوز نظام — مجھ کو پابندِ قوانینِ کہن کر نہ سکا
صرصرِ تلخیٔ ایام کی سوگند کبھی — میں نے احساس کی قندیل کو بجھنے نہ دیا
زندگی جبر نہیں رُوح جو بیدار رہے — تیرگی شعلۂ خورشید سے جل جاتی ہے
عسرت و نکبت و آلام کی سنگین چٹان — گرمیٔ سعیٔ مسلسل سے پگھل جاتی ہے
کھیل کچھ اور یونہی ظلمتِ آلام سے کھیل — اب کوئی دم میں ابھرنے ہی کو ہے ماہِ تمام
آ رہی ہے اُفقِ شرق سے لیلائے حیات — اپنے ہاتھوں میں لئے بادۂ گلفام کا جام

سماجی ارتقا

ساحر لدھیانوی :

انسانی سماج کی ابتدا کے متعلق مختلف اوقات میں مختلف النوع نظریے پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ اور ہر نظریے کی پشت پناہ کے لئے ایسے اصول و ضوابط وضع کئے گئے ہیں جو سماجی تعلقات کو ترتیب دے سکیں علم الطبیعات کے انقلاب انگیز انکشافات سے قبل ہر نظریے کی جڑیں مذہب سے پیوست ہوتی تھیں، جن پر ایک مافوق الادراک طاقت کے نام سے طرح طرح کی اخلاقی حدیں استوار کی جاتی رہی ہیں۔ وقت گزرنے پر جمہوری حکومت کا احساس آئینِ ریاست کی بنیاد بنا۔ بادشاہوں کے پیدائشی حق حکومت پہ عوام کی عقل نے کمندیں پھینکیں، اور "ظلِ ربانی" کے ملوکانہ تصور منہدم ہونے لگے لیکن انسان، جمہوریہ کے ارتقائی تصور پر بھی سماج کے آغاز سے ناواقف ہی رہا۔ حتےٰ کہ انیسویں صدی کے سائینسی انکشافات نے شاہراہِ تحقیق پر چھائے ہوئے اندھے مذہبی تعصبات کا خاتمہ کر دیا۔ ڈارون کی حیاتیاتی دریافتوں نے انسانی پیدائش کے عمل پر روشنی ڈالی، روئیس ملیگن کی علمی تحقیق نے قدیم انسانی سماج کی ساخت سے متعلق معلومات بہم پہنچائیں ہیگل نے تاریخ کو سائینس کی سطح تک پہنچایا۔ اور بتایا کہ انسانی سماج مسلسل بہم ربط ارتقا ہے سب سے آخر میں مارکس اور اینجلز نے تاریخ کا مادی نظریہ پیش کیا جس کے نقطۂ خیال کی رو سے تمام تاریکیاں مٹ گئیں، جو ان گنت صدیوں سے ذہنِ انسانی پر چھائی ہوئی تھیں، مارکس اور اینجلز نے بتایا کہ سماج نے اپنے آغاز سے اب تک جس قدر مرحلے بھی طے کئے ہیں، ان کا پس منظر مادی اسباب ہیں، جن کی قدریں مختلف اوقات میں مختلف ہوا کرتی ہیں۔ سماجی ارتقا پر یہ حکم لگانا کہ یہ کسی مشیت کی نگاہ کائنات نواز کا صدقہ ہے، محض فکر و نظر کی گمراہی ہے۔

انسان، حیاتیاتی ارتقا کا سب سے اہم مظہر ہے، جو زندگی کی جدوجہد میں جسمانی قبولیت کے ساتھ ساتھ خود ساختہ اوزاروں سے بھی مدد لیتا ہے۔ اس کی احتیاجات تدریجی طور پر گوناگوں مخترعات کی موجب ہوئی ہیں۔ جانوروں کے لئے ان کی کھالیں اختلافِ موسم پر اپنی خاصیت بدل لیتی ہیں۔ لیکن انسان کی ارتقائی حالت نے اس کی تگ و دو کے زاویے بدل دئے ہیں۔

انسان نے ابتداً اپنی عریانی جسم کو ڈھانپنے کے لئے احساس کے کنایہ پر درختوں کے لمبے لمبے پتوں اور چھال کو لباس بنایا۔ تدریجاً یہی لباس روئی کے کپڑوں میں بدلا گیا۔

ڈارون کے نظریے سے واضح ہے کہ انسان نے بندر کی وجودی حیثیت سے نشو و نما پائی ہے۔ اور اس نشو و نما نے وقت کی بڑھتی ہوئی لہروں کے ہمدوش عناصرِ فطرت کی فتوحات کا علم اٹھایا ہے۔

چونکہ فطرت کے جلو میں بے رحم طاقتوں کا ایک ہجوم تھا۔ اس لئے ان کے مقابلے اور مسابقت کے لئے انسان نے اپنے ہمجنسوں کے اشتراک، تعاون کی ضرورت محسوس کی اور اس طرح انسانی سماج کی صبحِ اول کا آغاز ہوا۔ پہلے پہل گروہ بندی شکار کھیلنے کے لئے ہوتی، پھر گھریلو جانوروں کی گلہ بانی کے لئے اور سب سے آخر میں زراعت کے لئے۔ ان تینوں مرحلوں نے انسان کو جماعت بند کیا۔ چنانچہ سماج کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے، جب قدرتی ذرائع سے کوئی نئی چیز پیدا کرنے کے لئے انسانی محنت کا استعمال شروع ہوا، اور انسان کی قوتِ کار نے تخلیقی مقاصد کے لئے ایک خاص ڈھب کی اجتماعیت کو اختیار کیا۔

زراعت، سماج کے ابتدائی استحکام کی دفعہ اول ہے، انسان نے خوراک کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنے اور خانہ بدوشی کی زندگی کو خیرباد کہہ کر گروہ در گروہ مختلف زمینی خطوں میں سکونت اختیار کر لی، انسانی آبادیوں کے یہی قطعے حقیقی سماج کا سنگِ بنیاد بنے۔

ہر گروہ نے ایک قطعہ زمین کے گرد باڑھ لگا کر اسے اپنی مشترکہ ملکیت قرار دیا جس پر مشترکہ محنت صرف ہوتی، اور سب افراد پیداوار کے مشترکہ حصہ دار ہوتے اس میں میرے تیرے کا سوال ہی نہ تھا۔

حالات کے سکون نے بتدریج انسانی محنت کی پیداوار کو بڑھایا نئے زراعتی اوزار وضع ہوئے، جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشترکہ محنت کے عمل میں رکاوٹ پڑ گئی۔ موجد ان اوزاروں کو اپنے ذاتی استعمال میں لانے لگے۔ اور انفرادی محنت کے ثمرات انفرادی ملکیت سمجھے جانے لگے جس سے رفتہ رفتہ سماج کے مشترکہ مفاد کا خاتمہ ہو گیا۔

متضاد اور مختلف مفاد رکھنے والے افراد کے سماجی تعلقات کو معین کرنے کے لئے ایک نیا ڈھانچہ درکار تھا جو محض مذہب ہی کے گارے سے چونے سے تیار ہو سکتا تھا چنانچہ پہلے کی طرح، ذرا مختلف رنگ میں مافوق الفطرت قوت سے استمداد کیا گیا۔ اور اس قوت کی آڑ میں سماج کے لئے نئے قوانینِ نظم و تہذیب مرتب کئے گئے۔

وقت کے ساتھ ساتھ زمین کی ذاتی ملکیت جو زمانہ قدیم کا واحد ذریعۂ معاش تھا امر بیل کی طرح پھیلتی گئی، اور اس پھیلاؤ نے سمٹ کر انفرادی ملکیت کے دائرے بنائے چھوٹے چھوٹے قبیلوں کا ظہور ہوا ہر قبیلہ کا ایک سردار بنا جو قبیلہ کی زمین

کا مالک قرار دیا گیا۔ یہ سردار آہستہ آہستہ آزاد کاشت کاروں کو بے دخل کر کے جاگیردار بن گئے۔ اس وسعت کو سنبھالنے کے لئے قبیلوی سردار متحد ہوئے۔ اور ایک مقدس بادشاہت رونما ہوئی، جو ان سرداروں کے خدائی حقوق کی محافظت کا آلہ تھی۔ اس آلے نے سماج کے آزاد تعلقات کی بیخ کنی کی، اور طبقاتی امتیازات کی دیواریں چن دیں ——— حقوق یافتہ سرداروں نے مذہب کے پردے میں سیاسی اقتدار حاصل کیا، اور محنت کش عوام کو مذہب، فلسفہ، اخلاق، اور قانون کے کھلونے دے گئے، جو درحقیقت اپنے عہد کے مروجہ نظام کے حفاظتی دستے تھے۔

سماج میں امتیازی طبقات کی پیدائش نے منطقی طور پر طبقاتی کشمکش کو جنم دیا جس کی بنا پر مختلف تاریخی مدارج پر بڑے بڑے انقلاب رونما ہوئے، پرانے نظاموں کی کینچلیاں اتریں، اور نئے طریقِ پیداوار سے پیدا شدہ نئے رجحانات متشکل ہو کر ایک نئے سماجی نظام کا ہیولیٰ بنے۔ ہر دور کے حکمران طبقہ نے نئی قوتوں کی نشوونما کے راستے میں روڑے اٹکائے، لیکن سماجی ارتقا کا عمل جاری رہا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ قدیم اشتراکی سماج کی بنیاد زراعت کے لئے مشترکہ محنت کے استعمال پر تھی۔ دستکاری کی ترقی نے اس سماج کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ اوزاروں کے مالکوں نے اپنی قوتِ کار کی پیدا کردہ اشیاء کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھنا شروع کیا اور ذاتی ملکیت کے مختلف تاریخی زاویے سمٹتے پھیلتے سرمایہ دارانہ نظام کے نقطۂ عروج کو پہنچے، جن کا درمیانی عرصہ مختلف پیداواری طریقوں کی ایک لمبی کہانی ہے۔

ذاتی ملکیت کے ابتدائی ایام میں غلامی کی داغ بیل پڑی جس میں وقت کے ساتھ ساتھ اصلاحی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ لیکن بہر رنگ غلاموں کی قوتِ کار پر آقاؤں کا قبضہ رہا۔ اور غلاموں کو صرف ان کی ابتدائی ضروریات مہیا کی جاتی رہیں۔ باقی سب کچھ "آقایانِ ولی نعمت" کا اجارہ تھا۔

ہندوستان میں رسمِ غلامی اس کلاسکی صورت میں رونما نہ ہوئی جس صورت میں وہ مغرب اور بحیرۂ روم میں قائم رہی، لیکن اس کا ایک بڑا حصہ ذات پات اور چھوت کے منو سمرتی آئین میں مضمر ہے۔

آریہ فاتحوں نے مفتوح دراوڑوں کو کلی طور پر غلام بنا ڈالا۔ اس کے آثار آج بھی ہندوستان کے معاشی نظام میں پائے جاتے ہیں۔

آرائش پر صرف ہونے لگی اور دیدوں کے ساتھ ساتھ دوسری بے معنی یادگاریں تعمیر ہونے لگیں چونکہ غلام محنت کشوں کی حیثیت اختیاری طور پر بمنزلہ صفر تھی۔ لہٰذا آقاؤں نے محنت کو زراعت پر خاطر خواہ طریق سے مرکوز نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا، کہ ایک طرف تو غلام محنت کش بھوک کا شکار ہونے لگے، دوسری طرف تمام اقتصادی ڈھانچہ اپنا توازن کھو بیٹھا، سوسائٹی ایک عظیم بحران میں مبتلا ہو گئی۔ اور پیداواری نظام جس کی بنیاد رسمِ غلامی پر تھی ٹوٹنے لگا۔

ہندوستان میں اس رسم کی تباہی کا رنگ، بابل، مصر، یونان اور روم کی طرح شدید نہ تھا، کیونکہ یہاں رسمِ غلامی کی ظاہری ہیئت نسبتاً مختلف تھی۔ لیکن بودھی بغاوت قدیم آریائی نظام کو متزلزل کرنے کا موجب بنی، اور اسے اپنی نشاۃِ ثانیہ کے لئے کئی صدیاں لگ گئیں جو کچھ دوبارہ قائم کیا گیا، وہ نوعیت کے اعتبار سے نیا اور صرف نام کے اعتبار سے پرانا تھا۔ مثال کے طور پر وہ روایاتی بادشاہت دوبارہ زندہ نہ کی جا سکی، جس کے ساتھ لا محدود زمینی اور آفاقی حقوق منسلک تھے۔

جاگیردارانہ نظامِ پیداوار کی بنیاد اس امر پر تھی کہ مزارعین اپنے "اوزاروں سے زمین کو کاشت کرتے تھے، اور زمین کی پیداوار پر مالک کا قبضہ ہوتا تھا۔ انہیں اس میں سے صرف اس قدر ملتا تھا جس سے وہ زندہ رہ سکیں۔ اور ان کے کام کرنے کی قوت کو ضعف نہ پہنچے ——— ہندوستان کے اکثر دیہاتی حصوں میں یہ طریقہ اب بھی آثارِ قدیمہ کے طور پر باقی ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ہر سماج اور اس کے پیداواری تعلقات ایک خاص سماجی نقطۂ ارتقا پر پہنچ کر اپنے بطن سے ایک نئے نظام کو جنم دیتے ہیں۔ جاگیرداری نے بھی ایک نئی جماعت کو جنم دیا، یہ جماعت تاجروں، اور دستکاروں کی تھی۔ اس طبقہ کی روز بروز ترقی ایک تاریخی تقاضا تھی۔ چنانچہ جاگیردار طبقہ کی سعی ناکام کے باوجود یہ جماعت پھلتی پھولتی رہی۔ کیونکہ خود جاگیرداروں کو اپنی اجناس کا بدل سونا درکار تھا جو تاجروں کے ذریعہ ہی حاصل کیا جا سکتا تھا۔

تجارت کا لازمی نتیجہ منافع تھا۔ چنانچہ تاجروں کی امارت جاگیردار طبقہ کی مزاحمت اور دباؤ کے باوجود بڑھتی رہی، ان تاجروں نے اپنے جمع کردہ سرمایہ کو دستکاری میں لگانا شروع کر دیا۔ اور سود بخش تجارت کے نتیجے کے طور پر جاگیردار طبقہ کی استبدادیت خطرے میں پڑ گئی۔ ہر ٹوٹتی یا مٹتی ہوئی چیز اپنی فنا سے پہلے ایک زوردار سنبھالا لیتی ہے، جاگیرداری نے بھی اپنی حفاظت کے لئے مطلق العنان شہنشاہیت ایجاد کی، اور اس کا سہارا لیا۔ لیکن فوجی طاقت کبھی بھی تاریخی محرکات کا رخ تبدیل نہیں کر سکی۔ بالآخر یہ نقشہ بھی پلٹا، اور سرمایہ دارانہ نظام نے اپنی پوری سج دھج سے رونمائی کی۔

کاشت کرنے کے پابند نہیں رہے، انہیں کھلے بازار میں اپنی قوتِ کار کو جنس بنا کر بیچنے کی آزادی حاصل ہو گئی۔ اس صورت حال سے دیہات کا مزارع شہر کا مزدور بنا اور شہروں میں انڈسٹری کے مراکز بڑھنے اور پھیلنے لگے اجرتی محنت میں نوعی اعتبار سے جاگیردارانہ غلامی کا کریہہ منظر نہیں تھا۔ دیہات کے مزارعین کی ایک کثیر تعداد شہروں میں اٹھ آئی مزدوروں کی فراوانی کے باعث انڈسٹری کے مالکوں کو سستی قوتِ محنت خریدنے کے مواقع ہاتھ لگے نتیجۃً سرمایہ کی مرکزیت کا آغاز ہوا۔

سرمایہ ہم اس دولت کو کہتے ہیں جس کے عوض دوسروں کی قوتِ کار ذرائع پیداوار سے نئی قدر پیدا کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے سرمایہ مزدور کی قوتِ کار کا وہ ماحصل ہوتا ہے جس کا معاوضہ اسے ادا نہیں کیا جاتا یعنی سرمایہ مزدور کی غصب شدہ محنت ہوتی ہے جسے بعد ازاں مزید مزدوروں کی قوتِ کار کا استحصال کرنے کے مصرف میں لایا جاتا ہے۔

شروع شروع میں انسان نے قدرتی ذرائع پر اپنی ضروریاتِ زندگی کے لئے محنت کا استعمال کیا۔ ذاتی ملکیت کی پیدائش نے پیداوار کے حقیقی مقصد کو ختم کر کے انسانی محنت ماحصل کو جنسِ تبادلہ بنا دیا۔ پہلے تبادلہ بلا واسطہ ہوتا تھا لیکن آخر میں سکّے ذریعۂ تبادلہ بنے اور دولت —— اجناس کے تبادلہ کا قانونی ذریعہ قرار دی گئی۔ یوں سرمایہ دارانہ نظام کے ماتحت پیداوار کا حقیقی مقصد بالکل ہی ختم ہو کر رہ گیا۔ پیداوار کا مقصد "منافع" ٹھہرا اور منافع بھی "پیدا کرنے والے" کا نہیں بلکہ ذرائع پیداوار کے مالک کا جس کا فی الحقیقت پیداوار میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ "قیمت" مزدور پیدا کرتا ہے محنت مزدور کی ہوتی ہے لیکن اوزار سرمایہ دار کے ہوتے ہیں مثال کے طور پر ایک میز کی قیمت اس لکڑی سے زیادہ ہوتی ہے جو اس میز پر صرف ہوتی ہے۔ یہ زائد قیمت اس محنت کا نتیجہ ہوتی ہے جو مزدور لکڑی پر صرف کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور سرمایہ دار کی مشینوں پر کام کرتا ہے، سرمایہ دار کا مقصد منافع کمانا ہوتا ہے اور منافع اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ مزدور کو اس کی محنت کا پورا معاوضہ نہ دیا جائے یعنی اس کی پیدا کردہ قیمت کا ایک حصہ غصب کر لیا جائے سرمایہ دارانہ نظام کے ماتحت پیداواری قوتیں تیزی سے بڑھتی ہیں "پیداوار" مانگ سے زیادہ ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ اشیاء کا معین منافع پر بکنا محال ہوتا ہے۔

یہاں "مانگ" ہونے سے یہ مفہوم نہیں لینا چاہئے کہ اشیاء ضرورت سے زیادہ تیار ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ اشیائے ضرورت کے لئے تو تیار کی ہی نہیں جاتیں جس وقت سرمایہ دار "مانگ" نہ ہونے کا شکوہ کر رہے ہوتے ہیں اس وقت کروڑوں آدمی زندگی کی ابتدائی ضروریات کو ترس رہے ہوتے ہیں منافع کو معین سطح پر لانے کے لئے کارخانے عارضی طور پر بند کر دیئے جاتے ہیں نتیجے کے طور پر مزدوروں کی ایک کثیر تعداد بیکار ہو جاتی ہے۔ اشیاء کو منافع پر بیچنے کے لئے سرمایہ دار پیداواری اخراجات کو کم کرتے ہیں اس مقصد کی تکمیل کے لئے مزدوروں کی اجرت گھٹا دی جاتی ہے اور اگر اجرت گھٹائی نہیں جاتی، تو اوقاتِ کار میں اضافہ کر دیا جاتا ہے، جس سے بالواسطہ طور پر اجرتیں کم کرنے کا مقصد حل ہو جاتا ہے۔ انڈسٹری کا ارتقا جہاں سرمایہ داروں کے لئے زائد پیداوار اور سستی محنت کے حصول کا موجب بنتا ہے، وہاں مزدوروں کی ایک کثیر تعداد کو بیکار بھی بنا دیتا ہے عوام کا معیارِ زندگی بتدریج پست ہونا شروع ہوتا ہے اور محنت کشوں کی بیکار صنعتی فوج سرمایہ دارانہ نظام کے لئے مستقل خطرے کی صورت اختیار کر لیتی ہے سماجی ترقی کا انحصار پیداوار کے لئے محنت کے استعمال پر ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا ارتقا محنت کشوں کی ایک کثیر تعداد کو پیداوار کے عمل سے علیحدہ کر دیتا ہے اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کا موجب بنتا ہے۔ اس مرحلہ پر سرمایہ دارانہ نظام کی وہ ترقی پسندانہ نوعیت ختم ہو جاتی ہے جو اسے سماجی ارتقا کے ابتدائی مراحل میں حاصل ہوتی ہے تبادلہ اور منفعت کے زیر مقصد چلنے والے نظام کا موروثی تضاد سرمایہ دارانہ نظام کو "نو آبادیاتی پھیلاؤ" پر مجبور کرتا ہے۔ صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ممالک کے سرمایہ دار طبقے اپنے مشینی مال کی کھپت کے لئے دوسرے ملکوں میں منڈیاں تلاش کرتے ہیں۔

دنیا کی زیادہ سے زیادہ منڈیوں کو اپنا اجارہ بنانے کے لئے سرمایہ دار ممالک کا باہمی مسابقہ، جنگ کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ جو سرمایہ دارانہ نظام کے اقتصادی ڈھانچے کو اور بھی غیر متوازن کر دیتی ہے اور اس کے بنیادی تضاد کے کروہ خدوخال واضح اور نمایاں نظر آنے لگتے ہیں۔ سماجی ارتقا کا عمل انقلابی طریق سے پھوٹ پڑنے کی منزل کو پہنچ جاتا ہے محنت کشوں کے لئے سرمایہ داری کی زنجیروں کو توڑنا ایک تاریخی فرض کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

سرمایہ داری اپنے تضاد سے ایک نئے نظام تمدن کی بنیاد رکھتی ہے اور ایک ایسی جماعت کی پیدائش اور تنظیم کا موجب بنتی ہے جو پرانے سماج کی لاش پر نئے سماج کی بنیادیں استوار کرنے کا فرض سرانجام دیتی ہے۔ اور بورژوا اقتدار کا خاتمہ کر کے ایک مشترک سماج کی بنیاد رکھتی ہے بورژوا اقتدار کا خاتمہ پیداوار کو اس کے حقیقی مقصد کی طرف لے آتا ہے۔ عناصرِ پیدائش از سرِ نو سماج کی اجتماعی ضرورت کے لئے استعمال ہونے شروع ہوتے ہیں۔ اور عدم طبقاتی سماج وجود میں آتا ہے، سرمایہ داری نظام نے محنت کو بڑی حد تک اجتماعی بنا دیا ہے لیکن محنت کے فوائد ابھی تک محدود سے چند افراد کے قبضے میں ہیں۔ پرولتاری انقلاب مشترکہ محنت کے ماحصل کو سماج کی مشترکہ ملکیت بنا دے گا۔ آج انڈسٹری اس قدر ترقی کر چکی ہے، کہ اگر دنیا کے عناصر پیدائش سماج کی مشترکہ ملکیت بنا دئیے جائیں، تو زندگی کی ضروریات اور سامانِ آسائش کے لئے ایک فرد کو ہفتہ میں محض ایک گھنٹہ کام کرنا پڑے گا۔ باقی تمام وقت وہ لٹریچر، سائنس، آرٹ اور زندگی کے دوسرے لطیف مشاغل پر صرف کر سکے گا +

سرخ روشنی

مدھو سودن

ریلوے ویٹنگ روم میں شور کم ہوتا جا رہا تھا۔ رات بڑھ رہی تھی۔ اور مسافروں نے اپنے اپنے بستر لگانے شروع کر دئے تھے۔ وہ اس وقت تک ویٹنگ روم میں آ کر سو سکتا ہے جب تک اپنے کپڑوں سے ایک آوارہ بھکاری نہ معلوم ہونے لگے۔ ابھی اپنے کپڑوں سے وہ ایک آوارہ بھکاری معلوم نہیں ہوتا۔ بنچ پر بیٹھے ہوئے اس نے سوچا، ابھی وہ اس بنچ پر سو سکتا ہے، چند دن اور سو سکے گا۔ جب تک ڈیوٹی پر آنے والے کانسٹیبل اسے پہچان نہ جائیں۔ ویٹنگ روم میں ابھی حرکت باقی تھی تیسرے درجے کے میلے کپڑے ادھر سے ادھر حرکت کر رہے تھے، دھیمی سی روشنی جو میلے کپڑوں میں اور بھی دھیمی معلوم ہوتی تھی، میلی گٹھریاں، تیسرے درجے کے ٹرنک، اجنبی آوازیں، ویٹنگ روم میں بکھری پڑی تھیں۔ ان کی بے ترتیبی نے ایک بھیڑ کا سا اثر پیدا کر دیا تھا لیکن درحقیقت ویٹنگ روم میں بھیڑ نہ تھی۔ ٹی سٹال پر صرف ایک آدمی کھڑا تھا، باقی لوگ چائے نہیں پیتے، یہ شاید اپنے کھیتوں کو چھوڑ کر اس شہر میں آئے ہیں جہاں وہ دو دن سے مارا مارا پھر رہا ہے۔ وہ بنچ پر بیٹھا رہا، دل میں ڈر تھا کہ لیٹ کر وہ استفسار کے لئے زیادہ عریاں ہو جائے گا۔ وہ بیٹھا رہا۔ ویٹنگ روم سے باہر سڑک پر ریسٹوران ایک روشنی کا کمرہ معلوم ہو رہا تھا۔ ریسٹوران میں گراموفون بج رہا تھا اور جوں جوں ویٹنگ روم میں خاموشی چھاتی گئی ریسٹوران واضح ہوتا گیا، تمام دوکانوں میں اب صرف یہ ریسٹوران ہی کھلا رہ گیا تھا اور منیجر لگاتار ریکارڈ بجائے جا رہا تھا۔

ایک لمحہ کے لئے نہایت عجیب ڈھنگ سے وہ ہوٹل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دکانیں بند ہونے کی وجہ سے اندھیرے کی قطار چلی گئی تھی۔ اس نے محسوس کیا جیسے باہر تمام ماحول میں صرف ہوٹل زندہ ہے، صرف ہوٹل جاگ رہا ہے، گیت کے متعلق اسے ایک دلکشی کا احساس ہوا گویا آواز اندھیرے سمندر کے درمیان کسی روشنی کے مینار سے آ رہی ہے۔ وہ خود ایک گم گشتہ سی حالت میں تھا، مبہم، غیر واضح خیالات نے ذہن پر بوجھ سا کر رکھا تھا۔ وہ انہی خیالات کو بار بار دہرانے سے تھک گیا تھا لیکن وہ ذہن سے ہٹتے نہ تھے۔ اچانک اسے ایک خلا کا احساس ہوا۔ ہوٹل میں ریکارڈ بجنا بند ہو گیا تھا، ویٹنگ روم کی طرف متوجہ ہو کر اس نے دیکھا، اکثر لوگ سو گئے تھے۔ ٹی سٹال والا دکان بند کر کے کاؤنٹر کے سل پر بستر بچھا رہا تھا، بستر بچھا کر وہ لیٹ گیا، پھر سامنے کا ریسٹورنٹ بھی بند ہو گیا۔ بہت دیر بعد اسے اب پھر تنہائی کا احساس ہوا، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی گھر نہیں ہے، اسے آج رات بھی اس ویٹنگ روم میں سونا ہے۔

دونوں ہاتھوں کو سر کے نیچے رکھ کر وہ بنچ پر لیٹ گیا، بنچ ٹھنڈا تھا، دسمبر کی رات کافی گذر گئی تھی، ریلوے لائنوں کی طرف سے ہوا کے یخ جھونکے آ رہے تھے، اس نے ہاتھوں کو سر کے نیچے سے نکال کر سینے پر لپیٹ لیا، اگر گھر سے چلتے وقت اوڑھنے کے لئے کچھ ساتھ لے لیتا ——— اس خیال کے ساتھ ہی اس نے اپنے تئے ایک نفرت محسوس کی۔

باہر لائنوں کے اوپر اندھیرا تھا، دور ایک سرخ بتی چمک رہی تھی، گویا وہ امید ہے جو تاریکی کے سینے میں جل رہی ہے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ کب تک وہ اس طرح زندگی گزار سکتا ہے، خیالات مستقبل کی طرف بڑھنے لگے۔ اگلے چند دنوں میں یہ کپڑے بالکل میلے ہو جائیں گے، دو دن تک اس نے نہایت احتیاط سے انہیں بچائے رکھا ہے، دو دن وہ انہیں اور بچا سکتا ہے۔ اس کے بعد اس دنیا میں جہاں انسان کی حیثیت کا اندازہ کپڑے سے لگایا جاتا ہے، وہ کیا کرے گا؟ پھر کوئی اُمید نہ ہو گی۔ وہ اس لمحے سے خوفزدہ ہو گیا۔ پھر اس نے ایک جھرجھری سی لی، سرد ہوا کے جھونکے بار بار جسم سے مس ہو رہے تھے، اس نے کروٹ لے لی اور جسم کو سکیڑ کر لیٹ گیا۔ نیند آ جاتی تو اچھا تھا، لیکن نیند نہیں آئی۔

دو دن پہلے وہ گھر سے چلا آیا تھا۔ وہ خود گھر والوں کو کچھ سہارا نہ دے سکتا تھا۔ اور ان پر بوجھ بننا نہ چاہتا تھا۔ گھر کی مالی حالت اتنی ابتر تھی کہ وہاں رہتے ہوئے اسے اپنا وجود اپنے ضمیر پر بوجھ معلوم ہوتا تھا۔ وہ گھر میں اکیلا نوجوان تھا اور بیکار۔ والد صاحب چھاپے خانے میں چالیس روپے کے کلرک تھے۔ اب لکھتے وقت ان کے ہاتھ میں ہلکی سی لرزش ہوتی تھی اور چالیس روپے میں گھر کی گذر مشکل تھی بہن انڈسٹریل سکول کے لئے فراکیں سیتی تھی، بلاؤز کاڑھتی تھی اور وہ لیمپ کی روشنی میں وہ بہن کو کاڑھتے ہوئے دیکھتا اور اس کی رگوں میں تکلیف پھیلتی جاتی اور وہ خاموش دیکھتا رہتا، بہن کاڑھنے میں منہمک رہتی اور پھر اچانک کبھی وہ آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھتی، ایک مسکراہٹ جیسے وہ اسے دلاسا دے رہی ہو۔ وہ مسکراہٹ اسے بے لفظی کی ایک تکلیف دہ احساس میں چھوڑ جاتی۔ دو سال سے وہ ملازمت کے [illegible]ش کر رہا تھا، ملازمت ملتی نہ تھی اور

اس کے علاوہ وہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا' ملازمت کے علاوہ اس کے خاندان میں کسی نے اور کچھ نہیں کیا تھا۔ اور پھر کسی کاروبار کے لئے سرمایہ نہ تھا' ماں کے زیور علاوہ اس کے خاندان میں کسی نے اور کچھ نہیں کیا تھا۔ اور پھر کسی کاروبار کے لئے سرمایہ نہ تھا' ماں کے زیور اس کی تعلیم میں بک گئے تھے۔ ماں نے سوچا تھا کہ پڑھ کر ان زیوروں کو وہ پھر لوٹا دے گا۔ اس کی یہ امید کتنی مامتا کی حامل تھی۔ اور وہ یہ کر نہ سکا تھا۔ اس امید کو پورا نہ کر سکا تھا اور ماں کی کھانسی بڑھتی جا رہی تھی جسم نحیف ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ صبح کی روشنی دیکھنے سے پہلے ہی چراغ بجھ نہ جائے۔ کتنی ٹریجڈی ہو گی یہ اجس امید کے سہارے وہ جی رہی ہے، اگر وہ اس کی زندگی میں پوری نہ ہوتی جس فارغ البالی کا وہ زندگی بھر انتظار کرتی رہی ہے۔ اگر وہ پوری نہ ہوئی۔ نہیں نہیں' وہ سوچتا تھا' اسے وہ دن دیکھنے کے لئے زندہ رہنا چاہئے۔ جب اس کے گھر میں خوشی ہو گی' مسرت اور بے فکری لیکن وہ دن کب آئے گا وہ دن کب آئے گا' ماں فکر میں گھل رہی تھی' امید' انتظار اور فکر اور فکر وہ یہ جانتا تھا' دوسرے لوگوں کے دل میں اپنی بے بسی کے ادراک سے بھی واقف تھا۔ کتنا دکھ دیتا تھا یہ احساس' کتنی تکلیف' کتنی اذیت

وہ گھر آتا تو یہاں کی بدحالی اور اپنی بے بسی کا احساس ہوتا تھا۔ اور اس نے زیادہ تر گھر سے باہر رہنا شروع کر دیا۔ دن بھر وہ گھر سے باہر رہتا' کہیں کہیں اپنی بے بسی اور اس بدحالی سے علیحدہ' رات گھر میں آتا کھانا کھاتا اور الگ لیٹ جاتا۔

پھر ماں بیمار ہو گئی۔

جب وہ اچھی ہوئی تو اگلے مہینے کی تنخواہ پیشگی لی جا چکی تھی۔ اگلے مہینے تنخواہ نہیں ملی۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا جب کوئی خلاف معمول بات ہو جاتی تھی' کوئی بیمار ہو جاتا تھا تو گھر کا مالی نظام درہم برہم ہو جاتا تھا۔ آمدنی میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ ایسے موقعوں کے لئے کچھ بچا لیا جائے۔ اس کے بغیر ہی گزارا مشکل سے ہوتا تھا' لیکن ہو جاتا تھا۔ اب تنخواہ نہیں ملی۔ پہلے ہفتے بنئے نے خوشی سے ادھار دے دیا۔ دوسرے ہفتے اس نے ادھار خوشی سے نہیں دیا تیسرے ہفتے اس نے نہایت انکساری سے انکار کر دیا۔ وہ معمولی سا دکاندار ہے۔ اس نے کہا' بیچنے سے جو کچھ ملتا ہے اسی سے خریدتا ہے خریدنے اور بیچنے کے درمیان ہے اس کی روزی۔ جب پیسے ہی نہ ملیں گے تو دکان کیسے چلے گی۔

دو دن اور گزر گئے۔ پڑوس والوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان کے گھر میں واقعی کھانے کو نہیں ہے اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کسی کے ہاں گیہوں ابھی مل سے پس کر نہیں آئے ہیں یا اس وقت بازار جانے کے لئے گھر میں کوئی نہیں ہے تو پڑوس سے مانگ لیا جاتا تھا' دوسرے دن لوٹانے کے لئے۔ دو دن ماں نے یہی کیا تھا' اس نے چھوٹے لڑکے کو اپنے بھائی کے پاس بھیجا تھا' لیکن یہ مہینے کا اخیر تھا۔ اور اب ان دونوں پڑوسیوں سے دوبارہ کیسے کہا جائے؟ اگر گیہوں واقعی مل سے پس کر آئے ہوتے تو کہنے میں ہچکچاہٹ نہ ہوتی' لیکن اب کیسے کہا جائے۔ جب فاقہ سامنے کھڑا ہے' اس نے نہیں کہا' یہ بھی نہیں کہا کہ شام کھانے کے لئے نہیں ہے' پتیل کا کوئی برتن بیچ دو۔ ماں خود اپنے الفاظ سے ڈرتی تھی' جیسے کہہ دینے پر یہ الفاظ حقیقت میں واقع ہو جائیں گے۔ اسے یہ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ رات جب وہ گھر آیا تو کھانا نہیں بنا تھا۔ کسی نے اسے بتایا نہیں' وہ سمجھ گیا۔ بچے بستر میں لیٹ گئے تھے۔ گھر پر موت کا خاموش سایہ معلوم ہوتا تھا' جیسے یہ گھر موت کا انتظار کر رہا ہو یا موت اس میں سرایت کر چکی ہو۔ بہن لیمپ کو پاس رکھے مشین سے کچھ سی رہی تھی' مشین کی آواز' لیمپ کی مدھم روشنی' دیواروں پر سائے' اندھیرا' خوف' کمرہ سہما سہما سا معلوم ہوتا تھا۔

"کھانا نہیں بنایا؟" اس نے خود ہی کہا۔

"نہیں" بہن نے آہستہ سے جواب دیا۔

ایک لمحے تک وہ کھڑا رہا' اور بے بس غصہ اس میں ابھرنے لگا۔

"تو مجھ سے کیوں نہیں کہا تھا" وہ چلا کر بولا۔

کسی نے جواب نہیں دیا۔ بہن مشین چلاتی رہی' ماں سامنے رکھی ہوئی انگیٹھی کی راکھ میں سے چنگاریاں کو کریدتی رہی۔

"میں تو نہیں گیا تھا" اس نے اندر جاتے ہوئے کہا۔

"تو کیا کر لیتا آخر" ماں نے دکھی سی آواز میں کہا' جیسے وہ ان الفاظ کی تلخی سے اسے بچانا چاہتی ہو' جیسے وہ جانتی ہو کہ یہ الفاظ کتنی بے بسی کا احساس کراتے ہیں۔

وہ کپڑے اتارنے کے لئے اندر چلا گیا۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا' وہ اپنے لوگوں کو فاقے سے بھی نہیں بچا سکتا۔ اس سے بہتر ہے کہ انسان خودکشی کر لے' اس نے سوچا' بہتر ہے کہ زندگی ختم ہو جائے۔ اس بے بسی اور ذلالت میں جینے سے مر جانا کہیں بہتر ہو گا۔

کپڑے اتار کر وہ بستر میں لیٹ گیا' دل میں برانگیختگی سی پھیل گئی تھی جو لاچاری سے ٹکرا کر غصے کی شکل اختیار کرتی گئی۔ اس نے بہن کی طرف دیکھا جو دانت سے دھاگہ توڑ رہی تھی۔ لیمپ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی' اس کے چہرے پر اداسی تھی لیکن اس اداسی کو کام پر توجہ نے ہلکا کر دیا تھا۔ وہ کام کر رہی تھی' ان سب کے لئے' اس کے لئے۔ اس کے دل میں بہن کے لئے درد کی ایک لہر سی آئی اور محبت کی ۔۔۔ نہیں' وہ ذلیل ہے' کیا نوکری کے علاوہ وہ اور کچھ نہیں کر سکتا' وہ کرنا نہیں چاہتا' وہ بازار میں

جاکر ایک مزدور بن سکتا ہے، لیکن ــــــــ

ماں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے بہن سے بھی سو جانے کو کہا اور اپنی چارپائی پر چلی گئی۔ تھوڑی دیر تک مشین چلتی رہی، پھر بند ہوگئی۔ کچھ دیر وہ کپڑوں کو تہ کرتی رہی پھر اس نے مشین کا ڈھکنا بند کیا اور لیمپ بجھا دیا۔ اندھیرا ہو گیا۔ اس نے بہن کو بستر پر جاتے ہوئے سنا۔ وہ لیٹ گئی، پھر ایک لمبا سانس ــــــــ

دیر تک وہ اندھیرے میں آنکھیں کھولے بستر پر پڑا رہا، پھر اس نے ماں کے آہستہ آہستہ سسکنے کی آواز سنی، وہ رو رہی تھی، یہ بھوک نہیں تھی جو اسے رُلا رہی تھی، یہ شرم تھی، اس فاقے کی شرم تھی، یہ بھی ہونا تھا، یہ دن بھی آنا تھا، یہ دن جو اس گھر کی تاریخ میں کبھی فراموش نہ ہوگا۔ ایک فاقہ کتنا اجنبی معلوم ہوتا تھا، انہوں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا اور یہ واقعہ ہو گیا تھا، فاقہ، کھانا کھائے بغیر سو جانا۔ کھانا کھائے بغیر سو جانا کوئی بات نہ تھی لیکن فاقہ، جب گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہو، فاقہ!

ماں کی سسکیاں معدوم ہو گئیں اور وہ ایک مغلوب غلام کی طرح پڑا رہا، پھر اس نے درد کے خلاف احتجاج محسوس کیا اور شدت اس کے جذبات میں ابھرنے لگی۔ وہ کیوں ایک اپاہج کی طرح چارپائی پر پڑا ہے۔ کیا وہ کچھ نہیں کر سکتا، نہیں، وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ کسی نے اس سے یہ نہیں کہا کہ شام گھر میں کھانے کو نہیں ہے، وہ سب جانتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اسے اپنے آپ سے ایک دکھ بھری نفرت ہو گئی، وہ بے بس ہے لاچار ہے، اس شہر میں، ان سب واقفوں کے سامنے وہ کسی بلند عمارت کی تعمیر میں پتھر نہیں اٹھا سکتا، کوئی اور نچلا کام نہیں کر سکتا، یہاں وہ صرف کلرکی کرنے کے قابل ہے، یا بچوں کو پڑھا سکتا ہے لیکن نہ کلرکی ہے نہ بچے، اور وہ ایک زائد بوجھ بن کر اس گھر پر پڑا ہوا ہے بہتر ہے کہ وہ اس گھر کو چھوڑ دے ...... ہاں بہتر ہے کہ وہ اس گھر کو چھوڑ دے یہاں سہارا دینے کی بجائے وہ ایک بوجھ ہے۔ باپ بڑھاپے کے ہاتھوں کی لرزش کے باوجود چالیس روپے کماتے ہیں، بہن پر جو ان سب کے لئے مزدوری کرتی ہے، اور وہ آرام پہنچانے کی بجائے صرف تکلیف کا باعث ہے۔ بہتر ہے وہ یہ گھر چھوڑ دے۔

اور اس رات اس نے گھر چھوڑ دیا۔

بارہا پہلے بھی وہ اس بات کو سوچ چکا تھا، لیکن اب تک اسے ملتوی کرتا رہا تھا ان سب کو چھوڑ جانے پر وہ خود کو تیار نہ کر پاتا تھا، اب وہ انہیں چھوڑ آیا تھا۔ ویٹنگ روم میں اب خاموشی چھا گئی تھی کسی کسی جگہ کوئی بول رہا تھا، جیسے وہ خاموشی کو پُر کرنے کی کوشش ہو، چند لوگ اپنی گٹھڑیوں کا سہارا لگائے سوتے ہوئے تھے، چند لوگ اپنی گٹھڑیوں کی وجہ سے جاگ رہے تھے، ویٹنگ روم میں جلتے ہوئے سوتے ہوئے لوگ آدمیوں سے زیادہ سامان معلوم ہوتے تھے۔ وہ بنچ پر اٹھ بیٹھا بیٹھنے سے سردی کم محسوس ہو گی۔ لیٹ کر جسم کی تمام لمبائی میں سردی سرایت کرتی جا رہی تھی، اگر ویٹنگ روم میں ایک طرف بھی پوری دیوار ہوتی تو مسافر اس سردی سے بچ جاتے، مسافر، اس نے سوچا، وہ آخر کب تک اس مسافر خانے میں آ کر سو سکے گا، کون جانے! اسے عدم وثوق کے سبب ایک مایوسی سی ہونے لگی۔

اور وہ لوگ جنہیں دو دن پہلے وہ ایک فاقے کی رات کو چھوڑ آیا ہے۔ اس صبح کو کیا ہوا ہوگا۔ اس فاقے کی صبح کو کیا ہوا ہوگا جب انہوں نے اُسے بستر پر نہ پایا ہوگا۔ شام تک وہ ایک خوف زدہ فکر میں منتظر رہے ہوں گے اور لگے دن بھی۔ اور ماں روئی ہوگی اور بہن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہوں گے، اور بچے اور والد صاحب ــــ لیکن وہاں رہ کر وہ کیا کرتا، اس نے سوچا، وہ رو کر چپ ہو جائیں گے صبر کر لیں گے، اور وہ صبر امید کی شکل اختیار کر لے گا، امید کہ وہ واپس آئے گا۔ لیکن اس صبح کو کیا ہوا ہوگا، وہ بھوکے نہیں رہے ہوں گے، لیکن لوگ بھوکے رہتے ہیں، نہیں نہیں کوئی انتظام کر لیا ہوگا، اس نے خود کو تسکین دیتے ہوئے سوچا، اتنے لوگوں کے ہوتے ہوئے وہ بھوکے نہیں رہ سکتے ــــــ وہ بنیا ــــ!

پچھلے دو مہینے سے مکان کا کرایہ نہیں دیا گیا تھا اور مالک مکان کا کارندہ نوٹس دے گیا تھا کہ مکان خالی کر دو۔ مکان خالی کرنے میں کوئی دقت نہ تھی لیکن اسے چھوڑ کر کہاں جائیں، ہر جگہ روپے کی ضرورت تھی، رہنے کے لئے روپے کی ضرورت تھی۔ جینے کے لئے روپے کی ضرورت تھی اور روپیہ نہیں تھا، اور ماں بیمار تھی اور مکان والے نے نوٹس دے دیا تھا۔ بیمار ماں نے اس کی خوشامد کی تھی کہ وہ مالک مکان سے مل آئے، بستر پر لیٹے ہوئے نحیف آواز میں اس نے کہا تھا۔ کہ مکان دار سے کہنا ایک مہینہ اور ٹھہر جائے۔

اور سیٹھ نے چوان کی نے کو اپنے منہ سے لگاتے ہوئے کہا کہ مہلت ہے تو مہینہ بھر کی دے دیں، اگلے مہینے تک نوٹس واپس نہیں لیا گیا اور سیٹھ کے گھر سے باہر آ کر اس کے سینے میں غصے کا زہر پھیل گیا۔ وہ سیٹھ کو مار ڈالنا چاہتا تھا لیکن بے بس تھا۔ اس زمین پر زمیندار کیوں ہیں، لگان دار کیوں ہیں، مہاجن کیوں ہیں؟ اس نے سوچا انسان صرف انسان کیوں نہیں، کسی ایک شخص کو جائداد بنانے کا کیا حق ہے کیوں دوسرے ایک انچ زمین سے محروم کر دئے گئے ہیں۔ اس طیش میں اس کا جی چاہا کہ ہر شے کو تباہ کر دے، عمارتیں ٹکرا کر گر پڑیں ــــــــ اور وہ ان کے ملبے پر ناچے!

(بقیہ بر صفحہ ۳۲)

رام پرکاش اشک

خوں بھرے پرچم کے نیچے

راج محل میں آگ لگی رے!!
آگ لگی رے آگ!

مزدوروں کے خوں سے بنی تھی راج محل کی شان
نردوشوں کے کندھوں پر تھا ان سب کا بھگوان
جلتا —— جاگ اٹھی رے جاگ
آگ لگی رے آگ !!

!!

دھنیوں نے انیائے کیا تھا
پرجا کا دھن لوٹ لیا تھا
دکھیاروں کا خون پیا تھا
ایکا کرکے ٹوٹ پڑے ہیں زہری 'کالے' ناگ
آگ لگی رے آگ

آج مچے گا اندھیارے میں ہلڑ اور نراج
کل کا سورج دیکھے گا دھرتی پر پرجا راج

جاگے دیش کے بھاگ
آگ لگی رے آگ

قیصر

فردوس تخیل

جب کہیں گرتا ہے پیسہ کسی رہرو کا کبھی
سوچنے لگتا ہوں پیسہ نہیں میرا ہی تو ہو
اور پھر کیسہ مفلس کی حقیقت کیا ہے
ایک بربط کا ڈھیر جس میں کوئی تار نہ ہو
میرے ٹوٹے ہوئے جوتے ہیں اسی کے غماز
جھانکتا رہتا ہے جن سے میرے جوتوں کا غبار
جگمگاتے ہیں ہر اک سمت دوالی کے چراغ!
میں بھی بجھتے ہوئے دیپک سے لئے بیٹھا ہوں
کیوں نہ افلاس کی دیوی کی پرستش کرلوں
اپنے آلودہ سے ہاتھوں سے لگا دوں ٹیکا
جن میں حسرت کی سیاہی کے سوا کچھ بھی نہ ہو
ایک صاحب کا وہ بل ڈاگ جو کل دیکھا تھا
کار میں حور کی آغوش بستر تھی جسے
دودھ اور شہد پیا کرتا ہے ہر صبح و مسا
رزق کی فکر سے آزاد ہیں اس کے لمحات
اس تعیش میں کوئی وعدۂ فردا بھی نہیں
لاغری اس کے مثاپے کی قسم کھاتی ہے۔
اس کے جبڑوں میں میرا گوشت بھی ہے، خون بھی ہے
ذہن کی سطح پہ ادراک کا بھونچال آیا
طاقِ دل سے مرے بوسیدہ سی تحریر گری
اس میں لکھا تھا کہ —— تو اشرف مخلوق بھی ہے۔
مجھکو تخیل کی فردوس عطا کی تم نے
تیرا آزوقہ مگر سوکھے ہوئے ٹکڑے ہیں
ایک افیونی نے افیوں کی قسم کھا کے کہا
یوں تو افیون کی تلخی ہے بہت زہرہ گداز
تلخئ زیست کو تھوڑا سا بھلا دیتی ہے

سری نواس لاہوتی

اشتراکی روس کی مسلم خواتین

لینن نے زاری روس کو بجا طور پر قومیتوں کا زندان کہا تھا۔ زاری روس کی وسیع حدود میں مختلف قومیتوں اور مذاہب کے لوگ بستے تھے یوکرینی۔ جارجین۔ ترکمان بتغل۔ کزاق جرمن یہودی اور حبشی مزید برآں عیسائیت کے پیرو جس میں کچھ کلیسائے یونان کے ماننے والے تھے جو فلسطین سے شمع ہدایت حاصل کرتے تھے۔ بدھ مت اور اسلام کے پیرو بھی موجود تھے سوویٹ یونین اس صورت حال سے پیدا ہونے والے گوناگوں اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوئی جس کا ثبوت اس حقیقت سے ملتا ہے کہ سوویٹ یونین کے تمام لوگ جرمن حملے کے مقابلہ میں جسم واحد کی طرح کھڑے ہوئے ہیں۔ نسلی یا مذہبی اقلیتوں کی طرف سے مخالفت میں ایک لفظ بھی سنائی نہیں دیتا۔ ہندوستانیوں کو جو آجکل اپنی سیاسی بصیرت کو اقلیتوں کے مسئلہ کی وجہ سے تاریک پاتے ہیں۔ روس کی صورت حال کا مطالعہ کرنے کی سخت ضرورت ہے مسلمانوں نے جزو ترکیبی کی حیثیت سے روس کی معاشی اور معاشرتی زندگی کے سنوارنے میں جو نمایاں حصہ لیا ہے اس کے متعلق مفروضہ قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں وہاں ان کی ایسی وحدتیں ہیں جو ایک ہی زبان بولتی ہیں اور بلحاظ تہذیب تمدن ایک ہیں۔ کوئی فرد اپنے آپ کو عیسائی اور مسلمان نہیں گنتا بلکہ ترکمان یا تاجیک یا روسی کہتا ہے حالانکہ آجکل اور انقلاب سے پہلے۔ روس کے بہت سے علاقے ایسے تھے جہاں مسلمان اکثریت میں ہے۔ مغربی اور وسطی ایشیا میں مسلمانوں کی تعداد تقریبًا ۵ کروڑ تھی۔ سوویٹ یونین کی سولہ جمہوریتوں میں سے ۷ جمہوریتیں ایسی ہیں جن کے پس منظر میں اسلامی تہذیب موجود ہے۔ آذربائی جان۔ قازقستان۔ ازبکستان۔ ترکمانستان۔ تازکستان۔ کرغزیا اور تغفانہ کی جمہوریتوں میں اسلام کو بحیثیت مذہب برتری حاصل ہے۔ بسرابیا اور تاتاریا کی خود مختار سوویٹ ریاستوں کا بھی یہی حال ہے۔ کریمیا کی سوویٹ جمہوریت کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب بہت تھوڑا ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ ان جمہوریتوں کا محل وقوع ہندوستان کے سرحدی سلسلہ پر واقع ہے۔ آج بھی بخارا۔ سمرقند۔ تاشقند کے پٹھانوں اور شمالی ہند کے لوگوں میں تعلقات قائم ہیں۔ زار روس کے عہد میں ان علاقوں پر بخارا کے امیر صوبے "یا تبگ" (تر کی گورنر کو "بے" یا بیگ کہتے ہیں) حکمران تھے۔ جو خود روسی دفتری حکومت کے ملازم تھے

زار روس کی حکومت جو ماسکو اور پیٹرو گراڈ میں براجمان تھی۔ اپنے خزانے پر کرنے کے لئے ان زرخیز اور بیش قیمت خطوں کا بڑی بے دردی سے استحصال کیا۔ سماجی اور تہذیبی

[illegible]

مسلم قومیتوں میں عورت کا درجہ انتہائی غیر اطمینان بخش تھا۔

ان علاقوں میں نام نہاد اسلامی حکومت کے دور میں لڑکیاں کنیزوں کی طرح فروخت کی جاتی تھیں اور کھلے بازاروں میں شادی کے لئے ان کا مبادلہ ہوتا تھا گھر کی عورتیں زیادہ تر چہار دیواری میں محصور رکھی جاتی تھیں۔ اور جب کبھی مجبورًا باہر جانا ہوتا تو گھوڑے کے بالوں کی دبیز نقاب استعمال کیا کرتی تھیں۔ ان عورتوں کے لئے تعلیم ایک نامعلوم شے اور سیاسی یا شہری حقوق سے ان کے کان ناآشنا تھے تاتاروں کے قبیلہ میں لڑکے کو قزاق سے مخاطب کیا جاتا تو لڑکی کو صرف کنیز کا نام دیا جاتا تھا۔ لڑکیوں کے پیدا ہونے پر قتل کر دینے کا ان میں عام رواج تھا۔ اگر ان میں خریدنے کی استطاعت ہوتی تو وہ چار یا اس سے زیادہ بیویاں بطور باندیوں کے رکھ سکتے تھے اس سلسلہ میں ان پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی۔ ڈاکٹر "فینا ہل" اپنی کتاب "مشرقی سوویٹ کی عورتیں" میں لکھتی ہیں کہ عورتیں ایک طرف شہنشاہیت کی غلام تھیں۔ تو دوسری طرف مردوں کی باندیاں سمجھی جاتی ہیں۔ جہالت۔ تعصب اور روایات پرستی کے خلاف انہیں جنگ کرنا پڑتی تھی

آج سے پچیس سال قبل انقلاب رونما ہوا۔ اور جمہوریہ روس نے اپنے ملک والوں کی تعلیم حاصل کرنے اور اپنی روزی کمانے کی نہ صرف آزادی لی۔ بلکہ اس کی ضمانت بھی کر لی۔ روسی عورتوں کو آزادی دلانے کے لئے متعدد قوانین جاری کئے گئے سوویٹ حکومت نے اپنے ایک اولین حکم میں یہ اعلان کر دیا کہ وہ ملک کی تمام ماؤں اور تمام بچوں کی حفاظت اپنے ذمہ لیتی ہے جمہوریہ روس کی عورتوں کو معاشی معاشرتی اور سیاسی زندگی کے تمام حقوق مردوں کے مساوی دے دئے گئے ان حقوق کو روبہ عمل لانے کے لئے عورتوں کو ان کے کام کے عوض مردوں کے برابر کی اجرت اور دیگر آسانیاں ملنے لگیں۔ زمانہ حمل اور بعد وضع حمل پوری تنخواہ کے ساتھ رخصت دی جانے لگی یعنی (۳۵) دن زچگی سے قبل اور (۲۸) دن زچگی کے بعد۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے وہ یہ کہ عورت کو ماں ہونے کے بعد حکومت کی طرف سے مدد ملتی ہے یعنی جو عورت ماہانہ (۳۰۰) روبل (ایک روبل ۸ آنہ کے مساوی ہوتا ہے) کماتی ہے۔ تو اسے بچے کی پیدائش کے وقت (۴۵) روبل اور اس کے بعد اسے بچے کے (۹) مہینے ہونے تک ہر ماہ دس روبل دئے جاتے ہیں ۔۔۔ کے ساتھ ساتھ وسیع خاندانوں کی ماؤں کو جو امداد ملتی ہے ہم اس کو

بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مثلاً جب ایک عورت کے ساتواں بچہ پیدا ہوتا ہے۔ تو حکومت کی طرف سے اس بچے کو ایک سال کے ہونے تک ہر ماہ ۱۶۲ روبل دئے جاتے ہیں۔ اور اتنی ہی رقم آٹھویں اور نویں بچے اور دسویں بچے کی پیدائش پر دی جاتی ہے۔ روس میں بہت سے ایسے خاندان ہیں، جہاں اس سے بھی زیادہ بچے ہیں جب گیارہواں بچہ پیدا ہوتا ہے تو حکومت کی طرف سے پہلے سال ۵۰۰۰ روبل بطور امداد دئے جاتے ہیں اور پھر دوسرے سال سے پانچ سال کے ہونے تک انہیں سالانہ ۳۰۰ روبل ملتے ہیں۔ اس سے ہم اندازہ لگا سکیں گے کہ روسی مائیں کتنی آرام سے زندگی بسر کرتی ہیں۔ لیکن ان تمام معاشرتی قوانین کا نفاذ مشرقی روس کی عورتوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے کوئی آسان کام نہیں تھا وہ اس مساوات اور آزادی کو سمجھنے سے قاصر تھیں جبکہ وہ صدیوں سے غلامی کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ اور اپنے کٹر مذہبی اعتقادات کی وجہ سے وہ خود بھی پرانے توہمات اور قدیم جکڑبندیوں کو ترک کرنے کی ہر ایسی تحریک کی مخالفت کرتی تھیں۔ اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لئے حکومت نے محسوس کیا کہ پہلے عورتوں کو تعلیم دینے کی ضرورت ہے تاکہ ان میں آزادی کا احساس پیدا ہو۔ جلد سے جلد تعلیم کو عام کرنا تھا۔ اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ مشرقی لوگوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دی جائے۔ ہر ایک جماعت کے لوگوں کو اپنے مدرسے بنانے اور اپنی مادری زبان میں دفتری کاروبار انجام دینے کے قانونی حقوق عطا کئے۔ سوویٹ حکومت نے یہاں تک کہہ دیا کہ جہاں کہیں بیس گھروں کی ایک ہی زبان ہو وہاں اس زبان کا مدرسہ کھولا جا سکتا ہے۔ بہت سے فرقے جو دریائے والگا کے کنارے یا پہاڑی گھاٹیوں پر رہتے تھے اور جن کی زبان ضبط تحریر میں نہیں لائی جا سکتی تھی۔ ان کے لئے کتابیں اور رسالے نئی لکھی ہوئی زبان میں مرتب کئے گئے پھر بھی پردہ نشین عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دینے میں دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا ——— یہ کام نوجوان اور پرجوش سیاسی کام کرنے والی عورتوں کے سپرد کیا گیا جو شہر شہر اور ہر گاؤں میں جا کر تعلیم کا پرچار کرتی تھیں۔ چند واقعات ایسے بھی ہیں جہاں مسلمان عورتیں کھلی جلسوں میں شریک ہونے سے گریز کرتی تھیں۔ کیونکہ وہاں لڑکیوں کو بے نقاب ہو کر تقریریں کرنے کا موقع دیا جاتا تھا چنانچہ ان پرجوش لڑکیوں نے ایسے کلب بھی قائم کئے جہاں پڑھنے کا معقول انتظام ہوتا تھا۔

اس نئے نظام کا دوسرا اہم پہلو بچوں کی صحت اور ان کی دیکھ بھال کا بندوبست تھا ان علاقوں میں جہاں دواخانے بہت کم اور بہت دور تھے۔ اور زچہ خانوں کا تو وجود بھی نہ تھا نرسوں، ڈاکٹروں اور سفری دواخانوں اور عوام کے لئے مفت طبی امداد کا انتظام کر کے حکومت نے ان کے دلوں کو مسخر کر لیا۔ ان واقعات نے بے اطمینانی اور ہچکچاہٹ کو دور کر دیا۔ یہ مشرقی عورتیں علاج کروانے آتیں اور ترقی کا نیا جذبہ اپنے دلوں میں لے کر واپس ہوتیں اور وہ اپنے میلی آنکھوں اور بڑے پیٹ والے بچوں کو خوب رو اور تندرست جوانوں میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھ کر محسوس کرتیں کہ ان کی حکومت ایک اچھی حکومت ہے۔

تیسری چیز جس نے ان مشرقی عورتوں کے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کی سوویٹ کا صنعتی لائحہ عمل تھا۔ کارخانوں بر قابی اسکیموں اور نہروں کا جال ملک میں پھیلا دیا گیا یہ تمام چیزیں عورتوں کو فائدہ اٹھانے اور روزی کمانے کی دعوت دے رہی تھیں۔ نہ صرف ان کو مردوں کے برابر تنخواہ اور مساوی مزدوری ملتی تھی بلکہ ان کو ہر پیشہ کی تعلیم حاصل کرنے کی آسانیاں مہیا کی گئیں۔ وہ سکول کی معلمہ اور ڈاکٹر سے کر طیارچی۔ (انجن ڈرائیور دنیا میں سب سے پہلی انجن ڈرائیور عورت روس کی ایک مسلمان خاتون ہیں۔) ماہر سائنس اور فن کار تک بن سکتی تھیں۔ اس اثنا میں ان کی صحت کا خیال۔ غیر موزوں کام کی ممانعت اور بچے کی پیدائش سے پہلے اور بعد پوری تنخواہ کے ساتھ دو مہینے کی رخصت ملنا لازمی قرار دے دیا گیا۔

آج کل روس کی مسلمان خواتین سائنس داں، ادیب، سیاست داں اور نئی دنیا کی معمار ہونے کے علاوہ زندگی کے ہر شعبہ میں مردوں کے دوش بدوش چل رہی ہیں ان کی اس پچیس سالہ ترقی کا اندازہ ان چند حقیقی اعداد سے مل سکتا ہے۔ ہم مثال کے طور پر صرف دو جمہوریوں کے اعداد پیش کرتے ہیں جو انقلاب روس سے قبل انتہائی پسماندہ سمجھی جاتی تھیں۔

آزربائی جان میں عام پڑھی لکھی عورتوں کی تعداد انقلاب سے پہلے ۳ فیصدی تھی۔ لیکن آج ۹۰ فیصدی مسلمان عورتیں پڑھی لکھی پائی جاتی ہیں۔ ازبکستان میں جامعات کی فارغ شدہ مسلمان خواتین کی تعداد ۴۰۰۰ سے زیادہ ہے۔ بچپن کی شادی اور ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اب پردہ ——— عجائب گھر کی زینت بن چکا ہے۔ اس وقت ۹۴ خواتین ازبک مجلس اعلٰے کی رکن ہیں۔ ۴۰۰ عورتیں اجتماعی مزرعوں کی صدر نشین ہیں۔ ۳۵۰۰ عورتیں صنعتی کام انجام دے رہی ہیں۔ ۱۲۰۰ عورتیں ڈاکٹر اور ۵۰۰۰ معلمات اور ۱۳۸ عدالتہائے عامہ کی جج ہیں۔

ذیل میں ان چند مسلم خواتین کے نام درج کئے جاتے ہیں جو تمام سوویٹ یونین میں مشہور اور ممتاز مانی جاتی ہیں۔

رر کبرا فرازہ، آزربائی جان کے محکمۂ صحت عامہ کی ناظم ہیں۔ بدبختی الیسا یوا ترکمانستان کی برقی صنعت کی ناظم ہیں۔ بیجناس عبدالعلی قاضی موجودہ سوویٹ مجلس اعلیٰ کی نائب صدر

ہیں۔ یہ خاتون ۱۹ سال کے ہونے تک پردہ نشین تھیں۔ "نوری کاراجیوا" نوجوان خاتون ہیں جو جمہوریہ ترکمان کی عدالت العالیہ کی میر مجلس ہیں۔ "نوری" بہ نو عمر ہی تھیں کہ ان کے والد نے ان کو ایک بوڑھے کے ہاتھ سترہ اونٹوں کے عوض فروخت کر دیا تھا۔

ابھی حال ہی میں ماسکو میں کل روس خواتین کانفرنس کا انعقاد ہوا تھا۔ اس کانفرنس میں مسلم خواتین نے بھی نمایاں حصہ لیا۔ ہم اُن چند مسلم خواتین کی تقریروں کے اقتباسات درج کرتے ہیں اس سے پتہ چلے گا کہ وہ اپنے ملک کی حفاظت کے لئے اس عوامی جنگ میں کس طرح حصہ لے رہی ہیں۔ "آگالاروروا" جو آذربائی جان کی مسلم خاتون ہیں فرماتی ہیں "۱۹۱۷ء کے انقلاب سے قبل ہمارے منہ بند تھے لیکن نومبر کے انقلاب نے ہمیں وہ سب کچھ عطا کیا جس کی ہم مستحق ہیں۔ اس انقلاب کے بعد سے ہم آزادی اور مساوات کی زندگی بسر کر رہے ہیں جس کی مثال ہمارے ماضی میں مشکل ہی سے ملے گی۔ میں اپنا حال سناتی ہوں میں ایک جاہل کسان گھرانے میں پیدا ہوئی۔ میرا بچپن اور نو عمری پردے میں گذری میں اس پردے میں سے اپنے ایک پڑوسی انجینئر کے کاموں کو بڑی حیرت کے ساتھ دیکھا کرتی تھی۔ آج سے سولہ سال قبل جب میری پہلی لڑکی پیدا ہوئی ہے میں بالکل ناخواندہ تھی لیکن سوویٹ حکومت نے مجھے تعلیم یافتہ بنایا آج میں خود انجنیر ہوں۔ میرے بچپن کے خواب آج پورے ہو رہے ہیں۔ میں مدافعت وطن اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ اس طرح سے ازبکستان کی "کریمہ" نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "انقلاب سے قبل ہمارے گلے میں غلامی کا طوق پڑا ہوا تھا لیکن لینن اور اسٹالن نے ہمیں اس سے نجات دلوائی۔ نومبر کے انقلاب اور اس کے ثمرات کی حفاظت کے لئے ہم اپنے خون کے آخری قطرہ تک کو بہانے کے لئے تیار ہیں۔ ہم نازی لٹیروں کو ختم کر کے ہی چین سے زندگی بسر کر سکتی ہیں۔ اس کانفرنس میں "دیرا انور" جو شاعرہ ہیں شریک ہوئی تھیں وہ کہتی ہیں "یہ جنگ ہمارے گانے کے سروں کو نہیں روک سکی۔ ہم آج برابر مخالف فسطائی گیت لکھ کر میدان جنگ میں لڑنے والے سُرخ سپاہیوں کے سینوں کو گرما رہی ہیں۔ آج ہمارا فرض اپنے ملک کی کامیاب مدافعت ہے"۔

اس حیرت انگیز تبدیلی اور ترقی کا راز لینن کے اس صحیح تدبر اور حکمت عملی کا نتیجہ ہے جس نے ہر قومی اقلیت اور ہر نسلی مجموعہ کو خواہ وہ کتنا ہی اقلیت میں کیوں نہ ہو۔ (چنانچہ کرغزیہ کی آبادی صرف ساڑھے تیرہ لاکھ ہے) حق خود ارادیت دے دیا تھا۔ لیکن یہ آزادی بجائے خود زیادہ کارآمد ثابت نہ ہو سکتی تھی۔ اگر تمام جمہوریتوں اور خود مختار علاقوں نے سوویٹ جمہوریت کی شاندار اور مستحکم عمارت کی تعمیر میں متحدہ جدوجہد ہم آہنگی

ظہیر کاشمیری

انقلابِ روس

یک بیک۔ سرخیٔ افکار کا لاوا پھوٹا
اسقف و زار کے دامن کو جلانے کے لئے
پا بہ زنجیر غلاموں نے کیا عزمِ جہاد
اپنی لاشوں پہ نئے شہر بسانے کے لئے

وقت کی ڈوبتی نبضوں میں حرارت آئی
زرد چہروں نے لیا قوتِ شاہی سے خراج
ایک مجبور سی تدبیر بدل سکتی ہے
خوف و بیداد کا راج۔ آتش و آہن کا رواج

ابن آدم کی حمیت نے سنایا پیغام
"اب نہ دربار میں بکنے کی ضرورت ہوگی
کوئی فرعون اگر تیغ پہ اترائے گا۔
آشتی کا یہ تقاضا ہے بغاوت ہوگی

روس! یہ دور تیرے نام سے پائندہ ہے
تیرے بیٹوں نے کیا نعرۂ جمہور بلند
ظاہراً قافلۂ مور و ملخ تھے لیکن
ڈالدی قصرِ سلیماں پہ عزائم کی کمند

ابراہیم جلیس

جیب

بی۔اے پاس کرنے کے بعد میری زندگی اس خوبصورت لڑکی کا پیکر اختیار کر گئی جو جوان ہو چکی ہو اور جس کا ایک ایک عضو دعوتِ لمس دے رہا ہو مگر جس کا کوئی عاشق نہ ہو۔ میں نے اونچی اونچی کھپریلوں سے لے کر بڑے سے بڑے محلات میں اپنا یہ کاغذ کا پرزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ میرا دماغ علم کے خزانوں سے مالا مال ہے۔ میرے بازوؤں میں دس دس گھنٹے تک لکھتے رہنے کی طاقت ہے۔ میری آنکھیں بارہ بارہ گھنٹے تک کتابیں پڑھ سکتی ہیں۔ اونچی سے اونچی کھپریلوں نے جواب دیا۔

"ایک کلرک کی جائداد ہے ——— تنخواہ تیس روپے"

بڑے سے بڑے محلات سے جواب ملا۔

"لڑکیوں کو ٹیوشن پڑھاؤ۔ تنخواہ بیس روپے۔"

یہ کیسا مذاق ہے۔ جب تک یونیورسٹی میں پڑھتا تھا میرا باپ مجھے پچاس روپیہ بھیجا کرتا تھا یعنی تیس روپے مثبت بیس روپے۔ اپنی طالب علمی کے ان بارہ پندرہ سالوں میں میں نے کتنے ہزار روپے پانی کی طرح بہا دیئے ہیں۔ اتنی مہنگی تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہ تیس اور بیس روپے کا مسخرہ پن۔ کہاں میں ایک ہزار کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ اونچے سے محل میں ایک خوبصورت بیوی قیمتی موٹر میں دریا کا کنارہ۔ اب یہی اونچے محل میرا منہ چڑا رہے ہیں اور یہی قیمتی موٹریں طنز سے مسکراتی قریب سے گزر جاتی ہیں اور میں گھبرا کر ایک میلی کچیلی بھکارن سے ٹکرا جاتا ہوں ——— میری خوبصورت بیوی۔ وہ بھی مسکرا دیتی ہے یعنی میرا منہ چڑا دیتی ہے اور میں دل ہی دل میں اپنی مٹی پلید کرنے والے شکسپیئر، ٹالسٹائی، ہیگل اور کارل مارکس کو گالیاں بکنے لگتا ہوں۔

میں نہ بیس روپے کی نوکری کروں گا نہ تیس روپیہ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھوں گا۔ مجھے کم سے کم چار سو روپیہ کی نوکری چاہئے۔ ورنہ پھر یونیورسٹی کی عمارت کو ڈھا دینا چاہیئے .... ہر کھاتے پیتے خوشحال آدمی کو طرح طرح کی روحانی اور جسمانی اذیتیں پہنچاؤں گا۔

ایک وسیع کنبہ۔ بوڑھی ماں اور باپ۔ دس ننھے ننھے بھائی چیخ رہے ہیں کہ ہمیں بھوک لگ رہی ہے ہمیں سردی لگ رہی ہے۔ مگر میں تو نہ رزاق ہوں نہ ستار۔ میں ان کی ٹھوڑیاں پکڑ کر آسمان کی طرف اٹھا دیتا ہوں ——— میرے پاس کچھ بھی نہیں بجز کچھ بھی نہیں۔ صرف ایک ضمیر ہے۔ اس کو بھی چار سو روپے کے عوض بیچ دینا چاہتا ہوں۔ میرا کنبہ اب تک میری طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے میں بھی کوئی آسمان ہوں ——— بلاشبہ میں آسمان ہوں۔ دلفریب رنگوں کا مجموعہ ——— اور کچھ بھی نہیں۔ بجز کچھ بھی نہیں۔

ایک دن میری بوڑھی ماں نے کہا۔

"بیٹا۔ زمانہ نازک ہے۔ تیس روپے ہوں یا بیس روپے۔ نوکری کر ہی لو۔"

اپنی عمر میں بالکل پہلی بار میں نے اپنی ماں کے شفیق بڑھاپے کو بھی دھتا بتائی۔ لال لال آنکھوں سے گھورتے ہوئے اس کو گالی بھی دے دی۔ جیسے وہ اب ماں نہیں رہی ہے بلکہ ایک بھکارن۔ اور اس کی ممتا گڑگڑاتی ہوئی بھیک

باپ نے سمجھا کہ وہ ایک جہاں دیدہ بزرگ ہے۔ وہ جو کہے گا سوچی سمجھی کہے گا۔ اسی لئے اپنا شفقت بھرا ہاتھ پیٹھ پر پھیرتے ہوئے روح کے اندھیرے میں ایک نئی شمع جلانی چاہی۔

"بیٹا ——— موت حیات خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جنگ میں بھرتی ہو جاؤ۔"

میں نے چھوٹتے ہی جواب دیا۔

"ابا۔ میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تمہارا ہاتھ ان ابھری ہوئی ہڈیوں اور پسلیوں سے نہیں ٹکرایا جو منہ اٹھا کر تمہارے خدا سے فریاد کر رہی ہیں۔ میں کتابیں پڑھ پڑھ کر اب اتنا بزدل ہو گیا ہوں کہ ہاتھ میں صرف ایک ہلکا پھلکا قلم پکڑ سکتا ہوں۔ تلوار نہیں۔" اور پھر یکایک طالسطائی میرے دماغ میں جاگ پڑا اور ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے چیخنے لگا۔

"جنگ میں ایک انسان دوسرے انسان کا خون بہاتا ہے۔ تم بھی ایک انسان ہو۔ لعنت ہے تم پر۔"

لعنت بھیجو طالسطائی۔ تم اگر زندہ ہوتے تو تم سے سمجھ لیتا۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ تیس روپے۔ کاغذ کے تین پرزے۔ بیس روپے کاغذ کے دو پرزے۔ بی۔اے کی ڈگری کاغذ کا ایک پرزہ۔ پیدا ہونے سے آج تک نہ میں زندگی کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ نہ کسی درخشاں نصب العین کے پیچھے۔ میں صرف کاغذ کے پرزوں کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ جو جلد پھٹ جانے والا ناپائدار اور ہیچ سی چیز ہے۔

میرے ایک گریجوایٹ دوست نے جو لقبول براؤننگ چاندی کے چند سکوں کے بدلے ہم سے جدا ہو گیا۔ ایک دن مجھ سے کہا۔

"تمہیں اب صبر سے کام لینا چاہیئے۔ اس طرح بلبلانے سے فائدہ۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئے" میں نے اس کے کوٹ کا کالر پکڑتے ہوئے جواب دیا۔

میں پاگل یا تم۔ تم نے تیس روپلوں کے عوض اپنی زندگی اپنی اوقات اپنا ضمیر سبھی کچھ بیچ ڈالا۔ بی اے کی ڈگری کا نرخ دنیا کے بازار میں اتنا گرا دیا کہ ایک گریجوایٹ اور ایک ان پڑھ مزدور میں کوئی فرق نہ رہا۔ تم اور تمہارے جیسے سب مجھ جیسا عزم کر لیتے تو کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ پیسے کا کفر بھی ٹوٹ جاتا۔

اس نے گھبرا کر جواب دیا۔

بھائی میرے کوٹ کا کالر تو چھوڑ دو۔ مگر پہلے پیٹ . . . . .

میں نے حقارت سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

مگر میں تو انسان ہوں۔ کتا نہیں ہوں بھوک سے سسکتے مر جاؤں گا۔ اپنے آپ کو اتنے سستے داموں نہیں بیچوں گا۔ نطشے رومی اور اقبال نے خودی کے نظریئے پیش کئے تھے اب میں نمونہ پیش کروں گا۔

میں نے اس کے کوٹ کا کالر چھوڑ دیا جیسے کتے کے گلے کی زنجیر چھوڑ دی ہے۔ اس پر ایک قہقہہ لگانا چاہتا تھا مگر میں نے اپنی ساری ہنسی تو ہوسٹل کے کمرے میں اپنے دوستوں کے فضول مذاق پر صرف کر دی ہے۔ اب مجھے شدید احساس ہوتا ہے کہ کاش میں کچھ ہنسی اور قہقہے بچا کر محفوظ رکھ لیتا۔ اور اپنی ہنسی کے زہر سے ان کھاتے پیتے انسانوں کی زندگی اور روح میں بھی زہر ملا دیتا۔

ایک دن میرا چھوٹا بھائی بخار میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے ایک ڈاکٹر سے پوچھا۔

"اس کا علاج کر سکو گے؟"

اس نے جواب دیا "روزانہ دو روپیہ فیس"

میں نے جواب دیا "خدا کرے کہ یہی بخار تمہیں ہو جائے؟"

اس ڈاکٹر نے انٹرمیڈیٹ تک میرے ساتھ ہی تعلیم پائی تھی۔ اور اب ڈاکٹر ہو گیا تھا تاکہ دنیا سے بیماری کو دور کرے۔ مگر اس نے بیماری کے ساتھ ساتھ غریبوں کو بھی دنیا سے دور دفان کرنے کا ارادہ کر لیا ہے ـــــ خدا کرے کہ یہی بخار اس کو بھی ہو جائے۔

جانے میری دعا کیسے پوری ہو گئی۔ ڈاکٹر کو بھی ٹائیفائیڈ ہو گیا اور وہ حضرت عزرائیل کو دو روپے فیس بھی ادا نہ کر سکا۔

اس ڈاکٹر کی موت پر میرا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ جیسے میں نے اس دن خوب پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا ہو۔ میں اپنی قدرت پر اور کس طرح ناز کر سکتا تھا۔ اقبال نے خدا کے آگے

[illegible]

دیکھتے ہوئے یونہی طنزاً مسکراتے ہوئے کہا "تو اگر بڑے آدمی پیدا کر سکتا ہے تو میں انہیں مار سکتا ہوں" میرا دل اندر ہی اندر پکارنے لگا۔ تجھ میں جو ہیرے ہیں تجھ میں جو ہیرے مگر ہیں جو ہر سمندر کی تہ میں ایک سیپ میں بند ہے جنگل میں کھلے ہوئے پھول کی طرح مسکرا رہا ہے۔ یہاں نہ تو بلبل ہے اور نہ تم خود مسکراتے ہوئے کلی سے پھول بن جاؤ اور اپنی خوبصورتی کی آپ ہی تعریف کرو۔ اپنی خوشبو آپ ہی سونگھو اور جب تھک جاؤ تو مرجھا کر گر جاؤ۔

میری زندگی کے اور روتے ہوئے دنوں کی طرح ایک دن ایسا بھی آیا۔ جب میری ماں کا بڑھاپا موت کے دروازے پر ختم ہو گیا۔ انسان کے زندہ جسم کی بھی ایک قیمت ہے اور مردہ جسم کی بھی ایک قیمت۔ اس مردہ جسم کے لئے کم از کم دو گز کفن کی ضرورت ہے۔ اس دو گز کپڑے میں تین بچوں کی قمیصیں بن سکتی تھیں۔ ماں نے مرتے وقت اپنے بچوں کا حق بھی چھین لیا۔ مگر اس کا بھی کیا قصور۔ زندگی بھر تو وہ چیتھڑوں میں لپٹی رہی اب آخری وقت وہ ایک نیا اور ثابت کپڑا پہن لے تو کیا حرج ہے۔

ماں کی موت کے بعد کنبے کا ایک پیٹ تو کم ہو گیا مگر خدا کی رزاقیت اور ستاریت وہیں رہی۔ سات آسمانوں کے پرے۔

ایک دن بہت مجبور ہو کر میں نے اپنا عزیز ترین فونٹین پن بھی بیچ ڈالا اور ایک قینچی خرید کر فتو استاد کی شاگردی قبول کر لی۔ اس کے ٹھیک آٹھویں دن فتو استاد نے میری چابکدستی کی تعریف میں میری پیٹھ ٹھونکی۔

اور اسی شام کو میں بے مطلب ادھر ادھر بازاروں میں گھوم رہا تھا کہ ایک داڑھی والے مولانا ایک شوخ و شنگ نوجوان لڑکی کے ساتھ ایک جھگڑتے سینما کے احاطے میں داخل ہوتے نظر آئے میں ایک کلرک کے پاس پہنچا اور پوچھا۔

"لائیے ٹکٹ خرید لوں"

"نہیں۔ نہیں ہم خود لے لیں گے"

جب میں سینما کے احاطے کے باہر نکلا تو قینچی کو کوٹ کے اندر کی جیب میں محفوظ رکھتے ہوئے مولینا کی شیروانی کا جیب باہر نکالا۔ اس جیب میں ایک گندہ سا رومال تھا اور ایک سگریٹ کی ڈبیا اور ایک ماچس۔

دھت تیری مولانا کی . . . . . " میں نے سگریٹ کی ڈبیا میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگا یا۔ اور جیب اٹھا کر دور سڑک پر پھینک دی مگر ایک اڈھیڑ عمر بھکاری دوڑتا ہوا آیا اور اس جیب کو اٹھا کر وہیں سڑک پر بیٹھے اپنی میلی تار تار قمیص پر ٹانکنے لگا۔ میں نے سوچا۔ اس قمیص کو جیب کی کیا ضرورت ہے۔ یہ جیب بھی ایک دن بھول کر کیا ہو جائے گی۔ میں نے دوڑ کر اس سے وہ جیب چھین لی۔ جیسے اس بھکاری کو سرائے کی لعنت سے

ریاض رفقی

دوسرا کنارہ

ایک ادیب کے لئے ضروری نہیں۔ کہ وہ ایسے ادب کی تخلیق کرے جو مستقبل کی صدیوں کے لئے ہو۔ بلکہ اسے ایسے ادب کی تخلیق پر بھی قدرت ہونی چاہئے جو صرف ایک لمحہ کے لئے ہو۔ اگر اُس ایک لمحہ میں اس کی قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے ——— ایلیا اہرن برگ

فضا خاموش تھی ——— مگر اس خاموشی کے اجزائے ترکیبی چند میٹھے میٹھے شیریں گیت تھے۔ خاموش گیت ——— ابدی گیت ——— وہ گیت جو کائنات کی آفرینش کے ساتھ پیدا ہوئے ——— وہ گیت جنہیں خاموشی نے گایا۔ مگر وہ دکھی تھا۔ اس کی زندگی کے روشن ستارے پر ناکامیوں کی تاریک بدلیاں چھا چکی تھیں۔ فضا خاموش تھی۔ مگر فضا میں ایک درد بھرا نغمہ تیر رہا تھا۔ خاموشی کے ابدی گیت۔ درد و غم سے لبریز تھے ——— وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے دل کی طرح کائنات کا دل بھی آہستہ آہستہ دھڑک رہا ہے۔ اور یہ دھڑکنیں ایک المناک نغمہ فضا میں ہر طرف بکھیر رہی ہیں

سورج کی کرنیں شفق کی پیشانی پر اپنے وداعی بوسے کا نشان چھوڑ کر رخصت ہو رہی تھیں شفق شرما شرما کر مسکرا رہی تھی۔ اور کرنوں کے بوسے کے لطیف کیف کو اپنے رخساروں کی سرخیوں کو فضا میں بکھیر رہی تھی ——— آسمان پر دو ستارے مسکرا رہے تھے۔ یہ وہ بلانوش تھے، جو ساقی بزم کے آنے سے پہلے ہی بزم میں آجاتے تھے۔ اور سلتی کے جانے کے بعد رخصت ہوتے تھے۔

اور وہ دریا کے کنارے بیٹھا ایک دیہاتی ملاح کا گیت سن رہا تھا۔ دریا خاموشی کے ساتھ بہا جا رہا تھا۔ دریا کی سبک رفتار لہریں اور بیقرار موجیں کروٹیں لیتی ہوئی باہیں پھیلاتے ہوئے آتیں۔ اور ساحل سے ہم آغوش ہو جاتیں۔ اس اتصال سے ایک لطیف نغمہ پیدا ہوتا۔ جیسے کوئی صراحی سے پیمانے میں ارغوانی شراب انڈیل رہا ہو۔ اور پیہم انڈیلتا جا رہا ہو نہ ساقی تھکتا تھا۔ نہ میکش۔

کنارے کے درخت آہستہ آہستہ گنگنا رہے تھے۔ پرندوں کے جوڑے مغرب کی سرخیوں میں چھپتی ہوئی سیاہی کو محسوس کرتے ہی ایک ہلکی سی چیخ لگاتے اور اڑ جاتے۔ خاموش فضا کے جسم میں ایک جھرجھری پیدا ہو جاتی۔ مگر یہ ہلچل کی زندگی کی میعاد چند لمحوں سے زیادہ نہ ہوتی ——— اور پھر ابدی سکون ——— ابدی گیت ——— اور جیسے کوئی صراحی سے پیالے میں شراب انڈیل رہا ہو جیسے کوئی بیلا کے خوابیدہ تاروں کو مضراب سے چھو چھو کر اُن کے طویل خواب سے بیدار کر رہا ہو۔ وہی طویل لافانی خاموشی ——— دریا کی روانی کا خاموش ترانہ۔ لہروں اور ساحل سے پیدا شدہ خاموش موسیقی ہواؤں کی خراماں روی کا خاموش نغمہ۔ درختوں کے پتوں کی دھیمی دھیمی تال ——— اس طویل لافانی خاموشی میں تحلیل کردیئے گئے تھے۔

مگر وُہ اس وقت کنارے پر بیٹھا ہوا دکھ درد سے بھرا ہوا ایک راگ سن رہا تھا۔ ایک دیہاتی ملاح کا گیت ——— جس میں درد کی کسک تھی غم کی ٹیسیں تھیں۔ روح کی غمناکی تھی۔ اس نے محسوس کیا۔ کہ کوئی شخص اس کے خاکستر دل کی دبیز راکھ کو آہستہ آہستہ پھونک رہا ہے جس میں چند آتش ریز چنگاریاں محو خواب ہیں ——— پھر وہ چنگاریاں بیدار ہوئیں۔ اور آگ ہر طرف پھیلنے لگی ——— درد و غم کی آگ ——— آگ ساری فضا پر چھا گئی۔ اور ساری فضا میں ایک درد بھرا راگ تیرنے لگا۔ وہ راگ جو اس کے دل کی لرزشوں پر اس کی روح گایا کرتی تھی ——— ملاح گا رہا تھا ——— فضا درد و غم سے لبریز تھی اور اس کا دل ——— راکھ اڑ چکی تھی۔ وہ چنگاریاں رقص کر رہی تھیں ———

میری محبوبہ تو مجھ سے بچھڑ گئی۔
لیکن تیری یاد اب تک باقی ہے۔

یہی زندگی ہے۔
دریا کے دونوں کنارے۔
ایک دوسرے سے کتنی دُور ہیں۔
لیکن ایک پل ان دونوں میں رشتہ قائم رکھتا ہے
مصنوعی پل ٹوٹ جاتے ہیں۔
مگر محبت کا پل نہیں ٹوٹتا۔
میری محبوبہ تو مجھ سے بچھڑ گئی۔

کچھ ایسا مفہوم تھا اس گیت کا جو ملاح گا رہا تھا۔ وہ روزانہ شام کو ندی کے کنارے جاتا تھا۔ اور ملاح کو یہی گیت گاتے سنتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ملاح یہی گیت کیوں گاتا ہے۔ کیا اُسے کوئی اور گیت یاد نہیں۔ کیا یہی اس کا محبوب ترین گیت ہے۔ وہ یہ تمام باتیں سوچنا بھی نہ چاہتا تھا۔ مگر پھر بھی سوچتا تھا۔ اور ملاح روزانہ یہی گیت گایا کرتا۔ یہ گیت اس کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو جاتا۔ اس نے سوچا یہ ملاح بھی کوئی دکھیا

طرح مجروح الفت ہے۔ جب ہی تو ایسا درد بھرا گیت گاتا ہے۔ اس کی آواز اس کی روح کی زخم خوردگی کی غمازی کرتی ہے۔ وہ روز اس سے ملنے کے لئے سوچتا مگر نہیں ملتا۔ وہ زندگی سے بھاگ آیا تھا۔ وہ دنیا سے بھاگ کر آیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بھی اسی جیسا کوئی دکھی ہے وہ اس سے ملتے ہوئے ڈرتا تھا۔

جیسے جیسے شمع بزم انجم کی روشنی ہر طرف پھیلنے لگی۔ اس کے ذہن کے چند تاریک دریچے دھیرے دھیرے منور ہونے لگے۔ مدھم مدھم سی روشنیاں ان دریچوں میں جھلملائیں ان روشنیوں میں اس کا ماضی آہستہ آہستہ ابھرنے لگا۔ وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا مگر پھر بھی بھولے ہوئے واقعات ذہن کے پردے پر منعکس ہونے لگے۔

وہ کالج کی انقلابی جماعت کا رکن تھا۔ اس کے خیالات باغیانہ تھے۔ کالج میں وہ اپنے خیالات کی اعلانیہ اشاعت کرتا تھا۔ وہ عشق و محبت کے بارے میں بالکل خشک واقع ہوا تھا۔ وہ محبت کو ذہنی بیماری سے زیادہ اہمیت نہ دیتا تھا ——— عورتوں کی مکمل آزادی اور مساوی حقوق کا قائل تھا۔ وہ لڑکیوں سے بے باکانہ طور پر ملتا تھا۔ اور بغیر جھجک کے ان سے گفتگو کرتا تھا۔ اس کے دوست اُسے ایک خشک فلسفی سمجھتے تھے۔ وہ اپنے عقیدہ میں بڑی سختی سے پابند تھا۔ وہ لوگوں سے گھنٹوں بحث کیا کرتا۔ یہاں تک کہ بحث ناگوار حد تک طویل ہو جاتی۔ بحث کی ناخوشگواری دلوں کی ناخوشگواری بن جاتی۔ لوگ اس سے ملتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اُسے دیکھ کر کترا جاتے تھے۔ خوف کھاتے تھے۔ کوئی اس کا ہمدرد نہ تھا لیکن اُسے کسی سے ہمدردی کی توقع بھی تو نہ تھی۔ وہ خوش تھا اپنے خیالات کی دنیا میں ——— اپنے ہمخیالوں کی صحبت میں۔ لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ نرگس کا دل بھی اس سے ہمدردی رکھتی ہے۔ اس کی تعریف کرتی ہے۔ تو اُسے عجیب کوفت ہوئی۔ آخر وہ اس سے کیوں ہمدردی رکھتی ہے۔ اس میں کوئی ایسی خوبی تو ہے نہیں پھر کوئی اس کی کیوں تعریف کرے؟ ——— وہ اکثر نرگس کے متعلق سوچا کرتا۔ نرگس کا خیال اس کے لئے تکلیف دہ تھا۔ آخر وہ کیوں اس کے متعلق سوچے۔ اگر نرگس کو اس سے ہمدردی ہے تو وہ کیا کرے۔ ایک فضول سا مہمل سا خیال لیکن پھر بھی وہ اس کے متعلق سوچنے لگا۔ اس کی ہمدردیوں کا احترام کرنے لگا۔ اور آہستہ آہستہ اسے ایک عجیب مسرت کا احساس ہوا۔ ایک عجیب سی خلش دل کی گہرائیوں میں آہستہ آہستہ بیدار ہوئی۔ کاش میں اسے اپنا ہمخیال بنا سکوں۔ زندگی کی جدوجہد میں اس طویل بے کیف سفر میں ایک ساتھی کی کتنی ضرورت ہے؟ ——— لیکن وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا۔ یہ بے معنی باتیں یہ فضول خیالات۔ اس کے باوجود نرگس کا خیال اس کے دماغ کے ہر گوشے میں سماتا چلا گیا۔

---

۹ اگست کے ہنگامے میں وہ سب کے پیش پیش تھا۔ اس نے تقریریں کیں جلوس نکالے۔ کالج میں سٹرائک کرایا۔ اور اس صلہ میں اُسے جیل میں بند کر دیا گیا۔

چند دن امید و بیم کی حالت میں گزرے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ہماری آخری قومی جدوجہد ہے مگر آہستہ آہستہ اس کے خواب ٹوٹنے لگے۔ ان خوابوں کی تعبیر کتنی المناک تھی۔ بندوقیں ——— گولیاں ——— آسمان سے آتشباری ——— خون ——— آنسو ——— بھوک ——— جیل ——— ناکامی ——— کتنا تلخ انجام تھا۔ اس ناکامی کا اسے شدت سے احساس ہوا۔ یاسیت اس پر چھاتی چلی گئی۔ وہ سمجھنے لگا۔ کہ ہندوستان ہمیشہ غلام رہے گا۔ یہ کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔

یاس و حسرت کی تاریک بدلیاں ہر طرف چھانے لگیں۔ وہ قنوطی فضا میں دن گزارنے لگا۔ اس زمانہ میں صرف نرگس کا خیال اس کے لئے مسرت بخش تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے متعلق سوچا کرتا۔ سیاست کی ناکامیوں نے رومانس کی دلفریب آغوش میں پناہ لی ——— اس نے محسوس کیا کہ وہ نرگس سے محبت کرتا ہے۔

سات ماہ بعد وہ جیل سے باہر نکلا۔ فضا بدل چکی تھی۔ ہر طرف سکوت کا عالم تھا۔ ہر طرف خاموشی چھا چکی تھی۔ لوگ بھوک گرانی اور مفلسی کی چکی میں پیسے جا رہے تھے۔ ملکی سیاست کھوکھلی ہو چکی تھی۔ اس کے ہمخیال کچھ تو اب تک جیل میں تھے اور جو باہر تھے ان کا نظریہ بدل چکا تھا۔ وہ جنگ کو دوسری نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کوئی بھی جدوجہد بغیر اتفاق کے کامیاب نہیں ہو سکتی۔ آج اتحاد کی جدوجہد ہی آزادی کی جدوجہد ہے۔

مگر اس کا دماغ ان تمام نظریوں پر غور کرنے سے قاصر تھا۔ اس کی حالت ایک ناکام و نامراد تھکے ہوئے مسافر کی سی تھی۔ وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا۔ قنوطیت اس کے جذبات پر پورے طور سے حاوی ہو چکی تھی۔ وہ نرگس سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ صرف نرگس کی تسلیاں اس کے گھاؤ کو مندمل کر سکتی ہیں۔ تب اسے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی۔ کہ نرگس آج کل سیاسی تحریکوں میں عملی حصہ لے رہی ہے ——— مگر جب نرگس سے ملاقات ہوئی اور اس کے خیالات معلوم ہوئے۔ تو اس کے زخم ہرے ہو گئے۔ وہ اس جنگ کو عالمگیر عوامی جنگ سمجھتی تھی۔ اس نے بڑے جوش کے ساتھ کہا۔ کہ یہ دنیا کے دو طبقوں دو نظریوں کی جنگ ہے۔ چاہے تم اسے مزدور و سرمایہ کہہ لو یا ترقی اور رجعت پسندی۔ آج دنیا کا محنت کش طبقہ ایک محاذ پر اکٹھا ہو کر

اپنی مخالف قوتوں سے برسرِ پیکار ہے۔ اس زمانہ میں ایک نیا محاذ قائم کرنا محنت کش طبقے کے محاذ کو صرف کمزور کرنا ہی نہیں۔ بلکہ آپ کو مخالف قوتوں کے ہاتھوں میں فروخت کر دینا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آج چند محنت کش طبقے کے دشمن بھی "مزدور محاذ" میں شامل ہو گئے ہیں مگر وہ تو خود اپنے ہاتھوں سے اپنی قوت کو کمزور کر رہے ہیں۔ محنت کش طبقے کی ایک مورچہ پر کامیابی مخالف طاقتوں کی ایک مورچہ کی تباہی کا باعث ہوگی۔ خواہ چند مخالف طاقتیں ہمارے ساتھ ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کی حالت تو اس لکڑہارے کی سی ہے۔ جو اسی شاخ کو کاٹ رہا تھا جس پر وہ خود بیٹھا ہوا تھا۔

نرگس نے بڑی لجاجت اور نرمی سے کہا: "پیارے دوست! اس لڑائی کے اختتام پر صرف ایک طاقت کامیاب ہوگی۔ چاہے وہ محنت کش طبقے کی ہو۔ چاہے سرمایہ دار کی ہمارے لئے یا تو ایک طویل خوفناک غلامی ہے یا ہمیشہ کی آزادی ——"

"کیا تم بیڑیاں پہنے ہوئے سپاہیوں سے ملک کی حفاظت کی متوقع ہو؟" اس نے دریافت کیا۔

"میرے دوست!" نرگس نے کہا۔ "اتحاد و اتفاق کی قوت صرف بیڑیوں ہی کو نہیں توڑتی بلکہ ملک کی حفاظت کا سبب بھی بن سکتی ہے۔"

نرگس اُسے دیر تک سمجھاتی رہی۔ مگر وہ کچھ سوچنا بھی نہ چاہتا تھا۔ یہ الفاظ اس نے اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ سنے تھے۔ اُسے یقین ہو گیا تھا۔ کہ نہ ہندوستان میں کبھی اتفاق ہوگا نہ ہندوستان کبھی آزاد ہوگا۔

وہ نرگس سے کوئی سیاسی درس لینے نہیں آیا تھا۔ وہ تو دنیائے سیاست سے بھاگ کر محبت کی آغوش میں پناہ چاہتا تھا۔ وہ متوقع تھا۔ کہ نرگس اس سے محبت کرے گی اسے تسلی و تشفی دے گی۔ مگر نرگس کی باتوں سے اسے ایسا محسوس ہوا کہ اسے محبت میں بھی ناکامی ہوئی —— محبت کی ناکامیابی کا احساس —— شکستہ دل پر یہ نیا تازیانہ تھا —— اس کی زندگی، ناامیدی۔ محرومی۔ ناکامی کا مجموعہ ہو کر رہ گئی۔ زندگی کے حسین سپنوں کی مالا ٹوٹ گئی۔ اس کی خواہشیں موتیوں کی طرح فرشِ خاک پر بکھر گئیں۔ آرزوؤں۔ ارمانوں۔ امنگوں نے اس طرح ساتھ چھوڑ دیا۔ جیسے خزاں زدہ پتے سوکھے ہوئے درخت کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

وہ زندگی سے بھاگ رہا تھا۔ شہری زندگی اور اس کے ہنگاموں سے بھاگ رہا تھا۔ اس نے دنیا اور دنیا کی ہلچل سے دور کشمیر کے ایک گاؤں میں پناہ لی دن میں وہ بچوں کو پڑھاتا۔ اور شام کو دریا کے کنارے فطرت کے آزاد نغمے اور اس [illegible]

آخر اس نے ایک دن ملاح سے پوچھ لیا۔

"تم یہ درد بھرا گیت کیوں گاتے ہو؟"

"درد بھرا گیت" ملاح مسکرایا —— "گیت تو سبھی درد بھرے ہوتے ہیں —— گیت تو دل کی دھڑکنوں کی پیداوار ہیں۔ یہ ہماری روح کی گہرائیوں سے درد و غم میں نہا کر نکلتے ہیں۔ گیت تو سبھی درد بھرے ہوتے ہیں بابو! اس دنیا میں تو صرف غم ہی غم ہے —— مسلسل —— لگاتار —— محرومیاں —— ناکامیاں —— نامرادیاں —— خوشی ہے کہاں؟ میں ایسا گیت کیوں گاتا ہوں؟

واہ! آپ کا بھی عجیب سوال ہے: جیسے کوئی زخم خوردہ سے پوچھے۔ کیا واقعی درد ہوتا ہے؟ یہ درد و غم کے گیت میری زندگی کی صحیح داستانیں ہیں جو احساسات اور جذبات میں نہا کر گیت کے سانچے میں ڈھل گئیں۔"

ملاح اس سے کتنا قریب تھا۔ وہ دونوں دوست ہو گئے۔ ملاح کی محبوبہ کو ایک سال قبل اسی دریا نے نگل لیا تھا۔ وہ نوجوان تھا۔ اردو فارسی کی چند ابتدائی کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ مگر زمانے کی ٹھوکروں نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ اور پھر کشمیر میں تو ہندوستان کے گوشے گوشے سے لوگ محض دلبستگی کی خاطر چلے آتے ہیں۔ اس نے ان خوش فکروں سے باتیں بنانی خوب سیکھ لی تھیں۔

ایک روز ملاح کہنے لگا۔

"سنا ہے بابو! دریا کی سطح کے نیچے مونگے اور موتیوں کے بڑے بڑے محل ہیں۔ ان محلوں میں جل پریاں رہتی ہیں۔ وہ خوبصورت انسانوں کو پکڑ کر اپنے محلوں میں لے جاتی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی وہ سطحِ آب پر سیر کرنے آتی ہیں۔ کیوں حضرت میری محبوبہ بھی سیر کرنے آتی ہوگی؟ اسی لئے میں شام کو ہر روز یہ گیت گاتا ہوں۔ شروع شروع میں تو میرا بھی جی یہی چاہتا تھا۔ کہ بس ایک ڈبکی لگا کر موتیوں کے محل تک چلا جاؤں —— مگر اس کو یاد کرنے والا کون ہوتا۔ میں تو اس کی یاد کو زندہ رکھنے کے لئے زندہ ہوں، اور پھر حضرت! میری بوڑھی ماں۔ اور چھوٹے بھائی بہن ہیں۔ محبت تو میری ذاتی چیز ہے۔ مگر میری زندگی تو صرف میری نہیں۔ میرے عزیزوں رشتہ داروں کا بھی میری زندگی سے ایک گہرا تعلق ہے۔ بس بابو! میں یہی سوچا کرتا ہوں" —— چند لمحے گنگنانے کے بعد وہ گانے لگا۔

میری محبوبہ تو مجھ سے بچھڑ گئی
لیکن تیری یاد باقی ہے۔

دریا کے دونوں کنارے ایک دوسرے سے کتنی دور ہیں۔
مگر ایک پل ان دونوں کے درمیان واسطہ قائم رکھتا ہے۔
میری محبوبہ تو کہاں ہے۔
کیا تو جل پریوں کے محلوں میں میرے بغیر خوش رہ سکتی ہے۔
دو غمزدہ دل ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہیں۔

تو میرے قریب ہے۔
دریا کے دو کنارے ایسے ہی ہیں۔
جیسے ایک دکھ بھرا دل ـــــ اور مصائب و آلام سے بھری دنیا۔
دریائے حیات موجیں مارتا ہوا درمیان سے گزرتا ہے
اور محبت کا پل۔
دونوں کناروں کے درمیان واسطہ قائم کر دیتا ہے۔

میری محبوبہ......

ملاح گا رہا تھا ـــــ لیکن وہ کہیں اور تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا۔ کہ وہ پانی کی ایک دبیز تہ کے نیچے سے آہستہ آہستہ ابھر رہا ہے، اس کے خیالات تیز رفتاری سے پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ جیسے پرندے شام کے وقت گھونسلے کی طرف دوڑتے ہیں۔ ملاح اپنی محبوبہ کی خاطر، اپنے عزیز و اقارب کی خاطر زندہ ہے۔ اور وہ زندگی سے چوہے کی طرح چھپتا پھرتا ہے۔ اس کے بھی بھائی بہن ہیں ـــــ عزیز۔ رشتہ دار، ہم جماعت، ہمجولی اور یہ سلسلہ پھیلتا ہی چلا گیا۔ کتنی اشک بھری نگاہیں، کتنی سرد سرد آہیں ـــــ کتنے شکستہ دل ـــــ اور یہ زنجیر پھیلتی ہی چلی گئی۔ اس نے محسوس کیا۔ کہ دریا کے دونوں کنارے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں ـــــ قریب ـــــ قریب ـــــ بہت ہی قریب ـــــ وہ چیخ اٹھا تھا ـــــ اس کی محبت اور اس کی زندگی۔ ان دونوں کناروں کے درمیان گھلی جا رہی تھی۔

وہ بھاگ رہا تھا زندگی کی طرف ـــــ وُہ زندگی سے بھاگ کر آیا تھا۔ وہ صرف اپنے دکھ سے واقف تھا۔ دریا کے ایک کنارے پر کھڑا تھا۔ وہ دریا کے دوسرے کنارے پر غور کرنا ہی نہ چاہتا تھا۔ دیکھنا ہی نہ چاہتا تھا ـــــ مصائب و آلام سے بھری ہوئی دنیا ـــــ کتنے دکھے ہوئے دل تھے۔ کتنی اشک بھری آنکھیں تھیں ـــــ کتنے دوسرے کنارے تھے، اور وہ دوسرے کنارے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ ناکامیوں اور نامرادیوں کی طرف بہت سی تصویریں بجلی کی سرعت سے اس کے ذہن کے پردے پر سے گزر گئیں۔ قومی اتحاد ـــــ قومی آزادی ـــــ محنت کش طبقہ ـــــ مفلسی ـــــ اشک بھری آنکھیں ـــــ ـــــ دوسرا کنارہ ـــــ ایک مورچے کی کامیابی۔ مخالف مورچے کی تباہی ـــــ نرگس ـــــ وہ زندگی میں داخل ہو رہا تھا۔ زندگی کا دریا موجیں مارتا ہوا تیزی سے بہ رہا تھا۔ دوسرے کنارے پر بہت سی تصویریں بن بن کر بگڑ گئیں۔ چین۔ روس۔ مصر، شام ـــــ پل صرف دونو کناروں کو ہی نہیں ملاتے تھے۔ بلکہ پلوں کا جال دور دور کے ملکوں میں پھیلتا جا رہا تھا ـــــ اور وہ تیزی سے دوسرے کنارے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ مصائب و آلام سے بھری ہوئی دنیا میں داخل ہو رہا تھا۔ مصائب و آلام کا خاتمہ کرنے کے لئے۔ ایک بہتر دنیا کے لئے۔ آزاد دنیا کے لئے۔ جہاں محرومیاں نہ ہوں ـــــ جہاں مختلف قوموں کا اتحاد ہی ان کی زندگی اور ان کے امن و سکون کی ضمانت ہو۔

بقیہ سرخ روشنی

لیکن کچھ نہیں ہوا، عمارتیں ویسے ہی کھڑی رہیں۔ گھر آنے پر ماں نے اس سے سوال کیا۔ وہ یہ سننا چاہتی تھی کہ مکان والا مان گیا ہے۔ اور اسے ماں پر غصہ آ گیا۔ ماں نے غصے کا جواب نہیں دیا۔ آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں روک کر کروٹ لے لی۔ اور اس وقت اس کا جی چاہا کہ ماں کے کمزور جسم کو اپنے بازوؤں میں لے لے، اس کے سینے پر سر رکھ کر رو پڑے اور اسے تسلی دے، اس کے آنسو پونچھ ڈالے لیکن اس نے یہ کیا نہیں۔ اپنے ناپیدا آنسوؤں اور آنسوؤں میں غصے کو لے کر وہاں سے ہٹ گیا۔

اس نوٹس کے ختم ہونے میں صرف چند دن باقی ہیں اور وہ انہیں ایک فاقے کی رات کو چھوڑ آیا ہے۔ فاقے کا تدارک ہو جائے گا، اسے امید تھی، لیکن نوٹس کرایہ [illegible] وہ کہاں کو جا رہے گے۔ اگر مکان والے نے گھر خالی کرا لیا۔ تو کہاں جائیں گے کتنی بدنامی۔ کاش یہ نہ ہو، وہ یہ نہیں ہونے دیں گے۔ بہن کو اپنی مشین بیچنی پڑے گی۔ بار ہا حالات نے اس کی مشین کو ڈرایا ہے، کتنی عزیز ہے یہ مشین اُسے یہ مشین بیچنی پڑے گی تو وہ روئے گی۔ وہ کبھی کسی کے سامنے نہیں روئی، لیکن وہ روئے گی، لیکن جب کوئی اُسے دیکھ نہ رہا ہوگا۔

وہ سوچتا رہا اور اس کی روح سے خون بہتا رہا اور وہ ویٹنگ روم سے باہر اندھیرے میں ریلوے لائنوں کی طرف دیکھتا رہا، سناٹے میں ان دیکھی گاڑیوں کی انفرادی حرکت کی آواز آتی تھی، جیسے گاڑیوں کی ہڈیاں چٹخ رہی ہوں، زندگی میں صرف تکلیف ہے، اس نے سوچا، ریلوے لائنوں کے اوپر اندھیرا چھایا ہوا تھا اندھیرا، اندھیرا، زندگی کب بہتر ہوگی، کیا زندگی بہتر ہو سکتی ہے۔

پت جھڑ	احمد ندیم قاسمی	"
نئے زاویے	(جلد دوم) کرشن چندر	"
زندگی کے تار	مہندر ناتھ	"
بہتے بازار میں	حیات اللہ انصاری	"
پتھر کا دل	مترجمہ سراج الدین	"
میلہ گھومنی	علی عباس حسینی	"
۱۹۴۴ کے بہترین افسانے	ادارہ	"
جدید۔جدید تر	دھرم پرکاش آنند	"

ناول

لندن کی ایک رات	سجاد ظہیر	۱/۴/-
جزیرۂ سخنوراں	غلام عباس	۱/۴/-
پریم کا جادو	(مترجمہ)سراج الدین احمد	۲/-/-
نوالہ	ترجنیف	۱/۴/-
بغیر عنوان کے	سعادت حسن منٹو	(زیر طبع)
اندھیرا	اختر حسین رائے پوری	"
ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	"
گرتی دیواریں	اپندر ناتھ اشک	"
پرچم	خواجہ احمد عباس	"
جنت اور جہنم	کرشن چندر	"
کدہ	" "	"
کارواں	اختر اورینوی	"
مریض	راجندر سنگھ بیدی	"

ڈرامے

منٹو کے ڈرامے	سعادت حسن منٹو	۳/-/-
پاپی	اپندر ناتھ اشک	۱/۸/-
آؤ	سعادت حسن منٹو	۱/۸/-
تین عورتیں	سعادت حسن منٹو	۱/۴/-
انسان کی زندگی	اندریف	۱/۸/-
چرواہے	اوپندرناتھ اشک	(زیر طبع)
پیکار	کالزوردی	"
اچھا اور برا	مہندر ناتھ	"
شیطان	عصمت چغتائی	"
شکست کے بعد	کرشن چندر	"

منظومات

شعلہ و شبنم	جوش ملیح آبادی	۵/-/-
آیات و نغمات	" "	۵/-/-
روح ادب	" "	۳/۸/-
حرف و حکایت	" "	۳/-/-
نقش و نگار	" "	۳/۸/-
فکر و نشاط	" "	۲/۸/-
جنون و حکمت	جوش ملیح آبادی	۳/-/-
حرف آخر۔ سیف و سبوء عرش و فرش		(زیر طبع)
ماورا	ن۔ م۔ راشد	۲/-/-
نقش فریادی	فیض احمد فیض	۱/۸/-
آہنگ	اسرارالحق مجاز	۲/-/-

آبگینے	اختر انصاری	۱/۸/-
آہنگ رزم	وقار انبالوی	-/۱۲/-
طرح نو	نذیر میرزا برلاس	-/۸/-
۱۹۴۱ء کی (بہترین نظمیں)	حلقہ ارباب ذوق	-/۱۲/-
۱۹۴۲ء کی منتخب نظمیں (مرتبہ)	ادارہ	-/۱۲/-
۱۹۴۳ء (بہترین نظمیں)	حلقہ ارباب ذوق	۱/۴/-
جلوہ گاہ	مخمور جالندھری	۲/-/-
خوناب	اختر انصاری	۱/۸/-
میراجی کے گیت	میراجی	-/۱۲/-
فروزاں	معین احسن جذبی	۱/۸/-
زہر خند	یوسف ظفر	۲/-/-
شعلۂ ساز	فراق گورکھپوری	(زیر طبع)
جلال و جمال	احمد ندیم قاسمی	"
زہراب	علی جواد زیدی	"
وسعتیں	سلام مچھلی شہری	"
بادۂ مشرق	ساغر نظامی	"
ساغر	" "	"
رنگ محل (بہ ترمیم و اضافہ)	"	"
سلسلہ (اردو کی بہترین غزلیں)		"

اجتماعیات

مشین اور مزدور	باری	-/۸/-
آزادی کی راہیں	برٹرینڈ رسل	۱/۸/-
فاشزم	ہیرلڈ لاسکی	-/۸/-
راجہ اور کسان	لیونارڈ ام شف	-/۸/-
صاحب اور مذہب	" "	-/۸/-
بابو اور مزدور	" "	-/۸/-
سوشلزم	اینگلز	-/۸/-
سرمایہ داری	عبد اللہ ملک	-/۸/-
جاگیر داری	" "	-/۸/-
امریت	اکرام قمر	-/۸/-
Pakistan & Untouchability	Ch. Afzal Haq	2/4
پاکستان (اردو)	چوھدری افضل حق	۱/-/-
احساس کمتری	شیر محمد اختر	-/۸/-
صیہونی قومی تحریک	مسعود علی ندوی	-/۸/-
معیشت زر	ابن الحسن	-/۸/-
گاندھی ازم۔نیشنلزم۔سوشلزم	ایم۔این۔رائے	۱/-/-
سوویٹ روس کے مزدور	گوپال متل	-/۸/-

ادبیات و تنقیدات

ادب کثیف	حاجی لق لق	۱/۴/-
ہندی کے مسلمان شعراء	عبداللہ بٹ	-/۸/-
اقبال اور اسکا پیغام	محمد رفیق خاور	-/۸/-
اردو ڈراما	محمد عبدالسلام خورشید	-/۸/-
تنقید جدید	اختر اورینوی	(زیر طبع)
غبارے	ممتاز مفتی	"

مطبوعہ [illegible] پریس لاہور

ادارۂ
احمد ندیم قاسمی
چودھری برکت علی

زرِ سالانہ ۱۶۵
چھ روپے (۶)
فی پرچہ دس آنے

رسالہ

ادبِ لطیف لاہور

شمارہ ۴ جولائی سنہ ۱۹۴۴ء جلد ۲۰

مندرجات

مرکنٹائل پریس لاہور میں چودھری برکت علی پرنٹر پبلشر نے چھپوا کر دفتر رسالہ "ادبِ لطیف" سرکلر روڈ بیرون موری دروازہ لاہور سے شائع کیا

ادارہ

اشارات

قارئین ادبِ لطیف میں سے بیشتر حضرات کو اخبارات کے ذریعے علم ہو چکا ہوگا کہ سالنامہ ۱۹۴۴ء میں جناب سعادت حسن منٹو کے افسانہ "بو" کو حکومتِ پنجاب نے قابلِ اعتراض قرار دیا اور اب ادارہ ادبِ لطیف کے خلاف ۳۸ ڈیفنس آف انڈیا رولز اور ۲۹۲ تعزیراتِ ہند کے ماتحت عدالت میں مقدمات چل رہے ہیں۔ قانونی مجبوریوں کی وجہ سے ہم ان مقدمات پر کسی قسم کی رائے زنی نہیں کر سکتے قارئین تک صرف یہ اطلاع پہنچانا مقصود ہے کہ ؎

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

فحاشی اور عریانی کے خلاف پرچار کرنے والوں کی دورخی پالیسی ہمیشہ اہلِ نظر حضرات کے لئے سامانِ حیرت بنی رہی ہے۔ لیکن ان "ڈھول" کے پول کھولنے کا بیڑا اٹھانے کی آج تک کسی نے حامی نہ بھری۔ ہمارے موقر ہمعصر ادبی دنیا کے تازہ شمارے میں "اخبارِ خیام" لاہور کے فلسفۂ اخلاق کی قلعی کھولی گئی ہے۔ موقر ہمعصر نے نیک نیتی سے چند حقائق لکھے ہیں جن کا جواب ہمارے خیال میں سوائے کھسیانی تاویلوں کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ان تمام معلمین اخلاق کی حیران کن قلابازیوں کا تفصیلی تجزیہ ادبِ لطیف کے جولائی نمبر سے شروع ہوگا۔ جو جدید اردو ادب میں عریانی کے خلاف صفِ ماتم بچھا کر اپنے روزگار کا سامان مہیا کر رہے ہیں۔ یہاں مدیر ادبی دنیا کے نوٹ کا مختصر سا اقتباس پیش کرنا بے جا نہ ہوگا۔ قارئین غور فرمائیں کہ اخلاق اور بداخلاقی کی اتنی بڑی خلیج (جو معزز معاصر نے اربابِ اقتدار کے سامنے اخبار خیام کے صفحات میں سے مشتے نمونہ از خروارے پیش کی ہے) کس طرح چند ریاکارانہ تحریروں سے پاٹ دی جاتی ہے۔

"کچھ عرصے سے ملک کے صحافتی حلقوں میں فحاشی اور عریانی پر جو بحث ہو رہی ہے۔ اس نے پنجاب میں حسبِ معمول ایک نہایت ناگوار اور غلط صورت اختیار کر لی ہے۔ یعنی اس بحث میں وہ لوگ بھی الجھتے ہیں جنہیں اس بارے میں کوئی بات کہنے کا حق نہیں پہنچتا۔ نہ صرف اس لئے کہ بظاہر انہوں نے مسئلہ زیرِ غور کا سنجیدگی سے مطالعہ نہیں کیا اور یہ نہیں سوچا کہ فن کی حد کہاں ختم ہوتی ہے اور بداخلاقی کی حد کہاں سے شروع ہوتی ہے یا علومِ انسانی میں جنسیات کا کیا درجہ ہے۔ یا کسی جنسی مطالعے اور کسی ترغیبی تحریر میں کیا فرق ہے۔ یا لکھنے والے کا اندازِ نظر موضوع پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ وہ دوسروں کی آنکھ کا تنکا دیکھنے میں اس درجہ مستغرق ہوتے ہیں کہ انہیں اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا . . . .

لاہور سے ایک ہفتہ وار اخبار نکلتا ہے "خیام" یہ ایک نیم فلمی سا پرچہ ہے جس نے گذشتہ کئی ہفتوں سے بزعمِ خویش اصلاحِ ادب و اخلاق کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ . . . لیکن خود اپنی یہ حالت ہے کہ اس کے ادبی صفحات پر اس کے بہترین مقالے کے متن میں ایک نہایت جلی اشتہار اس مضمون کا درج ہے "پرستان کا نظارہ۔ ۱۷ سال سے ۲۵ سال تک خوبصورت لڑکیوں کی ۴۸ تصاویر۔ کیمرہ کی پرائیویٹ حالت اور قدرتی نظاروں کی جن کی پوری تعریف کی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ یہ تصاویر اگر آپ نے نہیں دیکھیں تو کچھ نہیں دیکھا۔" یہ ہیں ہمارے اصلاحِ ادب و اخلاق کے اجارہ دار جو خود شیشے کے مکان میں بیٹھ کر دوسروں پر کلوخ اندازی کرتے ہیں اور خود فحاشی کی ذلیل ترین صورتیں نشر کر کے دوسروں پر انگلیاں اٹھاتے ہیں ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ"

جولائی نمبر عنقریب پیشِ خدمت ہوگا اور اس کے بعد اگست ستمبر کا مشترکہ شمارہ افسانہ نمبر ستمبر کے پہلے ہفتے میں شائع ہو جائیگا۔ افسانہ نمبر کے مندرجات کا مفصل [illegible] جو معاونین کرام نے اب تک اپنے افسانے اور مقالے روانہ نہیں کئے۔ وہ فوراً توجہ فرمائیں۔

علی سردار جعفری

وہم و خیال

(زمانہ ماقبل تاریخ کے انسان کا ذہنی تجزیہ)

وقت

مسکراتے ہیں مناظر، رقص کرتے ہیں نجوم
گنگناتی ہیں چٹانیں گا رہے ہیں آبشار

چھن رہا ہے ابر کے پردے سے نورِ آفتاب
اور فضا میں پڑ رہی ہے ہلکی ہلکی سی پھوار

وقت کے میلے بدن پر دھاریاں ہیں نور کی
تھرتھراتے ہیں ہوا میں سیکڑوں چاندی کے تار

عارضِ گلرنگ پر صبحِ تمدن کی نمود
گود میں تہذیبِ انسانی کا طفلِ شیرخوار

آنکھ میں ماضی کا جادو، رُخ پہ مستقبل کا نور
انکھڑیوں میں ارتقا کے جامِ رنگیں کا خمار

اپنے سینے میں لئے انسان کے سینے کا جوش
دوش پر اپنے اٹھائے فکرِ انسانی کا بار

فکرِ انسانی

ٹوٹتی ہے کیوں شعاعِ مہرِ تاباں کی کمند
شب اٹھا لیتی ہے کیوں ناہید و پرویں کا ستار

رات کے ڈھلتے ہی پڑ جاتی ہے پھیکی چاندنی
صبح ہوتے کیوں بکھر جاتا ہے تاروں کا غبار

جھوم کر اٹھتی ہے کیوں اودی فضاؤں میں گھٹا
کوہ و صحرا پر برس جاتا ہے کیوں ابرِ بہار

کیوں پلٹ جاتا ہے موسم کیوں بدل جاتی ہے رُت
کھیلتی ہے کیوں خزاں کی گود میں فصلِ بہار

موت اڑا لیتی ہے کیوں رنگین رخساروں سے رنگ
ہے اجل کی نیند کا کیوں چشمِ مستی میں خمار

رات کو ہوتا ہے کیوں بھولے مناظر کا ہجوم
خواب میں رہتی ہے کیوں پیشِ نظر تصویرِ یار

ذہن کی تاریکیوں میں نور پھیلاتا ہے کون
کس کے نغمے ہیں سرودِ زندگی پر بیقرار

زیرِ دامانِ افق سے پھول برساتا ہے کون
کون ہوتا ہے شفق کے رنگ میں آئینہ کار

کون سوتا ہے ردائے برف میں لپٹا ہوا
کوہ کی چوٹی ہے کس دوشیزہ سینے کا ابھار

آندھیوں سے اس طرح سرگوشیاں کرتا ہے کون
گونجتی ہے وادی و کہسار میں کس کی پکار

کس کی ہیبت ہے کہ گیتی کا دہل جاتا ہے دل
“کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار”

آسماں پہ ہے یہ کس کے تازیانوں کی صدا
آرہا ہے کون یہ بادل کے گھوڑے پر سوار

اٹھ رہا ہے کیوں پہاڑی کے کلیجے سے دھواں
ناچتا ہے کون یہ پہنے ہوئے شعلوں کے ہار

الاماں اے عالمِ فطرت کی ارواحِ عظیم
ہے حدِ ادراک سے باہر تمہارا اقتدار

ہے عناصر میں تمہارے حسن و ہیبت کی نمود
آتش و آب و ہوا پر ہے تمہارا اختیار

تم وہاں رہتی ہو انسانی تخیل سے پرے — جس جگہ جھک کر زمیں کو آسماں کرتا ہے پیار
نذر لاتے ہیں تمہاری بارگاہِ ناز میں — خوف کے مارے ہوئے مجبور انسانوں کی ہار[1]

دیکھ کر انساں کی پستی وقت بھی تھرّا گیا!
ارتقا کے نرم ماتھے پر پسینہ آگیا

[1] ہار بمعنی شکست

ارتقا

آہ اے ناداں، خیالی دیوتاؤں کو نہ پوج — ذہن میں بنتے ہیں جو، ایسے خداؤں کو نہ پوج
جو بستے ہیں یہاں بھی اور وہاں بھی ہم نشیں — ایسے آوارہ طبیعت بے وفاؤں کو نہ پوج
ہاں مرادیں اپنی ان گونگی چٹانوں سے نہ مانگ — قدر کر اپنے ارادوں کی دعاؤں کو نہ پوج
پوجنا ہے پوج اپنی فطرتِ آزاد کو — مشرق و مغرب کی آوارہ ہواؤں کو نہ پوج
گود میں سمٹی ہوئی رعنائیوں کو چھوڑ کر — وادی و کہسار کی رنگیں اداؤں کو نہ پوج
بھول کر اپنے سرودِ لذّتِ گفتار کو — آسماں میں گونجنے والی صداؤں کو نہ پوج

یہ خُدا[2]، یہ دیوتا دو روز ہی رہ پائیں گے
جہل سے پیدا ہوئے ہیں علم سے مرجائیں گے

[2] مراد ہے خیالی خدا

لہریں

عبادت بریلوی

ترے رُخ پر خزاں کی آہ وہ افسردہ سامانی! — تری آنکھوں سے وہ ٹوٹا ہوا تارہ قیامت تھا
نظر آئے مجھے فردوس کی آغوش میں شعلے — مرا احساس اک انجان ڈر سے کپکپا اُٹھا

مجھے مدت ہوئی چھوڑے ہوئے ان شاہراہوں کو — جہاں اس وقت بھی ابرِ سکوتِ غم کا سایا ہے
ہزاروں پربتوں کے آہنی سینوں کو شق کرکے — بڑی مشکل سے ہمدم اک نیا جادو بنایا ہے

میرے دل پہ بہار آنے سے پہلے ہی خزاں آئی — مگر اب تک تری اٹھکیلیوں کا ہے وہی عالم
کبھی جب چاندنی راتوں میں اس پر غور کرتا ہوں — تو رفتارِ مہِ تاباں بھی ہو جاتی ہے کچھ مدھم

تجھے کس طرح بتلاؤں کہ میں روتا ہوں کیوں آخر — مرے اشکوں کے ان تاروں میں رقصاں اک کہانی ہے
وہ ناچیں دیکھ ہو وہ ناچیں فضا میں چند تصویریں — کہ جن کی محفلوں سے دور شمعِ شادمانی ہے

عبادت بریلوی

اردو شاعری میں عریانی

عریانی کا تصور بڑی حد تک اضافی ہے۔ ایک بات جو کسی خاص سماج کے ایک خاص فرد کو عریاں معلوم ہوتی ہے، ممکن ہے کسی دوسرے سماج کے فرد کو عریاں نہ معلوم ہو۔ یہ چیز حالات و واقعات کے تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اور انہی حالات و واقعات کے پس منظر ہی میں دیکھنا چاہیئے۔ مثال کے طور پر یہ دیکھئے کہ مغربی عورتیں جس طرح کا لباس پہنتی ہیں اور جس انداز سے بازاروں میں اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی چلتی ہیں، ہم اسکو ان کی بے حیائی پر محمول کرتے ہیں۔ اور انکی اس عریانی کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ حالانکہ ان کی سماج کے افراد کے لئے یہ کوئی ایسی معیوب باتیں نہیں۔ ہم لوگ جب ان عورتوں کو اپنے جسم کی نمائش، اپنی بانہوں کا چمپئی رنگ، اپنے غازہ آلود چہرے کی چمک دمک اور سینے کے ابھار کو نمایاں کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، تو ان کو ذرا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اور نہ اس سماج کے نوجوانوں پر وہ بیقراری کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے جس کا شکار ہندوستانی نوجوان، ان عورتوں کو پہلی ہی نظر میں دیکھ کر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ہندوستانی سماج میں ایسے مناظر دیکھنے میں نہیں آتے۔ اسلئے یہاں کے نوجوانوں میں جنسی تشنگی کا احساس سارے جسم کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں ایک سیمابی کیفیت پیدا کر دیتا ہے ——— یہ تو خیر مشرق و مغرب کا تقابل تھا۔ آپ ہندوستان ہی کے مختلف خطوں کو دیکھئے۔ شمالی ہندوستان میں جس بات، جس طریقے اور جس انداز کو عریانی سمجھا جاتا ہے۔ اس کو گجرات، وسط ہند اور جنوبی ہند کے اکثر قبیلوں میں معیوب نہیں سمجھتے۔ گجرات میں عورتیں جس طرح کا نیم عریاں لباس پہنتی ہیں اسکو شمالی ہند والے اچھا نہیں خیال کرتے ——— گونڈ اور بھیل قوموں کے یہاں جو عورتوں کا لباس ہے۔ اس کو شمالی ہند کی کوئی عورت تحسین کی نظروں سے نہیں دیکھتی۔ کیونکہ اس میں ایک طرف تو ان کا جسم عریاں ہو جاتا ہے اور دوسری طرف انکے سارے خد و خال نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض قبیلے ایسے بھی ہیں، جن کے یہاں نوجوان لڑکیاں اپنے پستانوں کو کسی چیز سے پوشیدہ نہیں کرتیں۔ وہ اسی طرح نمایاں رہتے ہیں اور انکے یہاں اسکو معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا ——— یہی حال بعض خاص حالات و کیفیات کے بیان کا ہے۔ کہ کسی خاص دور میں اگر بعض خاص حالات کی تصویریں کھینچنی معیوب سمجھی جاتی ہیں۔ تو دوسرے میں ان کو برا نہیں سمجھا جاتا ——— وہ لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں، جو اس زمانے کے لوگ نہیں ہوتے بلکہ "اگلے وقتوں کے لوگ" ہوتے ہیں۔ اور جو زمانے کی بدلتی ہوئی کروٹوں اور حالات و واقعات کے تیوروں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ لیکن وہ لوگ جو ذہنی حیثیت سے آگے بڑھ چکے ہوتے ہیں۔ ان چیزوں کو اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے ان کے نزدیک انکے بیان میں کوئی معیوب بات نہیں ———!

جنسیات اور اس سے متعلق مختلف حالات و کیفیات کے بیان ہی کے ساتھ عریانی کا تصور وابستہ ہے۔ جہاں کہیں بھی جنسی پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ یا اسکے متعلق کوئی بات کہی جاتی ہے تو لوگ اسکو عریاں سمجھتے ہیں۔ حالانکہ دنیا میں ہمیشہ یہ خیالات یکساں نہیں رہے یعنی جنسیات کے متعلق تصورات قریب قریب ہر دور میں بدلا کئے ہیں۔ ایک زمانے میں اگر اسکی مختلف کیفیات کے بیان کو معیوب مانا گیا ہے۔ تو دوسرے دور میں وہ کھلم کھلا بغیر کسی جھجک کے پیش کئے گئے ہیں ——— صدیاں گزریں، جب انسان اس دنیا میں بالکل نووارد تھا۔ تو جنسی تعلقات کو وہ ایسا گناہ خیال نہیں کرتا تھا، جیسا کہ ہم آج خیال کرتے ہیں۔ برخلاف اسکے جنسی فعل انکے نزدیک ایک بڑی مقدس اور اہم بات تھی ——— اور سینکڑوں مثالیں تو ایسی ملتی ہیں، جب جنسی اعضاء انکی پرستش اور ان سے متعلق مختلف کیفیات کو مذہبی رنگ دے دیا گیا تھا۔ برچالٹ نے

اپنے ایک مقالے SEX IN RELIGION میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ دنیائے عام مذاہب کسی نہ کسی صورت میں جنسی مظاہرات سے وابستہ رہے ہیں ــــ اگلے زمانے کے لوگ ایک لمحے کیلئے بھی اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے کہ مذہب اور جنسی معاملات میں کوئی تعلق نہیں ــــ دنیا میں مختلف مقامات پر یہ دونوں چیزیں ایک سنگم پر ملتی ہیں۔ جاپان، ہندوستان، نیوگنی، فینیشیا، یونان، روم وغیرہ میں اکثر جگہ یہ تصورات ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ یہ سلسلہ تاریخی زمانے سے لیکر جب انسان وحشی اور جنگلی جانوروں کی طرح شکار کرتا پھرتا تھا، اس وقت تک جب اس نے کھیتی باڑی کر کے اپنا پیٹ پالنا شروع کیا۔ ان کے یہاں ایسے رقص و سرود کا رواج عام تھا جو جنسی ہیجان پیدا کرتے تھے۔ اور جو جنسی فعل کی ایک تمثیل تھے "IN EARLIER PHASES OF CULTURE FROM THAT OF PRIMITIVE HUNTING TRIBES TO THE GREAT AGRICULTURAL SOCIETIES OUT OF WHICH OUR CIVILIZATION HAS SPRUNG, ALMOST EVERY RITUAL INCLUDES LICENTIOUS DANCES AND SONGS, THE PERFORMANCE, ACTUAL OR SYMBOLIC, OF THE SEXUAL ACT, AND OFTEN ORGIES OF PROMISCUETY."....

. . . .

اور پھر وہ اس حقیقت کو پھیلا کر بیان کرتا ہے کہ عہد قدیم میں جو ممالک سب سے زیادہ تہذیب یافتہ خیال کئے جاتے تھے ان سب کے یہاں ہمیں جنسیات اور مذہب ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مصر، بابل، یونان، روم، ایشیائے کوچک اور بحر روم کے آس پاس کی قدیم تہذیبوں میں جنسیات کی پرستش کو دخل تھا ــــ بات یہ تھی کہ وہ جنسی فعل کو ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس تصور نے ان کے ذہنوں میں تقدس کا رنگ دے دیا تھا۔ اسلئے جنسیات اور جنسی فعل سے متعلق گناہ کا تصور ان کے یہاں دور تک نظر نہیں آتا۔ عہد قدیم میں ہمیں ناگ کی پرستش کا ذکر اکثر جگہ ملتا ہے اور جنسیات پر بہت سے لکھنے والے اس بات پر متفق ہیں کہ وہ جنسی فعل اور جنسی عضو کی ایک تمثیل SYMBOL ہے۔ ہندوستان میں شیوجی اور پاربتی کے تعلقات کی کہانیاں اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ عورت اور مرد اور ان کے جنسی فعل کو کسی طرح بھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ اس کے چھپانے سے کچھ حاصل ہے۔ عہد مسیح سے قبل اکثر ممالک میں ایسے دیوتاؤں کا ذکر ملتا ہے جن کا تعلق جنسیات سے ہے۔ اور عوام جن کی پرستش بھی کرتے تھے۔ روم میں جنس کا دیوتا PRIAPUS کہلاتا تھا۔ روم میں پامپئی POMPEI کے ایران شہر کی دیواروں پر ایسی تصویریں ملتی ہیں۔ جن میں اس دیوتا کو قربانی دینے کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ وسطی امریکہ میں اس بات کے متعدد ثبوت ملتے ہیں کہ وہاں کسی زمانے میں جنسی اعضاء مقدس و متبرک خیال کئے جاتے تھے۔ یہودیوں تک کے یہاں بعض ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ وہ جنسی اعضا کو تقدس کی نظروں سے دیکھتے تھے ــــ غرض یہ کہ جنس اور جنسی اعضا کی پرستش قدیم مذاہب میں عام تھی۔ شرم یا گناہ کے تصور کو اس میں دخل نہ تھا۔ اور اس سماج کے افراد اپنی ان حرکات کو اسی تقدس کی نظروں سے دیکھتے تھے جیسے آج کے مذہبی لوگ اپنی مختلف حرکات کو دیکھتے ہیں۔ قدیم مصر کے مندروں میں بھی جنسی قربانیوں کا رواج عام رہا ــــ جتنا پر APHRODITE کے لئے جو سب سے بڑی قربانی عورتوں کی طرف سے پیش کی جاتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ اسکے نام پر اپنی عصمت و عفت کو وہاں کے پجاریوں کے حوالے کر دیتی تھیں۔ اور وہاں کے پجاریوں نے اس چیز کو اپنی جنسی خواہشات کی تسکین کا ذریعہ بنا لیا تھا ــــ یہ تمام باتوں سے .... یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جنس ہمیشہ سے انسانی ایک زمانے تک مذہبیات سے وابستہ ہے ــــ اور ان کو کسی طرح بھی معیوب نہیں سمجھا گیا۔ برخلاف اسکے انکی اہمیت کے پیش نظر

انسان نے انکی پرستش کرنی شروع کر دی۔

لیکن جیسے کہ دنیا میں اور بہت سی باتوں کا ردّ عمل ہوتا ہے ان خیالات کا بھی ہُوا۔ یہ خیالات اور یہ رسومات بھی بہت دنوں تک ایک طرح پہ نہ چل سکیں۔ وجہ یہ تھی کہ پہلے اس سلسلے میں مکاری، دغابازی اور جعل سازی کا دخل نہ تھا۔ برخلاف اسکے ان کو برتنے میں ایک قسم کی سادگی اور معصومیت کارفرما تھی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ مسخ ہوتی چلی گئیں۔ اور بہت سے لوگوں نے ان کو اپنی وحشیانہ خواہشات کی تسکین اور عیش پرستی کا ذریعہ بنا لیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ عیاشی کا خیال اس میں گھر کرتا گیا جس کی زیادتی سارے سماج کے لئے مضر ثابت ہونے لگی۔ پہلی صدی عیسوی تک آتے آتے یہ رسومات بہت کافی مسخ ہو چکی تھیں۔ اور اگرچہ ان کا رواج اب بھی عام تھا لیکن اب بہت سے لوگوں نے ان کو بری نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ شروع شروع میں عیسائی مذہب کے پادریوں نے ان کی روک تھام میں بڑا حصہ لیا۔ لیکن ان کا تدارک کرنے میں وہ بھی انتہا پسند ہو گئے۔ چنانچہ عیسائی مذہب کے قبل جتنے مذاہب بھی عام تھے۔ وہ سب انکے نزدیک غیر مقدس ٹھہرے۔ جنسی افعال کو ان مذاہب میں برا نہیں خیال کیا جاتا تھا۔ اس لئے عیسائی پادریوں کی نظروں میں یہ چیز بھی غیر مقدس قرار پائی اور انہوں نے اس کو گناہ قرار دے دیا۔ SEX IN RELIGION میں ڈاکٹر سمپسن مار Dr. SIMPSON MARR نے لکھا ہے کہ ردِ عمل کے طور پر ان کے اطوار انتہا پسندانہ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے علاوہ ہر مذہب کو غیر مقدس اور اسی کے ساتھ ساتھ جنسی فعل اور جنسی تعلقات کی اہمیت کو غلط اور اسکے ارتکاب کو شرم آگیں بتایا، جو ان مذاہب غیر میں عام طور پہ رائج تھے۔ "IN REACTION, HOWEVER, THEY SWUNG OVER TO THE OTHER EXTREME AND ALL PAGAN RELIGIONS BECAME IMPURE FOR THEM AND THE SEX ACT ITSELF FELL UNDER CESURE AS SOMETHING SHAMEFUL AND WRONG."

چنانچہ تمام عیسائی لکھنے والوں کی تصانیف ان خیالات سے پُر نظر آنے لگیں، کہ جنسی فعل یا جنسیات کی مختلف کیفیات کا بیان گناہ ہے۔ عورت کا جسم مرد کے لئے لعنت ہے اور عورت مرد کو گمراہ کرتی ہے۔ ان کی اس قسم کی تحریروں کو فرائڈ کے نظریئے کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس کی روک تھام میں ان کی اُس جنسی بھوک کو تھوڑا سا سکون مل جاتا تھا جو ان لوگوں میں عام تھی۔ بہرحال اس تحریک نے جنسیات کے سلسلے میں مختلف جگہ "TABOOS" قائم کئے۔ اور جو آج تک اسیطرح موجود ہیں۔ لیکن وہ فطری نہیں بلکہ خود ہماری سماج کے بنائے ہوئے ہیں۔

۹ جنسیات کا موضوع چونکہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے ہر انسان اس میں دلچسپی لیتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض سماجی بندھنوں کے باعث، وہ اس کے متعلق زیادہ کہنے سننے پر آمادہ نہ ہو۔ لیکن ایسی سماج کے افراد بھی تنہائی میں اس قسم کی کتابیں پڑھنے میں لطف لیتے ہیں۔ جن میں جنسی باتوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ چونکہ انسانی دل و دماغ دونوں پر یہ جذبہ سب سے زیادہ حکومت کرتا ہے۔ اسلئے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنی ہر انسان کے لئے ضروری ہے۔ وہ لوگ جو اس کے متعلق کچھ کہنے یا سننے کو معیوب سمجھتے ہیں۔ دوسروں کو ایک فریب دینا چاہتے ہیں۔ اور خود تنہائی میں اس سے لطف لیتے ہیں۔ H. R. L. SHEPPARD نے SOME OF MY RELIGION میں لکھا ہے کہ بعض سماجی مذمومات ایسے ہوتے ہیں جن کے متعلق بات چیت کرنی زیادہ خوشگوار نہیں معلوم ہوتی لیکن ان کے فراموش کر دینے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ "WE FIND CERTAIN SOCIAL EVILS TOO UNPLEASANT TO TALK ABOUT, BUT NOT TOO UNPLEASANT TO FORGET."

جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس موضوع پر سوچنا غور کرنا اور

اس سے دلچسپی لینا انسانی فطرت میں داخل ہے۔ خواہ سماجی اقتسابات اس کو کتنا ہی مذموم قرار دے دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں ہر ملک اور ہر قوم کے لوگوں نے اس سے دلچسپی لی ——— کہیں چھپ کر اور کہیں کھلم کھلا ——— جنسی تعلقات کی اہمیت کے پیش نظر بعض جگہ جنسی تعلیم کی اہمیت کو بھی محسوس کیا گیا چنانچہ بعض وحشی اقوام کے یہاں آج بھی جنسی تعلیم کا رواج ملتا ہے۔ اور ہم حیران رہ جاتے ہیں جب ڈاکٹر میلینوسکی DR. MALINOWSKI اور مس مارگرٹ میڈ MISS MARGARET MEADE ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ بہت سی وحشی اقوام مذہبی رسومات کے پردے میں جنسی تعلیم دیتی تھیں اور آج بھی دیتی ہیں۔ پلوٹارک PLUTARCE نے LIFE OF LYCURGUS میں ظاہر کیا ہے کہ نوجوانوں کو شادی کی طرف راغب کرنے اور جنسی حیثیت سے صحت مند بنانے کے لئے رقص کو کس قدر دخل ہے ——— وہ بعض ایسی رسومات کا تذکرہ کرتا ہے جس میں عورتیں اور مرد سر بازار برہنہ نکلتے تھے۔ اور ان حرکات سے ان میں شادی اور محبت کے جذبات استوار ہو جاتے تھے۔

ان تمام باتوں سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ سماج کے جنسی اقتسابات قابل ستائش نہیں ——— اور نہ وہ ایسے فطری ہیں کہ بس ان میں ترمیم کی ہی نہیں جا سکتی ——— تاریخ بتاتی ہے کہ وہ ہر دور میں بدلتے گئے ہیں۔ ایک زمانہ میں جنسی افعال اور جنسی اعضا کی پرستش کی جاتی تھی۔ پھر ایک دور وہ آیا جب عیسائیوں کے شروع زمانے میں اس پر خوب لعن طعن ہوئی۔ اور اس فعل کو مذموم قرار دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا... کہ جنسی فعل اور عورت کا جسم انسان کے لئے لعنت قرار پایا ——— جب سینٹ پال کے منہ سے یہ جملہ نکلتا ہے کہ عورت کے جسم کو چھونا ہی انسان کے لئے اچھا ہے "IT IS GOOD FOR A MAN NOT TO TOUCH WOMAN" تو ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ لیکن یہ دور بھی ہمیشہ قائم نہ رہ سکا۔ اسکے بعد ایک زمانہ وہ آیا جب عیسائی پادریوں نے عورتوں کے ساتھ افلاطونی انداز PLATONIC BASIS میں رہنا شروع کیا جس میں جنسی تعلقات پیدا کرنے کی ممانعت تھی لیکن اسی زمانے میں زیادہ پادری بدچلنی کے الزام میں دھرے گئے۔ اور پھر آخر میں خانقاہوں کا رواج ہوا جہاں MONKS اور NUNS ایک ساتھ رہتے تھے ——— عورت اور مرد کا ایک ساتھ رہنا اور ان میں جنسی تعلقات کا پیدا نہ ہونا ناممکن ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا کہ ان لوگوں کی حرکتوں نے کلیسا کو بدنام کیا ——— تو جنسی اقتسابات ہی انسان کی بدچلنی کا باعث ہوتے ہیں۔ اگر انسان کھلم کھلا، بالکل فطری انداز میں زندگی بسر کرے تو یہ بات پیدا نہیں ہو سکتی۔ انہیں خیالات کے پیش نظر اکثر ان مروجہ اقتسابات کے نظریوں کے خلاف بغاوتیں ہوتی رہیں ——— چنانچہ جنس کے معاملے میں کلیسا کے خلاف سب سے پہلا باغی انگریزی شاعر بلیک (BLAKE) تھا جس نے اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں کلیسا کے اقتسابات کی دل کھول کر مخالفت کی ——— اس نے بتایا کہ جنسی فعل جو دنیا میں سب سے زیادہ حسین اور خوشگوار فعل ہے (LOVELY ACT OF SEX). اس کو خواہ مخواہ مذہب نے جرم قرار دے دیا ہے۔ اور پھر انیسویں اور بیسویں صدی تک آتے آتے فلسفیوں سائنسدانوں اور ادیبوں نے جنسی اقتسابات کے خلاف ایک اچھا خاصا محاذ قائم کر دیا۔ SEXUAL REFORM CONGRESS نے اس چیز کو ہوا دی۔ جس میں دنیا کے بڑے بڑے دماغ شامل تھے۔

جنسیات کے متعلق ان نظریات کا مدوجزر ہمیں ادب اور آرٹ میں بھی ملتا ہے۔ دنیا کے کسی ملک کا کوئی ادب اور آرٹ ایسا نہیں جس میں جنسیات اور اس سے متعلق مختلف حالات و کیفیات کا بیان موجود نہ ہو۔ چنانچہ بعضوں کا تو یہ خیال ہے کہ اگر جنسیات کے مختلف نظریوں اسکی تاریخ اور اسکے اتار چڑھاؤ کو جس دور میں بھی دیکھنا ہو تو اس کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اسوقت کے ادب اور آرٹ کا مطالعہ و تجزیہ کیا جائے HARRY ELINER BARNES ... نے لکھا ہے

"ONE OF THE BEST METHOD OF DISCOVERING THE THEORIES OF SEX BEHAVIOUR, WHICH HAVE PREVAILED IN ANY GENERATION IS BY EXAMINING THE LITERATURE OF THAT PERIOD." ......

اور یہ صحیح بھی ہے۔ آپ مختلف ممالک کے مختلف زمانوں کے ادبیات کو دیکھئے! آپ کو اس میں جنسیات کے متعلق انہیں نظریوں کی تصویریں بے نقاب نظر آئیں گی جو ان دنوں عام تھے۔ دنیا میں شاید سب سے پہلی ادبی تخلیق وہی ہوئی ہوگی جس میں جنسی تعلقات اور اسکی مختلف کیفیتوں کا تذکرہ ہوگا —— وحشی اور غیر مہذب انسان پر جنسی فعل اور اس کے کیف نے اس قدر اثر کیا ہوگا کہ وہ اس کے متعلق بیساختہ بہترین انداز میں کچھ نہ کچھ کہنے کے لئے مجبور ہو گیا ہوگا۔ ایسے گیت کہے گئے ہوں گے جن میں جنسی معاملات اور کیف کا تذکرہ ہوگا —— یہ تو خیر اس وقت کی بات ہے جس کی بنیادیں صرف قیاس ہی پر قائم ہیں —— لیکن اس کے بعد جب ہمیں ادبی تاریخ کی کڑیاں ملنے لگتی ہیں، تب بھی ہمیں قدم قدم پر ہر صنف ادب میں اسی بنیادی انسانی جذبے کا اثر کارفرما نظر آتا ہے۔ ادب میں پرانی داستانوں کو دیکھئے۔ ان سب میں آپکو عورت کا بیان ضرور ملے گا۔ اسکے مختلف اعضا کا تذکرہ ضرور ہوگا —— اس کی ہستی جس کیف کا باعث بنتی ہے، اسکی مختلف تصویریں ضرور نظر آئیں گی۔ ہر ملک کی دیومالا میں جو چیز سب سے زیادہ ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرتی ہے وہ اسی چیز کا بیان ہے۔ حالانکہ دیومالا میں تقدس کا عنصر سب سے زیادہ موجود رہتا ہے —— پرانی تہذیبوں میں ہندوستان، چین، یونان، روم، مصر و بابل وغیرہ خاص طور پر قابل غور ہیں۔ ان مقامات کے رہنے والوں کی نظموں میں جو انکے شاہکار ہیں اور جو اب کلاسکس کا مرتبہ حاصل کر چکے ہیں، وہ جنسیات کی مختلف کیفیات کے بیان سے خالی نہیں۔ ان سب میں ہم عورت کو دیکھتے ہیں اور اس کی ہستی میں قدرت نے جس سرور و سرخوشی کی دنیا کو سمو دیا ہے ان کا بیان بھی پاتے ہیں —— کالی داس، والمیکی، ہومر، [illegible] ڈانٹو کے زمانوں سے لے کر گوئٹے، شلر، شیکسپیئر اور اسکے بھی صدیوں بعد تک دیکھ جائیے۔ آپ کو ان میں ہر ایک کے یہاں ایسی باتیں ملتی ہیں، جنکے باعث بڑی حد تک انکی تخلیقوں میں جگہ جگہ عریانی پیدا ہو جاتی ہے۔

اردو شاعری بھی اس سے مستثنےٰ نہیں ہو سکتی۔ اس میں بھی قریب قریب ہر دور میں اس چیز کی فراوانی رہی ہے۔ غزل جو ساری اردو شاعری کا ایک بہت بڑا سرمایہ ہے، اس کے معنی ہی عورتوں سے باتیں کرنے کے ہیں۔ چنانچہ ہر دور کی غزلیات میں ایسے اشعار ملتے ہیں جو عریاں ہیں اور جن میں کھل کر شاعروں نے جنسی باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ عورت اور اسکے ایک ایک عضو کا تذکرہ وہ سب کے سب بغیر کسی جھجک کے کرتے ہیں۔ معاملہ بندی ان میں سے بہتوں کا خاص موضوع ہے۔ عورت اور مرد کے تعلقات میں جو کیفیات ایک دوسرے پر طاری ہوتی ہیں، وہ ان کو بھی مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ جنسی فعل سے قبل جو حالت طاری ہوتی ہے وہ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی شرماتے نہیں —— غرض جنسیات سے متعلق کونسی کیفیت ہے جس کا بیان انکے یہاں موجود نہیں —— آج جسکو عریانی کہا جاتا ہے۔ اس پر کسی زمانے میں شاعروں کی چھینٹیں اڑ جاتی تھیں —— یہ تو خیر فطری باتوں کا بیان ہے لیکن غزل گو شاعروں کے یہاں ایسی غیر فطری باتوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے جہاں جنسی حیثیت سے وہ ابنارمل نظر آتے ہیں۔ مثلاً ہمارے قدیم شاعروں میں اکثر کے یہاں امرد پرستی کا ذکر موجود ہے۔ وہ لطف لے لے کر لڑکوں کے حسن کا بیان کرتے ہیں اور انکے فراق میں انکے اوپر جو بیقراری کی کیفیت طاری ہوتی ہے اس کی تصویر بھی کھینچتے ہیں۔ اور بعض تو ایسے بے دھڑک ہیں کہ وہ انکا نام تک لینے سے باز نہیں رہتے۔ چنانچہ غزل کی شاعری پر ایک زمانے میں یہ زبردست اعتراض تھا جو ایک حد تک آج بھی کیا جاتا ہے کہ اسمیں اکثر جگہ ان حالات کا بیان ملتا ہے۔ جو انسان کے لئے قابل ستائش نہیں —— لیکن بہر حال قدیم اردو شاعری میں یہ چیز موجود

ہے، جواب کسی طرح بھی مٹائی نہیں جاسکتی ——— :

تصوف قدیم شاعری کا ایک اہم موضوع ہے اور فارسی شاعری کے ساتھ ساتھ اردو شاعری میں بھی اس کا پلڑا اچھا خاصا بھاری ہے تصوف کا خیال ہمیں خدا کی طرف لے جاتا ہے۔ دنیاوی معاملات اور خصوصاً جنسی رنگ کا اسمیں شائبہ تک نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن قدیم شاعری میں تصوف کے متعلق جو کچھ بھی کہا گیا ہے ——— جہاں کہیں بھی اسکے اسرار و رموز کھولے گئے ہیں، وہاں جنسی رنگ جھلکتا ہے ——— ہمارے شاعروں نے تصوف کے تحت حقیقت اور معرفت پر جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ سب کا سب مجازی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اور اگر کوئی ایسا شخص جو انکی استعاریت سے واقف نہ ہو انکو دنیاوی اشعار کے علاوہ ایسے اشعار نہیں سمجھ سکتا جن میں دنیاوی معاملات سے الگ ہو کر کوئی بات کہی گئی ہو۔ ان میں بھی معشوق کے حسن کا تذکرہ ہوتا ہے۔ کہیں اسکے عارض کا بیان ہوتا ہے۔ کہیں اس کے چشم و ابرو کی تعریف ہوتی ہے۔ کہیں اس کے سرو ایسے قد کی تصویر بنائی جاتی ہے۔ کہیں اسکے عشوہ ناز و ادا کا ذکر ہوتا ہے لیکن ان تمام باتوں سے یہ لوگ مراد اور کچھ لیتے ہیں ——— اور بڑے سے بڑا اللہ والا ان پر جھومتا ہے۔ مثال کے طور پر حافظ کی شاعری کو دیکھئے جسکو آج متصوفانہ شاعری میں ایک خاص مرتبہ حاصل ہے لیکن اس کے یہاں زیادہ تر جگہ ان کیفیات کا ذکر ملتا ہے۔ جن کا تمام تر تعلق جنسیات سے ہے۔ بھلا بتائیے جب وہ اس قسم کا شعر کہے ؎

مئے دو سالہ و معشوق چار دہ سالہ
ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

تو کوئی کیا سمجھے۔ بھلا اس خیال کو تصوف کا رنگ کیسے دیا جاسکتا ہے؟ ——— یہی نہیں بلکہ ایسے بیسیوں اشعار حافظ کے دیوان میں ملتے ہیں اور ایک حافظ ہی پر کیا منحصر ہے۔ اردو اور فارسی کے قریب قریب ہر صوفی شاعر کا یہی حال ہے۔ ان میں سے اکثر کے اشعار فحشیات کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ حالانکہ ان میں تذکرہ کیا جاتا ہے تصوف کے رازہائے سربستہ کا ——— متصوفین کے یہاں اس چیز کا تذکرہ ... ہونے کی وجہ یہ ہے کہ گوشہ نشینی اور تجرد کی زندگی بسر کرنے کے باعث، ان میں سے اکثر جنسی بھوک کے شکار تھے۔ وہ خانقاہوں میں رہنے کے عادی تھے اس لئے انکی تجرد کی زندگی نے اس فطری جذبے کو دبا دیا۔ جس کے باعث وہ حقیقت کے متعلق بھی اپنے خیالات کو ان پیرایوں میں بیان کرنے کے لئے مجبور ہوگئے ——— اور خوب کھل کھیلے ——— اردو شاعروں میں ولی، سراج، میر، اثر، میر درد، مظہر جانجاناں، تصوف میں بہت اچھے کہنے والے خیال کئے جاتے ہیں۔ لیکن ان سب کے متصوفانہ اشعار میں (میر درد کو چھوڑ کر) جنسی رنگ کی جھلک موجود ہے ——— لیکن یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ جنسی دباؤ ——— انسان سے عجیب باتیں کراتا ہے۔ ایک ذرا اردو شاعری اور تصوف کو چھوڑ کر فرانس کے اس زمانے کو دیکھئے! جب وہاں کی عورتیں حضرت عیسیٰ کے متعلق اس قسم کے گیت گاتی تھیں۔ ؎

"PRAISE TO JESUS, PRAISE HIS POWER,
PRAISE HIS SWEET ALLUREMENTS!
PRAISE TO JESUS, WHEN HIS GOODNESS
REDUCES ME TO NAKEDNESS;
PRAISE TO JESUS WHEN HE SAY TO ME:
'MY SISTER, MY DOVE, MY BEAUTIFUL ONE!'
PRAISE TO JESUS IN ALL MY STEPS,
PRAISE TO HIS AMOROUS CHARMS!
PRAISE TO JESUS, WHEN HIS MOUTH
TOUCHES MINE IN A LOVING KISS!
PRAISE TO JESUS WHEN HIS GENTLE CARESSES
OVERWHELM ME WITH CHASTE JOYS!
PRAISE TO JESUS WHEN AT MY LEISURE
HE ALLOWS ME TO KISS HIM."

اگرچہ یہ نظم حضرت عیسیٰ سے ایک عقیدت کا اظہار کرتی ہے۔ لیکن اس میں شروع سے آخر تک جنسی رنگ جھلکتا ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے اس جنسی بھوک کا جو فرانس کے اندر ایک خاص دور میں رہبانیت

نے پیدا کر دی تھی۔ زندگی کی یہ ایک عام حقیقت ہے کہ جو چیز زیادہ سے زیادہ دبائی جاتی ہے۔ وہ اسی قدر ابھرتی ہے۔ یہی حال جنسی جذبے کا ہے۔ کہ جس قدر بھی اس کو دبانے کی کوشش کی جائے گی وہ ابھرے گا۔ اور دوسرے راستوں سے اپنے آپ کو ظاہر کریگا ——— متصوفانہ شاعری میں جو جنسی رنگ موجود ہے اسکی وجہ بھی یہی ہے کہ شعراء اخلاقی بندھنوں اور ذہنی جکڑ بندیوں کے باعث کھل کر اپنی جنسی کیفیات کا بیان نہ کر سکے ——— اسلئے انکی عارفانہ باتیں بھی جنسی رنگ میں رنگ گئیں اور بعض نفسیات کی حد تک پہنچ گئیں۔ میں جب میر اثر کی مثنوی "خواب و خیال" کو دیکھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ کیسے وہ یہ سب کچھ لکھ گئے۔ حالانکہ وہ ٹھیٹ اللہ والے صوفی اور حضرت میر درد کے مرید اور شاگرد تھے ——— لیکن بہر حال وہ بھی انسان تھے۔ ان کی بھی فطری خواہشات تھیں جو دب کر ابھریں اور انکا اثر "خواب و خیال" کی صورت میں نمایاں ہوا ——— اور جس سے انکو ذہنی سکون بھی ملا۔

اس جذبے کا اظہار بھی سماجی ماحول کا پابند ہے۔ اور اس کی مختلف کیفیات کے بیان کو بھی ہمیں سماجی ماحول کے پس منظر میں دیکھنا چاہئیے۔ جب زمانہ بدلتا ہے، تو یہ خیالات بھی کروٹ لیتے ہیں اور وقت اور حالات کے تقاضوں سے شاعری میں بھی اسکی صورتیں بدلا کرتی ہیں۔ خود انسانی زندگی اپنے سماجی ماحول کی پابند ہوتی ہے اور انسان اپنی حرکات و سکنات کو سماجی نظریوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ شاعری چونکہ سماج اور ماحول کا عکس ہوتی ہے اسلئے اسمیں ان مختلف نظریوں کا بے نقاب ہونا بھی ضروری ہے چنانچہ ہر ملک کے مختلف زمانوں میں جنسی کیفیات کے بیان کے متعلق مختلف نظریئے ملتے ہیں۔ اگر ایک زمانے کے شعر و ادب میں ان کیفیات کے بیان کو سماج معیوب نہیں سمجھتا تو دوسرے دور میں اس پر سخت احتساب کرتا ہے۔ ایسے دور میں شاعر ایسی باتوں کے بیان میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، دل کھول کر کہتے ہیں۔ اور چونکہ انکی آواز وقت کی آواز ہوتی ہے اسلئے وہ کسی کے روکے رک بھی نہیں سکتی۔ دنیا بھر کی شاعری میں اس کی مثالیں ملتی ہیں ——— جب سماج رنگین ہوتی ہے اور تعیش کی دیوی ہر خاص و عام پر حکومت کرتی ہے تو اس زمانے کی شاعری میں بھی وہی رنگ جھلکتا ہے۔ عیش پرستی کا عنصر اسمیں قدم قدم پہ بے نقاب نظر آتا ہے۔ ایسے دور میں شعراء عورت اور شراب کا تذکرہ کرتے ہیں۔ حسن و عشق اور اسکی مختلف کیفیات کا ذکر تو ایسے ماحول میں نہیں ہوتا لیکن ہاں عورت کے جسم کی تعریف اور اسکی ہستی جس کیف کا باعث بنتی ہے، اس کا بیان ضرور ہوتا ہے۔ جس کے باعث اس میں اکثر جگہ عریانی پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس سماج کے افراد اسکو عریاں نہیں سمجھتے۔ کیونکہ وہ شب و روز اسی دنیا میں بسیرا لیتے ہیں۔ وہ اسی ماحول میں سانس لینے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہر ملک کی شاعری میں ایسے دور گذر چکے ہیں اور گذرتے رہتے ہیں۔ لیکن فرانس کی شاعری میں اس کی سب سے زیادہ فراوانی نظر آتی ہے۔ وہاں کے شاعر کھلم کھلا عورت کے ان اعضاء کا ذکر کرتے ہیں جن سے جنسی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر وہ ایسی ایسی باتیں کہتے چلے جاتے ہیں جسکو ہندوستان والے تو شاید ذرا بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ وہ کہیں اسکے پستانوں اور ان کے ابھار کا ذکر کرتے ہیں تو کہیں اسکو عریاں ہو جانے کا درس دیتے ہیں THEOPHILE GANTEER ایک نظم ہے ——— THE ROSE-COLOURED GOWN! جسمیں اس نے انہیں تمام باتوں کو پیش کیا ہے۔ وہ کہیں ایک عورت کے پستانوں کو TWIN IVORY GLOBES سے تعبیر کرتا ہے اور کہیں یہ کہتا ہے کہ اگرچہ اس کی گاؤن جسم پر بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی نازیبا ہے کیونکہ وہ حقیقتوں کو چھپائے ہوئے ہے ——— اور میری نظر ان کو دیکھنے کے لئے بیقرار ہے۔ اسلئے تو اپنے اس لباس کو اتار کر پھینک دے کیونکہ حقیقتوں کے اظہار میں بلا کی شیرینی اور مٹھاس ہوتی ہے ——— ایک گاٹیر ہی پر منحصر نہیں، فرانس کے اکثر شاعروں کا یہی حال ہے۔ اور اسکی وجہ صرف یہی ہے کہ انہوں نے ایسی سماج کے آغوش میں پرورش پائی، جو حد درجہ رنگین تھی اور جس میں ان کو

ایسی باتیں کرتے ہوئے جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی —— اور نہ صرف فرانس بلکہ دوسرے ممالک میں بھی اسطرح کے دور آئے اور آب بھی آتے رہتے ہیں۔

اردو شاعری میں بھی ایک ایسا دور آیا تھا، جب اس نے ایسی باتوں کو بڑے زور شور کے ساتھ اپنے دامن میں جگہ دی تھی یہ وہ زمانہ تھا جب لکھنؤ میں اودھ کی سلطنت اپنے شباب پر تھی اور یہاں کے نوابوں کی رنگین محفلوں اور تعیش پسندیوں کے شہرے دور دور پھیل گئے تھے۔ ان دنوں یہاں کی سماج کو سوائے جنسیات اور اسکے متعلقات کے اور کوئی بات سوجھتی ہی نہ تھی —— سوجھتی کیسے —— ؟ زندگی ایک نئے موڑ پر آچکی تھی۔ اب یہاں رنگینیاں راج کرتی تھیں — اگرچہ صنف نازک کو آزادی اب بھی نصیب نہیں ہوئی تھی لیکن اس کا بدل اس طرح ہو گیا تھا کہ شاہدانِ بازاری سے محلے کے محلے آباد تھے۔ اور ان دنوں کی سماج میں ان کو ایک خاص مرتبہ حاصل تھا۔ شریف سے شریف اور بڑے سے بڑے گھرانے ان سے ربط و ضبط قائم کرنے میں ذرا بھی نہ جھجکتے تھے خود مائیں اپنے نوجوان لڑکوں کے لئے اسکے انتظامات کرتی تھیں۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا —— یعنی ان دنوں کے ادب اور شاعری میں بھی وہی رنگ جھلکنے لگا —— چنانچہ اس زمانے کے قریب قریب ہر غزل گو شاعر کا معشوق بازاری معشوق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ اس کے اوپری رنگ و روغن کی تعریف زیادہ کرتے ہیں۔ اور اسکے ظاہری حسن اور جوبن کی قصیدہ خوانی میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں —— لیکن عشق کی دلی کیفیات، جن کا تمام تر تعلق دل سے ہے۔ ان کے یہاں نظر نہیں آتیں۔ اور بعض جگہ تو ان کی یہ جنسی ہیجان پسندی ان سے ایسی ایسی باتیں کہلاتی ہے کہ سُنکر حیران رہ جاتے ہیں۔ اور سوچنے لگتے ہیں کہ کیا یہی اس زمانے کی تہذیب تھی؟ کیا تہذیب کے علمبردار ایسے ہی ہوتے ہیں —— ؟ اس زمانے کا بڑے سے بڑا شاعر حتیٰ کہ آتش تک اس سے نہیں بچ سکا —— اسکی شاعری میں بڑی سنجیدہ اور پُر کیف ہونے کے باوجود ایک ایسا رنگ ملتا ہے جسکو وہ اس سماجی ماحول میں سانس لینے کے باعث پیش کرنے کے لئے مجبور رہتا —— جب آتش تک اس سے دامن نہ بچا سکا تو پھر چھوٹے شاعروں کا تو خیر کہنا ہی کیا؟ ان کے بیان میں عریانی لطافت کے ساتھ ہوتی تو قابلِ اعتراض نہ تھی —— لیکن وہ تو اس قدر آگے بڑھے ہوئے ہیں کہ ان سب سے اکثر کی شاعری ابتذال کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ جب وہ اس طرح کے اشعار کہتے ہیں

اے پری تو نے جو پہنی ہے سنہری انگیا
آج آتی ہے نظر سونے کی چڑیا مجھ کو — ناسخ

بوسہ بازی سے مری ہوتی ہے ایذا ان کو
منہ چھپاتے ہیں جو ہوتے ہیں جہاں سے پیدا — آتش

دوست کو لیکر بغل میں رات بھر سوتا ہوں میں
رشک ہے دشمن کو میرے طالعِ بیدار پر — ″

وصل کی شب اُن کے خوش کرنے کا ساماں کیجئے
خود بھی عریاں ہوجیئے ان کو بھی عریاں کیجئے — ″

اُٹھ گئے ساقینِ جاناں سے جو شب کو پائنچے
اک دو شاخہ نور کا محفل میں روشن ہو گیا — امانت

ہاتھ میں انگیا کی چڑیا آ گئی
آج ہم طائر کو لائے دام میں — ناسخ

کسی کے محرمِ آبِ رواں کی یاد آئی
حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا — آتش

تو ان کو پڑھ کر ہماری طبیعت منغض ہو جاتی ہے۔ لیکن بہرحال وہ ایک خاص دور اور ایک خاص سماج کی پیداوار ہیں۔ اسلئے ان کو مطعون نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ان شاعروں میں کوئی ایسی بڑی ادبی شخصیت کا مالک نہ تھا جو اس دلدل کو پار کر جاتا —— لیکن اس میں صرف اس زمانے کی رنگین سماج ہی کو دخل نہ تھا بلکہ اقتصادی اور معاشی حالات بھی اس کے بہت کچھ ذمہ دار تھے۔ اس زمانے کے شاعر بھی اپنے ماحول سے متاثر ہو رہے تھے۔ انہیں اگرچہ شعوری طور پر احساس نہ تھا لیکن غیر شعوری طور پر وہ یہ ضرور جانتے تھے۔ ان کی سلطنت کی بنیادیں

ریت پر قائم ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ مرہٹے اور انگریز اپنی طاقتیں روز بروز بڑھاتے جا رہے ہیں۔ وہ تو نبرد آزمائی میں مشغول ہیں لیکن ان کے یہاں قلعوں کی جگہ راج محلوں نے لے لی ہے۔ انہیں ان تمام بندھنوں کا احساس بھی تھا جن میں وہ بری طرح جکڑے ہوئے تھے۔ ان میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ حالات پر قابو پا لیتے۔ کیونکہ اندرونی حالات اس قدر بد سے بد تر ہو چکے تھے کہ ان کا علاج کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔ ذاتی بغض و عناد، نکالیاں، جعلسازیاں، یہ ساری چیزیں سلطنت کے رگ و ریشے میں سرایت کر چکی تھیں۔ ان حالات نے ان کو زندگی سے فرار اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ ان کی شاعری میں بھی ایک فراری کیفیت ہے وہ زندگی سے دور بھاگے اور انہوں نے پناہ لی صنف نازک کے کیفِ ہم آغوشی میں ——! وہ کھو گئے شراب ناب کی لہروں کے سرور میں! —— انہوں نے بسیرا لیا رنگینیوں اور رعنائیوں کے جھرمٹ میں! جہاں پہنچکر ان کی انتہا پسندی نے، ان کی شاعری کی حدیں ابتذال سے ملا دیں۔ اسی لئے آج ان کی شاعری ہمیں بری بھدی اور خراب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ان دنوں لوگ انہیں شعروں کو پسند کرتے تھے جن کو آج ہم تنہائی میں بھی دہراتے ہوئے شرماتے ہیں —— اس زمانے میں معاملہ بندی، اور جنسی تحریک پیدا کرنے والے اعضاء کا تذکرہ اگر شاعری میں نہ ہوتا تو وہ روکھی پھیکی سمجھی جاتی۔ یہ بھی زمانے کی بلہاری تھی ——!

برخلاف اس کے میر و سودا کے زمانے کی شاعری کو دیکھئے!

—— ان سب کے یہاں بھی جنسیات کا تذکرہ ہے لیکن ایسی عریانی نہیں جو آتش و ناسخ اور دوسرے لکھنوی شعراء کے یہاں موجود ہے۔ میر و سودا اور دلی اسکول کے دوسرے شعراء کے یہاں حسن و عشق کا ایک بلند تصور ملتا ہے۔ وہ داخلی کیفیات کا بیان زیادہ کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ظاہری حسن اور خارجی کیفیات کا بیان نہیں، جس کی وجہ سے ایسی زیادہ عریانی بھی پیدا نہیں ہوتی —— یہ سب بھی ایک خاص سماج کی پیداوار ہے۔ میر و سودا نے جس زمانے میں سانس لی، اس میں صنف نازک پر پابندیاں کچھ زیادہ عائد نہ تھیں۔ وہ مکانوں کے زنانوں میں اس وقت بھی مقید نہ تھیں۔ شاہراہِ بازاری کی بھی وہ فراوانی نہ تھی جو آگے چل کر لکھنؤ میں ہوئی۔ اسی وجہ سے ہمیں ان سب کے یہاں جنسی بھوک کا پتہ چلتا ہے۔ جس میں ایک سلگنے والی کیفیت ہے۔ آزادی اور بغاوت کا تصور ابھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنے ماحول سے بغاوت کر کے کچھ ایسی باتیں کرتے جو اگرچہ عریاں ہوتیں لیکن ذہنی حیثیت سے انکو تھوڑا بہت سکون بخش دیتیں۔ البتہ ان حالات کا ایک نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ امرد پرستی کا ذکر شاعری میں بھی ہونے لگا۔ اور میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ یہ چیز صرف ایران کی تقلید ہی پر مبنی نہ تھی بلکہ حالات و واقعات کا تقاضا تھی۔ اس سماج میں امرد پرستی کا رواج ضرور تھا —— ہرچند آج اسکو کوئی چھپانے کی کوشش کرے۔ لیکن جب بھی کوئی ذرا گہری نظر سے دیکھے گا تو اسکو یہ یقین ہو جائیگا کہ ایسا تھا اور ضرور تھا۔ چنانچہ اس [illegible] شاید ہی کوئی شاعر (درد کو چھوڑ کر جن کی میرے دل میں بڑی عزت ہے اور جن کی شاعری کو میں سوائے متصوفانہ شاعری کے اور کسی قسم کی شاعری نہیں سمجھتا) ایسا ہوا ہو جس نے امرد پرستی کا تذکرہ اپنی شاعری میں نہ کیا ہو —— اور چونکہ ان کے دیوانوں میں کھلم کھلا ایسے اشعار ملتے ہیں اسلئے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانے پر اس پر احتساب بھی اتنا سخت نہ تھا۔ مشاعروں میں کھلم کھلا ان موضوعات پر اشعار پڑھے جاتے تھے۔ اور سننے والوں کو ان پر وجد آ جاتا تھا ——

ان کے یہاں فراری کیفیت بھی نظر نہیں آتی۔ کیونکہ باوجود سپر ڈال دینے کے وہ ابھی میدان کارزار میں مصروف جنگ تھے —— ان کے پیچھے شاندار روایات تھیں جو انہیں آگے کی طرف دھکیل رہی تھیں۔ وہ اگرچہ شکست کھا چکے تھے اور انکی حکومت صحیح معنی میں لال قلعے ہی تک محدود تھی۔ لیکن اسکے باوجود وہ سمجھتے تھے کہ اتنی بڑی اور شاندار حکومت کا تختہ آسانی سے نہیں الٹ سکتا اسلئے ان کی شاعری میں ایک حد تک سینہ سپری کا سا انداز بھی نظر آتا ہے۔ جن کی منہ میں ایسی کراہوں کی آوازیں موجود ہیں۔

جو زخموں سے چور ہو جانے کے بعد دکھے ہوئے دلوں سے نکلتی ہیں یہ سب بھی وقت اور ماحول کے ادنٰے کرشمے تھے۔

یہ تو تھیں اس زمانے کے ان شاعروں کا ذکر تھا جو ذرا اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اسی زمانے میں آگرے کی سرزمین پہ ہمیں ایک ایسا شاعر ملتا ہے جو ان سب سے الگ ہے۔ اسکی شاعری میں ہمیں بالکل ایک نیا رنگ نظر آتا ہے۔ وہ عوام کا ترجمان ہے اس کی شاعری میں زندگی ہے۔ اسمیں حقیقتوں کا بیان ہے۔ اس میں تکلف اور تصنع کو مطلق دخل نہیں۔ وہ ایک ایسا انسان تھا جو ہر خاص و عام سے ملتا تھا۔ اسلئے اسکی شاعری میں بھی انہیں حالات و کیفیات کے مرقعے موجود ہیں۔ اور اس نے ان کی زندگی کے صرف کسی ایک پہلو پہ قلم نہیں اٹھایا ہے بلکہ سارے ماحول کو اپنی شاعری میں سمو دیا ہے۔ چنانچہ اس کے یہاں عورتوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ ان کے جسم کے ایک ایک عضو اور عشوۂ و ناز و ادا کی تصویریں بھی موجود ہیں۔ وہ جنسی جذبے اور اسکی مختلف حالات و کیفیات کا بیان بھی کرتا ہے ——— اور ان سب باتوں کو پیش کرتے وقت وہ کہیں بھی حقیقت نگاری کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ اس نے عشق کیا ہے۔ لیکن ایسا عشق نہیں جس میں صرف شب ہجر کی تلخیاں ہی سہنی پڑتی ہیں۔ اور مجنوں بن کر صحراؤں اور بیابانوں کی خاک چھاننی جس کی پہلی منزل ہے۔ اس کے عشق میں سب سے زیادہ جو چیز نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ اس کا جنسی پہلو ہے۔ اس کا معشوق بازاری معشوق ہے، جس کے یہاں جا کر وہ جب بھی چاہے۔ اپنی پیاس بجھا سکتا ہے۔ وہ اندھیری رات میں فرقت کے جانسوز لمحے نہیں کاٹتا۔ بلکہ رستے میں جاتے ہوئے اس کا معشوق مل جاتا ہے اور اسکی دلی مراد بر آتی ہے۔ ان تمام چیزوں کے بیان میں بھی عریانی کو دخل ہے لیکن چونکہ حقیقتوں کا بیان ہے اسلئے آج ہم اسکی قدر کرتے ہیں، حالانکہ اسکے زمانے میں اسکی وہ قدر نہ ہو سکی جو اسکے دوسرے ہمعصروں کی ہوئی۔ شیفتہ تک نے اس کو شاعر نہیں مانا ——— بات یہ تھی کہ اس نے اپنی دنیا اونچے طبقے سے علیحدہ بنائی تھی۔ اور وہ ایک عامی انسان کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ اسیوجہ سے عامی انسانوں کی ذہنی کیفیات۔ اور انکی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تصویریں، اسکی شاعری میں بھی ملتی ہیں۔ وہ جنسی جذبات کا تذکرہ جس انداز سے کرتا ہے۔ وہ بھی ہے ایک حد تک عامی ہے۔ لیکن اس میں حقیقت نگاری کا عنصر موجود ہے۔ اس کی تصویریں جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی معلوم ہوتی ہیں۔ اور وہ پیداوار ہیں اس سیاسی، سماجی اور معاشی ماحول کی جس میں اس نے سانس لی ——— یہ شاعر تھا نظیر اکبر آبادی ——— ا

پھر غدر کے زمانے کو دیکھئے! جب آزاد و حالی ایک انقلاب کا پیغام دے رہے تھے۔ جب سارا ہندوستان اپنا چولا بدل دینے کا متمنی تھا۔ ان کی تحریکوں میں میں رفارم کی کوشش سب سے زیادہ نظر آتی ہے۔ وہ ہندوستان کے گیسوؤں کو سنوارنے کے خواہشمند تھے جو حقیقتاً ان دنوں منت پذیر شانہ تھے۔ ادب ہی پہ کیا منحصر ہے۔ ان دنوں تو زندگی کے ہر شعبے میں رفارم کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی تھی۔ سیاسی اعتبار سے بھی ہندوستان اب ریفارم چاہتا تھا۔ کیونکہ میدان کارزار میں تو اس نے سپر ڈال دی تھی اور اب اس کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہیں سلا تھا کہ وہ بیرونی حاکموں کے زیر سایہ اپنی حالت کو زیادہ سے زیادہ سدھارنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ سر سید احمد خاں کی سیاسی تحریکیں وجود میں آئیں ——— ادب میں بھی یہی ہوا کہ اسکے اندر جو خرابیاں ایک انتشاری ماحول نے پیدا کر دی تھیں۔ انکو زیادہ سے زیادہ دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایسی حالت میں کوئی ایسی بات جنسیات سے متعلق پیش نہیں کی جا سکتی تھی جسمیں عریانی کو دخل ہو اور جو عوام میں کوئی فراری کیفیت پیدا کرے۔ اسی وجہ سے حالی کے یہاں جو اس زمانے کا نمایندہ شاعر ہے۔ حسن و عشق کا بیان تو ملتا ہے لیکن لطیف انداز میں ا——— ایک سنبھلی ہوئی کیفیت کے ساتھ۔ جس میں سادگی کو سب سے زیادہ دخل ہے چنانچہ حالی نے ان چیزوں کو سراہا نہیں جو اکثر شعراء نے اب تک روا رکھی تھیں۔ یعنی اس نے عریاں شاعری کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ اس کے یہاں مولوی اور شاعر کی حیثیتیں ایک

جگہ ملتی ہیں۔ اور وہ ہمارے ادب میں ایک بڑی قابلِ قدر ہستی ہے لیکن اس گروپ کو چھوڑ کر ذرا دیکھئے کہ قریب قریب اسی زمانے میں داغ اور امیر مینائی بھی اپنی اپنی محفلیں جمائے ہوئے ہیں۔ اور وہ اپنی شاعری میں جن خیالات کو سموتے ہیں۔ وہ حالی سے بالکل مختلف ہیں۔ داغ کے یہاں جنسی کیفیات کا تذکرہ بہت زیادہ ہے۔ اور اس کی تقلید میں امیر مینائی بھی اسی رنگ میں رنگ گئے ہیں۔ داغ تو خیر اسی دنیا کا انسان تھا۔ اور اس نے ان تمام حقیقتوں کا بیان کیا جو ہر انسان کے دم کے ساتھ وابستہ ہیں۔ لیکن امیر مینائی نے باوجود ایک اللہ والے، صوفی ہونے کے ایسی باتیں کہیں جو بعض جگہ داغ کو بھی مات کر دیتی ہیں ——— آخر کیا وجہ ہے کہ ایک ہی دور میں ہمیں یہ دو رنگی نظر آتی ہے؟ ——— بات یہ ہے کہ ان دونوں حلقوں کے شاعروں نے اپنی اپنی افتادِ طبع کے مطابق اپنے سماجی ماحول سے اثر قبول کیا۔ ایک کا شعور چونکہ زیادہ بیدار تھا۔ اس میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں زیادہ تھیں۔ اسلئے اس نے زندگی سے فرار اختیار نہیں کیا۔ دوسرے نے دماغ کے بجائے دل سے زیادہ کام لیا۔ چنانچہ زندگی کی حقیقتوں سے بھاگ کر وہ رومان کی دنیا میں بسیرا لینے لگے۔ زمانہ جس انتشار سے ہم آغوش تھا۔ انہوں نے اس کو فراموش کر دینا چاہا ——— رنگینیوں اور رعنائیوں کے بیان میں کھو کر! ——— یہ ساری کیفیت بھی سماجی اور معاشی ماحول کا تقاضا تھی۔

اس کے بعد جنگ عظیم اور اس کے آس پاس کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ جب ہندوستان میں مغربی تعلیم کا رواج اچھی طرح ہو گیا اور یہاں کے لوگوں نے زندگی کے ہر شعبے میں مغرب کا اثر قبول کرنا شروع کیا۔ ادب بھی اس سے بچ نہ سکا۔ چنانچہ جنگ عظیم کے بعد کی اردو شاعری مغربی شاعری سے بہت زیادہ متاثر نظر آتی ہے لیکن اس زمانے میں اس رومان کا رنگ غالب ہے جو شیلے، کیٹس اور بائرن کا حصہ ہے۔ اقبال کو چھوڑ کر، جس کی شاعری سوائے تفکر کے اور کچھ نہیں، اس زمانے کے سارے شاعر رومان کی رنگین شاہراہوں پر چلتے نظر آتے ہیں۔ اور جوش ان سب میں آگے ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں وہ کہیں بہار کے متعلق نظم لکھتا ہے۔ کہیں "جنگل کی شہزادی" کی تصویر کھینچتا ہے۔ اور کہیں "مہترانی" یا "جامن والیوں" کا تذکرہ کرتا ہے۔ اور اگرچہ ان سب میں بھی رومانی عنصر غالب ہے۔ لیکن حقیقت کا بھی فقدان نہیں۔ وہ جامن والیوں کے حسن کی تعریف ہی نہیں کرتا۔ بلکہ آخر میں ایک حقیقت کا اظہار بھی کر دیتا ہے۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے باعث ان فصلوں میں اکثر اسکی رسوائی ہو چکی ہے۔ ؎

جوشؔ یہ کافر مناظر ہوش میں رکھتے نہیں
آہ ان فصلوں میں اکثر اپنی رسوائی ہوئی (جامن والیاں)

یہ بھی زندگی کی ایک عام حقیقت ہے۔ اور جنس کا ایک پہلو جس کے بیان کو گناہ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس قسم کے واقعات کا ظہور پذیر ہونا کوئی ایسی بات نہیں جس پر تعجب کیا جائے۔ نوجوانوں کی دنیا میں ایسی باتیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ پھر اگر لطیف انداز میں ان کا بیان کر دیا جائے تو ایسی کونسی بری بات ہے ———

لیکن اس قسم کی آوازیں اس دور میں دبی دبی اور گھٹی گھٹی سی آوازیں معلوم ہوتی ہیں۔ ابھی ان کے بیان میں وہ تندی اور تلخی نہیں آئی تھی جو آگے چل کر پیدا ہو گئی ——— جوشؔ کے علاوہ جو شاعر اس راہ پر چلے، ان سب میں اگرچہ ایک انفرادیت ہے۔ لیکن وہ بے باکی کا پہلو نہیں جو جوشؔ کے یہاں ہمیں جگہ جگہ ملتا ہے ——— وہ سب عورت کا تذکرہ کرتے ہیں، لیکن روایتی انداز میں ———! اگر ان کے اندازِ بیان اور طرزِ ادا کو چھوڑ کر دیکھا جائے۔ تو جہاں تک حسن و عشق کی کیفیات کے بیان کا تعلق ہے۔ وہ غزل میں سموئے ہوئے خیالات سے آگے نظر نہیں آتے ان میں سے زیادہ تر عورت کے حسن کا بیان کرتے ہیں جس میں کہیں کہیں جنسی پہلو ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن کسی خاص حقیقت کو وہ پیش نہیں کرتے۔ جوشؔ نے یقیناً اس سلسلے میں بڑی ہمت سے کام لیا اور آیندہ چلنے والوں کو ایسا راستہ دکھا دیا جس پر چل کر وہ ——— بہت دور نکل گئے ——— حتیٰ کہ آنکھوں سے

ادجھل ہوگئے۔ لیکن بعض لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکتے رہے۔

اب اردو شاعری کا بالکل ایک نیا دور شروع ہوا جس میں وہ حقیقت نگاری سے زیادہ قریب آگئی۔ عورت کے متعلق صرف رومانی باتوں کا دور اب ختم ہوگیا۔ اب وہ ایک نئے موڑ پر آگئی۔ جہاں جنسیات، اسکی مختلف کیفیات کا بیان، عورت کے جسم سے پیدا شدہ لذت کا تذکرہ، اب نوجوان شاعروں نے کھلم کھلا شروع کردیا۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ یہ موضوع انسانی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس کے اثرات جسم اور ذہن دونوں پر بیشمار ہیں، تو پھر اس کو پیش کرنے میں جھجک کیا معنی ——؟ —— اس منزل میں جو شاعری ہوئی اور ہو رہی ہے، اس کو عریاں کہا جاتا ہے۔ کیف صرف عورت کے جسم سے متعلق کچھ باتوں کا تذکرہ ہی کیا کسی فن پارے کو عریاں بنا سکتا ہے۔ ؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک زمانہ وہ ضرور تھا جب ذہنی پایہ زنجیری انسان کے گلے کا ہار تھی وہ پتھروں، درختوں، چاند، تاروں، سورج اور کوہساروں کے سامنے جھکتا تھا۔ اور ان سب کو دیوتا مانتا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ سارے خیالات بدلتے گئے۔ اس کے اسطرح کے قائم کئے ہوئے خیالات اوہام اور صرف اوہام نکلے۔ پھر زمانہ اس کو رفتہ رفتہ زیادہ سائنٹفک بناتا گیا۔ عورت کے جسم اور جنسیات کے تذکرے کا بھی یہی حال ہے۔ کہ بعض زمانوں میں لوگوں نے اس کے بیان کو اچھا نہیں سمجھا۔ لیکن دنیا ہمیشہ تو ایک نہج پر نہیں چل سکتی۔ زندگی کی قدریں ہمیشہ بدلا کرتی ہیں۔ اسلئے جنسیات کا تذکرہ اور اسکی فطری کیفیات کا بیان، اب وقت کا تقاضا ہے۔ کیونکہ دنیا بدل چکی ہے۔ اب ہر بات کو سائنٹفک طریقے پر سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اور جو ایسا نہیں کرتا اسکو اس دنیا میں رہنے کا حق حاصل نہیں۔

جنسیات کے متعلق غور کرنے کے لئے بیسویں صدی کا زمانہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس زمانے میں سارے یورپ میں اس مسئلے نے بڑی اہمیت اختیار کرلی۔ یورپ کے مختلف سائنسدانوں فلسفیوں، طبیبوں اور ادیبوں نے اس پر غور کرنا شروع کیا عورتیں تک اس کام میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں۔ کلیسا تک نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اور ان سب کے ہاتھوں جنسیات کے اسرار و رموز کھلم کھلا بے نقاب ہونے لگے۔ ان سب میں ہیولاک ایلس ایک بہت بڑے مرتبے کا مالک ہے۔ جس کی کتاب PSYCHOLOGY OF SEX نے شائع ہوکر سارے یورپ میں تہلکہ ڈال دیا۔ اور جس کی پہلی جلد کو ہندوستان میں ممنوع قرار دیا گیا۔ لیکن امریکہ نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ بلکہ اس کا خیر مقدم کیا —— ہیولاک ایلس نے جنسیات کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی۔ جنسی مظاہرات، جو مختلف مذاہب اقوام میں موجود تھے۔ ان کو بے نقاب کیا۔ اور نوجوانوں کو اس مسئلے کی گتھیوں کو سلجھانے کی طرف راغب کیا —— وہ کہتا ہے کہ جنسی جذبہ ایک آگ ہے جسکو کوئی بجھا نہیں سکتا۔ وہ ایسی ہی آگ ہے جو حضرت موسیٰ نے کوہ طور پر دیکھی تھی۔ SEX IS AN EVERLASTING FIRE THAT NOTHING WILL EXTINGUISH. IT IS LIKE THAT FLAME, WHICH MOSES SAW ON MOUNT HOREB, BURNING THE BUSH WHICH YET WAS NOT EXTINGUISHED.

اس نقطے سے وہ اپنے فکری سفر کا آغاز کرتا ہے اور پھر نہ جانے کتنے خطروں اور قریوں کی خاک چھانتا ہے۔ وہ اس کا بھی تذکرہ کرتا ہے کہ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے کہ جب عشق و محبت کا ایک فن کی حیثیت سے بیان کرتے ہوئے ہر شخص کے چہرے پر شرم و حیا کے رنگ دوڑنے لگتے تھے۔ لیکن اب ہمیں اسکو ایک مقدس فریضہ سمجھنا چاہیئے۔ اب یہ چیز شاعروں ہی تک محدود نہ رہنی چاہیئے۔ بلکہ ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ اس پر غور کرے۔ کیونکہ اس میں زندگی کے خوشگوار یا ناخوشگوار ہونے کا راز مضمر ہے۔ (مسلسل)

اختر شیرانی

محبت سے پہلے

یہ زمیں سادہ تھی، جنت نہ ہوئی تھی پیدا!
زندگی میں کوئی لذت نہ ہوئی تھی پیدا
ذہن اور فکر میں عظمت نہ ہوئی تھی پیدا
—— جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا!

میرے افکار کے پھولوں میں بہار آئی نہ تھی!
میرے اشعار میں رنگینی و رعنائی نہ تھی!
میری تخئیل میں ندرت نہ ہوئی تھی پیدا
—— جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا!

مصرِ افکار تھا بیگانہ، زلیخاؤں سے!
میرے ارماں کدے محروم تھے سلماؤں سے!
فکر اور شعر میں لذت نہ ہوئی تھی پیدا
—— جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا!

بے اثر تھی مری نظروں میں ستاروں کی بہار
کتنی افسردہ تھی قدرت کے نظاروں کی بہار
کسی منظر میں لطافت نہ ہوئی تھی پیدا
—— جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا!

یہ جہاں سادہ تھا، نادان تھا، یا غم زدہ تھا
ایک اک ذرہ پریشان تھا، ماتم زدہ تھا
باغِ ہستی میں مسرت نہ ہوئی تھی پیدا
—— جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

نہ گھٹاؤں میں تھا یہ رنگِ خراماں پہلے
نہ ہواؤں میں تھی یہ بوئے پریشاں پہلے
رنگ و بو میں یہ حلاوت نہ ہوئی تھی پیدا!
—— جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

آرزوئیں تھیں نہ یہ حسن بھرا خواب اُن کا
نہ اُمنگیں تھیں نہ یہ نشۂ شاداب اُن کا
کسی جذبے میں طراوت نہ ہوئی تھی پیدا
—— جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

حسن خنداں تھا، نہ دیوانے نظر آتے تھے
شمع روشن تھی، نہ پروانے نظر آتے تھے
یہ جنوں اور یہ وحشت نہ ہوئی تھی پیدا
—— جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

شیریں اٹھی تھی نہ ایراں کی فضا سے اب تک
کوئی بلقیس نہ آئی تھی سبا سے اب تک
اور سلیماں کی شوکت نہ ہوئی تھی پیدا
—— جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا!

کرشن چندر

ایک تمثیل

یہاں سب غلیظ ہیں

افرادِ ڈرامہ

جگ موہن۔ نوجوان رئیس زادہ۔ جوشیلا۔ باتونی۔ بے عمل۔ ڈرپوک۔ خود پرست۔ خطیبانہ اندازِ گفتگو۔

رمبھا۔ کم گو۔ جگ موہن کی بیوی۔ ہنسی اور لہجے میں طنز کی جھلک نمایاں ہے۔

ونود۔ جگ موہن کا دوست

انور۔ جگ موہن کا دوست۔ بھاری آواز

منشی جی۔ کارندہ۔ وکیل۔ نیم خوشامدی۔ تملق پسند

پاسی۔ نئے زمانے کا کسان

سیٹھ جی۔ پرانے زمانے کا رئیس

چھمیا۔ سیٹھ جی کی داشتہ

وقت۔ سہ پہر

مقام۔ جگ موہن کا ڈرائنگ روم۔ ایک دروازہ سیٹھ صاحب کے دیوان خانے میں کھلتا ہے۔ دوسرا دوسرے کے مطالعہ کے کمرے میں تیسرا دروازہ ملاقاتیوں کے لئے ہے۔ اس وقت تینوں دروازے کھلے ہیں۔

(جگ موہن، رمبھا، انور اور ونود چائے پی رہے ہیں)

جگ موہن۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا انور؟

انور۔ (چڑکر) جگ موہن بھائی میں کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ مجھے تمہاری باتیں یاد نہیں رہتیں۔ پھر میں تمہاری ڈائری نہیں۔ یادداشت نہیں۔ روزنامچہ نہیں اور اس پر مصیبت یہ ہے تم سمجھتے ہو کہ جو جملہ تمہاری زبان سے ادا ہوتا ہے وہ ارسطو کی آخری تفسیر ہے۔

رمبھا۔ (ہنستی ہے)

جگ موہن۔ رمبھا اس میں ہنسی کی کیا بات ہے؟

رمبھا۔ کچھ نہیں (کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے)

جگ موہن۔ پھر وہی۔ ہی ہی ہی ہنس رہی ہو۔ آخر مجھے بھی کچھ پتہ چلے۔

رمبھا۔ انور بھائی کو ان کے والد مجبور کر رہے ہیں کہ وہ انجمن فلاح و بہبودی خواتینِ ہند کا کام چھوڑ دیں۔ اور رانیٹوں کا بھٹہ سنبھال لیں۔ اس پر انور بھائی کو غصہ آ رہا ہے اور وہ غصہ اب آپ پر اتار رہا ہے کیوں انور بھائی؟

انور۔ تمہیں چڑیل ــ زبیدہ نے بتایا ہوگا!

رمبھا۔ (ہنستی ہے)

ونود۔ یہ بھی اچھی رہی (ہنستا ہے)

انور۔ (ڈپٹ کر) تم چپ رہو ونود۔

جگ موہن۔ کیوں؟ ونود کیوں چپ رہے؟ اس ٹریجیڈی کے متعلق تمہارے ہر دوست کو رائے دینے کا حق ہے! (وقفہ) لیکن مجھے اس میں ہنسی کی کوئی بات نظر نہیں آتی میں نہیں سمجھ سکتا آخر تمہارے والد کو یہ حق کیسے حاصل ہے کہ وہ تمہیں اینٹوں کے بھٹے کے کاروبار میں لگا دیں۔ تم سوسائٹی کے ایک تعلیم یافتہ ترقی پسند

فرد ہو روشن خیال بلکہ آزاد خیال ہو۔ آواز بلند ہوتی جارہی ہے تم اپنی زندگی قوم ہو دطت کے لئے وقف کر چکے ہو اپنے وطن کی ان لاکھوں کروڑوں معصوم و بے زبان عورتوں کے لئے جو……

رمبھا۔ (بات کاٹ کر) انجمن فلاح و بہبودیٔ خواتینِ ہند! (ہنستی ہے)

جگ موہن۔ (غصے سے) پھر؟……

رمبھا۔ معاف کرنا جگ ڈارلنگ۔ مجھے اینٹوں کا بھٹہ یاد آرہا ہے۔ (ہنستی ہے)

جگ موہن۔ اینٹوں کا بھٹہ ہاں ہاں، انور اینٹوں کا بھٹہ تمہاری ذہانت کو کچل کر رکھ دے گا۔ تمہاری فطری صلاحیتوں کو پامال کر دے گا۔ میں کہتا ہوں دنیا کے کسی باپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس طرح اپنے بیٹے کی روحانی تمناؤں کو کچل دے۔ یہ سماج کا ظلم ہے۔ بیداد ہے! بیداد ہے!! بیداد ہے!!!

ونود۔ (شوخی سے) تمہیں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا چاہیئے۔ انو

انور۔ (ڈپٹ کر) تم چپ رہو ونود

جگ موہن۔ ونود کیوں چپ رہے؟ ونود بھی تمہارا دوست ہے وہ بھی ایک روشن خیال بلکہ آزاد خیال انسان ہے۔ وہ بھی اک نئے سماج کی تعمیر چاہتا ہے جہاں باپ بیٹے پر ظلم نہ کر سکے۔ جہاں وہ اس کی امیدوں کے ہرے بھرے نخلستان کو برباد نہ کر سکے۔ میں کہتا ہوں انور تم انکار کر دو۔ فوراً انکار کر دو۔ کہہ دو کہ میں اینٹوں کا بھٹہ نہیں چاہتا۔

رمبھا۔ (ہنس کر) انجمن فلاح و بہبودیٔ خواتینِ ہند چاہتا ہوں۔

جگ موہن۔ (غصے سے) رمبھا!

رمبھا۔ (بالکل ملائم) Sorry!

جگ موہن۔ انکار کر دو انور، ورنہ تمہاری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ نیا اخلاق اس ظلم کو چپ چاپ سہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ زندگی ایک مقدس شے ہے۔ اور جو والد اپنے بیٹے کی زندگی تباہ کرنا چاہتا ہے دانستہ یا نادانستہ طور پر شعوری یا لاشعوری طریق پر۔ وہ خود بداخلاق ہے۔ میں تم سے کہتا ہوں انور۔ اگر میرا باپ مجھ سے اس قسم کی بداخلاقی برتتے تو ـــــ

(اس موقعہ پر چھمیا گنگناتی ہوئی داخل ہوتی ہے)

چھمیا۔ سانوریا! نجریا توری ـــ سانوریا، توری نجریاااا…… او وہ چھوٹی سرکار ہیں۔ معاف کیجئے گا میں سمجھی بڑی سرکار کا کمرہ……

جگ موہن۔ سیٹھ صاحب دیوان خانے میں ہیں۔ اسی دروازے سے تشریف لیجائیے

چھمیا۔ شکریہ شکریہ۔ (مسکراتے ہوئے) چلے آؤ۔ (دو لو۔ کوئی نہیں۔ اپنی ہی سرکار ہیں گنگناتی ہوئی جاتی ہے) سانوریا…… توری نجریا نے…… سانوریا……

(Fade out)

جگ موہن۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا ونود؟

ونود۔ ذکر باپ کی بداخلاقی کا ہو رہا تھا کہ ـــ

رمبھا۔ لو چھمیا جان آگئیں (ہنسی)

جگ موہن۔ رمبھا تم ہمیشہ یونہی بے موقع ہنستی ہو۔

رمبھا۔ معاف کر دو میں تم پر نہیں چھمیا جان کے لباس پر ہنسی تھی کیسا بھونڈا مذاق ہے اس کا۔ شانے ننگے سینہ ننگا۔ بلاؤز پیچھے سے گہرا کٹا ہوا۔ عریانیت کی زندہ تصویر!

جگ موہن۔ عریانیت میں کیا برائی ہے۔ تمام جانداروں میں صرف ایک انسان ہے جو کپڑے پہنتا ہے۔ (وقفہ) یہ امر خلاف فطرت ہے۔ عریانی عین فطرت کے مطابق ہے۔ میں تو زندگی کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنا پسند کرتا ہوں!

ونود۔ یعنی ننگا۔ بالکل عریاں۔

جگ موہن۔ ہاں۔ عریاں۔ عریانیت ہی زندگی کا صحیح اخلاق ہے۔ جب ہم اپنی زندگی میں اپنے قول و فعل، اپنے سماج، اپنی معاشیات اپنے رسم و رواج کو بالکل ننگا دیکھ سکیں گے اسی وقت دنیا صحیح معنوں میں آزاد ہو گی جب ظاہر و باطن میں فرق نہ ہو گا جب کہنے اور کرنے میں فرق نہ ہو گا جب انسان کی معاشی، معاشری اور تمدنی زندگی پر پڑے ہوئے سب نقاب اور کپڑے اتر جائیں گے۔ اسی وقت دنیا آزاد ہو گی۔ اور ترقی کی طرف گامزن ہو گی۔

انور۔ کیا ترقی ننگے سینے، ننگے شانے اور گہرے کٹے ہوئے بلاؤز سے تعلق رکھتی ہے؟

جگ موہن۔ کیوں نہیں میں تو چھمیا کو داد دیتا ہوں کہ وہ ہمیشہ کم سے کم کپڑا استعمال کرتی ہے۔ آخر انسان کے جسم کی ساخت سے کون آگاہ نہیں ہے؟ پھر اسے چھپانے سے کیا حاصل، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انسانی جسم کی ساخت سے کس طرح بداخلاقی پھیلتی ہے؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ فطرت بداخلاق ہے، ورنہ ننگے شانے دیکھ کر آپ کے دل میں بداخلاقی نہ عود کر آتی!

ونود۔ فطرت ہرگز بداخلاق نہیں ہے۔

رمبھا۔ فطرت بداخلاق ہے۔ ونود بھائی۔ ورنہ آپ حضرت گنج میں کپڑے کی دکان نہ کھولتے۔

ونود۔ میں ۔ میں ۔۔۔ کپڑوں کی دکان کرتا ہوں ۔۔۔ مگر ۔۔۔ مگر ۔۔۔ اس کا رومانیت سے کیا تعلق ۔۔۔ بداخلاقی سے کیا واسطہ؟ ۔۔۔۔۔۔ وہ ۔۔۔ تو میرے والد کی دکان ہے!

انور۔ (چڑ کر) اینٹوں کا بھٹہ بھی تو میرے باوا کا ہے!!

رمبھا۔ (ہنس کر) اور چمپا بھی تو جگ موہن کی نہیں، بڑے سیٹھ جی کی داشتہ ہے!!!

(پس منظر میں چمپا کے گانے کی آواز سنائی دیتی ہے)

جگ موہن۔ (گرج کر) رمبھا!

رمبھا۔ (بالکل ملائم) معاف کر دو جگ ڈارلنگ۔ ۔۔۔ مگر میں تو تمہارے حق میں کہہ رہی تھی۔ (وقفہ) آہ! یہ غزل تم نے سنی؟ چمپا کبھی کبھی تو دل تڑپا دیتی ہے (سرگوشی سے) ذرا یہ دروازہ تو کھول دو چپکے سے!

(اب چمپا کے گانے کی آواز صاف سنائی دیتی ہے)

نہ شعور میں جوانی نہ خیال میں روانی کوئی سن کے کیا کرے گا مری دکھ بھری کہانی

تری زندگی حقیقت، مری زندگی فسانہ وہ خرد کی تنگ ظرفی، یہ جنوں کی بیکرانی

مرے دل کا داغ دائم کہ جھلک رہی ہے اس میں ترے مہر کی تمنا، ترے قہر کی نشانی

مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں ادھوری

مری موت سے نہ ہوگی مرے غم کی ترجمانی (ندیم)

سیٹھ جی۔ (دوسرے کمرے سے بآوازِ بلند) دروازہ بند کر دو جگ موہن۔ دروازہ بند کر دو۔

(جگ موہن آہستہ آہستہ دروازہ بند کرتا ہے۔ چمپا کی آواز فیڈ آؤٹ ہوتی جاتی ہے)

انور۔ (طنزاً) دروازہ بند کر دو۔

ونود (طنزاً) دروازہ بند کر دو۔ کہ چمپا گا رہی ہے۔

رمبھا (طنزاً) چمپا تو رومانیت پسند ہے!

انور (طنزاً) چمپا تو طوائف ہے!

جگ موہن۔ (دروازہ بند کر کے) مجھے طوائفیت پسند نہیں۔ مگر یہ سیٹھ جی کی پرائیویٹ زندگی ہے، میں انہیں کیسے سمجھاؤں؟ اور میں یہ حق بھی نہیں رکھتا کہ ان کی پرائیویٹ زندگی میں دخل دوں۔ ہر کسی انسان کو یہ حق نہیں دیتا۔ کہ وہ دوسرے انسان کی پرائیویٹ زندگی میں دخل دے۔ اسی لئے تو میں انور سے کہتا ہوں کہ وہ اینٹوں کا بھٹہ ۔۔۔۔!

ونود۔ پھر وہی اینٹوں کا بھٹہ!

انور۔ اسے بھئی ایک بار تم نے کہہ دیا میں نے سن لیا مگر تم ہو کہ چلے جاتے ہو۔ مجھے جھکی ہو جگموہن۔ بھیا میں ضرور ابا سے لڑوں گا ضرور لڑوں گا اینٹوں کے بھٹے پر کام کرنے نہیں جاؤں گا نہیں جاؤں گا ۔۔۔۔۔ (وقفہ) مگر ایک بات تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا تمہارے والد کی پرائیویٹ زندگی تمہاری پرائیویٹ زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتی؟

جگ موہن۔ بالکل نہیں۔ میرا ذہن، میری تعلیم، میرا اخلاق پتا جی سے بالکل الگ ہے مختلف ہے۔ مجھے طوائفیت سے اور اپنے ساهتی نظام سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تو طوائفیت کو مٹا کر عورت اور مرد دونوں کو برابر کا درجہ دینا چاہتا ہوں۔ میں تو ایک ایسا سماج چاہتا ہوں، جہاں طوائف کا نشان نہ ہو، جہاں کوئی کسی پر ظلم نہ کر سکے، جہاں سب برابر ہوں۔ انور بھائی۔ تم میرے قول و فعل میں کبھی کوئی تضاد نہ پاؤ گے۔ یہ فلسفۂ زندگی میری حیات کا جزوِ عظیم ہے!

رمبھا (تالی پیٹتے ہوئے) Hear! Hear!!

جگ موہن۔ (آپے سے باہر ہو کر) بس اب تم ۔۔۔ اپنے کمرے ۔۔۔ میں چلی جاؤ!

رمبھا۔ (بھولپن سے) ڈارلنگ! میں تو تمہیں شاباش دے رہی تھی۔

جگ موہن۔ ہاں تو ۔۔۔ وہ تو سب ٹھیک ہے مگر تم بس اب یہاں سے چلی جاؤ (نرمی سے) دیکھو آج شام کو ہمیں سماجی پرمانند بھی دیکھنا ہے۔ بڑی خوبصورت تصویر ہے۔ اور اس سے پہلے لیڈی داسنگھ کے ہاں چائے بھی ہے اور ۔۔۔ اس وقت ساڑھے پانچ ہیں۔ جاؤ لباس تبدیل کر آؤ۔ ڈارلنگ۔

رمبھا۔ اچھا۔ تو ۔۔۔ انور بھائی۔ رخصت! (وقفہ) وہ اینٹوں کا بھٹہ کہاں ہے؟

انور۔ دلیپ پور میں۔ یہاں سے بیس کوس پر

رمبھا۔ کسی دن میں اور جگ موہن تم سے ملنے آئیں گے وہاں!

انور۔ شکریہ ۔۔۔ ایں! مگر سنئے تو میں تو وہاں نہیں جا رہا ۔۔۔۔۔

رمبھا۔ (دور سے) گڈ بائی!

انور۔ بھابی بھی عجیب باتیں کرتی ہیں۔

(منشی جی اور پاسی کسان اندر داخل ہوتے ہیں)

منشی جی۔ حضور، یہ پاسی کسان ہے۔ دیکھیے گاؤں کا مکھیا!

پاسی۔ (دبی لہجے میں) رام رام چھوٹی سرکار!

جگ موہن۔ (لاپروائی سے) رام رام (منشی سے) اسے سیٹھ جی کے پاس لے جاؤ!

منشی جی۔ حضور سیٹھ صاحب تو اس وقت مل نہیں سکتے۔ آپ جانتے ہیں ہی ہی ہی!

جگ موہن۔ (رُکھائی سے) اوہ ہاں۔ اچھا تبا۔ تو تُم کیا کہنا چاہتا ہے!

منشی جی۔ غریب پرور۔ یہ اپنے گاؤں کا مکھیا ہے۔ گاؤں والے اب کے لگان نہیں دینا چاہتے۔ ہی ہی ہی!

جگ موہن۔ (حیرت سے) لگان نہیں دینا چاہتے!

پاسی۔ (پوربی لہجے میں) سرکار اب کے فصل نہیں ہوئی۔ بارش کی ایک بوند نہیں پڑی لگان کہاں سے دیں۔ سرکار اس دفعہ معافی مل جائے تو اگلی بار سب کچھ چکا دیں گے سرکار!

جگ موہن۔ لیکن لگان کیسے معاف ہو سکتا ہے؟ کم از کم میں اس معاملے میں کیسے فیصلہ دے سکتا ہوں سیٹھ جی جانیں۔

پاسی۔ سرکار آپ ہمارے چھوٹے راجہ ہیں۔ آپ کی تعریف ہم نے بہت سنی ہے آپ سب کو برابر سمجھتے ہیں سرکار سب کا خیال رکھتے ہیں چھوٹے سرکار گاؤں میں آپ کے دھرم کی بہت چرچا ہے۔ سرکار آپ ظلم کے خلاف ہیں۔ ہم غریبوں کے مائی باپ ہیں!

جگ موہن۔ لیکن لگان کا معاملہ اور ہے پاسی!

منشی جی۔ یہی میں بھی اسے دوپہر سے سمجھا رہا ہوں۔ مگر یہ کچھ سمجھتا ہی نہیں حضور۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

جگ موہن۔ (چونک کر) کیا کہا۔

منشی جی۔ جی کچھ نہیں! فارسی کا ایک محاورہ تھا۔

جگ موہن۔ (مسکرا کر) منشی جی آپ بھی بڑے اولڈ فیشنڈ (Old Fashioned) ہیں

منشی جی۔ (آہ بھر کر) جی ہاں سرکار۔ وہ زمانہ لد گیا

پاسی۔ تو لگان معاف نہیں ہوگا؟

منشی جی۔ تمہارا لگان معاف کر دیں تو ہمارا کام کیسے چلے پاسی!
تم چپ رہو جی۔ میں اپنی سرکار سے پوچھ رہا ہوں! سرکار!

جگ موہن۔ نہیں پاسی۔ زندگی کی ایک چول بدل دینے سے ساری زندگی نہیں بدل جاتی۔ تمہیں لگان دینا ہوگا۔ ہمیں لگان لینا ہوگا۔ اس وقت تک جب تک کہ زمانہ نہ بدل جائے انسانیت نہ بدل جائے۔ اخلاق نہ بدل جائے۔

پاسی۔ مگر زمانہ کون بدلے گا۔ سیٹھ صاحب! سرکار آپ ہی بدلیں تو بدلیں۔ (وقفہ) بڑی اُمید لے کر آئے تھے ہم!

جگ موہن۔ ہم اکیلے لگان معاف بھی کر دیں۔ تو اس سے کچھ نہ ہوگا جب تک تاریخ کا بہاؤ نہ بدل جائے۔

پاسی۔ تاریخ کا بھاؤ؟ ایکھ کا بھاؤ سنا تھا۔ گندم جوار باجرے کا بھاؤ سنا تھا۔ پھر تاریخ کا بھاؤ؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ سرکار!

منشی جی۔ چلو پاسی کسان۔ تکرار فضول ہے۔ ہم دونوں اولڈ فیشنڈ ہیں۔ ہی ہی ہی!

پاسی۔ بڑی اُمید لے کر آتے تھے...... رام رام سرکار..... جرا گور (غور) سے دیکھئے گا سرکار۔ دو چار دن میں کہیں تاریخ کا بھاؤ اوپر نیچے نہ ہو جائے۔

(چلا جاتا ہے)

(انور اور ولفرڈ دونوں ہنس رہے ہیں)

جگ موہن۔ (اُداس لہجے میں) تم ہنس رہے ہو۔ میرا دل رو رہا ہے۔

انور۔ اچھا بھئی۔ جگ موہن۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ دلچسپ آدمی ہو۔ ہم چلے۔

جگ موہن۔ کہاں؟

انور۔ وہیں۔ اینٹوں کے بھٹے پر۔

جگ موہن۔ ایں! تو ــــ تم نے فیصلہ کر لیا۔

انور۔ ہاں بھئی۔ دیکھ لیا۔ ایک آدمی کی زندگی دوسرے آدمی کی زندگی پر ضرور اثر انداز ہوتی ہے..... اچھا رخصت!

ولفرڈ۔ ٹھہرو میں بھی چلتا ہوں۔

جگ موہن۔ تم بھی؟ کہاں چلے؟

ولفرڈ۔ کپڑوں کی دکان پر۔ عریانیت ڈھانپنے کے لئے (ہنستا ہے) اچھا رخصت!

(انور اور ولفرڈ چلے جاتے ہیں۔ (وقفہ) رمبھا آتی ہے)

رمبھا۔ سب چلے گئے!

جگ موہن۔ (اُداس لہجے میں) ہاں سب چلے گئے۔ اپنے آدرش کو چھوڑ کر غلیظ، گندی، پرانی زندگی میں واپس چلے گئے۔

رمبھا۔ (آہستہ سے) یہاں سب گندے ہیں! یہاں سب غلیظ ہیں!

جگ موہن۔ کیا کہا۔ (وقفہ) ایں ـــ رمبھا؟ یہ تم نے کیسا بلاؤز پہنا ہے!

رمبھا۔ (معصوم) خوبصورت ہے نا!

جگ موہن۔ خوبصورت۔ شانے ننگے ہیں۔ گہرا کٹا ہوا ہے۔ اور سینہ بھی..... !!!

رمبھا۔ (ملائم) تم تو زندگی کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنا پسند کرتے ہو!

جگ موہن۔ (غصے سے) مگر یہ تو ـــ عریانی ہے۔

رمبھا۔ (ہنس کر) تم تو عریانی پسند کرتے ہو نا جی!

جگ موہن۔ (خفا) پسند کرتا ہوں دوسری عورتوں میں۔ اپنی بیوی میں نہیں۔

رمبھا۔ (ہنس کر بھولپن سے) تو یہ بلاؤز اُتار دوں!

سیٹھ جی۔ (فوراً دُور سے باآوازِ بلند) جگ موہن!..... جگ موہن!! (قریب آ کر) جگ موہن بیٹا کہاں چلے!

(دیوان خانے سے نکل کر سیٹھ جی ڈرائنگ روم میں آ گئے ہیں)

جگ موہن۔ پتا جی۔ وہ لیڈی دانگیر کے ہاں آج جاتے ہے۔

سیٹھ جی۔ ارے ہاں ٹھیک...... ٹھیک...... وہاں ضرور جاؤ۔ اور سنو! مسٹر دانگیر سے اینٹوں کے بھٹے کے بارے میں ضرور گفتگو کرنا۔ سنا ہے وہ ٹھیکہ تمہارے دوست انور کے والد کو ملنے والا ہے لیکن اگر تم کوشش کرو......

جگ موہن۔ بہت اچھا پتا جی!

(رمبھا اپنے کمرے کی طرف جا رہی ہے۔ سیٹھ اس کی طرف مڑ کر کہتا ہے)

سیٹھ جی۔ کہاں جا رہی ہو بیٹا!

رمبھا۔ (رُک کر) جی ابھی آئی!

(چلی جاتی ہے)

سیٹھ جی۔ (جگ موہن سے رازدارانہ لہجے میں ہنس کر) ہی ہی۔ آج رمبھا بھی وہی بلاؤز پہنے تھی جو چمپا نے پہنا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے دونوں کا درزی ایک ہے۔ (ہنستا ہے) جگ موہن کتنی عجیب بات ہے کہ آج کل شریف زادیاں طوائف دکھائی دیتی ہیں اور طوائفیں شریف زادیاں۔ (بے اختیار ہنستا ہے)

جگ موہن۔ (غصے کو دباتے ہوئے) رمبھا۔ وہ بلاؤز تبدیل کرنے گئی ہے پتا جی!

سیٹھ جی۔ ارے بھئی تم ناراض ہو گئے۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ (وقفہ) دیکھو تم رمبھا کی باتوں میں زیادہ دخل نہ دیا کرو۔ ہر شخص کی اپنی پرائیویٹ زندگی ہوتی ہے۔ رمبھا جس طرح کا لباس چاہے پہن سکتی ہے۔ وہ اپنے لباس کو تم سے بہتر سمجھتی ہے۔ سُنا!

جگ موہن جی

سیٹھ جی۔ (منشی جی کو اندر آتے دیکھ کر) کیا بات ہے منشی جی!

منشی جی۔ جی وہ ـــ دھیمے گاؤں کا مکھیا کھڑا ہے کب سے لگان معاف کرانے کے لئے کہتا ہے اب کے بارش نہ ہونے کی وجہ سے فصل نہیں ہوئی۔

جگ موہن۔ میں نے انکار کر دیا ہے پتا جی!

سیٹھ جی۔ بارش نہیں ہوئی ـــ تو آدھا لگان معاف کر دیتے ہیں بیٹا..... یہ ریاست کا معاملہ ہے کبھی سختی کبھی نرمی۔ یہی قاعدہ ہے یہاں۔ ہمیشہ موقع و محل دیکھ کر کام کرنا چاہیئے! بیٹا..... (رمبھا آتی ہے) لو وہ رمبھا بلاؤز تبدیل کر آئی۔

منشی جی۔ جی چھوٹی سرکار تو......!

سیٹھ جی۔ ہاں میں جانتا ہوں جگ موہن بڑا اولڈ فیشنڈ ہے۔ باتیں بہت بناتا ہے۔ (جگ موہن کا شانہ تھپک کر) مگر ہے آخر اپنے باپ کا بیٹا!

(ہنستا ہے)

رمبھا۔ (بہت آہستہ سے) یہاں سب گندے ہیں۔ یہاں سب غلیظ ہیں!

جگ موہن۔ کیا کہا۔

رمبھا۔ کچھ نہیں۔ (ہنستی ہے)

جگ موہن۔ پتا جی آپ رمبھا کو سمجھا دیجئے۔ یونہی موقع بے موقع ہنستی ہے۔

(رمبھا کھلکھلا کر ہنستی جاتی ہے)

(فیڈ آؤٹ)

باری

ایران کی مزدکی تحریک

ایران کی سوسائٹی میں صرف دو طبقے تھے۔ خواص اور عوام۔ ان دونوں طبقوں کے حقوق میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایرانی حکومت کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ وُہ ایران کے خواص (خاندانی امیروں کی جماعت) کے حقوق کی حفاظت کرے۔ عوام میں سے کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وُہ کسی امیر کی جائداد کا حصّہ خرید سکے۔ حکومت کے نظم و نسق میں بھی عوام شریک نہیں کئے جاتے تھے۔ طبقۂ عوام کا کوئی فرد اپنی ذہانت، قابلیت، محنت، یا دولت سے طبقۂ خواص میں شامل نہیں ہو سکتا تھا۔ شہروں میں رہنے والے عوام کی حالت دیہات میں رہنے والے عوام کی نسبت بہتر تھی۔ دیہاتی عوام سب کے سب غلام کسان ہوتے تھے۔ اخلاق کے اصول بھی خواص کے بنائے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض اصول تو سچائی پر مبنی تھے اور بعض صرف طبقۂ خواص کے حقوق کی حفاظت کیلئے بنائے گئے تھے۔ ایران میں خواص کے بنائے ہوئے معاشی اور اخلاقی نظام قباد کے عہد سے پہلے کھوکھلے ہو چکے تھے۔ عوام کے دلوں میں ان کے خلاف ہوتے ہوئے بغاوت کے جذبات پرورش پا رہے تھے۔ قباد کے عہد میں ایران کے سیاسی حالات نے اس تحریک کے لئے راہ پیدا کی جسے مزدکی کہا جاتا ہے۔

بعض سیاسی مصلحتوں نے قباد کو ابتدا میں مزدکیوں کا حامی بنا دیا تھا اس تحریک کا فلسفہ مزدک سے پہلے بندوس مرتب کر چکا تھا۔ مزدک نے بندوس کی کتاب کے چند اوراق لیکر ایک نئی تحریک شروع کر دی۔ یہ تحریک ایران کے معاشی اور اخلاقی نظاموں کے خلاف بغاوت تھی۔ مزدک نے بندوس کی نظری تعلیم کو عملی صورت میں پیش کرنے کے لئے جدوجہد کی۔

مزدکی عقائد کے مطابق "یزداں کا فعل ارادی ہوتا ہے اور اہرمن کا فعل غیر ارادی اور اتفاقی ہوتا ہے۔ نور اور ظلمت (یزداں اور اہرمن) کی کشمکش سے جو مادی دُنیا پیدا ہوئی۔ وُہ محض اتفاقی ہے۔ چونکہ اس کشمکش میں یزداں نے اہرمن کو شکست دی۔ اس لئے صرف یزداں کی پُوجا کرنی چاہیئے۔" ارتقا کے بارے میں مزدکیت کا یہ عقیدہ ہے کہ "ارتقا کی آخری منزل وُہ ہے جہاں نور کے ذرّوں کو تاریکی کی آمیزش سے رہائی حاصل ہو جائے گی۔"

خوشی حاصل کرنے کے لئے مزدکیت خواہشات پر غلبے کی تعلیم دیتی ہے معاشی مساوات کے متعلق مزدک کہتا ہے کہ "خدا نے زمین پر زندہ رہنے کے لئے جو ذرائع دے رکھے ہیں۔ وُہ سب انسانوں کے لئے مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک کو دوسرے سے زیادہ حصّہ نہیں ملنا چاہئے لیکن طاقت کے استعمال سے ہر شخص نے یہ چاہا کہ وُہ دوسرے کا حصّہ چھین لے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ امیروں سے دولت چھین کر غریبوں میں بانٹ دی جائے اور اس مساوات کو دوبارہ قائم کیا جائے جو انسانی سوسائٹی کے ابتدائی دور میں تھی۔ دولت کے ذرائع کو اس طرح مشترک بنانا چاہیئے جس طرح آگ اور پانی مشترک ہیں۔"

قباد کے عہد میں کال پڑا تھا۔ وُہ اس کال کو ٹالنے کے لئے بہت سے لوگوں سے مشورہ کرنے لگا۔ اسی مشاورت ہی کے ضمن میں مزدک کو بھی قباد سے ملاقات کرنے کا موقع ملا۔ ملاقات میں مزدک نے اس کال کو انسانوں کا بنایا ہوا بتایا۔ قباد کے دریافت کرنے پر اس نے کہا کہ ایران میں غلے کی کمی سے کال نہیں پڑا بلکہ غلے کو ذخیرہ کرنے سے۔ کہا جاتا ہے کہ اس ملاقات کے بعد قباد نے بھوکی رعایا کو حکم دے دیا تھا کہ وہ جہاں کہیں غلے کے ذخیروں کو پائیں۔ اُنہیں لوٹ لیں۔ ایران کے خواص قباد اور مزدک دونوں کے خلاف ہو گئے۔ قباد نے ایران میں دو طبقہ سماج تسلیم کرتے ہوئے غریبوں کی امداد کے لئے امیروں پر ٹیکس لگائے۔ لیکن ایران کے امیروں نے قباد کو قید میں ڈال دیا۔ قباد نے قید خانے سے بھاگ کر تورانیوں کے ہاں پناہ لی۔ اب ایرانی امیروں نے ایک کمزور شہزادے توزاماسپ کو ایران کے تخت پر بٹھا دیا۔

تھوڑی مدت بعد قباد نے تورانیوں کی مدد سے پھر تخت حاصل

حاصل کر لیا۔ اب اس نے چند امیروں کو جن سے اسے خطرہ تھا قتل کرا دیا دوسری بار تخت نشین ہو کر قباد نے کئی باغی قبیلوں کو اپنی اطاعت پر مجبور کر دیا۔ اس نے عرب قبائل کے حملوں کی روک تھام کی اور بازنطینی شہنشاہ سے لڑائیاں کیں۔ قباد کا بڑا بیٹا مزدکی تھا۔ لیکن اب قباد نے مزدکیوں کی حمایت سے آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ چنانچہ اُس نے کاؤس کی جگہ اپنے چھوٹے بیٹے خسرو کو اپنا جانشین مقرر کیا مزدکیوں نے کاؤس کے حق میں مظاہرے کئے۔ وہ کاؤس کو قباد کا جانشین بنانا چاہتے تھے۔ قباد نے اس مسئلہ پر بحث کرنے کے لئے مزدکی لیڈروں کو بلایا۔ بات چیت کے دوران میں قباد کے سپاہی ہاتھوں میں خنجر لئے ہوئے ان پر ٹوٹ پڑے۔ اس طرح مزدک اور اس کے کئی ساتھی قتل کرا دئے گئے۔ شاہی فرمان کے ذریعہ مزدکیوں کو قانون کی حمایت سے محروم کر دیا گیا۔ ہر شخص ہر مزدکی کو قتل کر سکتا تھا۔ مزدکیوں کا مال اسباب ضبط کر لیا گیا۔ ان کی مذہبی کتابیں جلا دی گئیں۔ ان کے عبادت خانے مسمار کر دیئے گئے۔ قباد کی موت (۵۳۱ء) کے بعد اُس کا بیٹا خسرو نوشیرواں کے نام سے تخت پر بیٹھا۔ اپنے عہدِ حکومت کے ابتدائی سالوں میں اس نے اور ایران کے امیروں نے مل کر مزدکی تحریک کو کچل کر رکھ دیا۔

تخت سنگھ

انقلاب

وہ ہر لرزتے ہوئے مُردہ مچُول کے دل میں ‏ نئے خیال نئے ولولے، مچلنے لگے
بنی وہ رس کی ہر اک بُوند آگ کا لُوکا ‏ وہ لوبھی لالچی بھونروں کے ہونٹ جلنے لگے

طوافِ شمعِ توہم کی رسمِ کہنہ سے ‏ وہ بے نیاز ہوئے جا رہے ہیں پروانے
فریبِ وعدۂ جنت کا وہ فسوں ٹوٹا ‏ بکھر رہے ہیں وہ تسبیحِ شیخ کے دانے

وہ ہر بھکاری کے تن پر پھٹی ہوئی پوشاک ‏ بدل رہی ہے بغاوت کے سُرخ پرچم میں
دہک رہے ہیں وہ عزمِ قوی کے انگارے ‏ غریب فاقہ کشوں کی نگاہِ پُر نم میں

وہ تلملاتا پسینہ جبینِ دہقاں کا ‏ اُمڈتا آتا ہے اک سیلِ آب کی صورت
وہ کپکپانے لگا اُس کے تیز دھارے پر ‏ ستم شعار فلک اک حباب کی صورت

جکڑ رہی ہیں سلاسل میں زر پرستوں کو ‏ وہ ہر غریب حسینہ کی مشکبُو زلفیں
رہ ہوس میں وہ کانٹے سے بن کے چبھنے لگیں ‏ غیورِ حُسنِ تہی دست کی سیہ پلکیں

وہ ڈگمگاتے ہیں محلوں میں زلزلے بن کر ‏ جگر گداز و حزیں نالے بیگناہوں کے
بڑھے جھپٹنے کو عشرت کدوں کی شمعوں پر ‏ وہ گرد باد غریبوں کی سرد آہوں کے

وہ ناگ بن کے ڈسا اُس غریب انبھے کا ‏ پیٹ چلا ہے وہ اک مالدار راہی سے
سُنو! وہ دُور کہیں زور کا دھماکا ہوا ‏ وہ اُٹھ رہا ہے دھواں بارگاہِ شاہی سے

تڑپ کے جذبۂ غیرت سے چار سو آخر ‏ وہ اپنی اپنی جگہ پھیلنے لگے تارے
لرز اُٹھیں وہ نظامِ کہن کی بُنیادیں ‏ نگل رہے ہیں وہ ظلمت کو نور کے دھارے

ممتاز مفتی

غُصّہ

کسی کو غصہ میں دیکھ کر نہ جانے میں ایسے کیوں محسوس کرتا ہوں جیسے کوئی موٹر لاری تیسرے گیئر میں پہاڑی پر چڑھ رہی ہو۔ شاید اس لئے کہ بچپنے میں مجھے پہاڑ پر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ جہاں بڑبڑاتی ہوئی لاریوں کو دیکھ کر میں بیحد محظوظ ہوا۔ اور پھر جب گھر لوٹا۔ اور ایک دن اماں کو غصے میں دیکھا۔ تو بے ساختہ چیخ اُٹھا "آپا! چپا لاری پہاڑ پہ چڑھ رہی ہے۔" میں غصے کے بارے میں اپنی وہ پرانی رائے بدل نہیں سکا۔ البتہ اُن دنوں جب لاری پہاڑی پہ چڑھتی تو شور مچاتی۔ مُنہ سے جھاگ اُڑاتی، چیختی چلاتی نظر آتی تھی۔ لیکن اب وہ زور لگاتی ہے۔ ڈرتی ہے۔ کہ کہیں پیچھے نہ لڑھک جائے لرزتی ہے! ہو سکتی ہے!

غصے کی کیفیت ایک مثال سے واضح ہو سکتی ہے۔ آپ تیز رفتاری سے کہیں بڑھتے جا رہے ہیں۔ آپ کے جی میں سمائی ہے کہ بڑھتے ہی جائیں۔ معاً آپ دیکھتے ہیں۔ آپ کا پاؤں عمودی کنارے پہ ہے۔ اور سامنے ایک گہری کھائی مُنہ کھولے پڑی ہے۔ آپ جھجک کر رُک سکتے ہیں۔ پلٹتے ہیں۔ تاکہ بھاگ کر آئیں۔ اور کھائی کو پھلانگ جائیں۔ سو خطرہ محسوس کر کے جھجکنا، ہٹنا اور بھاگنا، اس مرکب کیفیت کا نام غصہ ہے۔ اگرچہ عام طور پر ہم صرف اُس جست کو غصہ سمجھتے ہیں۔ جو ہمیں کھائی کے اس پار پہنچا دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ غصے میں تین کیفیتوں کا ہونا لازم ہوا۔ خطرہ محسوس کر کے جھجکنا، تیاری یعنی جست لگانے کے لئے "تیسرا گیئر" بدلنا تاکہ انجن زیادہ سے زیادہ طاقت خرچ کر کے خطرے کے مقام کو پار کر سکے۔

مگر غصے میں خطرے کا احساس چاہے وہ واضح ہو یا موہوم حقیقی ہو یا خیالی، لازمی ہے۔ اور جست کا عمل، غصہ میں خطرے سے مقابلہ کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ ڈر کی طرح فرار کی ترغیب نہیں دیتا۔ عمل تو دونوں سے وابستہ ہے۔ لیکن زاویہ ہائے عمل مختلف ہیں۔

شیر کو دیکھ کر مجھے غصہ نہ آئے گا۔ بشرطیکہ وہ چڑیا گھر کے مضبوط پنجرے میں بند نہ ہو۔ البتہ مجھے اُس بدتمیز چوہے پر بے حد طیش آتا ہے جو رات کو میرے بستر پہ پھدک پھدک کر مجھے جگا دیتا ہے اور میں قسم کھا کر اُٹھ بیٹھتا ہوں اور سونٹا لئے اُس کے پیچھے دوڑتا پھرتا ہوں۔ لیکن اُسے پکڑ نہیں سکتا —— یہی ایک بات میرے غصے کو خالص غصہ بنا دیتی ہے جب تک وہ میرے ہاتھ نہیں آتا۔ جب تک اُس کا وجود مجھے عاجز کر سکتا ہے خطرہ کا احساس دیتا ہے۔ اور یہ احساس نہ ہو تو غصہ یوں بے معنی ہو جاتا ہے جیسے لٹ جانے کا اندیشہ نہ ہونے پر بھی ہر دروازے کو مقفل کر دیا جائے۔

شیر پر غصہ کرنا کس قدر بے معنی ہے۔ وہ تو ہوا درندہ وہ کیا اس بات کو سمجھ لے گا کہ آپ صرف خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔ وہ تو یہی سمجھے گا کہ آپ غصے میں ہیں اور پھر وہ اس غلط فہمی میں نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ البتہ چوہے کی اور بات ہے وہ عرصہ دراز سے میرے گھر میں رہتا ہے اور میری عادتوں سے واقف ہے اسلئے وہ مجھے غصے میں دیکھ کر صرف بھاگ کر گم ہو جاتا ہے۔ قدرت نے غصے اور ڈر کا امتیاز بھی خوب تجویز کیا ہے۔ چھوٹے موٹے خطرے غصہ پیدا کرتے ہیں اور بڑے بڑے خطرے ڈر۔ پہلی صورت میں ہم خطرے سے دوچار ہونے کے لئے آگے بڑھتے ہیں اور دوسری صورت میں فرار ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر فرار کی کوئی راہ نہ ہو تو معاً ہمیں غصہ آ جاتا ہے۔ چاہے خطرہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔

خیال فرمائیے اگر کوئٹہ کے بھونچال پر کسی کو غصہ آ جائے۔ تو کیسی مضحک صورت پیدا ہو۔ اِدھر بھونچال اُدھر غصہ: کتنی

بے معنی بات ہے۔ آپکے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ مجھ سا پڑھا لکھا انسان ایسے سمے چارپائی پر یوں پڑا رہے گا۔ جیسے کل کا مرا ہوا ہو۔ بھونچال میں فراری حرکت ایسی ہی بے معنی ہو گی جیسے مقابلہ کرنے کی کوشش۔ چونکہ دقت یہ ہے کہ بھونچال صرف ہمارے گھر نہیں آتا۔ باہر گلی میں بھی آتا ہے اور پرے جنگل میں بھی۔ اس کے علاوہ بزرگوں کا قول ہے کہ بھونچال میں چلنے پھرنے سے فالج ہو جاتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ عمارت تلے دب جانے کے خطرے سے بچنا چاہیئے۔ لیکن ایسے موقع پر زمین کا پھٹ جانا بھی تو ممکن ہے ورمیں زمین میں دفن ہونے پر عمارت میں دفن ہونے کو ترجیح دیتا ہوں۔ کیونکہ عمارتوں تلے انسانوں کے علاوہ قیمتی چیزیں بھی دب جاتی ہیں۔ ہر دبی ہوئی قیمتی چیز کو تلاش کیا جاتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ ریلیف پارٹی کے کھودنے پر چیزوں کی بجائے انسان نکل آئے۔

غصے کا ذکر چھڑ جائے تو مجھے آسکر وائلڈ یاد آجاتا ہے جس نے بنی نوع انسان پر اس بڑی حقیقت کا انکشاف کیا "کہ" ادھار نوجوان کا سرمایہ ہے"۔ سچ پوچھئے تو اس چھوٹی سی بات میں دنیا بھر کی حقیقتیں پنہاں ہیں۔ اس کے علاوہ اس انکشاف کے بعد ایک تو قرض مانگنا آسان ہو گیا (یعنی تجارت چل نکلی) دوسرے قرض مل جانے پر حصولِ زر کی مسرت الگ اور جوانی کا احساس الگ (اور اگر دینے والا دینے کی جگہ صرف طنزاً مسکرا دے تو ——— تو وہ جاہل مطلق ہے جس نے آسکر وائلڈ سے عالم کا بھی مطالعہ نہیں کیا) اور پھر قرض ادا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بھلا اپنا سرمایہ بھی کوئی واپس کرتا ہے۔

آپ کہیں گے کہ اس انکشاف کو غصے سے کیا تعلق۔ ذرا غور فرمایئے۔ غصہ فی نفسہٖ ادھار ہے اور اس کے علاوہ نوجوان کا سرمایہ بھی۔ فرض کیجئے عام طور سے مجھ میں ایک گھوڑے کی طاقت ہے۔ لیکن کسی وقت کسی زبردست تر دشمن سے واسطہ پڑ جاتا ہے۔ مجھے غصہ ضرور آجائیگا اور حسب ضرورت مجھے دو [illegible]

بزائد طاقت خالص "ادھار طاقت" ہے۔

قدرت نے افراد میں "طاقت بنک" نہیں کھول رکھے جہاں طاقت جمع رہے اور ضرورت کے وقت استعمال ہو سکے قدرت جمع کردہ اشیاء بُری عادت سے خوب واقف ہے وہ جانتی ہے کہ ہر ایسی چیز چاہے وہ دولت ہو طاقت ہو یا بیویاں اور چاہے وہ صرف اسی لئے جمع کی گئی ہو کہ ضرورت کے وقت کام آئے۔ ضرورت کے وقت کام آنے کی بجائے جمع کرنے والے کو بیٹھا کر زندگی بیکار اور مظلوب ہے صرف خرچ ہونے کے خلاف احتجاج کریگی۔ بلکہ آپ خود سچے دل سے پکار اٹھیں گے "لیکن بھئی ضرورت ہی کب ہے"؟ مثلاً آپ پیسے اکٹھے کرنا یعنی اُن کی حفاظت شروع کر دیجئے تو چند ہی دنوں میں وہ آپ کو اپنی حفاظت میں لے لینگے حتیٰ کہ آپ سرمایہ بن جائیں گے اور خزانچی۔ اور پھر سرمایہ بھی کبھی خواہش یا ضرورت محسوس کرسکا ہے؟ تبھی تو سرمایہ داروں کے خلاف جو احتجاج ہو رہا ہے مجھے اُس سے قطعی ہمدردی نہیں۔

ہاں تو قدرت اس بات کو جانتی ہے کہ اگر انسان میں طاقت کا بنک کھول دیا جائے۔ تو ہر کسی کو طاقت اکٹھا کرنے کا خبط ہو جائے گا۔ اور پھر مرد سارا سارا دن چارپائی پر پڑے رہیں گے تاکہ اٹھنے بیٹھنے سے طاقت کا فضول اسراف نہ ہو عورتیں بیٹھی اُنہیں مٹھی چاپی کرنے میں لگی رہیں گی۔ گھروں میں عورتوں کی تقسیم مساوی نہ رہے گی۔ جنگ کے زمانے میں نیشنل سیونگ پاور کے چندے عاید ہونگے۔ پاور پوسٹل سارٹیفکیٹ خریدنے کے لئے پرچار ہوگا۔ اور طاقت کے سرمایہ یا سرمایہ داروں کے خلاف جلسے ہونگے اور انجمنیں بنیں گی۔ جن میں شاید مجھے ایک بڑا عہدہ پیش کر دیا جائے۔ یعنی اک قیامت بپا ہو جائے۔ چونکہ بازاروں میں چلتے پھرتے ہندوستانی "شفاخانے" دیکھنے میں آئیں گے اور پھر ایسے شریف آدمی کے لئے سودا خرید کر لانا بھی ناممکن ہو جائے گا۔ اس لئے ان [illegible]

ہاں تو یہ زائد "ہارس پاور" جو غصے کی صورت میں آتی ہے بالکل میری تنخواہ کے مشابہ ہے (میرا مطلب ہے میں ۱۹۴۲ء میں ۱۹۴۶ء کی تنخواہ اڑا رہا ہوں) اور لطف یہ ہے کہ طاقت کا یہ ادھار آپ ہی آپ مل جاتا ہے۔ مانگنے کی ضرورت نہیں۔ انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا قدرت دوراندیش ہے جیبی زادِ راہ رکھنے کو جمع کرنے پر ترجیح دیتی ہے۔ کیا یہ واضح ثبوت نہیں کہ قدرت ہر بھلے مانس کو غصہ کھاتے دیکھنا چاہتی ہے۔ پیتے نہیں۔ اسکے باوجود اگر لوگ منکر رہیں تو اس میں آپ کا میرا کیا قصور! تو ثابت ہوا کہ غصہ ایک کارآمد چیز ہے۔ جیسے پستول یا لٹھ۔ یعنی غصہ خطرے کے وقت حفظ ماتقدم کے کام آتا ہے۔

نوجوانوں کو تو بات بات پر خطرے کا احساس ہوتا ہے مگر بڈھوں کی بساط اس قدر کم ہو جاتی ہے کہ اکثر بساط سے بڑھ کر کام کرنا پڑ جاتا ہے۔ کام تو اتنے بڑے نہیں ہوتے لیکن بساط ہی کم ہو تو کیا کیا جائے۔ نوجوانوں کو غصے میں دیکھ کر کہا جاتا ہے "غصہ حرام ہے" ادھیڑ عمر کے مردوں کو شاید زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ بہرحال وہ اکثر بیوی کے روبرو غصے میں آجاتے ہیں۔ شام پڑی اور انکا غصہ چمکا۔ البتہ وہ صبح سویرے پورے اطمینان سے جاگتے ہیں جیسے بالکل شانت ہو گئے ہوں۔ یہ نکتہ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا۔ دوسروں کی ذہنی کیفیات کو سمجھنا آسان کام نہیں۔

ایک ذاتی تجربہ بیان کر دوں۔ میری بیوی کو گلہ تھا کہ مجھے غصہ نہیں آتا۔ اور شاید اسی وجہ سے وہ مجھے بدھو سمجھا کرتی تھی (اور بالآخر مجھ سے علیحدہ ہو گئی) ایک روز اکیلے میں شاید نوکر کا ذکر کر رہے تھے بولی "آپ۔ آپ کیا کریں گے بھلا۔ آپ کو تو غصہ بھی نہیں آتا۔ آپ!!" اور وہ ہنسی۔ بس پھر کیا تھا۔ غصے سے لال ہو گیا میں۔ پھر اسکی مسکراہٹ دیکھ کر نہ جانے کیوں میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے غصے میں دیکھ کر خوش ہو رہی تھی اپنے حسنِ تدبیر پر نازاں۔ معاً مجھے خیال آیا کہ میرے غصے سے کام لیا جا رہا ہے۔ اصولی طور پر تو مجھے اس بات پر اور بھی غصہ آنا چاہیے تھا۔ کام آنے میں تو بیشک مجھے خوشی ہوتی ہے مگر کام میں لائے جانے سے مجھے بالکل دلچسپی نہیں۔ تو صاحب میں کھکھلا کر ہنس پڑا اور وہ کھسیانی ہو گئی۔ وہ ہماری آخری ملاقات تھی! ——— لیکن اب میں سیانا ہو گیا ہوں اور میں نے قطعی ارادہ کر لیا ہے کہ پھر کسی بیوی سے سابقہ پڑا تو ہمیشہ ایک غصیلے خاوند کی حیثیت سے رہونگا تاکہ مجھے بدھو نہ سمجھا جائے اور تیسری بیوی کی تلاش میں سرگرداں نہ ہونا پڑے۔

تو غصہ ایک طاقت ہے۔ اور ہر طاقت کو چاہے وہ دوہار ہی ہو کام میں لایا جا سکتا ہے۔ مثلاً پہاڑوں میں بہتے ہوئے پانی کی روانی پھیلی ہوئی دھوپ۔ اور عورت کے چہرے پر حیا کی جھلکی۔ لیکن صرف آپ سے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ مجھے غصہ نہیں آتا۔ شاید آپ سمجھ رہے ہوں کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ یقین جانئے میں جھوٹ نہیں بولتا۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ ——— شاید آپ بھی سچے ہوں آپ نے کبھی مجھے غصے میں دیکھا ہو۔ میں مانے لیتا ہوں۔ لیکن اس طرح تو آپ انارکلی میں ہر گھڑی خوبصورت چہرے دیکھتے ہیں اور مسجدوں میں مقدس صورتیں بھی ——— میرا مطلب ہے میں اکثر غصے میں آجاتا ہوں لیکن مجھے غصہ کبھی نہیں آیا اور کبھی کبھار آ بھی جائے تو حالات اسقدر ناسازگار ہوتے ہیں کہ بےکار ثابت ہوتا ہے۔

مثلاً میں بیٹھا سوچ رہا ہوں اگرچہ سامنے کتاب کھلی ہے لیکن میرا ذاتی تجربہ ہے کہ سامنے کتاب ہو تو سوچنے کا عمل خوب رواں رہتا ہے۔ اور دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ پڑھنے میں مشغول ہے اور اس لئے مخل نہیں ہوتے۔ حفیظ بھی کیا خوب آدمی ہے۔ پچھلی مرتبہ جب مجھ سے ملاقات ہوئی تو کتنی دلچسپ باتیں سنائی تھیں۔ فنِ گفتگو کا تو وہ استاد ہے۔ اور وہ شعر کیا لطیف شعر تھا۔ اور میں لہر میں آکر شعر گنگنانے لگتا ہوں۔ اتفاق کی بات ہے کہ میرا گلا بھی خاصہ مفرور ہے یعنی کتاب سامنے ہوا اور

میں گنگناؤں تو غالباً آپ یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ انگریزی پڑھ رہا ہوں۔ ہاں تو میں وہ شعر گنگنانے لگتا ہوں: "ان تینوں سے بچ کے رہیو۔ کالے چھوٹے موٹے سے ——— ہیں؟" معاً میں رک جاتا ہوں۔ یہ شعر سنانے سے حفیظ کا مطلب کیا تھا بات تو اسمبلی کی صدارت کے بارے میں ہو رہی تھی۔ اچھا تو اُس نے شعر کے پردے میں مجھ پر فقرہ کسا تھا۔ مجھے کالا اور چھوٹا سمجھتا ہے۔ بڑا آگر را تو دیکھو ——— شاید وہ سمجھتا ہے کہ میں کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا ——— بیوقوف۔ معاً میں غصے سے لال ہو جاتا ہوں پھر خیال آتا ہے کہ حفیظ کو تو بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔ یہ تو میں ہی ہوں جس نے اُسکے ساتھ مل کر آپ بیتیاں لکھنے کا فیصلہ کیا۔ اور دیکھئے اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ سب بڑے آدمی قد کے چھوٹے ہوتے ہیں ایک تو نپولین تھا۔ اور ——— اور ایک اپنے چودھری نذیر احمد ہیں ——— مکتبہ اُردو والے! اور پھر اگر موٹے لوگ نہ ہوتے تو شکسپیر کے ناول ردی کے بھاؤ بکتے! ——— میں ہنس پڑا۔ دراصل ——— یہ غصے کا عمل اس قدر پرائیویٹ رہتا ہے کہ اکثر کتاب اور میرے درمیان شروع ہوتا ہے۔ اور کتاب اور میرے درمیان ختم ہو جاتا ہے۔ اس قدر مہلت بھی نہیں دیتا کہ کتاب کو ہٹا کر سامنے ٹنگی ہوئی سابقہ بیوی کی تصویر کو ہی گھور کر اُسے اپنے "غیر بدھو" ہونے کا ثبوت دے سکوں پھر خیال آتا ہے کہ چلو صاحب۔ جب اصل کو یقین نہ دلا سکے تو اب تصویر کو گھورنا کس کام کا۔ اور اگر گھور بھی لوں تو کیا وہ چوکھٹے سے اتر کر شام کی روٹی پکا دیگی میرے لئے؟

یہ تو خصوصی غصہ تھا نا۔ جو آپ ہی آتا ہے۔ میرے عام غصے کی تفصیلات اُس عقلمند بیرے کے خیالات سے ملتی جلتی ہیں جو اپنے دوست کی عیادت کو جا رہا تھا۔ مثلاً میں کسی صاحب سے کسی خاص کام کے لئے ملنے جا رہا ہوں۔ اگر مجھے تانگے کے پیسے میسر ہوں تو حالات کا رخ ہی بدل جاتا ہے۔ تانگے میں بیٹھ کر پیدل چلنے والوں کو دیکھنے میں وقت خوب کٹتا ہے اور پھر ادھر آپ بیٹھے اور اُدھر اُن صاحب کا مکان آگیا۔ لیکن پیدل جانا! رستہ نہیں کٹتا۔ تو میں سوچنا شروع کر دیتا ہوں بھئی میں جا تو رہا ہوں مگر خدا کرے اعظم مل جائے۔ اچھا تو اُسے کہہ دونگا کہ بھئی یہ کام ہے۔ اور یقیناً وہ یہ جواب دیگا۔ لیکن میں یوں دہراؤنگا اُس بات کو اور وہ مجبوراً یہ جواب دیگا ——— لیکن اگر اُس نے یہ کہہ دیا تو ——— تو میں یہ جواب دونگا مگر ——— اگر اُس نے یہ کہا تو اسمیں سراسر میری توہین ہو گی اور میں یہ بات کیسے برداشت کر سکتا ہوں۔ اونہوں! یہ نہیں ہو سکتا۔ تو میں اُسے کھری کھری سنا دونگا۔ مجھے سمجھا کیا ہے اُس نے؟ کیا سمجھا ہے اُس نے مجھے؟ اور میں جھجک کر رک جاتا ہوں یعنی سامنے گہری کھائی آگئی۔ اس حالت میں راہ گیر مجھے حیرت سے دیکھتے ہیں پڑے دیکھیں۔ اعظم کی اتنی جرأت! میں پہلے ہی جانتا تھا کہ وہ اچھا آدمی نہیں۔ اُس ملنا بھی میری توہین ہے ——— پھر جب ہوش آتا ہے تو دیکھتا ہوں کہ واپس گھر کو جا رہا ہوں۔ دفعتاً مجھے خیال آتا ہے کہ گھر میں جہاں ایک ہارس پاور کی بھی ضرورت نہیں خواہ مخواہ دو ہارس پاور سے اپنے آپ کو گرماتا! توبہ! ہاں البتہ اگر وہ سڑک پر مل جاتا تو میں مزاج پوچھتا تو در کنار۔ اُسے پہچاننے سے بھی انکار کر دیتا۔ لیکن اب گھر میں بیٹھ کر چارلی چیپلن کی فورڈ کار کی طرح آپ ہی آپ تھرکنا ——— بس انہیں نکات کی زد میں آکر میرے کان از سر نو زرد پڑ جاتے ہیں۔ اور ——— اور میری بیوی مجھے بدھو سمجھ کر مجھ سے علیحدہ ہو جاتی ہے اور ——— لیکن ٹھہریئے شاید آپ بھی مجھے بدھو سمجھ رہے ہوں۔ شاید آپ سمجھتے ہیں کہ میں سمجھتا نہیں۔ اچھا تو میں سب کچھ کھول کر کہہ دونگا۔ ہاں۔ سن لیجئے کہ آپ کو بھی غصہ نہیں آتا۔ اگرچہ شاید آپ غصے میں آجاتے ہونگے۔ جی ہاں۔ غصہ آنے کا زمانہ بیت چکا جبھی تو آج گھر والیاں گھروں کو چھوڑ انارکلی۔ کلب۔ ہوٹل اور سڑکوں پہ گھومتی پھرتی ہیں۔ اور دواخانے زوروں پہ ہیں اور اسمبلیوں میں ہاتھا پائی کی نوبت نہیں آتی۔ اور چینی کے ڈلو پھیڑ کے

باوجود کھلے رہتے ہیں۔ اور روزنامروں کے دفتروں کو آگ نہیں لگتی۔ اور ——— اور ہڑتالیں ہو جاتی ہیں۔ اور گاندھی جی کا بڑا نام ہے۔ اور انگریزی حکومت کا دور دورہ ہے۔ اور کنہیا لال کپور کی "سنگ و خشت" بکتی ہے۔ اور میں اپنی روٹی آپ پکاتا ہوں اور غصے کا مرثیہ لکھ رہا ہوں۔

آجکل جب ہم راہ میں گہری کھائی دیکھتے ہیں۔ تو خطرہ محسوس کر کے جھجکتے ہیں رکتے ہیں واپس آتے ہیں اور پھر بھاگ کر آتے اور کھائی پر سے کودنے کی جگہ سوچتے ہیں کہ "آگے بڑھنا ضروری بھی ہے کیا؟ کھائی کی بات نہیں ——— ایسی بیسیوں کھائیاں پار کیں ہم نے۔ ویسے آگے بڑھنے کا فائدہ بھی ہے کچھ؟ اور فرض کرو پار ہی کرنا ہے تو ذرا انتظار ہی کیوں نہ کر لیں پانی سوکھ جائیگا تو پار کر لیں گے۔ ذرا بھیگنے سے بچ جائیں گے۔" شاید آپ کا اتفاق نہ ہو ——— مگر ایسے اصحاب بھی ہیں جو کھائی پار نہیں کرتے اور یوں دکھائی دینے کا کمال رکھتے ہیں جیسے ابھی کھائی پار کر کے آ رہے ہوں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ بہتر طریقہ ہے "ہونے" پر "نظر آنے" کی فوقیت کو کون نظر انداز کر سکتا ہے نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو ٹیکنیک زاویہ نگاہ سے غصہ آنا یا غصہ میں "آنا" چنداں مختلف نہیں۔ ہر شخص نے غصہ میں آنے کی مخصوص اور منفرد تفصیلات پیدا کر رکھی ہیں۔ جو موقعہ کے مطابق کام میں لائی جاتی ہیں۔ اور جنہیں دیکھ کر انسان کا شعوری ہونا لاریب ہو جاتا ہے۔

اس موضوع کا سب سے بڑا فنکار بنیا ہے۔ جو غصے میں آتا نہیں البتہ آنے کی دھمکی دیتا ہے۔ نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو غصہ بذاتِ خود ایک دھمکی ہے۔ اس لئے بنیئے کا غصہ خالص غصہ ہوا۔ اور پھر چونکہ وہ دھمکی سارے بدن سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ صرف زبان سے تو اُسے ادھار طاقت کی مدد کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ ظاہر ہے کہ دھمکی کی دینا غصے کے فن کا کمال ہے۔

مثلاً بچہ چھت پر چڑھ جاتا ہے اور ماں سے کہتا ہے "اماں دے پیسہ۔ ورنہ میں لگا کودنے یہ کو دا میں ورنہ پیسہ دے۔" اگر وہ واقعی کوٹھے سے کود جائے تو کیا اُسے پیسہ مل جائیگا؟ شاید ماں دو روپے ڈاکٹر کو بھی دے دے۔ سیر بھر دودھ بھی پلا دے۔ لیکن یہ سب اُس پیسے کی برابری نہیں کر سکتے۔ جسے وہ پلے میں باندھ سکتا ہے۔ منہ میں رکھ کر چوس سکتا ہے۔ پکے فرش پر پہیئے کی طرح چلا سکتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر جیسے جی چاہے خرچ کر سکتا ہے۔ میں اُس لڑکے اور بنیئے کی عقل پر حیران ہوتا ہوں۔ جنہوں نے یہ بھید پا لیا کہ انسان خطرے سے نہیں ڈرتے جسقدر خطرے کی دھمکی سے محض اس خیال سے کہ خطرہ آنے والا ہے!

اس فنکار کو کہتے ہوئے سُنیئے "اکے دے گالی، پنسیری نہ اٹھا ماری تو۔ ہاں۔ اکے دے" اُس کا کام بھی چل جاتا ہے اور پنسیری اٹھانے اور دے مارنے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرنی پڑتی۔ لاری کا تمیر اگیتر لگتا ہی نہیں۔ نہ پہاڑی پر چڑھنے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہونکنے کی! اس انداز کی فوقیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یو پی کے با مذاق لوگوں نے اسے اپنا لیا ہے اگرچہ کوائف بدل لئے ہیں۔ اور پنسیری ٹٹولنے کی بجائے کسی دوست کی باہوں میں لپٹ کر چلانا شروع کر دیا "چھوڑ مجھے۔ وہ مزا چکھاؤنگا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائیگا سالے کو۔ چھوڑ تو ———" پھر راہ گیروں نے ایسے فنکاروں کو یوں داد دینا شروع کی کہ واقعی اُسے یوں روکنے تھامنے لگے گویا وہ پکڑا گیا ہو۔ پھر جب غصہ کے اس انداز کی عظمت عام طور پر تسلیم کر لی گئی۔ تو لوگ اس وقت علانیہ کہنے لگے "تو منہ سے بات کر۔ ارے میں کہتا ہوں منہ سے بات کر تو" ان الفاظ سے وہ منہ سے کہلوانے کا نہیں بلکہ ہاتھ سے نہ کہلوانے کا پرچار کرنے لگے۔ اور "پھر کیا کہا ——— پھر کہنا" کہکر حریف کی توجہ کہنے پر نہیں۔ بلکہ نہ کرنے کی طرف مائل کرنے لگے۔ حتیٰ کہ غصہ ایک کار آمد اور بے ضرر کیفیت کا فنی اظہار ہو گیا۔ پھر عورتوں نے اُسے اپنا لیا۔ اور اسے لطیف تر بنانے کے علاوہ اُس سے

اور کام بھی لینے لگیں۔ غازہ کے طور پر استعمال کرنے لگیں غصے کے ذریعے اپنی تو پیدار آواز کو گلی کوچوں میں نشر کرنے لگیں روٹھ کر منانے کا سبق سکھانے لگیں۔

غصہ میں آنے کی سب سے بڑی وجہ عزت آبرو اور خودداری سے متعلق ہوتی ہے۔ یعنی ہمیں تب غصہ آتا ہے جب ہماری توہین ہوتی ہے۔ بے عزتی کا خطرہ ہوتا ہے۔ ناک کٹ جاتی ہے اور ناک کی عظمت کو کون کافر نہ مانے گا؟

ناک اونچی اور تیکھی ہو کر آریہ نسل کو کول دراوڑ اور منگولوں سے ممتاز کرتی رہی۔ اُسکی عظمت قائم کرنے کے لئے "ذات پات" کا عالیشان ایوان تعمیر ہوا۔ اس لئے کہ لوگ اُسکے اونچے تیکھے ہونے کو نظر انداز نہ کر سکیں لوگوں نے اس پر روغن لگا لگا کر عوام کو متوجہ کرنا شروع کیا تاکہ اپنی عورتوں کی عالی نسل کی نمائش کر کے دیگر قبائل کو انہیں بیاہ کر لے جانے پر مائل کیا جائے عورتوں کی ناک کے زیور ایجاد کئے گئے جو عالی نسل کے علاوہ کنوارپنے کے عالم کا بھی مظہر ہوتے تھے اور شاید شادی کے بعد اتار دیئے جاتے تھے۔ لیکن نئی دلہن کی برتری واضح کرنے کے لئے بیاہ کے بعد بھی ناک کے زیور پہنے جاتے رہے۔ بالآخر قدرت نے ناک کے تحفظ کے لئے غصے کا سا مضبوط اور دلیرانہ جذبہ پیدا کیا اگر اسکے باوجود لوگ کہیں کہ ناک کوئی چیز نہیں تو ظاہر ہے کہ یہ جاپانیوں کا پراپیگنڈا ہے۔ اگر لوگ ناک کی عظمت سے منکر ہو جائیں تو اس قوم کی ناک محض بہنے والا عضو بن کر رہ جاتی ہے اور اس احساس پر کہ وہ زکام اور نزلہ کا اڈا ہے وہ اور بھی "سُڑک سُڑک" کرنے لگتی ہے۔ "سُڑک سُڑک" کرنے والی قوم بھلا کیا کر سکتی ہے۔ اس کے برعکس ذرا ناک کو اپنی عظمت سمجھ کر دیکھئے تو اس احساس سے کہ آپ کے منہ پر ایک اونچی لمبی ناک ہے معاً آپ کا منہ اوپر کو اٹھ جائیگا۔ چھاتی چوڑی ہو جائیگی اور چال میں وقار پیدا ہو جائیگا ایسے حالات میں "سُڑک سُڑک" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جیسے کہ جاپانیوں سے راہ و رسم کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یعنی ایک ناک کو تسلیم کر لینے سے ہندوستان کی سیاسیات سدھر سکتی ہیں

تو ظاہر ہوا کہ ناک بڑی چیز ہے اور غصہ اُس کا محافظ یا اے۔ ڈی۔ سی ہے۔ جیسے ہر بڑے عہدہ دار کے ساتھ ایک باوقار محافظ ہوتا ہے جو عام طور پر لال وردی اور چمکتی ہوئی پیٹی پہنے رکھتا ہے۔

سنا ہے پرانے زمانے میں یہ سرخ پوش اے ڈی کانگ کنگ کانگ سے ملتا جلتا تھا۔ کہتے ہیں اُس زمانے میں اگر کسی اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے شریف آدمی کی ناک کو مکھی کاٹ لیتی تو وہ بھنّاتا اُٹھتا اور اپنی پتھر کی تلوار سونت کر اُٹھ بھاگتا۔ فرض کیجئے دروازے پر اُسے کسی دوست یا پڑوسی کی بھینس مل جاتی تو وہ ایک ہی وار میں اُسے ڈھیر کر کے اطمینان سے واپس چلا آتا۔ شاید یہ بات سچی ہو۔ کون نہیں جانتا کہ ہمارے بزرگ بے حد دانا اور بینا تھے۔ اسکے علاوہ اُنکی روحانیت کا کیا ٹھکانہ تھا۔ یقینی طور پر وہ مکھی اور بھینس کے تعلق کو ہم سے بہتر جانتے تھے۔ اس دنیا میں کونسی چیز ہے جسے کسی اور چیز سے براہ راست یا ضمناً تعلق نہیں۔ کہتے ہیں آسٹریلیا اور کینیڈا میں اناج کم ہو تو ناروے والے بھوکوں مرجاتے ہیں۔ پوری بات تو میری سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن شاید مطلب یہ ہے کہ ایسا ہو تو انگلستان کو اپنی خوراک خود پیدا کرنی پڑے اور وہ بندوق اور گولیاں نہ بنا سکیں اور اسلئے ناروے والوں کو نہ بھیج سکیں۔ ناروے والوں کو گولیاں میسر نہ ہوں تو وہ شکار نہ کر سکیں اور شکار نہ کریں تو کھائیں کیا۔ مجھے یاد ہے ایف اے کے کورس میں ایک ایسا ہی گورکھ دھندا تھا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ جس شہر میں بلیاں زیادہ تعداد میں ہوں وہاں پھول بکثرت ہونگے اب خیال فرمائیے پھول اور بلیاں! اس سے تو مکھی اور بھینس ہی زیادہ قابل اعتبار ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس بات کا قطعی تجربہ نہیں۔ چونکہ یا تو میری ناک ہی نہیں اور اگر ناک

ہے تو بیچاری کو اے۔ڈی۔سی نصیب نہیں۔ اب آپ سے کیا پردہ ہے۔ میں نے اپنی آن کے تحفظ کا ایک انوکھا طریقہ ایجاد کر رکھا ہے۔ اور وہ طریقہ چاہے آپ کو پسند نہ آئے لیکن اس سے اسکی برتری پر حرف نہیں آتا۔

بحیثیت تحفظ غصے میں ایک نقص ہے۔ چونکہ عام حالات میں بے عزتی ہو جانے پر غصے کا ایڈی کانگ بڑھ کر وار کرتا ہے یعنی غصہ وہ شکر ہے جو کونین سے منہ کڑوا ہو جانے کے بعد کھائی جاتی ہے۔ فرض کیجئے فلاں صاحب نے وہ بات کہہ دی جس سے میری بے عزتی ہو گئی اب اگر میں غصے کی مدد سے فلاں صاحب کے منہ پر چانٹا مار بھی دوں تو بھی کیا۔ اس سے میری لٹی ہوئی عزت تو واپس نہ آسکے گی۔ یہ تو محکمہ احتساب کی سی بات ہوئی کہ تاک میں بیٹھے رہے۔ کسی کو جرم کرنے کا موقعہ دیا۔ اور جب وہ مجرم بن گیا تو جھپٹ پڑے۔ اس طرح تو مجرمانہ ذہنیت کی روک تھام نہیں ہوتی۔ البتہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ غصہ مزید بے عزتی سے بچائے گا۔ لیکن مزید بے عزتی سے بچائے یا نہ بچائے میرے لئے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ چونکہ جب بے عزتی ہو گئی تو ہو گئی کیا چٹکی بھر اور کیا سیر بھر۔ عقلمندوں کا قول ہے کہ بیماری کی روک تھام علاج سے کہیں بہتر ہے اور غصہ بیچارا ایک ایسی آٹومیٹک مشین ہے جو اس بات کی منتظر رہتی ہے کہ کوئی بچھاڑے تو ایک دم سی ودں۔ رفو کر دوں۔

میرا طریقہ تحفظ خالص روک تھام کے مترادف ہے۔ اور بڑوں کے اس بڑے اصول کے مطابق ہے یعنی لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ یعنی میرا طریقہ دو لفظوں میں ذاتی توہین ہے پیشتر اسکے کہ کوئی میری بے عزتی کر سکے میں آپ اپنی توہین کر کے اپنے آپ کو بے عزتی سے اور کسی غیر سے بے عزتی کرانے سے محفوظ کر لونگا۔ فرض کیجئے میں نے کوئی غلطی کی ہے جس پر میرے افسر کا مجھے بے وقوف سمجھنے یا کہنے کا زبردست اندیشہ ہے تو صاحب میں فوراً بول اٹھونگا۔ دیکھئے حضور۔ میں بھی کیسا بے وقوف ہوں۔" یا "میری بے وقوفی ملاحظہ کیجئے صاحب"

اور آپ جانتے ہیں سامنے پڑے کو تو شیر بھی نہیں کھاتا۔ کم عقل لوگ کہیں گے کہ اس طرح تو میں نے آپ ہی اپنی بے عزتی کر دی۔ لیکن یہی تو نکتہ ہے۔ درحقیقت میں نے اس بھلے مانس کے لئے ناممکن کر دیا کہ وہ مجھے بے وقوف سمجھتے اور اسکے بعد میں کیا خاموش ہو جاؤنگا۔ او نہوں۔ پھر کہہ دونگا۔ صاحب بڑی محنت اور احتیاط سے غلطیاں کرتا ہوں کہ کہیں آپ کی برابری کی غلط فہمی کا شکار نہ بن جاؤں اس طریقے سے وہی شخص جو میری بے عزتی کرنے پر تلا ہوا تھا۔ یقیناً ہنس پڑیگا اور میری پیٹھ ٹھونکنے سے بھی گریز نہ کریگا۔ اسکے علاوہ اسکو گمان تک بھی نہ ہوگا کہ میں بے وقوف ہوں چونکہ جو شخص اسکی برتری کا قائل ہے وہ بے وقوف ہو سکتا ہے کیا۔ اور اگر کوئی مزید فقرہ نہ بھی کہا جائے تو کیا وہ شخص بے وقوف سمجھا جا سکتا ہے جو اپنی حماقتوں سے کماحقہٗ واقف ہو اور پھر سچائی اور رنگینی مفت۔

نہ جانے کیوں یا تو اپنی بے عزتی آپ کرنا بے عزتی ہی نہیں یا سننے والے اس پر یقین نہیں کرتے۔ وہ سوچتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی بھلا مانس اپنی توہین آپ کرے نہیں اس میں بھی کوئی راز ہے۔ میرے بزرگ اور افسران صرف اسی بنا پر مجھے عقلمند سمجھتے ہیں۔ جب میں کہتا ہوں کہ جناب میں تو خالص بے وقوف ہوں اور وہ اخلاقاً جواب دیتے ہیں کہ نہیں صاحب آپ تو——— اور میں اسکے باوجود یہی رٹ لگائے جاتا ہوں تو انہیں اس بات پر غصہ آجاتا ہے کہ میں انہیں جھٹلانا چاہتا ہوں۔ اور وہ رعب اور شدت سے مجھے جھٹلاتے ہیں۔ اس عمل میں انہیں میری عقلمندی پر یقین لانا لازم ہو جاتا ہے۔ اور میں راضی برضائے تو کے سے انداز سے چپ ہو جاتا ہوں۔ اگر بار بار دہرانے سے خدانخواستہ مجھے اپنی بے وقوفی کا گمان ہونے لگے تو مجھے اس قدر تسلی ہوتی ہے کہ کیا کہوں۔ اس وقت میں اپنے آپ کو مہذب ترین انسان سمجھتا ہوں چونکہ اپنے آپ کو حقیر سمجھنے

پر کلچر کا وار و مدار ہے۔ اس وقت مجھے دنیا بھر کے عقلمندوں سے نفرت سی محسوس ہوتی ہے اور جی چاہتا ہے "اکل فوائڈے" کا مہذب رواج از سر نو جاری ہو جائے اور میں تمام بیوقوفوں کو گلے لگا نہ پھروں۔ تو یہ ذاتی توہین کا باڈی گارڈ جو سفید وردی میں ملبوس ہوتا ہے۔ اور حقیقی محافظ کی طرح آگے آگے چلتا ہے اُس پیچھے پیچھے آنے والے سرخ پوش ایڈی کانگ یعنی غصے سے کہیں بہتر ہے۔

ہاں اس طریقہ تحفظ کے خلاف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی صاحب اس قدر جلد باز ہوں کہ حفاظت کرنے کا موقعہ ہی نہ دیں اور وہ بات کہہ دیں جس سے ہماری خود داری کو ٹھیس لگ جائے۔ تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ ایسے موقعہ پر غصہ ہی کام آسکتا ہے۔ یعنی ذاتی توہین آگے آگے اور غصہ پیچھے پیچھے! اس صورت میں مکمل حفاظت ہو جاتی ہے جیسے ڈولی میں بیٹھی ہوئی ہندوستانی عورت کے آگے پیچھے کہار ہوتے ہیں۔ کہنے کو تو میں نے کہہ دیا لیکن سچی بات پوچھئیے تو جلد باز سے غصہ کرنے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ ایک عام سا جلد باز بھلا غصے کو کیا سمجھیگا۔ اور اُسکی فنی اور جمالی خوبی کو کیا جانیگا۔ جلد باز بے وقوف ہوتے ہیں اور یوں ہاتھ چلاتے پھرتے ہیں جیسے ڈوبتا تنکے کا سہارا تلاش کر رہا ہو۔ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ مقابل طاقتور ہے یا کمزور۔ اور سچ پوچھئیے — تو طاقت جلد بازی کا دوسرا نام ہے۔ اور جلد باز اندھے ہوتے ہیں۔ میں نے اکثر مرتبہ اندھے ہو جانے کی کوشش کی لیکن پھر بھی میری آنکھوں میں اس قدر بینائی ضرور رہ جاتی ہے۔ کہ حریف کے تنے ہوئے پٹھے نظر آ سکتے ہیں۔

ہاں تو غصہ ایک مشین ہے۔ جو عزت کی پھٹی پرانی چادر کو سینے اور رفو کرنے میں لگی رہتی ہے۔ آپ مجھے غصے میں جو جی چاہے کہہ دیں۔ گالیاں دے لیں۔ منہ چڑا دیں۔ چاہے آپ کی آنکھیں اُس وقت پھیل پھیل کر مجھے اپنی خونخواری کا قائل کرنے کی کوشش کریں۔ یا چہرا سُرخ انگارہ ہو کر اپنے جوش اور قوت کا یقین دلائے۔ چاہے آپ آستین چڑھانا بھی شروع کر دیں۔ مجھے آپ پر قطعی غصہ نہ آئیگا۔ بلکہ میں یوں محسوس کرونگا جیسے کوئی غریب اپنی گدڑی سی رہا ہو۔ اور میرا جی چاہے گا کہ آپ کو گلے لگا کر رو پڑوں۔

لیکن اگر آپ ٹھنڈے دل سے یعنی جھجک کر مجھے کچھ کہہ دیں۔ (بیوقوف" کا لفظ ہی سہی) اور مجھے اس قدر مہلت نہ دیں کہ میں خود اپنے آپ کو بے وقوف کہکر آپ کو تکلیف کرنے سے بچا لوں —— تو —— تو مجھے غصہ آجائے گا۔ ہاں غصہ آجائیگا۔ اور پھر نہ جانے میں کیا کر بیٹھوں۔ اسکے بعد آپ یہ نہ کہئیے گا کہ میں مہذب نہیں۔

احمد ندیم قاسمی

وحدت

دائرہ ایک ہے، انجام بھی، آغاز بھی ایک
دشتِ ناپیداکنار ——— ایک ہی راہگذار
ذوقِ پرواز بھی، پرواز کا انداز بھی ایک

ٹوٹ جاتے ہیں تو ملتے نہیں روشن تارے
جمع ہوتے ہیں غریب ——— قصرِ نیواں کے قریب
بکھری روحوں کو تھپکتے ہیں جہاں ماہ پارے

یہ ہوائیں، یہ فضائیں، یہ خلائیں، یہ فلک
یہ مہ و مہر کے داغ ——— یہ عناصر کے چراغ
ان کی نبضوں سے ہم آہنگ ہے کلیوں کی چٹک

ایک زنجیر سے مربوط ہیں کتنی کڑیاں!
چاند آیا لبِ بام ——— دیکھ مرجوں کا خرام
کہ زمیں لہراتی ہیں سیپوں کی منوّر لڑیاں

رنگ اور نسل کی الجھن میں بھٹک جاتے ہیں
یہ فقیہوں کے امام ——— یہ رواجوں کے غلام
مردہ تہذیب کے تِن حجروں میں سکوں پاتے ہیں

اُس طرف دعویٰ آزادیٔ نوعِ انساں
اِس طرف سوچ بچار ——— اپنے وعدوں سے فرار
ایک پھنکارا ——— سخاوت کا ابھی وقت کہاں

وقت کے سیل میں بہ جائیں گی لاشیں اُن کی
تودۂ فرق پہ تاج ——— جمع کرتے ہیں خراج
دستِ تاریخ میں رہ جائیں گی قاشیں اُن کی

امتیازات نے وحدت کا دبوچا ہے گلا
تلملا کر گرنے لگے! ——— زلزلے آنے لگے!
وہ مشیت کی کماں تن کے بجی! ——— تیر چلا!

فکر تونسوی

اور ظلمت نے کہا.....

ان جفاکار اُجالوں کے چمکدار غلاف
اپنے آبا کے خد و خال چھپا سکتے ہیں
وقت کی وحشی و بیباک نگاہوں کے شرار
ناچ سکتے ہیں مرے سینے پہ گا سکتے ہیں

مَیں نے دیکھے ہیں مگر زرکے بلوچ، یہ خم
کب یہاں رقص گہ منبر و محراب نہ تھی! ؟
کب نہ جھلکائیں تقدس نے جبینیں اپنی
کب یہی آنکھ، یہی آب، یہی تاب نہ تھی

یہی انساں ——— جسے قابیل نے خوں میں گوندھا
میری جھنکار میں کھو جاتا ہے، گھُل جاتا ہے
کھلبلا دیتا ہے یزداں کے سنہری تلوے!
اور یہ بنتا ہوا اسرار بھی کھُل جاتا ہے

منزلیں آئیں، اُبھرتے رہے آدم کے حبیب
زاہد و فلسفی و ملّا و درویش و حکیم
داؤ چلتے رہے، چڑھتے رہے نورانی غلاف
مرے سرمست دھوئیں کی وہ مگر طنزِ سلیم
لپٹ کر روح کے ابریشمی غالیچے پر
یہ بیک ایمائے مشیت و خداوندِ عظیم
مسکراتا ہی رہا دیکھ کے یہ سعیٔ جمال
یاد کرتے ہوئے انساں کی "وفائے قدیم"

اعظم مرزا

مکھی

اگر آپ کو امرت سر جانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے سیٹھ لبھو رام کے پکوڑے ضرور کھائے ہوں گے۔ اسٹیشن کی حدود سے باہر نکلتے ہی آپ کو سڑک پر میلی پھٹی ہوئی دھوتیوں والے غلیظ لڑکے سروں پر پکوڑوں کے تھال رکھے بڑی ترنم ریز آواز میں "پکوڑے لے لو پکوڑے۔ سیٹھ لبھو رام کے پکوڑے" پکارتے نظر آئیں گے۔ اور شاید آپکو تعجب ہوگا۔ سیٹھ اور پکوڑے! اچنبھے کی بات نہیں۔ چنبھارہ تو ہر پکوڑے میں ہوتا ہے لیکن "پکوڑا فروش" "سیٹھ"! آپ سوچ میں پڑ جائیں گے اور آپ کا جی چاہے گا کہ اُس سیٹھ کو ایک بار تو ضرور دیکھنا چاہیئے۔

ہال بازار میں داخل ہو کر دائیں ہاتھ کو دوسرا موڑ مڑ جائیے اور پھر ایک چوک چھوڑ کر دوسرے میں سینما کے قریب بائیں ہاتھ کو دیکھئے۔ ایک بڑی سی مگر میلی سی دکان نظر آئیگی اور ایک بھاری سا آدمی تختے پر بیٹھا ہوگا۔ یہی سیٹھ لبھو رام ہے اُسے دیکھ کر شاید آپ مسکرائیں اور اپنی راہ چل دیں۔ لیکن معاً آپ دیکھیں گے کہ اُس کے ہاتھ میں پنکھا ہے۔ سردیوں میں پنکھا! اور وہ اپنی توند کے علاوہ پکوڑوں کو بھی ہوا دے رہا ہے۔ آپ رک جائیں گے۔ اس کے بعد میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کیا کریں ـــ میں تو سیدھا بنچ پر جا بیٹھا تھا۔

اور سیٹھ نے پنکھا ہلاتے ہوئے کہا تھا: "مہاراج یہ مکھیاں نری جہر ہیں جہر۔ جہاں بیٹھ جاوے ہیں ستیاناس کر دیوے ہیں۔"

میں نے کہا "سیٹھ پکوڑوں پر بھی بیٹھتیں ہیں کیا؟"

اُس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولا: "کہاں نہیں بیٹھتیں مہاراج؟ ـــ کتنے کے تولوں؟"

بچپن میں وہ یہیں منڈی میں مزدوری کیا کرتا تھا۔ دن بھر بوجھ اُٹھاتا۔ شام کو آٹھ نو آنے جیب میں ڈال۔ گھر سے دھلی ہوئی خاکی قمیص پہن۔ بالوں کو سرسوں کے تیل سے تر کر کے ہاتھ میں سپاہیوں کا سا ڈنڈا لیئے باہر نکلتا۔ پہلے تو وہ سینماؤں کا طواف کرتا چوکھٹوں میں جڑی ہوئی تصویریں دیکھتا۔ لوگوں کی رائے سنتا۔ پھر وہ ٹکٹ خرید کر ہال میں جا بیٹھتا۔ جہاں وہ اپنی تمام تر توجہ ہیرو کے نکمے نکلنے یا حریف کو مار مار کر کچومر نکال دینے میں اور انجام کار ہیروئن کو ہیرو کے بازوؤں میں پہنچا دینے میں صرف کر دیتا۔ تماشہ ختم ہونے پر وہ "اُس" بازار میں یوں اکڑ کر چلتا جیسے وہ بذاتِ خود ایک ہیرو ہو جس کے انتظار میں وہ تمام ہیروئنیں لالٹینیں جلائے بیٹھی ہوں۔ آنکھوں سے آنکھیں ملاتا۔ منہ سے سیٹی بجاتا۔ مونچھیں مروڑتا اور مسکراتا ہوا اُس بازار سے گزر کر وہ رامو کے تنور پر جا پہنچتا۔ وہاں دال پھلکا کھاتا اور گھر جا کر سو رہتا۔ پھر اگلے دن سویرے اُٹھ کر منڈی میں بوجھ اُٹھانے چلا جاتا ـــ اُن دنوں لوگ اُسے لبھو کہتے تھے لیکن سمجھتے یہی پٹھان ہی تھے۔ چونکہ اُس کی ذہنیت مزدور ذہنیت سے قطعی مختلف تھی اول تو اُسے پیسہ کمانا سرے سے آتا ہی نہ تھا۔ اور جو کچھ وہ کماتا سینما دیکھنے اگنڈیریاں چوسنے اور سرسوں کا تیل خریدنے میں صرف کر دیتا۔

دوپہر کے وقت جب مزدوروں کو منڈی کے کام سے فرصت ہوتی تو وہ اسٹیشن یا اڈے پر چلے جاتے کہ کوئی مسافر مل جائے تو کچھ اور پیسے بن جائیں مگر لبھو کو یہ بات کبھی نہ سوجھی تھی۔ اُس وقت یا تو وہ پیپل تلے بیٹھ کر کوئی فلمی دھن گنگناتا اور آنکھوں تلے ہیرو اور ہیروئن کو ملتے دیکھ کر مسکراتا یا اگر جیب میں پیسے ہوتے تو آتما رام عطار کی دکان پر جا بیٹھتا اور مزے لے لے کر ٹھنڈے میٹھے کیوڑے والے شربت کا گلاس پیتا۔

آتما رام کی دکان منڈی کے موڑ پر آم کے درخت تلے تھی جہاں خنکی سی چھائی رہتی۔ سامنے چنی ہوئی بوتلیں۔ اور پاس ہی برف

کی بڑی سی سل کبھی کبھار وہاں جانے آتما رام کی طرف دیکھتا اور سوچتا کہ کاش وہ بھی ایک بے فکر دکاندار ہوتا جسے بوریاں اُٹھانے کی تکلیف نہ اُٹھانا پڑتی۔ لیکن پھر کوئی مکھی اس کے منہ پر بیٹھ جاتی یا کان کے قریب بھنبھناتی اور وہ چونک پڑتا۔ "لالہ جی مکھیاں بہت ہیں۔"

"مکھیاں" ! آتما رام تن کر کہتے ـــــ "مکھی تو ہوگی بھبو ـــ جہاں خالص پھولوں کا شربت ہوگا۔ وہاں مکھی تو ہوگی۔ بس یہی ایک پہچان ہے۔"

لیکن بھبو کو یہ بات نہ جچتی اور وہ کہتا: "اتنی مکھی تو گڑ کی بوریوں پر بھی نہیں ہے چاہے جا کر دیکھ لو منڈی میں"

اور لالہ جی ہنستے: "اونہہ! گڑ۔ راب سے سنے ہوئے گڑ پر کیا بیٹھے گی مکھی ــــ یہ خالص شہد کی مکھی ہے۔ شہد کی۔ وہ مکھی تو نالیوں پر بھی جا بیٹھتی ہے۔ اور یہ! ــــ بڑی پہچان ہے اِسے شہد سی خالص چیز اکٹھی کرتی ہے۔ بڑی سیانی مکھی ہے یہ۔ جبھی تو سٹور کر لیتی ہے۔ بڑی سیانی ہیں یہ مکھیاں۔ خالص شہد اکٹھا کرتی ہیں۔ پھولوں کا شہد۔" اور پھر وہ ہنسنے لگتے گویا بڑے راز کی بات کہہ گئے ہوں۔

آتما رام کی دکان پر بیٹھ بیٹھ کر بھبو کو اُس سیانی مکھی سے دلچسپی ہو گئی اور وہ مکھیوں کو بغور دیکھنے کا عادی ہو گیا۔ دیکھتے وقت یہ بھول جاتا کہ وہ مزدور ہے اور ابھی اُسے بوریاں اٹھانے میں لگ جانا ہے۔ پہلے تو وہ یوں محسوس کرنے لگا جیسے وہ خود مکھی ہو لیکن گندی سی بوتل پر بیٹھنے کی بجائے وہ اڑنے لگا۔ حتےٰ کہ کسی مسکراتی ہوئی ہیروئن کا چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ اور وہ یوں محسوس کرتا جیسے تھک جانے کے بعد بیٹھ جانے کو جگہ مل گئی ہو۔

ایک روز جب وہ ایک بھڑکیلی سی عورت کو دیکھ کر چونکا۔ تو لالہ جی ہنس پڑے۔ بولے: "بھبو یہ سب مایا ہے مایا" ـــــ

"مایا!" بھبو نے دہرایا۔ "مایا تو دھن کو کہیں ہیں مہاراج"

"اونہہ" لالہ جی۔ ہنسے "یہ خون کی لالی نہیں۔ سُرخی ہے ـــــ سُرخی بازار میں تین پیسے کی ڈبیہ ملتی ہے۔ تین پیسے کی۔ بس تین پیسے دو اور پھول بن جاؤ۔ لیکن" ـــــ وہ رازدارانہ انداز میں بولے "ہم بتا دیں۔ چاہے کیسے ہی گلاب سے کیوں نہ دکھیں مکھی نہیں بھٹکے گی۔ بڑی سیانی ہے یہ مکھی۔ بس خالص شہد ہو۔ خالص پھول ہوں۔ اِسے کون دھوکا دے سکتا ہے۔ دیکھ لو ان کالی کالی بوتلوں پر بیٹھتی ہے۔ ولایتی رنگدار بوتلوں پر ــــ اونہہ۔"

اس روز شام کو سینما کے باہر ٹنگی ہوئی تصویروں میں اُسے وہ دلچسپی نہ ہوئی جو روز ہوتی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہ مکھی ہو۔ ہیروئن کا چہرہ اُسے تسکین نہ دے سکا۔ اُسے بیٹھنے کو جگہ نہ ملی۔ اور وہ گھر چلا آیا۔ اُس دن سے نہ جانے اُسے کیا خبط سا ہو گیا وہ مکھی کی طرح پریشان رہتا۔ جیسے اُسے بیٹھنے کو جگہ نہ ملتی ہو حتےٰ کہ اُس کا سینما جانا بھی چھوٹ گیا۔ پھر معاً اُس کے جی میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ شہد اکٹھا کرے۔ خالص شہد ـــــ وہ سودائیوں کی طرح اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ کبھی سٹیشن پر۔ کبھی اڈے پر اور کبھی منڈی میں۔ ہر وقت اُس کی آنکھوں کے سامنے اِک مکھی بھنبھناتی اور اُسے کام کرنے پر مائل کر دیتی۔ حتےٰ کہ ہر کوئی اُسے شربت کی بوتل نظر آنے لگا۔ ہر کوئی جس کے ہاتھ میں گٹھڑی ہو: "میں لے چلوں بابو جی" اُس کا انداز ایسا ہوتا جیسے وہ پہلی مرتبہ مزدوری کر رہا ہو ـــ یا محض آپ کی مدد کرنے کی خاطر کہہ رہا ہو۔ جیسے اُسے آپ سے دلچسپی ہو مزدوری یا پیسے سے نہیں۔ آپ کی زبان بند ہو جاتی اور آپ اُس کے گٹھڑی اٹھا لینے کے خلاف کچھ نہ کہہ سکتے۔ لیکن اُس میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ اُسے اکنی دیں یا چونی اس کے لئے سب برابر تھا۔ ہر رقم اُس کے نزدیک رقم تھی۔ وہ پسینہ پونچھ کر اُسے جیب میں ڈال لیتا اور چپ چاپ چلا جاتا۔ پھر اُس کی آنکھوں تلے مکھی بھنبھناتی اور وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگتا۔

کچھ مدت میں اُس نے کئی ایک چھوٹے موٹے کام سنبھال لئے سیٹھ چھجو مل کی دکان کھولنے اور بڑھانے کے لئے اُسے تین روپے ملتے۔ آتما رام عطار نے بھٹی کے کام میں اُس سے مدد لی اور سینما والوں نے اُسے چوکیدار رکھ لیا۔ جہاں تنخواہ کے علاوہ شو مفت دیکھتا لیکن وہاں کیا تھا! خواہ مخواہ آنکھیں مٹکاتے اور ہونٹ بناتے ہوئے

چہرے پر شو تو اس کے دل سے اتر چکا تھا۔ اب اس کا جی چاہتا تھا کہ کوئی اپنا کام کرے۔ چونکہ شربت اور مربہ بنانے میں اُسے کافی مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ لہٰذا لبھو۔ منڈی کا مزدور لبھو۔ عطار بن گیا۔ لبھو عطار ——

شروع شروع میں بیچارہ بڑا تنگ تھا۔ صبح سے شام تک جتنے پیسے کماتا۔ رات کو اس کی کھانڈ اور لکڑیاں لے آتا اور دوسرے دن دکانداری چلانے کے لئے شربت بنا لیتا۔ وہ صرف شربت بیچتا تھا۔ اُس کے پاس اتنی پونجی نہ تھی کہ دیگر ضروریات بھی مہیا کر سکتا۔ گاہک اُسے گھٹیا درجے کا دکاندار سمجھ کر اُس کی دکان کا رُخ نہ کرتے بھلا کسے پڑی تھی کہ شربت تو اُس کے ہاں سے لے اور گاجر کا مربہ کہیں اور سے —— لیکن بچے —— ہاں لبھو کا بہرہ چمک اُٹھا۔ اُس نے املی کی چٹنی بنائی اور اپنے ہر گاہک کو چٹنی کا "چسکا" دینے لگا۔ اس بات پر محلے کے تمام لڑکے لبھو کی دکان پر آنے لگے پھر تو لبھو کا شربت بغیر برف کے بکنے لگا۔ دھیرے دھیرے اُس نے کھٹی میٹھی گولیاں بھی خریدلیں۔ گولیوں کے شوق میں اور بھی بچے اس کی دکان کی طرف کھنچے آتے۔ صبح کو اُس کی دکان پر گلاسوں کی قطار لگ جاتی اور دکان کے باہر بچوں کا اسکول۔ بچے اکثر گھر سے پٹ جاتے۔ "کس لٹیرے سے شربت لاتے ہو۔ برف کا نشان تک نہیں ہوتا۔" اگرچہ اس وقت وہ رو دیتے اور شاید لبھو کی دکان پر نہ جانے کا وعدہ بھی کر لیتے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ املی کا چٹخارہ بھی بڑی چیز ہے۔ اس کے علاوہ "چسکے" کا احساس بذاتِ خود امیری سے کم نہیں۔ بس وہ پیسے ملتے ہی گلاس لیکر سیدھے لبھو کی دکان کی طرف بھاگتے۔

لبھو کو بھی اس بات کا علم ہو گیا کہ اُس کے ننھے منھے گاہک شربت میں برف نہ ہونے کی وجہ سے اکثر پٹ جاتے ہیں۔ چونکہ اُس کی ساکھ بندھ چکی تھی۔ اسی لئے اُس نے اپنے گاہکوں کے لئے برف اور کیوڑا مہیا کرنے کو کچھ ادھار لیا اور برف اور کیوڑا کے ساتھ ساتھ اچار بھی خرید کر بیچنا شروع کر دیا۔

لبھو دکان پر چپ چاپ بیٹھا غور سے مکھیوں کی طرف دیکھتا رہتا۔ جو خالص شہد جمع کرنے میں لگی رہتیں۔ وہ خوش تھا کہ اس کی دکان پر شہد کی مکھیاں آتی تھیں۔ وہ مکھیاں اُس کے کھرے سودے کا سرٹیفکیٹ تھیں۔ لبھو بالکل خالص چیزوں سے شربت نکالنے کا قائل تھا۔ اگرچہ اس وجہ سے اُسے بہت زیر بار ہونا پڑتا لیکن کسی حالت میں بھی اُسے ناخالص چیز خریدنا گوارا نہ تھا۔ چونکہ وہ ڈرتا تھا کہ ایسا کرنے سے مکھی نہ آئے گی۔ اور مکھی نہ آتی تو وہ صبح سے شام تک کسے دیکھتا اور پھر اُس کے دل میں روپیہ جمع کرنے کی خواہش کون بھڑکاتا۔ وہ انہیں خیالات میں کھویا رہتا۔ حتےٰ کہ کوئی گلاس ٹھن سے تختے پر بجتا اور وہ چونک اُٹھتا۔ اور گھبراہٹ چھپانے کے لئے بڑبڑا اُٹھتا—"ایں —— بڑی سیانی ہے یہ مکھی۔ سارا دن مجاوری کرے ہے۔ کیا مجال جو کھوٹی چیز کی طرف دھیان بھی دے —— اونہہ —— کبھی چاہے تھوڑی ہو پر ہو کھری۔ ایک آنے کا کر دوں؟"

سودا دے کر از سر نو وہ مکھی کو دیکھنے میں کھو جاتا جو شہد اکٹھا کرنے میں لگی ہوتی اور پھر نہ جانے کیوں اٹھ کر اپنی تھیلی نکال اپنے اثاثے کو گننے کے لئے اندر چلا جاتا۔ کریانے کو پیار سے چھوتا۔ گنتا اور مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا۔ کبھی وہ شہد اکٹھا کرنے والی مکھیوں کو دیکھتا اور کبھی اپنے اکٹھے کئے ہوئے میلے کچیلے کریانے کو جس کے بوجھ سے وہ تھیلی یوں پھٹی جا رہی تھی جیسے بھرے شہد کا چھتہ۔ ٹھن سے ایک گلاس تختے پر بجتا اور چھن سے اس کے ہاتھ سے کریانے کی موٹے کھدر کی میلی کچیلی دوہری تھیلی چھوٹ جاتی اور وہ بھاگ کر باہر آ بیٹھتا۔ گاہک کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتا جب ذرا اطمینان ہو جاتا تو بوتل کا ڈاٹ کھولتا اور مکھیاں اُڑاتے ہوئے آپ ہی آپ بولنے لگتا: "بڑی سیانی ہے یہ مکھی ——"

ایک روز ایک واقعہ سے وہ بے حد متاثر ہوا۔ کوئی شوقین بابو جو پڑوس ہی میں رہتا تھا اور اکثر لبھو سے مکھی کے بارے میں بہت سی باتیں سُن کر اثبات میں سر ہلانے کا عادی ہو چکا تھا۔ اُس کی دکان پر آیا اور کہنے لگا "چار بوتل شربت صندل تو بنا دو" اب مشکل یہ تھی کہ صندل کا شربت تیار نہ تھا۔ مگر خیر لبھو نے

جھٹ حساب لگا کر بتا دیا: "بابو جی اتنے پیسے لگیں گے۔ بس یہ کھرید کے دام ہیں اور آپ سے بڑائی کیا لوں گا میں۔ آپ تو بالکل اپنے ہی ٹھہرے"۔ ــــــ روپے لیکر وہ سودا لینے چلا گیا۔ راہ میں معاً اُسے خیال آیا کہ وہ بوتلیں بچوں والے گھر جائیں گی۔ خالص شربت کی بوتلیں۔ خالص پھولوں کا رس ــــــ شہد کی مکھیاں ــــــ بچوں والے گھر میں شہد کی مکھیاں! اگر کسی کو کاٹ کھائیں! ــــــ "بھلا بچوں والے گھر میں خالص چیز کی کیا جرورت ـ آخر کوئی بَیر تو نہیں اُن سے۔ اور پھر گھر ہی تو ہے اور وہ بھی بچوں والا ــــــ" وہ سوچتا گیا اور آگے بڑھتا گیا۔ مارکیٹ میں پہنچکر اُس نے ناخالص چیزیں خرید لیں۔ اور اس لئے ناخالص شربت تیار ہو گیا۔ اگلے دن اُس کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ مکھی اُن چار بوتلوں پر بھی بیٹھ گئی۔ پہلے تو وہ ہنسا۔ بڑی چاتر ہے یہ مکھی۔ بیٹھ گئی کہ بوتل کا دل نہ دکھے۔ وہ ہنسنے لگا۔ لیکن دو دن تک وہ دیکھتا رہا کہ مکھی اُن ناخالص بوتلوں سے نہ اُڑی۔ نہ جانے اُسے کیا سوجھی اور وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اُس کی آنکھیں چمکیں اور وہ مسکرایا ــــــ پھر اُس کا منافع دو گنا سے سہ گنا اور سہ گنا سے چہار گنا ہوتا گیا۔ حتےٰ کہ موٹے کھدر کی میلی کچیلی دوہری تھیلی کی جگہ لوہے کی تجوری آ دھمکی۔ چھوٹے مرتبان قدِ آدم مٹکوں میں بدل گئے۔ بوتلوں کی قطاریں بڑھنے لگیں اور تختے پر پیتل کی چادر پڑ گئی۔ اُس کی توند کچھ اور بڑھ آئی۔ اور لوگ اُسے سیٹھ لبھو رام کہنے لگے ــــــ لیکن مکھیاں ویسے کی ویسے ہی رہیں ــــــ اس نے گاہکوں سے مکھیوں کا ذکر کرنا چھوڑ دیا۔ جیسے وہ اک راز بن گیا ہو۔ لیکن وہ آپ ہی آپ اُنہیں دیکھ کر ہنستا۔ دل ہی دل میں سوچتا: "بڑی چالاک ہیں یہ مکھیاں ــــــ چاتر ــــــ پھول وہ نہیں جو پھول ہو۔ پھول وہ ہے جس پر مکھی بیٹھ جائے۔ چلتی کا نام گاڑی ہے"ــــــ اور وہ بیٹھا بیٹھا مسکرایا کرتا اور اُس کے دو ملازم لوگوں کو سودا دینے میں لگے رہتے۔ "ہوں۔ پھول" وہ بیٹھا سوچتا اور پھر راجو کی سُریلی آواز اُسے چونکا دیتی۔ اور وہ سر اٹھا کر دیکھتا۔

راجو کے گورے چٹے چہرے پر بائیں جانب مکھی بیٹھی دیکھ کر پہلے روز تو وہ گھبرا گیا تھا کہ کہیں اُسے کاٹ نہ لے۔ اور پھر خواہ مخواہ اپنے ہاتھ سے اِردگرد کی مکھیاں اڑانے لگا کہ شاید اِس طرح وہ مکھی بھی اُڑ جائے۔ اِس بات پر راجو نہ جانے کیوں مسکرا دی تھی اور نہ معلوم کیوں اپنا ہاتھ یوں ہلایا تھا جیسے جتا رہی ہو: "یہ مکھی اُڑنے کی نہیں"۔ پھر اُسے معلوم ہوا کہ وہ تِل ہے ــــــ اب اُسے دیکھ کر وہ مسکرا دیا کرتا اور بوتل سے مکھیاں اڑاتے ہوئے کہتا۔ "اونہوں یہ مکھی نہیں اُڑے گی جب تک رس ہے!" اُس وقت اُسے ایسا معلوم ہوتا جیسے خود مکھی ہو اور کسی شگفتہ پھول پر بیٹھی ہو۔ راجو مسکراتی۔ "بڑی چاتر ہے۔" وہ سوچتا اور پھر پھول پر بیٹھ جاتا اور جب وہ چلی جاتی تو نوکر کو مکھی سے جھجکتے ہوئے دیکھ کر کہتا ــــــ "کرشنے تم کھا کھاڈ۔ وہ ہو۔ بھئی یہ مکھی تو جہاں بیٹھے ہے پھول کھل جاوے ہے واں"

گھر میں چھوٹے بھائی کی بیوی سندری کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک جاتا۔ اُس کا جی چاہتا کہ وہ اُسے پھول بنا دے۔ اُسے یوں دیکھتے ہوئے سندری جھینپ کر ایک طرف سرک جاتی اور وہ پریشان ہو کر کوٹھے پر چڑھ جاتا۔ پھر وہ مکھی اُڑتی۔ کبھی اِس چھت پر کبھی اُس چھت پر لیکن اُسے دیکھ کر سبھی چھوئی موئی ہو جاتے اور بیٹھنے کو کوئی جگہ نہ ملتی پھر وہ نیچے اتر آتا اور دکان پر جا بیٹھتا۔ لیکن سودا دینے کو نوکر موجود تھے سو وہ مکھی اُڑتی راہگیروں کے اردگرد منڈلاتی اور آخر راجو کے منہ پر جا بیٹھتی ــــــ راجو کی آواز سن کر سیٹھ جی آپ تختے پر آ بیٹھتے "کیا لو گی؟" ــــــ

"گاجر کا مربہ" وہ مسکراتی "دو آنے کا اور چاندی کے ورق ایک آنے کے"

اور جب نوکر مربہ لاتا تو وہ مکھی اڑاتے ہوئے ہنستا: "یہ مکھی نہیں اُڑنے ہے"۔ اور جب وہ چلی جاتی تو ہنس کر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا: "وہ مکھی ہی کیا جو نہ اُڑے"۔ پھر وہ آپ ہی آپ ہنسنے لگتا اور دیکھتا کہ دکان بھر میں مکھیاں اُڑ رہی ہیں۔ اُڑ رہی ہیں۔ صرف اُڑنے کے لئے بیٹھتی ہیں ــــــ اور پھر اُس کے لئے

بیٹھے رہنا مشکل ہو جاتا ——

راجو تھانیدار کی نوکرانی تھی۔ جس قدر منہ کی گوری تھی اُسی قدر بات کی سلونی۔ پہلے تو وہ سیٹھ لبھو رام کی باتیں سن سن کر مسکراتی رہی۔ آخر ایک دن بولی: "مکھی کا کیا ہے۔ جہاں گڑ دیکھا اڑ آئی" اس مختصر سی بات نے نہ جانے سیٹھ لبھو رام پر کیا اثر کیا کہ اس کی نگاہ میں سب کچھ بدل گیا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اُسے جادو کے ڈنڈے سے چھو دیا ہو۔ اُس نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا، سامنے راجو مکھی کی طرح اڑ رہی تھی اور اُس کی اپنی جگہ تختے پر گڑ کی بڑی سی بھیلی رکھی ہوئی تھی۔

وہ بیٹھا سوچ رہا تھا۔ دکان میں مکھیاں اڑ رہی تھیں۔ باہر بازار میں مکھیاں رینگ رہی تھیں۔ چاروں طرف مکھیاں ہی مکھیاں تھیں۔ اس ہما ہمی میں وہ اور اس کی تجوری گڑ کی بھیلی کی طرح پڑے تھے۔

یہ احساس اس کے لئے قطعی نیا تھا۔ اُس نے محسوس کیا جیسے وہ کوئی بڑا دیا لو ہو۔ اور سبھی اڑ اڑ کر اس پر بھنبھنانے ہوں اس بات پر اس کے جیون نے ایک پلٹا کھایا۔

گھر جا کر اب وہ سندری کو تاڑتا نہ تھا بلکہ اُسے دیکھ کر آنکھیں جھکائے رکھتا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہتا۔ اور سندری بغیر گھبرائے جواب دیا کرتی۔ لیکن سیٹھ لبھو رام کی آنکھ کچھ بھری بھری ہوتی جیسے دیا کر رہی ہو۔ اور تو ند کچھ ابھری ابھری!

"سندری اری تو تو سردیوں میں بھی ململ کی چُنّی پہنے ہے۔ اچھا تو ہم ایک گرم چادر منگوا دیں ہیں تجھے"

پہلے تو سندری حیران ہو گئی۔ لبھوا اور خرچ! لیکن اُسے معلوم ہوگا۔ کہ اب وہ گڑ کی ایک بھیلی ہے۔ جو مکھیوں کے انتظار میں پڑی ہے —— لیکن راجو۔ راجو جانتی تھی۔ اس بازار میں کون تھا جو راجو کو نہ جانتا ہو۔ وہ کیسے نہ جانتے اُسے، راجو روز دانتوں پر اخروٹ کی چھال ملتی، آنکھوں میں ڈالنے کے علاوہ تل میں بھی کاجل بھر لیتی۔ اور ململ کی قمیص تلے شوخ رنگ کا کپڑا پہنتی جو گویا قمیص اٹھا اٹھا کر جھانکتا۔ کیسے نہ جانتے لوگ راجو کو۔ اس کے علاوہ راجو بھی کئی ایک کو جانتی تھی۔ مثلاً محلے کا چودھری۔ جس کے پاس کبھی کبھی وہ چینی لینے جاتی تھی۔ لیکن اُن دنوں وہ تھانیدار کے ہاں نوکر نہ تھی اور چودھری صاحب کہتے "ہوں۔ چینی لیگی۔ کیوں جی؟"

"جی"۔ وہ مسکرا کر آنکھیں جھکا لیتی۔

"دانہ ہو نا راجو؟" وہ بامعنی انداز سے پوچھتے۔

"جی دانہ دار" اس کے ہونٹ کلی سی بن جاتے۔ آنکھیں چھپ چھپ کر اپنا آپ دکھاتیں اور وہ شوخ رنگ کا کپڑا قمیص تلے سے جھانکتا اور چودھری صاحب ہونٹوں پر یوں زبان پھیرتے جیسے مصری چوس رہے ہوں" سیٹھ لبھو رام ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ "اچھا تو دو آنے کا شربت اور ایک آنے کے ورق —— تین آنے —— باقی رہے ایک روپیہ تیرہ آنے۔ یہ لو تیرہ آنے۔ اور ——" معاً انہیں کچھ سوجھا۔ پانچ روپے کا نوٹ نکال کر راجو کو دیتے ہوئے مسکرائے۔ "اور یہ لو روپیہ"

راجو پہلے تو مسکرائی۔ لیکن پھر ماتھے پر تیوری چڑھا لی۔ اور پانچ کا نوٹ تختے پر پھینک دیا۔

"وہ ناراج ہو گئی؟" سیٹھ صاحب بولے "اچھا" اور پھر دس کا نوٹ نکال کر اُسے دکھایا۔

غصے سے راجو کی آنکھیں اور بھی کالی ہو گئیں۔ اور ہونٹ بالکل ہی مل گئے۔ اُس نے دوپٹے کو لہرایا۔ اپنے اردگرد لپیٹا اور گلاس اٹھا نوٹ لئے بغیر چلی گئی۔ معاً لبھو رام نے محسوس کیا کہ گڑ کی بھیلی راب بن گئی تھی اور مکھیاں اڑ گئیں تھیں۔ اس وقت انہیں وہ دکان خالی خالی دکھائی دی۔ اور بازار ویران ویران لیکن رات کو جب وہ اکیلے بیٹھے حساب کر رہے تھے۔ تو معاً راجو کی آواز نے انہیں چونکا دیا: "لالہ جی دیجئے میرا باقی اور خبردار جو مجھے چھیڑا تو۔ نہیں تو تھانیدار صاحب سے کہدوں گی ہاں!"

لالہ جی تھانیدار کا نام سُنکر گھبرا گئے۔ بولے: "اچھا جو کچھ تیرا بنتا ہے اُٹھا لے"۔ اور راجو نے پڑے ہوئے نوٹوں میں سے جھٹ ایک روپیہ کا نوٹ اٹھا لیا اور چل کھڑی ہوئی۔ دو قدم گئی ہو گی کہ "ہائے رے" چلا کر بیٹھ گئی۔ لالہ جی گھبرا گئے۔

"ستیاناس ہو اِن مکھیوں کا" وہ انگلی چوستے ہوئے چلائی "یہ کیا دکان ہے۔ اللہ مارا ڈو منے کا چھتہ ہے"

"ابھی سرکہ لگائے دیتا ہوں" لالہ جی سرکے کی بوتل لینے اندر گئے اور پھر وہیں سے چلائے "یہیں آجاؤ۔ دیئے کی روشنی میں لگا دوں"

"توبہ اب میں اندر آؤں!" راجو نے منہ بنا کر کہا۔ لیکن اندر چلی گئی۔

اندر ایک مکھی بھنبھنانے لگی —— اور پھر دوسری۔ ۔ ——— پھر دونوں۔ اور معاً ایک گڑ کی بھیلی بن گئی۔ اور، اور دوسری! ——— دوسری! ——— !

اب ہر روز مکھی آتی سیٹھ کو کاٹتی اور اس طرح وہ قطعی طور پر گڑ کی بھیلی بن گئے ———

اب سیٹھ جی کے لئے اِدھر اُدھر چل کر جانا مشکل ہوگیا۔ وہ اپنے آپ کو بوجھل سمجھنے لگے۔ اُنہوں نے ہندلینڈ ڈ منڈالی جس کے آگے ایک براق گھوڑا جتا رہتا۔ ایک سائیس بھی نوکر رکھ لیا جس کی پتنی راجیشری کے ماتھے پر مکھی بیٹھی رہتی تھی۔ جو اکثر اُسے کاٹ لیتی، اور سیٹھ جی اُسے سرکہ لگانے کیلئے اندر بلا لیتے اور خود گڑ کی بھیلی بن جاتے!

شام کو وہ فٹن میں بیٹھ کر سیر کیا کرتے۔ ایک روز فٹن "اُس" بازار میں جا پہنچی۔ اُنہیں دیکھنے کے لئے چوباروں میں رنگین مکھیاں بھنبھناتی ہوئی آگئیں۔ ان کی بھنبھناہٹ راگ بن کر چھا گئی۔ سارنگیاں غلافوں سے نکل آئیں۔ طبلہ جلاپے سے چھاتی پیٹنے لگا۔ بیراگیوں نے ستاروں کو گلے لگا کر رونا شروع کر دیا۔ اور پھر نہ جانے کس جادو کے زیر اثر وہ مکھیاں تیتریاں بن کر ناچنے لگیں۔ اور —

بالآخر وہ گڑ کی بھیلی کڑاہی میں جا پڑی۔ جہاں نرم نرم آنچ پر پگھل کر وہ راب بن گئی۔ اور — اور — بوتلیں نکلیں۔ سرخ سرخ ولائتی بوتلیں جن پر مکھی نہیں بیٹھتی —

——— نہ جانے پھر کیا ہوا کڑاہی کی ہلکی ہلکی آنچ سے وہ راب اڑ گئی تو مکھیوں نے بھی اڑنا شروع کر دیا۔ حتےٰ کہ ایک روز سیٹھ لبھو رام تنہا رہ گئے۔ اور اُن کی دکان حکیم اودے سنگھ نے خرید کر اُنہیں وہاں سے نکال دیا۔ لیکن اب اُنہیں خود اڑنے یا اڑجانے والے سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ اور وہ بچا کھچا اثاثہ لے کر از سرِ نو ایک دکان لے کر بیٹھ گئے۔ لیکن اب وہ شہد یا گڑ والی چیزوں کو خریدنے یا بیچنے سے خائف تھے ———

اُن سے آپ حیرت سے پوچھیں گے "سیٹھ جی پکوڑوں کو ہوا دینا! ——— پکوڑوں پر مکھی؟" اور وہ حیرانی سے آپکی طرف دیکھینگے —— "مکھی!! —— مکھی کہاں نہیں بیٹھتی مہاراج۔ نری جہر ہے جہر" —— اور وہ اپنی توند اور پکوڑوں کے تھال کو پنکھے سے ہوا دینے لگیں گے ❖

تین غزلیں

عزیز تھی جن کو زندگی کس لئے وہ جاں سے گذر رہے ہیں؟
حقیقتِ زندگی عیاں ہو گئی ہے شاید کہ مر رہے ہیں
مٹے حجاباتِ قرب و دوری، اُٹھے مکان و زماں کے پردے
کوئی ہمیں یاد کر رہا ہے، کسی کو ہم یاد کر رہے ہیں
اُسی پُرانی روش پہ قائم ہیں آج بھی دردمند تیرے
طلوعِ صبحِ ازل سے اب تک ہلاکِ ذوقِ نظر رہے ہیں
مری نگاہوں سے دور شاید کوئی کہیں مسکرا رہا ہے
کہ خود بخود پھول سے مرے دامنِ نظر میں بکھر رہے ہیں
یہ بے نیازی، یہ جذبۂ احترام، یہ محویت کا عالم
کہ اُن کے پہلو میں رہ کے پہروں ہم اُن سے بھی بےخبر رہے ہیں
سمائے ہیں بارہا وہ رگ رگ میں ایک موجِ سرور بن کر
نظر میں اک کیف سا رہا ہے وہ جب بھی پیشِ نظر رہے ہیں
جگانے آئے شورِ حشر ہم کو، لگی ہے مشکل سے آنکھ اپنی
کسی کے جلووں کے منتظر عمر بھر سرِ رہگذر رہے ہیں
غمِ جدائی میں چشمِ پُرنم کوئی نئی بات تو نہیں ہے
کہ اُن کے ہوتے بھی ہم تو اکثر حفیظ باچشمِ تر رہے ہیں

حفیظ ہوشیارپوری

کچھ دل ہم کو سمجھاتا ہے، کچھ ہم دل کو سمجھاتے ہیں
دیوانے مگر دیوانے ہیں، ہر حال میں دھوکا کھاتے ہیں
آلام و مصائب ہستی کے ہر آن جو بڑھتے جاتے ہیں
کیا یہ بھی کوئی دیوانے ہیں، دیوانوں کے مُنہ آتے ہیں
اے ہم سفرو مایوس نہ ہو احساسِ طلب ہے عینِ طلب
ہم گرتے پڑتے مر مٹ کر منزل پہ پہنچ تو جاتے ہیں
کہتے ہیں کسی نے تیرا نشاں پایا ہے نہ کوئی پائے گا
لو آج اِس عقدۂ مشکل کو ہم جاں دے کر سلجھاتے ہیں
اسرارکشائی کی منزل کو پا لینا آساں ہی سہی
لیکن پھر اِس کے متوالے رستے ہی میں کیوں کھو جاتے ہیں
طوفاں کی موجوں پر جن کی قسمت کا فسانہ لکھا ہو
ساحل پہ بھی ہوں وہ تو اُنہیں ساحل بھی بھنور بن جاتے ہیں
جینا کیا اِس کو کہتے ہیں مرتے ہیں نہ جیتے ہیں طاہر
گہ زیست کے دھوکے کھاتے ہیں گہ موت سے جی بہلاتے ہیں

سلیم طاہر

ایسے لمحے بھی محبت میں گذر جاتے ہیں
مسکراتا ہوں تو آنسو بھی نکل آتے ہیں
ہائے! ایّامِ محبت کی طلسمی یادیں!
قافلے وقت کے خوابوں میں ڈھلے جاتے ہیں
آہ! اس دل کی بدلتی ہوئی کیفیتِ جذب
وہ کبھی پاس، کبھی دور نظر آتے ہیں
دل کے اِن جھوٹے سہاروں پہ بھی جینا معلوم
وہ ابھی آتے ہیں، آ جائیں گے، آ جاتے ہیں
میرے احساس میں شعلے سے فروزاں ہی سہی
کچھ دھندلکے تری آنکھوں میں بھی لہراتے ہیں

ضمیر جعفری

میراجی

تین گیت

ہری ہر بولے من ہرجائی

ایک سہانا سپنا دکھلا دو — یا اپنا ہی جی بہلا دو
کون اس بھید کو کھولے — ہری ہر بولے
ایسا ہی یہ [illegible] — [illegible] بڑھے تو [illegible]
[illegible] — ہری ہر بولے
دھیان [illegible] چین نہ پائے — ہر جو آئے وہی بتائے
[illegible] — ہری ہر بولے

کوئی پریم کا چتر بنا نہ سکے
جو بناتے وہ دل کو بچا نہ سکے
سکھی شیام کو نین چھپا نہ سکے
مرے ہردے کی تھاہ کو پا نہ سکے
بھرے پریم کے جل سے کیوں یہ نین
لگی پریت کی آگ بجھا نہ سکے
ہیئہ ایسا جو بیاکل ہوئے سکھی
مرے ہردے کی لاج نبھا نہ سکے
سنا آئے سجن مدھو ماس بنے
مرے شول کو پھول بنا نہ سکے
کوئی پریم کے روپ کو پا نہ سکے
کبھی پائے تو جگ میں سما نہ سکے

مقبول احمد پوری

پریت میں ہیں کب ٹھنڈی آہیں
تم چاہو پریتم کیوں چاہیں
سپنوں کا جادو کیوں ٹوٹے
پریت لگن نہیں جھوٹے
نینوں میں جب نین سمائے
نیناں بن کیا دیکھا جائے
سپنوں کا جادو کیوں ٹوٹے
پریت لگن نہیں جھوٹے
چندر کلا جگ جیون جوتی
پریت لگن ہے آشا کے موتی
سپنوں کا جادو کیوں ٹوٹے
پریت لگن نہیں جھوٹے

عبدالمجید بھٹی

محمد انور انصاری

افسانہ اور اُس کی تشکیل

ذہنی ارتقا کی ابتدا ہی سے انسان کو کہانی سننے اور کہنے کا شوق رہا ہے۔ اب سے سینکڑوں برس پہلے کے یونان میں بھی کہانیاں اپنی زبان کی ابتدائی پیداوار ہونے کی وجہ سے زیادہ تر نظم میں لکھی گئی ہیں۔ یونانی زبان کے علاوہ سنسکرت۔ لاطینی۔ عبرانی اور عربی زبانوں میں بھی بکثرت کہانیاں پائی جاتی ہیں۔ بعض بعض زبانوں کی کہانیاں تو ایسی ہیں جن کو اس زبان کے ادبِ عالیہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی نمایاں مثال الف لیلہ و لیلہ ہے۔ الف لیلہ نہ صرف کہانیوں کا ایک زبردست مجموعہ ہے بلکہ اس کو عربی ادب میں ایک نمایاں حیثیت بھی حاصل ہے خیال ہوتا ہے کہ اول اول تو کہانیوں کی بنیاد سچے واقعات پر رہی ہوگی۔ لیکن رفتہ رفتہ ان پر مبالغہ کا رنگ چڑھنے لگا۔ لکھنے والے کو کسی خاص مقصد کے ماتحت، بالخصوص پڑھنے والے اور سننے والے پر ایک خاص اثر پیدا کرنے کی غرض سے واقعات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا پڑا جس کے لئے قوتِ اختراع سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ ان قدیم کہانیوں میں جس چیز پر زور دیا جاتا ہے وہ اُن کے افراد کی فوق البشر اور محیر العقول قوتیں ہیں۔ ان میں افراد روزمرہ کے انسان ہونے کے بجائے اساطیری دیوتاؤں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ جن میں صبر، تحمل، بہادری، عفت، عدل، عقل اور جرأت کی خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں اور جن کو کسی نہ کسی صورت میں غیبی امداد بھی ملتی رہتی ہے۔ ان کہانیوں کا مقصد زندگی کی عکاسی کرنا نہیں بلکہ محض اپنے زمانہ کے اخلاقی پہلو پر روشنی ڈالنا ہوتا ہے

زمانہ کے ساتھ ساتھ کہانیوں کے چہرہ مہرہ اور موضوع میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہا۔ داستان گوئی کی مختلف شکلوں اور ان کے موضوع کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ہمیشہ سے دلچسپی کا باعث رہی ہے۔ داستان گوئی اور روایت نگاری کو بہ نسبت دوسرے اصنافِ ادب کے اس لئے اور بھی مقبولیت حاصل رہی کہ اس میں انسانی خدوخال نمایاں ہونے کے علاوہ، دوسروں کے دُکھ سُکھ محسوس کرنے اور اس کے اظہار کرنے کی بھی زبردست صلاحیت موجود ہے۔ تاریخ، سوانح نگاری، رزمیہ شاعری، ڈرامے اور قصے یہ سب کے سب اسی جذبہ داستان گوئی کے مختلف انداز ہیں۔

قصے کہانیوں کی مختلف قسموں میں افسانہ نگاری جس سے ہماری مراد مختصر افسانہ لکھنے سے ہے، بحیثیت ایک علیحدہ صنفِ ادب کے انیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ حال ہی میں اس نے دنیا کی تقریباً ہر زبان میں اتنی تیزی سے ترقی کی کہ قصوں، داستانوں، حکایتوں اور ناولوں کے مقابلہ میں اس کے خدوخال نمایاں ہونے لگے۔ یہاں تک کہ ادب میں اس کو ایک مستقل جگہ دینا پڑی۔ سو سال کے اندر ہی اندر افسانہ نگاری کو ناولوں سے بھی زیادہ مقبولیت حاصل ہوگئی اور کوئی تعجب نہیں کہ ناول کی اہمیت، سماجی بحران اور لوگوں کی عدیم الفرصتی کی وجہ سے گھٹتے گھٹتے مختصر افسانہ کی مقبولیت کے نیچے دب کر رہ جائے۔ افسانہ اور ناول میں اس قدر مشابہت اور مماثلت ہے کہ ان دونوں کے درمیان فنی لحاظ سے امتیازی فرق نمایاں کرنا ضروری ہے۔ ظاہر میں تو ضخامت کا فرق ہے۔ لیکن دراصل اس کے علاوہ ایک بنیادی فرق بھی ہے۔ ناول کا عام طور سے یہ مقصد ہوتا ہے کہ ایک فرد یا بہت سے افراد کی پوری زندگی یا زندگی کے زیادہ سے زیادہ حصے کی عکاسی کی جائے۔ اس میں افراد کی زندگی، ان کے میل جول اور خیالات کو تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے۔ مگر افسانہ میں زندگی کی محض ایک جھلک ہوتی ہے۔ اس میں کسی ایک حادثے، ایک واقعے، ایک پہلو سے زیادہ کی تصویر پیش کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ناول نویس زندگی کی مکمل تصویر پیش کرنے کیلئے جزئیات اور تفصیلات

کو بھی پیش کرتا ہے۔ لیکن افسانہ نگار ان تفصیلات کو پیش کرنے کے لئے محض معنی خیز اشاروں سے کام لیتا ہے۔ اس سلسلہ میں فن کار کو کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ افسانہ لکھتے وقت سب سے بڑا مسئلہ واقعات کے انتخاب کا ہوتا ہے۔ افسانہ نگار کو واقعات اور تاثرات کے انبار میں سے بعض چیزوں کو نظر انداز اور بعض کو مختصر طور پر بیان کرنا پڑتا ہے۔ افسانہ میں کم از کم ایک واقعہ کو یا زیادہ سے زیادہ زندگی کے ایک پہلو کو پُر اثر، مختصر اور معنی خیز انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے اور انہیں خصوصیات کو مدِنظر رکھنا افسانہ نگار کا سب سے بڑا فرض ہے۔

ان خصوصیات کو نمایاں کرنے کے لئے افسانہ میں تسلسل اور ربط، وقت اور جگہ کا تطابق اور وحدتِ اثر کا ہونا لابدی ہے۔ غرضیکہ افسانہ میں ایک منظم وحدت کا ہونا ضروری ہے جس کو پڑھنے والا آسانی سے محسوس کر سکے۔ کوئی واقعہ، کوئی شوشہ، کوئی ایسا اشارہ اس میں نہ ہونا چاہئے جو بے ضرورت ہو یا جس سے افسانہ کی یک رنگی میں فرق پڑے یا جس سے پڑھنے والے کی توجہ مرکزی واقعہ یا کردار سے ہٹ جائے۔ اس لئے برخلاف ناول نویس کے، افسانہ نگار کو افسانہ کا بنیادی خاکہ ہر وقت ذہن میں رکھنا پڑتا ہے تاکہ افسانہ کو حشو و زوائد سے پاک رکھنے کے لئے واقعات کو اسی خاکہ کے مطابق چنا جا سکے۔

پُرانے زمانہ کے قصے کہانیوں کے برعکس آج کل افسانہ لکھنے کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ دلچسپ واقعات کو تاریخ وار بیان کر دیا جائے بلکہ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان واقعات کو اس اسلوب سے بیان کیا جائے کہ زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی گہری تصویر پڑھنے والے کے ذہن میں گھوم جائے اور لکھنے والے کے ذہن میں جو مقصد و غایت ہے اس کی بھی پوری پوری ترجمانی کر سکے۔ لیکن زندگی کی جھلک نمایاں کرنے میں محض واقعات اور افراد کو پیش کر دینا کافی نہیں جب تک کہ ایک فرد کا دوسرے فرد سے یا ایک فرد کا ماحول سے گہرا تعلق ظاہر کیا جائے۔ یہ باہمی تعلق ناول اور افسانے، دونوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ناول میں یہ تعلق تطابقِ زمانی کے ساتھ بالتفصیل لیکن دلچسپ پیرائے میں پیش کیا جاتا ہے۔ افسانہ میں اس کے اظہار کے لئے محض اشارات سے کام لیا جاتا ہے اور یہ اشارے بھی ایک خاص نیت کے ماتحت کئے جاتے ہیں تاکہ لکھنے والے کا مخصوص ذہنی خاکہ اُبھرے ہوئے نقوش میں نمایاں ہو سکے۔ اس لئے واقعات کو ایک مخصوص دائرے کے اندر محدود کرنے کے لئے لکھنے والے کو پہلے سے اپنے ذہن کے اندر افسانہ کا ایک خاکہ تیار کر لینا پڑتا ہے۔

یہ تو ہوا افسانہ کا پیکر۔ اب جہاں تک افسانہ کے لئے مواد جمع کرنے کا تعلق ہے ہم صرف اشارۃً کچھ بتا سکتے ہیں۔ اس کے لئے کوئی فہرست نہیں تیار کی جا سکتی۔ افسانہ کا مواد بعید مختلف النوع ہوتا ہے۔ افسانے کا مافیہ (MATTER) کو کس انداز میں پیش کیا گیا ہے؟ — اس کا تعلق براہِ راست افسانہ نگار کی ذہنیت سے ہے۔ افسانہ نگار اپنی دماغی اور نفسیاتی ساخت میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اگر ایک طبعاً شگفتہ ہوتا ہے تو دوسرا پژمردہ۔ اگر ایک رومان پسند ہوتا ہے اور خیالی دُنیا میں پناہ لیتا ہے تو دوسرا واقعیت کی سنگلاخ سرزمین پر زندگی بسر کرتا ہے اور اس زندگی سے شکست خوردوں کی طرح گریز کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اسی اختلاف کی بنا پر افسانوں کی بھی تقسیم کی گئی ہے مثلاً طربیہ، المیہ، رومانی، معاشرتی، سماجی، مزاحیہ وغیرہ۔ ہر افسانہ نگار زندگی کو کسی خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے اور جس طرف افسانہ نگار کا رجحان ہوتا ہے۔ اسے دُنیا کی ہر چیز اسی رنگ میں رنگی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ بعض لوگ دُنیا میں فقط رنج و غم ہی دیکھتے ہیں۔ بعض لوگ اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر مایوسی اور قنوطیت سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کی طبیعت پر مزاح کا رنگ غالب ہوتا ہے اور بعض رومان پسند ہوتے ہیں۔ بعض سماجی تقاضوں کو محض اصلاحی رنگ میں پورا کرتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی نظر سماج کے بنیادی نقائص پر بھی پڑ جاتی ہے۔ وہ محض اخلاق کی تبلیغ کرنے یا معمولی اصلاحات نافذ کر دینے پر قانع نہیں ہوتے بلکہ سماج کے ڈھانچہ کو سرے سے ڈھا کر اس میں بالکل نئی روح پھونک دینا چاہتے ہیں اور آج کل صرف وہی لوگ ہماری نظر میں ترقی پسند ہیں جن میں موجودہ سماج کی کرم خوردگی کا پورا پورا احساس موجود ہے اور جن پر یہ حقیقت بالکل واضح ہو چکی ہے کہ موجودہ تہذیب میں پیوند لگا دینے یا اس میں رفو کر دینے سے انسانیت کا تمام

نہیں چل سکتا۔ بلکہ ہم کو ایک بالکل نئی تہذیب کی ضرورت ہے جو ہمارے سماجی تقاضوں کو پورا کر سکے (اس موقعہ پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ایسے لوگ ہر زمانہ میں پیدا نہیں ہوتے۔ اس لئے ہر زمانہ میں انقلاب کی ضرورت نہیں ہوتی جب تھوڑے بہت تغیر و تبدل سے کام چل جائے تو انقلاب کی کیا ضرورت!) ہر زمانہ میں سماجی ضرورتوں کے موجب کچھ نہ کچھ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں لیکن ایک ایسا زمانہ بھی آتا ہے جبکہ بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے اور اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے انقلاب رونما ہوتا ہے۔ پانی ٹھنڈا ہوتا رہتا ہے۔ اس میں لحہ بہ لحہ ٹھنڈک بڑھتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ نقطۂ برودت پر پہنچ کر برف کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ بالکل یہی شکل سماج کی بنیادی تبدیلیوں کی ہے اور موجودہ دور اس نقطہ پر آن پہنچا ہے۔ جہاں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ چنانچہ اس وقت نہ صرف ہندوستان بلکہ ہر ملک کی سماجی حالت اس نہج پر پہنچ چکی ہے۔ جہاں محض مرہم پٹی سے کام نہیں چل سکتا بلکہ مریض کو اچھا کرنے کے لئے اس کے زہرباد پھوڑے کا اپریشن کر دینا ضروری ہے اور جو شخص اس حقیقت سے واقف ہے۔ وہی ہماری نظر میں ترقی پسند ادیب ہے)

اگر یہ صحیح ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہے تو افسانہ نگار کے لئے بھی لازم ہے کہ وہ اپنے ماحول کا مشاہدہ کرنے کے لئے ہمیشہ چوکنا رہے ایک فطری اور بیدار افسانہ نگار اپنے گرد و پیش کے واقعات کو اپنی زندگی کا جزو بنا لیتا ہے اور خلوص کے ساتھ اس حد تک ان کا مشاہدہ کرتا ہے کہ دوسروں کی تکلیف اور خوشی کا احساس خود اس کو بھی ہونے لگے۔ تخئیل کا انتہائی کمال یہ ہے کہ جگ بیتی کو اپنے اندر اس قدر سمو لے کہ وہ آپ بیتی معلوم ہونے لگے۔ اس لئے ایک اچھے اور کامیاب افسانہ نگار کا یہ محبوب مشغلہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی جاذب دلچسپ یا غیر معمولی جھلکیوں کو غور سے دیکھتا ہے اور ان کو اپنے ذہن میں اس طرح جذب کر لے کہ افسانہ میں وہ جھلکیاں واضح طور پر ہمارے سامنے آ جائیں ـــــ محض واقعات کے طور پر نہیں بلکہ اختراعی اور تخلیقی خوبیوں کے ساتھ۔ اس تفصیل کا ماحصل یہ ہے کہ مشاہدہ کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں تخئیل کی فراوانی ہو۔ لیکن تخئیل سے کیا مراد ہے؟ ـــــ یہ ایک فطری اور ذہنی صلاحیت ہے۔ بعض لوگوں میں یہ صلاحیت زیادہ ہوتی ہے اور بعض لوگوں میں کم۔ بہت کم لوگ ہوں گے جن میں یہ صلاحیت بالکل ہی مفقود ہو گی۔ غرضیکہ زیادہ تر انسانوں میں کمی اور زیادتی کے ساتھ یہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ انہوں نے اس صلاحیت سے پورا پورا فائدہ نہ اٹھایا ہو۔

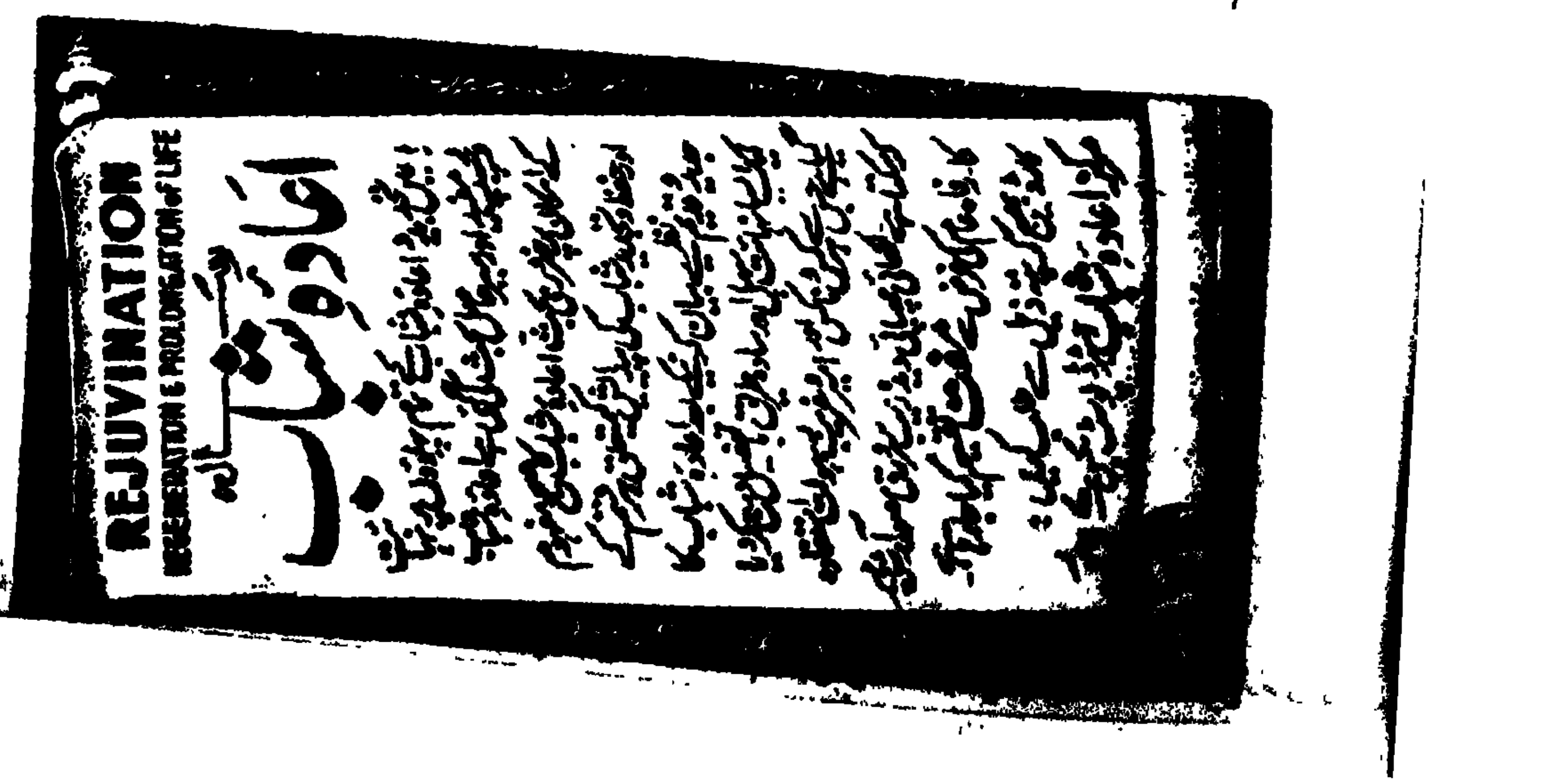
تخئیل نفسیات کی اصطلاح میں اس فعل کو کہتے ہیں جس کی مدد سے خارجی اشیاء کا، ان کے بظاہر موجود نہ ہونے پر بھی خیال باندھا جا سکے، خیال باندھنے میں ہم پر قریب قریب وہ تمام کیفیات طاری ہو جاتی ہیں۔ جو ان اشیاء کو واقعی دیکھنے سونگھنے یا چکھنے وغیرہ سے طاری ہو جاتی ہیں۔ حس یا مشاہدے اور ان کے تخئیل میں بنیادی فرق یہ ہے کہ تخئیل حس اور مشاہدے کے مقابلہ میں مبہم اور غیر واضح ہوتا ہے۔ نفسیات کی جدید تحقیقات نے معلوم کیا ہے کہ انسان میں صرف پانچ حواس نہیں بلکہ چودہ حواس ہوتے ہیں اور انہیں تمام حواس پر تخئیل کی بنیاد ہے [illegible] ہے جس قدر حواس کمزور ہوں گے، اسی قدر تخئیل کی وسعت محدود ہو گی۔ نفسیات نے اس تحقیق کے ساتھ ساتھ تخئیل کی گتھی کو بڑی حد تک [illegible] ہے تخئیل اگرچہ فطری صلاحیت ہے۔ پھر بھی ایک حد تک اس کو ترتیب دیکر تخلیقی کاموں کے لئے مفید اور کارآمد بنایا جا سکتا ہے۔ [illegible] طور پر اسے غذا ملتی رہے تو اس کی اچھی ترتیب ہو سکتی ہے۔ تخئیل کی ساری بنیاد پچھلے تجربات ہوتے ہیں اور انہیں تجربات کی بنا پر آئندہ [illegible] تجربات کی توقع ہوتی ہے۔ اب جس قدر بھی ہمارے تجربات بڑھیں گے اور ہم ان تجربات کا تصور کریں گے۔ اسی قدر ہمارا تخئیل تیز ہو گا۔

افسانہ کا مواد جمع کرنے کے لئے روزمرہ کے تجربات سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن محض واقعات اور تجربات کو من و عن بیان کر دینا روایت ہو سکتی ہے۔ لیکن افسانہ نہیں ہو سکتا۔ افسانہ کے لئے محض واقعات کا بیان کر دینا کافی نہیں ہے۔ اس میں انوکھا پن اور تخلیقی خوبیوں کا [illegible] ضروری ہے۔ اس کے لئے زندگی کے واقعات کو اندھا دھند جمع کر دینا کافی نہیں بلکہ ان مخصوص واقعات کو لینا پڑتا ہے جو افسانہ [illegible] پس منظر کا کام دے سکیں۔ اس کے لئے واقعات کے ساتھ ساتھ [illegible]

گرمی اور تڑپ پیدا ہو سکے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بہت سی حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جو افسانوی معیار پر پوری نہیں اُتر سکتیں مثلاً سائنس کی ایجادات، موسم کے تغیرات وغیرہ، یہ سب خارجی چیزیں ہیں اور اس وقت تک ہمارے لئے بیکار ہیں جب تک انسانی جذبات و محرکات سے ان کا تعلق نہ ظاہر کیا جائے۔

ابھی اُوپر ذکر کیا گیا ہے کہ افسانہ میں انوکھے پن اور تخلیقی خوبیوں کا ہونا ضروری ہے۔ انوکھے پن اور تخلیقی خوبیوں سے ہماری مراد کیا ہے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ محض واقعات کے انوکھے اور عجیب و غریب ہونے سے افسانوی دلچسپی نہیں پیدا ہو سکتی۔ افسانوی اہمیت اور دلچسپی پیدا کرنے کیلئے اس میں تخیل کی تخلیقی صلاحیت کی مدد سے رنگ کاری کرنا پڑتا ہے اور یہ بات اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ افسانہ نگار واقعات کو اپنی تفسیر اور ترجمانی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ واقعات کی تفسیر تخیل کی سب سے بڑی آزمائش ہے! دیکھنے والا ایک واقعہ کو دیکھتا یا سنتا ہے اور اس کی ترجمانی اپنے الفاظ میں دوسروں سے کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ داخلی یا نفسیاتی عنصر کو مناظر واقعات یا حادثات کے دھندلکے میں اجاگر کرے۔ فنی لحاظ سے اس کے بھی دو مختلف طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ کردار کے خارجی افعال کے ذریعے اس کی ذہنی کیفیت کا اظہار کیا جائے یا افسانہ نگار اس کا ذہنی تجزیہ کر کے اپنی زبان یا خود کردار کی زبان میں اس کو پیش کر دے۔

اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ فنی لحاظ سے کون سا افسانہ سب سے عمدہ ہوتا ہے؟ کامیاب افسانہ وہ ہوتا ہے جو مختصر ہونے کے باوجود اپنے ماحول پر پوری پوری روشنی ڈال سکے اور جس کی سچائی ایک فرد، ایک قوم یا ایک مذہب تک محدود نہ ہو بلکہ جو فطرت انسانی کی صحیح ترجمانی کر سکے۔ فطری افسانہ نگار واقعات کی گوناگوں بوقلمونی میں ہر جگہ اپنے مقصد کو تلاش کر لیتا ہے اور فرد اور اس کے ماحول کی کش مکش اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ انسان کے بنیادی جذبات اور محرکات کا عمل اور ردِ عمل محسوس ہونے لگے۔ وہ دوسروں سے اپنے مشاہدات میں صرف اس لئے مختلف ہوتا ہے کہ وہ روزانہ کی زندگی کی طرف ایک خاص طرزِ عمل اختیار کر لیتا ہے۔ وہ ہمیشہ عجیب و غریب واقعات کا مشاہدہ کرنے کے لئے چوکنا رہتا ہے اور ان واقعات کی اہمیت پر سوچ بچار کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ واقعات اس کی شخصیت میں گھل مل کر اس کا ایک جزو بنکر رہ جاتے ہیں۔ وہ ان واقعات کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور ان کو اپنے اندر سمو لیتا ہے اور جب یہ واقعات افسانہ کے سانچے میں ڈھل کر ہمارے سامنے آتے ہیں تو ہم ان سے نہ صرف متاثر ہوتے ہیں بلکہ ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ تمام واقعات خود افسانہ نگار پر گذر چکے ہیں۔ افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ افسانہ میں واقعات کو اس سلیقے سے بیان کرے کہ افسانہ حقیقت معلوم ہونے لگے۔ اسی کو آرٹ کا التباس (ILLUSION) کہتے ہیں اور یہی افسانہ نگار کی سب سے بڑی خوبی ہے۔



مجید امجد

دُنیا

بوڑھا پنواڑی ــــ اس کے بالوں میں مانگ ہے نیاری
آنکھوں میں جیون کی بجھتی اگنی کی چنگاری
نام کی اک ہٹی کے اندر بوسیدہ الماری
آگے پیتل کے تختے پر اس کی دُنیا ساری
پان، کتھا، سگرٹ، تمباکو، چونا، لونگ، سپاری

عمر اس بوڑھے پنواڑی کی پان لگاتے گذری
چونا گھولتے، چھالیا کاٹتے، کتھ پگھلاتے گذری
سگرٹ کی خالی ڈبیوں کے محل سجاتے گذری
کتنے شرابی مشتریوں سے نین ملاتے گذری
چند کسیلے پتوں کی گتھی سلجھاتے گذری

کون اس گتھی کو سلجھائے، دُنیا ایک پہیلی
دو دن ایک پھٹی چادر میں دکھ کی آندھی جھیلی
دو کڑوی سانسیں لیں، دو چلموں کی راکھ انڈیلی
اور پھر اس کے بعد نہ پوچھو کھیل جو ہونی کھیلی
پنواڑی کی ارتھی اُٹھی ــــ بابا، اللہ بیلی!

صبح بھجن کی تان منوہر جھنن جھنن لہرائے
ایک چتا کی راکھ ہوا کے جھونکوں میں کھو جائے
شام کو، اس کا کمسن بالا بیٹھا پان لگائے
جھن جھن، ٹھن ٹھن، چونے والی کٹوری بجتی جائے
ایک پتنگا دیپک پر جل جائے، دوسرا آئے

شاد عارفی

غزل

حُسن کو ودیعت ہے آرزو منانے کی
ورنہ مجھ میں کیا طاقت اُن سے روٹھ جانے کی
کیا ہوئی وُہ خود رائی سامنے نہ آنے کی
جانیے، نہیں فرصت مجکو سر اُٹھانے کی
گلستاں کی رنگینی، مے شراب خانے کی
کیں ہوں اور تفصیلیں اس کے مسکرانے کی
ہر نقاب کے اندر مدعا نہیں ملتا
ہر گھٹا نہیں ہوتی بجلیاں گرانے کی
صبح سے نہ اُٹھنے پر بدگماں کھٹکتے ہیں
وقت ہے بگڑنے کا بات ہے بنانے کی
دل میں درد کیا مانے، دل کا حال کیا جانے
کان ہیں زمانے کے آنکھ ہے زمانے کی
کیا سوالِ رُسوائی، کیا مآلِ رُسوائی
حُسن ٹھان لیتا ہے جب نقاب اُٹھانے کی
جستجو نہ کر پایا، آرزو کو ٹھہرایا
ابتدا، فسانے کی، انتہا فسانے کی
بے شمار نظارے، بے شمار مہ پارے
ہر قدم پہ سو راہیں اُس کے آستانے کی
عقل نارسا اُن کو سوچنے نہیں دیتی
وُہ جو رائے رکھتے ہیں اُس کو بھول جانے کی
شر کو بھی میں اے شاد شاعری سمجھتا ہوں
لفظ ہوں سلیقے کے بات ہو ٹھکانے کی

زقند

جگدیش چندر

وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی جا رہی تھی کہ عقب سے ایک نوجوان سائیکل پہ آیا اور گردن بڑھا کر آہستہ سے بولا: "لائیے سرکار کتابیں ہم لے چلیں۔" اُس کا دل دھک دھک کرنے لگا، سانس تیز ہو گیا، چہرے کی سرخی کانوں تک پہنچ گئی۔ رفتار اور تیز ہو گئی۔ چلتے وقت سر تو ہر ہندوستانی لڑکی کا جھکا ہوا ہوتا ہے مگر اُس کا سر اور جھک گیا۔ سڑک کے کنارے تو چل ہی رہی تھی۔ آخر کر فٹ پاتھ پہ ہو گئی اور ہمت جٹا کر ہمت کر کے کہنے لگی "مشٹنڈا کہیں کا"، مگر وہ مشٹنڈا اب تک نہ جانے شہر کے کس حصے میں پہنچ کر سوشل سروس میں مصروف تھا!

اسکول پہنچتے ہی ہیڈ مسٹریس کے کمرے کے باہر ایک آئینہ میں اُس نے اپنا چہرہ دیکھا سنجیدگی سے۔ مسکرا کر۔ سیدھی نظروں سے۔ ترچھی نگاہوں سے۔ اِس زاویے سے۔ اُس زاویے سے۔ اُس نے داہنے رخسار کے تل کو بہت غور سے دیکھا کہ کیسا پھبتا ہے۔ آنکھوں کی پتلیوں کو گھمایا اور مسکراتی بھوؤں کے بال انگلیوں سے سنوارے۔ ہونٹوں پر زبان پھیری۔ نم آلود لبوں کا مشاہدہ کیا۔ پھر مسکرائی۔ اپنے ابھرے ہوئے رخساروں کو دیکھا اور ہونٹوں کے پیچھے دو ننھی سفید لکیروں کو۔ دھیرے دھیرے سانس اندر کھینچا اور جب مزید سانس لینا دشوار ہو گیا تو چنری سینے سے سرکا کر اُس کا اُبھار دیکھا جو اُٹھتے اُٹھتے اُس کی ٹھوڑی تک پہنچ گیا تھا۔ قمیص کی آدھی آستین کو اُٹھا کر بازو سہلانے لگی۔ آج اُسے پہلی بار اِس بات کا احساس ہوا کہ وہ بدصورت نہیں ہے۔ اس میں بھی کوئی کشش اور جاذبیت ہے۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ نگوڑی سرلا اسے سچ سچ کالی کہہ کر جھک ہی مارتی ہے۔ کبھی کہتی ہے: "پچھلے کرموں کا پھل ہے۔ پچھلے جنم میں ماش کی دال دان کرتی ہو گی لیا دیا سامنے آیا، رنگ بھی میلا ہی ملا"۔ اور پھر کمبخت گنگناتی ہے...... "اونچی اٹریا کاگا بولے"...... گویا کہ میں کالی ہوں کیا اسی رنگ کو کالا کہتے ہیں...... اُس نے گال پہ انگلی رکھ کر کہا۔ "کوا کالا ہوتا ہے کیا میرا رنگ کوے سے ملتا ہے۔ جھوٹ بکتی ہے۔ یہ رنگ تو سانولا ہے۔ سانولے لڑکا لاکھوں ٹکا ہی کہتے ہیں۔ اور کنہیا بھی تو سانولے تھے...... سانورا سلونا من موہے لئے۔ وہ کیا بدصورت تھے، بدصورت ہوتے تو من کیسے موہتے۔ یہ تو سب نقوش پہ ہوتا ہے نقوش بھلے ہیں تو صورت بھلی ہے اور میرے نقوش کون سے بھدے ہیں، بڑی بڑی آنکھیں...... اُس نے آنکھیں پھاڑ کر آئینہ دیکھا۔ کشادہ ماتھا...... اُس نے ماتھے پہ لٹکی ہوئی ایک لٹ کو ہٹایا، پتلی لمبی سی ناک...... اُس نے ناک کی ہڈی پر انگلی رکھی اور پھر انگوٹھے اور ساتھ والی انگلی سے نتھنوں کو دبایا، چھوٹا سا منہ...... اُس نے منہ کو پورا کھولا۔ اور ناریل کے تیل کے مسلسل استعمال سے بنے ہوئے جیسے سیاہ بال...... وہ چونڈے کو سامنے لا کر اُس سے کھیلنے لگی۔ اور پھر ہندوستان میں گورا ہے کون انگریز ہر ہندوستانی کو "کالا آدمی" کہتا ہے خواہ وہ کتنا ہی گورا چٹا کیوں نہ ہو، اور پھر سرلا خود کونسی پری ہے، نہ رنگ نہ روپ نہ ناک نہ نقشہ، بھونڈی سی شکل اور اُس پر چیچک کے داغ، ٹھگنا سا قد، موٹے موٹے حبشنوں کے سے ہونٹ اور پھر ایک ٹانگ بڑی اور ایک چھوٹی...... جب بھی چلتی ہے تو بائیں ٹانگ کو یوں گھماتی ہے گویا ہوا سے لڑ رہی ہو۔ اور دوسرا کوئی اُس چڑیل کی نظر میں جچتا ہی نہیں، کمبخت کہیں

کی۔

دوسرے دن وہ نہانے کے لئے غسلخانہ میں داخل ہوئی تو اُسے ایک نامعلوم سی خوشی محسوس ہوئی اُس نے چاہا کہ کپڑے اتار کر آزاد ہو جائے صحرا میں چلنے والی ہواؤں کی طرح آزاد، جب وہ کپڑے اتار چکی تو اُس نے چاہا کہ بازو پھیلا کر اور دروازہ کھول کر کھلی فضا میں اڑ جائے اور نیلے نیلے آسمانوں میں گرمیوں کی شام کو اڑنے والی ابابیلوں کی طرح چکر کاٹے بےفکری سے آزادی سے، لیکن جونہی اس کی نظر ٹھنڈے پانی سے بھرے ہوئے ٹب پر پڑی تو آسمانوں میں اڑتے ہوئے خیال برف کے گالوں کی طرح دھیرے دھیرے زمین پر آ رہے، اُس کے جسم میں جھرجھری سی پیدا ہوئی، رونگٹے کھڑے ہوگئے اور اس نے جسم پر ہاتھ مل کر اُسے گرمانا شروع کیا ہاتھ ملتے ہوئے اُسے پھر ایک لطیف سی مسرت کا احساس ہوا۔ اُس نے اپنی پیٹھ پر ہاتھ مل کر اُسے بھی گرمانے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہی، وہ جتنی زیادہ کوشش کرتی اتنی ہی ناکام رہتی اور اتنی ہی اُس کی اُلجھن بڑھتی جاتی حتیٰ کہ اُسے اپنی پیٹھ پر کھجلی سی ہونے لگی۔ کچھ ایسا احساس جیسے اُس کی پیٹھ پر بیسیوں چیونٹیاں ایک ساتھ رینگ رہی ہوں، اُس نے چاہا کہ کوئی ہولے ہولے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرے۔ یہ چیونٹیاں چلنا بند کر دیں، اور وہ چپ چاپ آنکھیں موندے بیٹھی رہے، اُس نے اپنے جسم کے ہر حصے کو بغور دیکھنا شروع کیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا گویا اُس نے جسم کے ہر عضو میں ایک سونے کی کان دریافت کر لی ہو اُس نے اپنے بازو اوپر اٹھائے، بغلوں میں باریک باریک ریشمی بالوں کے گچھوں کو دیکھا، اُن پر پیار سے ہاتھ پھیرا، انگلیوں سے مروڑا اور چاہا کہ گردن بڑھا کر چوم لے۔ لیکن کوشش کے باوجود ہونٹ ننگے بازو سے مس ہو کر رہ جاتے تھے، اُس نے انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر ایڑیاں اٹھا کر انگڑائی لی، لیکن نجانے ایکا ایکی اُسکے دماغ میں کیا آیا، آپ سی آپ شرما گئی، انگڑائی فرطِ شرم سے ٹوٹ گئی، جوان لڑکی۔۔۔ ننگی۔۔۔ انگڑائی اور دیوتاؤں کی یہ مقدس سرزمین، اُس نے دروازہ کی چٹخنی کی طرف دیکھا اور نہانے لگی، صابن مل مل کر جسم کو صاف کیا، اور جب نہا دھو، بال سنوار کریم بندی لگا، اجلے کپڑے پہن مسکراتی ہوئی باہر نکلی تو یوں معلوم ہوتا تھا گویا پرانے برتنوں پر قلعی ہو گئی ہو،

اب وہ اپنے جسم پر بھی کچھ زیادہ توجہ دینے لگی۔ روزانہ نہاتی، کاجل لگاتی، اہتمام سے بال سنوارتی، میلے کپڑے ہی دھلائی کے لئے اتار کر رکھ دیتی، ہر بار دھوبی سے نوک جھونک کرتی وہ بے چارہ مسکراتا آتا منہ لٹکائے جاتا۔

"یہ کپڑے دھلے ہوئے ہیں لیا۔ جیسے لے گیا تھا ویسے ہی اٹھا لایا۔ استری یوں ہی کرتے ہیں کیا۔ اس سے بہتر تو گھر پر ہی دُھل سکتے ہیں۔

"یہ کلف لگی ہوئی ہے چھی چھی، ذرا ہاتھ لگا کر تو دیکھو ان کپڑوں کو۔۔۔۔۔۔ اور پھر نیل بھی تو نہیں لگایا۔ کیسا کام کرتا ہے تو؟"

"بی بی آپ کی نظر میں تو کچھ جچتا ہی نہیں، ہر بار یونہی ڈانٹ دیتی ہیں، دھوپ کھل کر نہ نکلے گی تو کپڑے بھلا کیسے سفید ہوں گے۔

"کلف زیادہ لگاتا ہوں تو آپ کہتی ہیں ہٹے کو لٹھ بنا دیا کم لگاتا ہوں تو ناراض ہوتی ہیں، بی بی جی یہ روز روز کا جھگڑا ہم سے نہیں ہوتا۔ ہم کام کرنا چھوڑ دیں گے۔"

"واہ دھمکی دیتا ہے، کام کرنا چھوڑ دیں گے۔ گھر کے بڑے سیانے ہو، کھرے دام اور کھوٹا کام، ہم خود ہی دھلانے چھوڑ دیں گے، سمجھے!"

اس کے گھستے ہوئے سلیپروں کی قسمت نے بھی انگڑائی لی، وہ سلیپر جو ہمیشہ مٹی سے سنے رہتے تھے اور جن کا چمڑہ کسی بوڑھے مزدور کی کھال کی طرح خشک اور کھردرا تھا، اب وہ روزانہ انہیں برش سے صاف کرتی، پالش لگاتی، کپڑا مل

مل کر چمکاتی۔ اور جب وہ مسکرانے لگتے، تو ان میں اپنا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرتی، جب چہرہ چمکے گا تو ان میں چہرہ دکھائی دیگا، چہرہ اور چہرہ!

رنگریز کو چنریا دیتے ہوئے وہ کہتی۔

"دیکھو رنگ شوخ ہو، کلپ اور ابرک خوب لگانا۔"

"اچھا بی بی جی۔"

"ہاں سنو تو ست رنگی پینگوں والی کا کیا لوگے؟"

"جی آٹھ آنے۔"

"آ۔۔۔ ٹھ۔۔۔ آ۔۔۔ نے" اور پھر کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہتی "رام رام۔۔۔ کیا لوٹ مچ رہی ہے۔"

"بی بی آجکل ہر چیز مہنگی ہو رہی ہے۔ کوئلہ اور لکڑی کا بھاؤ چڑھ گیا ہے۔ رنگ جرمنی سے آنے بند ہو گئے ہیں اور میدہ تو۔۔۔۔۔۔"

"یہ سب میں خوب جانتی ہوں، مہنگائی تو سب دنیا کے لئے ہے، اچھا آٹھ آنے ہی دونگی، لیکن یاد رکھو، اچھی نہ رنگی تو کانی کوڑی نہ ملے گی۔ اور چنری کے دام بھی دبے پڑیں گے۔ ہاں سنا تم نے رنگ شوخ ہو، کلپ اور ابرک خوب لگانا۔"

دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلی نینوں میں دیئے جگمگائے اور رگ و پے میں بجلیاں سرائیت کر گئیں پرائے سے بات کرتی تو کسی نامعلوم احساس کے زیر اثر اسکی نگاہیں جھک جاتیں، وہ شرماتی اور کسمسا کر سمٹ سمٹا جاتی ہولے ہولے رک رک کر بھولے بھالے لہجے میں زبان میں مٹھاس بھر کر بات کرتی تو اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو جاتا، اور وہ بے ساختہ چنری کے پلو کو انگلی کے گرد لپیٹنے لگتی اور دائیں پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کو کریدتی، اپنوں میں بیٹھتی تو کھل کھیلتی، سہیلیوں میں یوں دکھائی دیتی گویا رانیوں میں پٹ رانی ہو۔ منہ سے پھول جھڑتے بات بات پر تبسم لٹاتی، ہر کسی پر پھبتی کستی، کوئی سے چھیڑتی، شوخی سے مچلتی، چنری لاکھ سنبھالتی اس کے سر سے سرک جاتی، بیٹھے بیٹھے تو وہ خود سرکا دیتی اور قمیص تو اس کی چست ہوتی ہی تھی رہ رہ کر انگڑائیاں اور جمائیاں لیتی۔۔۔۔ جمائیاں آتی ہیں لی نہیں جاتیں پر وہ لیتی، اگر لچکاتی گویا کوئی پھولوں والی ٹہنی نسیم سحری کے زندگی بخش لمس سے عالم بیخودی میں دھیرے دھیرے جھوم رہی ہو، آنکھوں اور اشاروں سے باتیں سمجھاتی، اس کی آنکھوں میں شوخیاں ایسے آتیں جیسے دودھ پیتے بچے کو نیند آتی ہے۔۔۔۔۔ چپکے چپکے آنا فانا گویا وہ شوخیاں کہیں پس پردہ باہر نکلنے کو بیتاب تھیں۔ نینوں کی ان شوخیوں میں حیا کی اور حیا لیوں گلے مل رہی تھیں جیسے خود اس کی طفلی جوانی سے ہمکنار ہو رہی تھی۔ وہ ایک لمحہ بھی نچلی نہ بیٹھ سکتی تھی۔ اس کی رگ رگ پھڑکتی تھی وہ ایک تتلی تھی جو ہر پھول پر بیٹھتی اور دم بھر میں اڑ جاتی۔۔۔۔ ابھی وہ یہاں چل رہی تھی یہاں پھر رہی تھی یہ آئی وہ ــــ گئی، اب وہ دن بھر گنگناتی رہتی۔۔۔۔ نیلے تیرے نیناں۔۔۔ اسکی آواز میں راگ کم تھا روگ زیادہ، آواز دل سے نکلے تو اس میں سوز کیوں نہ ہو اور ساز تو قدرت کی دین ہے نا!

ایک سہانی شام کو جب ساون کی گھٹائیں انگڑائیاں لیتی ہوئی اٹھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اودے آسمان پر چھا کر رم جھم رم جھم مینہ برسانے لگیں، جب جوانی سے بغلگیر ہوتی ہوئی نوخیز دوشیزاؤں نے چھتوں کی کڑیوں میں جھولے ڈالے اور لہرا لہرا کر مدھر سروں میں جھولنا جھلاؤ ری گانے لگیں۔ اور دکھی سہاگنوں نے آس بھرے نینوں سے پردیس گئے پیا کی یاد میں ٹپ ٹپ آنسو برسائے تو وہ مسکراتی دبے پاؤں اپنے بھائی کے کمرے میں داخل ہوئی جو اس کی بھابی سے کھسر پھسر کر رہا تھا۔ بھابی اسے دیکھتے ہی الگ ہو کر بیٹھ گئی اور حیا اس کی آنکھوں سے سر نکال کر جھلکنے لگی۔ وہ بھائی کے پہلو میں بیٹھ گئی اور کہنے لگی "بھیا یہ سوال تو سمجھاؤ"

اس لفظ کے معنی تو بتادو۔ بھیا اُستانی کہتی ہے۔ اگر تو اسی طرح محنت کریگی تو ضرور فرسٹ ڈویژن لے لی۔ بھیا دیکھو تو میرے ہونٹ خشک ہو رہے ہیں اب پھٹ جائیں گے۔ اور ان سے خون بہنے لگے گا۔ بھیا کریم تو لا دونا۔ اور یہ میرے سلیپر کیسے دلنت نکال رہے ہیں تو گھس گھس کر کاغذ کی مانند پتلا ہوگیا ہے لیکن اب کے میں سینڈل لوں گی اونچی ایڑی والی جیسی تم نے بھابی کو لے کر دی ہے۔ اور بھیا تم نے تو کہا تھا چوڑیاں بھی چڑھا دو گے کب چڑھا دو گے۔ بتاؤ نو؟"

"کہا جو لے دوں گا سب کچھ، اب باہر جاکر پڑھو میرے کان مت کھاؤ؟"

"لیکن کب لے دو گے؟"

"پہلی کو؟"

"پہلی کو... تنخواہ ملنے پر..... اچھا؟"

وہ باہر نکلی تو پھر وہی کھُسر پھُسر شروع ہوئی بھائی اُسکے جانے پر خوش تھا اور وہ بھائی کے وعدہ پر۔

شام کو جب کوّے کائیں کائیں کرتے، بیٹیں کرتے اپنی بسیرے کے لئے اپنے اپنے گھونسلوں کو واپس جاتے اور جب دُور پرے دن بھر کا تھکا ماندہ سورج مکانوں کی منڈیروں کے پیچھے افق میں سر چھپاتا، جب مغرب میں اودے نیلے پیلے اور گلابی رنگ بن بن کر بگڑتے اور بگڑ بگڑ کر بنتے تو وہ ——— مکان کی اوپر والی چھت پر اپنے چھوٹے بھائی کو کولہے پر اٹھائے متجسّس نگاہوں سے مغرب میں نہ جانے کیا ڈھونڈتی ——— بھائی کو قریب ہی کھڑا کرکے وہ دونو ہاتھ کمر پر رکھتی اور داہنی ایڑی پر پھرکی کی طرح گھوم جاتی۔ اُس کا چوٹی کے ساتھ گہرے سرخ رنگ کا ربن بندھا ہوتا تھا ہوا میں لہراتا۔ قمیص کے دامن ذرا سے اوپر کو اٹھتے۔ اور ریشمی شلوار اس کی ٹانگوں سے چمٹ جاتی۔ پسینے کے چھوٹے چھوٹے گول گول قطرے اس کے ماتھے پر نمودار ہوتے اور سورج کی رنگینی ہوئی ہیجان گلابی کرنوں سے اس کا چہرہ شہابی ہو جاتا، وہ لپک کر بھائی کو گود میں اٹھا لیتی، اُسے کھِلاتی چِڑاتی اور چھیڑتی، اُسے بازوؤں سے پکڑ کر اونچا ہوا میں اچھالتی اور پھر بازو پھیلا کر سینے سے بھینچ لیتی، اس کے پتلے پتلے پھڑکتے ہوئے ہونٹ اس کے گال سے بے اختیار مل جاتے، اور وہ انہیں اتنے زور سے دباتی کہ اس بیچارے کی چیخ نکل جاتی تب وہ کہتی "منّے برفی لو گے، لڈّو لو گے، وہ دیکھو منّے وہ دیکھو.........."

ایک دن جب وہ اسکول سے واپس آئی، اُس کی امّاں نے اُسے اس کی نئی سلی ہوئی قمیص دکھائی جو اس نے خود ہی کپڑا خرید کر اور اُس کی پرانی قمیص کا ناپ دے کر سلوائی تھی اماں نے کہا "یہ ہے کپڑا جو میں نے تمہارے لئے خریدا تھا، دیکھو تو کتنا عمدہ ہے۔ سلائی کتنی اچھی اور کاٹ کتنی نفیس ہے۔ پندرہ آنہ گز ہے اور گیارہ آنہ سلائی؟"

اس نے قمیص ہاتھ میں لے کر پرکھی، انگلیوں سے کپڑے کی زمین اور موٹائی محسوس کی۔ دھاریوں پر ایک نظر دوڑائی قمیص کی سلائی اور کاٹ بغور دیکھی، اس کا چہرہ تین چار انچ لمبا ہوگیا، نیچے کا ہونٹ لٹکنے لگا، بسور کر کہنے لگی۔

"اماں ایسا کپڑا ان دنوں کون پہنتا ہے، اتنی چوڑی دھاریاں اور ہے بھی کھردرا سا، یہ تو دیہاتنیں بھی نہیں پہنتیں اور سلا ہوا بھی کیا ہے، گھٹیا کپڑا اور گھٹیا سلائی، دیکھو تو آستین اتنی کھلی ہیں گویا شلوار کے پائنچے ہوں، آجکل تو تنگ آستینوں کا رواج ہے، اور یہ ٹینس گلا...... ہے الیشور یہ تو لڑکے پہنتے ہیں، اور کمر اور چھاتیوں کے نیچے درزی نے پلیٹ بھی تو نہیں ڈالے، یہ تو پٹھانوں والا چغہ سی دیا ہے اُس نے، اماں اسے تم پہن لو مجھے اور سلوا دینا؟"

اس کی اماں یہ دیکھ کر کہ اس کے پسند کئے ہوئے کپڑے اور اس کی سلوائی ہوئی قمیص میں اس کی ہاتھوں جنی بچہ کری نے گن گن کر بیسیوں نقائص نکال بیٹھے ہیں جل بھن گئی اس نے

نم آلودہ نظروں سے اُسے دیکھا، اُس کے ماتھے پر شکنیں پڑیں اور ناک سکڑ کر اوپر چڑھ گئی، تڑپ کر کہنے لگی " یہ بہر اشتوں والی شکل اور یہ فیشن، کتنی ناک چڑھی ہوئی ہے اس فیشن کی پڑی مہاریاں، تنگ گلا، شلوار کے پائنچے... فوا بزادی، چڑیلوں والی شکل اور بہبوں والے فیشن ذرا صورت تو دیکھ اپنی کالی بھاٹ کہیں کی......"

ایک چھری اس کے سینہ کو چیرتی ہوئی دل میں اتر گئی، دماغ پر ہتھوڑے سے پڑنے لگے۔ اُس نے چاہا کہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر چلائے: " بس اماں بس، ایشور کے لئے اور کچھ نہ کہو" کر ایک گیند سی اس کے حلق میں اٹک گئی، دو موٹے موٹے آنسو اس کی پلکوں پر آ کر پھیل گئے اور اسے ماں کا بھیانک چہرہ دھندلا سا دکھائی دیا کچھ دیر۔ آنسو پلکوں پر دم بھر کے لئے کانپے اور کاجل کو اپنے ساتھ بہاتے، اس کے رخساروں پر ایک سرمئی لکیر بناتے، اس کے سینے پر پڑی ہوئی ست رنگی چنری میں جذب ہو گئے۔

نکہت نسیم بدایونی

بے رنگی

یہ سکوں وجہِ تسلیِ دلِ زار نہیں
فرشِ سنجاب میں بیداریِ افکار نہیں
اور یہ سامانِ طرب مجھکو سزاوار نہیں
روح میری غمِ فردا سے خبردار نہیں
زندگی اُلجھی ہوئی راہوں سے گذرے تو کہیں

جھلملائے کوئی آنسو سرِ مژگاں آ کر
پھونک دے روحِ خزاں جانِ بہاراں آ کر
چھیڑ دے ہنس کے کوئی سازِ رگِ جاں آ کر
بخش دے تو غمِ جشنِ چراغاں آ کر
زندگی اُلجھی ہوئی راہوں سے گذرے تو کہیں

سرِ مہری سے یہ آئینۂ دل ٹوٹ بھی جائے
ساغرِ عیش مرے ہاتھ سے اب چھوٹ بھی جائے
میری آنکھوں سے کہیں چشمۂ غم پھوٹ بھی جائے
اور یہ بجتا ہوا سازِ طرب ٹوٹ بھی جائے
زندگی اُلجھی ہوئی راہوں سے گذرے تو کہیں

صبح کے ماتھے پہ ہلکی سی پُراسرار شکن
اوس کے قطرہ پہ سورج کی وہ بیتاب کرن
یہ مہکتی ہوئی نوخیز کلی اور یہ چمن ،
ان میں ہر اک سے بچاتے ہوئے اپنا دامن
زندگی اُلجھی ہوئی راہوں سے گذرے تو کہیں

آسمانوں سے پرے چاند ستاروں سے پرے
اور اس نیلے سمندر کے کناروں سے پرے
دامنِ کوہ میں سوئے ہوئے دھاروں سے پرے
ان سکوں بخش جنوں خیز نظاروں سے پرے
زندگی اُلجھی ہوئی راہوں سے گذرے تو کہیں

وہ جہاں چاند کے شفاف کنارے چھو لوں
آسمانوں کے یہ رنگین ستارے چھو لوں
سرد ہاتھوں سے یہ جلتے ہوئے تارے چھو لوں
کانپتے ہونٹوں سے ساغر کے کنارے چھو لوں
زندگی اُلجھی ہوئی راہوں سے گذرے تو کہیں

طنز آمیز تبسم سے اُبلتے ہوں شرار
اور کھنکتے ہوئے نغموں میں ہو اک غم کی پکار
غمزدہ چہرہ پہ چھانے لگے جب رنگِ خمار
توڑ دوں ہنس کے میں اس ساز کے بجتے ہوئے تار
زندگی اُلجھی ہوئی راہوں سے گذرے تو کہیں

سری نیواس لاہوتی

اشتراکی روس کے مسلمان

سوویٹ روس کے مسلمان باشندے وطن کی حفاظت کے لئے اپنے دوسرے ہموطنوں کے دوش بدوش ——— کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔

آذر بائیجان۔ ترکمانستان۔ ازبکستان۔ کزاقستان کرغزیہ بشکیر۔ داغستان کے بسنے والے مسلمانوں نے اس بات کا عہد کر لیا ہے کہ وہ اپنے ملک کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینگے اس کی مثال سوویٹ تاشقند کے ایک اسّی برس کے بوڑھے مسلمان الیشاں باباخان کے اس بیان سے مل سکتی ہے جو انہوں نے "سوویٹ وار نیوز" کے نمائندے کو ملاقات کے دوران میں دیا تھا۔ انہوں نے فرمایا "اپنے ملک کی محبت اور مدافعت ایک سچے وفادار کے لئے فرض منصبی ہے۔ جیسا کہ آنحضرتؐ اور دوسرے بڑے بڑے پیغمبروں نے نصیحت فرمائی ہے"۔ (سوویٹ یونین نے ان کی اس بہادری کے صلہ میں نہیں ہر طرح کے اعزازات سے نوازا ہے۔ چنانچہ آذربائیجان کے "اسلام محمود" اور کمال کولومو۔ ترکمانستان کے "زبان داری اور تاتار کے "قانکولین" نامی باشندوں کو "سوویٹ روس کے ہیرو" کا خطاب ملا ہے۔ سوویٹ روس کی تاریخ میں ترک اور تاتار قوم اپنی بہادری کے لئے ہمیشہ سے مشہور رہی ہے۔ زار کی حکومت میں ان کی ہر طرح سے توہین کی گئی اور ان کے اعزازات چھین لئے گئے ...... لیکن انقلاب کے بعد سوویٹ روس کے دستور اساسی کے دفعہ ۱۲۳ کے تحت اقلیتوں کے تمام حقوق کی حفاظت کی ضمانت کر لی گئی اور اب سوویٹ سوشلسٹ متحدہ روس کے مسلمان باشندوں کو بلا لحاظ قومیت و نسل معاشی معاشرتی اور سیاسی۔ غرض کہ ——— زندگی کے ہر شعبہ میں مساوی حقوق حاصل ہیں۔ ان کی مادری زبان کو روسی زبان کے مساوی درجہ دیا گیا ہے۔ ہم ناظرین کی دلچسپی کی خاطر لینن اور اسٹالن کے اس اعلان کو یہاں درج کرتے ہیں جو انقلاب روس کے بعد انہوں نے شائع کیا تھا۔

"روس کے مسلمانو! تمہارے عقیدے تمہارے رسم و رواج تمہارے قومی ادارے اور تمہاری تہذیب اب سے آزاد ہیں اور ان میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہو گی۔ تمہیں انہیں برتنے کا پورا حق حاصل ہے تمہیں معلوم ہو کہ تمہارے حقوق اور روس میں رہنے والی تمام قوموں کے حقوق کو انقلاب کی اور مزدور سپاہیوں۔ اور کسانوں کے سوویتوں کی پرزور محافظت حاصل ہے۔ انقلاب اور اسکی حکومت کا ساتھ دو اور اسکی مدد کرو"۔

سوویٹ دستور اساسی کی دفعہ ۱۲۴ میں صاف طور سے اس بات کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ سوویٹ یونین میں بسنے والی ہر قوم کو آزادی حاصل ہو گی تاکہ وہ اپنے مذہبی اعتقادات کو برقرار رکھ سکے۔ شیعہ و سنی مسلمانوں کو اس بات کی آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنی مذہبی عبادت گاہوں کی دیکھ بھال کریں۔ سوویٹ یونین میں سب سے بڑی مسجد صوبہ "بشکریا" کے مشہور شہر "اوفا" میں ہے روسی مسلمانوں کے بہت بڑے عالم مولوی عبدالکریم بھی یہیں رہتے ہیں سوویٹ یونین میں کل ۱۳۱۲ مسجدیں۔ ۸۰۵۲ ملا ۲۸۲ شیخ ۱۸۰ پیشان ہیں جو ان مذہبی عبادت گاہوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں

سنہ ۱۹۴۱ء کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ازبکستان۔ ترکمانستان

تاجکستان۔ اور کرغزیہ کی اسلامی جمہوریتوں میں ۴۰ تھیٹر ایسے ہیں جہاں مقامی زبانوں میں کھیل۔ تماشے اور ڈرامے ہوتے ہیں ان مسلم جمہوریتوں میں ۷۰۰۴ بڑے کتب خانے ۴۴۴ کلب اور ۵۳۰ زچگی خانے نیز ۳۵ عجائب گھر ہیں۔ مسلم قوم کی وہ زبانیں جو زار شاہی کی بدولت مٹتی جا رہی تھیں اب پھر نئے سرے سے زندہ ہو گئی ہیں۔ ان زبانوں میں یورپ کی مختلف زبانوں کے ترجمے شائع ہو رہے ہیں۔ ابھی حال ہی میں شکسپیر کے مشہور ڈرامہ "اوتھیلو" کا کزاقی زبان میں ترجمہ ہوا اور اسے کھیلا بھی گیا۔ لوگوں نے اسے غیر معمولی دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔ ازبک۔ تاشقند استالن آباد۔ سمرقند میں بھی مغربی ممالک کے کئی ادیبوں کے ڈراموں کے ترجمے کئے گئے اور اسٹیج پر کھیلے گئے۔

آذربائجان۔ ازبکستان اور تاجکستان۔ تاسی ذیابیسے توف کاشمف دغیرہ میں کثرت سے مسلمان عوامی آرٹسٹ ہیں روسی جمہوریت میں عوام آرٹسٹ ایک بہت بڑا درجہ اور ایسا اعزاز ہے جو حکومت کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے۔ اور اس کو ایسے ہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو اپنے فن میں ماہر ہوں۔ مثال کے طور پر ان چند حضرات کے نام پیش کئے جاتے ہیں جو موسیقی میں بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں "استنبلاوسکی" "کاچالف" "اولگا نیپر" "والیریا" "وارسوا" "بالوچکینا" وغیرہ وغیرہ۔

قفقاز۔ وسطی ایشیا اور دریائے والگا کے کنارے بسنے والے ایسے سینکڑوں مسلمان ادیب۔ شاعر۔ اور ناول نگار ہیں جنہیں سوویٹ حکومت عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھتی ہے خصوصاً کزاقستان کے مسلمان ادیبوں نے موجودہ جنگ پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن کا کئی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ ابھی حال ہی میں کزاقستان کے ۹۶ سال کے ایک بوڑھے مسلمان شاعر "جامبل جابر" کو سوویٹ حکومت نے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے "استالن کپ" اور دو لاکھ روپیہ کا انعام دیا تھا۔ یہی وہ شاعر ہے جس نے اپنی شاعری کے ذریعہ روسی عوام کو انقلاب کے لئے بیدار کیا تھا۔ روسی زبان کے بہت بڑے ادیب "گورکی" نے خود اس بوڑھے شاعر کے پانچ مجموعوں کو مرتب کیا ہے جس کا روس کی اٹھارہ مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں بھی اس کے ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ آج یہ بوڑھا شاعر محاذ جنگ پر اپنی انقلابی شاعری سے فسطائیت کے خلاف اپنے ہم وطنوں کے لہو کو گرما رہا ہے۔ تاکہ وہ بہادری کے ساتھ جرمن حملہ آوروں کو فنا کر دیں۔ چنانچہ وہ اپنی ایک نظم میں جس کا اردو ترجمہ ہندوستان کے مشہور انقلابی شاعر مخدوم محی الدین نے کیا ہے۔ اپنے ملک والوں کو یوں مخاطب کرتا ہے۔

ہاں میرے ہم وطنوں۔
جاؤ اور اپنے سمندوں کو تو مہمیز کرو۔
سرخ فوجوں میں ملو۔
جوئے پرجوش بنو۔ برق کا سیلاب بنو اور بہو
اب دہکتے ہوئے پگھلتے ہوئے لوہے کا سمندر بنکر
غضب آلود بھنور بن جاؤ۔
اور فاشست خنازیر کو
فی النار کرو۔

(اقتباس "استالن کی آواز" پر)

اسیطرح روس کی اور دوسری جمہوریتوں میں بسنے والے مسلمان ادیبوں نے مادر وطن کی شاندار مدافعت کے لئے عوام کو بیدار کر دیا ہے۔ اور اسی بیداری نے ان میں فرض شناری کے احساس کو پیدا کیا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ آج روس کے مسلمان اپنے ہم وطنوں کے دوش بدوش جسم واحد کی طرح کھڑے اپنی آزادی کی بقاء کے لئے خون کا آخری قطرہ تک بہانے کو تیار ہیں۔

مسلم جمہوریتوں میں تعلیم اس قدر عام ہے کہ آجکل وہاں کوئی ناخواندہ نہیں ہے۔ ۱۹۲۶ء میں جہاں عوام ۴ فیصدی

تعلیمیافتہ تھے آج سو فیصدی تعلیمیافتہ نظر آتے ہیں ۱۹۳۹ء کی مردم شماری سے پتہ چلتا ہے کہ "آذربائیجان" نے ۳۲ لاکھ باشندوں میں سے تقریباً ۳۰ ہزار اور "کزاقستان" کے ۶۱ لاکھ باشندوں میں سے ۲۸ ہزار باشندے اعلیٰ تعلیمیافتہ ہیں۔ جہاں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں ان کی تہذیب کے مطابق نئی نئی درسگاہیں قائم کی جارہی ہیں۔ صرف ازبکستان کے صدر مقام تاشقند میں ۱۴ اعلیٰ تعلیمی درسگاہیں ہیں۔ آذربائیجان۔ تاتار۔ ازبک ترکمان اور دوسری زبانوں میں تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد ۱۹۳۹ء میں ۱۹۰۰۰ ۱۷۹۲ تھی۔ اس میں ان مختلف زبانوں میں تعلیم پانے والے طلباء کی تعداد کو شریک نہیں کیا گیا ہے جو سوویٹ یونین کے دوسرے حصوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ زار کے زمانے میں اقلیتوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے حق سے محروم کر دیا گیا تھا اور روسی زبان میں بھی جو طلباء تعلیم حاصل کرتے تھے وہ رئیس یا امیر زادے ہوا کرتے تھے۔ لیکن آج ایسا نہیں ہے۔ ہم مثال کے طور پر مسلم جمہوریت "کرغزیہ" کو پیش کرتے ہیں جسکی آبادی ۱۴۰۰۰۰۰ ہے لیکن اس جمہوریت میں تعلیم پانے والے طلباء کی تعداد ۱۹۴۰ء کے اعداد و شمار کے بموجب ۳۲۴۷۰۰ ہے۔ اسمیں ان طلباء کی تعداد کو شریک نہیں کیا گیا ہے جو اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ایسے طلباء کی تعداد تقریباً ۵۰۰۰ ہے پہلے یہاں ۱۹۱۴ء میں صرف ۱۰۷ اسکول تھے لیکن آج وہاں ۱۷۷۰ اسکول ۵۳ کتب خانے تقریباً ۳۴ کلب اور ۱۹ عوامی تھیٹر ہیں یہی حال دوسری مسلم جمہوریتوں کا ہے۔

سوویٹ روس کے مسلمان اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ انقلاب کے بعد سے انکی زندگی میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی ہے زارشاہی کی لعنت سے نجات حاصل کرنے کے بعد وہ ایسی زندگی بسر کر رہے ہیں جس میں انہیں ہر طرح کا راحت و آرام حاصل ہے لیکن جرمن حملہ کے بعد سے انہوں نے اس بات کو اچھی طرح سے محسوس کر لیا ہے۔ کہ اگر فسطائی حملہ آور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں تو ان کی زندگی عہد زار کی زندگی سے بھی بدتر ہو جائیگی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ انہوں نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو اس بھیانک خطرہ سے آگاہ کرتے ہوئے اپیل کی ہے کہ وہ اس جنگ آزادی میں شریک ہو کر فسطائیوں کے خلاف ایک عام محاذ قائم کریں۔ تاکہ فاشزم کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دنیا سے خاتمہ کر دیا جائے۔

اب ہم ذیل میں اس اپیل کے چند اقتباسات درج کرتے ہیں اصل اپیل عربی میں شائع ہوئی ہے۔ جس پر جمہوریہ روس کے بڑے بڑے علماء کے دستخط ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ عبدالکریم جابر ملک۔ امام ماموره۔ ازبک گیلانی اشنان کینوں۔ حیدر مالکی الگی وغیرہ۔

"تمام دنیا پر حکومت کرنے کے ارادے سے بے رحم لالچی ہٹلر بے دردی کے ساتھ یورپ کی بہت سی قوموں کو تباہ و تاراج کر کے معاشی استیصال کر رہا ہے۔ اب تک جن ممالک پر فسطائیوں کا اقتدار قائم ہوا ہے۔ وہاں نعشوں کا پہاڑ کھڑا ہے عورتوں کی عصمت دری کی جارہی ہے۔ بوڑھوں۔ بچوں اور جوانوں کا خون بہایا جارہا ہے۔

ہمیں اس بات پر کامل یقین ہے کہ اگر فسطائی درندے کامیاب ہو جائیں تو مسلمانوں کی آزادی خطرہ میں پڑجائیگی۔ اس شیطان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ بے رحمی کے ساتھ اسے مٹا دو۔ جہاں موقع ملے اس پر حملہ کرو وہ تمہیں برباد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تم اسے برباد کرنے کا مصمم ارادہ کر لو"

آگے چلکر وہ لکھتے ہیں۔

"ہم سوویٹ کے مسلمان دنیا کے مسلمانوں پر اس بات کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم اپنی پاک اور مقدس مادر وطن کی خاطر انسانیت کے دشمن فسطائیوں کے خلاف اس جنگ آزادی میں شاندار حصہ لے رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے اور آخر کار ہم کامیاب ہونگے"

نقد و نظر

سوشلزم ہی کیوں؟ ——— راہل سانکرتیاین

قیمت ——— ایک روپیہ ٭ پتہ ——— کتاب محل الہ آباد

ہندی ادب میں جناب راہل سانکرتیاین کو ایک مارکسی ادیب کا درجہ حاصل ہے۔ یہ کتاب آپ کی "سامیہ واد ہی کیوں" کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کا آغاز انسان کی تخلیق سے ہوتا ہے اسی باب کے آخر میں انسانی تاریخ کے کچھ اہم واقعات اور تاریخیں درج ہیں لیکن تعجب ہے کہ ۲۰۰ ق م اور ۱۳۰۰ء کی درمیانی مدت میں ہندی کے اس مارکسی ادیب کو کوئی اہم واقعہ دکھائی نہیں دیتا معلوم ہوتا ہے کہ آپ عربوں کی تاریخ سے یکسر ناواقف ہیں سرمایہ داری کی پیدائش اور سوشلزم کی ضرورت کو مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ (ب)

جنگ کی کہانی ——— افضل عابدی

قیمت ——— دس آنے ٭ پتہ :- اشاعت گھر حیدرآباد (دکن)

اشاعت گھر حیدرآباد (دکن) نے چھوٹی چھوٹی سیاسی کتابوں کی اشاعت کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے یہ کتابچہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ موجودہ جنگ کی کہانی کو آسان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے بچوں کے ادب میں یہ کتابچہ ایک مفید اضافہ ہے۔ (ب)

کارل مارکس ——— پرچک

ضخامت ۴۲ صفحات۔ قیمت بارہ آنے۔ پتہ :- قومی دارالاشاعت بمبئی۔

قومی دارالاشاعت بھی سیاسی مسائل پر ہلکی پھلکی کتابیں شائع کر رہا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کارل مارکس کی پچاسویں برسی کے موقعہ پر لکھی گئی تھی۔ شریف عالم صاحب نے اسے اردو میں پیش کیا ہے اس کتابچہ میں مارکسزم کے علاوہ لینن اور سٹالین کے کارناموں کا بھی تذکرہ ہے۔ (ب)

خانقاہ ——— مصنفہ ایم اسلم

ناشر عبدالحق اکیڈیمی حیدرآباد دکن ——— قیمت دو روپیہ بارہ آنے

خانقاہ ایم اسلم کے نو افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ایم اسلم چونکہ بہت پرانے لکھنے والے ہیں اس لئے جو کچھ بھی لکھتے ہیں اور جیسا کچھ بھی لکھتے ہیں۔ اس سے ادبی حلقے پوری طرح شناسا ہیں۔ موجودہ دور میں اُن کے افسانے پرانی یادگاروں کی حیثیت سے پڑھے جا سکتے ہیں۔ اس مجموعہ کے افسانوں میں انہوں نے کسی قسم کی کوئی نئی بات نہیں کی۔ بلکہ اپنی پہلی کہانیوں کے عکس پیش کر دیئے ہیں۔ البتہ اب وہ اپنی کہانی کا اخلاقی نتیجہ بھی بیان کر دیتے ہیں۔ اگر مصنف کو زبان پر پوری دسترس حاصل ہوتی۔ تو وہ افسانے کی تدریجی ترقی میں مکالموں سے بخوبی کام لے سکتا تھا لیکن وہ طرز مکالموں کے شوق میں زبان کے عجیب غریب شعبدے دکھاتا ہے۔ اس کے مکالموں کا انداز بالکل تھیٹریکل ہے۔ یہ مجموعہ ایم اسلم کے مداحوں کے مطالعہ کے لئے اچھا ہے کیونکہ نیا ہے۔

سادہ و رنگین افسانے ——— مصنفہ ظفر قریشی

ناشر :- عبدالحق اکیڈیمی حیدرآباد دکن قیمت ؏۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ درمیانہ

زیرِ نظر مجموعہ ظفر قریشی کے بارہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ جن کے مطالعہ سے کئی مقامات پر مصنف کی باریک نگاہی کا معترف ہونا پڑتا ہے لیکن پلاٹ کی افراتفری اور انداز بیان کی ژولیدگی کسی افسانے کو فنی حیثیت سے کامیاب نہیں ہونے دیتی مصنف موجودہ دور کے نئے رجحانات سے قطعی طور پر عاری معلوم ہوتا ہے۔ اس مجموعہ میں چند ڈرامے بھی شامل ہیں جن میں سے ایک ہے "جب سورج ڈوب رہا تھا" مصنف نے کمال جرأت سے ایک مشہور افسانہ نگار کے مکالمے کا بھونڈا سا چربہ اتارا ہے اور رسید تک نہیں دی۔ یہ حرکت حیرتناک بھی ہے اور افسوسناک بھی۔

کنول و دیگر افسانے ——— مصنفہ اعظم کریوی

ناشر عبدالحق اکیڈیمی حیدرآباد دکن۔ قیمت دو روپیہ بارہ آنے

ڈاکٹر اعظم کریوی افسانہ نگاروں کے اُس مشہور گروہ میں شامل ہیں جو منشی پریم چند کی قیادت میں مدتوں اردو ادب پر چھایا رہا۔ ڈاکٹر صاحب کے افسانوں کا زیرِ نظر مجموعہ بھی اُن کے فن اور اُس فن کی انفرادی خصوصیات کا کامیاب مظہر ہے اور ہر اہلِ ذوق کے مطالعہ کے قابل ہے۔

ادارہ

اشارات

اردو زبان کی بدقسمتی ہے، کہ اس کے علمبردار آئے دن فروعی مسائل میں الجھ کر ادب کے حقیقی روح سے غافل ہو جاتے ہیں۔ اور یہ نہیں سوچتے، کہ ادب کا مستقبل، کوششوں کا اجتماع اور عقائد کی وحدت چاہتا ہے۔ ترقی پسند گروہ نے ان فروعات کو مٹا کر اردو ادب کو ایک شہر یا ایک صوبہ میں محبوس کرنے کے بجائے اُسے بین الاقوامی حیثیت دینے کی سعی کی۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ابھی تک ہمارے "خیرخواہوں" نے اس ترقی پاتی ہوئی انسانیت کو قریب سے نہیں دیکھا۔ جو اتحاد، مساوات اور آزادی چاہتی ہے، اور جس کے سامنے زبان کے محاوروں اور بیان کی رنگینیوں سے زیادہ اہم اور زیادہ ٹھوس مسائل ہیں۔ ہمارے ہاں کے ہر اخبار، ہر رسالہ، ہر ادارہ، بلکہ ہر شاعر اور ہر ادیب کا اپنا الگ حلقہ ہے، جو بزعم خود اردو ادب کا اجارہ دار ہے، اور جس کے نزدیک ہر دوسرے فرد کی کوششیں محض دکھاوا اور پراپیگنڈا ہیں۔ اس سے قبل بھی کئی مرتبہ اتحاد و یکجہتی کی صدا بلند کی گئی ہے، مگر ہندوستان اس صدا کے لئے صحرا ہی ثابت ہوا۔ ہم ایک مرتبہ پھر بہی خواہانِ زبان اور دردمندانِ ادب سے اپیل کرتے ہیں، کہ وہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر بکھری ہوئی قوتوں کو سمیٹ لیں، کوئی منزل مقرر کریں، کوئی دستور العمل مرتب کریں۔ اور حیدرآباد، لکھنؤ، دلی اور لاہور کی حدبندیوں سے بلند ہو کر سوچیں۔ ہنسی مذاق کے مضامین کو اخلاقی مفاسد نہ سمجھیں۔ اور اخلاقی و علمی مقالات کو مسخرہ پن نہ گردانیں۔ ادب بہت وسیع اور بہت ہمہ گیر ہے، اور ہمیں یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے، کہ اردو ادب کی وسعت اور ہمہ گیری کو بکھری ہوئی قوتوں نے خطرے میں ڈال رکھا ہے۔ ہمیں امید ہے، کہ ہماری یہ پکار ہندوستان بھر کی ادبی بارگاہوں میں باریاب ہو سکے گی۔

چودھری برکت علی پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ادب لطیف ۵ سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا

مختار صدیقی

خیال درباری بلمپت

اِن کے گانے میں ہے پرکاش، ذرا دیکھو تو،
ایک اک تان سے ہیں نور کے سوتے جاری
تین صدیوں کے شب و روز جلو میں لے کر
سیکری لائی ہے گمبیر، سجل درباری

یہ در و بام ہیں سا ونت مغل کا پرتو
اونچی محرابوں کے گھیرے ہیں کشادہ ایواں
اسی ایوان میں ہے اکبرِ اعظم کا جلوس
ان گنت جھاڑ، دمکتی ہوئی لاکھوں شمعیں
"اہلِ دربار، خبردار، نگاہیں نیچی!!"
ہاتھ باندھے ہیں حضوری میں امیرانِ کبیر

ہے ستونوں کی نفاست سے عیاں سنگینی
جس نے بیباک ارادوں سے بلندی چھینی
سونے چاندی کے ستاروں سے چھنتیں ہیں آکاس
غلعتیں جن کی ہیں بلور کے شفاف لباس!
اِن صداؤں میں وہ ہیبت ہے کہ دل تھرائے
آئی آواز، کہ تشریف شہنشہ لائے
حضرتِ گیتی پنہ، اکبرِ اعظم آئے
کوئی نظریں نہ اٹھانے پائے
اکبرِ اعظم آئے!!

"ترکماں حجرتِ اکبر آیو!"
اُپ بلی، تپ بلی، دنیا میں خدا کا سایہ
جن کا دم بھرتا ہے، اِنسان، ملک، چوپایہ
اُن کے ہم آپ نہ بل بل جیتے؟!"
مرنے جینے کا اگر ان سے "بندھنوا باندھو"
پار ہو بیڑا کہ ہے "پیر ہمارا سانچو!
ترکماں حجرت اکبر آیو ——— حجرتِ اکبر آیو!!

انترہ:-

آلِ تیمور کے سورج کی تجلی پھیلی،
دُکھ دلدّر کے گھٹا ٹوپ اندھیرے بھاگے
وہ اُجالا ہے کہ "جگ جگ کے نصیبے جاگے"
"اے ری جگ جگ کے نصیبے جاگے!"
دو جہاں مطلعِ انوار ہوئے ہیں، دیکھو!"
ترکماں مجرتِ اکبر آیو ——— مجرتِ اکبر آیو

پھیلاؤ:-

روشنی تیز ہوئی!
روشنی تیز ہوئی شمعوں کی،
روشنی تیز ہوئی شمعوں کی فانوسوں کی،
روشنی تیز ہوئی شمعوں کی فانوسوں کی اور شب کی دُلہن،
روشنی تیز ہوئی شمعوں کی فانوسوں کی اور شب کی دُلہن شرمائی،
روشنی تیز ہوئی شمعوں کی فانوسوں کی اور شب کی دُلہن شرمائی، لجا کر سمٹی،
روشنی تیز ہوئی شمعوں کی فانوسوں کی اور شب کی دُلہن شرمائی، لجا کر سمٹی، سمٹ کر بیٹھی،
انہی شمعوں نے دیا چاند کا جھومر اس کو!!
دو جہاں مطلعِ انوار ہوئے، دیکھو تو!"
ترکماں مجرتِ اکبر آیو ——— مجرتِ اکبر آیو!!

جرأت گانے کی بھی، بیتے زمانے بھاگے
قصرِ ویراں میں کہیں بُوم کا نوحہ گونجا
بیکراں رات سے محراب کی رفعت دُونی
خشک خندق سے اُدھر، کوہِ گراں دیواریں
کھینچ لیں، تین سو برسوں نے ملنا ہیں اپنی
سونپ دیں راگ نے اِس نوحے کو خوابیں اپنی
اور میں سایۂ محراب میں ہوں اُفتادہ
اب کہاں جاؤں کہ رہبر نہ نشانِ جادہ
کس خرابے میں مجھے چھوڑ گئی درباری!!

کرشن چندر

مسلسل

اُردو کا نیا قاعدہ

(بچوں کے لئے)

"اُن تمام رفیقوں کے نام جو زندگی کے لئے اِک نیا قاعدہ مرتب کر رہے ہیں"

ح۔ حکومت

بچو! حکومت اُس کو کہتے ہیں جو تھوڑے سے انسان بہت سے انسانوں پر روا رکھتے ہیں۔ تم بہت سے بچے ہو، لیکن تم سب میرے تابع ہو۔ اس سکول میں میری حکومت ہے، میں اس تحصیل میں رہتا ہوں۔ اس تحصیل میں اور بھی بہت سے آدمی رہتے ہیں، لیکن اس تحصیل پر صرف ایک تحصیلدار کی حکومت ہے، یہ تحصیل ایک ضلع میں ہے جہاں کلکٹر کی حکومت ہے، یہ ضلع ایک صوبے میں ہے جہاں گورنر کی حکومت ہے، صوبہ ایک ملک میں ہے جہاں بادشاہ کی حکومت ہے، ملک زمین پر ہے جہاں خدا کی حکومت ہے، خدا دُنیا میں ہے جہاں پیسے کی حکومت ہے!

حکومت کے بغیر آدمی سانس بھی نہیں لے سکتا۔ اگر یہ حکومت نہ ہوتی تو یہ اسکول بھی نہ ہوتا اور نہ تم مجھ سے سبق لیتے نہ میں تمہیں پڑھاتا۔ یہ بھی حکومت کی برکت ہے۔ اِس لئے بچو ہمیشہ حکومت کی عزت کرو۔ اور یاد رکھو کہ ہر شخص حکومت نہیں کر سکتا اور ہندوستانی تو خاص طور پر کبھی حکومت نہیں کر سکتے جو لوگ حکومت کرتے ہیں وہ حاکم کہلاتے ہیں اور جن پر حکومت کی جاتی ہے اُنہیں محکوم یعنی رعایا کہتے ہیں۔ حاکم ہمیشہ رعایا کے فائدے کے لئے حکومت کرتا ہے اسی لئے حاکم ہمیشہ امیر ہوتا ہے اور رعایا ہمیشہ غریب ہوتی ہے۔ یہ اس لئے کہ حاکم ہمیشہ رعایا کے فائدے کے لئے حکومت کرتا ہے اگر خدانخواستہ کبھی ایسا ہو جائے کہ حاکم رعایا کے فائدے کے لئے نہیں اُس کے نقصان کے لئے حکومت کرے تو رعایا امیر اور حاکم غریب ہو جائیگا۔ اور یہ اچھی بات نہ ہوگی کیونکہ غریب حاکم کبھی حکومت نہیں کر سکتا۔ اِس لئے حاکم کو ہمیشہ رعایا کے فائدے کے لئے ہی حکومت کرنا پڑتی ہے بعض لوگ چاہتے ہیں کہ حکومت کا وجود ہی دُنیا سے مٹا دیا جائے۔ ایسے لوگ بہت بُرے ہوتے ہیں۔ وہ تو گویا "ح" کے لفظ ہی کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ بچو! اب تم ہی بتاؤ کہ اگر لفظ "ح" کو مٹا دیا جائے تو تم حاکم کیسے بن سکوگے اور حکومت کیسے کروگے؟ اس لئے ان پاگل آدمیوں کی باتیں کبھی نہ سنو۔ اور کہو۔ ح حکومت

خ۔ خربوزہ

بچو! تم نے اکثر خربوزہ کھایا ہوگا۔ خربوزہ ہندوستان کا مشہور میوہ ہے ہندوستان کا ایک اور مشہور میوہ بھی ہے۔ اُسے پھوٹ یعنی نفاق یا بالفاظِ دیگر ہندو مسلمان کی لڑائی کہتے ہیں۔ ہندوستان کے میوے بہت مشہور ہیں اور دُور دور تک وساور کو جاتے ہیں۔ لیکن پھوٹ کا میوہ باہر نہیں جاتا۔ انگریز اسے بالکل نہیں کھاتے۔ انگریز خربوزہ بھی نہیں کھاتے کیونکہ اس سے ہیضہ پھیلنے کا ڈر ہوتا ہے۔ ہندوستان کی ہر شے سے ہیضہ پھیل سکتا ہے، خربوزے سے، ترکاری سے، دودھ سے، پانی سے، ہوا سے، مٹی سے، اس ملک کے ذرّے ذرّے میں ہیضہ چھپا ہوا ہے، اس لئے خربوزہ کبھی نہ کھانا چاہیئے۔

خربوزہ باہر سے بڑا خوبصورت اور خوشبودار ہوتا ہے لیکن اندر سے بالکل پھیکا اور بیجوں سے بھرا ہوتا ہے۔ بعض آدمی بھی خربوزے کی طرح ہوتے ہیں لیکن ہم انہیں خربوزہ نہیں کہتے، بڑے آدمی کہتے ہیں۔ دنیا کے ہر ملک میں بڑے آدمی ہوتے ہیں لیکن جتنے خربوزے ہندوستان میں ہوتے ہیں اور کہیں نہیں ہوتے۔ خربوزے میں ایک اور وصف بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب چھری خربوزے پر گرتی ہے تو خربوزہ کٹتا ہے اور جب خربوزہ چھری پر گرتا ہے تب بھی خربوزہ کٹتا ہے لیکن یہ صفت بڑے بڑے آدمیوں میں نہیں پایا جاتا۔ وہ خود کبھی نہیں کٹتے ہمیشہ دوسروں کو کٹواتے ہیں! اس لئے کہو "خ خربوزہ"

د۔ دام

بچو دام سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے، تم نے یہ قاعدہ دام دیکر حاصل کیا ہے، یہ تختی، یہ قلم، دوات، کاغذ، پنسل، سلیٹ، ہر چیز دام دیکر حاصل کی ہے، دام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ اس سے آدمی پتھر کی مورتی سے لیکر پتھر کی پنسل تک خرید کر سکتا ہے، اور خدا سے لے کر خدمتگار تک حاصل کر سکتا ہے، دام دنیا کا بادشاہ ہے، پہلے پہل دنیا میں دام نہیں تھے، سب لوگ بے دام تھے بلکہ یوں کہو کہ "بے دام" تھے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ اگر میرے پاس چمڑا ہے اور مجھے گیہوں چاہیئے۔ اور تمہارے پاس گیہوں ہے اور تمہیں چمڑا چاہیئے۔ تو تم مجھ سے چمڑا لے لیتے تھے اور مجھے گیہوں دے

دیتے تھے اور خوشی خوشی گھر چلے جاتے تھے۔ اب یہ صورت ہے کہ نہ میں تمہیں دام کے بنا چھڑا دیتا ہوں۔ نہ تم دام کے بنا مجھے گیہوں دیتے ہو اور نہ ہم لوگ خوشی خوشی گھر جا سکتے ہیں۔ کیونکہ آج کل گھر بھی دام کے بنا نہیں ملتے۔ اس صورت حال کو لوگ "انسانی ترقی" کے نام سے پکارتے ہیں کئی لوگ کہتے ہیں کہ خوشی کا دام سے کوئی تعلق نہیں لیکن میں نے کسی بندۂ بے دام کو یہ کہتے نہیں سُنا۔ دام کے بغیر دنیا میں خوش رہنا محال ہے پہلے یہ ہوتا تھا کہ لوگ میرے علم و فن کو دیکھتے تھے اور اس کے بدلے مجھے پندرہ روپے نہیں دیتے تھے بلکہ میری زندگی کی ساری ضروریات پوری کرتے تھے۔ اب کسی نے دام دینے کا یہ نیا طریقہ نکالا ہے اور ساری دنیا کی خوشی کو اپنے قبضے میں کر لیا ہے اس سے تو شاید پہلا طریقہ ہی بہتر تھا اس میں خوشی زیادہ تھی آج کل دام بہت دکھائی دیتے ہیں خوشی کم ہے۔

پہلے دام کوڑیوں کے ہوتے تھے، انہیں دام نہیں بلکہ چھدام کہتے تھے۔ پھر دام دھاتوں سے بنائے جانے لگے۔ تانبا، چاندی، سونا، پیتل، لوہا، ان سب دھاتوں سے دام تیار کئے گئے، آج کل دام کاغذ کے بنتے ہیں۔ دام جال کو بھی کہتے تھے۔ دراصل اس دام اور اُس دام میں بہت فرق ہے یہ بھی ایک طرح کا جال ہے، جس میں انسانوں کی خوشی قید کر دی گئی ہے بچو ہم سب اسی جال میں گرفتار ہیں۔ اس لئے کہو۔ د۔ دام

ڈ۔ ڈاکو

بچو! ڈاکو چور کا بڑا بھائی ہوتا ہے اور بڑا خطرناک ہوتا ہے تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ کس طرح تمہارا بڑا بھائی تم سے زبردستی کھلونا چھین کر چلا جاتا ہے اور تم روتے رہ جاتے ہو اور رونے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ تمہارا بڑا بھائی تم سے زیادہ طاقتور ہے۔ وہ بڑا ہے اور تم چھوٹے ہو یہی حال ڈاکو کا ہے! وہ بھی اپنے سے چھوٹے اور کمزور آدمی پر ہاتھ ڈالتا ہے اور اُس سے سب کچھ چھین لیتا ہے۔ جب ایک انسان ایسا کرتا ہے تو ہم اُسے ڈاکو کہتے ہیں۔ . . . .

. . . .

. . . . جب دو انسان ایسا کرتے ہیں تو ہم اُسے قبیلہ کہتے ہیں، جب تین انسان ایسا کرتے ہیں تو ہم اُسے جاگیرداری کہتے ہیں۔ اور جب چار انسان ایسا کرتے ہیں تو وہ شاہیت کہلاتی ہے، نام مختلف ہیں لیکن اصول وہی ہے اور پھر اس میں مزہ یہ ہے کہ جب ایک انسان ڈاکہ ڈالتا ہے تو ہم اُسے پھانسی کی سزا دیتے ہیں۔ لیکن جب چار آدمی ملکر یہ کام کرتے ہیں تو اُنہیں خطاب دیئے جاتے ہیں، قوم اُنہیں اپنا ہیرو سمجھتی ہے، اور پوجتی ہے اور ہزاروں برس تک اُن کا نام رہتا ہے اور اُن کے بیٹوں کو جاگیریں دی جاتی ہیں اور وہ لوگ بادشاہ اور شہنشاہ بنا دیئے جاتے ہیں۔ اور اُن کا درجہ خدا کے بعد سمجھا جاتا ہے! توبہ توبہ زمانے کو کیسی ہوا لگ گئی ہے! بچو ان ڈاکوؤں سے ہمیشہ بچو، اور دنیا کی طاقت کو انسانوں میں برابر بانٹ دو تاکہ کوئی زبردست نہ رہے کوئی زبردست نہ رہے اور جب تک ایسا نہیں ہوتا۔ نیا قاعدہ پڑھتے جاؤ۔ رکہو۔ ڈ۔ ڈاکو۔

ذ۔ ذخیرہ

بچو! جب بہت سی چیزیں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو اُسے ذخیرہ کہتے ہیں جنگل بھی ایک قسم کا ذخیرہ ہوتا ہے درختوں کا، سکول بھی ایک قسم کا ذخیرہ ہوتا ہے، بچوں کا، پرانے زمانے میں حکومت کی طرف سے ہر گاؤں میں اناج کا ذخیرہ رکھا جاتا تھا تاکہ قحط سالی کے دنوں میں لوگوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو مغل بادشاہوں کے وقت میں بھی اناج کے بڑے بڑے ذخیرے رکھے جاتے تھے جن میں ہر سال نیا اناج بھرا جاتا تھا۔ آجکل بھی حکومت ذخیرے قائم کرتی ہے، لیکن ان میں اناج نہیں بھرا جاتا۔ ان میں روپے اور نوٹ بھرے رہتے ہیں۔ ان ذخیروں کو لوگ بینک کے نام سے پکارتے ہیں۔ قحط سالی کے دنوں میں یہ ذخیرے اناج کے بجائے روپے اور نوٹ تقسیم کرتے ہیں۔ روپیہ چاندی کا ہوتا ہے۔ نوٹ کاغذ کا ہوتا ہے، اور یہ دونوں چیزیں کھانے کے حق میں اچھی نہیں۔ ابھی حال میں بنگال میں قحط پڑا تھا۔ اور لاکھوں آدمی مر گئے، اسکی وجہ یہ تھی کہ مہاجنوں اور دوسرے امیر آدمیوں نے اناج چھپا لیا تھا۔ اگر اس وقت حکومت کے اپنے اناج کے ذخیرے ہوتے تو وہ فوراً اناج نکال نکال کر لوگوں میں بانٹ دیتی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ شاید اب لوگوں کو عقل آ جائے اور گاؤں گاؤں میں اناج کے ذخیرے قائم ہو جائیں۔

انگلستان ایک جزیرہ ہے۔ لیکن ہندوستان ایک ذخیرہ ہے۔

بُلبُلوں کا سہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

ہندوستان میں چالیس کروڑ بلبلیں رہتی ہیں۔ ایسی کمینی، روتی بسورتی فاقے کرتی ہوئی بلبلیں دنیا کے کسی اور حصے میں موجود نہیں۔ صرف ہندوستان ہی ان بلبلوں کا ذخیرہ ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ غلامی، جہالت، پستی اور بے حسی کا بھی۔ اس لئے کہو۔ ذ۔ ذخیرہ۔

ر۔ راجہ

بچو! تم نے راجہ دیکھا ہوگا۔ اگر راجہ نہیں تو راجہ صاحب کا ہاتھی ضرور دیکھا ہوگا۔ ہمیشہ یاد رکھو کہ راجہ صاحب کا ہاتھی ہوتا ہے۔ پنڈت جی کی بہلی ہوتی ہے، مولوی صاحب کا گھوڑا ہوتا ہے، غریب کا گدھا ہوتا ہے، دھوبی کا کتا ہوتا ہے اور اکثر نہ گھر کا ہوتا ہے نہ گھاٹ کا۔

لیکن راجہ صاحب کے پاس صرف ہاتھی ہی نہیں ہوتا اور سب کچھ ہوتا ہے، گھر گھاٹ، دھوبی، کتا، پنڈت، مولوی، ہاتھی، چیتا، بہلی، گاڑی، موٹر، کلغی، سہرا، سب کچھ ہوتا ہے۔ راجہ صاحب کی رانی بھی ہوتی ہے۔ بلکہ عام طور پر بہت سی رانیاں ہوتی ہیں جو عالیشان محلوں میں رہتی ہیں۔ اور جو رانیاں نہیں ہوتیں وہ پھونس کے جھونپڑوں میں رہتی ہیں۔

راجہ کے پاس رعایا بھی ہوتی ہے۔ اور رعایا کے بغیر کوئی راجہ راجہ نہیں کہلا سکتا۔ اس دنیا میں شروع سے یہی قاعدہ ہے کہ راجہ محل میں رہتا ہے، رعایا جھونپڑے میں رہتی ہے۔ یہ تخت پر بیٹھ کر حکومت کرتا ہے، رعایا ہل چلاتی ہے۔ راجہ شراب پیتا ہے۔ رعایا پانی پیتی ہے اور پانی پی پی کر بھی نہیں جی سکتی۔ اور جب پانی بھی نہیں ملتا تو چپ چاپ بھوکی پیاسی مر جاتی ہے ایسے موقع کو قحط سالی کہتے ہیں۔ لیکن یہ دنیا کا پرانا قاعدہ ہے۔ نیا قاعدہ جو اب تم پڑھ رہے ہو یہ نہیں سکھاتا، نئے قاعدے میں راجہ اور پرجا سب برابر ہیں۔ کروڑوں روپیہ ایک محل پر صرف کرنے کے بجائے رعایا کے رہنے کے لئے ہزاروں اچھے گھر بنائے جاتے ہیں، چند موٹر اور ہاتھی رکھنے کے بجائے سرکاری کارخانے جاری کئے جاتے ہیں۔ اور کلغی تو بالکل اڑا دی جاتی ہے۔ بھلا سر پر کلغی لگانے سے کس کا پیٹ بھرتا ہے۔ نئے قاعدے میں کلغی لگانے اور ہیرے موتی کے زیور پہننے پر کتابیں پڑھنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس لئے نیا قاعدہ پڑھو اور کہو۔ ر۔ راجہ

ڑ

بچو! "ڑ" میں بڑی گڑبڑ ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بڑی گڑبڑ [illegible] ہے۔ ڑ دراصل پہلے کبھی نہیں ہمیشہ لفظوں کے بیچ میں آتی ہے۔ جیسے "گڑبڑ" میں، لیکن ڑ بیچ میں آ کر بھی سب پر چھا جاتی ہے جیسے "گڑبڑ" [illegible] اب اس لفظ کو بولو۔ تو معلوم ہوتا ہے گویا اس لفظ میں ڑ کی آواز کے [illegible] اور کوئی ہستی نہیں۔ بیچ کے لفظ بہت برے ہوتے ہیں اور بڑی گڑبڑ پیدا کرتے ہیں [illegible] بیچ کی چیزوں کو ہم ایجنٹ یا دلال بھی کہتے ہیں۔ ہماری زندگی پر آجکل دلالوں کا قبضہ ہے اور یہ لوگ زندگی کی ساری خوبصورت اور مفید اشیاء پر قبضہ کئے بیٹھے ہیں اور سب [illegible] منافع حاصل کرتے ہیں اور یہ لوگ تجارت، حکومت، صنعت، حرفت، ہر شعبے کے بیچ میں آن گھسے [illegible] بڑی گڑبڑ پیدا کر رہے ہیں۔ دراصل یہ بیچ کا طبقہ ہمیشہ بڑی گڑبڑ پیدا کرتا ہے۔ کبھی تو یہ امیروں کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اور کبھی بظاہر غریبوں کا دم بھرنے لگتا ہے۔ لیکن کچھ بھی ہو۔ یہ طبقہ ہر حالت میں اپنا نفع حاصل کرنے کی فکر کرتا ہے گویا یہ درمیانہ طبقہ ہماری سماج میں چمگادڑ کی طرح ہے۔ اور چمگادڑ میں بھی [illegible] آتی ہے۔ دراصل یہ "ڑ" بڑی خطرناک آواز ہے۔ اس لئے جہاں تک ہو سکے اس لئے بچو۔ اور کہو ڑ۔ گڑبڑ یعنی چمگادڑ

ز۔ زمین

بچو! تم اس وقت زمین پر بیٹھے ہو، لیکن اگر تم اس وقت ہوائی جہاز میں ہوتے تو میں کہتا کہ تم ہوا میں اڑ رہے ہو۔ خیر۔ بچو یاد رکھو زمین [illegible] کام کی شے ہے۔ زمین سے اناج پیدا ہوتا ہے تاکہ کاشتکار لگان [illegible] زمین سے سونا نکلتا ہے تاکہ دام والے حکومت کر سکیں [illegible] لوہا نکلتا ہے تاکہ جنگ کے لئے توپیں اور بندوقیں بن سکیں۔ زمین سے مٹی نکلتی [illegible] ہماری تمہاری قبریں بن سکیں۔ اور سب سے بڑھ کر زمین کا فائدہ [illegible] زمین گول ہے اوپر نیچے، دائیں بائیں، ہر طرف سے گول ہے۔ [illegible] اور اگر تم بھی دیکھو تو بھی گول ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا میں فساد کی جڑ "ز" نہیں [illegible] درجہ میں بھی ڑ ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ زر، زن، زمین، ان تینوں [illegible] ہے اور ان تینوں کی وجہ سے دنیا میں لڑائی ہوتی ہے اور فساد [illegible] ہے۔ مجھے ان لوگوں سے [illegible] کہ زر، زمین، زن ان [illegible] میں سے کوئی [illegible] ہے جو ایک [illegible]

ہے انسان کے دماغ میں پیدا ہو چکی ہے۔ نفع "اگر یہ گڑبڑ دُور ہو جائے۔ تو دُنیا میں چاروں طرف خوبصورتی ہی خوبصورتی نظر آئے۔ اور یہ خوبصورت زمین خوشی سے ناچتے ناچتے اور بھی گول ہو جائے۔ بلکہ گول مٹول ہو جائے۔ اس لئے کہو۔ ز۔ زمین۔

ژ۔ ژال

بچو! ژال نام پہلوان کا ہے لیکن ہندوستان کے سب سے بڑے پہلوان کا نام ژال نہیں، گاما ہے۔ اُسے رستم زماں بھی کہتے ہیں کیونکہ اُس نے دنیا کے تمام پہلوانوں کو کشتی میں پچھاڑ دیا ہے۔ رستم ایران کا ایک مشہور پہلوان تھا۔ لیکن رستم کا نام بھی رستم ہی تھا، ژال نہ تھا۔ پھر بھی ژال نام پہلوان کا ہے۔ ژال یعنی پہلوان کا سر ہمیشہ گھٹا ہوتا ہے کیونکہ پہلوانوں کو بھی پنڈتوں اور مولویوں کی طرح سر منڈانے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑتے ہیں۔ اور اولے کو فارسی میں ژالہ بھی کہتے ہیں۔ جو لفظ ژال سے بنایا گیا ہے۔ کیونکہ پہلوانوں کو سر منڈاتے ہی اولے پڑتے ہیں یعنی ژالہ باری شروع ہو جاتی ہے۔ اس لئے بچو! اگر تم بھی پہلوان بننا چاہتے ہو تو سر منڈاؤ اور کہو ژ۔ ژال نام پہلوان۔

س۔ سچائی

بچو! سچائی دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے! تم نے جارج واشنگٹن کی کہانی پڑھی ہوگی، جس نے اپنے بچپن کے دنوں میں کلہاڑی سے اپنے باغ کا درخت کاٹ ڈالا تھا۔ اور جب اُس کے باپ نے اُس سے ڈانٹ کر پوچھا کہ یہ درخت کس نے کاٹا ہے۔ تو اُس نے سچ بول کر اقرار کر لیا۔ کہ یہ درخت میں نے ہی کاٹا ہے اباجی! کہتے ہیں جارج واشنگٹن کے سچ بولنے پر اُس کا باپ بہت مرعوب ہوا اور اُس نے پیشین گوئی کی کہ جارج بڑا ہو کر ضرور بڑا آدمی بنے گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اور جارج واشنگٹن سچ بولتے بولتے ایک دن امریکہ کا صدر بن گیا۔ جارج واشنگٹن کے واقعے کے بعد دنیا کے ہر بڑے آدمی نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا ہے۔ کہ وہ بچپن ہی سے سچ بولنا اور درخت کاٹنا شروع کرتا ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ قیصر ولیم کو درخت کاٹنے میں بڑی مہارت حاصل تھی مصیبت یہ تھی کہ اُسے ڈانٹنے والا کوئی نہ تھا اس لئے قیصر ولیم کو کبھی سچ بولنے کا موقعہ نہ ملا اور وہ پہلی جنگ عظیم ہار گیا۔ اور سنا ہے کہ انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر چرچل بھی سچ بولنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ انہوں نے اپنے بچپن میں اتنے درخت کاٹے ہیں کہ کئی جنگل کے جنگل اجاڑ دیئے ہیں۔ اسی طرح یوروپ کے ایک بہت بڑے آدمی کی بابت مشہور ہے کہ اُس نے سچ بولنے کی خاطر درخت کے علاوہ ایک آدمی کا گلا بھی کاٹ ڈالا تھا۔ اور اُس کے باپ نے خوش ہو کر اُسے فوراً معاف کر دیا تھا۔

میں نے یہ قصے تیسری جماعت میں پڑھے تھے، اُن دنوں مجھے بھی سچ بولنے کا شوق چرایا۔ چنانچہ ایک دن موقعہ پا کر میں نے کلہاڑا ہاتھ میں لیا۔ اور اپنے گھر کے ارد گرد جتنے درخت تھے سب کاٹ ڈالے، گلاب کی جھاڑیاں، انگور کی بیلیں، پھولوں کی روشنیں سب ویران کر ڈالیں۔ حالت یہ ہوگئی کہ شام کو جب والد دفتر سے لوٹے تو اپنا گھر بھی نہ پہچان سکے۔ میں نے اُنہیں حیران و پریشان دیکھ کر تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "آیئے آیئے پریشان کیوں ہوتے ہیں آپ۔ یہ آپ ہی کا گھر ہے۔" اس پر بھی میرے والد منہ سے کچھ نہ بولے۔ مُڑ مُڑ کر باغیچے کی طرف دیکھتے رہے۔ میں نے کہا۔ "آپ اس طرح گھور گھور کر کیا دیکھ رہے ہیں۔ اباجی سچ بات تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ ——— میں نے کیا ہے۔ وہ ——— جارج واشنگٹن والا واقعہ ——— " لیکن اس کے بعد والد نے مجھے بولنے نہیں دیا اور ایک کٹے ہوئے درخت کا تنا اُٹھا کر میری جو مرمت کی ہے تو ——— خیر میں جارج واشنگٹن نہ بنا سکول ماسٹر تو بن ہی گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس دن سے میری داہنی ٹانگ لنگڑی ہوگئی۔ اور بائیں بازو کی ایک ہڈی ٹوٹ گئی ......

——— تو بچو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چاہے ٹانگ لنگڑی ہو جائے چاہے بازو ٹوٹ جائے، چاہے جان چلی جائے، لیکن سچائی کو رکھو ہمیشہ عزیز۔ ہمیشہ سچ بولو۔ بلکہ پہلے بات کو تولو پھر منہ کھولو۔ پھر سچ بولو اور کہو س سچائی۔

احمد ندیم قاسمی

ردِ عمل

ملتا ہی نہ تھا نقطۂ آغاز سفر کا ابہام بدلتا ہی نہ تھا حدِ نظر کا
تاروں کی نگاہوں میں تقاضا تھا سحر کا

چلتا تھا مگر سمت معیّن نہ ہوئی تھی اِس وحشت میں اِک راہ بھی روشن نہ ہوئی تھی
اور روح رضامندِ نشیمن نہ ہوئی تھی

میں بارگہِ حسن میں اک بار گیا تھا لیکن یہ سفر بھی مرا بیکار گیا تھا
گو جسم بچا لایا تھا، جاں ہار گیا تھا

باہوں کو بھی سہلایا تھا، بانوں سے بھی کھیلا ہونٹوں سے بھی بہلا رہا، گالوں سے بھی کھیلا
تاروں پہ جھپٹنے کے خیالوں سے بھی کھیلا

کوہسار کے گاتے ہوئے چشموں میں نہایا جھونکوں نے مجھے اپنے ہنڈولوں میں جھلایا
اک سانس سے کہرے کے نقابوں کو اڑایا

گاتے ہوئے جھرنے پہ صنوبر کی گھنی چھاؤں چمٹے ہوئے میدان کی چھاتی سے کئی گاؤں
لہراتے تھے بازو تو لپکتے تھے مرے پاؤں

ہونٹوں کے چھلکتے ہوئے جرعے بھی پیے تھے آنکھوں کو طپاں ریت کے چھینٹے بھی دیے تھے
پوشاک بھی پہنی تھی، گریباں بھی سیے تھے

ناگاہ ستاروں نے نئے پیچ لڑائے اُڑتے ہوئے اِنسان کے پُرزے نظر آئے
تقدیر کی ڈوریں تھیں اشارے تھے پرائے

فرسودہ سہی کھیل، مگر ڈھنگ نیا تھا تھے چنگ پُرانے مگر آہنگ نیا تھا
گو رنگ وہی تھے مگر ارژنگ نیا تھا

انداز کی جدّت نے توجہ کو سمیٹا کچھ دیر صنوبر کی گھنی چھاؤں میں لیٹا
پھر عشق کا پشتارۂ بے ربط لپیٹا

خوابوں کی بلندی سے زمیں پر اتر آیا ہر ذرّے میں دبکا ہوا اک دل نظر آیا
ہر نقش میں صانع کا کلیجہ اُبھر آیا

چہروں پہ غبار اور نگاہوں میں پکاریں ہونٹوں پہ کئی مردہ و افسردہ بہاریں
آنکھوں میں جھلکتے ہوئے اشکوں کی قطاریں

سہمی ہوئی سمٹی ہوئی پھرتی تھی جوانی سڑتی ہوئی صدیوں کے تعفن کی نشانی
تاریخ کی روداد، مزاروں کی زبانی

پازیب میں زنجیر کے اٹھتے تھے چھناکے　　گیتوں میں امنگوں کے چٹخنے کے دھماکے
آنکھیں تھیں کہ فنکار کے بگڑے ہوئے خاکے

ہر بات میں فریاد تھی، ہر سانس میں نالہ　　ہر گام پہ حائل تھا رواجوں کا شوالہ
جکڑے ہوئے ہر عزم کو اخلاق کی مالا

روٹی کے لئے ناک رگڑتے تھے جوانمرد　　وہ درد کی شدت تھی کہ دل سرد تھے رُخ زرد
اور دور افق پار کی چھنتی ہی نہ تھی گرد

کھیتوں کی نگہبان تھیں بگڑی ہوئی لاشیں　　ناسور تھے سینوں میں تو گالوں پہ خراشیں
ٹوٹے ہوئے اک چاند کی بجھتی ہوئی قاشیں

ہر پھول کو حاکم نے بنایا تھا شرارہ　　اور وہم یہ ہوتا تھا کہ ابھرا ہے ستارا
تقدیر بڑے غور سے کرتی تھی نظارا

اک خطۂ اگر کال سے پامال ہوا تھا　　اک طبقہ اسی کال سے خوشحال ہوا تھا
مسرور بہت رندِ کہن سال ہوا تھا

بارود کے بھبکے میں شرابوں کی مہک تھی　　گوروں کی کڑک میں کئی کلیوں کی چٹک تھی
کچلے ہوئے اجسام میں ریشم کی لچک تھی

دیکھی نہ گئی مجھ سے جب آدم کی تباہی　　بیدار ہوئی روح کی آفاق پناہی
چبھنے لگی فطرت کو میری تیز نگاہی

حائل تھیں مری راہ میں مذہب کی فصیلیں　　آنکھوں پہ جھپٹنے لگیں قانون کی چیلیں
ڈسنے لگیں اخلاق کی بے رحم دلیلیں

بےخوف بھرے میں نے خلاؤں میں طرارے　　لپٹے مرے ملبوس سے جلتے ہوئے تارے
تقدیر کھڑی ہنستی تھی سورج کے کنارے

پرشور ہوا نے مجھے بے طرح اچھالا　　سو بار شبستانِ مشیت سے نکالا
لیکن مجھے احساس کی شدت نے سنبھالا

مستقبلِ آدم کی سیاہی کو اُڑایا!　　ناسور کو نابود کیا، پھول بنایا
ہر کرّہ کو انصاف کے محور پہ گھمایا

ہر لوح کی تحریر لہو گھول کے دھو دی　　آنکھوں کی تجلّی نئے لفظوں میں سمو دی
یہ دیکھ کے تقدیر بھی منہ ڈھانپ کے رو دی

اب میرا جہاں حسن و جوانی کا جہاں ہے　　مقصد میرا اب خواجگیٔ کون و مکاں ہے
اے جبرِ مشیت، تیرا قانون کہاں ہے؟

اندرا منوہر لعل

جدید اُردو ڈرامانگاری

آج جدید اُردو ڈراما جس دور سے گذر رہا ہے اُس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے زمانۂ ماضی پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تاکہ اُس کا پس منظر اردو ڈرامانگاری کی جدید تحریکات اور اُس کے جدید رجحانات کو زیادہ اجاگر کر سکے کہا جاتا ہے کہ اردو ڈراما کی بنیادیں "ہندوستانی ڈراما" کے کھنڈروں پر اُستوار کی گئی ہیں۔ اہلِ نظر حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ "اردو ڈراما" اپنی پیدائش کے بعد اس فضائے بسیط میں آزادی کی چند سانسیں بھی نہ لینے پایا تھا کہ غلامی کی بیڑیاں اُس کے پیروں میں ڈالدی گئیں۔ وہ پابجولاں اغیار کے روبرو پیش کیا گیا اور انہوں نے اس کی صورت مسخ کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ زاں بعد اسکو کسب زر کا ذریعہ بنایا۔ حیاتِ انسانی کی اصلاح کے بجائے اپنی بوالہوسی کی تسکین اس کا مقصد ٹھہرایا۔ اُس کی فنی تکمیل کو عوام کی دلچسپیوں پر قربان کر دیا۔ اُس کے محاسن کو ناجائز اصولوں کی بھینٹ چڑھا دیا۔ یہ ہے جدید اُردو ڈراما کا عہدِ ماضی یعنی پس منظر۔ جب اردو ڈراما اغیار کی گود میں پلا اور بڑھا۔ جب اُس کو اردو شاعری کی طرح کسی کی اعلیٰ سرپرستی نصیب نہیں ہوئی۔ جب ادبا و شعرا نے اُسے فنِ لطیف کی حیثیت سے نہ سراہا تو پھر کون اُسکی اصلاح اور ترقی کا بیڑا اٹھاتا۔ ہندی، بنگالی اور مرہٹی ڈرامے بھی تقریباً اسی عہد کی پیداوار ہیں۔ مگر ان زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں نے اُس کو اپنی اصلاح اور ترقی کا ایک ذریعہ سمجھ کر اُس میں فنی کمالات دکھائے۔ اُس سے تفننِ طبع کا بہترین کام لیا۔ اپنے ڈراموں میں کمسنی کی شادی، بیواؤں کی اور عورتوں کی تعلیم، قبیح رسمات، ذات کی بیجا پابندیاں اس انداز سے پیش کیں کہ تماشائی سوسائٹی کی اصلاح کا عزم بالجزم لیکر اٹھے۔ انہوں نے اپنے قومی زوال کی انتہائی گھناؤنی تصویریں پیش کیں اور اپنے تاریخی مشاہیر کے کارناموں کو پیش کر کے انہیں زندۂ جاوید کیا۔ عوام کو سیاسی تحریکات سے اس طرح [illegible] کیا کہ اُن میں جذبۂ حب الوطنی جاگ اٹھا۔ دوسرے الفاظ میں اُن کے ڈراموں میں تمثیلی، ادبی اور اصلاحی خصوصیات موجود تھیں مگر اردو ڈراما میں ابتدا ہی سے اُن کا فقدان تھا۔

اردو ڈراما کی تاریخ دراصل چند پارسی سرمایہ داروں اور پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کے وجود پذیر ہونے اور فنا ہونے کی داستان ہے جن کو میں نے اغیار کے نام سے موسوم کیا ہے محض اس وجہ سے کہ انہوں نے اردو ڈراما کی سرپرستی اپنے تجارتی مفاد کی تکمیل کی غرض سے کی۔ یہ کمپنیاں ڈرامے لکھواتیں اور اسٹیج کرتیں مگر اُن کا مقصد ادب و زبان کی خدمت یا ڈرامانگاری کی فنی تکمیل نہ تھا اور نہ سیاسی و معاشرتی اصلاح بلکہ اُنکا نصب العین عوام کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنا تھا۔ سوئے اتفاق ملاحظہ ہو کہ زمانے کے انقلاب نے بھی اُن کو یہ ستم توڑنے میں انتہائی مدد دی اور وہ یوں کہ جب انگریزوں کی حکومت ہندوستان میں مستحکم ہوگئی اور یورپ اور ہندوستان میں آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہوگیا تو بمبئی کے چند جوشیلے زر پرست پارسیوں نے یورپ سے آنے جانے والوں کے صلاح و مشورہ پر یورپین وضع قطع کے نہایت شاندار تھیٹر تیار کرائے۔ ان میں بیش قیمت ساز و سامان اور نظر فریب سین پیش کئے۔ عمدہ اور قیمتی پردے مہیا کئے۔ اداکاروں کے لئے زرق برق ملبوسات بنوائے۔ غرض تھیٹر اُن دنوں شداد کی بہشت بنے ہوتے تھے۔ عوام کو جو یہ نظر فریب ڈرامے دیکھنے کا موقعہ ملا تو وہ جوق در جوق وہاں پہنچنے لگے۔ ڈرامے اُن کے مذاق کے مطابق لکھوائے جاتے تھے۔ ان میں سوقیانہ مذاق ہوتا جو کسی جاہل ایکٹر یا ایکٹرس کی پست ذہنیت کا نتیجہ ہوتا جسے کوئی بے مقصد سوچتا۔ منشی اُسے ضبط تحریر میں لاتا۔ گجراتی، مرہٹی اور اردو کی کھچڑی تیار رہتی۔ قدم قدم اشعاریں کی منزل گانے ڈھالتی۔ اس طرح اردو ڈراما کی بجائے ایک معجون مرکب تیار کیا جاتا جو عوام کے مرض لاعلاج کی واحد دوا بھی جاتی تھی۔

اس عہد کے ڈراموں کے متعلق ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ( ) لکھتے ہیں:۔

"اُن کی یعنی پارسیوں کی نظر ہمیشہ عوام کی جیب پر رہتی ہے۔ اُنکو

ڈراموں کی ادبی اور اسٹیج کی خوبیوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور نہ اُن کو کسی ادبی خدمت کا دعویٰ رہا ہے۔ مہذب اور شائستہ لوگوں کی انہیں کبھی حمایت حاصل نہیں ہوتی۔ تمام تماشائی دلفریب مناظر، زرق برق لباس، مقفیٰ عبارتوں، ہنسی مذاق کی باتوں اور رقص و سرود کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ شرفا کی نظر میں ایکٹروں کی منڈلی اسی قدر ذلیل سمجھی جاتی ہے۔ جیسے الزبتھ کے عہد میں۔ شریف عورتوں کے پارٹ لڑکے یا کسبیاں ادا کرتی تھیں۔ ایکٹروں کو محنت کرنا پڑتی ہے۔ گویّے، ناچنے والے اور کرتب دکھانے والے ایسے ہی چالاک اور ہوشیار ہوتے ہیں جیسے کہ ایلزبتھ کے زمانے میں۔"

اردو ڈراما کے سلسلہ میں تھیٹر، اسٹیج اور تھیٹریکل کمپنیوں کا تذکرہ زیادہ آیا ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ اردو ڈراما کے دو پہلو ہیں۔ ایک ادبی اور دوسرا تمثیلی۔ تمثیل کا تعلق اسٹیج سے ہے اور اسٹیج تھیٹر کا لازمی جزو ہے۔ شلیگل (Schlegal) کا یہ قول میرے اس بیان کی تائید کرے گا۔ اُس نے لکھا ہے۔

"ڈراما کو ہمیشہ دو طریقوں سے جانچنا چاہئے۔ پہلا یہ کہ اسٹیج پر کھیلے جانے کے قابل ہے یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس میں ادبیت کو کتنا دخل ہے۔"

ادبی اور تمثیلی نقطۂ نظر سے اردو ڈراما کا پس منظر بالکل ناکارہ ہے۔ اسی ناکارہ پس منظر پر جدید اردو ڈراما کی عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ دورِ جدید میں عہدِ ماضی کے جو علمبردار زندہ تھے۔ اُنہوں نے اردو ڈراما کی اصلاح کی بہت کوششیں کیں مگر اُن کی سعی مشکور نہ ہوئی جیسے میاں ظریف، مرزا نظیر بیگ، ونائک پرشاد طالب، منشی مہدی حسن احسن، پنڈت نرائن پرشاد بیتاب وغیرہ اور جنرل تھیٹریکل کمپنی، لائٹ آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی، وکٹوریہ ناٹک کمپنی، الفریڈ تھیٹریکل کمپنی، الگزینڈر تھیٹریکل کمپنی وغیرہ سے منسلک رہے۔ وہ مجبور تھے کہ مالکان کی فرمائش پر غیر ملکی اور بیرونی روایات پر اپنے ڈرامے لکھیں۔ اِس طرح کہ ہر منظر کی ابتدا میں پہیلیوں کے گانے پیش کریں۔ مقفیٰ و مسجع عبارت لکھیں۔ ڈراما میں کہیں نہ کہیں مذاق ضرور پیش کریں۔ خواہ وہ کتنا ہی ادنیٰ درجہ کا کیوں نہ ہو۔ آغا حشر کاشمیری بھی ابتدا [illegible] اثر کے بغیر نہ رہے۔ مگر ان کی زندگی کا دوسرا دور

شیکسپیئر کے ڈراموں کے تراجم کے لئے وقف رہا۔ اُن کے علاوہ جو ڈرامے حشر نے تصنیف کئے وہ Melo Droma کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکے۔ حشر نے اپنے دوسرے دور میں اتنا ضرور کیا ہے کہ قدیم اور فرسودہ راہوں سے علیحدہ ہو کر معاشرتی، معاشرتی، سیاسی اور معاشی شعبوں میں اپنے ڈراموں کے موضوع تلاش کئے ہیں۔ زبان میں بھی سلاست، روانی اور سادگی پیدا کی مگر جلد ہی وہ ہندی کی طرف رجوع ہو گئے۔

کسی چیز میں تغیر اور انقلاب ایک دم ممکن نہیں ہوتا کیونکہ قدامت پرستی اور جہالت کے تباہ کن اثرات بہت دیرپا ہوتے ہیں۔ اردو ڈراما کے معاملہ میں فرسودہ روش، پست مذاق، عامیانہ طرزِ ادا وغیرہ عوام کی رگ و پے میں سرایت کر گئے تھے۔ آخر حامیانِ اردو نے "اردو ڈراما" کی اصلاح کی طرف قدم بڑھایا۔ کیونکہ اُن کے دلوں کو اردو ڈراما کی پامالی تکلیف دینے لگی۔ اُنہوں نے دبی زبان سے شکوے اور شکایتیں شروع کیں۔ عوام کو وہ تھیٹروں کا چہیتا سمجھتے تھے۔ اُنکو چھیڑنا اور اُن سے جنگ مول لینا اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ انہیں زبان و ادب کا پاس تھا۔ مگر اسٹیج اور اداکاری سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اُنہوں نے اردو ڈراما کی اصلاح کی طرف بحیثیت فن کار قدم نہ بڑھایا۔ انہیں اسکا خیال نہ آیا کہ اسٹیج کی اصلاح کے بغیر اردو ڈراما ترقی نہیں کر سکتا کیونکہ اردو ڈراما تھیٹر کی پیداوار ہے۔ جدید اردو ڈراما نگاری کا پیشرو بھی وہی شخص ہے جس کو محمد حسین آزاد کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اُس نے اردو نثر و نظم کو قدیم طرز سے علیحدہ کر کے جدید روش پر لا ڈالا تھا۔ اُس نے شیکسپیئر کے ڈراما میکبتھ (Macbeth) کا اردو ترجمہ کیا۔ اور "ڈراما اکبر" لکھنے کی کوشش کی مگر جنون نے قلم چھین لیا۔ فنی اعتبار سے یہ دونوں ڈرامے قابلِ قدر نہ سہی مگر میکبتھ کا جتنا ترجمہ شائع ہوا اور جتنا حصہ "ڈراما اکبر" کا آزاد نے لکھا وہ زبان اور طرزِ بیان کے لحاظ سے بہت بلند پایہ ہے۔ دورِ جدید کے ڈراما نگاروں میں منشی احمد علی شوق قدوائی ہیں جنہوں نے اردو ڈراما کی شاعری کے خلاف جہاد کرنے کی کوشش کی۔ اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور میکفرسن لوسی اور قاسم و زہرہ لکھ کر اردو ڈراما نگاروں کے سامنے ایک نادر نمونہ پیش کیا۔ اردو کے مشہور ناول نگار مولانا عبدالحلیم شرر نے بھی اردو ڈراما کی بے راہ روی دیکھ کر "شہید وفا" اور "میوہ تلخ" کے نام سے دو ڈرامے لکھے۔ اس کے بعد طرزِ جدید کے بہت سے علمبردار پیدا ہو گئے۔ کشن چند زیبا نے زخمی پنجاب، منشی مراد علی نے "البرٹ بل" لالہ گوبند سہائے

ایم۔ اے نے "بربھانڈ" حکیم اظہر دہلوی نے بیداری، احمد حسین خاں ایڈیٹر شباب نے حسن کا بازار اور حکیم احمد شجاع نے "باپ کا گناہ" بھارت کا لال، آخری فرعون، اور جانباز وغیرہ ڈرامے لکھے۔ مگر ان سب کے ڈراموں میں زبان اور انداز بیان کی اصلاح و ترقی مدنظر رکھی گئی ہے۔ انہوں نے ڈرامہ کے فنی پہلوؤں کو قطعی نظرانداز کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ اردو ڈرامہ کی ترقی معرضِ التوا میں پڑی رہی۔ ہاں کار عہدِ حاضر کے ڈرامانگاروں نے یہ سمجھ لیا کہ اگر اردو ڈرامہ کی فنی خوبیوں کو اجاگر کر کے اسٹیج کی اصلاح نہ کی گئی تو اردو ڈرامہ کبھی صحیح معنوں میں ترقی نہیں کر سکتا۔ عہدِ حاضر کے ایک مشہورِ آفاق ڈرامانگار اشتیاق حسین صاحب قریشی ڈرامہ کے فنی پہلو پر غور کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں۔

"میرا عقیدہ ہے کہ ڈرامہ کو زندگی کی صحیح تصویر پیش کرنی چاہئے اور اگر کوئی مافوق العادت ضرورت درپیش نہ ہو تو اسے ایسا ہونا چاہئے کہ تمثیل کے وقت ناظرین یہ محسوس کریں کہ وہ اسی دنیا کے واقعات کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اس کے برخلاف ہمارے موجودہ ڈرامے لباس، ماحول اور ہر دوسرے اعتبار سے فضا کو زیادہ سے زیادہ مصنوعی اور غیر فطری بنانے میں سبقت لیجانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

ڈرامہ کا پلاٹ زیادہ پیچیدہ نہ ہو تاکہ مصنف کو زندگی کے متعلق اپنے عقائد بیان کرنے کا موقعہ ملے یا کم از کم وہ محض واقعات کی آندھی کے بجائے پُرسکون زندگی کی صحیح تصویر پیش کر سکے۔ ایسے واقعات جو اسٹیج پر تمثیل ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے ڈرامہ میں پیش نہیں ہونے چاہئیں۔

ہمارے ملک میں ڈرامہ کے تنزل کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے ڈرامے بہت طویل ہوتے ہیں اور ان پر بہت وقت صرف ہوتا ہے تعلیم یافتہ حضرات بالعموم مشغول زندگی بسر کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ تھیٹروں کو بیکاروں کا مشغلہ سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں یہی سبب ہے کہ ہمارے تھیٹروں پر جہلا کی حکومت ہے۔ میں ڈرامہ کی ترقی کو قومی ترقی کا ایک اہم جزو تصور کرتا ہوں اور اس کا قومی اخلاق و عادات، خیالات و محسوسات پر جو اثر ہوتا ہے اس کے اعتبار سے اس کا مدعی ہوں کہ ڈرامہ سے قوم کی بڑی خدمت ہو سکتی ہے۔ لہٰذا میں ضروری خیال کرتا ہوں کہ ڈرامہ کو اس بیچارگی کے عالم سے نجات دلائی جائے اور اس راستہ میں پہلا قدم یہ ہو سکتا ہے کہ ڈرامہ کو چھوٹا کیا جائے۔ طویل ڈرامہ فی الحقیقت بہت سے غیر ضروری اجزا پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہمارے ڈراموں میں اکثر دو غیر مربوط ڈراموں کے مجموعے ہوتے ہیں جن میں سے ایک اصلی ڈرامہ ہوتا ہے اور دوسرا کامک ہوتا ہے۔ یہ کامک اس قدر ضروری تصور کیا جاتا ہے کہ خواہ اصلی ڈرامہ کا افسانہ کتنا ہی المناک کیوں نہ ہو۔ کامک کا ہونا اس میں ضروری ہوتا ہے۔ دوسرا جزو گانے کا ہے جن کا ایسا بے محل استعمال ہوتا ہے کہ ذوقِ سلیم اس پر ماتم کرتا ہے۔ اگر ڈرامہ کو ان زوائد سے پاک کر دیا جائے تو بہت سا وقت بچ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے یہاں سین اس کثرت سے ہوتے ہیں کہ یا تو ان کو مناسب سامان کے ساتھ پیش کرنا ممکن نہیں یا پھر وہ صحیح فضا پیدا نہیں ہو سکتی۔"

مذکورہ بالا اقتباس یہ بتا رہا ہے کہ جدید اردو ڈرامانگاری میں فنی اصلاح کا بہت خیال رکھا گیا ہے۔ جہاں بیش بہا اردو ڈرامے تصنیف کئے جا رہے ہیں، وہاں غیر زبانوں کے ڈرامے بھی اردو میں ترجمہ کر کے اس کے ڈرامائی سرمایہ میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ شیکسپیر کے ڈراموں کو خاص طور پر اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ سمبلین، کامیڈی آف ایررز، مرچنٹ آف وینس، ایز یو لائک اٹ، ہیملٹ، ونٹرز ٹیل، رومیو جولیٹ، اوتھیلو، انٹنی کلوپٹرا، ہنری ہشتم وغیرہ علی الترتیب ظلم ناروا، بھول بھلیاں، دل فروش، پسند خاطر، خداداد، مرید شک، گلنار فیروز، شہید وفا، زن مرید، تسخیر فرانس کے نام سے ترجمہ کئے گئے۔ ان کے علاوہ گولڈ سمتھ، شریڈن، الگزینڈر ڈوما، مولیئر، اوسکر وائلڈ کے ڈرامے شی اسٹوپس ٹو کانکر، شلر، پیریڈ دی شاد۔ آف نیلس کے علی الترتیب تسخیر، محبوبہ جرمن، خونِ جگر، مسلمہ اور سالومی کے نام سے ترجمہ کئے گئے۔ اسی طرح دیگر کئی مصنفین کے ڈراموں کو اردو کا جامہ پہنایا گیا۔ دورِ جدید کے تمام اردو ڈراموں کو ہم دو حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جن میں موضوع کی دلچسپی، ڈرامائی تاثرات، پلاٹ کی ترتیب اور [illegible] پر زورِ قلم صرف کیا جا رہا ہے۔ مگر وہ اسٹیج پر پیش نہیں کئے جا سکتے۔ اور دوسرے وہ ہیں جن کو فنی خوبیوں کے لحاظ سے مکمل کیا گیا ہے اور جو اسٹیج پر بآسانی پیش کئے جا سکتے ہیں مگر ادبی ڈراموں کی تعداد تمثیلی ڈراموں سے زیادہ ہے۔ دورِ جدید کا اردو ڈرامہ انگریزی ڈراموں کے دورِ جدید سے بہت کچھ مطابقت رکھتا ہے جس طرح آج اردو ڈرامہ ادبی [illegible] پیش کیا جا رہا ہے بالکل اسی طرح انیسویں صدی کے [illegible] صدی کی ابتدا میں انگریزی زبان میں [illegible] خیالی اور مثالی

تھے اور کچھ ایسے تھے جن میں زندگی کی حقیقت اور اصلیت پر توجہ دی گئی ہے۔ ابتدا میں کردار نگاری کے بجائے تمثیل پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ حامیانِ زبانِ انگریزی سیرت نگاری اور کردار نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔ براؤننگ اس گروہ کا سردار ہے اس کے یہاں "غیر متوقع مواقع" پر بہت زیادہ زور صرف کیا جاتا ہے مگر اس طرح نہیں کہ وہ بالکل غیر فطری معلوم ہونے لگیں یا قاری اور ناظر کو یہ محسوس ہونے لگے۔ کہ وہ عمداً خاص واقعات کے سلسلہ میں پیدا کئے گئے ہیں یا محض ایکٹنگ کو زوردار بنانے کے لئے ایسا کیا گیا ہے۔ بلکہ وہ کرداروں کی ڈرامائی کھینچ تان کی وجہ سے خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان میں زمان و مکان کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے اور اتحاد و اثرات اتحادِ عمل اور اتحادِ زمان و مکاں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ کردار میں بھی مواقع کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے اس سے قبل کردار جس صورت میں ابتدا سے پیش کئے جاتے تھے اختتام تک انہیں خصوصیات کے حامل رہتے تھے غرض "مواقع" پر پورے ڈرامے کی خوبیوں کا انحصار ہوتا تھا۔ براؤننگ اتحادِ واقع اور اتحادِ زمان و مکاں کے اثرات کے تحت میں اپنے کرداروں کو مجبور کر دیتا ہے اور وہ اُن ہی کے اثرات میں عمل پیرا نظر آتے ہیں۔ مگر اُس کے دوسرے ساتھی اور معصر میٹر لنک کے یہاں نہ تو مواقع پر توجہ دی جاتی ہے اور نہ کردار نگاری پر اور نہ عمل کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے وہ "کردار" کو ہمیشہ فطری حالت میں پیش کرتا ہے۔ اُس کے کردار کی جو عادتیں ہوتی ہیں وہ مواقع کے ماتحت نہیں ہوتیں۔ واقعات اُن کو تبدیل نہیں کر سکتے ماحول کا اُن پر کوئی جادو نہیں چلتا وہ ابتدائے ڈراما میں جن خصوصیات کو لیکر آتے ہیں۔ آخر تک ان ہی پر قائم رہتے ہیں۔ وہ اپنی خصوصیات کے ساتھ اپنی جگہ پر اٹل اُن کا مزاج، اُن کی طبیعت اُن کا طرز اور طور طریقہ سب کچھ اپنی جگہ پر اٹل واقعات ڈراما زمان و مکان اور اتحادِ عمل سب کچھ ان کے ماتحت تمام تبدیلیوں کے باوجود اُس کے کردار میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ وہ ہم کو مافوق العادت نظر آتے ہیں۔ مگر دوسرے گروہ کا سردار ابسن ہے جس کے کردار دنیاوی معلوم ہوتے ہیں وہ ہماری طرح گوشت اور پوست کے انسان ہیں۔ اُن میں زندگی کے نمایاں آثار نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی حیات کے لئے تگ و دو کرتے ہیں وہ اپنے ماحول کی بدولت کشمکشِ حیات میں پھنسے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ [illegible] مسلسل کشمکش رہتے ہیں۔ جو اُن کی حرکات و سکنات کا نتیجہ [illegible] معمولی باتیں ان کے لئے اہم ہوتی

ہیں کیونکہ ان کی زندگی کی بقا کا سوال انہیں میں پوشیدہ ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ ابسن ڈراما نگاری کو حقیقت کی طرف لے آیا ہے۔ اُس نے خیال کے بجائے "حقیقت" اور "اصلیت" کو اپنے ڈراموں کا موضوع قرار دیا۔ وہ صرف انسان ہی کی فطری باتوں کی مصوری نہیں کرتا۔ بلکہ قدرت کی ہر بات بغیر کسی تصنع اور بناوٹ کے پیش کرتا ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جس نے ابسن کو عہدِ جدید میں غیر فانی شہرت کا مالک بنا دیا ہے۔ اس کی یکہ و تنہا ذات ایسی ہے جس نے اپنے زمانے اور وقت کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اپنے ملک اور اپنے برادرانِ وطن کی تمام تر خصوصیات کو من و عن بیان کیا۔ مگر نقاد جب ابسن کے ڈراموں پر تنقید کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اس کے ڈرامے زندگی کے مسائل سے پُر ہیں۔ وہ زندگی کی تنگ و دو میں گھرا ہوا نظر آتا ہے۔ ابسن کے متعلق لوگوں کا یہ خیال بھی ہے کہ اُس کے ڈرامے محض ادبی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا اسٹیج کرنا دشوار ہے۔ حالانکہ ڈراما اور اسٹیج میں ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ ڈرامے کے موجدوں نے ڈراما کو اسٹیج پر پیش کرنے کا یہ مدعا قرار دیا ہے کہ ہنسی کھیل اور مذاق کے پردے میں تماشائیوں کے جذبات کو ابھار کر، مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی تعلیم دی جاتے۔ اس طرح اسٹیج ایکٹر اور تماشائی ڈراما کے ضروری اجزا ہیں مگر ابسن کے ڈراموں میں قاری اور ڈراما نگار دو ہی رہ جاتے ہیں۔ ڈرامہ کے نقاد ابسن پر سخت ترین نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دنیا کے تمام تر مشہور ڈرامے محض اسی غرض سے لکھے گئے ہیں ملٹن، شکسپیر، سوفوکلیز کالیداس، بھاؤ بھوتی وغیرہ نے اسٹیج کو پیش نظر رکھ کر ڈرامے لکھے مگر ایک گروہ اور بھی ہے جن کا یہ خیال ہے کہ "ڈراما" "ادبیات" کی ایک اہم صنف ہے جس وقت اس پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو تماشائیوں کے ہجوم، تھیٹر کے عالیشان پردے اس کی بلند پایہ عمارت، مناظر کی دلفریبی، ایکٹروں کے عمل، سنگیت کی ساحرہ نوازی اور رقص و سرود کو بالائے طاق رکھ دینا چاہئے۔ کیونکہ ان سب کا مقصد "نظر فریبی" ہے جو ڈراما کا مقصد اصلی نہیں ہے۔ اس گروہ کے نمایاں افراد سٹرانڈبرگ، کریگ، میٹرلنگ اور ڈاکٹر اسپنگارن وغیرہ ہیں۔

دورِ جدید کے اردو ڈرامہ نگاروں نے زیادہ تر ابسن کی تقلید کی ہے مگر ایک گروہ ایسا بھی ہے جو براؤننگ کے نقشِ قدم پر چلکر اسٹیج کی فنی خوبیوں کے ساتھ ڈرامے لکھ رہا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے ایک ڈراما "زود پشیمان" کے نام سے لکھا جو اسٹیج کے لئے زیادہ موزوں نہیں رہا۔ انہیں خود

اس کی خواہش نہ تھی کہ تھیٹریکل کمپنیاں اس کو اسٹیج کریں۔ وہ ایک ادبی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے اس کے بارے میں لکھا تھا کہ یہ اردو میں ایک نیا ڈرامہ ہے۔ جو ایک فلسفیانہ دماغ والے فاضل و قابل نوجوان کے قلم سے مکمل ہو کر اس پبلک کے سامنے پیش ہوتا ہے جس کا بہت ہی محدود حصہ اس رنگ سے آشنا ہے۔ مولانا عبدالماجد صاحب کی کوششوں کے نزدیک پشیمان ہونے پر پنڈت دتاتریہ کیفی نے وہ ڈرامے لکھے۔ "راج دلاری" اور "مراری دادا" جن کی حیثیت محض ادبی ہے۔ محمد عمر نور الٰہی صاحبان نے ادبی اور تمثیلی دونوں طرح کے ڈرامے لکھے ہیں۔ روحِ سیاست، جانِ ظرافت، ظفر کی موت، قزاق، تین ٹوپیاں، قابلِ قدر ڈرامے ہیں جو زیادہ تر یا تو ترجمہ ہیں یا کسی غیر زبان کے ڈرامے سے ماخوذ ہیں۔

اس دور کے دیگر بلند پایہ ڈرامانگار ڈاکٹر عابد حسین، اشتیاق حسین قریشی، امتیاز علی تاج، عبدالغفار مدہولی، شاہد احمد دہلوی، فضل الرحمٰن، انصار ناصری، ادیس احمد ادیب، محمد مجیب، فضل حق قریشی، سالک بٹالوی وغیرہ ہیں۔ مگر ان میں سے ہر ایک کے صرف دو سے چند ڈرامے شائع ہوئے ہیں کسی نے دو ایک ڈرامے لکھے ہیں اور کسی نے کچھ ترجمے کر دیئے ہیں۔ ڈاکٹر عابد حسین کا ڈراما "پردۂ غفلت" ادبی اور تمثیلی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اسکولوں اور کالجوں کے اسٹیج پر متعدد مقامات پر پیش کیا جا چکا ہے۔ اور جامعہ اردو آگرہ کے نصاب امتحان ادیب میں بھی داخل ہے۔ "شریر لڑکا" بھی آپ ہی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے اشتیاق حسین قریشی کے ڈرامے "معلم اسود" "گناہ کی دیوار" "ہمزاد" "نقشِ آخر" اور "نیم شب" بہت مشہور رہیں۔ اُن میں اصلاح معاشرت کو مدِ نظر رکھا گیا ہے اُن میں نیم شب اسٹیج کی فنی خوبیوں سے مالا مال ہے۔ امتیاز علی تاج کے مشہور ڈرامے "انارکلی" سے کون واقف نہیں۔ مگر اس میں اسٹیج کی کوئی خوبی نہیں پھر بھی وہ ایک زبردست ادبی کارنامہ ہے۔ عبدالغفار مدہولی بچّوں کے لئے مفید ڈرامے لکھتے ہیں۔ "بچوں کا انصاف" "اسکول کی زندگی" "قوم پرست طالبِ علم" اُن کے مطمحِ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی، محمد فضل الرحمٰن اور انصار ناصری کے مشہور ترجمے "نرگس و جمال" "ظاہر و باطن" "نئی روشنی" اور "سلمیٰ" بہت مشہور رہیں۔ ادیس احمد ادیب نے دو تاریخی ڈرامے لکھے ایک "پرتھال" اور دوسرا "اعتراف"۔ پہلا محض ادبی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرا تمثیلی اور ادبی دونوں۔ پروفیسر مجیب کا ڈراما "کھیتی"، فضل حق قریشی کا "تعلیم زدہ بیوی" وغیرہ مشہور ڈرامے ہیں۔ مگر اُن میں ادبیت زیادہ ہے۔

یہ ہے اردو زبان و ادب کی جدید اردو ڈرامانگاری۔ چند افراد کہیں کہیں اور کبھی کبھی دو ایک ڈرامے لکھ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ انہیں ابسن کی طرح اسٹیج سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا۔ محض ادبی شان اپنے ڈراموں میں دیکھنا چاہتے ہیں یعنی دورِ جدید میں اردو ڈرامانگاری کا جنازہ نکل گیا اور کیوں نہ نکلتا۔ جبکہ اردو ڈرامانگاری کیساتھ روزِ اول ہی سے غیر جانب داری برتی گئی۔ جنہوں نے اس کا ساتھ دیا اُنہوں نے اسے اپنی آمدنی کا ذریعہ بنا لیا بہ ضرب المثل کہ مرے کو ماریں شاہ مدار، اردو ڈراما کیلئے بالکل صحیح ہے۔ اول تو اسٹیج کیلئے بلند پایہ ڈرامے لکھے ہی نہیں گئے کیونکہ اردو کے شعراء و ادباء نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اور جب اُنہوں نے اردو ڈراما کو سراہنا شروع کیا تو تھیٹریکل کمپنیوں کا وجود ہی ختم ہو گیا۔ عوام کے مذاق کو تبدیل کرنے میں وقت ضرور ہوتی مگر ایک وقت ایسا ضرور آتا کہ وہ ادیبوں کے ڈراموں ہی کو اسٹیج پر دیکھتے اور سر دھنتے۔ مگر فلم کی ابتدا گویا اردو ڈراما اور اسٹیج دونوں کے لئے موت کا پیغام تھی۔ متحرک تصاویر اور پھر صدا بندی نے ایسا رنگ جمایا کہ اردو ڈراما و رار دو اسٹیج کا خاتمہ ہی ہو گیا۔ وہ تمام دقتیں جو اسٹیج سے متعلق تھیں باقی نہیں رہیں۔ کم وقت کم خرچ۔ آنکھوں کی ضیافت کا سامان، کانوں کی تواضع کے لئے گانے اور اداکاری کے بہترین نمونے پیش کئے جانے لگے۔ روزانہ نئی نئی داستانیں فلمائی جانے لگیں۔ سرمایہ داروں نے اس سیلابِ عظیم کو بڑھتا دیکھ کر اردو کے ڈراما ہال سینما ہال میں منتقل کر دیئے اردو ڈراما کے لئے تھیٹر ہال کی اب گنجائش نہیں رہی۔ صرف امیچور کلب اور اسکولوں اور کالجوں کے تھیٹر ہال باقی رہ گئے ہیں۔ جہاں کبھی کبھی طلباء طریفیت مل جل کر کوئی ڈراما اسٹیج کر لیتے ہیں۔ مگر یہ جمودی کیفیت اردو ڈراما کی موت کا اعلان ہے فلموں کے لئے جو ڈرامے لکھے جاتے ہیں۔ ان کا اسلوبِ تحریر بالکل دوسرا ہے۔ اُن میں افسانے کی شان ہوتی ہے نہ کہ ڈراما کی۔ ایک شخص قصہ تیار کرتا ہے۔ دوسرا اُس کے مکالمے لکھتا ہے اور تیسرا گانے بھرتا ہے۔ اور چوتھا شخص سینیریو لکھتا ہے اور ڈائرکٹر فلمی ڈراما کی تیاری میں ہدایات دیتا ہے۔ ڈیزائنر نئے نئے ڈیزائن تیار کرتا ہے۔ فوٹوگرافر فلم کی شوٹنگ کرتا ہے۔ اداکار اداکاری کے نمونے پیش کرتے ہیں۔ مدوِن ایڈیٹنگ روم میں اس کی تدوین کرتا ہے تقسیم کنندگان فلم ملک کے ایک خاص حصے میں

اُس کی تقسیم کرتے ہیں۔ تب وہ نمائش کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

ابھی اردو ڈراما اس فلمی ضرب کاری کی وجہ سے نیم بسمل ہی تھا کہ اُس پر ریڈیو کی روز افزوں ترقی نے ایک اور ضرب کاری لگائی۔ وہ حضرات جو ادبی اور تمثیلی ڈرامے فلموں کی ابتدا کے بعد بھی لکھ رہے تھے۔ ریڈیائی ڈرامے لکھ کر آواز کے شیدائیوں کو خوش کرنے لگے۔ امتیاز علی تاج، عشرت رحمانی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، فضل حق قریشی، انصار ناصری، شاہد احمد، اویس احمد ادیب، سعادت حسن منٹو، شوکت تھانوی وغیرہ نے ریڈیائی ڈرامے اور فیچر لکھنا شروع کر دیئے ہیں۔ جو میرے نزدیک ادبی تمثیلی ڈراموں سے زیادہ آسان ہیں۔ ان میں زمان و مکاں کا خیال خاص طور پر رکھنا پڑتا ہے۔ کرداری ارتقا مفقود ہوتا ہے۔ سب کردار خود بخود ایک خاص مقصد کے ساتھ ایک ہی جگہ آ جاتے ہیں۔ ساز اور مختلف آوازوں کے ذریعے سے اتحادی اثر پیدا کیا جاتا ہے۔ میرا یہ مقصد نہیں کہ ان میں زندگی کے آثار موجود نہیں ہیں اور ضرور ہیں مگر ریڈیائی ڈراموں کے رواج سے ادبی اور تمثیلی ڈراما نگار بھی ختم ہو گئے۔

ہمیں اردو ڈراما کی اس کسمپرسی اور ناگفتہ بہ حالت پر خون کے آنسو بہانے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہمارے پیش نظر انگریزی اسٹیج بھی ہے جس کی ایک عرصے تک یہی زبوں حالی رہی مگر ابسن نے رسمیات، روایات اور تکلفات کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اُس نے خود کلامی کو خیرباد کہا۔ دلفریب بصری مناظر کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ سادہ اور روزمرہ کی گفتگو سے وہ جذبات کو متاثر کرتا ہے۔ اسی طرح اُس نے بھی اپنی گردن سے تھیٹر یا اسٹیج کے قدیم روایات کے طوق کو اتار پھینکا۔ موضوع اور اسلوب دونوں میں آزادانہ طرز اختیار کیا۔ دوسرے ممالک کے ڈراما نگاروں نے بھی اس کی تقلید کی اور عصری مسائل اور روزمرہ کے معاملات پر بحث شروع کر دی۔ تھیٹر پہلے ناسمجھ اور جاہلوں کے آنے کی جگہ تھی مگر اب وہ تعلیم یافتہ طبقہ سے متعلق ہو گیا۔ وہ اسٹیج کو فسانہ وہ شاندار تھیٹر بکل ہال نہیں جس میں شاندار رنگین پردے ہوتے بلکہ وہ ایک ایسا گول کمرہ ہو گیا تھا جس کی چوتھی دیوار غائب تھی۔ اور اداکار اس بے تکلفی اور آزادی سے بات چیت کرتے جیسے گھروں میں بیٹھے ہیں برنارڈ شا ابسن کے اثرات کا اعتراف اس طرح کرتا ہے۔

"ابسن کا جو زبردست اثر انگلستان پر پڑا وہ تین عظیم الشان انقلابوں، چھ خطرناک صلیبی جنگوں، دو زبردست بیرونی حملوں اور ایک قیامت خیز بھونچال سے بھی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔"

ہر ملک کے ڈراما نگار اس بادی ڈراما کے پیرو ہو گئے۔ ولیم آرچر، برنارڈ شا، گالز ورِدی، اگرینڈ، ائل بارکر وغیرہ نے اس کی تقلید کی۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم بھی اپنے ڈراموں کو ابسن کے انداز پر لکھنا شروع کریں اور اپنے اسٹیج کو اسی طرز پر دوبارہ استوار کریں جس کی سادگی کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ اور ایسے وقت میں جبکہ ہماری دنیا کے ڈراما کو فلمی دنیا اور ریڈیائی دنیا والوں نے لوٹ لیا اور ہمارے پاس اسٹیج اور ڈراما نگار دونوں میں سے کسی ایک کو بھی نہ چھوڑا۔ آیئے دیکھیں کہ کون کون سے ممالک میں اس کی عادی تحریکیں شروع ہوئیں۔ فرانس میں لبری تھیٹر (Libre. Theatre) جرمنی میں فری بوں انگلستان میں ریپرٹری تھیٹر (Repertory Theatre) اور ماسکو میں کیمرنی تھیٹر اس مقصد کیلئے کھولے گئے۔ انہوں نے رفتہ رفتہ ایک منظم تحریک کی صورت اختیار کی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اُن کے طرز کے سینکڑوں تھیٹر کھل گئے۔ ان جدید طرز کے تھیٹروں میں نظر فریبی اور فریب دہی کے کام بالکل نہیں پائے جاتے۔ پردے اور تیز رنگ کے لباس بالکل استعمال نہیں ہوتے۔ اُن میں تیاری کے وقت صرف orolly Acton یعنی اتحاد عمل کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یہ جدید تھیٹر جدت کا پہلو لئے ہوتے ہے۔ اُن میں روشنی سے وہ تمام کام لئے جاتے ہیں۔ جو پہلے پردوں سے لئے جاتے تھے۔ پہلے جو بلب اسٹیج کے سامنے اداکاروں کی طرف رخ کر کے لگائے جاتے تھے وہ اب اسٹیج پر اوپر کی گیلری میں لٹکائے جاتے ہیں جو مختلف زاویوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ اُن کے علاوہ اسٹیج کے مختلف حصوں میں بھی بلب لگائے جاتے ہیں۔ اُن کے آگے رنگین شیشے ہوتے ہیں جیسی قسم کی روشنی درکار ہوتی ہے۔ ان شیشوں کے ذریعہ سے حاصل کی جاتی ہے روشنی کے ذریعہ ہی سے رات کا سین تیار کیا جاتا ہے اور روشنی ہی کے ذریعہ سے دن پیش کیا جاتا ہے۔ روشنی ہی سے بہار اور خزاں دکھائے جاتے ہیں۔ اس روشنی کا انتظام ایک ماہر فن کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ تھیٹر بھی بہت لمبا نہیں ہوتا۔ اسٹیج گھومنے والا ہوتا ہے۔ وہ اسٹیج کے سین بدلنے میں بڑی تیزی سے کام ... لایا جاتا ہے ...

فن میں کامل ہوتے ہیں۔ ابتدا میں ان لوگوں کو ناکامیابی ہوئی مگر رفتہ رفتہ انہوں نے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں گھر کر ہی لیا اور اُن کو پہلے سے زیادہ ہردلعزیزی حاصل ہوگئی۔

کیا ہندوستان میں اس قسم کے جدید تھیٹر قائم نہیں کئے جا سکتے۔ پروفیسر محمد حسین ادیب نے اپنے ایک مضمون میں تحریر کیا تھا کہ ہندوستان میں تھیٹر دوبارہ زندہ نہیں ہوسکتا مگر میرا خیال ہے کہ وہ زندہ ہوسکتا ہے۔ اور وہ صرف اسی صورت میں کہ غیر ممالک کے ریپرٹری تھیٹر، ماسکو تھیٹر، بدی تھیٹر اور فری پول تھیٹر کی خصوصیات کا بغور مطالعہ کیا جائے اور اُن کو اپنی ضروریات اور ماحول کے مطابق تبدیل کر لیا جائے۔ پہلے بمبئی، کلکتہ، دہلی اور لاہور جیسے بڑے بڑے شہروں میں ان کو قائم کیا جائے۔ رفتہ رفتہ وہ خود ہی ملک کے طول و عرض پر چھا جائیں گے مگر صرف اسی صورت میں جبکہ :-

(۱) ملک کے رؤسا اور امراء اس طرف توجہ دیں۔ اردو کی سرپرستی کریں زرِ کثیر صرف کر کے ڈرامے لکھوائیں اور اپنی نگرانی میں ایسے تھیٹر تیار کرائیں

(۲) ڈراما کی ترقی کے لئے بڑی بڑی انجمنیں قائم کی جائیں جن میں ملک کی مایہ ناز ہستیاں شامل ہوں وہ والیانِ ریاست سے مناسب انداز اور پیرایہ میں امداد طلب کریں۔ یہ اپیل یکہ و تنہا انسان کی نہ ہونی چاہیئے۔ بلکہ اجتماعی ہونی چاہیئے۔

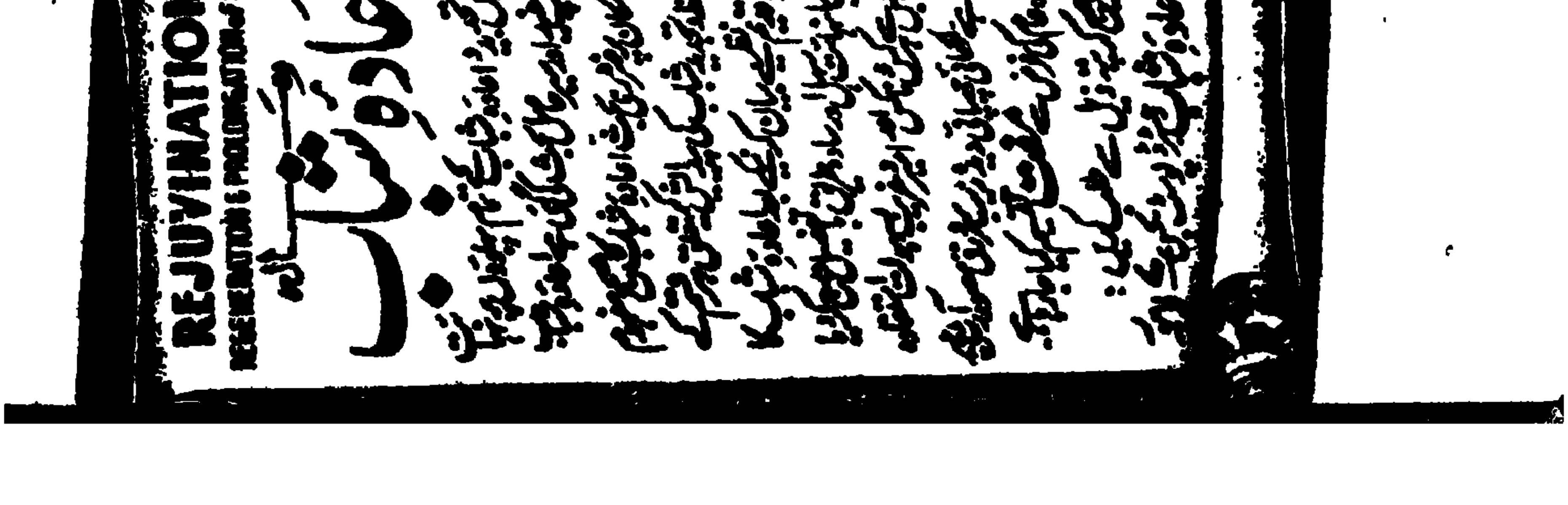
(۳) ڈراما کی اسٹیج کلبیں ایک خاص تنظیم کے ماتحت کام کریں۔ اگر انجمن ترقی اردو اس تنظیم کو اپنے ہاتھ میں لے تو ملک کے منتشر کلب ایک نظام کے ماتحت کام کرنے لگیں۔

(۴) محکمہ تعلیمات اگر اس طرف توجہ دے تو سب سے بہتر ہو ہر اسکول اور کالج میں ڈرامیٹک کلب قائم کیے جائیں اور تعلیم کا بیشتر حصہ ڈراموں کے ذریعہ سے دیا جائے اس کے لئے اسکولوں اور کالجوں کو ایک خاص امدادی رقم علیحدہ ملنی چاہیئے۔

ہمارے برادرانِ وطن کی ذہنیت بہت کچھ تبدیل ہوگئی ہے وہ خود سمجھنے لگے ہیں کہ ڈراما اب ڈوم ڈھاریوں کے ہاتھوں میں نہیں رہا۔ وہ اس کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اس میں خود بھی حصہ لیں گے اور دوسروں کو بھی مجبور کریں گے۔ اس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ ہندوستان کے رسائل اور اخبارات اب ایک ایک ایکٹ کے ڈرامے ڈراموں پر مضمون اور تنقیدیں شائع کرنے لگے ہیں۔ ورنہ ایک وقت وہ تھا کہ ہندوستان کے کسی رسالے میں ڈرامے کا نام بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔

اگر یہ شہادتیں ہمارے لئے کافی نہیں ہیں تو ہمیں خود ہندوستانی ڈراما کی تاریخ دیکھ لینا چاہیئے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ بدھ مذہب کے پیشوا ڈراما کو انتہائی حقارت آمیز نظروں سے دیکھتے تھے مگر انہوں نے اپنی غلطی سے آگاہ ہو کر ڈراما کو تبلیغ کا ذریعہ بنایا۔ گوتم بدھ کے حالات خانقاہوں میں ڈراما کے رنگ میں پیش کرنا شروع کئے ان کی شہادت آج بھی ایجنٹا کے غاروں کی تراشیدہ تصویروں سے ملتی ہے۔ بدھ مذہب کے زوال کے بعد جب برہمنوں کا ستارۂ اقبال چمکا تو انہوں نے بھی ڈراما ہی کو اپنی قوت کا باعث سمجھا۔ کیا آج ہم ڈراما سے وہ کام نہیں لے سکتے۔ جو گوتم بدھ کے پیرو اور برہمنوں نے لیا تھا۔ اگر اس طرف جلد توجہ نہ کی گئی تو اردو ڈراما اور اردو اسٹیج ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ اور مجھے اقبال کی زبان میں کہنے کی اجازت دیجئے کہ ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں



یوسف ظفر

اِنکار

حُسنِ معصوم مجھے کانپتی نظروں سے نہ دیکھ
جرمِ مجبوری نہیں لائقِ تعزیر ابھی
تُو جنہیں دیکھ نہیں سکتی، وہی زنجیریں
جھنجھناتی ہیں پسِ پردۂ تصویر ابھی
تُو مری مرگِ مسلسل میں گرفتار نہیں
تُو کہاں جان سکے گی مری مجبوری کو
تجھ کو پہلو میں لئے دیکھ رہا ہوں شعلے
جو ہوا دیتے ہیں سینے میں غمِ دوری کو
یہ ترا جامِ محبت مری قسمت میں کہاں
کہ میں اِس جام میں اک شعلۂ تر دیکھتا ہوں
جس کی نمناک لپک بادہ گلرنگ نہیں
میں اِسی جام میں انجامِ بشر دیکھتا ہوں

بٹتے بٹتے یہ قبیلے، یہ گھرانے، یہ فرد
رنگ اور خون کی دیواریں اٹھی ہیں کیا کیا
مذہب و ملت و اقوام و عقاید، توبہ
ایک انسان پہ تلواریں اٹھی ہیں کیا کیا
یہ مگر خواب محبت ہی کی تعبیریں ہیں،
تو جنہیں جان، نہ پہچان سکے وہ چہرے ــــ
بربریت کی، ستمگاری کی چنگیزیت
جھانک کر دیکھتی رہتی ہے اِسی پردے سے
یہ زر و مال کی تقسیم پہ مذہب کی سند
خطِ توریث پہ یہ مہرِ روایاتِ قدیم
یہ خداداد حکومت ــــ یہ محبت کے ثبوت
یہ تخیل مری نظروں میں ہے مفلوج و سقیم

(۲)

نسلِ آدم کسی وحدت پہ کبھی تھی مرکوز
آج تفریط کے محور پہ زمیں گھومتی ہے
آج ہر قوم کو اپنے سے نہیں بیگانے
ماں کسی غیر کے بچے کو کہاں چومتی ہے

(۳)

خشک ساحل پہ کوئی ناؤ نہیں چل سکتی
ریت کے کھیت سے گلزار کی امید نہ رکھ
میں نے مانا کہ بہت پختہ ہیں تیرے جذبات
اپنے جذبات کو معیارِ تمدن پہ پرکھ

تیری تسکین کا ساماں مرے آنسو بھی نہیں
اور میری شبِ حسرت کی سحر تو بھی نہیں

علی عبّاس حسینی

مُصنّف

اسکولوں، کالجوں، کچہریوں میں چھٹی تھی۔ مصنّف کے پاس اپنے پیشہ کا کوئی کام نہ تھا اور اسے کئی دن سے کوئی نئی کتاب پڑھنے کو نہ ملی تھی۔ متعدد ایڈیٹروں کے تقاضے بھی اس کے ذمے تھے۔ خود اس کی بھی طبیعت کچھ لکھنے کو چاہتی تھی، پلاٹ پر پلاٹ ذہن میں چلے آ رہے تھے۔ تخیل زوروں پر تھا، نئی تشبیہوں اور نوبہ نو استعاروں کا دماغ پر نزول جاری تھا۔ لیکن وہ جب بھی قلم اُٹھاتا تا ہندوستانی عیال دار زندگی کا جنجال اور اطمینانِ قلب کا عدم اُسے تصنیف و تخلیق سے باز رکھتا۔ وہ تین دن تو صبر کرتا رہا، لیکن آخر جام چھلک گیا، اس کی کنپٹیوں میں دھمک سی ہونے لگی۔ آنکھوں کے ڈھیلے نہ جانے کیا کیا دیکھتے دیکھتے کس گئے اور اُسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کوئی اُس کے منہ پر اس طرح ہاتھ رکھے ہوئے ہے کہ اس کا دم گھٹا جا رہا ہے۔

اُس نے بالآخر ایک دن ذرا سا موقع پاتے ہی کاغذ کے چند ٹکڑے اُٹھائے، پنسل لی اور اس کھرّے تخت کی طرف چلا۔ جو گھر کے اس کونے میں رکھا تھا۔ جو پھٹے پرانے لحافوں، ٹوٹے پھوٹے پلنگوں، تین ٹانگ کی کرسیوں اور بچوں کی توڑی ہوئی چیزوں کے لئے مخصوص تھا۔ اُس نے کاغذ کے انہیں ٹکڑوں سے جنہیں وہ اپنے ہاتھ میں لئے تھا، تخت پر سے تھوڑی سی گرد جھاڑی اور بیٹھ کر لکھنا شروع کر دیا۔

"شہزادی شب خوابی کا لباس زیب بر کئے اپنی مخملی گدّوں والی مسہری پر لیٹی ہوئی تھی۔ اُس نے سکوت اور تخلیہ سے اکتا کر جماہی لی۔ وہ پروں کے نرم تکیوں میں اپنی داہنی کہنی گڑا کر ایک کروٹ ہو گئی۔ اس نے اپنے "دستِ سیمیں" پر اپنا وہ سر رکھ لیا جس کے "جعدِ بلند" کی صید افگنی اور جس کے "مشکیں کمند" کا تطاول ایک عالمگیر فریاد کا باعث بنا ہوا تھا۔ مسہری کے نرم نرم مخملی گدّوں پر۔۔۔"

تخت کے تختوں کے درمیانی جوف نے مصنف کی پنڈلیوں میں اپنے دانت اتنی سختی سے گڑائے کہ اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ وہ غیر ارادی طور پر بائیں ہاتھ سے اس جگہ کو سہلاتا رہا۔ جہاں تختوں کا داغ تھا۔ اُس نے ایک جھجکتی ہوئی نظر اس نہر پر ڈالی جو ملکی ہیزم نے اُس کے جسم پر ہندوستانی مصنف ہونے کی سند میں لگائی تھی۔ وہ ذرا طنز سے مسکرایا اور پھر لکھنے لگا:۔

"شہزادی کی مرمریں ساق بالکل ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے سبزۂ بیگانہ پر ہاتھی دانت کی سڈول جوڑی رکھی ہو یا دھان کے ہرے ہرے نرم پودوں کے فرش پر کیلے کے تنے کا اندرونی موسلا چھلا ہوا پڑا ہو۔۔۔"

دفعتہً مچھروں کا ایک پرا گردہ مصنّف کی تخئیل کی داد دیتا ہوا آ پہنچا اور اس کے کانوں اور اس کی گردن پر بیٹھ کر اس طرح چٹخارے لے لیکر تعریفیں کرنے لگا کہ وہ گھبرا سا گیا۔ اُس نے جلدی سے پنسل پھینکی اور ہاتھوں سے دفاع اور کاغذ کے ٹکڑوں سے پنکھے کا کام لیا۔ جب جا کر یہ بن بلائے مہمان ٹرّاتے کوستے کاٹتے تشریف لے گئے۔

مصنّف نے زخمی حصّوں کو کھجا کر پھر لکھنا شروع کیا:۔

"شہزادی کی آنکھیں بالکل اس طرح کی تھیں۔ مخمور اور نیم وا تھیں، جیسی چغتائی کی بنائی ہوئی تصویروں میں دکھائی دیتی ہیں اور اس کے ہاتھوں کی انگلیاں اس اسکول کے برعکس، اس طرح کی تھیں جیسی ٹیگور خاندان کی تصویروں میں پائی جاتی ہیں۔ اُس کے نازک چھوٹے اور خوبصورت پاؤں ہندوستان کی مشہور دیویوں کی طرح بالکل کنول کے پھول جیسے تھے۔۔۔"

دفعتہً مصنف کے تخت کے سامنے سے مہترانی اپنے جھبّے سمیت گزری۔ اس کے مخالف کی خوشبو نے مصنف کو چونکا دیا۔ اُس نے جلدی سے قمیص کے دامن سے ناک بند کی اور چونکہ قسمت کا آدمی ہونے کی وجہ سے بجائے مہترانی کے چہرے کے اُس کے پاؤں کی طرف نظر کی مرد کے پاؤں کی قلع تھی۔

کالے بکھرے ہوئے اور جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے! مصنف نے کانپ کر آنکھیں بند کر لیں۔ دل نے کہا: مہترانی اور رانی کے پاؤں میں فرق ہونا ہی چاہیے!"
عقل نے "کیوں؟ کس لئے؟ کس وجہ سے؟ کیا دونوں بنت حوا نہیں؟" کے سے سوالات کی بارش شروع کر دی۔ مصنف پریشان ہو گیا۔ خیالی دنیا و دماں کی میٹھی سہانی فضا سے حقیقت کی تلخ اور کڑوی فضا میں اس قدر جلد منتقل ہونے نے اُسے بوکھلا دیا۔ اُس کی حالت بالکل اس چور کی سی تھی۔ جو کوئی قیمتی چیز لے کر بھاگے اور اس وقت اچانک گرفتار کر لیا جائے جب وہ اپنے کو تمام خطروں سے محفوظ سمجھنے لگا ہو!

اُس نے پوری قوت ارادی سے کام لیکر منتشر توجہ کو پھر اکٹھا کیا اور لکھنا شروع کر دیا۔

"وہ حور نقا اس طویل دو لیفن مسہری میں اور اس نرم مخملی گدے پر اس طرح لیٹی تھی جیسے نایاب موتیوں کی ایک لڑی کسی سرحدی عورت کے چوڑے چکلے سینے پر پڑی ہو . . . ."

کمرے کے کواڑ تڑاق سے کھلے اور دھڑاک سے بند ہوئے۔ مصنف نے نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے اُس کی مہارانی کھڑی تھیں۔ بال اُلجھے ہوئے، چہرے پر کثرت بچہ کشی کی وجہ سے جھریوں کے بیسیوں نکڑ سینے ہوئے ہاتھوں میں آٹا آٹا ہوا۔ دوپٹے کا آنچل جادو بکشی کے فرائض ادا کرتا ہوا۔ جان پڑا کسی نے سہانے خواب سے جگانے کے لئے فاختہ اڑا دی۔ اس نے تکلیف سے مسکرا کر پوچھا۔

"آپ کیسے تشریف لائیں؟"

انہوں نے اپنے سر پر اس طرح ہاتھ پھیرا کہ سیاہ بال ٹانگے سے جھڑی معلوم ہونے لگے پھر وہ بولیں۔

"تمہیں گھر کے دھندوں سے کوئی مطلب نہیں بس تم ہو اور تمہاری کتابیں یا جھوٹی بے سر پاؤں کی کہانیاں . . ."

مصنف نے آزردہ ہو کر کہا۔ "تو کوئی کام ہے یا آپ محض نصیحت کرنے تشریف لائی ہیں؟"

وہ ہاتھ بجلی کی طرح جھٹکا کر کڑک کر بولیں "کام؟ کام تو ہزاروں ہیں۔ مگر جو تم سمجھو جب تو! تمہارے نزدیک تو کھانا پکانا، چھ چھ بچوں کا پالنا، بازار سے سودا سلف منگوانا کام ہی نہیں! پھر یہ چھوکرے چھوکریاں ہیں کہ ہر منٹ ہر سکنڈ میں ایک نیا بکھیڑا کھڑا کر دیتے ہیں . . ."

مصنف نے جلدی سے بات کاٹ کر پوچھا "تو اس وقت کیا شرارت کی؟"

وہ کولھوں پر ہاتھ رکھ کر بولیں "شرارت سی شرارت! ایک قیامت بپا کر رکھی ہے۔ اور بات کچھ بھی نہیں۔ چھوٹا ایک ٹین کا ٹکڑا لئے کھیل رہا تھا کہ منجھلا اُسے اچک کر لے بھاگا۔ وہ چیخ چیخ کر جان ہلکان کر رہا تھا کہ میں نے بڑے سے کہا ذرا جا کر اس جھگڑے کو چکا دے۔ اس نے جاتے ہی منجھلے کو ایک دھول رسید کی اور اس سے وہ ٹین کا ٹکڑا چھیننا چاہا۔ منجھلے نے اُسے مضبوط پکڑ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس چھینا جھپٹی میں منجھلے کا ہاتھ کٹ گیا۔ اور اس نے جھنجھلا کر اتنے زور سے بڑے کو دانت کاٹا کہ پوری بوٹی اتار لی۔ میں جب تک چولھے سے پتیلی اتار کر دوڑوں دوڑوں بڑی لپکی ہوئی آئی اور اُس نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی، دونوں نے مل کر اس کو اس طرح دھکیل دیا کہ وہ پکے فرش پر گر پڑی اور اُس کے دانت سے اُس کے ہونٹ کٹ گئے۔ اُس نے جو دھل دھل خون نکلتے دیکھا تو اِس طرح دھاڑیں مار مار کر رونے لگی جیسے اس کی ماں ہی مر گئی ہو . . . ."

مصنف نے اوپرے دل سے جلدی سے کہا "ارے خدا نہ کرے!"

وہ بولیں "ارے قبح کسی کو ایسی زندگی کا ارمان ہوگا جس میں ایک آن سکھ نہیں! ایسی زندگی سے تو مر جانا ہی بہتر ہے!"

کواڑوں سے پھر تڑاق دھڑاک کی آواز آئی اور مہارانی اپنے راج میں واپس تشریف لے گئیں۔ مصنف نے سینے میں گھٹتی ہوئی ایک سانس لی۔ کاغذ کے ٹکڑے تخت کے جوف میں ٹھونسے، پنسل کان کے پیچھے لگائی اور بڑبڑاتا ہوا اٹھا: "چلو ان بچوں کو یہیں لے آؤں، میری آنکھوں کے سامنے رہیں گے تو شاید اس طرح شرارت نہ کریں گے!"

وہ بھی آئے۔ بڑا، منجھلا، چھوٹا، بڑی، منجھلی، چھوٹی، ہر ایک بچہ بسورتا ہوا! ہر ایک مصنف کے متعلق خاص اسی کے اور صرف اسی کے باپ ہونے

کالاکالا ہوا اور ہر ایک رونے دھونے میں بھی ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونے کے لئے تیار۔ مصنف نے پانچ سال سے اوپر والوں کو نصیحت کی، پانچ سے نیچے والوں کو مٹھائی اور ٹوٹے پھوٹے کھلونے دیئے، ایک ٹھنڈی سانس لی، پیشانی سے پسینہ پونچھا، کمرے سے کمرے تخت پر بیٹھ کر جوت سے کاغذ نکالا، کان میں کُھنسی ہوئی پنسل ہاتھ میں لی اور افسانے کی کڑیاں یوں جوڑیں۔

"کمرے کی معطر فضا، اس کی ملاوٹ آرائش، اس کی دیواروں کے نقش و نگار اور اس میں ایک زریں مسہری پہ اُس ماہ چہار دہم کا لیٹا ہونا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی پری قاف کی چوٹی سے اتر آئی ہے، یا سورج کی کوئی کرن ہے جو ایک لکہ ابر پر سوار ہے، یا کسی شاعر کی سیمابی تخیل ہے جس نے بدمستی و جوانی کا روپ بھر لیا ہے ۔۔۔"

مصنف کی رانی نے چولھے سے آواز دی "ارے بڑے! او بڑے! ادھر تو آ! تو اوہاں جا کے یا بالکے ناتو سے لگ کے بیٹھ رہا، کتنی دیر سے کہہ رہی ہوں کہ پیسے کی پیاز باز دے لا دے، مگر تو ہے کہ سنتا ہی نہیں، کام چور!

مصنف نے بڑے کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھا، اُس نے سہم کر دروازے کی طرف قدم بڑھائے، باورچی خانے سے آواز آئی "موئے تجھ سے آیا نہیں جاتا، اپاہج، نمک حرام!"

مصنف کا جسم اس طرح کانپنے لگا جیسے خزاں کے جھونکوں میں درختوں کی زرد پتیاں کانپتی ہیں، جی چاہتا تھا گلا پھاڑ کر چیخے کہیں نکل جائے، لیکن وہ خون کا گھونٹ پی گیا، اُس نے لبوں پر مہر لگائی اور لکھنے لگا۔

"ان سب پر بالا سکوت، خاموشی اور تنہائی، اس طرح کا سکوت جو صدہا ریاضتوں اور ہزاروں تپسیاؤں کے بعد نصیب ہوتا ہے، ایسا سکوت جس میں ابدی خوشی کے راز مضمر ہیں! ایسا سکوت جو ہمالیہ کی چوٹی پر ہی بیٹھ کر حاصل ہوتا ہے! ایسا سکوت ۔۔۔"

چھوٹے نے منجھلے کا کھلونا چھینا، اس نے بھی طمانچہ کھینچ مارا، اُس نے اُس کے سر کے بال کھینچ لئے، اُس نے اس کے ہاتھ میں دانت گڑا دیئے، بس "چیں" "ہیں" "ٹیں"، طرح طرح کے منہ بنے اور طرح طرح کی آوازیں حلق سے نکلنا شروع ہو گئیں، مصنف کاغذ اور پنسل پھینک کر جلدی سے ننگے پاؤں دوڑا، اب دونوں کی ایک چیخ اوپر ہے، ایک نیچے۔ منجھلا کہتا ہے۔

"چھوٹے نے ہمارے دانت کاٹا!"

چھوٹا کہتا ہے "تو اس نے ہم کو مالا!"

مصنف نے چھوٹے کو گود میں اُٹھا کر تخت پر بٹھا دیا اور منجھلے کا ہاتھ سہلا سہلا کر پیار کر کے چپ کرایا، جب اس کی سسکیاں بند ہوئیں اور مصنف تخت کی طرف پلٹا تو وہاں "اگر پدر نتواند پسر تمام کند" کے مقولہ پر چھوٹا بسورت عمل پیرا نظر آیا، اُس نے باپ کی پنسل اٹھائی تھی اور سپید کاغذ پر حضرت موسیٰ کے خط میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ مصنف نے جھپٹ کر پنسل ہاتھ سے چھینی، پھر قیامت آگئی۔ ڈھائی برس کا بچہ بالک ہٹ پر اُتر آیا، اُس نے پوری قوت سے چیخ کر رونا شروع کر دیا۔

مصنف ایک بار بڑی کی طرف مڑ کر گرجا۔

"لے جا اس پاجی کو یہاں سے! لے جا نہیں تو مار ہی ڈالوں گا!"

اُس نے مچھلی کی طرح پھڑکتے بچے کو کسی طرح کولھے پر لادا، چھوٹی بہن کی انگلی پکڑی اور جلدی سے کمرے سے نکل گئی۔ دوسرے بچے بھی مار کھائے کتے کی طرح دبے پاؤں وہاں سے چل دیئے۔ فضا پر آہستہ آہستہ سکوت سا چھانے لگا۔ مصنف نے کاغذ کے پرزے اکٹھا کئے، پنسل اُٹھائی اور لکھنا چاہا۔۔۔

نیچے سڑک پر بہت سے لوگوں کے چلنے کی آہٹ سنائی دی۔ پھر ایک شور سا اُٹھا "رام نام ست ہے! رام نام ست ہے!" مصنف نے دونوں ہاتھوں سے سر کے بال نوچ لئے۔ پھر اُس نے "نا تمام جملہ" ایک زہرخند کے ساتھ یوں ختم کیا۔

"ایسا سکوت جو چتا پر جلنے اور قبر میں دفن ہونے کے بعد ہی نصیب ہو سکتا ہے!"

قرۃ العین حیدر

خوابوں کے محل

اور جب وہ کار سے اُتر کر میری طرف نظر کئے بغیر رومال سے ناک پونچھتا ہوا برآمدے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گذشتہ رات کالج کی اسٹیج پر اس کے ساتھ آسٹرین ڈچس کے لباس میں رقص کرتی ہوئی ایملی شاید میرا مذاق اُڑا رہی تھی۔ "بچپنے چھوٹے سے رومان کا رو پہلا محل تو میں نے بنایا ہے۔ تم اس میں داخل ہونا کیسے چاہتی ہو۔ کیسے ہو سکتی ہو۔ ہا ہا ہا یہ تو صرف میرے لئے ہے" اور میرے کانوں میں اس کے سُریلے قہقہے کی آواز گونج کر رہ گئی۔

ثریا دریچے میں کھڑی للی کے پھولوں کو گلدان میں سجا رہی تھی۔ مجھے کمرے میں آتا دیکھ کر اس نے اپنا آٹوگراف البم میری طرف پھینک دیا۔

"میں کیا کروں اس کا؟"

"دیکھو۔ اس کے دستخط ہیں اس میں۔ ڈرامہ ختم ہونے سے قبل گرین روم میں جاکر میں نے لے لئے تھے اُس سے۔"

"تو آخر یہ مجھے اس خصوصیت سے کیوں دکھایا جا رہا ہے بھئی" مجھے واقعی غصہ آگیا۔

ثریا نے گلدان ایک طرف رکھ کر سیٹی بجاتے ہوئے پھر کہا "رومانٹک ــــ حد سے زیادہ لیکن وہ پوڈر بھی لگاتا ہے۔"

"ہرگز نہیں لگاتا پوڈر۔ واہ" میں فوراً اس کی طرفداری پر آمادہ ہوگئی۔

"بالکل لگاتا ہے۔ میں نے خود اس کی سنگار میز پر میکس فیکٹر پاوڈر اور پونڈس کریم رکھی دیکھی ہے۔"

"آخر تم اس قدر دلچسپی اور انہماک سے اس کا ذکر کیوں کر رہی ہو" میں نے جل کر کہا۔

"وہ اتنا خوبصورت جو ہے۔ خوابناک آنکھیں اور نقرئی آواز ــــ! ہا ہا ہا۔ فطعی خطرناک بات ہے" ثریا بہت صاف گو لڑکی ہے۔ دریچے میں بیٹھ کر ٹانگیں ہلاتے ہوئے وہ پھر بولی "اس وقت تو وہ خالہ جان سے نہایت سعادتمندی کے ساتھ کوئلے کی گرانی اور نوکروں کی قلت کے مسئلے پر گفتگو کر رہا ہے۔ پرسوں بھی تو آیا تھا۔"

"کون آیا تھا پرسوں بھی؟" ریاض بھیا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ذہل در معقولات کی۔

"درزی" ثریا نے اطمینان سے جواب دیا اور للی کے پھولوں کو نئے سرے سے سجانے لگی۔ ریاض بھیا تپائی پر جھک کر چارٹ بنا رہے تھے۔ اور ثریا نہایت معصومیت سے ان کے لئے سنگترہ چھیل رہی تھی۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ ریاض بھیا اور ثریا دونوں کو چاہ دانی میں ڈبو دوں اور پھر ڈرائنگ روم کی روشنیاں گُل کر کے کشنوں میں منہ چھپا کر خوب روؤں۔

خالہ جان کے کمرے میں سے باتوں، قہقہوں اور چھینکوں کی آوازیں آنی بند ہو گئی تھیں۔ ریاض بھیا اور ثریا دریچے میں سے باہر باغ میں کود کر شاید ٹینس کھیلنے کے لئے جا چکے تھے۔ ریڈیو میں چارلس جوڈا کا آرکیسٹرا تیزی سے بج رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور تصور میں جوڑے بالوں والی آسٹرین ڈچس پھر آ کر کھڑی ہوگئی جو رقص کرتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی "میرے چھوٹے سے رومان کا رو پہلی محل ــــ

ــــ سرو کے درختوں سے ڈھکی چھوٹی پہاڑی کی چوٹی پر بنا ہوا سُرخ برجیوں اور اونچے اونچے کنگوروں والا محل جس میں خوابوں کی شہزادیاں رہتی ہیں۔

پچھلے ہفتے وہ اپنے کالج کے ڈرامے کے ٹکٹ بیچنے کے لئے ہمارے یہاں آیا۔ ریاض بھیا نے میرے اور ثریا کے لئے دس دس روپے کے ٹکٹ خرید کر اپنی فیاضی کا ثبوت دیا اور اسے بڑے زور سے چھینک آگئی۔ اس نے ثریا کی طرف مڑ کر کہا "VEPEX ہوگا آپ کے پاس؟" اور میں نے طے کر لیا کہ میں اسے اپنے اس سرخ برجیوں والے قلعے میں قطعی نہ گھسنے دوں گی۔ اسی دن شام کو "پکیڈلی" میں پھر اس سے ٹکر ہوگئی۔ اس کے ساتھ اس کے دوستوں کے علاوہ ایک لڑکی بھی تھی ــــ "یہ میری دوست مس ایملی آرکڈیل ــــ اور یہ ــ یہ ــ مس ــ مس ــــ" اس بے نیازی سے اس نے میرا تعارف کروایا۔ گویا میرے بیکار سے نام کو یاد کرنے کے لئے اسے اپنے دماغ پر زور دینے کی ضرورت پڑ رہی تھی۔ اور وہ فضول سی اینگلو انڈین لڑکی جسے پنک لگا کر سائیکل پر کناٹ پلیس کے چکر لگانے کے سوا اور کوئی کام نہیں ہنس ہنس کر میری طرف سے ٹکٹ خریدنے کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔

لیکن اگلے دن اس نے مجھے فون کیا کہ ہمارے لئے آگے کی بہترین نشستیں اس نے خاص طور پر ریزرو کروالی ہیں اور کافی دیر تک وہ ادھر ادھر کی بے معنی باتیں کرتا رہا۔ اور رو پہلے محل کے ایوان پھر جگمگا اٹھے۔ خانہ بدوشوں کے کاروان کی موسیقی سے

کمرا اور صندلکے میں چھپی ہوئی وادیاں گونجنے لگیں۔ اونچے اونچے کنگوروں والے چاکلیٹ کی رنگت کے محلے کی شہزادی نے بربطِ پر اپنے پسندیدہ نغمے گنگنانا شروع کر دیئے۔

میں نے ریڈیو کی آواز مدھم کر کے پھر آنکھیں بند کر لیں ـــــ لیکن اگر اس کہانیوں کی سرزمین اس رنگین بوسیماپہ کوئی بھورے بالوں والی آسٹرین ڈچس اپنا قبضہ کر لے تو۔؟ ـــــ جگمگاتے ہوئے بال روم میں بلوری میز پہ جھکا بیٹھا جیسے کوئی آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ آپ کے آٹوگراف البم میں کیا لکھوں ـــ ؟ ان سیاہ آنکھوں کا خیال مجھے کھوئے ہوئے خوابوں کی وادی میں پہنچا دیتا ہے۔ جہاں رائن کے پانیوں میں اترتے ہوئے زرد چاند کی کرنیں ان چمکدار پگڈنڈیوں پر پڑتی ہیں جو سرسبز پہاڑیوں اور شاہ بلوط کے گھنے جنگلوں میں سے گذرتی ہوئی خوابوں کے سُرخ برجیوں والے قلعے تک باقی ہیں ـــــ!

لیکن نہیں ـــــ اس نے تو کہا تھا۔ یہ ہیں میری دوست مس ایملی آرکڈیل۔ آپ ہمارے کالج کے ڈرامے میں ضرور تشریف لائیے گا۔ ہم دونوں کو بہت خوشی ہوگی "ہم دونوں" ـــــ خوابوں کے سر فلک قلعے پر جیسے کسی نے بمباری کر دی۔

"ابھی وہ تو فلرٹ (FLIRT) ہے بالکل۔ چاہے جس سے پوچھ لو۔ ایملی کے کالج میں آنے سے پہلے امرجیت اس کے ساتھ گھومتی رہتی تھی۔ اب دیکھ لینا اگر ایملی کہیں چلی گئی تو سلطانہ کا نمبر آ جائے گا۔" ثریا کہہ رہی تھی ـــــ میں چڑ کر رہ گئی۔ بھئی اگر وہ فلرٹ ہے تو میں کیا کروں۔ آخر ثریا اس قدر باقاعدگی سے اس کی ریسرچ کیوں کر رہی ہے۔ لاحول ولا۔ میں نے مستقل مزاجی سے طے کر لیا ان رو پہلے محلات کو سجانے کا کام اگلے سال پر اٹھا رکھوں گی۔ کیونکہ سالانہ امتحانات بہت قریب آ گئے تھے ـــــ

کافی دن گذر گئے۔ ایک شام میں کسی کام کے لئے ڈرائنگ روم میں گئی ثریا بھی سجائی حسبِ معمول دریچے میں بیٹھی انڈین لسنر کے ورق الٹ پلٹ کر شاید کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر چھوٹتے ہی بولی "ایک بڑے مزے کی بات سنو جی۔ پچھلے ہفتے تک تو شاہدہ بھلی چنگی کالج آتی تھی اور اس اتوار کو اس کی شادی ہو رہی ہے۔"

"اچھا؟ بڑی خوشی کی بات ہے۔ کس سے ہو رہی ہے؟" ظاہر ہے مجھے شاہدہ کی شادی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔

"اسی سے ـــــ تم کو اس لئے انہوں نے نہیں بلایا کہ تمہاری پڑھائی میں ہرج ہوگا۔ فائنل ایئر ہے تمہارا ـــــ ہماری تو کار بھی تین دن سے ان کے وہاں منگنی میں گئی ہوئی ہے۔" اور پھر وہ ایسا انداز بنا کر بیٹھ گئی کہ برقی لیمپ کی نیلی روشنی میں اس کے چہرے پر پڑ سکے کیونکہ ریاض بھیا کمرے میں آ چکے تھے۔

کہانی ختم ہو گئی ـــــ لیکن خوابوں کے سرخ برجیوں اور اونچے اونچے کنگوروں والے قلعے کی شہزادی آتش دان کے سامنے بیٹھی شاید اب بھی کسی شہزادے کا انتظار کر رہی ہے۔

ضیا جالندھری

تجدید

اور اک صبح نمودار ہوئی
چشمِ غم دیدہ کی تاریک نگاہی نہ گئی
پلکیں اٹھیں تو نگاہوں کی جھپک میں سائے
دفعتاً جیسے کسی خواب سے بیدار ہوئے
ایسی بیداری جو خود خوابِ گراں ہو جائے
زیست پھر برسرِ پیکار ہوئی

خشک ہونٹوں پہ تبسم آیا
حلقہ در حلقہ اٹھیں سازِ الم کی موجیں ---
جاگتی لہروں کی انگڑائیاں بنتا ہوا راگ
راگ وہ راگ جسے ولولے دہراتے ہیں
کوئی کہتا ہے کہ اب خوابِ شبِ تار سے جاگ
دیکھ موجوں میں تلاطم آیا

شبنم آلود شگوفے پھوٹے
دھڑکنیں دل کی کہے جاتی ہیں دل بس میں نہیں
آرزو ایک نئے درد کا آغاز تو ہے
زندہ رہنے کیلئے کوئی سہارا تو ہوا
دکھ سے بھرپور سہی مست مدھر ساز تو ہے
اب نہ رات آئے نہ افسوں ٹوٹے

خلیق ابراہیم

مے باقی

آج بھی لعلِ مئے ناب میں جاں باقی ہے
آج بھی وسعتِ رندانِ جہاں باقی ہے
ناشنیدہ ہے ابھی نغمۂ شیرینِ حیات
زمزمہ سنجیٔ صد آہ و فغاں باقی ہے
نودمیدہ ہے ابھی غنچۂ رنگینِ حیات
پھول بننے کو ابھی ایک جہاں باقی ہے
ناتراشیدہ ہے انساں کی فطرت لیکن
سنگِ خارا میں ابھی رقصِ بتاں باقی ہے
ہیں حقائق ابھی رنگینیٔ اوہام میں گم
ابھی وہموں پہ حقائق کا گماں باقی ہے
آدمیت ہے سرِ راہ تڑپتی ہوئی لاش
لیکن اس لاش میں اکسیرِ جناں باقی ہے
جس دھندلکے سے ہے ہر صبحِ صداقت کی نمود
وہ دھندلکا سا سرِ آبِ رواں باقی ہے
تارے شرمائے ہوا جھینپ گئی رات ہنسی
ابھی ان آنکھوں میں اس شب کا سماں باقی ہے
آسمانوں سے ٹپکتے ہوئے لمحوں میں ابھی
ایک ہنگاموں سے پُر دورِ زماں باقی ہے
بجھ چکی نبضِ محبت مگر اس پر بھی خلیق
ایک جنبش سی قریبِ رگِ جاں باقی ہے

سرفیق علی خاں

تندرستی

اس کی کوٹھڑی کے سامنے والی نالی صاف ہو چکی تھی۔

آج نالی کو صاف دیکھ کر اُسے سب کچھ نیا نیا سا معلوم ہو رہا تھا۔ نالی کی گندگی اس کی زندگی کا جزو بن چکی تھی۔ اس کی آنکھیں اس تبدیلی کی متلاشی تھیں جس کی وہ عادی ہو چکی تھیں۔ اس لئے اپنے ہونٹوں پر ایک عجیب قسم کا بوجھ محسوس کیا۔ اس نشہ آور تساہل کو مٹانے کے لئے پپوٹوں کو کئی مرتبہ گھمایا۔ اُس کی طبیعت کسی صورت میں بھی اس تبدیلی کو قبول کرنے پر تیار نہ تھی۔

بجلی کے کھمبے کے پاس بھنگیوں کا جمعدار بھنگیوں کو بڑی تیزی سے گالیاں دے رہا تھا۔ ان کے بھوکے پیٹ ان موٹی موٹی گالیوں کو ہضم کر رہے تھے۔ کبھی کبھار کسی کے ماتھے پر بل آجاتا جیسے اُسے زبردستی کسٹر آئیل پلایا جا رہا ہو مگر جمعدار کی زبان میں اس قدر روانی تھی گویا وہ ان گالیوں ہی کی تنخواہ پاتا ہے۔

جمعدار کی مغلظات سن کر غیر ارادی طور پر رمبھا کے منہ سے "بے حیا" نکل گیا اور فوراً ہی اس کی نگاہیں شعلے کے اندر رینگتی ہوئی جوں کے تعاقب میں تیرنے لگیں مگر وہ ایک نئی گالی سن کر چونک سی پڑی، اُسے محسوس ہُوا جیسے جمعدار کی گالی نے اُسے ننگا کر دیا ہے۔

گلی میں ایک جمگھٹا سا لگا تھا میونسپلٹی کی لاریوں کی پوں پوں سن کر بچے بوڑھے سب باہر نکل آئے تھے، پہیوں کی سرسراہٹ نے اُن کی خاموش زندگی میں ایک خاص طرح کی کسمساہٹ بھر دی تھی، مگر رامو حلوائی اپنی مخصوص جمعیتِ قلب کے ساتھ کہہ رہا تھا کہ آئندہ الیکشن میں چیئرمین صاحب اسمبلی کے اُمیدوار ہیں۔ آج کل وہ ہر شخص کی بات بہت خندہ پیشانی سے سنتے ہیں، منگلو کو دس روپیہ کی نوکری آج ہی دلوائی ہے اُس نے بھی اپنے محلے کے ایک ایک ووٹ کا پکا وعدہ کیا ہے کلو کو سڑا ہوا گوشت بیچنے کی اجازت مل گئی ہے۔ اُس کی یہی تمنا تھی کہ چیئرمین صاحب ہمیشہ کسی نہ کسی الیکشن میں اُمیدوار رہا کریں ـــــ صفائی، نالیوں کی صفائی، یہ سب کے لئے ایک انوکھی بات تھی، بچے، بوڑھے، جوان، سب کی پھیکی پھیکی آنکھوں میں ایک ایسا استعجاب چھپا ہُوا تھا جس نے صفائی جیسے معمولی واقعہ کو نمائش بنا رکھا تھا بہت سی نوجوان چھوکریوں کو مجمع میں دیکھ کر رمبھا کے منہ سے کئی بے ترتیب کوسنے نکل گئے، وہ چاہتی تھی کہ ان چھوکریوں ہی میں سے کوئی جمعدار کے منہ میں نالی کی تھوڑی سی گندگی جھونک دے، مگر وہ سب تو اس کی گالیوں پر پلّو سے منہ چھپا چھپا کر کھی کھی کر رہی تھیں، وہ اس طرح شرما رہی تھیں گویا جمعدار کی گالیاں سننے کی اور زیادہ مشتاق ہیں،

یکایک رمبھا کا ہاتھ ایک موٹے سے بانس پر جا پڑا ـــــ اور ایک گندی سی گالی اُس کے پپڑی جمے خشک ہونٹوں پر تھرک کر رہ گئی۔

بیلیتہ آفیسر اسی جم غفیر میں کئی سفید سفید مرگھلی چھوکریوں کو تاک رہا تھا۔ مانتا، بلقیس، اور رجنی نے اُسے متوجہ دیکھ کر تو جان بوجھ کر ڈھلکا دئے تھے تاکہ وہ اپنے حسن کو نمایاں کر سکیں، رمبھا کے دل میں رقابت کی آگ بھڑک اٹھی۔ وہ من ہی من نوجوان افسر کی بدذوقی کی مذمت کر رہی تھی۔ اسی ذہنی کرب کی حالت میں اس نے اپنے بھرے بھرے بازوؤں پر کئی اچٹتی ہوئی سی نظریں ڈالیں، اور اپنے موٹے موٹے بھدّے کولھوں کو ادھر سے اُدھر پھینک دیا۔

پچھلے چند دنوں سے اس کی کوٹھڑی کے سامنے والا بجلی کا کھمبا اس کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا تھا۔ شام ہوتے ہی بجلی کا گول گول بلب رمبھا کا منہ چڑانے لگتا۔ وہ بلب ایک ایسا سنتری تھا جسے رمبھا کچھ بھی رشوت نہ دے سکتی تھی۔ رات کی تاریکی میں وہ کچھ کرنا چاہتی تھی تو اس میں یہ بلب بہت رکاوٹ ڈالتا، پچھلے ہفتے کو جب وہ باہر نکل کر روانہ ہونا چاہتی ہی تھی کہ تھوڑی دیر کے لئے رک گئی، اُس کی چاچی نے جو سامنے مکان میں رہتی تھی اُسے دیکھ لیا تھا، چاچی نے اس کا نام لے کر اُسے پکارا بھی مگر وہ ساری دُنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے چلی تھی، اسی گھبراہٹ میں وہ پھر اپنی کوٹھڑی میں گھس آئی؛

"رمبھو تو ابھی گئی نہیں"؟ اُس کی ماں نے اُس کی گھبراہٹ کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں" وہ ہانپتے ہوئے بولی۔

"اری وہ بابو جی انتظار کرتے ہوں گے"

"اونہہ!... آج سردی کتنی ہے ...."

"دو قدم کا تو فاصلہ ہے"

"میرے بدن میں درد ہو رہا ہے"

دونوں کی باتیں سن کر رتو کھبلا اُٹھا اور اُس نے نیم مدہوش حالت میں رمبھا سے مٹھائی کی فرمائش کر دی۔ ماں کے اصرار کے باوجود وہ وہیں لمبی لمبی لیٹ گئی، اس کی سانس بہت تیزی سے چل رہی تھی۔ اس کا سینہ ...

پھر کتنا سا تھا چاچی نے اُسے ضرور پکڑ لیا ہوگا ۔ وہ کئی منٹ تک اسی خود فریبی میں مبتلا رہی مگر پھر اس خیال سے کہ چاچی نے اس کا نام پکارا ربھا کو بالکل مردہ کر دیا چاچی کو کچھ نہ کچھ شک ضرور رہا ہوگا ۔ اُسے چلا جانا چاہئے تھا ' لوٹ کر اس نے خود کو اور مشتبہ بنا لیا۔

کواڑ کی دراز میں سے اس کی تاریک کوٹھری میں بجلی کی روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ بڑی گول گول بلب اس کا منہ چڑا رہا تھا ' اس کا دل مچل سا گیا کہ وہ ایک ڈھیلا لے کر بلب پر ایسا تاک کے مارے کہ اُس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں ۔

ربھا کو وقت نے گندگی میں دھکیل دیا تھا ' مگر اس کی روح آئینہ کی طرح صاف تھی ' خشو کو چٹورپن کی عادت پڑ گئی تھی ' اس کا شوہر مل میں دس روپیہ کا ملازم تھا خشو نے ڈرتے ڈرتے راما سے اپنے جذبات کا اظہار کیا ۔ مگر راما ایک جاہل دیہاتی آدمی تھا اُس نے خشو کی ابھری ابھری ہڈیوں کو دیکھ کر اُسے صاف جواب دے دیا ' مگر جب ربھا کو اس کا علم ہوا تو اُس نے خشو اور راما کو بہت ڈانٹا ' خشو بہت پژمردہ ہو گئی مگر ربھا نے ترس کھا کر اُسے ایک روپیہ دے دیا ــــ وہ خود بھی گندگی کو چھوڑنا چاہتی مگر چھوڑ نہ سکتی ' اُسے تندرستی قائم رکھنا تھی ' اُسے کھانا تھا ' اُسے پیسہ کمانا تھا ' اُسے گندگی کا چسکا سا پڑ گیا تھا ــــ برابر والے مکان میں جب ایک طالب علم کرایہ پر کمرہ لے کر رہا تھا تو وہ اُس دن کس قدر ہشاش تھی ' صبح ہی سے وہ نئے نئے سپنے بنانے لگی بہت دنوں سے اس کا دل پنجی کی خستہ گرم گرم بالوشاہیاں کھانے کو چاہ رہا تھا ۔ اُسے محسوس ہوتا جیسے بالوشاہی کے ذرّے اس کے تالو سے چپکے ہوئے ہیں مگر یہ مجو تھے تو اُسے کوئی چیز بھی اطمینان سے کھانے نہیں دیتے ' جب کوئی چیز کھانے بیٹھتی تو ہیں ہیں کی رٹ لگا کر اُسے اتنا پریشان کر دیتے کہ وہ اُسے نالی میں پھینکنا پڑتی ' مگر پر سوں جب اُترو نالی میں سے بھی امرود اٹھانے لگا تو ربھا نے اس کی خوب مرمت کی ــــ راما کی صورت دیکھتے ہی ربھا نے ایسا محسوس کیا جیسے اُس کے نرم نرم گوشت کے ٹکڑے بالوشاہیوں کی ڈلیوں میں تبدیل ہو گئے ہیں ۔ مگر راما کا مایوس کن جواب سن کر اس نے پہلی مرتبہ شام کی سردی کو محسوس کیا ۔

"تو نے کوشش نہیں کی راما"

"ارے ! وہ تو بڑا نیک چلن ہے ! "

"تو نے بات تو کی ہوتی "

"نہیں ربھو ! "

"تو لیا صاف جواب ......" سوال کا باقی حصّہ اس کی مایوس آنکھوں میں

گم ہو گیا ۔

مگر راما کو اپنی ربھا کا بہت خیال تھا ' وہ اسے چار آنہ کی گرم گرم بالوشاہیاں خرید کر دے گیا ' وہ چاہتا تھا اس کی ربھا صدا تندرست بنی رہے وہ ایک قصائی کی سی دور اندیشی رکھتا تھا جتنا گوشت ہوگا ویسے ہی دام لگیں گے '

ربھا کی خوراک بہت بڑھی ہوئی تھی وہ اتنا کھاتی کہ جس اوقات اُسے خود بھی تعجب ہوتا ' وہ باجرے کی آٹھ موٹی موٹی روٹیاں ہاتھوں ہی باتوں میں کھا گئی ۔ نیا نیا باجرہ چلا تھا اس کی طبیعت بالکل سیر نہ ہوتی ' جو کھٹو ہے پر بیٹھ بیٹھ چینگ چینگ کر باجرے کی روٹی کھا رہا تھا ' وہ کھیل زیادہ رہا تھا کھا کم رہا تھا ۔ وہ چاہتا تھا کہ باجرے کی روٹی کبھی ختم نہ ہو ' ربھا نے جگو کی روٹی چھین کر کھا لی ' ربھا کے گول گول گال بالکل غبارہ ہو رہے تھے ــــ جگو کی ریں ریں جاری تھی اور ربھا کی ہنسی نکلی پڑتی تھی ۔

وہ یونہی ہنستے ہنستے بعد سے چارپائی پر ڈھلک گئی ۔ بانس کی چارپائی کی چرچر بھی اُس کی بے ہنگم ہنسی کا ساتھ دے رہی تھی ۔ اس کی ماں نے کئی مرتبہ اُسے گھور کر دیکھا ' وہ اسی طرح کئی چارپائیاں توڑ چکی تھی ۔ جب اس کی ماں اُسے ڈھائی من کی لاش کہتی تو اس کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا ' وہ سمجھتی گویا اس کی بڑی تعریف ہوتی ' اسی لئے ماں کی خشم آلود نگاہوں کے باوجود ہنسے جا رہی تھی ۔

ربھا کے جسم پر گوشت منڈھا ہوا تھا کہیں سے کہیں کوئی ہڈی بھی دکھائی نہ دیتی ۔ اس کے باوجود وہ بھدی نہ تھی ' راما اسے گبدی کہا کرتا تھا وہ خوشی سے پھولے نہ سماتی ' اُسے راما بہت اچھا لگتا ' اس کی تندرستی کو دیکھ کر بہت سی عورتوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں ' بہت سی حسد کی بنا پر کہتیں کہ وہ حرام کا کھا کر موٹی ہو رہی ہے ' مگر پچھلے چند مہینوں سے اس پر بے تحاشہ گوشت چڑھ گیا تھا ' اسی لئے اس کی ہری راماس کی شلوار کولھوں پر بہت تنگ ہو گئی تھی صبح جب وہ گھڑا اٹھانے لگی تو شلوار کئی جگہ سے مسک گئی ' اس کا کچھ حصّہ در کا سا گندمی رنگ جھلکنے لگا ۔ ربھا کو اس کا قطعی احساس نہ تھا مگر دوسری عورتیں شرم سے گڑی جا رہی تھیں ' اور مردوں کی ٹکٹکی سی لگی ہوئی تھی ۔ موٹاپے کی وجہ سے چلنے میں اس کے کولھے بہت زیادہ متحرک تھے '

رتجو بڑبڑا اپنی توتلی زبان میں اس کو کوس رہا تھا ــــ " ایشور کرے مر جائے ! "

وہ سوچتی رتجو ہے کتنا ناسمجھ ' بچہ ہی تو ہے مگر لمحہ بھر میں اس کے جذبات کئی کروٹیں بدل لیتے ' وہ خود بھی تھوڑی دیر کے لئے بچہ بن جاتی اس کا جی چاہتا کہ رتجو سے لڑنے لگے جیسے وہ اس کا حریف ہی تو ہے ' اگر اس کے بس کی بات ہوتی تو وہ بچوں میں [illegible]

کہ اگر وہ مر گئی تو اُسے دونوں وقت روٹی کون کھلائے گا۔ غریبوں کے بچے گر کھاتے کتنا ہیں! بھیک سے بھی اُن کا دوزخ نہیں بھر سکتا۔

اس کا اندھا باپ بیڑی کا دھواں چھوڑ رہا تھا اور ماں ابال کو روکنے کے لئے دال کی دیگچی پر رکابی رکھ رہی تھی۔

اسی طرح ماں باپ کی طرف نرملا اپنے نفرت بھرے جذبات کے ابھار کو روکتی تو اس کی ماں جان بوجھ کر اُسے بابو لوگوں کی باتیں سناتی۔ نرملا کا دل ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح صاف شفاف تھا جس کی سطح پر محبت کی لہریں کھیلا کرتیں مگر کبھی کبھار ہوا کا کوئی تیز جھونکا پانی کو گدلا کر دیتا اور وہ نفرت سے کھیلنے لگتی۔ نہ باپ کے کان پر جوں رینگتی ہے نہ ماں کے ماتھے پر بل آتا ہے، وہ صرف کمائی کرانے والی اور کھانے والے اتنے،

تڑاخ سے رجّو کے نرم نرم گالوں پر اس کی ماں کا چانٹا پڑا۔ وہ بلبلا اٹھی، وہ یکلخت تمام کوسنے بھول گیا۔ اُس کی ماں نے اطمینان کے سانس لئے جیسے اس کی روزی محفوظ ہو گئی۔ باپ نے بیڑی پھینک دی تھی وہ اب اٹھنے کے لئے لاٹھی ڈھونڈ رہا تھا۔

نرملا نے جب رجّو کی ہتھیلی پر ایک پیسہ رکھ دیا تو وہ اتنا خوش ہو گیا جیسے وہ کبھی رویا ہی نہیں!!

یونہی بہت سے بے ربط خیالات اُس کے دماغ میں رینگ رہے تھے۔ کہ ایک کھٹمل نے اس کی ران میں کاٹ کھایا، وہ دوڑے کو انگلیوں سے آہستہ آہستہ سہلانے لگی، ساتھ ہی اس کی انگلیوں نے گوشت کی زیادتی کو محسوس کیا۔ اُس نے اپنے کولھوں کی گولائی اور موٹاپے کو شدت کے ساتھ محسوس کیا، وہ موٹاپے سے بیزار سی ہو چلی تھی۔ حالانکہ ایک میم کے پیچھے کو نکلے ہوئے کولھے دیکھ کر اُسے اپنے کولھے کے تناسب کا بہت خیال تھا۔ اسی لئے اس نے لیڈی شو پہننا شروع کئے تھے، مگر مالتی کا وہ فقرہ آوارہ عورتوں کی پہچان اُن کے بھاری کولھے ہوتے ہیں اس کے کلیجہ کو بری طرح چھید رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ باقی گوشت چھری سے کاٹ کر پھینک دے، وہ گندگی سے کھیلنا چاہتی تھی مگر یہ نہ چاہتی تھی کہ کوئی دوسرا اس پر گندگی اچھالے،

پچھلے چند ہفتوں سے وہ پریشان پریشان سی رہنے لگی تھی، اس کی زندگی کے تاریک پہلو سے رفتہ رفتہ سب کو آگاہی ہو رہی تھی، بہت سی منہ پھٹ بڑھیوں نے اس کے سامنے اُس کو "حرامزادی" کہا، بہت سی فاقہ زدہ نوجوان لڑکیوں نے اس طرح اُسے "آوارہ" کہا جیسے وہ آوارگی کی تمام لذتیں پہچانے ہوئے ہیں، رات کی تاریکی میں بابو لوگ اس کے جسم سے کھیلتے ہیں اور دن کی روشنی میں دنیا کی زبانیں اس کے جسم کو چھیلتی ہیں، اس روحانی خلفشار اور ذہنی کوفت نے اس کی زندگی کے سکون و جود کو فنا کر دیا تھا

اپنے دل کے کسی ویران کونے میں وہ پاکبازی کا دیا جلانے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔

منگلوار کی رات کو جب اس نے بتاشوں کا دونا اٹھایا تو اس کے ہاتھ کانپنے لگے، اس کے بدن کا ریشہ ریشہ تھرانے لگا۔ وہ بہت تیزی سے مندر کی طرف لپکی۔ وہ بھلا جو کبھی دیوار کے سایہ سے بھی ڈر جایا کرتی تھی آج کتوں کے بھونکنے سے بھی ذرا نہ گھبرائی آج وہ اپنی گندگی پھینکنے جا رہی تھی، اسے پچھلی زندگی کے تمام کریہہ نقوش مٹانا تھے، لیکن مندر کے دروازے کے اندر وہ نہ داخل ہو سکی۔ بڑھی بوڑھیوں سے اُس نے ایک روایت سن رکھی تھی کہ ایک فاحشہ عورت مندر کے دروازے پر جل کر مر گئی تھی، کیا وہ بھی جل جائے گی؟——

وہ ایک لاغر سے بھک منگے کو بتاشے دے کر الٹے پاؤں لوٹ آئی، وہ رونا نہ چاہتی تھی، وہ زندگی سے بری طرح چڑی ہوئی تھی!!

اس وقت وہ چارپائی پر اس طرح اوندھی پڑی ہوئی تھی جیسے اس نے دنیا کو پچھاڑ لیا ہو۔ دس بہت دیر کے بج چکے تھے مگر وہ دھوپ ہی میں لیٹی رہی، سورج کی گرم گرم شعاعیں سوئیوں کی طرح اس کے گوشت میں داخل ہو رہی تھیں۔ کوئی کھٹمل کاٹ لیتا تو اُسے محسوس ہوتا جیسے کسی نے مہین سی چٹکی لے لی، وہ بدن کو اس طرح کھجانے لگتی جیسے اُسے بہت لطف آ رہا ہے، بہت سی عورتیں اُسے گھورتی ہوئی گذر گئیں مگر وہ کوٹوں کے ساتھ اپنے بھونڈے کولھوں کو ادھر سے ادھر گھماتی رہی، بلکہ اس کے تخیل میں تو نئی نئی شوخیاں انگڑائی لینے لگتیں، وہ چاہتی کہ دوبارہ وہ اپنی پھٹی ہوئی ہری راماس کی شلوار پہن لے اور پھٹے ہوئے چیتھڑوں سے اس کے جسم کا عریاں حصہ سب کا منہ چڑائے۔

جب وہ چارپائی پر بیٹھ کر آنکھیں مسلنے لگی تو ان میں پانی بھر آیا مگر مالتی کی آنکھیں تو سچ مچ ڈبڈبائی ہوئی تھیں!

مالتی دو روپیہ مانگنے آئی تھی، مالتی کو دنیا نے پچھاڑ دیا تھا۔ یہی نرملا جس کی وہ برائیاں کیا کرتی تھی آج وہ اسی سے دو روپے مانگنے آئی تھی، وہ ناموس اور خودداری کو دفن کرنا سیکھ رہی تھی، وہ کئی دنوں سے ایک وقت کا فاقہ کر رہی تھی، مالتی بہت ہی حسین تھی، مگر پیٹ کو مارتے مارتے ہڈیاں ابھر آئی تھیں، وہ اس قدر پژمردہ اور مضمحل تھی۔ جیسے برسوں کی بیمار ہے۔ قوم کی تمام بےکسی اور زبوں حالی مالتی کی زندگی میں فریاد کر رہی تھی، —— مالتی کی التجا میں ایک جھجک تھی مگر نرملا کی امداد میں ریا کی تھی اسی لئے غرور کی ایک ہلکی سی شکن نرملا کے ماتھے پر پھیل گئی۔

اُسی دن کی طرح آج بھی جمعدار بھنگیوں کو گالیاں سنا رہا تھا، اس نے ارادہ

فکر تونسوی

نوشئے کہ حرم دارد ز نار نیش بروں آرم

دکھ تو یہ ہے۔ کہ برخود غلط ناخدایان کے لاؤ لشکر بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اپنوں ہی کے تھپن لٹیا ڈبو دیں۔ "تو از بیگانگاں عالم" کی سطروں پڑ "آں آشنا کردئے" کے نوحے کیوں نہ ابھر آئیں؟ ــــ آزاد نظم بھی۔ جو ابھی آٹھ دن کی معصوم۔ اور اس پر پرورش و پرداخت کی یہ مربیانہ جہالتیں۔ بزعم خود لوریاں ہیں جن سے کان بج اٹھتے ہیں پنگوڑے کو وہ وہ اونچے نیچے جھکولے دیئے جاتے ہیں۔ کہ ننھا معصوم چلا چلا اٹھتا ہے۔ پدرانہ شفقتوں کے یہ ڈھب! ؟ ــــ میرے اللہ! اساری ادبی تاریخ چھان ماری ہے مگر بگڑے دل کا یہ انداز نہ کچھ ایسا نیا اور اچھوتا ہے۔ کہ جھینپنے کے سوائے چارہ نہیں رہتا۔

اب عالم یہ ہو رہا ہے کہ برخوردارانِ کرام نہ آگا دیکھتے ہیں نہ پیچھا بنکے چلے جاتے ہیں۔ بےبعاری کے تناؤ میں منہ اٹھائے، بگٹٹ بھاگے جا رہے ہیں۔ کھلے رسنے کی طلسمی ترغیبیں مسلّم! ــــ لیکن مصیبت یہ ہے۔ کہ اپنے کس بل ڈیل ڈول اور بےپروایانہ پہ نظر ہی نہیں جاتی۔ ارے میاں! یہ فن ہے فن جھاڑ جھنکار سے پر کوہ و کمر سے اٹا ہوا دشت نوردی کی دھن ہے، تو یہ گرہ باندھ لو۔ کہ "اس میں کچھ سخت مقام آتے ہیں"۔ فن کی یہ کلعی زلفیں ٹیڑھی کھیر ہیں۔ فن کے جسم کو دیکھتے ہو تو بڑا دلفریب اور خوش رنگ دکھائی دے گا لیکن کبھی فن کی روح میں بھی جھانک کر دیکھا۔ کہ وہاں کو بکنی کا کیا عالم ہے؟ تیشہ وری کا بوتا نہیں ہے۔ تو عشق کی زلفیں جھٹکا کر یہ ناٹک کیوں کھیلا جا رہا ہے؟

ــــ "اسلوب میں نیا پن پیدا ہو رہا ہے، رجحانات بدل رہے ہیں زاویے جدید ہیں" تو بخوشی کریں۔ جو انکار کرے وہ مجرم لیکن بات کہنے کے طور طریقے بھی تو ڈھنگ کے ہوں مصرعوں کے جوڑ توڑ تو کسی ڈھب سے ہوں۔ یہ نہیں کہ جدت کی اچھل پھاند میں فن کی حدیں ہی پھلانگ جاؤ۔ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھو۔ راشد نے کہا۔ خالد بولتا رہا۔ تابش چلایا اور نہیں تو فیض ہی کی سنتے، پھر وہ بیچارا "خدائی خوار" بدنام عالم۔ زمانے بھر کا مجرم "میراجی" بھی تو جی رہا ہے۔ اسے پہچانتے ــــ پھر کئی دوسرے سیانے کھلاڑی ــــ! ڈھب سے سوچا ڈھب سے کھیلا اور اپنی بات منوا گئے۔ ان بھلے پرشوں نے یہ تو نہیں کیا کہ جو زبان مجروح تو مگر ہی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا۔ سنوار سنوار کر زبان استعمال کی۔ نپے تلے مصرعے اور ان کے اصلی ٹھور ٹھکانے جو کہنے کی بات تھی، کہی۔ بانی اچھال پھینکی۔ یہ نہیں۔ کہ آؤ تاؤ دیکھے جا رہے ہیں۔ پھر ان کے کہے میں نئے بھی ہے اور نئے بھی، فن اور خیال کو اس چابکدستی سے ہم پیالہ و ہم نوالہ بنا دیا کہ زبان چٹخارے لے اٹھی، ایسے سر پھرے اور فن کوش مصرعے اگر دول کی یہ ناخلف اولاد! ؟ ــــ چھی چھی چھی! بات کہنے بیٹھیں گے۔ تو الٹوں تلٹوں میں جا بیٹھیں گے فلاں خیال کی اڑان کہاں ختم ہوتی ہے اور فلاں مصرع کس نقطہ سے شروع کیا جائے گا ــــ اس سے ان کے فرشتوں کو بھی واسطہ نہیں۔ اور پھر خیال کی ساخت و ترتیب، اور ساتھ ہی ساتھ مصرعوں کے حسین اور مناسب ٹھکانے، لفظوں کے مزاج اور ان کی اصلی جنبشیں ــــ! ؟ یہ سب کچھ جائے بھاڑ میں۔ شاعری کرنا ہے۔ کریں گے۔ اور بیچ کھیت کریں گے یعنی بیچ کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق ــــ ! :ــــ

ہائے! یہ اجارہ داری! !

اب قافیے سے لاگ رکھیں گے۔ خواہی نخواہی یہ خارش ہو رہی ہے نظم کا حلیہ ناک نقشہ بھلے سے بگڑ جائے مگر قافیے کو دم نہیں مارنے دیں گے۔ یہ جنس غریب آنا چاہے گی۔ تو بھی دور رسید کر کے بھگا دیں گے۔ چاہے اس میں اپنی ہی کلیاں بلبلا اٹھیں۔ راشد اگر کہے :۔

آج پھر "آ" ہی گیا

آج پھر روح پہ وہ "چھا" ہی گیا

تو "آ" اور "چھا" کی بلائیں لیتے پھریں گے ــــ مگر اپنی بات اور ہے "اجی!" قافیہ چٹیاں بن جاتا ہے، اس لئے یہ راستہ آزاد مسافر کے ڈھب کا نہیں۔ یہ آزاد شاہیں اور گھونسلے! وہ ہوا و فضا کا باسی ہے اڑے گا۔ اور جہاں جی چاہے اڑے گا ــــــ پھر قافیے کی اس لاگ میں بھرتے بھی ہیر ہے۔ ایک مصرع "فاعلا" پر ختم ہو رہا ہے تو دوسرا "تن" سے طلوع ہو رہا ہے اور پھر خدا کی مار! یہ طلوع آگے بڑھ کر "فعلا" پر ہی غروب ہو جاتا ہے ــــ یہی نہیں، بلکہ ارکان کے ساتھ ساتھ بےزبان الفاظ پر بھی کترنیاں چلتی ہیں۔ یعنی فرماتے ہیں :۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا

سے چھوٹوں

اور

تو اتو نیلگوں لہروں کے اندر کرنے کے لئے]

اور میں ———
چپکے چپکے دیکھ لینا ——— پتوں کی آڑ سے

خود فرمائیے! "اور میں" اور "سے چھوٹوں" کی علیحدہ نگری دعوت لے بسے گی۔ چاہے یہ لاوارث "معاشی تنگ نظل" میں سکیں مر جائے ——— پھر تاویلیں کی جائیں گی۔ "اور میں" اور "سے چھوٹوں" کی "جدائیت" کو میں سکوں سے برحق ٹھہرا جانے کا یہاں پہلا خیال ختم ہو جاتا ہے یہاں دوسرا شروع ہو جاتا ہے" اور پھر اسی ڈھب کی پہیلی بنا دیں لیکن بھلا! آپ جانیں۔ جو چیز چھوٹ گئی۔ وہ تو چھوٹ ہی گئی۔

اور پھر وہ ابہام کا بکھیڑا! سلجھنے میں ہی نہیں آتا۔ یعنی ابہام کو جو ڈھیل دی گئی تھا عمل سے جا بجا تھا یا نقاب پوشی "آرٹ کی جان" ہے لیکن ایسا بھی کیا کہ نقاب ہی نقاب رہ جائیں؟ اور "جان نقاب" غائب غلہ کر دی جائے! ——— خواہ مخواہ الجھ رہے ہیں "بوجھو تو جانیں" کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ مگر نیوں کے اس طفلانہ کھیل میں بڑے بڑے بیٹھے منہ تک رہے ہیں کہ کہیں "اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ" کا تیر نہ چھوٹ پڑے۔

ارے میاں! ڈھکی چھپی کہنی ہے۔ تو سلیقے سے کہو، مانجھ مانجھ کر نہیں رکھنا چاہتے۔ تو پلستر ہی ایسا شفاف کرو اسو لوس تک پہنے وڑ کی جھلکیاں دکھائی دیں فنکاری اور کسے کہتے ہیں؟ — یہی کہ "ان کہی" کہہ دی جائے۔ مگر کوئی اتنا نہ پرکھ سکے کہ کلا کار نے کونسے منتر سے یہ جادو جگا دیا۔ بن گہنے کے چاند اچھا لگتا ہے۔ لیکن جب گہنا پہنانا ہی ہے۔ تو ایسا پہناؤ۔ کہ چاند پڑا شرمائے۔

ہمیں تو اُن پرانے شعلہ آشاموں پر آتا ہے۔ جو اٹھ گئے اور اپنے پیچھے بے سوز بادہ خوار چھوڑ گئے۔ دھن لٹ رہا ہے۔ اور وہ ہیں کہ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے گم سم صرف تماشائی بن کر رہ گئے ہیں جس جتن سے جوت لگی تھی۔ وہ تو اب رتن ہو کر گراں عنبر ہو گیا۔ اور اگر اب کسی آنکھوں والے نے سدھ بدھ نہ لی۔ تو جو نہ ہونا ہو گا۔ وہ ہو گا۔ باقی سکوں کی جھنکاریں تو ایسی انمیل اور بے تال ہو رہی ہیں کہ ہر چڑھتے دن ان کے ڈوب جانے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ اور کیا عجب ہے کہ اس ہنگامے میں جھوٹا ہوا یہ "نتھا" کبھی جیتا جاگتا س ہو کر رہ جائے۔ اور تاریخ اُردو کا یہ باب "المیہ" کی بین الاقوامی مثال بن جائے

کشمکش

نکہت نسیم بدایونی

میں تجھے بھول گئی یہ بھی نہیں ہے لیکن
میں تجھے یاد بھی ہر وقت نہیں کر سکتی
زندگی کتنی ہمہ گیر ہے کتنی پرشور
صرف اشکوں ہی سے دامن تو نہیں بھر سکتی

کیسے فطرت کے تقاضوں سے کنارا کر لوں
کس طرح تلخیٔ زہراب گوارا کر لوں
زندگی کتنی ہمہ گیر ہے کتنی پُرشور

میں محبت کے تقاضے بھی سمجھتی ہوں مگر
میں حقیقت کے اشارے بھی تو پہچانتی ہوں
میں تری یاد میں خود اپنے سے غافل ہو جاؤں
ماسوا اپنے کسی اور کو بھی جانتی ہوں

زندگی صرف ترانہ ہی ترانہ تو نہیں
کچھ حقیقت بھی ہے یہ محض فسانہ تو نہیں
میں حقیقت کے اشارے بھی تو پہچانتی ہوں

شعر و نغمہ میں گزرتی ہوئی رنگیں راتیں
کون ہوگا جسے نغمات کا احساس نہیں
تلخیٔ غم بھی تو اک ٹھوس حقیقت ہے مگر
کون ہے جس کو حقیقت کا ذرا پاس نہیں

یہ دھڑکتے ہوئے دل اور یہ جھنکتے ہوئے ساز
یہ بہکتے ہوئے نغمات یہ بجتی آواز
کون ہوگا جسے نغمات کا احساس نہیں

زندگی کتنی ہمہ گیر ہے کتنی پُرشور
اور اس شور میں نغموں کی حقیقت کتنی؟
میں تجھے یاد کئے جاؤں یہ ممکن ہے مگر
اس ہمہ گیری میں اک یاد کی فرصت کتنی

کتنے دلچسپ ہیں الفت کے ترانے لیکن
کتنے رنگیں ہیں یہ سادہ سے فسانے لیکن
اس ہمہ گیری میں ان سب کی حقیقت کتنی؟

ابراہیم جلیس

چور

"رانی ــــــ تم سچ مچ کی رانی ہو"

مارواڑی لڑکے نے رانی پر منڈلاتے ہوئے کہا ــــ رانی سچ مچ کی رانی نہیں تھی بلکہ مارواڑی لڑکا نشے میں مدہوش ہو رہا تھا ــ وہ تو ایک کنگال کنواری تھی جس کا رانی کا نام صرف کر اس کے ماں باپ نے اپنے دیس کی روائتی محبت کا ثبوت دیا تھا۔ بڑی پیاری صورت تھی اس کی مگر بھوک کے مارے اس کے گلنار رخسار پیلے پڑ گئے تھے۔ اس کے برف ایسے سپید ہاتھوں پر نیلی نیلی رگیں ابھر آئی تھیں اور مارواڑی لڑکا اپنی سونے اور ہیرے کی انگوٹھیوں میں جگمگاتی انگلیوں سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے ایسی بے ساختگی سے مسکرا رہا تھا جیسے رانی گدگدی بن کر اس کے جسم میں سرائیت کر گئی ہے۔ اگرچہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ رانی کے لبے رس ہونٹوں اور پیلے پیلے رخساروں میں بھوک نے کڑوی گولیوں اور کچے سیبوں کی سی تلخی اور کھٹاس پیدا کر رکھی ہے مگر اس کے ڈیڈ نے اس کے لئے چالیس کنواریوں کی شرط لگا رکھی تھی ــــ اور رانی کا نمبر چالیسواں تھا۔ مارواڑی لڑکے کی خوشی کی انتہا نہ تھی ــ وہ بار بار بنگال کے قحط اور اس کے لانے والوں کو دعائیں دے رہا تھا۔

نڈھال اور نیم جان رانی اونچے محل کی بے شمار سیڑھیاں طے کر کے نیچے آئی تو اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ آسمان سے دھرتی پر اتر آئی ہے ــــ آسمان سے دھرتی ــ دھرتی سے آسمان ــــ زندگی کی یہی تو دو منزلیں ہیں۔ ازل سے لے کر ابد تک ! ــــ انسان مکان و زمان کی قید سے کبھی آزاد بھی ہوگا ــــ ؟ رانی کو دیکھ کر بڈھے ماں باپ اور گیارہ ننھے ننھے بھائی بہنوں نے اسے گھیر لیا۔ باپ نے اپنا لرزتا ہوا جھریوں پڑا ہاتھ اس کے سر پر پھیرتے ہوئے شیر دلو دی ..... شیر دلو اماں نے اپنے میلے آنچل سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اس کی بلائیں لیں ...... بلائیں !

شیر دلو اور بلائیں ــــــ آج سے پہلے جب کبھی اس کے ماں باپ اس کو شیر داد دیتے اور بلائیں لیتے تو اس کے دل میں مور سا ناچنے لگتا تھا ــــ آج اس کے من کا مور مر گیا تھا ــ یوں گم سم ہو گئی تھی جیسے مارواڑی لڑکا کوئی زہریلا ناگ تھا۔ جو اُسے سونگھ کر بے جان کر گیا ہو۔

ایک کان میں اس کا باپ کہہ رہا تھا ــ میری بچی تو بوڑھے والدین کی بڑھاپے کی لڑکی ہے ــــــ دوسرے کان میں اس کی ماں کہہ رہی تھی ــــ میری لاڈلی تو ان گیارہ ننھے ننھے بچوں کی بڑی بہن ہے۔ رانی سوچ رہی تھی کہ وہ بڑی لڑکی اور بڑی بہن کے علاوہ کچھ اور بھی ہے ــــ اس کی آنکھیں خلا میں اپنے منگیتر چندر کو ڈھونڈ رہی تھیں جو کلکتہ یونیورسٹی کا ایک بیروزگار گریجویٹ تھا اور ایک عرصے سے نوکری کی تلاش میں کلکتے گیا ہوا تھا ہر ہفتے وہ رانی کے نام کلکتے سے ایک محبت بھری چٹھی بھیجا کرتا تھا۔ ابھی کل ہی تو اس کی چٹھی آئی تھی کہ وہ بہت جلد رانی سے ملنے آنے والا ہے شاید اگلے بدھ تک ــــ رانی دل ہی دل میں کالی ماتا سے پرارتھنا کرنے لگی کہ اگلے بدھ تک وہ کسی طرح دھرتی سے اٹھ جائے ــــــــ اگلا بدھ طلوع ہی نہ ہو پاتا !

بوڑھے باپ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "چل بیٹی ــ اب چلیں" رانی کا جی چاہا کہ اپنے باپ کا ہاتھ بڑی ذلت سے جھٹک دے مگر نقاہت سے وہ بے بسی کے جال میں پھنسی ہوئی تھی اسی لئے چپ چاپ اپنی ساڑھی کے پلو میں سے ہاتھ بڑھا کر چاندی کے پانچ سکے اپنے باپ کی ہتھیلی میں تھما دیئے ..... اب پورا قافلہ چلنے لگا۔ اس قافلے کی رکی ہوئی زندگیاں چلنے لگیں۔ کیا ناٹک ہوتی ہے چاندی کے سکوں میں !

ابھی یہ قافلہ ایک بجلی کے کھمبے سے دوسرے کھمبے تک بھی نہ گیا ہوگا کہ ایک جانی پہچانی آواز سے وہ رک گیا۔ اس آواز سے رانی کے کانوں کے پردے تھرتھرانے لگے اس کا جسم چوٹی سے ایڑی تک کانپنے لگا۔ اس نے پلٹ کر گھبرائی ہوئی نظروں سے چندر کو دیکھا جو ایک میلے پھٹے کوٹ اور ڈھیلے ڈھالے پاجامے میں ملبوس بغل میں ایک چھوٹا سا بستر دبائے دوڑا دوڑا چلا آ رہا تھا ــــــــ آج بدھ تو نہیں تھا !

"ارے سیوچاچا ــــ یہ پلٹن کہاں لئے جا رہے ہو چاچا۔ کچھ سنا تم نے ــــ مجھے نوکری مل گئی ہے تیس روپے ماہانہ۔ اب تم کو محنت مزدوری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں چاچا میں کماؤں گا تمہیں۔ موسی کو۔ رانی کو اور ان ننھے ننھے گڈے گڑیوں کو پالا کروں گا۔ چلو گھر چلو۔ دیکھو میں کیا کیا چیزیں لایا ہوں کلکتے سے ــــــ"

چاچا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ بڑھیا نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر قحط اور گرانی کو کوسنا شروع کیا "بیٹا ــ کون سے گھر چلیں۔ مکان والے نے گھر سے بے دخل کر دیا ہے۔

تین مہینے سے کرایہ نہیں دے سکے تھے نا- اب تو یہ بجلی کے کھمبے ہی......!"

چندر کے لال انگارہ گالوں کو بڑھیا کے جملوں نے پانی کے چھینٹوں کی طرح بجھایا —— مگر فوراً ہی اس نے رانی کی موجودگی کا احساس کرتے ہوئے فقرے اندر میں کہا- ارے تو کیا پرواہ ہے موسی —— جب تک چندر کے جسم میں لہو کی ایک بوند بھی باقی ہے چندر اپنی موسی کے لئے یعنی اپنی موسی کی لڑکی کے لئے تاج محل جیسی عمارت کھڑی کر سکتا ہے —— ہاں! اچھا تو موسی اسی بجلی کے کھمبے کے پاس ٹھیلا لگا دو پھر —— مجھے تو بڑی زوروں کی بھوک لگی ہے۔"

چندر نے اپنا لسٹر فٹ ہاتھ پر رکھ کر کھولا اور اس میں سے ٹین کے دو تین ڈبے نکال کر سب کے سامنے رکھ دیئے، دیسی اور انگریزی مٹھائیوں کی ملی جلی سوندھی خوشبو سے ننھے ننھے خرگوشوں کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ اور وہ چیلوں کی طرح ان پر جھپٹ پڑے —— مگر رانی گم سم ہی بیٹھی رہی- ماں کے اصرار پر اس نے دو ایک لقمے پانی کے گھونٹ کے ساتھ حلق سے اتارے- چندر سوچ رہا تھا کہ یہ بھی ایک ادا ہوتی ہے- لڑکیوں کی— وہ بار بار دزدیدہ نظروں سے رانی کی جھکی ہوئی پلکوں اور گھنے گھنے ابروؤں کو دیکھ کر اپنے آپ پر شعریت اور رومانیت کا عالم طاری کر رہا تھا- کھانے سے زیادہ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ جب تک لڑکیاں شرماتی ہیں بڑی سندر معلوم ہوتی ہیں- ذرا شرم دور ہوئی کہ سارا مزہ کرکرا ہو گیا- ادھر رانی کے جسم پر بار بار رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے- اسے یوں محسوس ہو رہا تھا- جیسے اس کے من کا مور ابھی مرا نہیں بلکہ زخموں سے چور ہو کر پھڑ پھڑا رہا ہے ——

دھڑک —— دھڑک دھڑک........

کھانے سے فارغ ہو کر چندر ایک سستی سی سگریٹ جلا کر یک گونہ سکون اور سرور کے زیر اثر رانی سے کچھ باتیں کرنا اس کو چھیڑنا اور ہنسانا چاہتا تھا- اس کو رانی کی ہنسی بہت پسند تھی- وہ جب ہنستی تھی تو.......... چندر کوئی بالکل انوکھی تشبیہ سوچ رہا تھا- کہ ایک پولیس والے نے اپنی مونچھوں کو بھونڈا سا بل دیتے ہوئے انہیں ڈانٹا" ارے کیا یہ تمہارے باپ کی سڑک ہے- چلو اٹھو یہاں سے —— اٹھائی گیرے کہیں کے۔

چندر کو پولیس والے کی یہ مداخلت بڑی ناگوار معلوم ہوئی خصوصاً اس وقت جب وہ رانی کے ساتھ ایک خیالی اڑن کھٹولے میں بیٹھا اپنی یوٹوپیا کی سیر کر رہا تھا اور اس کی ہنسی کے متعلق کوئی رنگین تشبیہ اس کے ذہن میں نہیں آتی تھی مگر اس نے سپاہی کی مونچھوں کا بل دیکھ کر جھگڑا بڑھانا مناسب نہ سمجھا- یہ ایک حقیقت تھی کہ غریبوں کے باپ بھی غریب ہوتے ہیں- اسی لئے ایسی صاف شفاف سڑک ان کے باپ کی ملکیت ہو ہی سکتی تھی- ممکن ہے کہ ان کے باپ دادؤں نے یہ سڑک بنائی ہو- مگر اس سے کیا ہوتا ہے...... تاج محل جانے کن معماروں نے بنایا تھا مگر دنیا یہی کہتی چلی آئی ہے کہ شاہجہان نے بنایا ہے تاج محل۔

"ابے او بڈھے —— سنتا ہے کہ نہیں —— لے چلوں تھانے ——؟"

بوڑھا اٹھ کر سپاہی کی خوشامد کرنے لگا" سرکار —— آج ایک رات بسر کر لینے دو- کل سویرے ہی چلے جائیں گے- قحط کے مارے ہیں- سرکار تو مائی باپ ہے- دیا کرو ہم پر ——"

چندر کو بوڑھے کی اس رجعت پسند ذہنیت پر بڑا غصہ آیا- اس نے سوچا کہ اگر سرکار مائی باپ ہے تو بیشک یہ سڑک بھی ہمارے باپ کی ہے- مگر دنیا ابھی تک رجعت پسندی اور مونچھوں کے بل میں پھنسی ہوئی ہے- پھر کیا فائدہ ایسی تاویلات سے" اس نے جیب سے ایک چونی نکال کر رانی کو دکھاتے ہوئے سپاہی کے ہاتھ میں رکھ دی- دراصل چندر رانی کو مرعوب کرنا چاہتا تھا کہ رانی کا راجہ کلکتے سے سچ مچ کا راجہ بن کر لوٹا ہے۔

سپاہی مسکراتے ہوئے آگے نکل گیا- اور بوڑھا بڑبڑانے لگا۔

"اتنی بڑی دھرتی —— اور ہمارے باپ نے ہمارے لئے چپہ بھر زمین بھی ورثے میں نہیں چھوڑی"- اور بوڑھے نے اپنے باپ کو ایک خوفناک گالی دی۔

چندر نے بوڑھے کو سمجھاتے ہوئے کہا" چاچا —— کچھ غم نہ کرو ظلم کی چکی سدا نہیں چل سکتی- ایک نہ ایک دن تو اسے رکنا ہی پڑے گا- اب تو اپنے دیس میں اشتراکیت......"

مگر چندر چونک پڑا کہ وہ جانوروں کے آگے بین بجا رہا ہے- یہ بوڑھے کیا جانیں دیس کیا ہوتا ہے اور اشتراکیت کسے کہتے ہیں- ان کی تو جتنی کھوپڑی ہے اتنا ہی دماغ ہے، اس وقت اس نے رانی کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا" رانی —— بھگوان نے چاہا تو ہماری اولاد کچھ کر دکھائے گی —— کیوں ——؟"

چندر آنے والی نسل کے بارے میں پکا رجائی تھا- اسی لئے ابھی سے بے فکر ہونے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے بوڑھے سے کہا" چاچا —— کوئی فکر کی بات نہیں- اندھیری رات کے بعد صبح ضرور ہو گی- میرے پاس اس وقت

سترہ اٹھارہ روپے ہیں۔ کل سویرے ہی کلکتہ چلیں گے ——"

اور پھر اس نے شرما کر سر جھکاتے ہوئے کہا "اور وہاں —— وہاں"

بوڑھا چندر کا مطلب سمجھ گیا۔ اور ایک ٹھنڈی سانس میں جواب دیا۔

"بیٹیا —— بھگوان تمہیں سکھی رکھے —— !"

دوسرے دن بھوکوں کا یہ قافلہ کلکتے پہنچا۔ چندر نے اڑوس پڑوس کے لوگوں اور شناساؤں کو بتایا کہ وہ اپنی رانی کو کلکتے لے آیا ہے۔ اپنے خاص خاص دوستوں کو ایک گھٹیا سے ہوٹل میں ایک چھوٹی سی ٹی پارٹی بھی دی۔

کلکتے پہنچ جانے کے بعد بوڑھے، بڑھیا اور ننھے خرگوشوں کے پیٹ میں بھوک کے شعلوں کی پہلی سی غضبناکی نہ رہی تھی۔ البتہ رانی اسی طرح گم سم سی تھی جیسے مارواڑی عورت کا زہر ابھی تک اس کے جسم میں، اس کی روح میں رچا ہوا ہے۔ چندر کو بعض اوقات حیرت ہوتی اور وہ اس پتھر کی مورتی کو دیکھ دیکھ کر بقول خود "فرسٹریٹ" ہو جاتا تھا۔ مگر انسان اپنے آپ کو بہلا بھی تو لیتا ہے۔ ارے یوں ہی ہوتا آیا ہے۔ ہر ہندوستانی لڑکی اپنے دولہا کو دیکھ کر منہ میں گھنگھنیاں ڈال لیتی ہے۔ خیر شادی ہو لینے دو۔ پھر دیکھنا رانی صاحبہ کی اتنی سی زبان میرٹھ کی قینچی تک کو مات نہ کر دے تو میرا نام چندر نہیں۔

ایک دن برسبیل تذکرہ اپنے ایک بڑے عزیز دوست سے رانی کے متعلق کہہ ہی دیا کہ وہ لڑکی نہیں۔ ممی ہے ممی ——!

اس دوست نے اپنا تجربہ بتاتے ہوئے اس کا شک دور کیا کہ بھئی —— شادی سے پہلے ہر ہندوستانی لڑکی ممی ہی ہوتی ہے۔ اب ہماری شیریں کو ہی دیکھو۔ شادی کے بعد پورے آٹھ دن تک ہزار آفتوں اور لاکھ خوشامدوں کے باوجود ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکالا تھا اور اب یہ حالت ہے کہ "آٹو چینج اور آٹو ریلیز گراما فون" کی طرح دن بھر بجتی رہتی ہے۔ کہاں رہتے ہو —— گھر کی بھی کوئی فکر ہے تمہیں —— پیسے نہیں رہے چاول ختم ہو گئے —— موئے جاپانیوں کو کالی ماتا نگل لے —— جب سے برما پر قبضہ کیا ہے ......

"اور یہاں سے وہ ساری بین الاقوامی سیاسیات پر لیکچر دینے لگتی ہے۔ بھلا سوچو تو کہاں عورت کی زبان کی شیرینی اور کہاں اٹلانٹک چارٹر کی کڑوی دفعات۔ بڑی بلبل بنی پھرتی ہے —— ارے عورت کی زبان کو تو ہارمونیم کی پتی ہونا چاہئے —— ذرا چھوا نہیں اور روح کے ریگزار میں رس کا سیلاب بہا نہیں۔ بعض اوقات میں تو بالکل تنگ آ جاتا ہوں۔ تم بھگوان کا شکر ادا کرو کہ تمہیں میری طرح تعلیم یافتہ بیوی نہیں ملی۔"

چندر مسکرا دیا۔ اس کو تعلیم یافتہ عورتوں سے چڑ تھی گریجویٹ تھا۔ اسی لئے تعلیم یافتہ عورت سے شادی کر کے اپنے آپ کو احساس کمتری میں مبتلا کرنا اسے کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں تھا۔ اس نے بی اے صرف اس لئے کیا تھا کہ بی اے کی ڈگری قابلیت کی سند سے زیادہ دنیا کے بازار کی ایک جنس ہے۔ موجودہ تعلیم کے متعلق وہ کہا کرتا تھا کہ ہم ۵ فیصدی علم کے بجائے ۹۵ فیصدی حاضری کے لئے کالج جایا کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا تھا کہ اس کی رانی تعلیم یافتہ عورت کی طرح دردِ سر نہیں بلکہ دردِ جگر ہے۔

چندر کو اب رانی کی ٹھہری ہوئی جوانی پر کوئی حیرت نہیں ہوتی تھی البتہ بعض اوقات وہ "فرسٹریٹ" ضرور ہو جاتا تھا کہ عجیب لڑکی ہے کبھی چوری چھپے ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے بھی نہیں بہلاتی —— اور یہ بڑھیا تو آٹھوں پہر رانی سے چڑیل کی طرح چمٹی رہتی ہے کبھی رانی کو تنہا نہیں چھوڑا۔ کبھی کبھی وہ سوچنے لگتا کہ کہیں رانی کو اس کی نوکری کا راز تو معلوم نہیں ہو گیا!

چندر کی نوکری ایک راز ہی تو تھی۔ دن بھر پاؤں پھیلائے کھاٹ پر خراٹے لیتا رہتا۔ اور سرِ شام ہی کھانا کھا کر اپنا اکلوتا کوٹ کندھے پر ڈال ڈکاریں لیتا باہر چلا جاتا۔ اور رات کے تین چار بجے سے پہلے گھر نہ لوٹتا۔ چندر اپنی نوکری کے متعلق کسی کو بتاتا بھی تو کیسے —— ؟ بتانے والی بات ہوتی تو بتا بھی دیتا۔ سیٹھ ...... نے بنگال کے قحط سے فائدہ اٹھا کر خفیہ طور پر بھوکی عورتوں کی تجارت شروع کر دی تھی اور اس تجارت میں چندر سیٹھ کا بحیثیت ایک کمیشن ایجنٹ معاون تھا۔ اس نے اب تک کوئی تین ساڑھے تین سو کنواری، بیاہی، ادھیڑ، کالی گوری، موٹی دبلی، خوبصورت، بدصورت —— عورتوں کو سیٹھ کے ہاتھ معقول کمیشن پر بیچا تھا۔ —— کیا رانی کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی —— ؟ رانی کے دل کی طرح چندر کے دل میں بھی چور تھا۔

ایک رات چندر اپنی نوکری پر جانے کے لئے تیار ہی ہو رہا تھا کہ رانی کو قے ہوئی۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر میں اس نے دو تین بار استفراغ کیا۔ چندر گھبرا گیا۔ بوڑھے بڑھیا کے منع کرنے کے باوجود وہ دوڑا دوڑا ایک سستے سے ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر نے رانی کا معائنہ کیا۔ اور مسکرایا چندر کی پیٹھ کو تھپکاتے ہوئے کہنے لگا "بابو —— پریشان کیوں ہوتے ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے"

"خوش ہونا چاہئے —— !" چندر حیرت سے ڈاکٹر کو دیکھنے لگا جیسے وہ پوچھ رہا ہو ڈاکٹر ہے یا صرف ڈاکٹر کی وردی .... ڈاکٹر نے جھک کر اس کے کان میں کہا "تمہاری وائف —— ایک بچہ کی —

چندر کو یوں محسوس ہوا جیسے دھرتی ایک زبردست زلزلے سے لرز اٹھی ہے اور وہ تمام نا جائز بچے جن کی ماؤں کو چندر نے معقول کمیشن پر ہمیشہ کے لئے فروخت کیا تھا، چیختی ہوئی چٹانوں کے ریزے چن چن کر بے تحاشہ قہقہے لگاتے ہوئے چندر پر پھینک رہے ہیں۔ یہ بچے ——— یہ آنے والی نسل ——— جس کے بارے میں چندر پکار جاتی تھا۔

چندر نے لڑکھڑا کر قریب کے ستون کا سہارا لیا ——— اور جب وہ آہستہ آہستہ آدمی کی جون میں آنے لگا تو رانی کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر یکایک مسکراہٹ آ گئی ——— آخر وہ اور کیا کرتا! اس کے پاس آنسو کی ایک بوند بھی نہیں تھی۔ بڑی کوشش کے بعد اس نے اپنے گلے کے پھندے کو کھولتے ہوئے کہا "اچھا ——— تو رانی ——— ایک بچے کی ———"

اور وہ اپنے اکلوتے کوٹ کو کندھے پر ڈال کر آہستہ آہستہ باہر نکلا۔ اور پھیلے ہوئے گہرے اندھیرے میں ڈوب گیا ——— غائب ہو گیا ...... فنا ہو گیا۔

باہر نکلتے وقت اس نے رانی کی ایک ہلکی سی ڈراؤنی چیخ بھی سنی مگر اب وہ رانی سے اتنی دور جا چکا تھا کہ وہ ہلکا لطیف تار جس نے چندر کے دل کو رانی کے دل سے باندھ رکھا تھا کھنچتے کھنچتے بالآخر ٹوٹ جائے ——— ایسا ٹوٹے کہ پھر کبھی نہ جڑ سکے ——— مگر وہ اس تار کو جتنا کھینچتا تھا وہ اتنا ہی کھنچتا چلا جا رہا تھا۔ اگر چندر دھرتی کے آخری کنارے تک بھی چلا جاتا تو بھی وہ تار نہیں ٹوٹ سکتا تھا۔

چند مہینے گزر گئے نہ چندر کہیں دکھائی دیا اور نہ رانی کا حال معلوم ہو سکا۔ بنگال کا قحط اسی طرح زوروں پر رہا۔ ہزار ہا رانیوں کے بچے پیدا ہوتے رہے اور ہزار ہا چندر اندھیرے میں ڈوبتے گئے ——— غائب ہوتے گئے، فنا ہوتے گئے۔

ایک دن ذکریا اسٹریٹ میں سڑکوں پر بکھری ہوئی لاشوں کو اٹھانے والی بیل گاڑی چرخ چوں ... چرخ چوں کرتی آ رہی تھی اور فٹ پاتھ پر ایک مکھیا بھکاری بھوکی عورت سکرات کے عالم میں پڑی کراہ رہی تھی۔ اس کی سوکھی چھاتی کو ایک ننھا بچہ چوستے چوستے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا تھا۔ گاڑیبان جب بچے کی لاش کو اٹھانے کے لئے جھکا تو یکایک اس کا جسم برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔ اس بچے کی ماں فٹ پاتھ پر پڑی ڈراؤنی آواز میں کراہ رہی تھی۔

"چندر ——— آن ——— ہا ——— چن ——— در ——— آہاں"

گاڑیبان نے جھک کر اس ہڈیوں کے ڈھیر کی طرف دیکھا۔ وہ چونکی نظریں عورت کی آنکھوں کے دھنسے ہوئے گڑھوں میں ڈوبتی گئیں، ڈوبتی گئیں۔ اور وہ بے اختیار ہو کر گھٹنوں کے بل اس پر گر پڑا۔ اس کے گالوں کی ابھری ہوئی ہڈی کے نیچے دھنسے ہوئے گڑھے میں اپنی ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے وہ گڑگڑا نے لگا "میری رانی ——— میری رانی ——— میری جان!"

اور بیل گاڑیبان کی آہ زمین کر ذکریا اسٹریٹ کو بھیانک چیخوں سے گونجانے ہوئے انسانی کیڑوں کے ایک اور ڈھیر کی طرف رینگنے لگے!

تندرستی

کر دیا تھا کہ وہ شہر کی تمام گندگی نکال پھینکے گا مگر آج پہلے کی طرح بھیڑ نہ تھی، لوگ صفائی کے عادی ہو چکے تھے۔ جب ربھا کی کوٹھڑی کے سامنے والی نالی کی باری آئی تو وہ بے چین سی ہو گئی، وہ کسی عمیق راز کو معلوم کرنا چاہتی تھی۔

"جمعدار صاحب یہ صفائی کس لئے ہو رہی ہے۔"

"اس گندگی میں بڑے زہریلے کیڑے پیدا ہوتے ہیں۔"

"مگر اس گندگی کو دور کرنے سے سرکار کو کیا لابھ!"

"اس لئے کہ پبلک کی تندرستی بنی رہے!"

ربھا سمجھ گئی کہ سرکار چاہتی ہے کہ مالتی ربھا کی طرح ہو جائے اور اس نے رانوں تک اپنی شلوار چڑھا لی اور بڑی بے دردی سے ناخنوں سے اپنے گوشت کو کھرچنے کی لمبی لمبی خراشوں میں خون نمودار ہونے لگا تھا۔

مالتی دو روپیوں کو ہاتھ میں مسلتی ہوئی نکل گئی ——— اور جمعدار کی آنکھیں ربھا کی ننگی ننگی سڈول رانوں میں الجھ کر رہ گئیں!!

شیم چندر کے متعلق اپنا گرد ہی شاہکار بھرت سے پڑھنا شروع کردیا۔ افسانہ پر پنسل سے نشان لگا گیا۔ گویا دوسرے ایڈیشن کے لئے اُسے ابھی باتیں ابھی سے سُوجھ رہی تھیں۔ کرشن چندر کا جی پان کھانے کو چاہتا تھا۔ لیکن گاڑی کہیں رکتی نظر نہ آتی تھی۔ اُس نے سبطے حسن سے کہا۔ "دم گھٹا جارہا ہے۔"

"اگلے اسٹیشن پر اُتر کر ڈائننگ کار میں چلیں گے۔" سبطے نے تجویز پیش کی۔

"میں بھی چلوں گا۔" سردار نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ یعنی ڈبے کے بیچ میں خاموشی تھی۔ ورنہ چاروں طرف شور تھا۔ اور کسان اور مزدور اور غریب بدصورت مفلوک الحال لوگ چلا چلا کے باتیں کر رہے تھے۔ وہ اس قدر اکیلے، کمینے اور بھوکے لوگ تھے۔ کہ اگر نہ چلاتے۔ تو شاید پاگل ہو جاتے۔ اس خاموشی۔ کائنات کی اندھی بسیط گنہگار خاموشی میں دب کر رہ جاتے۔ اسی لئے تو اُن کی روحیں چیخ چیخ کر اپنی زندگی کا نوحہ بیان کر رہی تھیں۔ وہ ہنستے تھے۔ وہ بات کرتے تھے۔ وہ مسکراتے تھے۔ وہ خوش ہوتے تھے۔ وہ غصہ میں آکر چیختے تھے۔ لیکن بات ایک تھی۔ نوحہ، مرثیہ، دفنائی ہوئی، کفنائی ہوئی، آرزوؤں کے ننگے مزار، ہر ہنسی کے پیچھے ہر تبسم کے پیچھے۔ ہر انداز گفتگو کے مرکز میں گویا اپنا سینہ کھولے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ہمیں دیکھ لو۔ جاہل وحشی ظالم درندو ہمیں بھنبھوڑ کر کھا جانے والے دیوتا نما شیطانو۔ آؤ۔ آؤ ہمیں قریب سے دیکھ لو......" کرشن چندر نے منہ پھیر لیا۔ باہر شفق کھل گئی۔

سبطے کے ذہین چہرے پر کرب کی ایک لہر آئی۔ اُس نے آہستہ سے کہا "وہ دیکھا تم نے....؟" سبطے کے چہرے پر کرب کی بے شمار لکیریں ہیں۔ جیسے سمندر کا جھاگ ساحل سے ٹکرا ٹکرا کے پختہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ذہنی احساسات کا تموج سالہا سال سے اس کے نازک چہرے پر رنج لبستہ ہوتا چلا گیا ہے۔ اس کا چہرہ خفیف سے خفیف انسانی جذبات کا بھی عکاس ہے۔ اور اکثر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا سبطے نے زندگی سے کرب ہی اخذ کیا ہے۔ زندگی کی بے پناہ مسرتوں اور گہری سے گہری مسرتوں سے بھی اُس نے کرب ہی حاصل کیا ہے۔ غالباً اُس کے انداز فکر میں ایک ایسی تازگی ہے اور اُس کے احساسات اور جذبات پر ایک ایسی شدت کی کیفیت ہے جو اسے ہر غم اور ہر مسرت سے اک خاص قسم کا درد محسوس کراتی ہے۔ ایک کھو کو دیکھ کر اس کے چہرہ پر ایسی ہی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جیسے ایک فاقہ زدہ بھکاری کو دیکھ کے۔ اس کا چہرہ شدت احساس کا مثالی مرقع ہے جہاں حسن اور غربت دونوں ایک ہی درد کی تفسیر بن جاتے ہیں۔ اپنی جواں سالی کے باوجود یہ چہرہ بوڑھا ہو چلا ہے۔ اس میں صدیوں کی تھکن آچکی ہے۔ کرب کی ننھی ننھی لاکھوں لکیریں اس چہرے کے ہر روزن سے شب و روز جھانکتی نظر آتی ہیں جیسے انہوں نے دنیا کے سارے غم کا احاطہ کر لیا ہو۔

شفق کے نازک رنگوں کو دیکھ کر سبطے کے چہرہ پر وہی مخصوص کربناک کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا "وہ دیکھو۔ وہ دیکھو۔" کرشن چندر نے شفق کی طرف دیکھا۔ افق پر پھولی ہوئی سرسوں کی کیاریاں۔ کشمیر کی کشت ہائے زعفران اسے بھی شفق بیحد پسند ہے شفق جو اس کے دل میں نہ تھی، یہ پیلا پیلا سنہرا جادو جو اُس کی روح میں نہ تھا۔ یہ شادابی۔ یہ رنگینی۔ یہ حسن کاری جس کے نہ ہونے سے اُس کا رواں رواں بھوکا تھا...... یہ شفق جو اب سونا نہ تھی۔ جو اب زعفران بھی نہ تھی۔ جو اب گل مہر کے پھولوں کی طرح شعلہ بداماں تھی۔ سورج نیچے ڈھل گیا تھا۔ بادلوں کا ہر غرفہ پھول پھول تھا۔

سبطے نے کہا.... "وہ دیکھو...... وہ دیکھو......"

سیاہ بادلوں کے پیچھے سونا ابل رہا تھا۔ سیاہ بادلوں کے مرکز میں آسمان نیلا تھا۔ ایک کھڑکی سی کھلی تھی۔ سمندر پر کھڑکی کھل گئی تھی۔ اور سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور وہ کھڑکی میں بیٹھ کر ڈوبتے ہوئے سورج کو تک رہا تھا۔ اور لہریں ریت کو چوم کر واپس چلی جا رہی تھیں۔ یہ نور کی لہریں یہ سورج کا سمندر...... یہ خدائی کا مرکز۔ "وہ دیکھو...... وہ دیکھو"

شام بڑھنے لگی، شفق ڈوبنے لگی تاریکی پھیلنے لگی۔ ہر چیز ڈوب جاتی ہے۔ اس تاریکی کے سمندر میں وہ سنہرا رنگ کہیں کھو گیا۔ وہ گلابی تاج محل شہابی ہو گئے۔ مرمریں سے گلابی گلابی سے شہابی، شہابی سے قرمزی۔ محل ہاتھی بن گئے اور پھر تاریکی۔ نور کی آخری لہر افق سے ٹکرا کر ڈوب گئی اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔

"اب کچھ نظر نہیں آتا۔" سبطے نے افسردگی سے کہا۔ اور اُسے

ڈائننگ کار یاد آتی۔ اگلے اسٹیشن پر وہاں چلیں گے۔"

"مجھے کچھ نظر نہیں آتا،" کرشن چندر نے کہا۔ "بیل کے پنکھے اور بہت سے گھنٹے اور چمن کے جبڑے، اور دھرتی کے بیٹے اور بیٹیاں"

"عورت کا ذکر تم ضرور کرو گے۔" سردار نے چڑ کر کہا۔ "میاں کسی ڈاکٹر سے علاج کراؤ اپنا۔ شفق کو دیکھ کر تمہیں عورت ہی یاد آتی ہے۔ اس خونیں منظر کو دیکھ کے بھلا تمہیں میدان جنگ کیوں یاد نہیں آتا"....

گاڑی دھیمی ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ چلتی چلتی رک گئی۔ سردار سبطے اور کرشن چندر اتر کر ڈائننگ کار میں بیٹھ گئے۔

ڈائننگ کار میں خوبصورت فانوس تھے۔ شفاف بلوریں میزیں تھیں۔ انگریزی شراب تھی۔ ہنستے ہوئے چہرے تھے اور عورتیں جن کے چہرے گلاب تھے۔ قد لمبا۔ ہنسی نقرئی اور جسم پر غالب اُن کے لباس کا سرسراتا ہوا ریشم اپنے رنگ و نور سے نگاہوں کو خیرہ کئے دیتا تھا۔ اور وہ بیٹھی ہوئیں اور مسکراتی ہوئیں اور چلتی ہوئیں اس طرح دکھائی دیتی تھیں گویا کسی شیشے کی صراحی میں رنگین مچھلیاں تیر رہی ہوں۔ یہ ڈائننگ کار کی مچھلیاں تھیں۔ یہ وہ مچھلیاں نہ تھیں جو ساحل سمندر پر گھومنے والے ماہی گیروں کی میراث ہوتی تھیں۔

سبطے سردار اور کرشن چندر کو معلوم ہوا گویا وہ کسی نئی دنیا میں آ گئے ہیں۔ ویٹر سپید مکلف لباس پہنے مؤدب کھڑے تھے۔ تین کورس کا انگریزی کھانا.... اس کے بعد کافی پھر وہ لوگ اخروٹ کھانے لگے۔ لوگ اخروٹ توڑنے والا ہتھوڑا استعمال کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے دانتوں سے وہی کام لیا۔ مقابل کی میز پہ تین انگریز فوجی بیٹھے تھے ایک دوسرے سے شناسا نہ تھے۔ اس لئے بات نہ کر سکتے تھے ہاں وہ ان قہقہہ مار کر ہنسنے والے ادیبوں کی بدتمیزیوں کو بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان تین انگریز فوجیوں کے ساتھ چوتھی کرسی پر ایک موٹا پارسی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بار بار کہہ اٹھتا: "میں پریشان ہوں۔ میں بیحد پریشان ہوا جاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" ایک انگریز فوجی نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں تم نہیں جانتے۔ میں زندگی سے عاجز آ گیا ہوں۔ بیرا ایک لارج برانڈی لاؤ۔ آپ پئیں گے؟"

"نو تھینکس۔" دوسرے فوجی نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری مرضی۔ لیکن میں بہت پریشان ہوں۔ تم بیان نہیں کر سکتے میں کس قدر پریشان ہوں۔" فوجی افسر اٹھ گئے۔ موٹے پارسی نے سبطے کی طرف نگاہ دوڑائی اور کہا: "بھائی میں بہت پریشان ہوں۔"

"آپ پریشان نہ ہوں۔" سبطے نے مشورہ دیا۔

"کیسے پریشان نہ ہوں۔ میں تو پریشان ہوں۔ میں اس زندگی سے اس دنیا سے پریشان ہو چکا ہوں۔ یہ سب دھوکا ہے۔ سراب ہے۔" اس نے گلاس ختم کرتے ہوئے کہا۔ "بیرا ایک لارج برانڈی اور لاؤ — آپ پئیں گے؟"

"نہیں شکریہ!" کرشن چندر نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"آپ کی مرضی۔ مگر میں بہت پریشان ہوں!"

اتنے میں ایک اور موٹا پارسی آخری میز سے اٹھ کر ادھر آیا۔ دونوں پارسیوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ بڑے ٹھاٹ سے "صاحب جی" ہوا! اور وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔

"کیا حال ہے؟" نو وارد نے پوچھا۔

"کیا پوچھتے ہو؟ دوست یہ دنیا ایک دھوکا ہے۔ سراب ہے۔ مایا ہے۔ میں تو بیحد پریشان ہوں۔"

"آخر ہوا کیا ہے؟" دوسرے پارسی نے پوچھا۔

"ارے بھائی۔ امسال ایک کروڑ انکم ٹیکس میں جا رہا ہے۔ اس سال کے بزنس پر۔ بتاؤ ہم لوگ کیا کمائیں گے۔ جب اسی فیصدی تو سرکار ہی منافع میں سے لے جائے گی۔ I tell you — it is a Swindle. میں بہت پریشان ہوں۔ کہیں بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ بوائے دو لارج برانڈی لاؤ۔ جلدی!" اتنا کہہ کر وہ موٹا پارسی میز پہ سر ٹیک کر رونے لگا۔

(۳)

دوسرے روز صبح جب آنکھ کھلی تو گاڑی نظام اسٹیٹ کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ اور ایک اندھا لڑکا ہاتھ میں کھجری لئے دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ اپنی دلدوز آواز میں گا کر بیان کر رہا تھا۔ باہر میلوں تک "

[illegible] سیٹوں تک [illegible] کا جنگل تھا جو گرتی ہوئی [illegible] سے بچ کر جھاڑیوں سے نکل بھاگتے تھے۔ [illegible] ریلوے جا رہا تھا اور بیلوں کے پاؤں سے اڑتی ہوئی گرد میں [illegible] کی کرنیں اک زریں دھند کے بیں لھرتی گئی تھیں۔ یہ دھند اگر [illegible] تھا جہاں سورج سرخ لحاف سے سر نکال کر نئے دن کو دیکھ رہا تھا۔ چلتی گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔ ترقی پسند ادیبوں کے سَتے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ کھجری کا نغمہ سُن رہا تھا جو چلتی ہوئی زندگی کو ریلی موت کا پیغام دے رہی تھی۔ مسافر آنے والی موت سے مرعوب ہو کر اسے خیرات بانٹ رہے تھے۔ ہزاروں سالوں سے یہی آسا کی دھن اور یہی موت کا نغمہ صبح سویرے سارے ہندوستان میں گونج اٹھتا ہے پھوڑ دو دُنیا۔ چار دن کی چاندنی ہے۔ پھر اندھیری رات ہے۔ مایا کا جنجال ہے مسافر کس بھول میں پڑا ہے۔ ان گیتوں میں سراب ہے، اندھیرا ہے، تاریکی ہے۔ موت ہے۔ زندگی نہیں۔ حرکت نہیں۔ خوشی نہیں۔ خود اعتمادی کی وہ جگمگاتی ہوئی کرن نہیں جو انسان کو صبح سے شام تک دنیا کے تکلیف دہ کاموں میں مسرت و شادمانی سے مصروف رکھتی ہے۔ اسی لئے تو یہاں ہر فرد فاقہ مست ہے۔ ہر شخص کا چہرہ سُتا ہوا ہے۔ جیسے ابھی ابھی اُس نے اپنے باپ کے انتقال کی خبر سُنی ہو۔ اسی لئے تو یہاں ہنسی ہونٹوں سے غائب ہے۔ کرۂ ارض پر شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں ہنسنا بدتمیزی میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور رونا مین ثواب ہے۔ رونا ہمارے نغمے میں ہے، ہمارے فلسفے میں ہے، ہمارے سماج میں ہے، ہمارے فن میں ہے، ہمارے مذہب میں ہے۔ رونا ہمارے تمدن کی معراج کمال ہے: "سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا ......" کھجری والے اندھے نے دوسرا رونا شروع کیا۔ اور سردار نے جھلا کر اُسے دونی دی اور کہا "بس کرو اور اگر مزدوری کچھ گانا چاہتے ہو تو کوئی کام کی چیز گاؤ۔" اندھا بیچارہ چند لمحے چُپ رہا۔ اُس کے ساتھی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اندازہ لگایا کہ ڈبے میں مسلمان مسافروں کی تعداد زیادہ ہے۔ اُس نے اندھے کے کان میں کچھ کہا اور اندھے نے کھجری کی تھاپ سے ایک نعت شروع کی۔ اور جب وہ نعت گا چکا اور صرف مسلمان مسافروں سے پیسے وصول کر چکا تو اُس نے اب دوسری چیز شروع کی۔ "مُرلی والے گھنشام ....."

اب کے صرف ہندو مسافروں نے اُسے پیسے دیئے۔ [illegible] میں بیٹھا ہوا ہر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی طرف [illegible] دیکھ رہا تھا۔ جیسے اُسے کچا ہی کھا جائے گا۔ اور کرشن چندر [illegible] ہوا گویا گاڑی کے ڈبے میں اک گہری خلیج حائل ہوتی جا رہی ہے۔ دو قوموں کے درمیان، دو نظریوں کے درمیان، دو زندگیوں کے درمیان، جیسے کوئی سویا ہوا احساسِ نفرت یکایک بیدار ہو گیا تھا۔ اور سانپ کے پھن کی طرح سر اُٹھا کر لوگوں کے دلوں میں لہرا رہا تھا۔

یکایک گاڑی رُک گئی اور اندھا اُتر کر دوسرے ڈبے میں چلا گیا۔ وہاں سے پھر صدا آنے لگی، "سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا.... کملی والے .... مُرلی والے گھنشام ..... " اور کیفی اعظمی نے اس طرح بُرا سا منہ بنایا جیسے کسی نے زبردستی اُس کے گلے میں زہر اُنڈیل دیا ہو۔

مدن گوپال نے سر ہلا کے کہا۔ "ظالم نے کیسا اچھا گلا پایا ہے۔"

"ہائیں!" یکایک سب ترقی پسند ادیب جھلا کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ اُسے اسی وقت گاڑی سے نیچے اُتار دیتے لیکن پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہے۔ کہ اِس آدمی نے منشی پریم چند پر ایک کتاب لکھی ہے۔

ہر طرف بیزار سے چہرے تھے۔ عادل رشید کھٹے ڈکار لے رہے تھے۔ ملک راج آنند مُنہ پر ہاتھ رکھے شریفانہ انداز میں جمائیاں لے رہے تھے۔ مہندر ناتھ اپنی بڑھی ہوئی داڑھی کھجا رہے تھے۔ رفعت سروش بے وجہ مسکرا رہے تھے۔ کرشن چندر پائنچوں میں دونوں ہاتھ ڈالے سیٹ پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ قدوس اپنے حلق میں یوکلپٹس کی گولی رکھ رہے تھے سبطے آنکھیں مل رہے تھے۔ اور سجاد اونگھ رہے تھے اور علی سردار جعفری لوٹا لئے باتھ روم کی طرف اس طرح بڑھ رہے تھے۔ گویا کسی انقلابی مہم پر روانہ ہو رہے ہوں۔

"مسلم چائے، مسلم چائے" کسی نے پکارا۔

یہاں بہت سے لوگوں نے ایک ساتھ کہا۔ "لاؤ۔"

"کتنی چائے؟"

"پندرہ بیس تیس۔ چالیس۔ جتنی ہو سکے آؤ۔" عادل رشید نے حکم دیا۔ چائے والے نے کہا۔ "اگلے سٹیشن پر ملے گی۔" اور یہ کہہ کر رفو چکر ہو گیا۔

[illegible] بیٹھے تھا اور جب تک یہ لوگ چائے ختم کرتے حیدرآباد اسٹیشن کا میدان [illegible] کمیٹی کے دس پندرہ ارکان حاضر تھے۔ اور صبح صبح [illegible] آنے پر بڑا فرختہ سے دکھائی دیتے تھے۔ اُن کے چہرے خوش آمدید کی کوشش میں مصروف تھے۔ مگر بشرے سے یہی عیاں ہوتا تھا میاں، اگر انسان ہو تو ابھی واپس لوٹ جاؤ۔ صبح سویرے ہمیں جگایا۔ یہ اِنی شرافت نہیں ہے۔ بھاڑ میں جائے تمہاری ترقی پسندی۔ یاں حیدرآباد میں ہم لوگ دس بجے سے پہلے نہیں اُٹھتے۔ دوکانوں کے دروازے گیارہ بجے کھلتے ہیں اور بارہ بجے کے قریب کہیں کوئی اکا دُکا خریدار سردی میں ٹھٹھرتا ہوا شیروانی کے بٹن کالر تک بند کئے اک معذرتی انداز میں گھومتا ہوا نظر آتا ہے اور ایک آپ ڈھیٹ ہیں۔ کہ نو بجے ہی اسٹیشن پر آدھمکے ہیں۔ لعنت!"

چند لمحوں تک مہمانوں نے میزبانوں کو اور میزبانوں نے مہمانوں کو دیکھا پھر ہونٹوں پر تبسم آتے گئے۔ یہ تبسم بھی خوب ہے۔ کاروباری۔ تجارتی۔ معذرتی۔ احمقانہ۔ ہر طرح کا تبسم ہوتا ہے۔ مایوس تبسم، عیار تبسم، محبوب تبسم، منفعل تبسم، جاہل تبسم۔ عالم تبسم جیسے ہم سب کچھ جانتے ہیں اور آپ بڑے چغد ہیں کامران تبسم، جیسے میاں بتاؤ اب کیا کروگے تمہاری لونڈیا تو ہم لے اُڑے۔ اور تبسم جس میں حسرتوں کی خاک بھری ہوتی ہے۔ ابراہیم جلیس کے چہرے پر بھی تبسم تھا۔ کچھ عجیب قسم کا ملتجیانہ، مٹیالا مایوس تبسم۔ گویا کہہ رہا ہے۔ دیکھو مجھے جریدۂ عبرت نگاہ ہو۔ قد چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا۔ اور اس پر ایک فٹ کی اونچی رومی ٹوپی پہن کر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ابھی ابھی کسی سرکس سے نکل بھاگے ہیں۔ یہ شہاب ہیں۔ پستہ قد۔ گندمی رنگ۔ گول چہرہ سیدھا سادہ لیکن آنکھیں بیحد ذہین۔ گویا کہہ رہی ہوں "ہم تمہیں پہچان گئے۔ ایک ہی لمحے میں"۔ یہ نظر حیدرآبادی ہیں۔ چوڑا سیاہ چہرہ۔ چوڑا ماتھا۔ چوڑا دہانہ۔ بڑے بڑے اُلجھے ہوئے بال۔ ہر چیز میں وسعت کا احساس دکن کا شمالی باشندہ جیسے دکن نے خود اپنی وسیع، عریض چٹانوں سے تراشا ہو۔ بے باک قہقہہ۔ بے جھجک تبسم جو خود بخود لبوں پر آتا جاتا ہے۔ نظر شاعر ہوکر بھی زمین کے اس قدر قریب کیسے ہوسکتا ہے۔ اُس کا اندازہ اُسے دیکھتے ہی ہوسکتا ہے۔ یہ مُسلم ضیائی ...... پستہ قد، سنولا رنگ، گنجا سر۔ آنکھوں پر دبیز شیشے ہونٹوں پر شرمیلی کنواریوں کی سی مسکراہٹ، مسکراہٹ جو کھو جاتی تھی اور آجاتی تھی...... پیچھے ہٹ جاتی تھی اور سامنے آجاتی تھی۔ اسی قدر حسّاس مسکراہٹ تھی وہ کہ [illegible] کہو ہاں [illegible] لوگ [illegible] دوست ہیں یا دشمن۔ اجنبی [illegible] عزیز۔ مسکراہٹ [illegible] کہہ رہی تھی میں اکیلی ہوں۔ میں تنہا ہوں۔ میں نے بہت کچھ کھودیا ہے۔ سب کچھ کھو دیا ہے [illegible] ہوں۔ اکیلی ہوں۔ مجھے نہ چھوڑو۔ میں تمہیں اپنا بنانا چاہتی ہوں لیکن مجھے تم پر اعتبار نہیں۔ اپنے آپ پر اعتبار نہیں۔ اس ذلیل [illegible] پر اعتبار نہیں۔ جو آدمی کو آدمی نہیں رہنے دیتا۔ تم میرے رفیق ہو سکتے ہو۔ ہاں۔ ہاں۔ ... نہیں۔ نہیں۔ .. مجھے چھوڑو نہیں۔ میرے پاس اب اپنا کچھ نہیں۔ ایک نام تھا وہ بھی اپنا نہیں رہا۔ ضیائی میرا ایک دوست تھا۔ وہ مرگیا۔ اس کا نام میں نے اپنا لیا۔ اب وہ مجھ میں زندہ ہے۔ تم میری ہنسی اُڑانا چاہتے ہو۔ یلو میں چلی۔ نہیں تم مجھے نہیں سمجھو گے اس دوست نے مجھ سے مرتے وقت کہا تھا کہ میں شراب نہ پیئوں۔ اُس روز سے میں نے کبھی شراب نہیں پی۔ تم پھر ہنسنے لگے۔ ایلو میں ہونٹوں سے غائب ہوتی جارہی ہوں ...... تم مجھے نہیں سمجھو گے۔ میں جو معصومیت کی میراث ہوں۔ میں جو محبت کے آنسو سے پیدا ہوتی ہوں اور ناکامی کی گود میں موتی بن کر چھپی رہتی ہوں ......

مُسلم ضیائی اور مہندر ناتھ گلے ملنے لگے۔

"آپ سے ملئے" کسی نے کرشن چندر سے کہا اور کرشن چندر نے مڑکر دیکھا۔ معمولی قد و قامت کا بے ڈول سا انسان۔ چہرہ پہاک لایعنی۔ بے مطلب تبسم۔ پُراسرار تبسم نہیں کہ جسے آدمی نہ سمجھ سکے۔ بلکہ ایک ایسا تبسم جو اپنی تفسیر میں کسی طرح اسم مہمل سے نہ بڑھ سکے۔ بے حد روکھا پھیکا چہرہ۔ نہ لبوں پر چمک نہ آنکھوں میں ذہانت نہ پیشانی پہ نور۔ چپ چاپ گم سُم۔ مٹی کا مادھو۔ چہرے کا رنگ پیلا۔ نہیں مٹیالا۔ نہیں خاکستری .... نہیں کچھ خاکستری کچھ سبز سا .... بالکل مینڈک جیسا "لاحول ولا قوۃ" کرشن چندر نے دل ہی دل میں کہا۔ اُسے دیکھ دیکھ کر متلی سی ہو رہی تھی۔ کس کا مُنہ دیکھا پڑا صبح سویرے ......

"آپ جگر حیدرآبادی ہیں۔ ابراہیم جلیس کے بڑے بھائی ہیں"۔

"اوہ جگر حیدرآبادی ہیں! بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر" کرشن چندر نے مصافحہ کرتے ہوئے اپنے غلیظ کثیف دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر مڑکر ہمیطے کے کان میں "جگر جہاں بھی دیکھو۔ جلا بھنا ہی بنتا ہے کمبخت!"

سبطے نے ہنس کر کہا "ہاں حیدرآباد میں ہو یا مراد آباد میں یا اردو شاعری میں۔ اس کا ایک ہی رنگ ہے"

سردار نے سبطے اور کرشن چندر دونوں کو ڈانٹا "آئینے میں اپنی صورتیں ملاحظہ فرمایئے ذرا۔ پھر دوسرے پر اُنگلی اُٹھایئے گا۔"

"کچھ بھی ہو مجھے تو اس شخص سے نفرت ہو گئی ہے" کرشن چندر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"یہ آپ کی بدقسمتی ہے کیونکہ قیام و طعام کے تمام انتظامات جگر صاحب کے ذمہ ہیں" سردار نے ہر لفظ پر زور دے کے کہا۔

"باپ رے" کرشن چندر چونک کر اُچھل پڑا۔

(۴)

جس مکان میں مہمان ادیبوں کو ٹھہرایا گیا۔ وہ حیدر گوڑے میں واقع تھا۔ علی سردار جعفری نے کرشن چندر کو حیدر گوڑہ جاتے راستے میں ایک محل کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ گذشتہ مرتبہ اُردو کانفرنس کے موقع پر ہم لوگ اُس محل میں ٹھہرائے گئے تھے۔ قیام و طعام کا اس قدر اچھا انتظام تھا۔ بلکہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی اچھا تھا۔ ہر مہمان کیلئے دو نوکر وقف کئے گئے تھے۔ جو ہر وقت اُس کے کمرے کے باہر بیٹھے رہتے تھے۔ اس وقت کے نظم و نسق میں جاگیرداری کا مکمل شکوہ موجود تھا۔ اور کرشن چندر نے سوچا اب کے پرولتاریت کی حد ہو گئی ہے۔ دراصل اُسے جگر سے بغض للہی ہو گیا تھا اس لئے اسے یہ مکان بھی پسند نہ آیا۔ حالانکہ مکان نیا نیا تعمیر کیا گیا تھا۔ اور پورا مکان اُن لوگوں کے قبضے میں تھا۔ کرشن چندر نے دل ہی دل میں سب کو گالیاں دیتے ہوئے سب سے اچھا کمرہ اپنے قبضے میں کر لیا۔ باقی تین کمروں میں چھ چھ سات سات آدمی ٹولی بنا کر بس گئے۔ اور بستر فرش پر بچھ گئے۔ "اُونہہ چارپائی تک تو میسر نہیں۔ اور یہ باتھ روم کی کنڈی بھی غائب ہے اور نہانے کے لئے برتن موجود نہیں۔" جگر اُس کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے اور اُس کے دل کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ یکایک اُس نے رُک کر جگر صاحب کو مخاطب کیا۔

"بہت اچھا مکان لیا ہے آپ نے"

"اجی صاحب۔ ابھی ابھی بنا ہے"۔ جگر معصومیت سے فرمانے لگے۔

"وہ دیتا نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے اسے حاصل کیا۔ آپ لوگوں کے لئے۔ بالکل نیا ہے۔ ڈپٹی جلال الدین جو ہیں نا ......"

کرشن چندر نے دل میں کہا "اب آپ اس مکان کی کہانی سنائیں گے۔ اس کا شجرۂ نسب بیان کریں گے۔ ٹھیک ہے صاحب۔ کہئے۔ ہم سنیں گے۔ آپ کے مہمان جو ٹھہرے"

اتنے میں ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا "جگر صاحب سجاد ظہیر صاحب پلنگ مانگ رہے ہیں۔ اُن کے کمرے میں پلنگ ڈلوا دیجئے۔"

جگر صاحب نے کہا "پلنگ تو یہاں نہیں ہے۔ مگر ٹھہرو میں انتظام کرتا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ اپنی کہانی ادھوری چھوڑ کے چل دیئے اور کرشن چندر نے سوچا۔ کس قدر عجیب آدمی ہے۔ بھئی تم اپنی کہانی تو پوری کرتے جاؤ۔ یہ کیا بدتمیزی ہے کہ عین گفتگو کے بیچ میں اُٹھ کے چل دیئے۔ کس قدر بری بات ہے یہ۔ اچھی تہذیب ہے یہ۔ واہ!

پھر اُسے سجاد ظہیر کے پلنگ کا خیال آیا۔ بنّے سجاد پلنگ ہی پر سو سکتے ہیں۔ فرش پر نہیں۔ آخر اُن کے لئے پلنگ کیوں منگایا جا رہا ہے۔ وہ کیوں پلنگ پر سوئیں۔ اور ہم کیوں نہ پلنگ پر سوئیں۔ واہ۔ یہ اچھی رہی۔ کرشن چندر نے سوچا۔ بنّے پلنگ پر سوئیں گے تو میں بھی پلنگ پر سوؤں گا۔ بنّے کیلئے پلنگ آئیگا تو میرے لئے بھی آئے گا۔ میں کسی سے کم نہیں ہوں۔ اور یہ جگر صاحب کس صفائی سے مجھے یہاں اکیلا چھوڑ کے بنّے کے لئے پلنگ کا انتظام کرنے کیلئے چلے گئے۔ میں بھی تو اُن کا مہمان ہوں۔ مہمان ہوں۔ خاک مہمان ہوں۔ گھنٹوں سے یہاں خالی کمرے میں کھڑا ہوں۔ کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے اور بنّے کیلئے پلنگ منگایا جا رہا ہے اور میں یہاں فرش پر سوؤں گا۔ میرا ماتھا تو اُسی وقت ٹھنکا تھا جب میں نے جگر کو سٹیشن پر دیکھا تھا۔ خباثت اُس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ پلنگ لانے گئے ہیں۔ سجاد ظہیر اُن کے رشتہ دار ہوتے ہیں کیا۔ میں یہاں فرش پر سوؤں گا۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں لیکن لیکن۔ میں جب سے یہاں کھڑا ہوں کوئی نوکر بھی تو اس کمرے میں جھاڑو دینے نہیں آیا۔ اور دوسرے کمروں میں پلنگ بچھائے جا رہے ہیں۔ کون پوچھتا ہے مجھے۔ میں کون ہوں جو مجھے کوئی پوچھے گا۔ دراصل یہ سب سازش ہے مجھے ذلیل کرنے کیلئے یہاں بلایا ہے۔ وہ بیچارا احمد علی ٹھیک کہتا تھا۔ کرشن چندر کو اپنے آپ پر رحم آنے لگا۔ اور اُس کی آنکھیں غم و غصہ کے آنسوؤں سے نمناک ہو گئیں۔ اتنے میں مجلس استقبالیہ کے ایک رکن تشریف لائے۔

"چلئے چائے پی لیجئے"۔

"نہیں۔ میں چائے نہیں پیوں گا" کرشن چندر نے کہا۔
"آپ چائے نہیں پیتے؟"
"پیتا ہوں۔ مگر اس وقت نہیں پیوں گا"
"کیوں کوئی خاص بات ہے؟"
"جی نہیں۔ مجھے ذرا سی پیچش ہے"
"تو پیچش میں تو چائے مفید ہوتی ہے"
"ہوتی ہوگی۔ مگر میرے لئے نہیں۔"
"اچھا تو چلیے۔ تھوڑا سا ناشتہ ہی کر لیجئے۔"
"ناشتہ! میں ناشتہ بھی نہیں کروں گا"
"چلیے بھائی۔ تکلف نہ کیجئے۔ آپ ناشتہ نہیں کریں گے، تو جگر صاحب مجھ پر خفا ہوں گے"
"جگر صاحب کہاں ہیں۔ انہیں میرے پاس بھیج دیجئے"
"وہ ابھی آتے ہوں گے۔ سجاد ظہیر کیلئے پلنگ کا انتظام کرنے گئے ہیں"
یکایک کرشن چندر نے چلاّ کر کہا۔ "نہیں صاحب میں ناشتہ نہیں کروں گا۔ مجھے پیچش ہے۔ سر میں درد ہے۔ ہلکی ہلکی حرارت بھی ہے۔"
"بخار ہے۔ پیچش ہے۔ سر میں درد ہے۔ تو ٹھیریئے۔ میں ڈاکٹر کو بلا کے لاتا ہوں"
کرشن چندر نے کہا "ٹھیریئے ٹھیریئے" مگر وہ رُکا نہیں اور ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا۔

اتنے میں سردار قریب سے گزرا۔ "یہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو کرشن، چلو ناشتہ پر لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" اور وہ دونوں بازو میں بازو ڈال کر چل دیئے۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر جب وہ اپنے کمرے کو گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ باہر دہلیز پر جگر کھڑے ہیں اور اس کے کمرے میں پلنگ بچھایا جا رہا ہے۔ جگر نے کہا "ڈاکٹر ابھی آتا ہوگا۔ میں ابھی بستر کئے دیتا ہوں آپ اس پر آرام کیجئے"

(۵)

کانفرنس کا پہلا اجلاس، افتتاح کے موقعہ پر مسز سروجنی نائیڈو کی شعر بیانی، کیا عورت ہے۔ معمر ہونے پر بھی آنکھوں کی جواں سالی نہیں کھوئی، تبسم کی حیرانی نہیں کھوئی، روح کی جستجو اور پیہم کاوش نہیں کھوئی۔ بدلتا ہوا زمانہ ہر بار اک نیا مرحلہ سامنے لاتا ہے، اور یہ شاعرہ اس مرحلے کا یوں استقبال کرتی ہے۔ گویا مدت سے اُس کی منتظر تھی، اُٹھتی ہوئی لہریں بار بار ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ اور ان رواں دواں بلند و بالا موجوں کے تخت پر آپ اس عورت کو دیکھیں گے جس نے ہندوستانی سیاست اور ادب کے سارے رنگ دیکھے ہیں۔ فن سے زندگی تک، اور جوم ریعلی سے جمہوریت تک۔ وہ کبھی پیچھے نہیں رہی۔ اُس کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے۔ وہ زمانے سے ہمیشہ دو قدم آگے رہی ہے۔ "ممکن ہے اپنے باغیانہ خیالات کی بنا پر اب کے اُسے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں بھی جگہ نہ ملے۔" سردار نے سبطے سے کہا۔ "ش" سبطے نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھتے ہوئے کہا۔ سنو۔ کرشن اپنا مقالہ پڑھنے جا رہا ہے۔ ہال میں خاموشی تھی۔ پانچ ہزار آدمی چپ چاپ بیٹھے ہوئے ایک ادبی مقالہ سُن رہے تھے۔ اس سے پہلے ایسا نہ ہوا تھا۔ یہاں مشاعرہ نہ تھا۔ خطیبانہ انداز تکلم نہ تھا۔ کوئی گہری فلسفہ طرازی نہ تھی۔ لیکن لوگ خاموشی سے سُن رہے تھے۔ پانچ ہزار آدمی کالج کے طالبعلم، سکول کی لڑکیاں، سرکاری ملازم، دوکاندار، ریلوے مزدور، بے کار۔ ہر طبقے کے لوگ شامل تھے۔ اور خاموشی سے سُن رہے تھے۔ اور جب مقالہ نگار نے مراکو سے لے کے جاوا تک کے آزادی پسندوں کی تحریک کا ذکر کیا تو ہال نعروں سے گونج اُٹھا۔ اور جب ادب میں اشتراکیت کا ذکر آیا۔ انسانیت کا ذکر آیا۔ ایک بہتر نظام زندگی کا ذکر آیا جشن کی انقلابی ماہیت کا ذکر آیا۔ اور ان طبقوں کا ذکر آیا جن پر ہمارے ادب کے دروازے ابھی تک بند ہیں۔ تو سُننے والوں کے دلوں کے تار جھنجھنا اُٹھے جیسے مقالہ نگار کی زبان اور اُن کے دل مل گئے تھے۔ جیسے اُس مقالے میں وہ لوگ خود بول رہے تھے۔ پہلے روز یہ ہوا۔ دوسرے روز بھی اسی طرح ہوا تیسرے روز اور چوتھے روز بھی یہی ہوا۔ یہ مکمل انہماک، یہ سچائی کو پا لینے کی پاکیزہ جستجو ہر چہرے سے عیاں نظر آئی۔ گذشتہ دس سال سے لوگ تہذیبی اور ادبی کاوشوں کی طرف توجہ دینے لگے تھے۔ انہیں اپنی قومی زندگی کا عنصر بھی سمجھنے لگے تھے۔ اور گو تعمیری تنقید نے اتنی ترقی نہ کی تھی۔ پھر بھی باشعور پڑھے لکھے طبقے میں ان باتوں کا چرچا تھا۔ نئی تحریروں پر بحثیں ہوتی تھیں۔ بہ تعمق نگاہ ہر مضمون کے حسن و قبح پر اس کے افادی یا غیر افادی پہلوؤں پر۔ اس کے ترقی پسند یا ترقی پسند رجحانات پر بڑی تفصیل سے گفتگو

ہو رہی تھی۔ مختلف نظریئے تھے۔ مختلف اذہان تھے۔ مختلف زاویہ ہائے نگاہ لیکن ایک چیز ان سب میں وجہ اشتراک تھی۔ ادب اور کلچر اور تمدن سے دلچسپی۔ حقیقی دلچسپی اور قومی اور ملکی ادب کو اُس راہ پر گامزن کرنے کی آرزو ...... جہاں وہ اس کی بڑھتی، اُٹھتی، مچلتی ہوئی زندگی کا ترجمان بن جائے ہندوستان کے نوجوان کا دل جاگ اُٹھا تھا۔ اور ادب کی ہر تفسیر میں اپنی جگمگاتی ہوئی تمناؤں کے فانوس خیال روشن کر رہا تھا۔ یہ روشنی جو بڑھتی جا رہی تھی۔ جو اندھیرے پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ گیت جس کے ہر مصرعے میں ایک نئی لے کی چمک تھی۔ وہ جس کی ہر لے میں کروڑوں انسانوں کی آرزوؤں کی گونج تھی۔ اس نئے نغمے نے ہر ادیب کے دل کو بہجت سے لبریز کر دیا اور اُن کے دلوں کی دھڑکنیں اُن ہزاروں دلوں کی دھڑکنوں میں کھو گئیں جو اس وقت ہال میں موجود تھے۔ روشن چہرے ذہین آنکھیں۔ تالیوں کا شور اور نئی زندگی، نیا ادب۔ نئے انقلاب کے نعرے۔ یکایک کئی ادیبوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ گویا سب کے دل معاً شدت سے یہی محسوس کرنے لگے کہ ادب صرف تخیل کی چار دیواری میں محبوس ہو کر کس قدر محدود ہو جاتا ہے۔ اور اس بڑھتی ہوئی زندگی۔ کشمکش حیات کی آویزشوں سے ٹکراتی ہوئی زندگی کے بحرانی لمحوں میں گھل مل کر ادب اور ادیب کیسے اک نئی وسعت، اک نئے رُخ، اک نئے کیف وکم سے سرشار ہو جاتے ہیں۔

پہلے اجلاس کے ختم ہونے کے بعد بہت رات گئے اجلاس کی کامیابی پر گفتگو ہوتی رہی۔

——کالجوں کے لڑکے بڑے انہماک سے ادیبوں کی گفتگو سنتے رہے اور آٹوگراف لیتے رہے۔ یہ آٹوگراف کی بدعت بھی خوب ہے۔ ادیب جلدی میں یوں دستخط کرتے ہیں گویا کہہ رہے ہوں۔ ارے بھئی۔ ان لوگوں نے تو پریشان کر دیا۔ اب کوئی کہاں تک دستخط کرے۔ کبھی کبھی کسی لڑکی کی آٹوگراف بک آ جاتی تو قلم لے کے بیٹھ جاتے اور سوچتے کہ کس طرح ایک فقرے میں لیلیٰ و مجنوں کی پوری داستان بیان کر دیں۔ بعض لوگ بہت ہی کلبی بننے کی کوشش کرتے۔ ایں۔ اس میں ہے کیا آخر۔ آخر تو عورت ہی تو ہے۔ شوپن ہار والی عورت، جا معاف کر دیا تجھے۔ مدن گوپال سے کسی نے آٹوگراف نہیں مانگا۔ تو آپ تبسی نکالے ہر ایک سے پوچھ رہے ہیں۔ بھئی۔ اُس خوبصورت لڑکی کی بید بہ صفت آٹوگراف بک پر تم نے کیا لکھا۔ یہی یہی۔ اب کوئی پوچھے اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی۔ آٹوگراف بک جو مسلم ضیائی کے پاس تھی کئی اعتبار سے بہت دلچسپ تھی۔ سجاد ظہیر نے لکھا تھا "اشتراکیت زندہ باد"۔ کرشن چندر نے لکھا تھا "انسانیت زندہ باد" جوش نے لکھا تھا "ابھی تم دونوں بچے ہو" آگے ساغر نے لکھا تھا "کل زرا چار سو بیس ہے"۔ یہاں آ کے تسلسل ٹوٹ گیا اور جوش اور ساغر کے مناقشات پر گفتگو ہونے لگی۔ جوش کی رباعیوں کا ذکر آیا۔ فراق نے بھی رباعیاں کہنا شروع کی تھیں۔ موازنہ ہوا۔ اس جھگڑے میں رات کے دو بج گئے۔ صبح ہی سردار کو نظام کالج میں ایک تقریر کرنا باقی تھی۔ اُس نے سوچا لاؤ ابھی شیو کر ڈالوں۔ کرشن تمہارا شیو کا سامان کہاں ہے۔ کرشن کا سامان غائب تھا اُس نے بہت ڈھونڈا۔ لیکن کہیں نہ ملا۔ اُس نے گھور گھور کر جگر صاحب کی طرف دیکھا۔ جگر نے کوئی توجہ نہ کی۔ کرشن چندر کے دل میں نفرت اور بڑھ گئی۔ خوب۔ اب یہ پوچھتے تک بھی نہیں کہ بھئی آپ کا شیو کا سامان کہاں ہے۔ کیسے گم ہوا۔ یہیں کہیں ہوگا۔ میں ڈھونڈھ دیتا ہوں۔ مگر جگر نے جمائی لے کے کہا "میں تو چلتا ہوں۔ صبح فراق اور احتشام اور ڈاکٹر سعید الظفر تشریف لائیں گے۔ اسٹیشن جانا ہوگا۔"

"اور ہمیں تو نظام کالج جانا ہے" کرشن چندر نے کہا۔ "گاڑی کا انتظام کر دیجئے۔"

"میں دیکھتا ہوں" جگر نے سرسری طور پر کہا۔ اور کرشن چندر کا جی جل کے کباب ہو گیا۔ اور وہ اسی لمحے اپنے کمرے میں جا کے بستر پر دراز ہو گیا اور اس نے سوچا۔ میں کل نظام کالج نہیں جاؤں گا۔ نہیں جاؤں گا۔ چاہے مجھے کوئی کچھ بھی کہے۔ میری بلا سے" وہ صبح اُٹھا تو شیو کا سامان غائب ہی تھا دوبارہ ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملا۔ سردار بے چارہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گھوم رہا تھا۔ لیکن کسی کا شیو کا سامان خالی نہ تھا۔ آنند داڑھی مونڈ رہے تھے۔ سبطے نیند میں کراہ رہا تھا۔ سجاد ظہیر اپنے شیو کا سامان کسی کو مستعار نہیں دیتے۔ قدوس صہبائی نے جب دونوں ادیبوں کو نظام کالج کا عزم کرتے دیکھا۔ تو بولے "آپ لوگ شیو بنا لیتے تو اچھا تھا۔ سُنا ہے نظام کالج میں لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں"۔ سردار کا چہرہ تانبا ہو گیا تھا۔ اور کرشن چندر کا چہرہ ایک بھوکی بھیڑ کا۔ اتنے میں جگر گاڑی

ئے۔ چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری۔ نہ غم نہ مسرت۔ نہ حیرانی۔ نہ دلچسپی۔ نہ ادیبوں سے مرعوب تھے۔ نہ ان سے بیزار نظر آتے تھے۔ جیسے کوئی خاص دلچسپی انہیں اُن لوگوں سے نہ تھی۔ اور پھر کوئی ایسی اجنبیت بھی نہ تھی۔ کچھ عجیب قسم کی لاتعلقی چہرہ پر عیاں تھی جسے دیکھ کر کرشن چندر اور بھی جھلا دیا۔ اور اپنے چہرے کی بڑھی ہوئی داڑھی پر یوں ہاتھ پھیرنے لگا۔ گویا جنگل ہی میں ان کا شیو کا سامان گم گیا تھا۔

جب سردار اور کرشن چندر نظام کالج سے لوٹے تو فراق اور احتشام اور ڈاکٹر عبدالعلیم لکھنؤ سے تشریف لے آئے تھے۔ یہ سب لوگ کھانے پر بیٹھے عریانی پر بحث کر رہے تھے۔ سردار نے آتے ہی قلم ہاتھ میں لیکر ایک تجویز اس امر کے متعلق لکھنا شروع کی اور بحث طویل ہو گئی۔ فراق حسن کار ہیں۔ اس لئے انہیں عریانی سے اتنی نفرت نہیں، احتشام کی طبیعت میں نوجوانی کے باوجود اتنا ٹھہراؤ ہے کہ وہ عریانی کو دیکھ کر بدکتے نہیں۔ برافروختہ نہیں ہو جاتے سزائیں سنانے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کا انداز یہ تھا "میاں ابھی تم بچے ہو۔ کیا طفلانہ باتیں کر رہے ہو۔" اُن کے ہشاش بشاش چہرے پر مسکراہٹ کی لہر دوڑ دوڑ کے گم ہو جاتی تھی۔ وہ اپنی داڑھی اور وضع قطع سے فرانسیسی معلوم ہوتے ہیں۔ اور اپنے درشت انداز تکلم سے ہیڈ ماسٹر اور جنگ کا بگولہ ہوتے وقت سو فیصدی کمیونسٹ نظر آتے ہیں۔ اکثر لوگ غلط بات غلط موقع پر کہتے ہیں یا غلط بات صحیح موقع پر کہتے ہیں یا صحیح بات صحیح موقع پر کہتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر عبدالعلیم کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ صحیح بات کہتے ہیں اور ہمیشہ غلط موقع پر کہتے ہیں۔

چندر گھاٹ کالج میں انہوں نے تقریر کرتے ہوئے طلبا کے مجمع میں اُن کے اُستادوں کو وہ ڈانٹ پلائی کہ بیچارے اب تک یاد کرتے ہوں گے اسی طرح P.E.N کانفرنس کے موقعہ پر جب ڈاکٹر ملک راج آنند نے تجویز پیش کی کہ ہندوستان میں بھی فرانسیسی انسائیکلوپیڈیسٹ کی طرح ایک تحریک جاری کی جائے تو بہت سے لوگوں نے اس انقلابی تجویز کی حمایت کی۔ ان میں ریاست بیکانیر کے وزیر سردار پانیکر بھی شامل تھے لیکن صرف ایک آدمی کی پر زور مخالفت سے یہ تحریک رہ گئی۔ یہ مخالفت کرنے والا جانتے ہیں کون تھا۔ یہی اپنے ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب۔ آپ نے اُٹھ کر کہا۔ تجویز تو بہت معقول ہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں۔ کہ فرانس میں اس تحریک کے چلانے والوں میں بڑے بڑے لوگ تھے۔ روسو اور والٹیر۔ یہاں ایسا کون ادیب ہے، کون ایسا مفکر ہے آپ نے پورے مجمع پر نظر ڈال کر کہا۔ مجھے تو آپ لوگوں میں سے ایک آدمی بھی اُس پائے کا نظر نہیں آتا۔

مجمع پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ پھر مجمع میں سے کسی من چلے نے پوچھا۔

"کیا اسٹیج پر بھی کوئی ایسا آدمی آپ کو نظر نہیں آتا!"

اسٹیج پر سروجنی نائیڈو تشریف فرما تھیں۔ جواہر لال نہرو تھے۔ ڈاکٹر سارا بھائی تھے۔ فاسٹر۔ اور ملک راج آنند، ہرمن اولڈ اور احمد شاہ بخاری۔ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نے اسٹیج پر بھی نگاہ ڈالی۔ سب کی طرف دیکھا اور پھر مڑ کر مجمع کو مخاطب کر کے کہا "نہیں۔ ان میں بھی کوئی نہیں۔۔۔!"

تحریک گر گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب سچائی کو اس شدت احساس سے پیش کرتے ہیں۔ اور اس پر سختی سے کاربند ہوتے ہیں کہ اکثر اوقات بعد میں مخالف ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کی انہیں کوئی پروا نہیں۔ وہ ادیبوں کے مہاتما گاندھی ہیں لیکن ذرا عدم تشدد کے قائل نہیں۔ اور اگر کبھی ہندوستان میں ایسا قانون نافذ ہوا کہ ادیبوں کو ان کی فکری۔ ذہنی یا خارجی غلطیوں کی سزا ملنے لگی۔ تو اس احتساب کا محکمہ ڈاکٹر صاحب کے ہی سپرد ہوگا۔ اُن کی صاف گوئی۔ سے بہت سے لوگ ان سے گھبراتے ہیں۔ لیکن اسی میں اُن کی عظمت ہے۔ ورنہ اگر اس صنف میں کوئی اُن سے ٹکر لے سکتا ہے۔ تو وہ حسرت موہانی ہیں جو خوش قسمتی سے وہیں کانفرنس میں تشریف رکھتے تھے۔ اور مولانا فقرا اس کے ہر اجلاس میں شرکت کرتے رہے۔ چنانچہ جب ترقی پسند ادیبوں کی طرف سے عریانی کے خلاف قرارداد پیش کی گئی تو اس کی مخالفت کرنے والے مولانا حسرت موہانی تھے اور قاضی عبدالغفار مزے کی بات یہ تھی کہ نوجوان عریانی کے خلاف تحریک پیش کر رہے تھے اور بزرگ اس تحریک کی مخالفت کر رہے تھے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا۔ کہ شاید اس طرح نوجوان اذہان کی قوتیں مسلوب ہو جائیں گی اور اُن کی تخیلی فیکٹری رک جائے گی۔ مولانا حسرت موہانی کی پر زور تقریر سے قرارداد مسترد کر دی گئی۔ سبط بہت ناخوش تھا۔ کہنے لگا۔ "اماں مولانا کا ہمیشہ سے یہی رول رہا ہے۔ وہ جہاں گئے لوگوں کو مصیبت میں ڈالتے گئے۔ جب کانگریس میں تھے تو ہوم رول کے دنوں میں آزادی کا ذکر کر کے

کانگریس ہائی کمانڈ کو خائف کیا کرتے تھے۔ اور جب کانگریس نے لاہور کانگریس کے موقع پر مکمل آزادی کی قرارداد منظور کر لی تو آپ نے اشتراکیت کی بیخ کنی اور کانگریس سے ایسے ناخوش ہوئے کہ مسلم لیگ میں چلے گئے۔ وہاں پہنچے ہیں تو اب بیچارے شریف خاں بہادروں کو بغاوت پر اکسا رہے ہیں۔ اور مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کئے دے رہے ہیں۔ ہر جگہ مصیبت میں ڈالتے ہیں، لوگوں کو۔ بھئی اب اچھا بھلا ریزولیوشن پاس ہو رہا تھا۔۔۔۔ خیر۔۔۔۔ ہٹاؤ اب اس قصے کو۔" یہ کہہ کر وہ رُک گیا۔ اور اس کے چہرہ پر ہزاروں درد کی لکیریں یکایک معدوم ہو گئیں اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "مگر بھئی۔ یہ خوب ہیں مولانا۔ چٹان ہیں۔ بس کسی کی نہیں سنیں گے۔ اپنی جگہ سے کبھی نہیں ہٹیں گے۔"

دوپہر کو پریم چند سوسائٹی کا افتتاح تھا۔ حسین ساگر میں جو کلب ہے وہاں دعوت بھی تھی۔ ادیبوں کو کشتیوں میں سوار کرکے کلب میں پہنچایا گیا۔ حالانکہ ایک راستہ خشکی سے بھی جاتا تھا۔ غالباً موٹر بوٹ کی نمائش مقصود تھی کلب کی عمارت جھیل میں تعمیر کی گئی ہے۔ کوئی پچاس کے قریب ملازم ہوں گے۔ آٹھ کورس کا کھانا۔ اس دعوت پر اتنا صرف کیا گیا تھا۔ غالباً پریم چند کو اپنی زندگی میں اتنی رائلٹی نہ ملی ہوگی۔ یورپ میں جب ادیب زندہ ہوتا ہے تو اس کی قدر ہوتی ہے۔ ہندوستان میں مرنے کے بعد اسے پوچھا جاتا ہے چنانچہ آج پریم چند سوسائٹی کا افتتاح تھا۔ قاضی عبدالغفار تقریر کر رہے تھے۔ اور مرغن کھانے دعوت میں شامل تھے۔ اور جھیل کے منظر سے ادیب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ قاضی عبدالغفار صاحب کی شخصیت پر متانت کا ایک دبیز پردہ پڑا ہوا ہے۔ لیکن اتنا دبیز بھی نہیں کہ ان کی جبلی خوش طبعی اس متانت کے اندر سے جھلک نہ اٹھے۔ متانت ہے لیکن بوجھل نہیں ہے۔ خوش طبعی ہے۔ لیکن مکمل کر نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کسی چیز نے، کسی خاص واقعہ نے یا کسی خاص ماحول نے ان کے ذہن کے، اُن کے فکر کے، اُن کی فطری صلاحیت کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ وہ اس پر بھی محیط ہیں۔ اُس پر بھی۔ دونوں رنگ ایک ہی شخصیت میں جھلکتے نظر آتے ہیں۔ پیرس کی رنگینی بھی ہے۔ عالمانہ زہد بھی ہے، شگفتہ انشا پردازی بھی ہے اور فکری ٹھہراؤ بھی، لباس میں امارت کی جھلک ہے اور گفتگو میں علم کی چاشنی، تیور جاگیردارانہ ہیں۔ اور ذہن باغیانہ، قاضی صاحب ایک ایسے نوجوان ہیں۔ جیسے عرصے سے کسی نے گدگدایا نہ ہو۔ لیکن خود اُس کے اپنے دل میں شوخیاں چٹکیاں لے رہی ہوں کاش کوئی مصنف لیڈ کے خطوط کو گدگدا دے۔ اس طرح کہ وہ بھری محفل میں ــــ یاروں کی محفل میں نہیں۔ ہزاروں لاکھوں معمولی آدمیوں کی محفل میں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ یہ گدگدی ایک بہت بڑے شاہکار کا پیش خیمہ ہو

کرشن چندر نے مسلم ضیائی سے پوچھا "بھئی تم شادی کیوں نہیں کرتے جواب تو تمہاری آنکھوں پر عینک بھی آ چکی ہے۔"

مسلم ضیائی نے اپنی عینک کے شیشوں کو صاف کرتے ہوئے کہا:

"تم نہیں جانتے۔ آہ!"

"کون ہے وہ ظالم!" کرشن چندر نے پوچھا۔

"وہ ہر روز کانفرنس میں آتی ہے۔ آہ!"

گاڑی چار مینار کے گرد گھوم کر ایک گل فروش کی دوکان پر کھڑی ہو گئی۔ مسلم ضیائی اُتر کر گجرے خریدنے لگے۔

"یہ گجرے کیا کرو گے؟"

"میں اُسے بھیجوں گا۔ اُسے یہ گجرے بہت پسند ہیں؟"

"آہ!" کرشن چندر نے کہا۔ "مجھے اپنی بیوی کیلئے چوڑیاں خریدنی ہیں اور ایک مرادآبادی پاندان"

"واہ! یہ سب چیزیں تو قریب ہی کے بازار میں مل سکتی ہیں" مسلم ضیائی نے جواب دیا۔

"آہ!" کرشن نے کہا۔

قریب کے بازار سے سب چیزیں مول لیکر واپس ہوئے تو چار مینار کے قریب گاڑی روک کر ایک طرف کھڑی کر دی گئی۔ مینار پر گھڑی میں ابھی پانچ نہ بجے تھے۔ چاروں طرف سیٹیاں بج رہی تھیں۔ سائیکل والے سائیکلوں سے اُتر کر، گھوڑا گاڑی والے گاڑی ٹھیرا کر، کار والے کار ایک طرف کرکے اور پیدل چلنے والے جہاں تھے وہیں رُک کر جامد و ساکت ہو گئے۔ چاروں طرف جدھر نگاہ جاتی تھی۔ خاموشی تھی۔ گہرا سناٹا اور خوف کے سر جھکے ہوئے تھے اور شیروانیوں کے بٹن گلے تک بند تھے۔ اور آنکھیں آسمان کی پہنائیوں کو چھوڑ کر زمین کی پتھریلی سطح پر جھکی ہوئی تھیں اور پسینہ میں عرق عرق پیشانیاں کسی نظر نہ آنے والے خدا کے آستانے کی جبہ سائی کر رہی تھیں۔ یکایک کہیں سے ایک سیاہ موٹر گزر گئی۔ مینار کے

سامنے کھڑے ہوئے سپاہیوں نے سلامی اتاری، اور گاڑی بہت دُور نکل گئی اور یکایک مینار کے گھڑیال نے پانچ بجائے۔ اور یکایک جیسے ساری فضا کی خاموشی چھن سے ٹوٹ گئی۔ اور جھکی ہوئی گردنیں اوپر اٹھ گئیں۔ اور موٹر اور سائیکل اور گھوڑا گاڑیاں چلنے لگیں۔ اور دکاندار گاہکوں کو سودا دینے لگے۔ اب پھر وہی شور و غل تھا۔ وہی ہاؤ ہو۔ وہی زندگی۔

"کیا ہوا تھا بھئی؟" کرشن چندر نے ایک چاؤش سے پوچھا جو اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔

چاؤش نے اُسے گھور کر دیکھا۔ اور اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھ کر کہا "ابھی سرکار کی سواری ادھر سے گزر گئی ہے۔ اندھے ہو کیا تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں؟"

"چلو۔ چلو۔ گاڑی بڑھاؤ!" مسلم ضیائی نے ٹیکسی والے سے کہا اور پھر مڑ کر کرشن چندر سے کہنے لگا۔

"یہ چاؤش آزاد عرب کے لوگ ہیں۔ ان سے" یا چاؤش "کہہ کے گفتگو کرنا چاہیئے "بھئی" کہہ کے نہیں۔ وہ تو یوں کہو۔ شریف چاؤش تھا۔ ورنہ کوئی اور ہوتا تو ابھی اس بات پر تمہارے پیٹ میں چھری بھونک دیتا!"

"یا چاؤش"! کرشن چندر نے گھبرا کر کہا "اب کہاں چلو گے؟"

"راجہ شامراج جی کے ہاں دعوت ہے۔ چھ بجے!"

راجہ شامراج کا محل۔ پرانا محل۔ شہر میں واقع ہے۔ اونچی فصیل کے اندر ایک باغیچہ ہے۔ باغیچہ میں ایک مور ناچ رہا تھا۔ جب ادیب لوگ وہاں پہنچے تو دس بارہ موٹریں ایک طرف استقبال کیلئے کھڑی تھیں۔ راجہ صاحب غائب تھے۔ ادیبوں کو موٹر ڈرائیوروں۔ سپاہیوں اور راجہ صاحب کے مصاحبوں نے جھک کر سلام کیا۔ اور یہ بیچارے کچھ حیران، کچھ پریشان، کچھ پشیمان سے، محل کی سیڑھیوں پر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ اتنے میں کسی نے کہا "ادھر تشریف لایئے۔ ادھر لائبریری کی طرف" یہاں راجہ صاحب سے تعارف ہوا۔ بظاہر صدق و صفا کی مورت۔ دبلے پتلے، پیشانی پر تلک، اتنی بڑی لائبریری۔ اتنی اچھی لائبریری، ہر موضوع پر کتابیں جنہیں غالباً آج تک کسی نے کھول کر پڑھا نہ تھا۔ بہت سی کتابوں کے ورق بھی کاٹے نہیں گئے تھے۔ پوری لائبریری میں صرف دو بچے پڑھ رہے تھے۔ یہ سنگ مرمر کے مجسمے تھے اور ایک سنگ مرمر کی کتاب کھولے ہوئے اس پر جھکے ہوئے تھے۔

اور نجانے کتنے سالوں سے اسی طرح جھکے ہوئے اس کتاب کے اس صفحے کو پڑھ رہے تھے۔ یہ سنگ مرمر کے صفحے۔ یہ سنگ مرمر کے بت۔ یہ سنگ مرمر کے محل، لیکن ہم لوگ یہاں کیا کر رہے تھے۔ کیوں اس دیار غیر میں اجنبیوں کی طرح گھوم رہے تھے۔ وہ گھر جو اپنا نہ تھا۔ جس کے ہر سنگ مرمر کی رگ کا خون سفید ہو چکا تھا۔ سامنے مور ناچ رہا تھا۔ ایک کمرہ اشتراکیت کے موضوع سے متعلق تھا۔ یہاں ہزاروں کتابیں جمع تھیں۔ مصاحب ادیبوں کو اس طرح دیکھ رہے تھے۔ گویا یہ تماشہ ہوں اور وہ تماشائی۔ اُن کی نظریں گویا کہہ رہی تھیں "تمہارے ایسے سینکڑوں لوگ یہاں آتے ہیں اور دعوت کھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہم ادیبوں کو بلاتے ہیں۔ اور سرکس والوں اور مداریوں کو۔ اور مسخروں کو یہاں سیاح آتے ہیں۔ اور بھک منگے بھی۔ اور سیاست دان بھی۔ ہمارے راجہ صاحب سب کو دعوت پہ بلاتے ہیں۔

ہمارے راجہ صاحب بہت اچھے ہیں۔ لیکن اُن کے اچھا ہونے سے آپ لوگ اچھے نہیں ہو سکتے۔ سردار صاحب آپ کی قمیص پھٹی ہوئی ہے۔ آپ کی شیروانی کا بٹن غائب ہے سبطے میاں۔ فردوس صاحب آپنے یہ جھولا کیسے لٹکا رکھا ہے۔ مہندر بھائی آپ نے سر پر یہ جنگل سا کیا اگا رکھا ہے۔ کرشن چندر صاحب آپ کی پتلون پر دس پیوند ہیں۔ آپ لوگ یہاں کیا کھا کر ترقی پسندی کا دعویٰ کریں گے؟"

سامنے مور ناچ رہا تھا۔

ایک صاحب جو غالباً راجہ صاحب کے وزیر معلوم ہوتے تھے بولے "سرکار کا عجائب گھر بھی دیکھئے گا۔" سرکار کا عجائب گھر اس وقت تو یہ سارا محل عجائب گھر معلوم ہو رہا تھا جس میں نمونے کے طور پر ترقی پسند ادیب مختلف کمروں میں رکھ دیئے گئے تھے۔ اس بانکڑانی میں سجاد ظہیر، ڈاکٹر تارا چند اور ملک راج آنند تھے۔ اس لرسے میں سردار اور عادل رشید۔ سبطے حسن اور رفعت سروش محبوس تھے۔ اس شیشے کی الماری کے قریب کرشن چندر، مدن گوپال اور فراق گورکھپوری ایستادہ تھے۔ فراق صاحب کے چہرے پر غیض و غضب کے آثار نمایاں تھے۔ اور ان کی گول گول پتلیاں حیرت و استعجاب میں ڈوب کر ادھر اُدھر مجذوبانہ انداز میں تک رہی تھیں۔ ایں۔ ہم لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ ہم دعوت کھانے

آگئے ہیں یا اپنا خون پینے آئے ہیں۔

فراق بولے ۔ بلند آواز میں "بھئی میں تو چلتا ہوں" یہ کہہ کر وہ چلے۔

"ٹھہریئے ۔ ٹھہریئے" وزیر نے کہا "وہ راجہ صاحب کا عجائب گھر!"

"اچھا صاحب" فراق صاحب نے رمان کر کہا "چلئے! وہ بھی ہو جائے"

ایک کمرے میں پتھر کے بت ۔ ایک کمرے میں دیوتاؤں کے بت۔ پتھر کے نہیں دھات کے ۔ ایک کمرہ میں آصفیہ خاندان کے خطوط جو راجہ صاحب کے بزرگوں کو لکھے گئے تھے۔ راجہ صاحب کے بچوں کے خطوط جو انہوں نے اردو میں لکھے تھے۔ یہ خطوط شاید اردو سے نسبت کے ثبوت میں تھے

ایک کمرے میں مختلف تصاویر۔

وزیر نے کہا۔ "مجھے وہ تصویر بہت پسند ہے۔"

کوئی خاص بات اس تصویر میں نہ تھی۔ ایک خوبصورت عورت کی تصویر تھی۔ جس نے ایک سپید ساڑی پہن رکھی تھی۔ اس طرح کہ ساڑی کے اندر عورت تقریباً ننگی نظر آتی تھی۔ کمر کے خم میں گاگر نے کمر لی تھی۔

"بے حد پسند ہے مجھے" وزیر کے ہونٹ کھلنے تھے۔ اُسکے وہ موٹے موٹے کھلے کھلے بدصورت ہونٹ!

سامنے مور ناچ رہا تھا

"میں جا رہا ہوں بھئی کرشن" فراق نے جھلا کے کہا۔

"ٹھہریئے ۔ ٹھہریئے" وزیر نے گھبرا کے کہا "چائے پی کے جایئے"

"ہوں" فراق صاحب نے جھلا کے کہا اور باغیچہ میں جا کے چائے پینے لگے۔

چائے پینے کے بعد راجہ صاحب کے ساتھ ترقی پسند ادیبوں کا فوٹو کھینچا گیا۔ دائیں طرف سجاد ظہیر بائیں طرف کرشن چندر اور کرسیوں پر دوسرے ادیب اور بہت سے ادیب مصاحبوں کی طرح پیچھے کھڑے تھے۔ سردار اور سبطے اور دوسرے انقلابی ادیب۔

"میں حاضر ہوں سرکار" فوٹو گرافر نے کہا۔

راجہ صاحب نے اشارہ کیا۔ اور فوٹو لے لیا گیا۔

فراق کے بدن میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ لیکن اب فوٹو لے لیا گیا تھا۔ فوٹو بہت ضروری تھا۔ فوٹو سے راجہ صاحب کی ترقی پسندی کو کیا ظاہر ہوتی تھی۔ اپنی ذلت پسندی کی انتہا ہو گئی تھی۔ سردار نے کہا "اگر مجھے معلوم ہوتا" سبطے بولا "انقلاب کے دوران میں جاگیردار ایسے ایسے کئی فوٹو پیش کر کے اپنے آپ کو اشتراکیت کا علمبردار ثابت کریں گے۔ اور ان باتوں سے کیا ہوتا ہے" قدوس صہبائی بولے "ذرا گردن ناپ دی جائے گی" "مگر ایسا ہوا کیوں؟" مدن گوپال چیخے "ہم یہاں آئے کیوں"

فراق بولے "اگر کوئی میرے ساتھ چلتا ہے تو چلے ۔ ورنہ میں تو ابھی چلا"

"ٹھہریئے ۔ ٹھہریئے" وزیر نے چلا کر کہا "پان اور عطر حاضر ہے"

سونے کا عطردان اور چاندی کا پاندان اور پان کھلا کے اور عطر لگا کے اور ہاتھ میں ایک گلدستہ تھما کے ادیبوں کو رخصت کر دیا گیا۔ چلتے وقت یہ محسوس ہو رہا تھا گویا کسی نے منہ پر تھوک دیا ہے۔ پیشانی پر کیچڑ مل دی ہے اور روح میں غلاظت کے انبار لگا دیئے ہیں۔ ہر شخص اُتر کا پھیکا معلوم ہو رہا تھا۔

سامنے مور ناچ رہا تھا۔

واپس قیام گاہ پہنچ گئے۔ تو دیکھا سامنے صحن میں جگر حیدرآبادی کھڑے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ "کہئے صاحب ۔ راجہ صاحب کی دعوت سے فارغ ہو گئے"

اس کے بعد ہنسے ۔ ہونٹ لال ۔ مسوڑھے لال ۔ دانت لال۔ زعفرانی رنگ چہرے پر یہ رستا ہوا سرخ زخم جی میں آیا گلا گھونٹ دیا جائے۔ سردار نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں اور اپنے آپ پر بہت جبر کر کے بولے ۔ بندۂ خدا بتا تو دیا ہوتا ۔ کہاں دعوت ہے ۔ ہمیں کیا معلوم یہ شاہراج راجراج جی کون ہیں ۔ ہم تو سمجھے تھے کوئی ادب نواز صاحب ہیں"

"ادب نواز تو وہ ہیں ورنہ آپ کو بُلاتے کیوں"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر ــــ مگر یہ راجہ ، یہ نواب ، یہ یار جنگ بہادر تم سمجھو گے نہیں" جگر گھوم گئے مطبخ کی طرف جاتے ہوئے بولے "آپ کے لئے شام کے کھانے کا انتظام کرنے جا رہا ہوں۔ شام کے کھانے سے پہلے اردو مجلس کے یہاں سے تمام مندوبین کو بلاوا آیا ہے۔ جانا ہوگا"

وہ مڑ کر گھوم گئے۔ فراق نے انہیں معاف نہیں کیا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں گھماتے ہوئے بولے "یار عجب آدمی ہے ۔ بچہ ہیں گھنٹے ..."

رہتا ہے۔ جب دیکھو قیام گاہ میں حاضر ہے۔ یہ شخص سوتا نہیں۔ کھاتا نہیں۔ پیتا نہیں۔ جب دیکھو اِدھر سے اُدھر۔ اُدھر سے اِدھر گھومتا رہتا ہے۔ اسے کیا ہوا ہے؟"

اس کے بعد خود ہی حیران اور ششدر کھڑے رہ گئے۔ دیر کے بعد سبطے سے مخاطب ہوئے "کچھ سمجھ میں نہیں آتا —۔ آؤ بھئی تمہیں کچھ رباعیاں سنائیں۔"

"آپ چلئے۔ میں ابھی آتا ہوں" سبطے نے کہا۔

بعد میں سبطے نے کرشن کو بھی گھسیٹنا چاہا "چلو۔ رباعیاں سنو تم بھی۔ کمبخت رباعی بہت اچھی کہتا ہے۔"

عادل رشید پتلون کی کریز درست کرتے ہوئے بولے "بہت بڑا شاعر ہے"

سبطے نے کہا۔ "اس کی شاعری ہندستانی کلچر کی معراج ہے۔"

کرشن چندر نے کہا "میں نہیں جاؤں گا سننے اس وقت!"

لہجے میں ضرورت سے زیادہ تلخی تھی۔ حسد اور رشک اور ایک حریفانہ رقابت کہ ہائے میں شاعر کیوں نہیں۔ یہ ہر محفل میں شاعر کیوں چھا جاتا ہے۔ افسانہ سنتے ہی لوگوں کو جمائیاں آنے لگتی ہیں۔ کاش میرا افسانہ فراق کی رباعی کی طرح خوبصورت ہوتا......

(۷)

شام اور رات کے بیچ کے وقفے کی دھندلی اُداسی ادیبوں کی پھیکی پھیکی اکتائی ہوئی تھکی ہوئی صورتیں میرزا فرحت اللہ بیگ کے وسیع و عریض برآمدے کے باہر بطخوں کا بے ہنگم خرام۔ اُردو مجلس میں چائے اور مشاعرے کا بندوبست۔ شاعروں کی آوازیں اور چینی کے پیالوں میں چلتے ہوئے چمچے اور سرکیوں کے پیچھے پردہ پوش خواتین کی کڑی تنقید۔

"ہائیں — یہ کرشن چندر ہیں"

"کون وہ ٹھنگنے سے ... اری وہ"

"کرشن چندر نہیں چندر چندر معلوم ہوتے ہیں"

قہقہہ۔

کرشن چندر کا کھانسنا۔ وہ کھانسی گویا کہہ رہی ہو۔ دیکھئے ہم بھی سن رہے ہیں۔

عادل رشید اس طرح بیٹھے ہوئے تھے گویا میر مشاعرہ وہی تھے۔

قدوس صہبائی۔ گویا ابھی چوتھے دروئش کا سرگذشت سنا کے مستا رہے ہوں۔

فضا میں اُجلے پن کے باوجود تیرگی۔ عرصۂ زماں میں حال کے باوجود ماضی کا دھندلکا۔ محبت کے باوجود اک کربناک کھنچاؤ جیسے رگیں ٹوٹ رہی ہوں۔ جیسے دو زمانے۔ دو نسلیں اور دو زاویۂ نگاہ ایک دوسرے کے قریب آنے کی ناکام کوشش کر رہے ہوں۔ جیسے اندھیرا جالے میں اور ماضی مستقبل میں۔ اور موت زندگی میں اپنا عکس ڈھونڈ رہی ہو۔

کیفی نے اپنی نظم مرثیہ خوانوں کے انداز میں سنائی۔

خاموشی۔ گہرا سناٹا۔

ایک پیرومرشد نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا "آپ شاعر ہیں۔"

پھر خاموشی۔ لوگ اس جملے کی اہمیت پر غور کر رہے ہیں۔

سب مؤدب بیٹھے ہوئے ہیں گویا کسی ایٹم بم کا انتظار کر رہے ہیں۔

پھر کسی نے کہا۔ مرزا صاحب آپ کچھ سنائیے۔

مرزا صاحب سنانے لگے۔ "جمنا کا کنارہ"

سرکیوں کے پیچھے کسی نے کہا "کنارہ نہیں کنارہ کہئے!"

تہذیب اور کلچر موت کے زہر آب میں گرفتار ہوں۔ لیکن گرامر نہیں بدل سکتی۔ زندگی بدل جائے۔ لیکن زبان کی ہیئت نہیں بدل سکتی۔ زمان و مکان میں تغیر کی نمو ہو سکتی ہے۔ ملک و ملت اور افراد و کردار کی ہیئت میں، طرز و گفتار میں، ان کی سماجی، سیاسی، شعوری زندگی میں انقلاب آ سکتا ہے۔ لیکن زبان میں کوئی تغیر ممکن نہیں۔ وہ موت کی طرح اور خدا کے آخری حکم کی طرح قطعی ہے۔

اے لسانی مقابر کو پوجنے والی مخلوق، سر جھکائے مؤدب بیٹھی رہ۔ اس کی فکر نہ کر کہ سر سے طوفان گزرا جا رہا ہے۔ قانزر کی بیش قیمت چائے دانیوں سے ابلتی ہوئی چائے انڈیل۔ صحن میں آہستہ خرام، کڑکڑاتی ہوئی بدصورت بطخوں کو دیکھ اور سن۔ جمنا کا کنارہ...... نہیں..... نہیں..... جمنا کا کنارہ ..... معاف کیجئے گا۔

کرشن چندر نے جھک کر نظر کے کان میں کہا "خودکشی کیلئے کونسی جگہ بہتر رہے گی۔"

نظر نے بہت سوچ بچار کے بعد کہا "ایکاجی کا ہوٹل"

"تو چلو پھر دیں"

آخر کانفرنس ختم ہوگئی۔ سبطے نے فنِ صحافت پر اپنا مقالہ بھی پڑھ لیا۔ کسی شخص نے اُسے ٹوکا نہیں۔ سردار نے اقبال کے رجعت پسند نقادوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ کسی نے اس کے پیٹ میں چھرا نہیں بھونکا۔ ڈاکٹر تاراچند نے اردو کا شجرۂ نسب دو ہزار سال کے پرانے ہندوستان کی تہذیب سے جا ملایا۔ کسی ہندو مہاسبھائی نے اُف تک نہ کی۔ لیکن جب کانفرنس ختم ہونے کے بعد مخدوم نے آہستہ سے کہا "بھئی۔ وہ ریلوے کے مزدور تم لوگوں کو اپنے جلسے میں بلانا چاہتے ہیں" تو بہت سے لوگ زکام اور ہیضہ اور بخار سے بیمار پڑ گئے۔ جگر صاحب نے بڑی مستعدی سے لوگوں کے بستر باندھنا شروع کر دیئے۔ کچھ لوگ بازار میں خرید وفروخت کرنے کیلئے چلے گئے۔ کچھ لوگ جی، ای، این کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے اسٹیشن سے جے پور کے ٹکٹ لانے کے لئے چلے گئے۔ کچھ لوگ بیمار بن کر بستر پر دراز ہوگئے۔ مزدوروں کے جلسے کیلئے صرف کیفی، سردار اور ساحر پہنچے۔

مخدوم نے تعارف کرایا۔ یہ کیفی ہیں

انقلاب زندہ باد

یہ سردار ہیں ——— انقلاب زندہ باد

یہ ساحر لدھیانوی ہیں

انقلاب زندہ باد

سٹیشنوں پر کام کرنے والے لوگ، سانولے کالے لوگ، موٹے موٹے چہروں کھُردرے ہاتھ پاؤں والے لوگ، بدصورت لوگ۔ غلیظ لباس پہننے والے لوگ۔ بُرا کھانا کھانے والے لوگ۔ لوگ جو نہ "واللہ" کہہ سکتے تھے نہ "مکرر ارشاد"، نہ "ہائے کیا شعر ہوا ہے"۔ لوگ جن کے آداب ان کی زندگیوں کی طرح کھُردرے تھے۔ اُن کے لباس کی طرح وحشی تھے۔ اور اُن کے اعتقاد کی طرح مضبوط تھے۔ یہ لوگ خوبصورت الفاظ میں شاعروں کی تعریف نہیں کر سکتے تھے۔ یہ لوگ جو خاموش تھے۔ اور سُن رہے تھے۔ اور مکرر ارشاد نہ کہنے کے باوجود اُن کے چہروں کی آب اور اُن کی آنکھوں کی چمک، اور اُن کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گویا کہہ رہی تھی۔ ہم خوش ہیں۔ کیونکہ تم ہمارے ہو۔ ہم میں سے ایک ہو۔ ہماری خوشیوں اور غمیوں کے گیت گاتے ہو۔ اور اپنے الفاظ کی حسین تصویروں میں ہمارے دُکھ کا مداوا ڈھونڈتے ہو۔ تم ہماری برادری میں سے ہو۔ اُن انسانوں کی عظیم برادری میں سے جہاں کسی انسان کا حق دوسرے انسان کے حق پر فائق نہیں سمجھا جاتا۔ آؤ۔ آؤ ہم تمہارا استقبال کرتے ہیں۔ چمکتی ہوئی آنکھوں سے۔ خاموش کانپتے ہوئے ہونٹوں سے اور بھینچی مضبوط مٹھیوں سے۔ خوش آمدید ساتھیو۔ اب تک تم ویرانے میں گھومتے رہے۔ آج تم گھر میں آئے ہو۔ ہمارے پاس حریری پردے نہیں ننگی دیواریں ہیں۔ سونے کے پلنگ نہیں پتھر کا فرش ہے۔ ہماری جیبیں خالی ہیں۔ لیکن دل آنسوؤں سے معمور ہیں۔ محبت کے آنسو۔ شفقت کے آنسو۔ رفاقت کے آنسو! . . . . آؤ . . . . . آؤ . . . . ساتھیو!

ساحر لدھیانوی کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ شعر کہتے کہتے رُک گیا۔ اور اس کی نمناک آنکھوں میں جیسے سارا مجمع ناچ گیا۔ اور اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا اپنے عزیزوں سے گلے مل رہا ہو۔ یہ اس کی ماں تھی۔ یہ بھائی۔ یہ بہن۔ یہ بچپن کا محبوب ساتھی . . . . . آؤ . . . . . آؤ . . . . ساتھیو!

اب وہ لوگ فارغ ہوکر حیدر آباد کے سٹیشن پر پہنچ گئے تھے ریلوے کے مزدوروں نے تھرڈ کا ایک چھوٹا سا ڈبہ اُن کے لئے وقف کرا دیا تھا۔ تاکہ انہیں دورانِ سفر میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اب اِس کمرے میں اُن کا سامان رکھا جا رہا تھا۔ سٹیشن کا پلیٹ فارم تھرڈ کلاس کی مخلوق سے اٹا ہوا تھا۔ اور غلیظ بستروں اور زنگ آلود سیاہ ٹرنکوں۔ بدبودار ٹوکروں اور کھانچیوں سے ایک غلیظ مال گودام کی صورت میں مبدل ہو چکا تھا۔ جالی دار ٹوکریوں میں مرغیاں کُڑکُڑا رہی تھیں اور اُن کے قریب سیاہ فام گھاٹنیں اپنے کمر کے گرد لپٹی ہوئی مرہٹی ساڑھی کے پلو سے جوئیں چننے میں مصروف تھیں۔ اتنے میں زور سے ایک موٹر کے ہارن کی آواز کانوں میں آئی۔ اور ایک سیاہ رنگ سیڈان سٹیشن کے پلیٹ فارم پر جہاں موٹر گاڑیوں کا آنا ممنوع ہے چلتی ہوئی دکھائی دی۔ پوں۔ پوں۔ آگے سے ہٹ جاؤ۔ پوں۔ پوں . . . . . پولیس کے آدمی ہنٹر لئے ہوئے لوگوں کو پرے ہٹانے لگے۔ قلی اسباب راستے سے اُٹھانے لگے۔ راستہ صاف ہوگیا۔ پوں پوں۔ موٹر پلیٹ فارم پر چلتی گئی اور آخر تھرڈ کلاس کے ڈبے کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی جو کسی بڑے آدمی کا سپیشل سیلون معلوم ہوتا تھا۔

کار میں سے پہلے سنہری وردی میں ملبوس ایک اردلی اترا۔ پھر اس نے کار کے دروازے کا پٹ کھولا اور جب تک پولیس کے لوگوں نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال لیا اور پھر کوئی کچھ نہ دیکھ سکا کہ کیا ہے۔

"کیا ہے"۔ ایک نے پوچھا۔

"سر سلطان بالقابہ کا سپیشل سیلون ہے۔"

"سر سلطان احمد جو وائسرائے کی کونسل کے ممبر ہیں؟"

"جی ہاں وہی"

"یہاں حیدر آباد میں کیا کرنے آئے تھے؟"

"آپ کس عزیز کی شادی میں یہاں آئے تھے۔ وہ دلہن کمپارٹمنٹ ہے اور یہ باہر کیا رکھا ہوا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو۔ یہ جہیز کا سامان ہی تو ہے۔

مُرغی کے بدبودار ٹوکروں۔ اور غلیظ جام سے بھرے ہوئے کھانچوں اور زنگ آلود مٹکوں سے نظریں پھسلتی ہوئی اُس ساز و سامان پر پڑیں۔ جہاں چاندی کے برتن پڑے تھے۔ اور اخروٹ کی بیش قیمت چیزیں اور رو پہلے پایوں والے پلنگ۔ اور صراحیاں جن پر طلائی آب و رنگ تھا اور پھر نظریں وہاں سے پھسلتی ہوئی جو ٹیں چھنتی ہوئی متیالی کائی سٹو لی غلیظ گھاٹیوں کے جسموں کو انداز تنفر دیکھتی ہوئی اُس کھڑکی کے باہر جا کر رُک گئیں۔ جہاں ریشمی پردہ لہرا رہا تھا۔ آگے مت جاؤ۔ ریشمی پردہ کہہ رہا تھا۔ آگے مت جاؤ۔ یہ ریشم کی دیوار ہے۔ اس دیوار کے ادھر تمہاری دنیا ہے۔ غریبی کی کیچڑ میں کلبلاتی ہوئی مخلوق، ریشم کی دیوار کے اُس طرف دوسری دُنیا ہے۔ جس کی ہر سانس میں آسودہ تعیش کا عطر ہے۔ ہر تبسم میں کامران انگوروں کی شراب ہے۔ ہر لے میں فتح کا مغرور نغمہ ہے اور ان دونوں دُنیاؤں کے بیچ میں ایک پتلی شفاف سی ریشم کی دیوار ہے۔ اتنی پتلی اور ایسی شفاف کہ لوگ آرپار دیکھ سکتے ہیں۔ اس دُنیا کے لوگ اُس دُنیا کے لوگوں کو اور اُس دنیا کے لوگ اس دنیا کے لوگوں کو اجنبی نگاہوں سے۔ دشمن نگاہوں۔ نفرت کی نگاہوں سے تک رہے ہیں۔ تک رہے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں۔ ڈر رہے ہیں لیکن کوئی اِدھر سے اُدھر یا اُدھر سے اِدھر نہیں آتا۔ کوئی اس پتلے شفاف سے پردے کو ہاتھ کے ایک ہی جھٹکے سے چاک کرنے کی ہمت نہیں کرتا۔

آؤ۔ آؤ۔ ساتھیو یہ دیکھو یہ سر سلطان احمد کا سپیشل سیلون ہے۔

وہ تمہارا تھرڈ کلاس کا ڈبہ ہے۔ یہ اُن کا سنہری وردی میں ملبوس بیرا ہے وہ پھٹے ہوئے کالروں والا علی سردار جعفری ہے۔ یہ اخروٹ کا میز ہے۔ جس پر کشمیر کے کاریگروں نے حسین پچی کاری کی ہے۔ وہ رفعت سروش کا بستر ہے۔ جس میں درجنوں پیوند لگے ہیں۔ یہ طلائی صراحی ہے۔ وہ تانبے کا لوٹا ہے۔ یہ کمخواب کی رضائی ہے۔ وہ کھدر کی اوڑھنی ہے۔

یہ موت ہے۔	وہ زندگی ہے
یہ ماضی ہے	وہ مستقبل ہے
یہ اندھیرا ہے	وہ اُجالا ہے

دیکھو دیکھو۔ وہ دیوار ٹوٹ گئی۔ موت زندگی سے، ماضی مستقبل اور رات سحر سے گلے مل رہی ہے۔ لیکن نہیں دیوار کہاں ٹوٹی ہے یہ تو گاڑی چل رہی ہے۔ آہستہ آہستہ لوگ الوداع کہہ رہے ہیں۔ مسلم ضیائی کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ ابراہیم جلیس کے رخساروں کے گڑھے اور گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ نظر کے بال اور بکھر گئے ہیں۔ اور نشتر جاتی کی محبوب نگاہیں کہہ رہی ہیں۔

"ہم شرمندہ ہیں۔ بیحد شرمندہ ہیں۔ نجانے کیوں"

گاڑی چل رہی ہے۔

جگر صاحب ہاتھ ہلا کر جلیس سے کہہ رہے ہیں۔ "میں بہت جلد گاؤں سے لوٹ آؤں گا۔ اور چھوٹی بہن کو ساتھ لیتا آؤں گا۔ ضرور لیتا آؤں گا۔ فکر نہ کرنا۔ اچھا ہے۔ اپنے مہمانوں کے ساتھ جا رہا ہوں۔ تھوڑی دور ساتھ رہے گا۔ میرا خیال ہے اب وہ اچھی ہو گئی ہو گی چھوٹی بہن . . . . "

گاڑی چل رہی ہے۔

سورج ڈوبتا جا رہا ہے۔

سورج ڈوب گیا۔

حیدر آباد غائب ہو گیا۔

گاڑی پھر بھی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ گویا ان بھک منگوں کا منہ چڑا رہی تھی جو پلیٹ فارم کے کنارے کنارے اور بعد میں ریل کی پٹڑی کے کنارے کنارے بھاگ رہے تھے۔ سگنل مینوں کے کیبن سور کے چھوٹے چھوٹے ڈربوں کی طرح سطح زمین سے اوپر اُٹھے ہوئے تھے۔ گاڑی آگے چلی جا رہی تھی لیکن

انجن نے ابھی اپنی رفتار تیز نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ ابھی ابھی گودام سے کوئلہ اور نل سے پانی لے کر فارغ ہوا تھا اور ایک تازہ دم حُقّے کی طرح گڑگڑا رہا تھا۔ بھکارن چلا رہے تھے۔ بابو صاحب پیسہ۔ بابو صاحب پیسہ۔ گاڑی شہر سے باہر میدان میں آ گئی تھی۔ سٹیشن کی عمارت بہت دور پیچھے رہ گئی تھی۔ اور اب سطح مرتفع پر گارے کی بنی ہوئی جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں ... بھینسیں

میدان میں ... چر رہے تھے۔ اور اتنی دور سے وہ بھی بھینس کے بچے معلوم ہوتے تھے۔ جوہڑوں میں بدبودار غلیظ گدلا سبز پانی ٹھہرا ہوا تھا۔ اور کہیں کہیں جھاڑیوں میں لوگ رفع حاجت کے لئے گاڑی کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے۔ بھک منگوں کی آواز بار بار کانوں میں آ رہی تھی۔ بابو صاحب پیسہ۔ بدھ کے وقت میں بھی یہی ہندوستان تھا۔ یہی غلیظ جوہڑ۔ یہی گارے کی جھونپڑیاں یہی بھک منگے، اشوک کے عہد میں بھی یہی ہندوستان تھا۔ اکبر کے عہد میں بھی یہی۔ اور آج دو سو سال کی انگریزی حکومت کے بعد بھی لوگ اسی طرح گاڑی کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے۔

آئے۔ آئے۔ کہیں سے آئے۔ وہ زندگی کی بیدار افق۔ اس بلکن منجمد بے حس دُنیا میں اس گہری اتھاہ تیرگی میں آئے۔ کہیں سے آئے وہ نور کی کرن وہ صبح کی سُرخ لکیر، محبوب کے پائل کی ناچتی ہوئی آواز آئے کہیں سے آئے۔ اور تاروں بھری افشاں کی طرح چمک کر ہندوستان کے ماتھے پر جگمگائے ....

پھر گاڑی تیز چلنے لگی۔ اندھیرا بڑھتا گیا۔ تاریکیاں شبنمی لبادے اوڑھ کر چاروں طرف چھا گئیں۔ دل کسی نامعلوم خوف اور اُداسی سے معمور ہو گئے سب چُپ تھے۔ صرف جگر اک ملتجیانہ تبسم سے اوروں کی طرف دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

"میں اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔"

سب خاموش رہے۔

"میری بہن بیمار ہے۔"

کوئی نہیں بولا۔

"مجھے اپنی بہن سے بڑی محبت ہے۔ مجھے اپنے گھر میں بہن ہی سب سے پیاری ہے ہماری ایک ہی بہن ہے۔ اور ایک مجھ سے بہت پیار ہے، لیکن میں اُسے چند وجوہات سے اب تک حیدر آباد نہ لا سکا۔"

چُپ چاپ ... گاڑی چلتی رہی۔

"میں اُسے حیدر آباد لے آؤں گا۔ ڈاکٹر اجنگیا سے اُس کا علاج کراؤں گا۔ ڈاکٹر نائیڈو کو بھی دکھاؤں گا۔ میں نے دو سو روپیہ اس کی بیماری کے علاج کیلئے بچا کے رکھا ہے۔

ہم دونوں کچے امرود توڑ کر کھایا کرتے تھے۔ میں اس کے لئے لچھمن کے گھر سے املی چُرا کے لایا کرتا تھا۔ اُسے میٹھے بیر بہت پسند ہیں ......"

وہ اپنی یادوں میں کھو گیا۔ سب لوگ چپ رہے۔

ہولے ہولے کیفی گنگنانے لگا۔ اپنی محزوں محبت کا گیت۔ وہ گیت جس میں اُس نے اپنے کھانستے ہوئے سینے کی آرزوئیں اپنی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کا نور اور اپنے زرد چہرے کی حسرتوں کی راکھ کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ وہ ہولے ہولے گا رہا تھا۔ جیسے وہ اپنے دل کے بچے کو لوری دے رہا ہو۔ وہ خود اپنے لئے گا رہا تھا۔ صرف اپنے لئے۔ لیکن اُس ڈبے میں کون تھا جس نے اُس گیت کو اپنے لئے نہیں سمجھا۔ اس کے ہر شعر میں، ہر مصرعے میں، ہر لفظ میں، اپنے عشق کی جھلک، اپنی ناکامی کی تصویر اور اپنے محبوب کی تنویر نظر نہیں آئی۔ جیسے تصور میں کوئی مسکرا اٹھا۔ کسی نے انگڑائی لی۔ کہیں سے پائل بج اٹھی اور پھر نغمہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا........

اک گرانبار افسردگی بوجھل غبار بن کر سانس روکنے لگی اور پھر ساحر اپنے چیچک زدہ چہرے کے داغوں کو سہلاتا ہوا اپنی سیٹ پر جھک گیا۔ اور اپنے ہاتھ ٹھوڑی پر رکھے ان نغموں کا ذکر کرنے لگا۔ جو اُس نے اپنے محبوب کے پیار کی خاطر لکھے تھے۔ وہ نغمے جنکی پنہائیوں میں اُس کی زندگی کی بہاروں کے سرچشمے اُبلتے تھے۔ اور جس کے زعفران رنگ کھیتوں میں اُس کی مست آرزوؤں کی مہک تھی۔ ہولے ہولے، آہستہ آہستہ، شرماتے ہوئے، مجرمانہ انداز میں وہ گا رہا تھا۔ گاڑی جتنی تیز تھی گیت اتنا ہی ہولے تھا۔ کہیں کوئی سُن نہ لے اُس کے پیار کا گیت۔ اس کی محبت کی شکست، اس کی زندگی کی موت لیکن کون اس وقت ساحر نہ تھا۔ یہ نغمے کس نے بازاروں میں نہ بیچے تھے۔ کس نے کیفی کی طرح اپنے سینے پر غم کی بھاری سِل نہ باندھی تھی جس کے بوجھ سے سینہ یوں چور چور ہو گیا تھا۔ کس نے غم جاناں کی منزل سے گذر کر غم دوراں

کو اپنا یاد تھا کہ گرن تھا جو زخمی نہ رہ چکا تھا۔ محبوس نہ رہ چکا تھا۔ شکستہ دل نہ رہ چکا تھا.....

یکا یک جیٹلے نے آہستہ سے کہا۔ آہستہ سے جیسے وہ اپنے الفاظ کو چوم رہا ہو۔ "وہ ہر روز اسٹیشن پر ملنے آیا کرتی تھی ....." پھر چپ ہو گیا — سب یادوں میں کھو گئے۔

کسی نے کچھ نہیں کہا۔ مگر شاید سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں آدمی ایک خاموش گویائی کے طلسم سے مجبور ہو کر داستاں بیان کر رہے تھے۔ اپنا نوحہ۔ اپنی مسرتیں۔ اپنی آرزوئیں۔ اپنی حسرتیں جو وہ تھے۔ جو وہ بننا چاہتے تھے۔ سپنے جو ادھورے رہ گئے۔ خوبصورتی جیسے ہونٹ چوم نہ سکے۔ کسی گم شدہ ماضی کی حسرت، کسی نامعلوم مستقبل کی آرزو اور پھر کشمکش حیات کا دہکتا ہوا شعلہ، تھا۔ اب بھی ہے۔ اب ہوگا۔ ضرور ہوگا.......
ضرور.......

سب یادوں میں کھو گئے۔ اور پھر آنکھیں بند کر کے سپنے دیکھنے لگے۔

(۹)

یکا یک کرشن چندر کی آنکھ کھلی۔ گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ جگر صاحب بستر لپیٹ رہے تھے۔ اور اسٹیشن پر جانے والے تھے۔ بستر لپیٹ کر انہوں نے سوئے ہوئے ادیبوں کی طرف دیکھا اور یکا یک کرشن چندر پر اُن کی نظر پڑ گئی۔ اور جگر نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

کرشن چندر نے دیکھا کہ جگر رو رہے ہیں۔

"جگر" کرشن چندر نے کہا۔

جگر نے منہ موڑتے ہوئے کہا "چھوٹی بہن مر گئی"

کسی نے کرشن چندر کا دل پکڑ لیا۔ وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

"میری چھوٹی بہن مر گئی ہے۔ اب میں اُسے گاؤں سے لانے جا رہا ہوں۔ میں نے اُس کے علاج کیلئے دو سو روپے بچائے ہیں۔" اس کی آواز گھبرائی ہوئی تھی۔ اور اس کے لہجے میں نیم دیوانگی تھی۔

وہ چپ چاپ اسٹیشن پر اُتر گیا۔ پلیٹ فارم پر اُس کے عزیز کھڑے تھے۔ یکا یک ایک سنہری وردی میں ملبوس اردلی وہاں سے گذرا۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ اور وہ سر سلطان احمد کے اسپیشل سیلون کی جانب جا رہا تھا۔ جگر نے جلدی میں اُس سے ٹھوکر کھائی۔ اور تھوڑا سا دودھ چھلک کر باہر گر گیا۔

"دیکھ کر نہیں چلتے ہیں آپ؟" اردلی نے چنگھاڑ کر کہا۔

گاڑی نے سیٹی دی۔

جگر نے آنسو پونچھ کر کہا۔ "خدا حافظ"

کرشن چندر اُسے خدا حافظ بھی نہ کہہ سکا۔ گاڑی چلنے لگی۔

ساحر لدھیانوی کرشن چندر کے قریب سیٹ پر لیٹے تھے۔ کرشن چندر نے آہستہ سے کہا "ساحر — ساحر"

ساحر نے اُسی طرح لیٹے لیٹے کہا "میں خوب جانتا ہوں اس شخص کو — یہ ابراہیم جلیس کا بھائی ہے"

کرشن چندر نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا "تم جانتے ہو اس کی چھوٹی بہن مر گئی ہے۔"

"ہاں میں سن رہا تھا" ساحر نے نپے تلے لہجے میں جو ہر قسم کے جذبات سے عاری معلوم ہوتا تھا کہا "میں جانتا ہوں۔ اس کی بہن مر گئی ہے۔ اس کی ایک ہی بہن تھی۔ سارے گھر میں اُسے وہی سب سے پیاری تھی۔ لیکن اتنی محبت کے باوجود وہ اُس کا علاج اب تک حیدرآباد میں نہ کرا سکا۔ کیونکہ اب تک وہ دو سو روپے اکٹھے نہ کر سکا تھا۔"

"مگر" کرشن چندر نے کہنا چاہا۔ لیکن ساحر نے اُسے بولنے نہیں دیا۔

"اور جب اس نے دو سو روپے اکٹھے کر لئے تو یہ کانفرنس آ گئی اور اس نے یہ روپے کانفرنس کے لئے دیدیئے۔ اور اس نے گاؤں گاؤں گھوم کر مخدوم کے ساتھ ہر جگہ جا کر چندہ اکٹھا کیا۔ کسانوں سے، مزدوروں سے، طلبا سے، غریب لوگوں سے چندہ جمع کیا تاکہ کلچر زندہ رہے۔ اس کی بہن مر جائے۔ لیکن تہذیب زندہ رہے۔ تمدن زندہ رہے۔ فنکار کا خیال زندہ رہے۔ اس کی بہن اچھی خوراک اور مناسب دوا نہ ملنے سے سسک سسک کر جان دے دے۔ لیکن کتاب زندہ رہے۔ زبان زندہ رہے، قوم کی روح زندہ رہے۔ اس کی پیاری پیاری، املی کھانے والی، امرود توڑ توڑ کر چرا کر کھانے والی۔ اس کے بچپن کی ساتھی بہن مر جائے۔ لیکن کالیداس زندہ رہے، غالب زندہ رہے اقبال زندہ رہے۔ پریم چند زندہ رہے۔ موت اس کی بہن کے ہونٹوں کو یخ بستہ کر دے، اور اس کی آنکھوں کو بے نور کر دے لیکن زندگی اور اس کا زندہ ادب اپنے نور سے اور اپنی حرارت سے اور اپنے ایمان سے لاکھوں

دلوں کو روشن کر دے"

"مگر ..... "کرشن نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ساحر اب بلند آواز میں کہہ رہا تھا جیسے ادیب جاگ اُٹھے تھے۔

"کانفرنس کامیاب رہی مگر اس کی بہن مر گئی۔ کانفرنس کے دوران میں جگر کو اپنی بہن کی شدید علالت کے تین تار آئے۔ لیکن وہ اُسے ملنے نہیں گیا۔ چپ چاپ کانفرنس کا کام کرتا رہا۔ جب پہلا تار آیا تو اُس وقت تم اپنا مقالہ پڑھ رہے تھے۔ جب دوسرا تار آیا اُس وقت تم پریم چند۔ دھاینی کے مہمان بن کر ڈنر کھا رہے تھے۔ جب تیسرا تار آیا تھا۔ تم لوگ راجہ شلراج کے ہاں مدعو تھے۔"

"ساحر!" کرشن چندر زور سے چلایا۔ جیسے کسی نے اس کے دل میں آہنی کیل گاڑ دی ہو۔ اور پھر جیسے اُس کیل سے لہو کی سُرخ دھار پھوٹ نکلی کسی نے جان سے پیاری ہمشیرہ کی زندگی کا لہو دے کر ادب کو زندہ کر دیا تھا۔ لہو چاروں طرف بہہ رہا تھا۔ اور اس میں طلائی صراحیاں اور اخروٹ کے میز اور نقرئی پلنگ ڈوب رہے تھے۔ حریری پردے سرک گئے تھے۔ اور وہ دیوار ٹوٹ گئی تھی۔ جس نے انسان اور انسان کے مابین امتیاز پیدا کر دیا تھا۔ چاروں مینار سرنگوں تھے۔ اور تیز دوڑتی ہوئی سیاہ سیڈان سیاہ فام گھاٹیوں کے آگے سربسجود تھی۔ وہ لوگ اکیلے تھے۔ کمینے تھے۔ احساس کمتری اور خود غرضی کے شکار تھے لیکن سب مل کے وہ جیسے کچھ اور ہو گئے تھے۔ کسی نئی ہمت، کسی نئی قوت، کسی نئی عظمت سے سرشار ہو گئے تھے۔ جیسے ملکے ان کی برائیاں دب گئی تھیں۔ اور اچھائیاں اُبھر آئی تھیں۔ ساحر اب چُپ تھا۔ لیکن اس کا سینہ کسی ہیجان طوفان سے رستاخیز تھا۔ اُس نے کنکھیوں سے اپنے رفیقوں کی طرف دیکھا۔ کوئی ایسا نہ تھا جس کی آنکھیں پُرنم نہ ہوں نم اور دور۔ بہت دور جیسے وہ ماضی اور حال اور مستقبل کے پرے جا کر بھی کچھ تلاش کر رہی ہوں۔ کچھ ڈھونڈ رہی ہوں۔ کچھ پا رہی ہوں۔

وامق آہستہ سے گانے لگا۔

پورب دیس میں ڈگی باجے بھوکا ہے بنگال
بھوکا ہے بنگال
رے ساتھی

یہ بھوکے بنگال کا گیت تھا۔ اداس دلوں کا گیت تھا۔ مرتی ہوئی روحوں کا گیت تھا۔ لیکن اس وقت نجانے اس گیت میں کونسی طاقت آگئی تھی۔ کہ یہ گیت موت کا گیت نہیں زندگی کا نغمہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی لے میں اداسی کی جھلک نہیں اک کامران تبسم کی نرم گونج تھی۔ اس کی پنہائی میں یاس و حسرت نہیں اک پُر اُمید للکار کی گونج سنائی دیتی تھی۔ جیسے اس گیت کا سویا سویا مدھم نوحہ کسی کے خون سے جاگ اُٹھا تھا۔ اور اک بے خطر بغاوتی طوفانی انداز میں کہہ رہا تھا۔

پورب دیس میں ڈگی باجے

ڈگ ... ڈگ .... ڈگ .... ڈگی باج رہی تھی۔ پورب دیس ہی میں نہیں۔ پورب۔ اُتر۔ دکھن۔ پچھم۔ ہندوستان کی چاروں کھونٹوں میں یہ ڈگی باج رہی تھی۔ ہندوستان کا وہ کون گوشہ ہے جو بنگال نہیں!

وامق کے گاتے گاتے یکایک وہ سب یکدم اکٹھے پوری قوت سے گانے لگے۔

پورب دیس میں ڈگی باجے بھوکا ہے بنگال رے ساتھی
بھوکا ہے بنگال
رے ساتھی

ساتھی۔ یہ ڈگی سن رے۔ یہ خطرے کی ڈگی ... اک غیر مختتم للکار۔ اک مبہم پکار۔ آؤ۔ آؤ۔ ساتھی

ساتھی جو بھوکے تھے ساتھی۔ جو مفلوق تھے، ساتھی جو جیل کی سختیوں کے آثار لئے ہوئے تھے۔ ساتھی جو لبھڑی ہوئی ناکام آرزوؤں کے مزار تھے۔ ساتھی جو درد کی تفسیر تھے اب یکایک اٹھ کر اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ اور اپنی روح کی پوری قوت سے گانے لگے۔ خود ہی گا رہے تھے اور خود ہی سن رہے تھے۔ اک نیا گیت، اک نیا خیال، اک نئی آواز، اک نیا تبسم جیسے ادھ کھلی کلی یکایک کچھ سوچ کے مسکرا اُٹھے .....

باہر گاڑی بھاگی جا رہی تھی۔ اندر سکون تھا۔ باہر چاروں طرف اندھیرا تھا۔ لیکن گاڑی کے اندر روشنی تھی۔ باہر راستہ تاریک، دشوار گزار تھا لیکن اندر منزل معلوم ہو چکی تھی۔

اختر حسین رائے پوری

کافرستان کی شہزادی!

(افغانستان کے مشرق کی طرف ایک علاقہ ہے جو پہلے کافرستان کہلاتا تھا۔ تھوڑی مدت ہوئی کہ یہاں کے باشندے مسلمان ہو گئے اور اب یہ صوبہ نورستان کہلانے لگا۔ اسی علاقہ کا ایک کونہ چترال ریاست میں دھنس آیا ہے اور وادیٔ بمبریت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مجھے تین سال پہلے چترال جانے اور چند دن اس وادی میں گزارنے کا موقعہ ملا تھا۔ یہ افسانہ انہیں ایام کی یادگار ہے۔ افسانہ کے کردار اصلی مگر واقعات فرضی ہیں ۔)

الاؤ کی آگ سسکتی سنستاتی اور چمکتی ہوئی اوپر لپکی اور اس کی چنگاریاں جگنوؤں کی طرح ہرے بھرے پیڑوں میں چمکنے اور بجھنے لگیں جب لکڑی کے سب کندلے آگ کی گرفت میں آ گئے۔ تو ایک آتش مینار ننگے میدان کی گود سے نکل کر تن گیا اور یوں بلند ہوتا گیا گویا زمین کے اندر سے کوئی اسے اوپر دھکیل رہا ہو۔ گھنے گھنے چناروں کے جھرمٹ کو چیر کر اس کی تمتمائی ہوئی آنچ دور دور پھیل گئی۔ اور اس سے بھی بہت دور اس نقارہ کی پیہم گونج پھیلتی گئی جسے دو نوجوان مارخور کے سینگوں سے پیٹ رہے تھے وہ گونج ہندوکش کی اونچی اونچی چوٹیوں سے ٹکرا کر ہر طرف بکھر گئی۔ وہ چوٹیاں جو کافرستان کی اس حسین وادیٔ بمبریت کے چاروں طرف حصار کی طرح لپٹی ہوئی تھیں۔ پہاڑی نالا اپنے پانی کی صفائی پر اتراتا ہوا بے معنی شور مچاتا اپنی راہ بہا جا رہا تھا۔

برف پوش پہاڑ جنگی چوٹیوں نے دھوپ کا منہ کبھی نہ دیکھا تھا چاندنی میں جاگ کر اپنے اردگرد لہلہاتی ہوئی بہار کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔ بہار جس کا جادو رات کو بھی نہ سویا تھا۔ اور جس کے زیر اثر دیودار کے پیڑ اپنے کھردرے بدن میں سے نئی نئی کونپلیں نکال رہے تھے۔

نورالاؤ سے ہٹ کر چنار کے نیچے کمبل اوڑھے چپ چاپ بیٹھا تھا اس نے شب قدر کی برفانی چوٹی پر یوں اٹکا ہوا پایا گویا آسمان پر ٹانگ دیا گیا ہو۔ اور چھاگلوں کی جھنکار پر اسے جنگلی پریوں کے ناچ کا گمان ہوا۔

ایک ایک دو دو کرکے کافر زن و مرد آتے گئے۔ اور ایک پہر رات بیتنے ابھی خاصی بھیڑ لگ گئی۔ مرد اونی لبادہ میں ملبوس ہاتھ میں بلم یا بھالا لئے ہوئے۔ عورتوں کے لبادے کمر پر پٹکے سے کسے ہوئے اور ان کے سر اونی رومالوں سے ڈھکے ہوئے جن پر رنگ برنگے پتھر جڑے ہوئے تھے۔ گورے گورے پیر جنگلی مہندی سے خون ناب بڑی بڑی آنکھوں کے گرد سیاہ سا حلقہ جو بکرے کے سینگ کی لیپ سے بنایا گیا تھا۔ تندرستی اور جوانی سے ڈبڈبائے ہوئے جسم تنگ قباؤں میں تلملا رہے تھے۔ اور وہ سب اپنے جنگلوں کی پھولوں بیلوں کی طرح حسین اور معصوم تھیں۔

جب سب جمع ہو گئے تو ملک شاہ جو ان سب کا بزرگ اور جاہ و جلال میں کسی یہودی پیغمبر سے کم نہ تھا اٹھا اور ایک مشعل لئے ہوئے قبرستان کی طرف گیا جو اس میدان کے پاس ہی تھا۔ عورتیں منہ موڑ کر ایک کونے میں کھڑی ہو گئیں اور مردوں نے نقارے کی چوب پر ہو ہو کا نعرہ بلند کیا۔ عورتوں نے دھیمے سروں اور یکساں آوازمیں کوئی گیت شروع کیا۔ ذرا دیر میں ملک شاہ لکڑی کا ایک بت کاندھے پر اٹھائے ہوئے پلٹا اور اس بت کو دیکھتے ہی سب زن و مرد سجدہ میں گر پڑے مرد ہوا میں بلم ہلاتے ہوئے ہو ہو ہو کرتے آگ کا طواف کرنے لگے اور عورتوں نے اپنے گیت کی لے تیز کر دی۔ وہ بت جس کا نام ایشان تھا چنار کے تنے کا ٹیکا لگا کر بٹھلا دیا گیا۔

یک بیک چھاگلوں کے گھنگرو ایک ساتھ مرتعش ہوئے سارے بلم بجلیوں کی طرح ہوا میں لپکے۔ نقارہ جلدی جلدی غضب ناک اژدہے کی طرح سانس لینے لگا۔ الاؤ کے چاروں طرف مردوں کے

پیر دھما دھم زمین کو کوٹنے لگے۔ لیکن عورتوں نے آہستہ سے زمین کو ٹھوکر لگائی گویا اس کا بوسہ لے رہی ہوں [illegible] بوڑھوں نے جو ایشان دیوتا کے پجاری معلوم ہوتے تھے۔ جھوم جھوم کر ایک ترانہ گانا شروع کیا۔ دیکھتے دیکھتے ان سب نے اپنے اوپر ایک ایسی وجدانی اور ہیجانی کیفیت طاری کر لی گویا وہ ابھی اپنی قدیم روایت کی تجدید کرکے انسانوں کو آگ میں زندہ جلا دینگے اور پھر ان کی تصویریوں کے ہار بنا کر پہن لیں گے۔ ذرا دیر کے لئے مسافر مبہوت رہ گیا۔ اور اسے یقین نہ آیا کہ وہ افغانستان کی سرحد پر مہذب دنیا سے کالے کوسوں دور ان وحشی کافروں کا مہمان ہے۔ جو ناچنے والا تھا۔ جو زیادہ گھڑی بھر کے لئے دیوتا کے آگے زمین بوس ہوتا۔ اور پھولوں کی شراب کی مشک میں منہ لگا کر دوبارہ اس ہنگامہ میں شامل ہو جاتا تھا۔ رقص کی لے کے ساتھ ساتھ آگ کی لو بھڑکتی گئی اور ہو ہو کے وحشیانہ نعرے پہاڑوں سے ٹکرا کر شور قیامت کی طرح فضا میں گونج اٹھے۔

مسافر مشرق و مغرب کے بہت سے ناچ دیکھ چکا تھا۔ لیکن کسی ناچ میں اس نے یہ وارفتگی، یہ قوت اور یہ وحشیانہ مسرت نہ دیکھی تھی۔ وہ سب بہار کے دیوتا ایشان کے اشارہ پر مرنے مارنے کو تیار تھے۔ اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے جذبۂ عقیدت کو کس طرح ظاہر کریں۔ رات میں ٹھنڈ سمائی ہوئی تھی لیکن وہ سب پسینہ میں شرابور تھے۔ اور لڑکیوں کے دلربا چہروں پر گویا موتیوں کی جھالر لٹکی ہوئی تھی۔

ملک شاہ نے مسافر کو بتایا کہ یہ دیوتاؤں کا ملک ہے کوئی کہتا ہے کہ کافر سکندر اعظم کے بچھڑے ہوئے سپاہیوں کی اولاد ہیں اور کوئی انہیں قدیم آریہ قوم کا نام لیوا بتلاتا ہے لیکن دراصل وہ دیوتاؤں کے [illegible] ہزاروں سال سے وہ [illegible] بستے ہیں۔ انہوں نے تاتاریوں ترکوں اور افغانوں کے قبیلوں کو گذرتے دیکھا ہے۔ بڑی بڑی سلطنتوں اور تہذیبوں کو بنتے بگڑتے دیکھا ہے۔ لیکن ان انقلابوں کا ان پر اتنا ہی کم اثر ہوا جتنا ان پہاڑوں پر۔

اس گفتگو کے دوران میں ایک دوشیزہ صف سے نکل کر ایشان دیوتا کے آگے آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے زمین کی مٹی اٹھا کر آنکھوں پر لگائی پھر تالی بجا کر ہاتھ ہوا میں پھیلا دئے۔ اور سارے مجمع کی تالیوں کی گونج پر اس نے ناچنا شروع کیا۔ وہ اپنے دیوتا کو رجھانے کے لئے ناچ رہی تھی۔ اور اس کا ناچ گویا قدرت کا خاموش شکریہ تھا کہ اسے حسین بنایا۔ گردن سے لیکر ٹخنے تک اس کا جسم ایک لبادہ میں چھپا ہوا تھا لیکن ناچ کے دوران میں وہ یوں مچلا گویا ابھی عریاں ہو جائے گا۔ اور ہتھیلیوں میں چھپی ہوئی اس کی انگلیاں تیروں کی نوک کی طرح ہوا میں تھرتھرائیں۔ اس کے سڈول پیر کبھی ڈگمگائے کبھی تھرکے اور کبھی کسمسائے۔ اپنی چوٹی میں سے اس نے سرخ پھولوں کا ایک گچھا نکالا۔ اور اسے ہتھیلی میں لئے دیوتا کی نذر کو چلی۔ آہستہ آہستہ اس کے قدم اٹھے پائیوں نے ہیبت کے مارے سانس روک لیا۔ لیکن پھول بت کے آگے رکھ کر وہ خوشی سے اچھلی اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ اور وہ پھرتی سے ہاتھ پاؤں یوں نچانے لگی گویا تتلی کی طرح ابھی اڑ جائے گی۔ اور اسی وقت ایک خوشرو نوجوان [illegible] ہلاتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ اپنے سر اور بازوؤں کو اس نے ہری بھری ٹہنیوں سے ڈھک رکھا تھا۔ اسکے پر وقار انداز سے مسافر سمجھ گیا کہ یہ ایشان دیوتا کا پاٹ ادا کر رہا ہے اب دونوں گل بہیاں کرکے ایک گت پر مزے میں ناچنے لگے اور سب نے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ان کا گھیرا کر لیا۔

مسافر کے رہنما ملنگ نے چپکے سے کہا۔ جانتے ہو یہ جام شیریں (حسینہ) کون ہے؟ یہ ملک شاہ کی نواسی گلون ہے۔ اس بہار میں وہ بالغ ہوئی ہے اور اپنی جوانی کا صدقہ اتارنے کے لئے ناچ رہی ہے لیکن اس کا عاشق ملک شاہ کے دشمن نامدار کا غلام کاش ہے۔ صدیوں سے کاش کا گھرانہ نامدار کے گھر غلامی کرتا آیا ہے۔ یہ دل میں لاکھ ایک دوسرے کو چاہیں لیکن سب کے دیکھتے انہیں اس محبت کا اظہار نہ کرنا چاہیئے۔

ملنگ وادی بمبیرت کا فلسفی تھا۔ اپنے کانوں میں سونے کا [illegible] مخمل کا پھٹا ہوا شلوکہ پہنے پرانی وضع کی بندوق بارود کے [illegible] پیٹھ پر لادے وہ ایک عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ وہ افغانوں کا بھاٹ، سرخ پوش سب کچھ تھا۔ اب بہار میں جب کافر [illegible] چرانے کے لئے جنگلوں میں چھپ جائیں گے تو ملنگ ان کی حفاظت کرے گا۔ بمبیرت اور افغانستان کے [illegible] کے سوا اور کوئی [illegible] تھی اور اکثر افغان [illegible] کو پکڑ لے جاتے تھے

بہ نوروز کے دن ملنگ سے ان کی مڈبھیڑ ہوا کرتی تھی۔

ملنگ کی چلم میں گانجا تھا یا چرس یا تمباکو۔ مسافر کے لئے یہ معلوم کرنا مشکل تھا۔ لیکن ملنگ تابڑ توڑ اس کے کش لگا رہا تھا اور کھانستے ہوئے بیچ بیچ میں اپنی لال لال آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے پانی کو میلی آستینوں سے پونچھ پونچھ کر مسافر سے کہنے لگا۔ "یہ کمبخت گاش آپ اپنی جان کا لاگو ہے بلکہ شاہ کافروں کا پجاری ہے۔ اس کی نواسی سے یہ غلام زادہ شادی نہیں کر سکتا جب تک کوئی دس گھوڑے، پچاس گائیں اور سو بکریاں نہ لائے گلون سے بیاہ کیسے کر سکتا ہے۔ لیکن گاش کے سوا کوئی اس چھوکری کی آنکھوں میں جچتا بھی تو نہیں۔ نوروز کو وادی کی سب جوان لڑکیاں 'مارا' دیوتا کے مندر کے آگے آ بیٹھتی ہیں۔ کنوارے آتے ہیں اور جو جسے پسند ہو اپنی جائداد کی تفصیل سناتے ہیں۔ یہاں سونے روپے کی کوئی قدر نہیں زمین اور مویشی ہی اصل جائداد ہے۔ اگر کوئی لڑکی کسی کا ہاتھ پکڑ لے تو سمجھو کہ منگنی ہو گئی۔ پچھلے نوروز کو کئی کنوارے گلون سے شادی کرنے کو آئے۔ مگر اس نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اسے تو گاش کے سوا کوئی بھاتا ہی نہیں۔"

ملنگ ٹھیک کہتا تھا۔ کیونکہ وہ دونوں سدھ بدھ بھول کر یوں ناچ رہے تھے گویا وہاں اور کوئی تھا ہی نہیں۔ ان کی آنکھیں باتیں کر رہی تھیں اور ان کے جسم ایک دوسرے کی پیاس میں تڑپ رہے تھے۔ لیکن اور سب کی آنکھوں میں غصہ جھلک رہا تھا۔ دیوتا اور مہمان کی موجودگی کی وجہ سے وہ مجبوراً خاموش تھے۔

بہت رات بیتے وہ ناچ ختم ہوا۔ اور مسافر اپنی چارپائی پر لیٹے لیٹے کان سے اودامی گیت کے اس بول کو نکال پھینکنے کی ناکام کوشش کرتا رہا جس کا مطلب تھا۔ کہ "یہ ہائے بہار بھی نہ رہے گی اور مسافر بھی چلا جائے گا۔"

رقص کے دوران میں وہ ٹکٹکی باندھے گلون کو تاکتا رہا تھا۔ رقص کے دوران میں وہ کبھی پھول کی طرح کھلی کبھی ناگن کی طرح لہرائی، کبھی کسی پہاڑی ندی کی طرح گنگنائی۔ اور مسافر اسے دیکھتا رہا، دیکھتا رہا۔ گلون نے بھی ایک نگاہ [illegible] دیکھا تھا۔ اپنی سہیلی کو ٹہوکا دے کر وہ مسکرائی تھی [illegible] آنکھوں کے بیچ سے

دیدہ دکھا کر مدہوشی کا اشارہ بھی کیا تھا۔

ملنگ نے مسافر کو جھنجھوڑا تو اس کی آنکھ کھلی۔ دھوپ پھیل چکی تھی اور ملنگ کے ٹوٹے ہوئے دانتوں میں ہنسی پھیل رہی تھی "کھیل چکے تم مار خور کا شکار۔ اٹھو بہت سو چکے۔" ایک لمحہ مسافر کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں تھا۔ کسی کافر کے مکان کی بالائی منزل میں وہ ٹھہرایا گیا تھا۔ کمرے کے بیچ ایک چولہا جو بیک وقت انگیٹھی، تندور اور لیمپ کا کام دیتا تھا۔ اور نیچے اترنے کے لئے لکڑی کی ایک سیڑھی جو بوقت ضرورت اوپر کھینچی جا سکتی تھی تاکہ مکین دشمنوں یا ڈاکوؤں سے محفوظ رہیں۔

عورتیں گھروں یا کھیتوں میں کام کر رہی تھیں اور مرد شکار کھیلنے، پھل توڑنے یا شہد جمع کرنے باہر نکل گئے تھے۔ رات کو جب وہ لوٹیں گے تو عورتیں پاؤں دھلا کر انہیں کھانا دیں گی لیکن شہد، گھی اور پنیر کو خود ہاتھ نہ لگائیں گی۔ یہ نعمتیں صرف مرد کے لئے مخصوص ہیں کیونکہ اسی کی ذات پاک، دیوتا کی مظہر ہے۔

مسافر کی آنکھیں ادھر ادھر کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس نے ایک کسک سی محسوس کی جس میں درد کا شائبہ بھی نہیں مگر خفیف سا احساس ضرور تھا اور چلتے چلتے اس نے گاش کو دیکھا جو ایک آنگن میں بیٹھا مٹی کے برتن بنا رہا تھا۔ کس پھرتی سے وہ گیلی مٹی کے برتنوں کو اپنے ہاتھ میں نچاتا اور پھر ان سے پیالی یا صراحی بنا کر دھوپ میں رکھتا جاتا تھا۔ مسافر کو دیکھ کر اس کی روشن آنکھیں مسکرائیں۔ اور وہ رات کی بکھری ہوئی قبت کی یاد میں گم ہو گیا۔

ملنگ تیز قدم چل رہا تھا۔ اور چلتے چلتے کبھی پتوں پر پڑی ہوئی اوس کو غور سے دیکھ کر کہتا کہ ادھر سے لومڑی گئی ہے۔ اور کبھی ٹیلوں پر بنی ہوئی قبروں کی طرف اشارہ کر کے کہتا کہ ان میں ہمارے اجداد سو رہے ہیں۔ جب کوئی کافر مرتا ہے تو لاش کے ساتھ اس کے کپڑے، زیور اور گہنے دفن کر دیتے ہیں۔ پہلے تو کوئی انہیں ہاتھ بھی نہ لگاتا تھا لیکن جب سے لال کافر مسلمان ہوئے ہیں یہ قبریں محفوظ نہیں ہیں۔

ملنگ مارخور کی دھن میں ایک سوکھے ہوئے نالے کے پتھروں پر اچھلتا کودتا چلا جاتا تھا۔ پھر کسی چیز کا خیال آتے ہی وہ بولا۔ مسافر [illegible]

ہمیں ایسا مارخور ملے جس کی ناف میں منکا چھپا ہوا ہو۔ منکا انگلی تک کے زہر کو پل بھر میں چوس لیتا ہے۔ اسے دکھلا کر تو راجہ کی بیٹی کو بھی موہ سکتا ہے۔"

یک بیک اس کی آنکھوں میں شرارت آئی اور وہ خود بخود کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ "رات کو میں تیری آنکھوں کو تاڑ رہا تھا۔ گلوں کو تو نے پسند کیا کیوں! ہیں؟"

افروٹ کے پیڑ کی چھاؤں میں دونوں بیٹھ گئے۔ مسافر نے سگریٹ اور ملنگ نے چلم سلگائی۔ ملنگ کہنے لگا "اس میں کوئی ہرج نہیں۔ مہمان ہماری بیٹی کو پسند کر لے تو اس میں ہماری عزت ہے۔ دس گھوڑوں پچاس گایوں اور سو بکریوں کے دام یہاں چھ سات سو روپے سے زیادہ نہ ہونگے۔ تو گلوں کو بیاہ کر یہیں بس جا۔ تجھے ہم مفت میں یہ جنگل اور پہاڑ دے دینگے۔"

اس نے دوبارہ شریر نگاہوں سے مسافر کو گھورا۔

"نہیں ملنگ۔ گلوں اور اس کا دیس حسین سہی۔ مگر نہ میں انکے لئے ہوں اور نہ وہ میرے لئے۔"

ملنگ ٹوہ لینے کے لئے جھوٹ موٹ جھنجلا کر بولا۔ "ہوں۔ میں جانتا ہوں نہ تیرا دیس ایسا حسین ہے اور نہ وہاں گلوں جیسی عورتیں ملتی ہیں۔"

ملنگ اسے چھیڑتا گیا۔ "پشاور تک تو میں بھی جا چکا ہوں میں جانتا ہوں کہ تو اونچے مکانوں اور صاف سڑکوں کو پسند کرتا ہے۔ لیکن کیا ان کے ساتھ گندی گلیاں اور تنگ جھونپڑیاں نہیں ہیں۔ تیرے دیس میں عورتیں یا تو شادی کر کے پردہ کی اوٹ میں بچے جنا کرتی ہیں اور یا دام لے کر یا لے دام طوائفیں بن جاتی ہیں۔ تو ہماری بیٹیوں کے مرتبہ کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

مسافر کی خاموشی کے باوجود ملنگ سمجھ گیا کہ اس کے دل میں کیا ہے وہ ان کافروں کو وحشی سمجھتا ہے ان کے رسوم پر ہنستا ہے۔ انکی رہن سہن کو حقارت سے دیکھتا ہے۔ اس احساس سے ملنگ کے باطن میں سوئی ہوئی سینکڑوں دیوتاؤں کی ہزاروں سال پرانی روح بھڑک اٹھی اور وہ دفعتاً بگڑ کر بولا۔ "تجھے اپنی ریلوں موٹروں اور ہوائی جہازوں کا گھمنڈ ہے۔ انہیں دیکھے بغیر تو زندہ نہیں رہ سکتا۔ پہاڑوں ندیوں اور جنگلوں سے دو تجھے زیادہ بھلے لگتے ہیں۔ انہیں تو اپنی تہذیب اور تمدن سے تعبیر کرتا ہے۔ اور یہ تو کہہ کہ اس ترقی کی قیمت تو کس طرح ادا کرتا ہے۔ ایوان کے پوسٹ ... کے پاس ایک اخبار آتا ہے۔ ہر مہینہ میں نمک اور چائے خریدنے جاتا ہوں تو وہ اخبار پڑھکر مجھے سناتا ہے۔ اس میں لڑائی قحط گداگری اور بیکاری کی خبروں کے سوا کچھ نہیں ہوتا لیکن تیری روح ایسی خبیث ہے کہ انکے تماشے بغیر اسے سکون نہیں مل سکتا۔"

ملنگ ابھی جانے کیا کیا کہتا لیکن اسی وقت داہنی طرف سرسراہٹ سی ہوئی دونوں ایک پیڑ کی آڑ میں دبک گئے اور انہوں نے دیکھا کہ ایک چٹان پر کھر جوڑے ایک مارخور کھڑا ہوا ہے۔ اسکے پرپیچ اور لمبے لمبے سینگ بڑے بھلے لگتے ہیں اور وہ اپنی بھری بھری گردن اٹھائے سورج کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اپنی ریشمی ڈاڑھی کو وہ رہ رہ کر ہلاتا ہے۔ گویا منبر پر کھڑا وعظ دے رہا ہو۔ اور اسکے حساس نتھنے پھڑک پھڑک کر اسے فضا کی ہر تبدیلی کی خبر دے رہے ہیں۔ مسافر کی انگلی بندوق کی لبلبی کی طرف بڑھی۔ مگر مارخور اچانک ایک چٹان سے اچھل کر دوسری پر اور وہاں سے تیسری پر پہنچا۔ وہ اسی طرح چٹانوں پر چوکڑیاں بھرتا گیا۔ اور جب بندوق دغی تو حیرانی سے ایک بار پیچھے دیکھکر پہاڑ کی ایک دراڑ میں گھسا اور غائب ہو گیا۔ کچھ دیر گولی کی آواز کبھی یہاں اور کبھی وہاں گونجی۔ میمنوں نے رنگ رنگی کرخت صدائیں بلند کر کے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اور ایک دو شاہین اپنے گھونسلوں کو چھوڑ کر ہوا میں اڑنے لگے۔

x x x

لوٹتے وقت مسافر نے گلوں کو دیکھا۔ وہ چراگاہ میں بیٹھی ہوئی اپنے کتے کے بالوں میں پیشو ٹٹول رہی تھی۔ کتے نے اس کی انگلیوں کے مس کی لذت کو بخوبی دل نشین کرنے کی غرض سے آنکھیں بند کر لی تھیں کبھی کبھی اس کی کھال سکڑ جاتی۔ اور اس کی دھیمی دھیمی غراہٹ میں مسرت کا اظہار تھا۔ بکریاں اور گائیں ادھر ادھر چر رہی تھیں۔ اور بیچ بیچ میں وہ گلوں کی طرف اطمینان کرنے کے لئے دیکھ لیتی تھیں۔ کہ وہ اپنی جگہ پر ہے یا نہیں۔

مسافر سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں اور وہ ہونٹوں پر غیر محسوس سی مسکراہٹ لاکر الہڑپن سے گھاس کے تنکوں کو نوچنے لگی۔

اس نے اپنی بولی میں سلام کیا اور اس کی چھیڑ چھاڑ کا جواب ایک میٹھی جھڑکی میں دیا۔ مسافر نے اسکی جھکی ہوئی چتونوں کو اپنے قدموں کا تعاقب کرتے پایا اور اس احساس سے اس کی ٹانگوں میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

پہاڑی نالے کے ٹھنڈے پانی کو انگلیوں سے ٹھوکتے ہوئے وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ وہ اس وادی کو ایک خواب سمجھتا ہے۔ وہ اس میں سے گذر کر پھر اپنی تنگ اور تاریک دنیا میں چلا جانا چاہتا ہے۔ جہاں بدصورتی اور ریاکاری کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ کیا کثافت اور غلاظت میں بھی کوئی لذت ہوتی ہے جو زہر کی طرح انسان کے رگ و پے میں سرائیت کر جاتی ہے اور وہ گوبر یلوں اور تل بٹوں کی طرح اسی مٹی میں اگتا اور اسی میں زندہ رہ سکتا ہے۔ کیا اذیت پسندی اس نام نہاد تہذیب کا ایک لازمی حصہ ہے۔ اور جب تک ہم جسمانی اور روحانی ہلاکت کا نظارہ نہ کریں ہمیں چین نہیں مل سکتا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو مسافر کو اس وادی میں بسنے کا خیال ناگوار کیوں ہے۔ وہ اپنی ذہنی کیفیت کے تجزیہ کی کوشش کرنے لگا۔ بچپن میں جنگل کا راجہ بننے اور جنگل کی پری سے عشق کرنے کا خیال کس قدر دلچسپ تھا لیکن آج وہ خیال ممکن الحصول تھا۔ تو وہ جھجک کیوں رہا تھا۔ اس مہذب دنیا سے اسے لینا کیا تھا انسانوں سے دکھ درد کے سوا اسے ملا کیا تھا۔ وہاں کی روٹیوں میں جسمانی اور اخلاقی امراض کے جراثیم تھے۔ اور وہ سب اسیر تھے۔ آپ اپنی خودی کے اسیر۔۔۔

ممکن ہے یہی بات ہو۔ اور یا یہ ہو کہ مسافر محض بظاہر ان کا فرد اں کا سا آدمی تھا۔ ورنہ ان کے مابین دو ہزار سال کا فرق تھا۔ یہ فرق حواس کو محسوس نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وقت کی روانی کو محسوس کرنے کی صلاحیت حواس میں نہیں۔ البتہ حواس سے پرے جسم کے نہ خانوں میں مدفون نامعلوم طاقتیں وقت کے اسرار سے واقف ہیں۔

مسافر صرف یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ ان سے مختلف ہے۔ وہ گلون کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اگر گلون کی عمر سولہ سال ہے تو اسکی اپنی عمر دو ہزار سولہ سال! اور نہ وہ ان پہاڑوں میں رہ سکتا ہے کیونکہ اگر اسکی اپنی عمر تیس سال ہے تو انکی دو لاکھ تیس سال۔

× × ×

کل صبح مسافر واپس چلا جائے گا۔ ابھی ابھی اس نے اپنے میزبانوں سے رخصت لی ہے اور ان کی مہربانی کا شکریہ بھیٹوں، بٹوؤں اور رنگین رومالوں کی صورت میں ادا کیا ہے۔ اپنا سامان بند کرتے ہوئے وہ سوچتا ہے کہ ان کا بوجھ زیادہ تھا یا میرے دل کا۔

گلون کی تصویر وہ اپنے دماغ سے نہیں نکال سکتا لیکن وہ اسے اس سرزمین سے الگ بھی نہیں کرنا چاہتا۔ وہ تا زندگی اس خیال سے اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کہ وہ سدا بہار پھول کی طرح اپنی وادی میں مہک رہی ہے اور کسی مشاطہ نے اسکے گیسو نہیں سنوارے ہیں۔ وقت اگر کہیں ملے تو اس سے وہ کہنا چاہتا ہے کہ مرتے دم تک اسے جوان رہنے دے۔

چارپائی پر بیٹھے بیٹھے وہ سوچتا ہے کہ جب موم بتی خود بخود بجھ جائیگی تو میں لیٹ جاؤنگا۔ اور عین اس وقت جب موم بتی کی لو بھڑک کر بجھنے کے قریب ہوتی ہے دروازہ اپنی چول پہ چرچراتا ہے۔ ملنگ ہانپتا ہوا چوکھٹ پر کھڑا ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔

"مسافر" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا! "وہ لوگ گاش کو قتل کر رہے ہیں"! مسافر اچھل پڑا۔ اور اسی وقت موم بتی بجھ گئی۔

"شام کو وہ گلون سے ملنے کھیت پر گیا۔ سلمی اپنے دوستوں کے ساتھ ان دونوں کی تاک میں تھا۔ دونوں پکڑے گئے۔ اب قبرستان کے سامنے مارا دیوتا کے حضور میں پنچایت اسے سزا دینے کے لئے جمع ہوئی ہے"!

مسافر کے جسم کا لہو خشک ہو گیا۔ اور اس کے ہر روئیں نے پکار کر کہا! کہ بھاگو! ملنگ نے اسکا بازو پکڑ لیا! "مسافر تو گاش کی جان بچا سکتا ہے"! اور مسافر کو وہ باہر کی طرف کھینچنے لگا۔

قبرستان کے مقابل چناروں کے جھرمٹ میں آگ جل رہی تھی لیکن اسمیں کل رات کا سا جوش و خروش نہ تھا۔ اداس اداس اور بجھی بجھی سی آگ۔ اسکی پھیکی سی روشنی مارا دیوتا کے اونچے پورے چوبی بت پر پڑ رہی تھی۔ جو قبرستان کے پھاٹک پر مردوں کی حفاظت کر رہا تھا۔ اس کے روبرو بوڑھے کافر ادب سے دوزانو بیٹھے ہوئے تھے بیچ میں ایک شہتیر نصب تھا جس سے گاش بندھا ہوا تھا۔ پاس ایک زخمی بکرا پڑا ہوا وحشت انگیز آواز میں کراہ رہا تھا معلوم ہوتا تھا اسے گھائل

کرکے چھوڑ دیا گیا تھا بچہ بیچ میں۔ گلون کا ناکام عاشق سلمیٰ زمین سے چلو بھر خون اٹھا کر گاش پر چھڑک دیتا تھا۔ مارا دیوتا کے آگے گلون ادھ ننگی لیٹی ہوئی تھی اور جب بکرے کی چیخ بند ہو جاتی تو گلون کی سسکیوں کی آواز سنائی دینے لگتی تھی۔

ذرا دور پر ملنگ نے مسافر کو روکا اور کہا "یہ ناچ نہیں ہے۔ کوئی اجنبی اس میں شامل نہیں ہو سکتا۔ تو یہیں چھپ کر تماشا دیکھ۔ اور جب ملک شاہ دیوتا کو مخاطب کرے تو اس کے پاس جا اور گاش کی جان کی امان مانگ۔"

دیر تک بکرا تڑپتا اور کراہتا رہا۔ سلمیٰ اس کے خون کے چھینٹے گاش پر چھڑکتا رہا۔ گلون خاموش ہو گئی اور عجب نہیں کہ اس نے تھکے ہوئے بدن کو ایسی حالت میں نیند آ گئی ہو۔ ملک شاہ زیرِ لب کوئی دعا ہی منتر جپتا رہا۔ اتنے میں بکرا آخری بار چلایا اور تڑپ کر مر گیا۔ اسی وقت سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور مارا مارا کی صداؤں سے ہوا تھرا اٹھی۔ سلمیٰ کسی نیزے کی ادھ میں چھپی ہوئی کھوپڑیوں کی مالا اٹھا لایا — وہ کھوپڑیاں جو اسکے اجداد نے دشمنوں کے مردہ اجسام میں سے نکالی تھیں۔ یہ ہار گلے میں ڈال کر سلمیٰ نیزہ ہلاتے ہوئے گاش کی طرف جھپٹا اور پھر دیوانہ وار مرگھٹ کے بھوت کی طرح ناچنے لگا۔ اس کے نیزے کے اشارہ پر کبھی گلون ڈر کے مارے چلاتی اور ایک آدھ مرتبہ تو گاش بھی زخمی بکرے کی طرح چیخ پڑا۔ باقی سب لوگ ہو ہو ہو اور مارا مارا کی آواز پر گویا اس ناچ پر تال دینے لگے۔

مسافر اس خیال سے سہم گیا کہ کہیں نیزہ گاش کے بدن میں چبھ نہ جائے لیکن ملنگ نے اسے تسلی دی۔ ابھی ملک شاہ نے مارا دیوتا کی اجازت نہیں لی ہے ملنگ نے سمجھایا کہ ان کا جرم بڑا سنگین ہے۔ ایک تو ننگنی سے پہلے ان کا نہانا ہے ملنا پھر دوسرے بچارتی کی لڑکی اور یہ غلام زادہ سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے اپنی وعدہ گاہ عین اس مقام کو بنایا جہاں مارا دیوتا ان کے گناہ دیکھ سکتا تھا۔

ملک شاہ کے ہاتھ اٹھاتے ہی رقص بند ہو گیا۔ اور موت کا سا سناٹا چھا گیا ابھی ملک شاہ اپنے دیوتا سے مخاطب ہوا ہی تھا کہ اسے کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ وہ چونک پڑا اور حیرانی سے ملنگ سے پوچھا کہ مہمان چاہتا کیا ہے۔

مہمان نے مارا دیوتا کے قدموں کی خاک اٹھا کر آنکھوں کو لگائی اور گلون کی ملتجی نگاہوں نے اس کے کانپتے ہوئے دل کو ہمت دی۔

وہ بولا "کل میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اور میرا دلیس اتنا دور ہے۔ کہ شاید پھر کبھی نہ آ سکوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان چند دنوں کی یاد میرے دل میں ہمیشہ رہے۔ اور اس یاد میں صرف احسان اور مسرت ہو — غم کی کوئی کھٹک نہ ہو۔" — وہ جانتا تھا کہ آخری الفاظ جھوٹ ہیں کیونکہ جس مسرت میں غم کی جھلک نہ ہو وہ یاد کیسے رہ سکتی ہے۔ ملک شاہ نے جواب دیا، ملنگ مہمان سے پوچھو کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ مہمان کی خوشنودی ہمارے مذہب کا آئین ہے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ گاش کی جان بخش دی جائے۔"

ہر شخص اپنی اپنی جگہ بھنا اٹھا۔ اور ان کی بھن بھناہٹ میں مخالفت صاف عیاں تھی لیکن ملک شاہ کے حکم سے سب خاموش ہو گئے۔ اور وہ دیوتا کے آگے جھوم جھوم کر اپنی زبان میں دیر تک کچھ کہتا رہا۔ کبھی وہ اپنے کان دیوتا کے لبوں کی طرف لاتا گویا اس کی آواز سن رہا ہو کبھی اس کی منت کرتا کبھی چپ ہو جاتا۔ آخر کار وہ اٹھ کھڑا ہوا اور سب لوگ دوبارہ مارا مارا کہتے ہوئے سجدہ ریز ہو گئے۔

ملک شاہ نے پیغمبرانہ شان سے ہر لفظ تول تول کر کہنا شروع کیا۔ "اس غلام کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں — لیکن —" اس لیکن پر سلمیٰ اور اسکے حامیوں کے چہرے اتر گئے — "لیکن مہمان نے اپنے قیام کے دوران میں صرف ایک خواہش ظاہر کی ہے۔ اور اسے رد کرنا ہمارے آئین کے خلاف ہے۔"

ملنگ نے خوشی کا نعرہ لگایا اور جلدی جلدی گاش کے بندھن کھولنے لگا۔ "ٹھہرو" ملک شاہ کی بوڑھی آواز کڑکی "گاش آئندہ ہماری وادی میں نہ رہ سکیگا۔ مہمان قیمت ادا کرکے اسے خرید لے پھر چاہے اسے چھوڑ دے یا پاس رکھے۔"

گاش کو زہر آلود نگاہوں سے اس نے گھور کر تاکید کی "اگر تم نے کبھی اس وادی میں قدم رکھنے کی جرأت بھی کی تو یاد رکھو کہ مارا دیوتا کے ۔ ۔ ۔ میں زندہ چن دیئے جاؤ گے۔"

پھر اس نے سرد مہری سے گلون کی طرف دیکھا جو روندی ہوئی کی طرح اب تک زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ بوڑھے کے اشارے پر وہ اٹھی لیکن کسی نے اس کے جسم کی ۔ ۔ ۔ سی صورت تھی۔

مگر تو مسلمی سے بیاہ کرے تو دیوتا تیرے گناہوں کو معاف کر دیں گے"

گلون کا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ پتھر کی طرح سخت پڑ گیا اور اس نے سر کی جنبش سے انکار کر دیا۔

"کاش کے علاوہ تجھے اور کوئی کافر پسند ہے؟"

گلون کے منہ سے صاف آواز نکلی "نہیں"

"تو جانتی ہے کہ دیوتا کے آگے انکار کرنے کے بعد تو عمر بھر کسی مرد کے ساتھ نہ رہ سکے گی؟"

گلون کی گردن نے اشارہ کیا کہ ہاں میں انجام کو جانتی ہوں۔

"تو پھر مجھے کچھ نہیں کہنا ہے"

دفعتاً ملنگ نے جھک کر ملک شاہ کے کان میں کچھ کہا اور بڈھے نے ذرا حیرت سے مہمان کو گھور کر لڑکی سے سوال کیا "مہمان اگر یہیں رہ جائے تو تو اسے پسند کرے گی؟"

مسافر کا دل بلیوں اچھل پڑا۔ اور اسے ایسا لگا کہ یہ لمحہ ہزاروں سال کی دوری طے کر رہا ہے۔ اور اس کی روح میں پنہاں تہذیب کی زنجیریں یوں منتشر ہو رہی ہیں جیسے زلزلہ میں سینکڑوں ہزاروں سال پرانی عمارتیں ایک آن میں برباد ہو جاتی ہیں۔ اور وہ حیران رہ گیا کہ اپنی قسمت کا وہ آپ مختار نہیں۔ بلکہ اس کی ملکہ یہ لڑکی ہے جو ابھی لکڑی کے ٹوٹے ہوئے بت کے آگے سجدہ میں پڑی سسک رہی تھی۔

گلون نے گھڑی بھر مسافر کو اداسی سے دیکھا۔ اسکی معصوم آنکھوں نے اجنبی سے کچھ نہ پوچھا۔

مگر اس کی گردن دائیں بائیں ہلی —— اور اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں نے کہا —— "نہیں"

——— × ——— × ——— × ———

پرکاش دھن

جبر و اختیار

کردار

متحرک پنکھا۔
پہلا ساکت پنکھا
دوسرا ساکت پنکھا
کاغذ کا پرزہ
چند "ماٹوز"
دیواریں۔ میز۔ کرسیاں۔ بنچ وغیرہ

[کالج کا ایک خالی کمرہ۔ فلسفے کے پروفیسر نے ابھی ابھی قضا و قدر کے مسئلہ پر اپنا لیکچر ختم کیا ہے۔ وہ اور ان کی کلاس کے دو طالب علم جا چکے ہیں۔ اب کمرے میں یا تو بنچ و کرسیاں ہیں۔ یا بجلی کے تین پنکھے۔ ان میں سے دو ساکت ہیں۔ تیسرا تیزی سے چل رہا ہے۔ گویا ایک بیکلی ہے جو اسے اس طرح سرگرداں رہنے پر مجبور کر رہی ہے۔ فضا کی خاموشی کو پنکھے کی باقاعدہ اور تھکا دینے والی سرسر توڑ رہی ہے۔ یا کاغذ کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کی مسلسل پھڑپھڑاہٹ۔ جس کا ایک سرا بنچ کی درز میں پھنسا ہوا ہے اور جو پنکھے کی تیز ہوا میں اڑ جانے کے لئے پھڑپھڑا رہا ہے۔ کبھی کبھی پنکھے کی مسلسل اور باقاعدہ سرسر میں یکایک ایک کرخت اور لمبی چیخ کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ گویا اس کی چولیں ڈھیلی ہوتی جا رہی ہیں۔ اور اس کے چاروں پر علیحدہ ہو کر فضا میں تیزی سے تیرتے ہوئے دیواروں سے ٹکرا جائیں گے۔

پھر یہ شور دفعتاً بند ہو جاتا ہے۔ گویا پنکھے کے درد کی شدت میں کمی ہو گئی ہو۔ دیواروں پر موٹے موٹے حروف میں "ماٹوز" لگے ہوئے ہیں۔ مثلاً "انسان اپنی تقدیر کا خود خالق ہے"۔ "خودی کو کر بلند...... خدا پر بھروسہ رکھو۔ اور نیکی کرو"۔ "عمل ہی راہِ نجات ہے"۔ پنکھے کی تیز ہوا میں کپڑے کے یہ ماٹو لرز رہے ہیں۔ مگر دیوار نے انہیں مضبوطی سے جکڑ رکھا ہے۔

دفعتاً یوں معلوم ہوتا ہے۔ گویا پنکھے کی سرسر بتدریج بلند ہوتی جا رہی ہے پھر آہستہ آہستہ اس آواز میں معانی پیدا ہونے لگتے ہیں۔ گویا پنکھا کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہو۔ رفتہ رفتہ الفاظ صاف ہوتے جاتے ہیں]

متحرک پنکھا۔ یہ میرا فرض ہے۔ میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ مجھے ایسا کرنا چاہیئے۔ یہ میرا فرض ہے۔ میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں ـــ ایسا چاہیئے۔ یہ میرا فرض ہے۔ میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ مجھے ایسا چاہیئے۔ ....

[آواز میں شدت اور سرعت پیدا ہو رہی ہے۔ الفاظ بلند ہوتے جا رہے ہیں۔ اور تیز تر۔ اس مریض کی آواز کی طرح جس کی کیفیت ہذیانی بخار کی شدت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جائے۔ ایسا معلوم ہے۔ گویا پنکھا پاگل ہو گیا ہو۔ آخرکار یہ شدت عروج پر پہنچ کر دفعتاً بند ہو جاتی ہے۔ گویا مریض نڈھال ہو کر بستر پر گر گیا ہو۔ اور اب اس میں بکنے جھکنے کی تاب بھی باقی نہ ہو۔

رفتہ رفتہ فضا میں ایک گنگناہٹ سی بلند ہوتی ہے۔ یہ اسی پنکھے کی آواز ہے مگر اب اس کی آواز میں ٹھہراؤ ہے۔ گویا مریض ہوش میں آ گیا ہو۔]

متحرک پنکھا۔ زندگی! زندگی عمل کا نام ہے۔ انتھک عمل کا ـــ سعی مسلسل کشمکش لازوال جہادِ پیہم۔ ان کے بغیر زندگی ہے کیا! آخرکار وہ رازِ سربستہ مجھ پر وا ہو گیا جس نے اتنی مدت مجھے پریشان رکھا۔ اب بھی میری راتیں بیقرار ہوں گی۔ اور میرے دن بیتاب ... میری زندگی میں خلش ہوگی، تڑپ ہوگی، جستجو ہوگی۔ مگر اب ...

نہ ہوگی۔ اب میری تڑپ اور خلش راہ گم کردہ مسافر کی تڑپ اور خلش نہ ہوگی۔ اب میری جستجو نے منزل دیکھ لی۔ اب میری راہ معین ہے۔ میری منزل مخصوص ہے۔ بے یقینی اور بے عملی کی وہ کرب انگیز اذیت جس نے میرے ہر پیچ اور ہر تار کی قوت سلب کر رکھی تھی۔ اب دور ہو چکی۔ اب راتوں کی تاریکی میں جب کائنات سو رہی ہوگی۔ میرا دماغ مجھ سے بار بار یہ نہ پوچھے گا۔ کہ مقصدِ حیات کیا ہے۔ اب میں سمجھ گیا ہوں کہ حیات جاودانہ سعی جاودانہ کا دوسرا نام ہے۔ ایک پنکھے کا فرض منصبی حرکت ہے۔ کبھی نہ رکنے والی حرکت۔

وقفہ۔ کچھ دیر کے لئے کمرے میں پھر وہی سکوت چھا جاتا ہے۔ البتہ پنکھے کی سرسراہٹ بدستور ہے۔ اور کاغذ کے پرزے کی پھٹ پھٹ بڑھ گئی ہے۔ گویا وہ اپنے تئیں پنکھے کے چنگل سے آزاد کرانے کے لئے اور بھی بیتاب ہو رہا ہے۔ بنچ کرسیاں اور میز خاموش ہیں۔ شاید پنکھے کی تفسیر حیات پر غور کر رہے ہیں۔ دیواروں پر کپڑے کے ماڈل اب بھی اسی طرح لرز رہے ہیں۔ اور ساکت دیواریں اب بھی انہیں مضبوطی سے جکڑے ہوئے ہیں۔]

متحرک پنکھا۔ آہ اس زندگی میں کس قدر تسکین ہے۔ کس قدر مسرت ہے۔ مقصدِ حیات کا علم ہو۔ تو حیات کس قدر شیریں ہو جاتی ہے! ادائیگی فرض میں کتنا حظ ہے۔ کس قدر راحت! برسوں کی روحانی تگ و دو کے بعد یہ ... قدر شیریں ہیں۔ میری خودی بیدار ہو چکی ہے۔ اور میں اپنے اندر ... طاقت کا احساس کر رہا ہوں۔ ایک بے پناہ قوت کا بحر بے پایاں ... موجزن ہے۔ اب میرے ارادے مستحکم ہیں۔ اب میری زندگی ... ہیں۔

الفاظ کمرے کی دیواروں، بنچوں، کرسیوں اور میزوں پر بکھر جاتے ہیں۔ پنکھا ... اور کپڑے کے ماڈل ... ہر چیز مبہوت و ساکت ہے ... لرزشیں ... کی مجنونانہ پھٹ پھٹ ... مسلسل ... شاید ... چند لمحوں کے لئے ایک نئے میں ... ہیں حتیٰ کہ ... کی آواز بلند ہوتی ہے۔

... اسی گردش مدام کا نام زندگی ہے۔ حیف ہے ... نہ کہے۔ لعنت ہے ہر اس وجود پر۔ جو جامد و ساکت ہے۔ اور لعنت ہے ہر اس فرد پر جو متحرک نہیں۔ کائنات کا ہر ذرہ مظہر ہے۔ کہ حرکت ہی قانون قدرت ہے۔ وسعت عالم میں کونسی شے ہے جس میں حرکت نہیں۔ اس لئے کیا ہم پر کہ اشرف المخلوقات ہیں۔ یہ فرض نہیں کہ ہماری زندگی ایک کاوش لامتناہی ہو؟ دنیا بھر کی تمام مخلوق ہمارے مقابلہ میں حقیر ہے۔ ہم پنکھوں میں وہ جذبۂ بے پناہ موجود ہے جس کا منبع خود حرکتِ اعظم کی ذاتِ خاص ہے۔ یہ ہمارا حصہ تھا کہ ہمیں یہ عطیۂ خاص تفویض کیا گیا۔ پھر کیا واجب ہے کہ ہم ان حقیر و بے مایہ بنچوں اور کرسیوں کی طرح بے حس و حرکت رہیں؟

آواز اب پھر بتدریج بلند ہوتی جا رہی ہے۔ اب اس کا انداز سرگوشیانہ نہیں۔ غضبناک ہے۔ لہجہ میں تحکم ہے۔ گویا جو کچھ کہا جا رہا ہے اس کی صداقت میں کلام نہیں۔ وہی حرفِ آخر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی اس تقریر کا مخاطب بھی ہے۔ آواز پھر بلند ہوتی ہے۔

متحرک پنکھا۔ اے حریصِ لذتِ جمود! اے ننگِ حرکت و کاوش! کوہ باطل و دزدِ سیاہ مخلوقِ حرکتِ اعظم۔ یہ مستغرق سکوت کہاں تک؟ یہ محویتِ عدم خوابیدگی تا چند؟ کب تک تو اس طرح کاہل و بے کار رہے گا؟ کہاں تک تو حکمِ الٰہی کی سرتابی کرے گا؟ بار بار میں نے تجھے دعوتِ عمل دی۔ اور بار بار تو نے اسے رد کیا۔ بار بار میری آواز جہادِ عظیم کے لئے بلند ہوئی۔ اور بار بار اس کی گونج تشنۂ حرفِ لبیک ہو کر واپس آئی۔ تیرے پیچ اس قدر ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ اور تیرے تار اس قدر مردہ کہ میرا نعرۂ حق تجھ میں جنبشِ عمل نہیں لا سکتا۔ میری زبان میں وہ اثر ہے کہ پہاڑوں کے سینے شق ہو جائیں۔ دریا ہیبت سے اپنے رخ بدل دیں۔ اور وسعتِ افلاک خوف و ہراس سے اپنے تئیں سمیٹ لے۔ مگر صد حیف اے نامرد! کہ تیرے پروں نے جنبش نہ کی۔ اور تیرے بدن کا ایک تار تک نہ پھڑکا۔ میری وہ گرمیٔ گفتار جس کی حدت سے دنیا بھر کے ریگزاروں کی ریت تک پگھل سکتی ہے۔ تیرے سینے کی ایک دھڑکن تک کو نہ گرما سکی۔ اب بھی وقت ہے۔ اٹھ۔ کمر ہمت باندھ۔ اور سرگرمِ کار ہو۔

آواز تھمتی ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے گویا ہزاروں بجلیوں نے ابھی ابھی کڑکنا بند کیا ہے۔ اب کے سکوت میں بھی ایک حدت ہے۔ ایک ارتعاش۔ چند لمحوں کے لئے کانوں کو ...

تک دب چکی ہے۔ گویا وہ اس کڑاک سے مرعوب ہو کر بے دست و پا ہو گیا ہو۔ یا پیچ کی گرفت متوقع سعیِ عمل کی پیشقدمی کے لئے اس پر اور بھی سخت ہو گئی ہو۔ پھر ہوا میں سرگوشی سی بلند ہوتی ہے۔ گویا کوئی نیند سے جاگ رہا ہو۔

پہلا ساکت پنکھا۔ واللہ کیا مزے کی نیند تھی جس سے آپ نے مجھے یوں بیدردی سے بیدار کر دیا۔ اب میں آپ سے گلہ بھی کروں۔ تو کیسے! آپ تو ماشاءاللہ جوشِ عمل سے پسینہ پسینہ ہوئے جاتے ہیں۔ ذرا دم تو لیجئے۔

آواز میں لوچ ہے۔ تمسخر آمیز متانت ہے۔ اور ایک ہلکی سی تھکن۔ دیوار پر لگے ہوئے ماؤزر کی ہلکی سی لرزشوں کی طرح نحیف و نزار۔ چنانچہ جب آواز بند ہو جاتی ہے۔ تو ماؤزر کی لرزش اسی کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ پھر اس ارتعاش پر ایک بھدی۔ کرخت آواز غالب آ جاتی ہے۔ کاغذ کے پرزے کی سی پھٹ پھٹ کی آواز۔

دوسرا ساکت پنکھا۔ خواہ مخواہ چلائے جا رہا ہے کمبخت جیسے اسکے باوا کا راج ہی تو ہے۔

آواز بند ہو جاتی ہے گویا بادل کڑکا۔ اور خاموش ہو گیا۔

متحرک پنکھا۔ حرکتِ اعظم کی لعنت ہو تم پر۔ اور تمہاری حیاتِ بے معنی پر۔ تم لوگ گم کردہ صراطِ مستقیم ہو۔ مجھے کہ محوِ عمل تکمیل مقصدِ حیات ہے چند روزہ ۔۔۔۔۔۔۔ بدل

پہلا ساکت پنکھا۔ خدارا ذرا تھمیئے۔ آپ بولتے ہیں۔ تو میں ڈر جاتا ہوں کہ خدانخواستہ کہیں کوئی ترکیب ختم کر لینے سے پہلے آپکا دم گھٹ کر نہ رہ جائے۔ اور کوئی اضافت کہیں جان لیوا ثابت نہ ہو جائے۔

متحرک پنکھا۔ اے لعین۔ تو راہِ حق میں تمسخر و تضحیک سے کام لیتا ہے۔ حرکتِ اعظم کا قہر یقیناً تجھ پر نازل ہوگا۔ اور تو دونو جہانوں میں راندا جائیگا۔ میری طرف دیکھ۔ مجھ میں تو اس ربِ عظیم کی بے پناہ قوتیں کار فرما دیکھے گا۔ جو تحریکِ اعظم ہے۔ حرکتِ اعظم ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا۔ کہ عمل ہی زندگی کی ابتدا ہے۔ اور عمل ہی انتہا۔ کہ حرکت زندگی ہے۔ اور جمود موت۔ پس ثابت ہے۔ کہ عمل تجھ پر فرض ہے۔ مگر تو ہے۔ کہ اپنے وسیع اور باوقار پر پھیلائے پڑا ہے۔ اور انہیں حرکت میں نہیں لاتا۔ کیا تو محسوس نہیں کرتا کہ تیری زندگی عمل کے بغیر بے معنی ہے۔ آخر تیری زیست کا مقصد کیا ہے؟

پہلا ساکت پنکھا۔ دیکھئے نا۔ آپ پھر بیدم ہوئے جاتے ہیں۔ ذرا سنبھل کر بات کیجئے۔ اور ہاں۔ یہ عمل کا لفظ۔ جسے آپ بار بار استعمال کرتے ہیں۔ ذرا وضاحت طلب ہے۔ آخر وہ عمل ہے کیا جس کی آپ مجھے بار بار ترغیب دیئے جا رہے ہیں!۔ گھومنا ہمیشہ کے لئے گھومنا۔ ہمیشہ کیلئے ایک ہی محور کے گرد گھومنا!۔ شاید آپ اسی کو "عمل" کہتے ہیں۔ کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ ہمارے عمل کا دائرہ بہت محدود ہے۔ اور ہماری تخلیق کے دن ہی اس امر کا آخری اور ناطق فیصلہ کر دیا گیا تھا۔ کہ ہم کس قسم کے عمل کے مجاز ہیں؟ اگر فی الواقع ایسا ہے۔ تو اس بے معنی عمل سے حاصل! اگر زندگی میں کوئی معنی ہے۔ تو یقیناً اس امن و سکون کی وجہ سے۔ جو مجھے حاصل ہے آپ ایک خاص عمل کے لئے مجبور ہیں۔ میں کلیتاً آزاد ہوں۔

متحرک پنکھا۔ تو گویا تو فلسفی ہے۔ اور اپنی خرد کو ارشاداتِ محرکِ اعظم سے بالاتر تصور کرتا ہے۔ سن اے گردیدۂ فہم و ادراک! کہ جس خرد پر تو نازاں ہے۔ وہ تجھے دوزخ کی پستیوں کی طرف لے جائیگی۔ تیرا ذہن قال و اقوال کی الجھنوں میں گرفتار ہے۔ اور تیری آنکھیں اس حقیقت کی طرف بند ہیں جس کا نور شعاعِ مہر کی طرح تاباں ہے۔ تو کہتا ہے۔ کہ عمل بے معنی ہے۔ محدود ہے۔ ناپائیدار ہے۔ لیکن تو نہیں جانتا۔ کہ محرکِ اعظم نے ہم میں وہ بے پناہ قوتیں پنہاں کی ہیں۔ اور ہمیں وہ کوہ شکن ارادے عطا فرمائے ہیں کہ عالمِ امکان کی ہر چیز ان کے سامنے ہیچ ہے۔ محرکِ اعظم نے عمل کی تمام راہیں تجھ پر کھولی ہیں۔ صرف اختیارِ جزا اپنے ہاتھوں میں رکھا ہے۔ کیا تو نہیں جانتا۔ کہ تیرا اختیار صرف ادائیگی فرض تک ہے۔ اور اس کے صلہ کی خواہش تجھ پر حرام کر دی گئی ہے! پس اے فلسفی۔ اٹھ۔ اور جزا کی تمنا بھی چھوڑ کر عمل کی جانب راغب ہو۔ کیونکہ بموجب فرمانِ محرکِ اعظم ہر بندے کا فرض ہے۔ کہ اس بے نہایتی ادوار میں اپنا معین فرض انجام دے جس کی ابتدا محرکِ اعظم نے کی ہے۔

پہلا ساکت پنکھا۔ سبحان اللہ۔ اپنی بے بضاعتی کی کیا اعلےٰ تفسیر جناب نے اپنی زبانِ مبارک سے فرمائی۔ کیا آپ کے فلسفۂ عمل کی بنیادیں فی الواقع اس قدر کمزور ہیں کہ آپ اپنا اختیار عمل تک ہی محدود رکھتے ہیں اور اس کے نتائج کسی موہوم طاقت کے سپرد کر دیئے ہیں؟ تو نتیجۂ عمل سے حاصل؟ آپ پنکھے ہیں۔ یا محض ایک مشین؟ آخر آپ میں ادراک کا مادہ ...

اُس پر زندے ہیں، جو پنج کے چنگل میں پھڑ پھڑا رہا ہے۔ فرق ہی کیا ہے؟ مجھے کسی ایسی موہوم طاقت کی ہستی سے ہی انکار ہے۔ میرا یہ نظریہ ہے۔ کہ نظامِ عالم چند ازلی اور ابدی قوانین پر قائم ہے جن کی تشکیل میں ہماری ہستی یا نیستی اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ ان قوانین میں ذرہ بھر تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ اور اس لئے میرے ہر عمل کا حاصل معین ہے۔ ایک خاص عمل کا ہمیشہ ایک خاص معین نتیجہ بر آمد ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی موہوم ہستی مطلق موجود بھی ہے تو وہ بھی ان معین نتائج میں ردو بدل کرنے کی مجاز نہیں۔ اگر مجھے عمل سے کد ہے۔ تو اس لئے نہیں کہ مجھے اس کے نتائج کے بارے میں کسی کی مداخلت کا ڈر ہے۔ بلکہ اس لئے کہ میرے عمل کا دائرۂ انتخاب بہت محدود ہے۔ جب قوانین قدرت نے مجھے یہ اختیار دیا ہے۔ کہ میں ساکن رہوں۔ یا حرکت کروں۔ تو وہ مجھے اس امر پر کیوں مجبور کرتے ہیں۔ کہ میں ایک ہی سمت حرکت کروں؟ اور پھر جب میری ساری مساعی کا انجام آخر کار یہی ہوتا ہے کہ نظامِ عالم جیسا ہے۔ ویسا ہی رہے گا تو مجھے اس مجنونانہ عمل سے حاصل؟

متحرک پنکھا۔ عمل اپنا حاصل آپ ہے۔

پہلا ساکت پنکھا۔ آپ کے لئے شاید ایسا عمل کوئی دلچسپی رکھتا ہو میں ایسے عمل کو بے معنی سمجھتا ہوں۔ آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے۔ کہ آخر اس بے معنی عمل کے باعث آپ کونسی فضیلت حاصل کریں گے؟ کیا اس گردشِ مدام سے آپ کا جی نہیں گھبراتا؟ کیا آپ یہ نہیں سوچتے۔ کبھی نہیں سوچتے کہ آخر جب آپ اس طرح گھومتے گھومتے اپنا ہر ہر پرزہ گھسا بیٹھیں گے۔ تو بھی آپ میں اور مجھ میں کیا فرق ہو گا۔ سوائے اس کے کہ میں مقابلتاً تر و تازہ ہونگا۔ اور آپ پر قبل از وقت بڑھاپا آجائے گا۔

متحرک پنکھا۔ تو خود اپنے استدلال میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ تجھے کیا معلوم کہ جب میں یوں ادائیگی فرض میں سرگرم ہوں۔ تو مجھے کس حظ کا احساس ہوتا ہے۔ ایک بار حرکت کر۔ اور پھر دیکھ۔ کہ تیری زندگی کس قدر پُر لطف ہو جاتی ہے۔

پہلا ساکت پنکھا۔ یقیناً آپ اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں۔

متحرک پنکھا۔ آہ میں تجھے کیسے بتاؤں کہ تیری زندگی کس قدر بے معنی ہے۔ میں تجھے کیسے سمجھاؤں۔ کہ تو اس قعرِ مذلت میں پڑا ہے۔ جہاں تجھے دیکھ کر میرا دل جلتا ہے۔ کاش محرکِ اعظم تجھے آنکھیں بخشتا۔ کاش تو یہ جان سکتا۔ کہ عمل بے معنی نہیں۔ حرکت لا حاصل نہیں۔ یہ کیسے ہو۔ کہ میں تیرے ذہن کی تاریکیاں دور کر سکوں۔ اور تجھ پر ظاہر کر سکوں۔ کہ اگر تو عمل کرے گا۔ تو خود ربِ عظیم کی ساری قوتیں تیرے شاملِ حال ہونگی۔

پہلا ساکت پنکھا۔ معاف کیجئے۔ آپ کی جذباتیت کا مجھ پر اثر نہ ہوگا آیئے اگر آپ فی الواقع میری ذہنی الجھنیں دور کرنا چاہتے ہیں۔ تو اس امر کا کوئی بین ثبوت بہم پہنچایئے۔ آپ کی ساری کوششوں کے باوجود آپ میں اتنی طاقت بھی تو نہیں کہ آپ کاغذ کے اس بے بس و لاچار پرزے کو، جو آزادی کے لئے پھڑ پھڑا رہا ہے۔ اس ظالم پنج کے پنجے سے رہا کرا سکیں ....

دفعتاً کاغذ کا پرزہ پنج کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور پنکھے کی ہوا میں چکر کاٹتا ہوا آخر دیوار کے ساتھ چپک جاتا ہے۔ پھر وہاں سے بھی رہا ہو کر ایک جست کے ساتھ پنکھے کی ہوا کی پہنچ سے باہر فرش پر گر پڑتا ہے۔ کچھ دیر کے لئے کمرے میں کامل سکوت طاری ہو جاتا ہے متحرک پنکھا بھی گویا فرطِ استعجاب سے دم بخود ہے۔ پھر چند لمحات کے بعد متحرک پنکھے کی کڑک سنائی دیتی ہے۔

متحرک پنکھا۔ دیکھ اے منکرِ ہستی محرکِ اعظم! اگر دیدۂ حق شناس بینا ہو۔ اور سن اے پیروِ مسلک جمود۔ اگر گوشِ حق بنوش باز ہو۔ کہ تیرے حلق سے تیرے کلمات نکل بھی نہ پائے تھے۔ اور تیرے الفاظِ استشہاد کی گونج ابھی لوٹی بھی نہ تھی۔ کہ محرکِ اعظم کے دستِ قاہر و مقتدر نے حرکت کی۔ اور اپنی شمشیرِ ہیبت و اجلال سے تیرے دلائل باطلہ کی صفوف کو یکسر قلم کر دیا۔ کیا یہ شہادت بینہ و علامت صریحہ بھی تیری نیند کا نشہ اتارنے کو نا کافی ہے؟ تو یاد رکھ کہ تو مٹا دیا جائے گا۔ اور تیرے عظیم الشان اور مضبوط پر۔ جن کے سہارے تو کھڑا ہے۔ تجھ سے چھین لئے جائیں گے۔ تیرے پیچ اس قدر کس دیئے جائیں گے۔ کہ تو کرب و اذیت سے چیخے گا۔ پس اے فیلسوف! خشوع و خضوع اور انقطاع و قنوت سے مصروفِ رقصِ الٰہی ہو۔ اور دل و جان سے تحریکِ اعظم کا مطیع و منقاد بن!

فضا پر پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ اس قدر گہری خاموشی کہ ماحول کی نامعلوم سی لرزشیں بھی بلند آہنگ معلوم ہوتی ہیں۔

پھر تھوڑے سے وقفہ کے بعد دوسرے ساکت پنکھے کی کرخت اور بھاری آواز سنائی دیتی ہے۔ آواز میں اب وہ درشتی نہیں جس کا اظہار پہلی بار کیا گیا تھا۔ اس میں اب گھبراہٹ ہے۔ دہشت ہے۔ استعجاب ہے عجز ہے۔

دوسرا ساکت پنکھا۔ اے حرکت اعظم میں گناہ گار ہوں میرے گناہ بخش دے۔ اب تک میں مدہوش رہا۔ میں نے تجھے نہ پہچانا۔ میں گنہگار ہوں۔ مجھے بخش دے۔

پہلا ساکت پنکھا۔ مبارک ہو جناب۔ آپ کا بے پناہ استدلال ایک گمراہ کو راہ راست پر لے آیا۔ اسے اپنے سایۂ عاطفت میں لیجئے۔ اسکے گناہ بخش دیجئے۔ اب اس کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ وہ پرزۂ کاغذ جو اس کے اور محرکِ اعظم کے درمیان پردہ کی طرح حائل تھا۔ اور جس نے محرکِ اعظم کی ہستی جلیل کو اس کی آنکھوں سے اوجھل کر رکھا تھا۔ اب ہٹ گیا ہے۔ اب اسے کائنات کے ہر ذرے میں وہ ربِ عظیم نظر آ رہا ہے۔ جو محرکِ اعظم ہے۔ حرکت اعظم ہے۔ تحریکِ اعظم ہے!

آواز میں اب بھی وہی تمسخر آمیز متانت ہے۔ وہی ٹھہراؤ۔ وہی سوچ۔ مگر اب اس میں ایک احساس ناکامی کی آمیزش ہو چکی ہے۔ ہلکی سی تھکن اب گہری ہو گئی ہے۔ اور لہجہ گویا کہہ رہا ہے "کیا حاصل؟" پھر جب متحرک پنکھے کی آواز گونجتی ہے تو اس کا فاتحانہ انداز اس آواز کے ساتھ ایک عجیب تقابل پیش کرتا ہے۔

متحرک پنکھا۔ یقیناً تیری عقل پر محرکِ اعظم کی حکمتوں نے پردہ ڈال رکھا ہے۔ یقیناً تیری آنکھیں بند ہیں۔ اور تیرے کان بہرے کر دیئے گئے ہیں۔ تو نے محرکِ اعظم سے اس کی ہستی کا ثبوت مانگا تھا۔ تو نے عمل کو بے معنی ثابت کرنے کی دلیل دی تھی۔ چنانچہ حرکتِ اعظم نے مجھے وہ طاقت بخشی۔ کہ ایک معجزے کے ذریعے میں نے تیری دلیل رد کر دی جس کی آنکھیں تھیں۔ اس نے حرکتِ جلیل المرتبت کو پہچان لیا۔ جس کے کان تھے۔ اس نے محرکِ اعظم کے رقصِ جاودانی کی آواز سن لی۔ یقیناً محرکِ اعظم نے اسے اپنے دامن میں پناہ دی۔ اور یقیناً تو ہدفِ پیکانِ عذابِ الٰہی بنا دیا گیا۔

پہلا ساکت پنکھا۔ مرحبا! اے عالم باعمل پنکھے۔ مرحبا!

دوسرا ساکت پنکھا۔ تم بھی ایک ہی ڈھیٹ ہو۔ شرم نہیں آتی؟ جواب نہیں سوجھتا تو مذاق کی ٹھانی ہے۔ تمہیں ملے تو کیا تعقل ہم اپنے عمل سے ایک پرزۂ کاغذ تک کو رہا نہیں کرا سکتے۔ بولو۔ ڈ ... ہوا یا نہیں؟ پھر اب اور کیا ثبوت درکار ہے؟

پہلا ساکت پنکھا۔ مگر اس امر کا کیا ثبوت ہے۔ کہ پرزۂ کاغذ کی رہائی کے لئے انہیں کا عمل ذمہ دار ہے؟

دوسرا ساکت پنکھا۔ اس کے ثبوت کی کیا ضرورت ہے؟ کیا یہ بات کم ثبوت ہے۔ کہ ادھر تم نے منہ سے بات نکالی۔ ادھر پوری کر دی گئی؟ تمہیں بتاؤ۔ ایسا کیوں ہوا؟

پہلا ساکت پنکھا۔ اتفاق محض اتفاق میں نے زندگی کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اس فرش سے لیکر چھت تک کوئی چیز ایسی نہیں جس کی ساخت اور ماہیت سے میں واقف نہیں۔ اپنے جسم سے لیکر ایک حقیر اور بے حس و حرکت کرسی تک ہر شے پر حاوی قوانین میں نے دریافت کئے ہیں۔ میرے مشاہدے اور تجربے کا حاصل یہ ہے۔ کہ قوانین قدرت یقیناً ہمارے نظریوں کے پیش نظر نہیں بنائے گئے۔ ہم رہیں یا نہ رہیں۔ یہ ہمیشہ رہیں گے۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں یہ نہ بدلیں گے۔ پھر میں یہ کیسے مان لوں۔ کہ یہ پرزۂ کاغذ محض اس لئے رہا کر دیا گیا۔ کہ اس فعل سے کسی کے نظریئے کی حمایت مقصود تھی!

دوسرا پنکھا۔ عجیب آدمی پنکھے ہو۔ کیا جو تم جانتے ہو۔ اور مانتے ہو۔ وہی ٹھیک ہے؟ چاہے اُسکے خلاف ثبوت بھی مل جائے؟

پہلا ساکت پنکھا۔ آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ دیکھئے دو امور کا اتفاقیہ طور پر ایک بار ایک ہی وقت پر نمودار ہو جانا ہمیں کوئی نتیجہ اخذ کر دینے کا اہل نہیں بناتا۔ اس اتفاقی امر کی جو تاویل آپ کر رہے ہیں۔ کیا وہ محض ایک خوش فہمی کی پیدا کردہ نہیں؟ کیا یہ ہماری احمقانہ جسارت نہیں کہ ہم یہ سمجھ لیں۔ کہ یہ تمام نظام محض ہمارے نظریات کی درستی یا نادرستی ظاہر کرنے کے لئے تعمیر کیا گیا ہے؟ اور ہماری خواہشات کے احترام کی خاطر اس میں ردو بدل کیا جا سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں پرزۂ کاغذ کی رہائی چند ایسے قوانین کے عمل کے باعث ہوئی جن کا، بالواسطہ نہ تو ہماری مساعی سے تعلق ہے۔ نہ خواہشات سے۔ اگر ہے۔ تو آیئے۔ اپنے پیر و مرشد سے کہئے وہ ایک اور معجزہ دکھائیں۔ اور پرزۂ کاغذ کو بعینہٖ اسی حالت میں واپس بھیج دیں جس میں وہ پہلے گرفتار تھا۔

دوسرا ساکت پنکھا۔ خدا جانے کیا بکے جا رہے ہو۔ تم نے جو ثبوت مانگا تھا وہ نہیں مل گیا۔ اب اور مانگو گے تو وہ بھی مل جائے گا۔

متحرک پنکھا۔ اے حق شناس! تو ابھی ان معاملات میں مبتدی ہے تو نہیں جانتا اس فیلسوف کے دلائل باطلہ تیرے حق میں کس درجہ خطرناک ہیں۔ پس تجھ پر واجب ہے۔ کہ ملعون کے اقوال فاسدہ کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اس کے گمراہ کن اور ایمان سوز الفاظ سننے کی نسبت تیرے لئے بہتر ہوگا۔ کہ پگھلا ہوا سیسہ تیرے کانوں میں ڈال دیا جائے۔ یاد رکھو۔ کہ ہر لفظ جو اس کے منہ سے نکلتا ہے۔ اپنے اندر دوزخ کی آگ کی ایک کبھی نہ بجھنے والی بھٹی رکھتا ہے۔ جو تجھے تا ابد جلاتی رہے گی۔ تو اپنی نجات کا ذمہ دار خود ہے۔ عمل ہی ذریعۂ نجات ہے۔ اسلئے سرگرم عمل ہو۔

پہلا ساکت پنکھا۔ ہاں ہاں۔ دوست۔ اب سرگرم عمل ہو کمرے کی دیواریں مضطرب ہیں۔ میز اور کرسیاں پسینہ میں شرابور ہیں سارا عالم انتظار میں ہے۔ تو کیوں پس و پیش کر رہا ہے؟

دوسرا ساکت پنکھا۔ دیکھو بھئی تم بہت بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے ہو۔

متحرک پنکھا۔ تو پھر اس لعین کی طرف متوجہ ہوا! یہ وہ مخلوق ہے جس کے لئے راہِ عمل بند کر دی گئی۔ ممکن نہیں۔ کہ اسکے قلب تیرہ و تار میں ایک شعاع نور الٰہی کا گذر تک ہو سکے۔ خوفِ تادیب نارِ جہنم بھی اسے اس کی خوابیدگی اغراض سے بیدار نہیں کر سکتی۔ پس واجب ہے۔ کہ تو اس کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اور وہ رقصِ جاودانی شروع کر جو تجھے محرک اعظم کا محبوب بنا دے گا۔

وقفہ۔ کمرے میں مکمل خاموشی ہے۔ البتہ متحرک پنکھے کی سرسراہٹ فاتحانہ شدت اختیار کر رہی ہے۔ شاید یہ اس کے احساسِ فتحمندی کا نتیجہ ہے۔ پہلا ساکت پنکھا خاموش ہے۔ دوسرا ساکت پنکھا شاید حرکت کرنے کی کوشش میں ہے۔

پھر کچھ دیر بعد فضا میں ایک گہری اور لمبی آہ ابھر جاتی ہے۔

جو رفتہ رفتہ ایک اندوہناک اور یاس انگیز پکار بن جاتی ہے۔

دوسرا ساکت پنکھا۔ یا پیر و مرشد! یہ کیا ہے۔ کہ میں چلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور چل نہیں سکتا۔ میں کس تیزی سے گھوما کرتا تھا مگر آج مجھے کیا ہو گیا ہے۔ کہ میرے پیچ مجھے سہارا نہیں دیتے۔ میرے "قابلے" اس قدر کس چکے ہیں۔ کہ مجھے حرکت کرنے نہیں دیتے ہیں جس قدر حرکت کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ خود کو بے بس و لاچار پاتا ہوں۔ المدد الغیاث!

وقفہ۔ جس میں متحرک پنکھے کی سرسراہٹ اور موٹر کی ہلکی لرزشیں دوسرے ساکت پنکھے کی ناکامی عمل پر طنز سا معلوم پڑتی ہیں۔

پہلا ساکت پنکھا۔ واللہ آپ لوگ از حد دلچسپ پنکھے ہیں۔ پیر و مرشد فرماتے ہیں۔ حرکت کرو۔ سعادتمند مرید جواب دیتے ہیں۔ کوشش کرتا ہوں۔ مگر حرکت نہیں کر سکتا! گویا آپ کو اپنی حرکت پر بھی اختیار نہیں!

دوسرا ساکت پنکھا۔ میری ساری روح حرکت کے لئے کوشاں ہے مگر آہ! میں کس قدر بے بس ہوں۔ کس قدر لاچار! کتنا مجبور! شاید محرک اعظم کا یہ منشا نہیں۔ کہ میں حرکت کروں۔

پہلا ساکت پنکھا۔ کیوں اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہو! تم اپنی حرکات میں مختارِ مطلق ہو۔ تم کسی بھی لحہ حرکت کر سکتے ہو۔ مگر اصل بات یہ ہے۔ کہ تم حرکت کرنا نہیں چاہتے۔ تمہارے تحت الشعور میں حرکت کے خلاف ایک زبردست فطری جذبہ موجود ہے۔ کیونکہ حرکت غیر فطری ہے۔ اور جمود فطری۔ تمہارا شعور تمہارے تحت الشعور اور لاشعور کی اس فطری خواہش کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور یہی باعث ہے کہ تم حرکت نہیں کرتے۔

دوسرا ساکت پنکھا۔ کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ اپنی خواہشات کو میں زیادہ جانتا ہوں۔ یا تم؟ اس وقت میری سرشت کا ہر ذرہ حرکت کا خواہشمند ہے لیکن شاید محرک اعظم کی رضا نہیں۔

پہلا ساکت پنکھا۔ اپنی سرشت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اسکے لئے یقیناً تمہیں کسی تجربہ کار ماہر نفسیات کی خدمات درکار ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ تمہارا تحت الشعور غیر معمولی طور پر پیچیدہ ہے۔ تم جسے اپنی کمزوری پر محمول کر رہے ہو۔ دراصل وہی تمہاری ذہنی صحت کا سب سے بڑا ثبوت ہے........

متحرک پنکھا۔ اے مجسمۂ کذب و ریا۔ اور اے سرچشمۂ نظریات باطلہ! اپنی تقریر طولانی بند کر۔ تو ان آثار و علائم کی تفسیر و تاویل واقعی کے قطعاً

نااہل ہے۔ یقیناً یہ عذاب محرکِ اعظم نے اُسے اس گناہ کی پاداش میں دیا ہے جس کا مرتکب یہ تیری دلائلِ فاسدہ سننے کے باعث ہوا۔ حرکت ہمارا شعار ہے۔ حرکت قانونِ قدرت ہے۔ حرکت رضائے الٰہی ہے۔ خود محرکِ اعظم کی ذاتِ خاص ایک رقصِ جاودانی ہے۔ پس یہ کیسے ممکن ہے۔ کہ یہ حرکت نہ کر سکے؟

پہلا ساکت پنکھا۔ تو پھر بتلایئے۔ یہ حرکت کیوں نہیں کر سکتا؟ سوائے اس نفسیاتی حل کے۔ جو میں نے ابھی ابھی پیش کیا ہے۔ آپ کونسا حل پیش کر سکتے ہیں؟

متحرک پنکھا۔ یقیناً اس کی خودی ابھی کلیتاً بیدار نہیں ہوئی۔ ورنہ ایسا کیوں ہے۔ کہ یہ حرکت نہیں کر سکتا؟

پہلا ساکت پنکھا۔ اس لئے کہ حرکت غیر فطری ہے۔ اور جمود فطری۔

متحرک پنکھا۔ ہرگز نہیں۔ حرکت فطری ہے۔ اور جمود غیر فطری۔ کیا تو دیکھتا نہیں۔ کہ میں جس کی خودی بیدار ہے۔ کس طرح حرکتِ جاودانی میں مصروف ہوں؟ کیا تو سمجھتا ہے۔ کہ اب دنیا کی کوئی بھی طاقت اس رقص الحرکت عظمیٰ کو بند کر سکتی ہے؟ قسم ہے محرکِ جلیل المرتبت کی۔ کہ تمام پہاڑوں کی چوٹیاں۔ تمام آسمانوں کی بجلیاں۔ ساری دنیاؤں کے زلزلے۔ اور سمندروں کا سارا پانی بھی میرے رشتۂ عمل کو منقطع ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایک غیبی ہاتھ نے بڑھ کر "سوئچ" بند کر دیا ہے۔ آواز بتدریج مدھم ہوتی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ جب پنکھا رک جاتا ہے۔ تو وہ اپنی بات ختم کئے بغیر ہی خاموش ہو جاتا ہے۔ دیواروں کے ماثوز آخری بار تھرک کر رہ جاتے ہیں۔

باہر کسی کے بھاری بوٹوں کی چاپ چند لمحوں کے لئے سنائی دیتی رہتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ مدھم ہوتے ہوتے آخر گم ہو جاتی ہے۔

کمرے پر ایک گہری خاموشی چھا جاتی ہے۔ مگر فضا میں اب بھی ایک حدت ہے۔ ایک ارتعاش۔

جاوید اقبال

اشک و لہو

منظر :۔ (کسی مفرور جوڑے نے سرائے کے ایک غلیظ کمرے میں پناہ لی ہے۔ چارپائی پر ایک نوجوان کمبل اوڑھے گہری نیند سو رہا ہے۔ سامنے کھڑکی میں اُس کی ہمنوا لڑکی کھڑی عجیب انداز میں آسمان کو تک رہی ہے۔

رات کا ایک حصہ گذر چکا ہے۔ گاؤں کے سب چراغ بجھا دیئے گئے ہیں۔ کمرے میں ہر طرف اندھیرا ہے، صرف چاند اور ستاروں کی ماندسی شعاعیں کھڑکی کے رستہ کمرے میں داخل ہو رہی ہیں۔ باقی چہار اطراف قبرستان ایسی خاموشی چھائی ہے۔

جب پردہ اُٹھتا ہے تو کچھ لمحوں کے لئے وقفہ رہتا ہے، پھر کھڑکی میں کھڑی لڑکی اچانک مڑتی ہے اور اُس کے مُنہ سے دہشت ناک چیخ نکل جاتی ہے)

نوجوان :۔ (ایکدم چونکتے ہوئے) کون ——— ؟! یہ کِس کی چیخ تھی ؟!!

لڑکی :۔ (ایک عجیب بے بسی کے عالم میں) میں نہیں جانتی۔

نوجوان :۔ تمہارا چہرہ کیوں اُتر گیا ہے ؟!

لڑکی :۔ مجھے اپنے ماں باپ یاد آ رہے ہیں۔

نوجوان :۔ تمہیں اس کھڑکی کے قریب نہ جانا چاہیئے تھا۔ کیا تم آسمان کو دیکھ رہی تھیں ؟!

لڑکی :۔ ہاں ———

نوجوان :۔ میں نے تمہیں کہا تھا آسمان ابر آلود ہے، تم کچھ نہ دیکھ سکو گی۔

لڑکی :۔ تم نے جھوٹ کہا تھا۔

نوجوان :۔ کیا مطلب ؟!!

لڑکی :۔ مطلع صاف ہے اور میں نے کچھ دیکھ لیا ہے ———

نوجوان :۔ کیا دیکھا تم نے ؟!

لڑکی :۔ میں نہیں کہہ سکتی۔

نوجوان :۔ مگر تم اس قدر آہستہ کیوں بول رہی ہو ؟!

لڑکی :۔ کوئی سن رہا ہے۔

نوجوان :۔ آخر تم اٹھیں کب ؟!

لڑکی :۔ نجانے کب میں تمہاری آغوش سے نکلی ——— لیکن میں نے محسوس کیا جیسے میں آسمان کی اُن لاتعداد آنکھوں کے درمیان جا کھڑی

ہوئی ہوں اور دور، قوسِ نما ماہِ نو زرد بادلوں کے پیچھے چھپ کر مجھے اشاروں سے بلا رہا ہے۔ ہوائیں مدہوش سو رہی ہیں مگر میں انہیں خوابوں میں کبھی کبھار بڑبڑاتے سن لیتی ہوں —— ستارے میرے اس قدر قریب تھے کہ میرا دل چاہا اُن دمکتے جواہرات کے خوشوں کو توڑ کر اپنی جھولی میں ڈال لوں ——

نوجوان:۔ ہاں، تو پھر——

لڑکی:۔ پھر —— جب میں نے انہیں توڑنے کیلئے اپنا ہاتھ بڑھایا تو کوئی گرم سی شے میری انگلیوں سے چھو گئی۔ یہ .... یہ ایک قطرہ تھا، ایک آنسو —— جو کسی ستارے کی آنکھ سے گرا تھا۔ میں نے ٹھنڈی آہ بھری اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا —— پھر معاً ہی میری نگاہیں اُس چاند پر پڑیں —— اُس چاند پر، جو کسی دیو کے میلے سفید دانت کی مانند، کسی یخ بستہ نعش کی مڑی ہوئی اُنگلی کی طرح، مجھے گھور رہا تھا —— وہ ایک دم نیچے اُترا اور میں خوف سے سمٹ گئی۔ وہ مرمریں خنجر کی طرح میری طرف بڑھا اور لمحہ بہ لمحہ میرے نزدیک ہوتا گیا، حتّٰے کہ میرے سینہ میں پیوست ہو گیا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں درد و کرب سے چیخوں، وہ پلٹا —— اور اپنے پیچھے خون کی ایک طویل لکیر چھوڑتا ہوا، اپنی ازلی جگہ پر جا معلق ہوا ——

نوجوان:۔ میرا خیال ہے تم چاند کو لگاتار تکتی رہی ہو ——

لڑکی:۔ تم خود دیکھ کر اپنی تسلی کر لو —— وہاں، اُس صنوبر کے ٹنڈ منڈ درخت سے ذرا اوپر، وہ لٹک رہا ہے۔ کیا تمہیں اس پر میرے خون کے دھبے نظر نہیں آتے؟!!

نوجوان:۔ شاید اسے گہن لگا ہو۔

لڑکی:۔ تم پھر جھوٹ کہہ رہے ہو۔

نوجوان:۔ میرے قریب آؤ، مجھے اپنا ہاتھ دو ——

لڑکی:۔ کاش میں تمہارے ساتھ نہ آتی۔ کاش میں اپنے ماں باپ کو نہ چھوڑتی۔ آخر تم میرے کون ہوتے ہو۔

نوجوان:۔ تم نے ضرور کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ خدارا لیٹ جاؤ، تھوڑا سا آرام کر لو۔ تم بہت تھکی ہوئی معلوم ہوتی ہو۔ میں تمہارے سرہانے بیٹھوں گا۔ اور تمہیں ایک ایسی لڑکی کی داستان سناؤں گا۔ جو کسی شہزادے کے ساتھ بھاگ نکلی تھی۔ اور پھر کبھی واپس نہ آئی تھی ——

راجندر سنگھ بیدی

ماسوا

بغلی کمرے سے ہنسی کی آواز آئی۔

میں بدستور اپنا کام کرتا گیا اگرچہ "جیتی بی بی" بھی برابر ہنستی گئی جیتی کا بیاہ تھا وہ تو ہنستی ہی رہتی تھی۔ . . . ایک عام بات جس پر کوئی مسکرا بھی نہ سکے، وہ امانہ کرے جیتی کے لئے بڑا مزیدار لطیفہ ہوتی تھی ۔۔۔ دیکھیے جی، وہ اوپر چھتری پر لٹکا ہوا ہے یا نہیں، اور یہ چھتری نہیں آدمی ہے —— ہائی! اور جیتی کو ہم پڑھے لکھوں کے سلجھے ہوئے "مزاج نے" خراب نہیں کیا تھا۔

جیتی بی بی کے ہنسنے کی آواز میرے لئے غیر متعلق شور ہو کر رہ گئی تھی متعلق اور غیر متعلق شور میں کیا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً میں ایک دوست کے نام خط لکھ رہا ہوں جس میں مجھے ایک بدگمانی کو دور کرنا ہے نہیں تھا اور رد دیجئے، شاید اس سے میرا مفہوم واضح نہ ہو سکے۔ فرض کیجئے میں ایک نظم لکھ رہا ہوں۔ چاند تاروں کے متعلق ایک نظم، جو ہمارے شاعر اکثر لکھا کرتے ہیں اور جس میں دھندلے، اجنبی، ان گنت، مبہم، بے نام خلا وغیرہ کے سوا کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ لیکن پڑوس کے سردار [illegible] "سونہ" والے کیرتن سوہلا پڑھنا شروع کر دیتے ہیں —— گگن میں تھال روی چند دیپک بنے، تارکا منڈلا جنک موتی، تو اگلے ہی لمحے سارا آسمان ایک وسیع و عریض تھال کی صورت میں سامنے آ جاتا ہے۔ جس میں چاند اور سورج دیئے بن جاتے ہیں اور تارے ان گنت موتیوں کی طرح تھال میں پڑے نظر آنے لگتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ایسے ہی وسیع و عریض پیمانے پر بھگوان کی آرتی اتر رہی ہے اور پون کا نیم چنور دھوپ کلیاں کی صورت میں ہل رہا ہے . . . اب اتنی حسین منظر کشی کے بعد چاند تاروں کے متعلق کوئی کیا لکھے گا؟ برخلاف اس کے سامنے کے سروس اسٹیشن سے دن رات کاریں دھونے کا شور سنائی دیتا ہے اور مستری بجلی کے فوارے کے ساتھ فحش کلامی بھی کرتا ہے۔ لیکن میں لکھ سکتا ہوں۔ پڑھ سکتا ہوں، سوچ سکتا ہوں۔ بلکہ ایسا شور مجھے زندگی کا قرب، ایک قسم کے تحفظ کا احساس اور ۔۔۔ نظم اس کے سوا دیتا ہے۔ یوں غیر متعلق شور میرے لئے ممد و معاون ثابت ہو جاتا ہے۔۔

لیکن آہستہ آہستہ جیتی کا شور متعلق ہو رہا تھا —— دکھن کا دیا کھاتی ہوں —— ان کا نہ اور پھر ایک بڑھے کی نامانوس آواز آئی، ہمارے گھر میں یہ دوسرا بوڑھا کون ہو گیا تھا۔ یہ جیتی کے والد کی آواز تھی۔ وہ ہمارے ملیوں بازار میں آئے تھے۔ لیکن گاہے ماہے، اور وہ بھی قدامت پسند ہونے کی وجہ سے اپنی بیٹی کے گھر کا کچھ نہ کھاتے۔ اگر کہیں زبردستی کوئی سنگترے کی پھانک منہ میں ڈال دے تو پورے سنگترے کی قیمت رکھ دیتے اور ہمیں یوں معلوم ہوتا جیسے اچھی خاصی تجارت ہو گئی ہے اور پھر جب وہ اپنے گن آنند کو ڈانٹتے ہوئے اور بچوں کو آیا کی گود میں دیکھتے تو ان کی آنکھوں میں پانی آ جاتا اور وہ پیار کا کوئی شبد کہے بغیر چل دیتے۔ آخر اس کی ضرورت ہی کیا تھی جب اپنا آپ بچوں کی صورت میں سکھی ہو جاتا ہے تو پھر موت پر کیوں نہ کوئی شادیانے بجاتے . . . لیکن وہ بڈھا کوئی اور تھا۔ ورنہ بابوجی، میرے سسر ایسے بلغمی مزاج کے نہ تھے اور نہ یوں ہنستے تھے جیسے کوئی آواز نکل کر ایک تھیلے میں گم ہو جاتی ہے پھر جیتی کی آواز آئی —— ان کا دیا کھاتی ہوا، بڑا بیٹے مجھے پتہ ہی تھا —— چھپو اور بتاؤ۔ . . . اور ہنسی . . . .

میں اپنے کام کو ٹالتے ہوئے بغلی کمرے کی طرف چل دیا۔ کمرے تک جانے کی نوبت بھی نہ آئی دونوں کمروں کے درمیان غسلخانے کے سامنے جنگلا ہوا ایک چھوٹا سا برامدہ تھا جو زمین سے دو تین فٹ اونچا تھا۔ اس کی سیڑھیوں پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا تھا اور اس کے سامنے لوہے کی ایک کرسی پر (جس پر مشکل سے کوئی بچہ بیٹھ سکے) جیتی بیٹھی اپنا ہاتھ اس بوڑھے کو دکھا رہی تھی۔ بوڑھے کا رنگ سرخ

تھا اور اس کے سر پہ بے احتیاطی سے بندھی ہوئی گیروی پگڑی سے مطابقت رکھتا تھا۔ اس کی داڑھی مونچھیں سفید ہونا چاہئے تھیں، لیکن کثیف سے تیل کے استعمال نے انہیں میلا بنا دیا تھا۔ . . . "بٹیا منحوست تمہارا ہاتھ جل جاتا ہے" — وہ کہہ رہا تھا اور ایک حقیر سے وقفے کے بعد سر کو جھٹکا دیتا تاکہ پگڑی پیچھے نہ گر جائے۔ سر سے پاؤں تک جوگی ہونے کے باوجود اُس کی شکل سادھوؤں اور سپیروں سے یکسر علیحدہ تھی اُس میں کوئی ایسی بے نیازی نہ تھی اور نہ ہی تکرار طلب۔ دودھ دھاری ہونے کے باعث دودھ ہی پر گزارہ کر لیتا تھا۔ وہ خوش تھا — خوش کل کائنات کا باپ بن کر، جیتی کا ہاتھ تھامے ہوئے۔

"یہ مارس کا گرڈل ہے۔" وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہہ رہا تھا "یہ ریکھا جو ادھر جاتی ہے۔ اس کا مطلب ہے تم ٹریول بھی کرو گی۔"

"کدھر جاؤں گی؟" جیتی پوچھ رہی تھی اور وہ کہہ رہا تھا "سمندر کا سفر نہیں، یوں کچھ جاترا معلوم ہوتی ہے۔"

میں نے کہا — "جیتی، تم اتنا شور مچا رہی ہو کہ میں . . . . "

ابھی میں نے فقرہ بھی مکمل نہیں کیا تھا کہ جیتی منہ پھلا کر، رو ٹھ چکی تھی . . . "تمہیں تو میں ہڈیوں کے بولنے کی آواز بھی روک دے گی۔ اس وقت تک وہ بوڑھا رمال اور پامسٹ میری اُنگلی پکڑ کر مارس کے گرڈل پر رکھ چکا تھا۔

مانتا ہوں، ہمارے سماج میں خاوند کا کھوج فوراً چل جاتا ہے لیکن جس آسانی سے وہ بڈھا مجھے جیتی کا شوہر سمجھ گیا تھا۔ یہ بات میرے لئے کافی حیران کن تھی اور پھر وہ یوں باتیں کرنے لگا گویا مجھے برسوں سے جانتا ہے وہ فوراً میرے ساتھ ایک رشتے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس بات کو جانے بغیر کہ میرے باوا کے باوا کا باوا . . . . اس کا بھی باوا تھا۔ یہاں کچھ عقل گم ہو جاتی ہے۔ ورنہ مجھے یہ کیوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی بھی عورت میری بیوی ہوتی تو اُس کی وضع قطع جیتی ایسی ہوتی۔ دس برس ہوئے مجھے باوجی کا داماد بنے ہوئے۔ لیکن جب سے باوجی پیدا ہوئے میں ان کا داماد تھا

تو مارس کے گرڈل کا مطلب تھا کہ کام کرو گے اور کھاؤ گے۔ میں نے کہا "اگر یہ گرڈل جیتی کے ہاتھ میں ہے تو اُس نے دو تین نوکر رکھے ہوئے ہیں۔ جن پر حکومت کرتی ہے اور خود پلنگ پر بیٹھ کر موزے بنتی ہے۔ اپنے خاندان کے لوگوں کے موزے ختم ہو جاتے ہیں تو اڑوس پڑوس کے شروع کر دیتی ہے۔" جیتی بول اُٹھی "نوکر تو نام ہی کے ہیں نا۔ سارا دن ان سے مغز کھپائی ہوتی ہے۔ کوئی کام اپنے آپ بھی کرتے ہیں؟" — تو یہ تھی گرڈل کی تشریح اور پھر موزے! . . . اگر اس کے ہاتھ کی ریکھا ہاتھ کے ساتھ پڑھی جائے تب کہیں وضاحت ہوتی تھی۔

لیکن جیتی خوش تھی — خوش! اُس بڈھے کی طرح۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے اتنا ہی قریب تھے۔ جتنا میں ان سے پرے تھا۔ میں ہر روز آسمان سے زمین پر آتا تھا۔ یہ لوگ تھوڑا بہت بھی آسمان کی طرف جاتے تو بیحد خوش ہوتے۔ لیکن میرا آسمان بتدریج اُونچا ہو رہا تھا۔ جیتی کے لئے یہ بات پریشان کُن نہ تھی کہ وہ میری قسمت کا کھا رہی ہے۔ عورت اور کمائی کچھ طوالتفوں ایسی بات معلوم ہوتی تھی۔ باوجود اس بات کے کہ میرے غلاموں کا حلقہ وسیع ہوتا تھا۔ مجھے یہ بات اچھی نہ لگی۔ لیکن یوں اچھا نہ لگنے میں جو اچھا لگتا ہے۔ اس نخوت کا کوئی کیا کرے"؟

نو بڈھے نے جتنی باتیں بتائیں وہ ایسی تھیں کہ ہم ان پر یقین کرنا پسند کرتے تھے۔ کہیں تھوڑا بہت ردّ و بدل ہوتا تھا لیکن وہ ہمیں پریشان کرنے کے لئے کافی نہ تھا۔ مثلاً یہ کہ سوموار کے دن جو ہم کالی گائے لائے ہیں۔ یہ پھلے گی نہیں۔ شاید اسی لئے بچھڑا مر گیا تھا اور شوالکو اپنے کیوبہ سے لگنے کا ایک تھن ہمیشہ کیلئے بند ہو گیا تھا لیکن ایسی بات کو صرف ایک اتفاق کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے اور انسان فضا کہہ سکتا ہے۔ اس کا قسمت سے کوئی سمبندھ نہیں۔ البتہ دوسری بات جو تشویشناک ہو سکتی تھی۔ وہ یہ تھی کہ یوگ بڑا ہو کر ہمیں تنگ کرے گا۔ سو ابھی آٹھ دس سال پڑے تھے۔ یوگ کے بڑا ہونے میں۔

برخلاف اس کے ہمارے حق میں کتنی باتیں تھیں۔ قسمت کی لکیر اور دماغ کی ریکھا کو کاٹتی ہوئی شہادت کی اُنگلی کی طرف جھکتی تھی۔ وہاں زحل کی ایک پہاڑی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ زندگی بھر ہمیں معاش کی فکر نہ ہوگی اور آخری عمر میں راج دربار میں "ڈرامان" پائیں گے۔ یہ بات بھی مجھے اچھی نہ لگی، خیر . . . دروازے پر ہلکی سی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ باوجی کی چھڑی کی آواز تھی۔ انہی کا انداز تھا کہ دروازے کے شیشوں پر چھڑی سے ہلکی ہلکی ضربیں لگاتے اور کسی کا نام پکارنے کی

بہاتے ایک سیکھتی ہوئی آواز میں ہری اوم... وہ... وہ... ہم کہتے

آج باوجی نے پگڑی بھی ایسی باندھ رکھی تھی جیسے پرشوک لگے تھے۔ اپنی پگڑیاں ہردوار میں ملتی تھیں اور ان کے ایک پتو میں بیٹھے بیٹھے بنے ہوئے چاول پرشاد کے طور پر ملتے تھے۔ آج چھڑی بھی مختلف تھی۔ یہ کھین لکڑی کی بنی ہوئی تھی جس پر پھوڑے ہی پھوڑے نظر آتے تھے۔ یہ چھڑی گھر میں سے سانپ بھگانے کا لاجواب نسخہ تھی۔ جیتی اپنے پوجا پاٹھ کی طرف متوجہ ہوئی اور بڈھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کہا: وہ پیسے نہیں لے گا۔ البتہ اخبار والے اور کوئلے والے کی طرح مقررہ تاریخ پر بل چکانے آئے گا لیکن میں کچھ نقدی اس کی مٹھی میں تھما چکا تھا۔

"یہ میں نہیں لوں گا بیٹا!" اس نے کہا

"کیوں بابا، کیوں نہیں لوگے؟"

بڈھے نے اپنی رمل اور وہ کتاب جس پر ہندی کے بے شمار زائچے بنے ہوئے تھے۔ اٹھائی۔ اسے جھاڑا، پونچھا، آنکھوں اور سر سے لگایا اور اپنی جھولی میں رکھ لیا۔ اس وقت تک اس کے چہرے سے خوشی زائل ہو چکی تھی اور اداسی کے تاثرات نظر آنے لگے تھے۔ وہ بوڑھا ان لوگوں میں سے تھا جو خوشی کے وقت خوش اور غمی کے وقت غمگین ہوتے ہیں ایک دن میں دس بار ہنستے اور پانچ چھ بار رو بھی دیتے ہیں اور ایک ہی تاثر کو اپنے چہرے پر مستقل نہیں ہونے دیتے۔ بڈھے نے کہا "بیٹا! میں پیسے نہیں لوں گا، جو خبر میں تمہیں سنانا چاہتا ہوں وہ اچھی نہیں ہے ــــ ہاتھ دکھاؤ۔"

جیتی کے والد اس اثنا میں بڑے اطمینان کے ساتھ کشمیری آسن پر براجمان ہو چکے تھے۔ جیتی انہیں بابا کی باتیں سنا کر ہنس رہی تھی۔ بوڑھے نے مفاہمت کے انداز سے اس کی طرف دیکھا اور ایک قہقہہ کہیں ہتھیلی میں گم ہو کر رہ گیا۔ پھر بوڑھے نے سنجیدہ سا منہ بناتے ہوئے کہا: "بیٹا! برا تو نہیں مانو گے، اداس تو نہیں ہو گے؟" میں نے کہا "بابا، جتنا میں اداس نظر آتا ہوں، اس سے زیادہ اور کیا ہوں گا؟" ... "نہیں نہیں" بڈھا جیسا... قریب باوجی لوگ کی باتیں سن کر آسن سے لاڈ کر رہے تھے... باہر جو دروازہ اندرونی صحن میں کھلتا تھا، جوبلیاں والے سردار کی آواز اس میں سے ہو کر آ رہی تھی۔ وہ گا رہے تھے ـــ لال رنگ تس کو لگا ـــ لال رنگ اسے لگتا ہے جو بہت خوش نصیب ہوتا ہے۔ یہ دوسرے مصرع کا موضوع تھا۔ لیکن بڈھے نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "یہ بھنتی کیسی تو مورت بس چپکے سے چل دے گی۔"

میں نے گھبرا کر کہا۔ "کیا؟"

بڈھے نے نقدی میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا "جیتی بہت دیر جیتی نہ رہے گی اور..."

"اور؟"

"اور تمہاری دوسری شادی ہو گی!"

یوں تو میں ہر اس بات کو مان لیتا ہوں جس کے لئے میں نے دام دیئے ہوں۔ لیکن سب سے زیادہ اس بات کا قائل ہوتا ہوں جس کے لئے کوئی دام قبول نہ کرے۔ کوئی آدمی چیز دے اور چل دے تو یہ چل دینا ہمیں کتنا مرتبیانہ معلوم ہوتا ہے ـــ جوبلیاں والے کی آواز نے مجھے جھنجھلا دیا تھا۔ بوڑھے کی بتائی ہوئی خبر "لال رنگ" نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن میں اپنے کام کو چھوڑ کر سروس سٹیشن کے سامنے بوڑھے کو جاتے دیکھتا رہا۔ اس کی بغلوں اور اس کی چھاتی پر خاصی چربی جمنے کے باعث بوڑھے کے بازو بھینگی کے انداز میں چل رہے تھے۔ وہ کھڑا رہتا تو میں کچھ بھی محسوس نہ کرتا۔ لیکن اس نے بات کہی اور چل دیا ..... وہ سرخ اور سفید، بھاری بھر کم آدمی اس قدر زندہ تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے موت کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ لیکن اب اس کی چھوڑی ہوئی خالی جگہ شمشان کی طرح بھائیں بھائیں کر رہی تھی -- وہ چلا گیا اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس کے بوجھ سے دبی ہوئی سیمنٹ کی سیڑھیاں آہستہ آہستہ اپنی سطح پر آ رہی ہیں۔ کوئی تیز لانچ پانی سے گزر جائے تو پانی میں ایک گھاؤ سا پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح مجھے اس بوڑھے کے پیچھے ایک گھاؤ سا نظر آ رہا تھا اور ارد گرد کی فضا اس گھاؤ کو پاٹنے کے لئے چاروں طرف سے امنڈتی دکھائی دیتی تھی

آج سروس سٹیشن خاموش تھا۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے سروس سٹیشن کا مالک جمعہ کے دن دکان بند رکھتا تھا۔ سو آج وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ چند آوارہ کتے ایک مریل سے کتے کو دھکیلتے ہوئے کاروں کے پلیٹ فارم کے نیچے خالی جگہ میں گھس گئے تھے اور اسی دم چلے بھی گئے

گویا وہاں فقط اس سروس الیکشن کی عمارت کھڑی تھی جس کے پیچھے سیو بیر کا اکیلا درخت، پچھلے روز کی بارش میں دُھلا ہوا، اپنی سرسبزی سے آنکھوں میں کھبا ہوا تھا۔ بائیں طرف جنگلے کے پیچھے ہوا بھرنے والی موٹر نظر آ رہی تھی اور اس پہ یعنی ہوا کے حروف انگریزی میں اتنے موٹے لکھے ہوئے تھے کہ ان کے لکھے ہونے میں خواہ مخواہ شک پیدا ہوتا تھا . . .

بوڑھے نے بات کہی اور چل دیا . . . . وہ ابھی تک بازار میں اس جگہ پہنچا تھا جہاں نگر پرزہ اور نان کے شاگرد مل کر گڈیاں بنا رہے تھے۔ بوڑھا دم بھر کے لئے سامنے کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ لیکن اسی دم پھر سامنے آ گیا۔ ابھی وہ یکے سے بچنے کے لئے گلی کی پناہ میں گیا ہی تھا کہ دو نیچے اڑتے ہوئے بوڑھے سے بھڑ گئے۔ بوڑھے کی پگڑی پیچھے کی طرف سرک گئی۔ جسے اس نے ٹھیک کیا اور بچوں کو جھکا کر آگے چل دیا ـــــــ آخر اسے نظروں سے اوجھل ہونا تھا سو وہ ہو گیا۔

رسوئی سے پلیٹ کے گرنے کی آواز آئی۔ شاید آیا کے ہاتھ سے گری تھی۔ چونکہ اسے اکثر بے احتیاطی کے باعث ڈانٹ پڑتی۔ اسلئے اس کے لئے اس کے ہاتھ کانپتے رہتے تھے۔ نوکروں کے کوارٹر میں جو تیل کا لمپ جلایا جاتا تھا۔ اس کی چمنی وہ تین چار بار پھوڑ چکی تھی۔ لیکن یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے جیتی نے پھر اب کے اس کا پلیٹ توڑنے کا قصور معاف کر دیا ہے، کاش پہلی بار جب اس سے چمنی ٹوٹی تھی۔ اس وقت کوئی اس کے گناہ کو معاف کر دیتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی . . . . بھری ادم کی آواز کے ساتھ بابوجی کے پیٹ سے ایک خاص قسم کی آواز نکلی جو پیٹ کے یکسر خالی ہونے پہ پیدا ہوتی ہے یا بہت کھا لینے کے بعد سننے میں آتی ہے۔ ساتھ ہی پتہ چلا کہ مجھے پکارا جا رہا ہے

میں نے کہا "جی، آپ مجھے بُلا رہے ہیں؟"

"ہاں بھاگیرتھ، بات سُنیو" ـــــ جیسے میرے اپنے اندر سے آواز آئی "جیتی کو کہو ورزش کیا کرے۔"

"ورزش کیا کرے؟ وہ تو پہلے ہی گھر کے کام کاج تلے دبی ہوئی ہے۔"

"گھر کا کام کاج تو نوکر کریں۔"

"لیکن بابوجی ـــــ نوکر بھی بھلا اپنے آپ کام کرتے ہیں۔ جب تک بیوی خود ہاتھ پاؤں نہ ہلائے، کون جان مارتا ہے۔ جو یہ سب پنکھے جھلکو رہے، زینے سے دھرے ہوئے ہیں، نوکروں نے دھرے ہیں؟ ننگا سرنگ کر صوفے کی پُشت میلی ہو جائے، کیا مجال جو نوکر کہیں۔ اس پہ کپڑا ڈال دیں یا اسے پکڑ کر دھو ڈالیں"

"تو یہ دھونے دھلانے کا کام کون کرتا ہے؟"

"جیتی"

"یہ تو اچھی بات ہے، بیٹیا، اصل ورزش تو یہی ہے۔ نا کہ بنا مطلب ماپتے پھرنا شہر کی گلیاں سیر کے بہانے!"

"عورت کے لئے سب سے اچھی ورزش گھر کا کام کاج ہے۔ جس سے اس کا شریر گٹھا رہتا ہے اور وہ بیمار نہیں ہوتی۔ کپڑے دھونے سے بازوؤں اور چھاتی میں طاقت آتی ہے۔ کام نہ کیا تو موٹی ہو جائیگی۔"

جیتی کو پتہ چلا تو وہ بدستور ہنستی ہوئی باہر آئی ـــــ "بابوجی آپ بھی حد ہیں۔ آپ کو چاہئے۔ میری طرف داری کریں۔ آپ اُلٹا مجھے کام کرنے کے لئے کہتے ہیں تو میں کام نہیں کرتی؟ سارا دن سینا، پرونا کتر بیونت کے علاوہ کپڑے دھونا، حتےٰ کہ برتن بھی مجھے ہی مانجھنا پڑتے ہیں۔ گون آنند کی تو یہ کوشش ہوتی ہے، اونہ ابی بی آنکھ ادھر کرے اور وہ جھٹ سے سارے جھوٹے برتن گرم پانی میں ڈال دے۔ مانجے نہیں اور جھاڑ پونچھ کر برتونی پر لگا دے۔"

"تو خود کام کرتی ہے، یہ سُن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی" ـــــ بابوجی کہہ رہے تھے۔ لیکن ایک بات سے انہیں بھی اتفاق تھا کہ جیتی کو برتن نہیں صاف کرنے چاہئیں۔ وہ بہو بیٹی سے سر دبوانے، جوتا اٹھوانے چلم بھروانے اور ایسے نیچ کام کروانے کے خلاف تھے۔ نہ اپنا نیچے کا کپڑا کسی بہو بیٹی کو دیتے نہ ان کا اپنے بدن سے چھو لینے دیتے۔ کہنے لگے۔ "ضروری ضروری کپڑے آپ دھونے چاہئیں اور جو بہت ہو جائیں تو ایک کی جگہ دو دھوبی لگائے جائیں۔ ایک کو دوسرے کے اوپر لگا جائے تو یہ لوگ آپس میں لڑتے ہیں اور مالک سکھی ہو جاتا ہے ـــــ

خوب اُبھری تھی!

جینتی نے اُنگلیوں سے بوک کی مانگ بناتے ہوئے کہا: "وہ دیکھا، وہاں آیا تھا۔ کہہ، اچھا۔ ہاتھ میں لکھا ہے۔ کام کروں گی تو کھاؤں گی۔"

"نہ کروں گی تو کیا؟ اگر تم نہیں کیا کچھ چلے گا؟" باؤجی نے میری وکالت کی جیسے کچھ دیر روشنی کی طرف دیکھتے رہنے سے ہر چیز پر ایک لال نیلا اور کالا سا دھبّہ نظر آتا ہے اور نگاہ کے ساتھ ساتھ حرکت کرتا ہے۔ آہستہ اس بوڑھے کی روشن باتوں نے یوگی، جینتی اور باؤجی کے چہرے کو ایک منحوس رنگ دھبّے کے پیچھے چھپا دیا تھا۔ کبھی کبھی جینتی کی شکل صاف نظر آتی۔ وہ کتنی بھولی دکھائی دیتی تھی —— اچھی بیٹی، اچھی بیوی، اچھی ماں —— وہ ہنستی رہتی تھی۔ میں نے اس کی ہنسی کو چھلنے کی بہت کوشش کی۔ ہر اس کی مسکراہٹوں کا جواب میں نے تبسّم سے دیا اور ہنسی کا جواب خفگی سے لیکن وہ ہنستی رہی۔ کیا موت اس ہنسی کو کچل دے گی؟ . . . . وہ بوڑھا سال میرے دل کے تالاب میں ایک وزنی پتھر پھینک کر چلا گیا تھا اور مجھے معلوم ہوتا تھا جیسے کثرت سے لاتعداد میرے دل کے کنارے —— دل کے اندر گر رہے ہیں۔

"گن آنند —— ارے او گن آنند" میں نے اپنے آپ سے بچنے کے لئے آواز دی

"جی ہو!"

گن آنند ایسے ہی بولا کرتا تھا —— "جی ہو" میں نے کہا: "جی ہو کے بچّے، باؤجی کے لئے حقّہ ڈال دے۔" جواب میں پھر "جی ہو" کی آواز آئی۔ اس اثنا میں باؤجی اپنی جیب سے تمباکو نکال چکے تھے اور میری طرف بڑھا رہے تھے۔ پڑوسیوں کا موزہ، جینتی کی سلائیوں پر لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ جب وہ تیسری سلائی ڈالتی اور دایاں اور بایاں ہاتھ اکٹھا جھٹکتی تو ساتھ ہی اس کے پتلے، نمدار ہونٹ سمٹ جاتے۔ میری نگاہ بوسے کے قریب سے کہیں ایک کرن اس کے ہونٹوں پر پہنچ کر کھیل جاتی —— اُس وقت وہ باؤجی کی طرف اشارہ کرتی اور میں جھینپ جاتا۔ پہلے میں جینتی بیٹی کو دیکھ رہا تھا۔ پھر جینتی ماں کو دیکھنے لگا —— اب میرے سامنے جینتی تھی —— عورت! . . . . میری نگاہیں اُس کے خوبصورت جسم اس کے مثبت کی پیمائش کرتی ہوئی کولھوں پر آ رکیں۔ درزی نے بانات میں سے دو دو ریشے کھینچ کر کاٹے قریب قمیص کو کس دیا تھا اور جینتی کے اوپر اور نیچے کے جسم کی حد بڑی صفائی سے باندھ دی تھی۔ درمیان کا جسم کپڑے کے نیچے یوں معلوم ہوتا تھا گویا ایک بھوری سی جلی آگ کے پاس سے اٹھ رہی ہے اور کمر کی . . . . جینتی کے جسم سے اوپر اُٹھا کر کمڑی اکڑی رہتی ہے . . . . اور اس کے بعد یوں نظر آنے لگا جیسے بہت بڑے پیندے والی ستار پڑی ہے۔ شاید ستار کو عورت کے جسم کی مناسبت سے بنایا گیا ہے . . . .

اس وقت تک گن آنند باؤجی کے لئے حقّہ ڈال چکا تھا بلکہ باؤجی بھی تمباکو چلم میں پھینک چکے تھے۔ جینتی میری نگاہوں کی تاب نہ لا کر شرما چکی تھی۔ بیٹی اور ماں کی صورت میں جو وقار جینتی کے چہرے پر ہوتا ہے ویسا ہی وقار عورت ہونے پر بھی قائم رہتا۔ بلکہ وہ کبھی یوں سر اُٹھاتی جیسے کہہ رہی ہو —— "میں ہوں!" لیکن میں اپنی نگاہوں کی فحاشی سے اکثر اُسے اُس کے مفعول ہونے کا یقین دلا دیتا۔ اُس وقت وہ نہایت بے بس ہوتی اور میں اوچھے ہتھیاروں کی مدد سے وہ شخصی لڑائی جیت لیتا۔ وہ قاعدے کی لڑائی میں عورت سے کون کبھی جیتا ہے؟

میں اپنے کمرے میں چلا گیا اور نئے سرے سے اپنے دوست کی بدگمانی دُور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اس کے نام ایک بے سر ا پا لمبا چوڑا خط لکھا۔ کیونکہ میں اُس کی دوستی کی قدر کرتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ محض اس بات پر مجھ سے ناراض ہو جائے کہ میں نے ایک معمولی سی پارٹی میں اس کا تعارف عورتوں سے نہیں کروایا۔ میں جانتا ہوں وہ اس محفل میں محض چائے پینے کی غرض سے نہیں بلایا گیا تھا اور مجھے عورتوں کے علاوہ اُس شام کے دھیان کے ساتھ بھی اُسے ملانا چاہئے تھا لیکن قصّہ یہ تھا کہ میں تو مہمانوں کے سواگت میں لگا ہوا تھا اور یہ تعارف کا کام کسی دوسرے کے سپرد تھا یا شاید میں نے اپنے دوست کو بہت اپنا بھی سمجھ لیا تھا اور اس لئے بنا جانے بوجھے مجھ سے یہ غلطی ہوئی . . .

لیکن میں بہت دیر تک اس خط کے متعلق سوچ بھی نہ سکا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی اور دائیں طرف کے مکان میں اوپر کے فلیٹ پر روشنی اور سائے آپس میں گھل مل گئے تھے۔ کمروں میں ابھی بتیاں نہیں جلی تھیں فقط کچھ دوپٹے اِدھر اُدھر حرکت کرتے نظر آ رہے تھے۔ سامنے سڑک پر

پاہر کے سے بتی جلی اور پھر بجھ گئی۔ معلوم ہوتا تھا۔ بجلی کمپنی والوں نے آزمائشی طور پر ان قمقموں کو روشن کیا ہے۔ میں بجلی کے متعلق سوچنے لگا۔ نہیں مجھے دوسری شادی کسی قیمت پر منظور نہ تھی۔

میں نے قلم کو میز پر رکھا اور آنکھیں میرا ۔۔۔ اکڑوں بیٹھ کر دونوں گھٹنوں کو اپنے ہی بازوؤں میں بھینچ لیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بنگالی کمپنی سے آ تنخواہ لینے کے لئے بیٹھا ہوا ہے۔ میری ٹھوڑی بڑے آرام سے گھٹنوں پر ٹکی ہوئی تھی۔ یہ بات نہیں کہ اس ٹھوڑی کو اٹھانے پھرنا مجھے بوجھل معلوم ہو رہا تھا۔ بلکہ یہ اس لئے تھا کہ اس طور بیٹھنے سے میں مانیہا سے بہتر سوچ سکتا تھا۔ اپنا بچہ میں دنیا جہان کی باتیں سوچنے لگا۔ اس دنیا جہان کی باتیں جن سے جینی متعلق تھی۔

شادی کے بعد پانچ چھ سال تو ہم نے ایک دوسرے کو سمجھنے میں لگا دیئے ..... میری ماں مر چکی تھی۔ اس لئے مجھ میں خواہ مخواہ یہ احساس پیدا ہو گیا کہ جینی میرے یتیم بہن بھائیوں کو اپنی طرح نہ رکھے گی۔ مجھے وہ شدید اختلاف کا دن یاد ہے جب جینی نے میرے چھوٹے بھائیوں کی نسبت مجھے اچھا کھانا دیا۔ میری ہدایات کے مطابق اور پیٹ بھر کے کھانے میں بہت بار جھینک دیتے جہاں بھی کبھی اس قدر شدید اختلاف ہوتا تھا جینی و سب بیا کرتی تھی حالانکہ مجھے نہیں جا ننے تھے۔ میرا تجربہ ہے کہ جب کوئی عورت بہت "پتی پرتا" ہو جاتی ہے اور شادی کے بعد ... اپنے خلاف کوئی شکایت نہ کرے تو شوہر مزید بیہودہ باتیں کرتا ہے ... بات کو بیہودہ نہیں سمجھتا۔ اچھا یا برا دونوں اضافی چیزیں ہی تو ہیں۔ برخلاف اس کے جب عورت شور مچاتی ہے اور محلے والوں کو اکٹھا کر لیتی ہے اور نام نہاد شرافت سے سہمی نہیں رہتی تو مرد زیادہ سے زیادہ ایک دو بار ایسا شور بپا ہوتے دیکھتا ہے۔ اس کے بعد وہ راہ راست پر آجاتا ہے۔ ہر انسان میں جھگڑے سے بچنے کی قدرتی خواہش ہوتی ہے۔ اس امتحان کے باوجود اگر کوئی مرد نہ لوٹا تب تو پھر اس کا کوئی علاج نہیں سوائے اس کے کہ عورت خود ... ہو جائیں ... اس دن بھی محلے کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ عورتوں اور مردوں نے مل کر مجھے شرمسار کیا ۔۔۔ اور میں خود بھی شرمسار ہو کے ... ہاتھ لایا

"بات یہ ہے یہ تو تمہاری عورتوں کو خراب کرتی ہیں۔" وہ کہنے لگیں۔ "جینی نے اگر تمہیں اچھا کھانا دیا ہے تو بہت اچھا کیا ہے یہ تو ایک اچھی عورت کی صفات میں سے ہے۔" جینی کہہ رہی تھی: "گھر بھر میں مرد ہمیشہ سب سے اچھا کھانا اور سب سے اچھا پہنتا ہے۔ اس کے بعد کسی کی باری آتی ہے۔ میں اپنے بچے کو وہ کھانا نہیں دیتی جو آپ کو دیتی ہوں ۔۔۔ ہاں اگر میرے اپنے بچے اور تمہارے بہن بھائیوں کے کھانے میں فرق ہو تو مجھے چوٹی سے پکڑ لو . . ."

اس وقت جب میں یہ باتیں سوچ رہا تھا تو بیل جھمڑی کے زمین پر پڑنے کی آوازیں آئیں معلوم ہوتا بابو جی اپنے ہاں جا رہے تھے اور ان کی سکھ پرز ایک باقاعدہ وقفے کے ساتھ زمین پر پڑ رہی تھی جاتے جاتے بھی ہری ادم کی آواز کانوں میں پڑی۔ اس وقت وہ اکیلے نہیں جا رہے تھے بلکہ پوگ کو بھی اس کے ننھیال لے جا رہے تھے۔ کمرے کا پٹ آہستہ سے کھلا اور آواز آئی ۔۔۔ "بھاگیہ بتی بیٹا! میں جا رہا ہوں۔"

میں نے وہیں سے آواز کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا . . . "پھر کب آؤ گے، بابو جی؟"

"اب جینی کو کہو نا دو تین مہینے ہمارے ہاں چلی آئے۔"

"اب بھی تو آپ ہی کے ہاں ہے۔"

"نہیں، میرا مطلب ہے" ... بابو جی کہہ رہے تھے ۔۔۔ "میں اس سال وشنو دیوی جا رہا ہوں۔ جینی بھی میرے ساتھ چلی جائے۔"

"اچھا، بابو جی ۔۔۔۔ ابھی راستہ کھلنے میں دیر ہے، سوچ لیں گے ۔۔۔ پرنام!"

پوگ نے دروازے سے منہ نکال کر مجھے لکڑی کا انجن دکھایا۔ یہ غالباً بابو جی لائے تھے۔ انجن دکھاتے ہی وہ اونچی آواز میں ہنس کر نانا کے ساتھ ہو لیا۔ میں کرسی میں ذرا سا ہلا تو اسے خیال آیا کہ میں ننھیال نہیں جانے دوں گا۔ اس لئے وہ فوراً بھاگ گیا ۔۔۔

جینی ایک خداداد ذہن کی مالک تھی۔ وہ معمولی سی ہندی جانتی تھی اور بس۔ اسے کسی طور بھی پڑھے لکھے ہونا نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے باوجود جب کبھی اسے انگریزی فلم دیکھنے کے لئے لے جاتا تو وہ ... سمجھ جاتی۔ جزوی تفاصیل اور گفتگو کے متعلق وہ لغزش ... کی ہو سکے لیکن چیز کا مفہوم اور کہانی کے مرکزی خیال پر پہنچنے ... کبھی دیر نہ لگتی۔ بلکہ جب کبھی ... مخالفت کے ... وہ ...

اور اس سے پوچھتا —— اب کیا ہو؟ تو وہ چند ہی لفظوں میں سلسلہ تمام کر دیتی ۔۔۔۔ لیکن ان خوبیوں کے باوجود جینتی میں چند شدید نقائص تھے مثلاً یہ کہ وہ کسی کی بات پوری نہ سنتی تھی۔ درمیان ہی میں بول اٹھتی۔ دوسرے یہ کہ وہ جھوٹ کو بالکل برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ فوراً دروغ باف کے منہ پر کہہ دیتی کہ یہ جھوٹ ہے۔ حالانکہ یہ اخلاق کے منافی ہے —— جھوٹ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ اس لئے رشتے دار اس سے نالاں رہتے تھے۔ وہ لاگ لپیٹ کے ساتھ بات کرتے تھے لیکن جینتی انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی ——

میری عادت ہے میں حالات کا مقابلہ کرنے سے جی چراتا ہوں۔ اگر مجھے اپنے کرایہ دار سے کرایہ مانگنا پڑے تو میں اس سے نہیں مانگوں گا۔ تاوقتیکہ وہ مجھے خود نہ دے دے یا کوئی ایسی بات کرنے سے احتراز کروں گا جس سے میرے دل کا امن و امان تباہ ہو جائے۔ لیکن ایسے میں جینتی عین مقام پر پہنچ کر دو ٹوک فیصلہ کر دیتی ہے۔ جہاں میں امن و امان کے متعلق سوچتے رہنے سے اپنے دل کا سکون کھو بیٹھتا ہوں۔ وہاں وہ ذرا جھگڑا کر ایک مستقل قسم کے سکون کی بنیاد رکھ دیتی ہے۔ جینتی میرا مرد ہے اور میں اس کی عورت ہوں! ۔۔۔ اور میں کیسے برداشت کر سکوں گا۔ یہ عورت مر جائے اور میں دوسری شادی کر لوں

سردار فتح سنگھ حویلیاں والے دروازے میں نمودار ہوئے اور میرے خیالات کا سلسلہ تھوڑی دیر کے لئے منقطع ہو گیا۔ ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جو ڈاکیہ غلطی سے ان کے برآمدے میں پھینک گیا تھا۔ میں نے کہا ——"شکریہ سردار صاحب!" سردار صاحب جواب میں مسکرا دیئے اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولے۔ گویا کوئی بات اتفاقاً یاد آ گئی ہو ——"آج آپ رُک گئے کیا؟" میں نے کہا "نہیں سردار جی! آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے ۔۔۔" "اچھا، اچھا —— ہا ہا اچھا" —— اور سردار صاحب چلے گئے۔ جینتی وہاں ہوتی تو فوراً کہہ دیتی کہ دسکی والی بات سردار صاحب کو اتفاقاً نہیں آئی بلکہ وہ کچھ دیر پہلے ضرور اس کے متعلق سوچ رہے ہوں گے۔

گذشتہ بارش کے روز سے انہوں نے ابر سے خوب فائدہ اٹھایا تھا اور آسمان پر ادھر ادھر بکھرے نظر آتے تھے جنہیں سردار صاحب اپنے تخیل میں یکجا کر رہے تھے۔ شام کے وقت دھندلا آسمان سے نیچے اتر آتی تھی اور سڑک پر بجلی کی بتیاں محدود سا فاصلہ روشن کرنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکتی تھیں۔ سردی سے ٹھٹھرتے اور سہمے ہوئے درخت دراز قامت سایوں کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔

مجھے خیال آیا کہ اگر جینتی میری جگہ ہوتی تو وہ اس لفافے کو بھی محض مجھ تک آنے کا ایک بہانہ سمجھتی۔ یہاں تک کہ جینتی سے مجھے اختلاف ہو جاتا ہے اور میں اسے شرافت نہیں سمجھتا۔ اول تو کوئی وجہ نہیں کہ کسی کو ثبوت کے بغیر مجرم سمجھا جائے اور بالفرض اگر ایسی بات حویلیاں والے سردار کے ذہن میں ہے بھی تو یہ ایک معمولی کمزوری ہے۔ جیسے کسی انسان کو جتا دینا اہانت ہے ۔۔۔۔۔

میں نے لفافہ کھولا۔ کلدیپ کی چٹھی تھی۔ میں ابھی ابھی جو خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اسی کے نام تھا۔ اسی کی ایک غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے یہ خط لکھ کر میرے ساتھ ہمیشہ کے لئے تعلق توڑ لیا تھا۔ میرا کلیجہ میرے منہ کو آ رہا تھا۔ میں نے با آواز بلند کہا —— "گرو آنند"۔ جواب آیا "جی بابو"۔ لیکن میں اپنے جاتے جاتے ارادے کو زبان پر نہ لا سکا۔ ابھی ابھی کمبخت کام کر کے ہٹے ہوں گے اور پھر خدا جانے بیٹھی بھی ہے یا نہیں —— آخر انسان کے بچے ہیں۔ انہیں دو گھڑی تو آرام کرنا چاہئے۔

لیکن دروازہ آہستہ سے کھلا اور مجھے گرو آنند مجسم کھڑا نظر آیا۔ میں نے اس کشمکش کو اتنی توجہ کے قابل نہ سمجھا اور میں نے کہا "بھئی اگر چائے کی ایک پیالی مل جائے تو ۔۔۔" گرو آنند نے کہا "بی بی تو پہلے ہی بنا رہی ہے"۔ میں نے کہا —— "اچھا، اچھا ——!"

اور پھر یہی خط آخر اس شخص نے میری زندگی سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے ایک دھچکا لگا۔ پھر میں نے کہا "چلو اچھا، یہ بھی قصہ پاک ہوا"۔ ہر روز یہ آدمی میرا وقت ضائع کیا کرتا تھا۔ اکثر باتیں بڑے کام کی کرتا تھا۔ لیکن آدمی کہی ہوئی باتوں سے کب سیکھتا ہے۔ جب تک اسے خود تجربہ نہ ہو۔ وہ کب کسی چیز کا قائل ہوتا ہے۔"

کلدیپ جینتی کی طرح خداداد ذہن کا مالک تھا اور پھر اس پہ پڑھا لکھا آدمی۔ مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب میں انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر اس کے ساتھ گھنٹوں باتیں کیا کرتا تھا۔ کلدیپ اخلاق کا مجسمہ

تھا۔ لیکن اس معمولی سی بات پر اُس نے مجھے داد دی کتنا مناسب سمجھا۔ . .

ایک دن میں نے اُسے کہا: "کوئی آدمی جب یوں رہا ہو اور تمہیں پتہ چل جائے کہ وہ سرا۔ ۔ ۔ ۔ دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے تو کیا تم اسے ٹوک دو گے؟"

کلدیپ نے کہا "موقع کی بات ہے۔"

ظاہر ہے ایسے کئی ہیں۔ اس وقت کی جیتی ہی تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک بوڑھے دوست کا ایک قصہ سنایا۔ میں نے کہا: "رفیق ہے نا میرا دوست وہ ایک دن قصہ سنا رہا تھا کہ میں اپنے ایک دوست کے ہاں جایا کرتا تھا۔ اگرچہ یہ بات مخرب الاخلاق نظر آتی ہے لیکن بابا دل ہی تو ہے ——— اس دوست کی بہن سے میری محبت ہو گئی۔ میں نے کہا "جی ہاں ——— ممکن تو ہے۔ رفیق کہنے لگا ——— یہ سری نگر کا واقعہ ہے، میرا دوست ایسے مکان میں رہتا تھا جس کا دروازہ دریائے جہلم کی طرف کھلتا تھا ———

میں نے کلدیپ کو صاف صاف کہہ دیا کہ رفیق کے گزشتہ اطوار کی بنا پر میں نے یہیں سے اُس کی داستان پر شک کرنا شروع کر دیا۔ وہ حکایت میں حقائق کا رنگ دینا چاہتا تھا اور اُس کی خواہش تھی کہ اس میں رومانی کیفیات بھی پیدا کرے۔ اگر ہم وسکی کا گھونٹ پی لیتے تو یہ واقعہ ضرور شام کے وقت ہوتا جبکہ سورج جہلم پر غروب ہو رہا ہوتا ہے اور اُس کی شعلہ باری پانی پر آہستہ آہستہ مدھم ہوتی نظر آتی ہے . . . یہی جگہ تھی جہاں کلدیپ نے مجھے ٹوک دیا اور کلدیپ کا زاویہ نگاہ بھی وہی تھا جو میرا تھا۔ اس بنا پر اُس کی داستان میں شک کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ یہ صریحاً غنڈہ گردی تھی۔ بہر حال، رفیق نے اپنی بات کو جاری رکھا اور بولا ———

ایک دن امر سنگھ کالج میں ۔ ۔ ۔ تھا اور مجھے یقین تھا کہ کنیز ضرور . . . یہ اُس لڑکی کا نام تھا۔ . . . ضرور . . . دیکھنے کی غرض ۔ ۔ ۔ گیا ہوگا۔ دراصل وہ ایسی پُر رونق جہلم پر جانے کی بہت شوقین تھی۔ بلکہ میں نے اسے امیرا کدل کے پل پر جاتے بھی دیکھا۔ میں نے کہا . . . بڑا . . . موقع ہے اظہارِ محبت کا۔ میں اپنی تمام ہمت کو جمع کر رہا تھا . . . اس کے سامنے اپنے دل کا ماجرا کہہ سناؤں گا . . . . . . آہستہ کنیز کے . . . گیا۔ . . . جب میرا بے تکلفی تھی۔ میں پرے ہٹتا ہوا . . . میں پہنچا۔ کھڑکی دریا کی طرف کھلی ہوئی تھی اور کمرے کے اندر سے کنیز مجھے کھڑکی پر کھڑی نظر آئی ———

اس وقت سورج ڈوب رہا تھا ——— اور بغیر وسکی کے رفیق نے سورج کو غروب کر دیا۔ چنانچہ سورج غروب ہو رہا تھا اور اس کی سنہری شعاعوں نے کھڑکی میں کھڑی کنیز کے بالوں کو طلائی سنہری لگا دی تھی۔ گویا سچ مچ "سنہری" موقع تھا اور کنیز کی پیاری پیاری شکل روشنی کے خلاف دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھی۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور آخر کھڑکی پر پہنچ کر میں نے اُسے ایک دم بازوؤں میں لے لیا اور اس کا منہ چوم لیا ——— لیکن میں گھبرا کر الگ ہو گیا۔ وہ کنیز نہیں اُس کی ماں تھی!

ہم دونوں دیر تک ہنستے رہے پہلے رفیق اور میں اور بعد میں کلدیپ اور میں، ایک دو باتیں غور طلب تھیں۔ وہ یہ کہ کہانی کے آخر میں یکدم ایسا پلٹا۔ داستان گوئی کے فن کے اعتبار سے بہت پرانی بات ہو چکی تھی۔ لیکن رفیق بوڑھا ہو چکا تھا اور زمانے کی دوڑ سے پیچھے رہ گیا تھا۔ دوسرے اپنی تمام داستانوں میں رفیق نے محبت میں اپنے آپ کو کامران ہوتا کبھی نہیں دکھایا تھا۔ محبت بڑے دلچسپ انداز میں شروع ہوتی تھی اور بس یونہی ختم ہو جاتی تھی۔ بسا اوقات ناکامی پر۔ اپنی داستان کو ناکامی پر ختم کرنا رفیق کا فن تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اہلِ بینش فوراً اعتراض کریں گے کہ تمہارے ایسی شکل کے آدمی سے کون لڑکی محبت کر سکتی ہے۔ اس لئے وہ حدود کے اندر رہنا چاہتا تھا ——— کاش کوئی لڑکی اس سے محبت کرتی تو وہ زندگی میں سچ کے سوا اور کچھ نہ کہتا

کلدیپ نے پوچھا ——— "پھر تم نے اُسے ٹوک دیا؟"

میں نے کہا "نہیں۔ اُس کے ساتھ جی بھر کر ہنس لینے کے بعد میں نے بھی اُسے ایک جھوٹی کہانی سُنا دی۔" اُس وقت کلدیپ کھڑا ہو گیا۔ اُس نے میرے ساتھ پُرجوش مصافحہ کیا اور بولا۔ "بھاگیر تھ، تم بہت بڑے آدمی ہو۔" اور میں نیچے حیران ہو کر دیکھنے لگا . . .

میں اس تعریف سے مزید لطف اٹھانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا: ——— "اخلاق کے لئے بہت عالی ظرفی کی ضرورت ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دسترخوان پر اگر مہمان سالن گرا دے تو میزبان کا یہ فرض نہیں کہ وہ کہے ——— نہیں، نہیں کوئی بات نہیں ——— بلکہ اسے یوں ظاہر کرنا چاہئے جیسے اس نے دیکھا ہی نہیں۔"

کلدیپ نے مجھے بتایا . . . انسان بھی دیکھے ہیں جو

ہی تھوڑا سا سالن گرا دیتے ہیں۔ کرنل فاکس میرا دوست تھا۔ اُس کے
ہاتھ کھانا کھاتے ہوئے میرے ہاتھ سے کچھ گر گیا۔ میں نے اُسی وقت دیکھا
اس کی بیوی کا میز کے نیچے اپنا کچھ گرا چکی تھی... پھر کلدیپ نے ایک
اور داستان سنائی: پوٹھیا میں پرنس آف ویلز نے ہندوستانی فوجیوں
کے ساتھ کھانا اسی انداز میں کھایا جس میں فوجی کھا رہے تھے۔ حالانکہ کھانا
[illegible] بڑی تھا اور ہندی فوجیوں کو اسے کھانے کا سلیقہ نہ آتا تھا ——

ایسا دوست، کلدیپ میری زندگی سے نکل گیا! کتنا خوش ذوق آدمی تھا۔ لیکن کیا معمولی سی بات پہ ناراض ہو جانا بھی اُس کی خوش ذوقی کی علامت ہے؟ کیا یہ غنڈہ گردی نہیں ہے کہ جو شخص پہلے ہی اپنے آپ کو مجرم تصور کرتا ہو۔ اس کو بتایا جائے کہ وہ مجرم ہے ...... اچھا وہ میری زندگی سے نکل گیا ہے تو نکل جائے — اس کا انداز ہمیشہ ناصحانہ ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے یہ بتلانے کی کوشش کیا کرتا تھا کہ مہمانوں کے سامنے پھل چیر کر نہیں رکھنے چاہئیں۔ پھل ضائع بھی ہوتے ہیں اور یہ طریقہ بھی نہیں ہے۔ یوں بھی مہمان اپنی مرضی سے جو چاہتا ہے کھاتا ہے اور وہ ویسے بھی تھوڑا کھاتا ہے۔
—— لیکن جس مہمان کو میں اصرار سے کھلانا چاہوں۔ اُس کا کیا کروں میں کلدیپ کی باتوں کو سن لیتا۔ مجھے اپنے آپ کو کم عقل کہتا، بہن ماں اپنے میں بھی عذر نہ ہوتا تھا۔ میں ہمیشہ ثانوی درجہ حاصل کر کے خوش ہوتا تھا اور اس میں مجھے زیادہ راحت اور تسکین ملتی تھی ——

کلدیپ چلا گیا ہے تو میں خورشید کو اپنا دوست بنا لوں گا۔ وہ اچھا آدمی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو اتنا اچھا نہیں سمجھتا۔ ذہنی اعتبار سے وہ اتنا بلند نہیں۔ لیکن جب وہ میرے سامنے تھوڑی سی پی کر بہک جاتا ہے تو مجھے اچھی طرح پتہ چلتا ہے کہ پینا بُری چیز ہے۔ کلدیپ کی مدلل باتوں سے بھلا پتہ نہیں چل سکتا

کیا کلدیپ ایسے دوست کے چلے جانے سے زندگی کا کھیل رک جاتا ہے۔ نہیں ...... میں سولہ برس کا تھا جب میرے والد فوت ہوئے تھے۔ اس وقت دنیا مجھے اپنی آنکھوں میں اندھیر نظر آتی تھی۔ میں سمجھتا تھا سب کچھ ختم ہو گیا، سب کچھ۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میں ایک گہری دلدل [illegible] دیکھنے سے کنارے [illegible] معلوم ہوتے ہیں اور جیسے میں پیچھے [illegible] کے لئے دفن ہو جاؤں گا ... میں گھر کے [illegible]

دور رہا تھا۔ بدرو کے کناروں کی گیلی مٹی کو اپنے دل کے ساتھ لگاتا تھا تو کہیں تسکین ہوتی تھی ... ایک چبھن تھی —— جس نے سارے جسم کا احاطہ کئے ہوئے تھی ... اُس وقت مجھے خیال آیا کہ اس کے بعد میرا زندہ رہنا ناممکن ہو جائے گا —— یہ میرا ہنستا کھیلنا ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے گا؟ جب بدرو کے کنارے سے اُٹھا اور غسل خانے میں چلا گیا وہاں میں نے ہنسنے کی کوشش کی۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ میں ہنس بھی سکتا ہوں —— میں ہنس رہا تھا اور ساتھ کے کمرے میں میرے والد کی لاش پڑی تھی ......

اس کے بعد میری شادی ہو گئی اور بابو جی مجھے والد سے زیادہ عزیز معلوم ہونے لگے۔ میں نے عاطفت کے لئے اپنے سسر کو قبول کر لیا اب میں ہنستا ہوں، کھیلتا ہوں اور قریب قریب اپنے والد کو بھول چکا ہوں بلکہ ان کی زندگی میں مجھے اتنی آزادی نہ تھی۔ اب میں جو چاہتا ہوں کرتا ہوں، مجھے کوئی روکنے والا نہیں۔ ایسے جیسے میں کلدیپ سے علیحدہ ہو کر [illegible] سرور ہا ہوں اور اگر جینتی ہنستی کھیلتی چلی جائے ——
نہیں نہیں! .....

اس وقت تک رات پڑ چکی تھی اور کھانا تیار ہو چکا تھا۔ گن آنند آیا اور پرمیشری نوکرانی جو برتن توڑا کرتی تھی، گھبرا گھبرا کر ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ اُنہیں سانس لینے تک کی فرصت نہ تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے گھر میں بہت سے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ بابو جی آئے اور لوگ کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ جس کے دم سے گھر کی رونق تھی اور جو ہر لحظہ کوئی نیا قضیہ کھڑا کئے رہتا تھا۔

اُس وقت میرا بھی جی چاہنے لگا کہ تھوڑی سی پی لوں اور شمشان کی سی خاموشی میں کچھ ارتعاش پیدا کر دوں۔ پتا جی کی موت پر آنسو بہاؤں اور کلدیپ کی فاتحہ خوانی کروں۔ سارے بدن میں متواتر سوچتے رہنے سے جو تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اسے آسودہ کرنے کو جی چاہتا تھا۔ [illegible] اس وقت [illegible] تپائیاں [illegible] اور [illegible] کی آواز [illegible] تک آ رہی تھی —— کیسی [illegible] سنسناہٹ بھری ...... [illegible] میرے [illegible]

صرف آوازیں غیر متعلق شور ہو کر میرے تخیل کی معاون ہو گئیں ـــــ میں سوچتا رہا ـــــ سوچتا رہا۔ . . . . اُس کرسی میں دبکا ہوا۔ اور ابھی تک کھانے کے لئے مجھے آواز نہیں دی گئی تھی . . . .

اگر میری دوسری شادی ہو بھی جائے تو میں زندگی کو استوار کرنے سے پہلے اتنی کشمکش نہیں کر سکتا۔ دراصل میں اتنا تھکا ہوا ہوں کہ اب دوسری شادی کا متحمل ہی نہیں ہو سکتا . . . . .

لیکن یہ آسان بات ہے۔ آخر شادی کسی پڑھی لکھی لڑکی سے ہو گی جو ہر بات کو ہمدردی کے نقطۂ نظر سے دیکھے گی . . . . وُہ پلنگ پر بیٹھی ہے ایک مدراسی دھوتی پہنے جس کا کنارہ بہت چوڑا اور سیاہ ہے اور یہ پتہ نہیں چلتا۔ اس کے بال کہاں سے شروع ہوتے ہیں اور ساری کا پلو کہاں ختم ہوتا ہے۔ دھوتی کی زمین مٹیالی ہے اور اس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین تین حلقے نظر آتے ہیں۔ اوپر کا حلقہ سیاہ جو پلو سے مطابقت رکھتا ہے، درمیان کا زرد، اُس کے اندر کا سفید، پھر نیلا اور آخر میں دھوتی کی زمین اُبھری ہوئی ہے . . . . .

وُہ خاموش ہے گنواروں کی طرح نہیں ہنستی اور نہ جھوٹ کو اتنا بُرا سمجھتی ہے۔ شاید برا سمجھتی ہو لیکن کہتی نہیں۔ بڑی خاموشی سے مسکرائے جاتی ہے . . . . .

میں اُس سے کہہ رہا ہوں ـــــ "میں جیون کی اس دوڑ میں تھک گیا ہوں سکھداں، میں شاید تمہارے ارمانوں کو پورا نہ کر سکوں۔ لیکن میں تمہیں محبت اور سکھ دے سکتا ہوں۔ ایسی محبت نہیں جو شعلہ جوالہ ہو۔ ہاں البتہ ایک دھیمی آنچ جس میں محبت پختہ بھی ہوتی ہے اور خوش ذائقہ بھی۔ . . . . تمہیں دو یتیم بچے بھی سنبھالنا ہوں گے اور ان سب باتوں کے جواب میں وُہ شرما کر سر ہلا دیتی ہے۔ گویا اسے سب کچھ منظور ہے!"

وُہ کہہ رہی ہے ـــــ "میرا خیال ہے، تمہارے دوستوں کو کھانے پہ بلاؤں"۔

"ہاں بلاؤ سکھداں، یہ تم نے میرے من کی بات کہہ دی"ـــــ اور ہم ایک فہرست مرتب کرنے لگتے ہیں۔

دوست آتے ہیں کھانا کھاتے ہیں۔ امریکن سینڈ ٹافی میز پر رکھی جاتی ہے اور میرے دوست اسے سٹینڈ پر سے اُٹھا کر کھاتے ہیں اس خیال میں کہ کوئی چھلکا اتارنے کی ضرورت نہیں لیکن وُہ نہیں جانتے وُہ ٹافی اسٹینڈ سمیت اُٹھائی جاتی ہے اور اسے منہ میں ڈال کر اسٹینڈ رکھ دیا جاتا ہے۔ میں سراسیمہ ہو کر ادھر اُدھر دیکھتا ہوں سکھداں سب کچھ جانتے ہوئے بھی میرے دوستوں کی طرح غلط طریقے سے ٹافی کھاتی ہے . . . . .

اس کے بعد مجھے جانگلو سی ہنسی سنائی دی۔ میرا ماحول اس وقت اس قدر پُر سکون تھا کہ میں جیتی کی ہنسی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دراصل . . . دراصل میں چاہ رہا تھا کہ یہ ہنسی ختم ہو جائے . . . . مجھے کھانے کے لئے آواز دی گئی۔ میں اُٹھا جبکہ مجھے اپنی نگاہوں کے اُفق پر وُہ بوڑھا رمال اپنے بازو ہلاتا ہوا گزرتا نظر آنے لگا۔

عصمت شاہد لطیف

معائنہ

اسکول کے بکھرتے ہوئے شیرازے کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹنے کی کوشش میں وہ بالکل پاگل ہو گئی۔ دوپہر کو جو لڑکیوں کے گھروں سے کھانا آتا اس میں سے ایک آدھ آدھ روٹی چپڑاسنیں نکال کر اڑا جاتیں۔ باقی میں استانیاں حصّہ لگاتیں۔ بیچاری بچیاں بھوکی مرتیں۔ پہلے تو چپڑاسنوں نے سنی ان سنی کر دی پھر جو سختی کی گئی تو ایک اور چال چلی۔ لڑکیوں سے کہہ دیا "خبردار جو پورا کھانا کھایا، ہمارا حصّہ ضرور چھوڑنا" لیکن یہ بات بھی زیادہ دن نہ چھپ سکی اور ایک دن چپڑاسنوں کے مظالم کی پھر کسی نے شکایت کی۔ بازپرس پر چپڑاسنوں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

"کیا کریں مس صاحب چھ روپیہ اور تین بچے ایک اپاہج ماں اور نکھٹو بھائی کیسے گذر ہو۔ یہ اللہ ملا پیٹ بھی نہیں مارا جاتا۔"

"جیسے تیسے تو ہم پڑھا رہے ہیں اپنی بچیوں کو اپنے ہی پیٹ کو نہیں تو ان چپڑاسنوں کا کہاں سے کلّہ گرم کریں" لڑکیوں کے والدین نے دہائی مچائی "بیس روپے میں مکان کا کرایہ اور اپنا اور چار بندوں کا کھانا کپڑا کیسے پورا کریں" استانیاں چیخیں۔ شمن کو ایسا معلوم ہوا اسکول میں نہیں کسی لنگر خانے میں کھڑی ہے۔ دنیا نہیں بھوکے ننگوں کا ایک مستقل یتیم خانہ ہے جہاں اوپر سے لے کر نیچے تک ہر ایک نڈھال ہے اس نے دونوں چپڑاسنوں کو اپنے پاس سے دو دو روپیہ دینا شروع کئے۔ جب کبھی ممکن ہوتا استانیوں کی دعوت کر دیتی۔ ہر ماہ دو چار غریب لڑکیوں کی فیس بھی ادا کر دیتی۔ مگر اُسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جتنا جتنا وہ پیٹ بھرنے کی کوشش کرتی بھوک بڑھتی ہی جاتی۔ ایک فقیر کو پیسہ دے دو تو دس اور ٹوٹ پڑتے ہیں جو نہ دو تو بعض شوقین مزاج گالیوں پر بھی اُتر آتے ہیں۔ غرض اس دریا دلی کے بدلے میں بجائے شکر گزاری کے جوتیاں ملیں۔ ہر جمعرات کو چپڑاسنیں محلے ٹولے میں بھیک بھی مانگ لاتیں استانیاں نہ بیچاری بھیک مانگنے کی ہمت اور نہ عمر بھر کی

کے پیشے کے ادنی گھرانے بار سوائے اسکول والوں کی خیرات کے اور کیا وسیلہ زندگی گذارنے کا ہوتا۔ ہر وقت ایسے لرزتیں جیسے تعطائی سے نکلے۔

مگر منیزہ بیگم بالکل چنگیزی پالیسی کی قائل تھیں۔ باوجود کوششوں کے انہوں نے لڑکیوں کو ایک لفظ بھی پڑھا کر نہ دیا۔ بس ہر وقت بیٹھی منیجر صاحب کے لئے کشیدہ کاری کا جال تیار کیا کرتیں۔ شمن نے ان کی رپورٹ میں شکایت کی مگر وہ رپورٹ انسپکٹرس کے پاس بھیجنے سے پہلے منیجر صاحب نظرثانی کو دے گئے اور اُن کی شکایت ہی گول مال کر دی۔ رضیہ بیگم شدت سے حاوی ہوتی گئیں۔ شمن کا پلّہ اٹھتا دیکھ کر وہ استانیوں پر قابو جما بیٹھیں۔ بحالی اور ترقی کی کامیاب سفارشیں ہونے لگیں۔ آموں کی چٹنی کے ساتھ انہوں نے اسکول کی بھی چٹنی بنانی شروع کر دی۔ شمن کو معلوم بھی نہ ہوا اور وہ منیجر کی آڑ لے کر اس کی پیٹھ میں ڈنک مارنے لگیں۔ اس کے ملنے جلنے والوں کی رپورٹ پہنچائی اور منیجر صاحب قوم پرستی پر تل گئے۔ اس کے لباس اور طرزِ رہائش سے انہیں شریف خاندانوں کی لڑکیوں کا اسکول سے ہٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ وہ ذرا ذرا سی بات کی خبر پا جاتے۔ کے بجے اٹھتی ہے کب سوتی ہے کیا کھاتی ہے اور کیوں کھاتی ہے۔

"کس نے کہا آپ سے" وہ حیرت زدہ ہو کر پوچھتی۔

"مجھے ہر بات کی خبر رکھنا پڑتی ہے صاحب" وہ نہایت پُر اسرار مسکراہٹ چہرے پر طاری کر کے کہتے، گویا اسکول کے منیجر کو سی۔ آئی۔ ڈی کا کام بھی کرنا پڑتا ہے۔ "مجھے عوام کے قومی جذبہ کو اُبھار کر چندہ جمع کرنا ہے لہٰذا استانیوں کا چال چلن ......"

لفظ چال چلن پر شمن جل کر رہ گئی۔ پتا نہیں لوگ چال چلن کو کیا سمجھتے ہیں۔ چال چلن بھی کوئی مقدس مقبرہ ہے کہ اس کے آگے ماتھا ٹیک کر نجات کی امیدیں لگائے بیٹھیں۔ اگر ایک استانی زمانے بھر کی آوارہ ہے مگر کام ٹھیک کرتی ہے تو اس مقدس مٹی کی بنی ہوئی معلمہ سے ہزار درجہ غنیمت ہے جو خود تو مجسم نیک چلن ہے مگر لڑکیوں کا حال اور مستقبل تباہ کرنے میں مصروف ہے

"دیکھئے صاحب سنا ہے لڑکیوں کے پاس چٹھیاں آتی ہیں۔"

"کیسی چٹھیاں؟" شمن نے ضبط سے کام لیا۔

"اجی یہی خرافات پرچے، غنڈے بھیجتے ہیں۔ آپ ایک کام کیجئے۔ ایسی سب لڑکیاں جن کے پاس خط آتے ہیں اکٹھا کرکے انہیں ڈانٹیے۔"

"مگر یہ کیسے معلوم ہو کہ چٹھیاں کس کے پاس آتی ہیں۔ پکڑی جائیں جب نا!"

"تو صاحب پکڑ لیجئے" گویا چٹھیاں بھی کبوتر ہیں کہ چھاپا مار کر پکڑ لی جائیں۔ دوسرے یہ چڑی ماری تجربے سے آتی ہے۔ ایسے خط ڈاک سے نہیں آتے بلکہ لڑکیاں ہی ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں۔ اپنے بھائی بندوں کی پرچہ بازیاں جاری کرنا ایک عام بات ہے۔ بیس روپیہ پانے والی استانیاں اور پچاس روپیہ میں گذر کرنے پر مجبور چپراسنیں اگر پان تمباکو کا خرچ اس پرچہ بازی سے نہ نکالیں تو اور کیا کریں۔ اگر لڑکیوں کو ڈانٹو تو الٹے چڑھ دوڑتے ہیں۔ پھر ان کی معصوم بچیاں یہ ہتھکنڈے کیا جانیں۔ اور ان معصوم بچیوں کا پکڑنا بھی معمولی کام نہیں حد درجہ کی ہوشیار ہوتی ہیں کم از کم وہ گروہ جو ان بیہودگیوں میں پیش پیش ہوتا ہے۔ جو تنہائی میں یہ فعل کرتی ہیں معصوم نہیں ہوتے۔ ہزاروں چالیں چل کر خط لائے جاتے ہیں۔ عموماً تو لڑکی کی طرف سے لڑکی کے نام ہوتے ہیں جن پر بازپرس کرنے کے لئے غیب دان ہونا پڑتا ہے۔

ساتھ ہی امتحان آ گئے۔ نتیجہ لگوانا اس چالاکی سے کہ لڑکیاں ایک دوسرے کی نقل نہ کرسکیں کاپیاں لگوانا اور پھر سارے دن چوکیداری کرنا، پکنک کا زمانہ بھی آ گیا۔ اب یہ دیکھنا کہ سارے رجسٹر جھوٹے سچے کیسی بھی فضول معلومات سے پُر ہیں یا نہیں لائبریری کی کتابوں اور کشیدہ کاری کے نام سے روپیہ نکال کر جو منیجر صاحب نے اپنی ساس کا قرضہ اتار دیا اس رقم کی لیپا پوتی میں کرنے کے گر استعمال کئے جائیں۔ منیجر صاحب بھی کچھ کم قدر سے رہ گئے۔

"اچھا صاحب یہ کیجئے کہ لکھ دیجئے رجسٹر میں ..... کہ گملے اور پھولوں کے بیج خریدے گئے۔ چلئے چھٹی ہوئی" رائے دینے لگے۔

"مگر ہیں کہاں گملے اور بیج۔ انسپکٹرس نے معائنہ کیا تو؟"

"کہہ دیجئے گا کچھ بچیوں نے توڑ ڈالے اور کچھ تیرا چنگی کے افسر سے کہہ کر خالی ٹوٹے گملے منگوا لوں گا۔ باغ عام میں بہت بیکار پڑے ہیں۔ کچھ میرے یہاں ہیں وہ بھیج دوں گا۔ اور آپ ..... آپ نے بھی تو کچھ لگا رکھے ہیں؟"

"اپنے تو میں نے تقسیم کر دیئے کون چھٹیوں میں رکھوالی کرتا۔"

"اے لیجئے غضب کر دیا آپ نے تو ..... خیر کوئی مضائقہ نہیں۔"

"اور بیج؟"

"اور لکھ دیجئے اُگے نہیں، خراب تھے اور یہ کمبخت ہوتے بھی ہیں گھنے گھنائے، واہیات۔ کہئے تو میں کچھ پنساری کے یہاں سے منگوا دوں۔"

"مگر یہ پورے روپیہ کا تو حساب نہ ہوا۔"

"کچھ بننے کاڑھنے کا سامان میں مکان سے بھجوا دوں گا۔"

"بہت اچھا۔"

"اور کچھ کتابیں بک اسٹال سے منگائے دیتا ہوں، خراب نہ ہونے پائیں، نہایت احتیاط سے واپس کرنا ہوں گی۔ کچھ چائے پانی کا انتظام؟"

"وہ تو خیر ہو جائے گا، مگر وہ بورڈنگ، اس کا کیا ہوگا اس کے لئے باقاعدہ رقم ملتی ہے۔"

"آپ فکر نہ کیجئے ایسا ہے کہ اس کا تو میں نے پہلے سے انتظام کر لیا ہے۔ وہ جو مشرقی بازو کے تین کمرے ہیں اس میں پندرہ بیس چارپائیاں ڈلوا دوں گا ..... بستروں کا بھی انتظام گھروں سے کر دیں گی۔ کچھ فاضل چادریں اور تکیے ہوں تو آپ دے دیجئے گا۔"

"مگر یہ تو سراسر دھوکا دینا ہے اس طرح فریب دے کر انسپکٹرس کی نظروں میں کیا وقعت رہ جائے گی۔ اگر اُسے کسی طرح پتہ چل گیا۔"

"اب صاحب پتہ چلنے کی کوئی راہ تو ہے نہیں سوائے ..... خیر ..... آپ اسکول کی مائی باپ ہیں، مجھے امید ہے کہ اسکول کی بہتری کیلئے آپ کو خود فکر لگی رہتی ہے۔ کیا کیا جائے۔ مجبوری ہے۔ یہ دیکھئے آپ کو اگر گورنمنٹ سے گرانٹ لینی ہے تو سبھی کچھ کرنا پڑے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں میں سب کچھ بھگت لوں گا۔ بس جس وقت آئیں تو آپ ..... ارے ہاں وہ نظم؟"

"نظم؟"

"جی ہاں نظم ..... تیار کی آپ نے؟"

"میں نے؟ کیوں؟"

"لیجئے صاحب، ابھی وہی انسپکٹرس کی شان میں ..... بھول گئیں"

گیا۔ دیکھئے جب وہ آکر بیٹھ جائیں تو کسی پیاری سی بچی سے گلے میں ہار ڈلوا دیجئے گا۔ عمدہ صاف کپڑے ہوں۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی نواسا ٹھیک رہے گی، میں اسے صبح ہی سے بلوا لوں گا۔"

"مگر وہ تو یہاں پڑھتی نہیں۔"

"اجی سب چلتا ہے، کوئی نام ہو نام۔ تقریری ایک ایک لڑکی دیکھی جاتی ہے۔ آپ یہ کیجئے گا۔ کہ صبح سے بلوا لیجئے گا ...... ہاں"

"جیسی آپ کی مرضی!"

"اور ہاں پھر ہار وغیرہ پہنا کر لڑکیوں سے نظم ..... چولا ہول ولا قوۃ آپ نے نظم تو تیار نہیں فرمائی۔"

"میں نے عرض کیا نا کہ مجھے نظم لکھنی نہیں آتی۔"

"چھ تو یہ ایسی مشکل ہی کیا ہے، پچھلی مرتبہ رضیہ بیگم نے بنا دی تھی، اگر مل جائے تو وہی چلا دیجئے، دو چار لفظوں کا ہیر پھیر کرنا ہوگا۔ ... ورنہ ٹھہریئے میں ہی کچھ سوچوں گا۔" اور وہ چہرے پر شاعرانہ جذبات طاری کرنے کی کوشش کرنے لگے "ہاں؟ ہیں؟" "نہیں سوجھ ہی گئی۔" "وہ دیکھئے پاس جو قومی ہائی سکول ہے۔ اس میں جو جلسے ہوتے رہتے ہیں۔ وہاں ہزاروں نظمیں پڑی ہیں۔ منگوا نا ہوں میں .... ابے نتھے ..... او ..... سالے .... اوہ معاف کیجئے گا ...... دیکھ بے ذرا مسعود صاحب کے پاس تو جا ایک کر کہنا مینجر صاحب نے سلام کہا ہے اور نظمیں مانگی ہیں۔"

"نجمیں؟"

"ابے ہاں گدھے۔ کہیں ..... چ اُلو ہے تو ..... معاف کیجئے گا .... خیر میں خود ہی لے آؤں گا ...... اور کل تک پہنچ جائے گی آپ اس میں ردّ و بدل کروا لیجئے گا۔ اسکول میں ایک دن پہلے سے سجوا دوں گا۔ اور امتحان پیر سے شروع کروا دیجئے گا ..... اُس روز پرچہ رکھ دیجئے گا۔" انسپکٹرس کو اُردو نہیں آتی تھی تعلیمی انسپکشن سے بچنے کی یہی ایک صورت تھی۔

انسپکٹرس کی آمد کی خوشی میں پاس پڑوس کے جتنے گملے تھے آگئے کسی میں پودینہ تو کسی میں ہری مرچیں مگر برآمدہ ہرا بھرا ہوگیا۔ کتب فروشی سے دس روپیہ کرایہ طے کر چار پانچ سو کتابیں بھیج دیں۔ اتنا دیکھنے کی کسے فرصت یا فکر تھی کہ اس میں زیادہ تعداد ایسی کتابوں کی تھی جو لڑکیاں چھوڑ کسی کے بھی پڑھنے کے قابل نہ تھیں زیادہ تر سستے بازاری ناول "میاں بیوی" ...... "شادی کی راتیں" اور مستند کوک شاستر تھے جنہیں بڑی شان سے الماری میں چن دیا گیا ساتھ ساتھ اور اِدھر اُدھر کا کوڑا جمع کر دیا گیا۔ پہلے پرانے میگزین جنتریاں ٹیلی فون ڈائریاں اور پرانی فہرستیں نہایت صفائی سے کاغذ چڑھا کر ایسے مقام پر رکھ دی گئی تھیں جہاں سے دیکھنے والا کتاب کی ضخامت سے تھرّا کر رہ جائے نیز اس کاغذ چڑھانے والی چال کو سلیقہ سمجھے کواڑوں اور کھرچی ہوئی نیچوں پر تیل اور پانی چھڑا گیا۔ جگہ جگہ تصویریں اور کیلنڈر وغیرہ چپکا کر دیواروں کی مفلسی پر پیوند لگائے گئے۔ لڑکیوں سے کہہ دیا تھا۔ کہ صاف اور ثابت کپڑے پہن کر آنا تو وہ بڑی کے جوڑے نکال کر پہن آئیں۔ چھا نجن چوڑیوں کی جھنکار سے اسکول اندر سبھا کا اکھاڑا بن گیا۔

ایک اور ہوشیاری کی گئی وہ یہ کہ امتحان کی کاپیوں پر آدھا آدھا پرچہ استانیوں نے بورڈ پر لکھ کر پہلے سے کروا دیا تاکہ اگر انسپکٹرس لڑکیوں کی قابلیت کا اندازہ لگانے پر بضد ہوں اور کسی کو ساتھ لے آئیں تو اُن میں ادیب فاضل کی لیاقت کے جوابات حل کئے ہوئے پائیں۔ ان انسپکٹرسوں کے سارے ہتھکنڈوں سے اسکول والوں کو واقف رہنا پڑتا ہے۔ کوئی چال اُن کی نہیں چل سکتی۔

اس کے علاوہ میزوں اور الماریوں میں "لڑکیوں کی کشیدہ کاری" کے نام سے کچھ بازار سے خریدی ہوئی چیزیں اور کچھ مانگے تانگے کے جہیزوں کے میز پوش پاندانوں کے کور سلمہ کا بنا ہوا تاج محل اور قریب قریب سارے نمونے رضیہ بیگم کے کاڑھے ہوئے "سویٹ ہوم" اور "گڈ نائٹ" سجا دیئے گئے۔ اُن میں سے بعض چیزیں تو مشین کی بنی ہوئی اور بیرونجات کی صنعت گری کا نمونہ تھیں مگر ایسے چینتروں سے یہ سب سامان رکھا گیا کہ صرف چیزوں کی تعداد بڑھا رہا تھا مگر پہنچ سے دور تھا۔ یہی نہیں بلکہ کچھ نامکمل چیزیں بھی تھیں جو پاس کے اسکول سے منگا کر سجا دی گئی تھیں۔

بورڈنگ بھی لیس تھا۔ چارپائیوں پر خالی غلافوں میں الا بلا ٹھونس

کر تکیے لگا دیئے گئے۔ اُوپر سے چادریں اور پلنگ پوش ڈال دیئے گئے۔ پاس دو چار میزوں پر کتابیں سجا دی گئیں۔ لیجئے کمرے سج گئے۔ رہیں لڑکیاں تو وہ تین چار کلاسوں سے چن کر مقرر کر دیں کہ جب انہیں بلا یا جائے تو حاضر ہو کر انسپکٹرس کو سلام کریں۔

خدا خدا کر کے برات کی طرح زور شور سے انسپکٹرس آ تریں گیٹ کے پاس جہاں لمبا چوڑا خوش آمدید اور جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ منیجر ہیڈ مسٹرس نے مع چپراسی اور دو عیسائی استانیوں کے خوش آمدید کہا۔ یہ انسپکٹرس بھی دنیائے تعلیم میں خدا کا سا درجہ رکھتی ہیں۔ جو شان لاٹ صاحب کی سوان کی۔ ان کا کام صرف دھوم دھڑکے سے آنا اور ڈانٹ ڈپٹ کرنا ہے۔

"یہ جالا کیوں؟ .... یہ اینٹ کیسی؟ ...... یہ گڑھا کس لئے؟" اب ان سے کوئی پوچھے سال میں دو مرتبہ اگر آئیں اور جالے اور گڑھوں میں پھنس گئیں تو کونسی قیامت آگئی۔ سیدھی طرح آؤ، ہار پھول پہنو، تعریفی نظمیں سُنو تازہ تازہ پھل اور مٹھائیاں بھینٹ کے لئے منگا رکھی ہیں وہ چکھو کچھ تمہارے ساتھ چپکے سے باندھ کر گھر پہنچا دیں گے۔ وہاں اطمینان سے چکھنا۔ بس اس سے زیادہ دخل درمعقولات کی فہرست میں داخل! کیا فائدہ بُری رپورٹ سے چیف انسپکٹرس کب کب آتی ہے اور کتنی دیر کو آتی ہے۔ اس سرسری معائنے کی سرسری ...... ہی رپورٹ ہو، ورنہ خواہ مخواہ تمہارا ہی حلقہ بدنام ہو جائے گا۔ اوّل تو ہم ہندوستانی ہیں بد انتظام، دھوکا جعلسازی ہمارا پیدائشی حق، دوسرے ہمارا شمار پست اقوام میں ہے۔ اب تو چپڑی اور دو دو! تم بیکار مغز پاشی کر رہی ہو۔ تمہاری بلا سے جو رسیدوں پر جعلی دستخط ہیں جو منیجر صاحب نے خود اُلٹے ہاتھ سے کر لئے ہیں۔ اور فرضی انگوٹھے تنخواہ کے رجسٹر میں لڑکیوں اور چپراسنوں سے لگوائے ہیں۔ تم کیوں پڑتی ہو ان جھگڑوں میں۔

اس پر بھی جو تم نہ مانیں تو مقامی قومی اخبار کے ذریعہ تمہارے چال چلن، خفیہ رشتوں اور ہیرا پھیریوں کا پول کھول کر رکھ دیا جائے گا۔ تم فرقہ پرست الگ مشہور کر دی جاؤ گی۔ زیادہ نہیں چار پانچ روپے کا خرچ ہے۔ سحر البیان اڈیٹر تمہاری سات پشتوں تک کی دھجیاں بکھیر کر پھینک دیں گے۔ ہم جو جانتے تم کو دے رہے ہیں ان میں سے کچھ اپنے افسروں کے سامنے رکھ دو۔ اس معائنے کے اچھے شکریہ کے انعام میں جو ہم یہ چاندی کا بکس علاوہ مٹھائی کے دے رہے ہیں، اس میں سے کچھ اپنے افسر کے بکس میں پہنچا دو۔

سپرنٹنڈنٹ صاحبہ کی نواسی کے ہاتھوں ہار پھول پہن کر انسپکٹرس نے ذرا ٹیڑھا راستہ اختیار کیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" پیار سے پوچھا۔

"اُوں، ہٹ!" لاڈلی نواسی نے جواب دیا اور منیجر صاحب کی روح قبض۔

"اوہو ہو..... شرماتی ہے ...... بولو ...... بیٹی نام بتاؤ ...... بولو۔" بیچارے مدد کو دوڑے اصل میں وہ خود بچی کا نام بھول گئے تھے۔

"وحیدہ!" کسی نے سہارا دیا۔

"کس کلاس میں پڑھتی ہو وحیدہ!"

"بولو ... بولو بیٹی وحیدہ ...... ہُنہ ..... ہاں ڈرو مت ...... ڈرتی کیوں ہو۔" حالانکہ بچی نہایت گستاخی سے انسپکٹرس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھور رہی تھی۔ اور ادھر مارے خوف کے دراصل منیجر صاحب پسینے ہوئے جا رہے تھے۔ مگر بچی ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"ابھی یونہی آتی ہے۔ کلاس ولاس میں تو کچھ نہیں ..... شریف آدمی کی لڑکی ہے یہ اسکول آتی ہے تو عوام کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔" منیجر کو تمام گُر یاد تھے۔ چائے اور ناشتے سے صاف انکار! یا خدا! ضرور کسی نے کان بھر دیئے ہیں۔ گذشتہ سال جو انسپکٹرس آئی تھی بیچاری کتنی اچھی تھی، مزے سے بیٹھی نظم سُن سُن کر گائے کی طرح چارہ سا نگلتی رہی۔ پر یہ تو پوری دوہ تھی۔"

"ہیں، ہیں، ہیں، آپ کو پسند ہوں تو بنگلے پر پہنچوا دوں .... جی ...." منیجر اپنے سوکھے سوکھے ہاتھوں کو دھونے کی نقل میں ایک دوسرے کے گرد لپیٹنے لگے۔

"یہ چُنگی کے گملے ہیں!" صاف تاڑ گئیں۔

"ہیں! ..... چُنگی واللہ! ......" منیجر صاحب مصنوعی حیرت

اور خوف کے مارے مجلے جملے سے اور بھی زرد اور نڈھال ہو گئے اور بوکھلاہٹ چھپانے کو گملے کے پھندے ہی گلے ہوئے نمبر کو بغور پڑھنے لگے۔ کمبخت چپراسی نمبر مٹانا بھول گیا!

"اوہ، جی ہاں چنگی کے تو ہیں ہی" وہ اطمینان کا سانس بھر کر بولے۔ "سکتر صاحب نے امداد کے طور پر عطا فرمائے ہیں" لیجئے ایک مد اور رجسٹر سے کم ہو گئی۔ دوسری مفت کی رہی۔

شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ نہ جانے کس پُر اسرار طریقے سے رجسٹر میں گملوں کی مد کے آگے لکھا تھا۔ ابھی آئے نہیں ادائیگی پیشگی ہو گئی۔ مگر انسپکٹرس تو آج خون پینے کے منصوبے گانٹھ کر آئی تھی۔

"یہ گملے کافی سے زیادہ ہیں، اور ضرورت نہیں — روپیہ واپس لے لیا جائے" یہ اُس نے گملوں کی باڑ پر چھری پھیر دی۔

یہ ہوتا ہے کہ اگر پہلے ہی وار میں انسپکٹرس کو گھیر کر بدحواس کر دو تو بھیگی بلی کی طرح ہر بات پر میاؤں کروا لو۔ اگر ہاتھ اوچھا پڑا اور نکل گئی چھٹک سے، تو بس مست ہاتھی کی طرح گرجتی برستی سب چیزوں کو روند کر کھلیان کر دے گی اور یہ نئی انسپکٹرس تو بالکل تازی گھوڑے کی طرح چاروں سمت ٹاپیں ڈالنے لگی۔ مگر مینجر صاحب بڑے بڑے جن بھلا چکے تھے۔ نہ جانے کدھر سے کتابیں اڑا دیں کچھ رہ گئیں۔ وہ ایسی کہ وہ قیمت کا اندازہ ہی نہ کر سکی، دست کاری اس نے باوجود شدّت سے التجا کرنے کے نہ دیکھی۔ امتحان کا وار بھی کچھ اوچھا پڑا۔ پہلے تو دو چار کا پیالہ دیکھیں منشی سے کھسر پھسر کی پھر کہہ دیا کہ چونکہ امتحان ہو رہا ہے۔ تعلیمی معائنہ پھر ہوگا۔ کس دن؟ یہ مقرر نہیں، بے کہے گرل آن گرے گا۔

اس کے بعد اُس نے قطعی ہلاکو والی پالیسی اختیار کی۔ بجائے لڑکیوں کے فی الحال استانیوں کا امتحان لے لیا جائے تو خوب ہے۔ مینجر صاحب کے پیروں تلے کی زمین سرک گئی۔ اور سر پر مصیبت ٹوٹ پڑی۔ مارے بوکھلاہٹ کے بدکے ہوئے اونٹ کی طرح چاروں طرف دوڑنے لگے۔ اس گھبراہٹ میں کئی گملے جو سجاوٹ کے خیال سے نہایت خطرناک جگہوں پہ نازک سے سہارے سے ٹکا دیئے تھے پھسل پڑے اور "دھڑم" مع تمام بانسوں اور تختوں کے اُن پر سے نچھاور ہو گیا۔

رضیہ بیگم کا پیٹ کی خرابی کا پرانا مرض ابھر آیا اور وہ نڈھال ہو کر اپنی پلنگڑی پر جا پڑیں۔ دوسری استانیاں بھی از سر نو راشٹ ہو گئیں۔ صرف عیسائی استانیاں جنھیں گر روٹی تھیں بھی غنیمت۔

اسی عرصہ میں گھبرا کر مینجر صاحب نظم خوانی کے لئے لڑکیاں بلا لائے شاید ڈھول تاشے سے معاملے کی تریخ کچھ کم ہو جائے۔ کہتے ہیں سنگیت میں بلا کی طاقت اور جادو ہے بجھی ہوئی شمعیں جل اٹھتی ہیں۔ بدمست ہاتھی اطاعت ہو جاتے ہیں۔ مگر غضب ہو گیا۔ نظم کے بند بغیر تبدیلی کئے لڑکیوں کے سپرد کر دیئے گئے۔ اور تعلیمی جلوس کا ہاتھی اپنے بدلے صوبے کے کمشنر کی شان میں نظم سن کر اور بھی بدمست ہو گیا۔ مگر بجائے غصہ ہونے کے وہ بے زور زور سے قہقہے لگانے لگی۔ مینجر صاحب جواب تک بے قابو تانگوں کو صرف قوتِ متخیلہ کے ذریعہ روکے ہوئے تھے بے طرح لرزنے لگے اور خود بھی بدحواس ہو کر ہنسنے لگے۔

"کوئی دوسری چیز گاؤ" رسانیت سے حکم ملا۔

"ہاں ہاں کوئی دوسری چیز سناؤ ...... وہ گاؤ لب پہ آتی ہے ...... چلو کمبخت منہ کیا دیکھ رہی ہو ...... شروع کرو" مینجر صاحب لڑکیوں کی صف کے آگے پیچھے دوڑ دوڑ کر ہدایات دینے لگے "گاؤ ...... ہاں ...... لب پہ؟" مگر لڑکیاں مبہوت اور شرمائی ہوئی ایک دوسرے کی پیٹھ میں گھسنے کی کوشش کرتی رہیں۔

"یہ ...... یہ دیکھیے مس صاحب میں تو ہار گیا ان سے، آپ کو نہیں معلوم، آپ نہیں جانتیں ہماری قوم کس قدر پستی میں گری ہوئی ہے یہ سب غریب اور نچلے طبقے کی بچیاں ہیں جن کے گھروں میں کوئی الف کے نام بے نہیں جانتا۔ میں تو تھک گیا سمجھاتے سمجھاتے۔ اوہ ...... ارے خدا کے واسطے ......" لڑکیوں نے اُن کی رقت آمیز آواز سے ڈر کر "لب پہ آتی ہے" شروع کی۔ مگر باوجود کوششوں کے کچھ بھی لب پہ نہ لا سکیں۔

"اچھا وہی گاؤ، سارے جہاں سے اچھا ...... چلو شروع کرو۔"

بڑے جوش سے ایک لڑکی نے پنچم سر کو گھسیٹ کر تار سُر کی لے پر گلے کی آخری جھنجھناہٹ ختم کر دی۔ سُر بہت اُونچا تھا۔ ایسا معلوم ہوا چیل انڈا چھوڑ کر اُڑی اور منڈلا کر دالیں گر پڑی۔ پھر لاکھ

خوشامدوں کے بعد ایک دوسرے کے کہنیاں مار کر منہ پھیر کر ہنس ہنس کر ... چھپا کر ایک لڑکی نے از سر نو تان کھینچی اور کھرج سروں میں ہندوستان کے سارے جہاں سے اچھے ہونے کا عملی ثبوت دینا شروع کیا۔ دم پھولا اُٹھا۔

"بس کرو" انسپکٹرس اُٹھ کر چلنے لگی۔ دل شکستہ اور شرمندہ لڑکیاں چوٹ کھائی ہرنیوں کی طرح بچوں میں اُلجھتی گرتی بھاگیں۔

"ہم جانتے ہیں آپ کا یہ اسکول کیا ہے اور کیوں قائم ہے لیکن ہمیں جان بوجھ کر پست اقوام کے ساتھ رعایت کرنی پڑتی ہے۔ سرکار کی یہی پالیسی ہے۔ ورنہ یہ اسکول دو دن بھی قائم رہنے کا حقدار نہیں" رپورٹ پر اس نے "اطمینان بخش" لکھ کر حقارت سے کہا۔ اور مینجر صاحب نے کھل کر سانس لی۔ . . . . خیر سے بلا ٹلی اور بڑی نہیں ٹلی۔ جلدی سے انہوں نے گلاب جامنوں کی پوٹلی سنبھال لی۔ جو انسپکٹرس نے چھوئی بھی نہیں تھی۔

"اجی یہ اُجڈ کیا جانیں ان نعمتوں کا مزہ!" انہوں نے پیار بھری نظروں سے مٹھائی کو دیکھا اور چل دیئے۔

شمن سارا دن کچھ مردہ دل رہی۔ رعایت؟ آخر کیوں؟ ان نچلے لوگوں کے ساتھ ہر ایک کو دیا ہی سوجھتی ہے کمزور ہیں جاہل ہیں نادار ہیں اسلئے خیرات کے حقدار ہیں۔ تو پھر ان پست قوموں کو دنیا پر سیاہ اور عفونت پھیلائے رکھنے کا حق ہی کیا ہے۔ کیوں نہیں انہیں جیسا ملک کے پیڑ کی جڑ میں لگے ہوئے خطرناک کیڑے کی طرح سپرٹ ڈال کر جلا دیتے۔ یوں نیچا رکھ کر اور پستی میں گراتے جانا تو سراسر حماقت ہے۔ کہتے ہیں۔ اگر بھاری طوفان اور آندھیاں آئیں تو وہ سارے کوڑے کرکٹ کا خاتمہ کر جاتی ہیں۔ یا خدا تو پھر یہاں طوفان کب اُٹھے گا۔ جو ساری پستیوں کو کچے رنگ کی طرح بہا کر کیچڑ کے ساتھ بہا لے جائے گا . . . . . . پھر لوگ پست کو اور پستی کی طرف دھکیلنا تو چھوڑ دیں گے؛

("ٹیڑھی لکیر کا" ایک باب)

احمد ندیم قاسمی

ہیروشیما سے پہلے۔ ہیروشیما کے بعد

لوگ کہتے تھے شمشیر خان وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کی رنگین طبیعت کا تقاضا بھی تھا کہ اس کا چہرہ روشن اور اس کی داڑھی سیاہ ہے۔ لیکن کچھ دنوں سے اس پر بڑھاپا اچانک برف کی طرح گرنا شروع ہوا، اور اس کے سر کے بالوں اور داڑھی مونچھوں کو کھچڑی بنا گیا۔ بڑھاپے کی یہ آسیبی سفیدی اس کے لباس پر بھی اثر انداز ہوئی۔ بنارسی پگڑیوں، ریشمی لنگیوں اور بوسکی کے کُرتے! اور ڈھیلے ڈھالے چوغوں کی جگہ ململ کے پیشاور، ٹخنوں سے بالشت بھر اونچے تہمدوں اور کھدر کی کسی کسائی بنگالی قمیص نے لے لی۔ چہرے کی لالی نچڑ گئی، اور آنکھوں کے کناروں پر مکڑی جیسے جالے پسار دیں۔ اس انقلاب کے باوجود بچوں سے لیکر بوڑھوں تک اور کنواریوں سے لے کر بیواؤں تک اس کی چھیڑ چھاڑ بدستور جاری رہی بلکہ کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر گئی، جب وہ گلی کے نکڑ پر تیزی سے گزرتے ہوئے کسی نوجوان پر پھبتی کستا "ارے بھئی، وہ تو پنگھٹ پر جا چکی"۔ یا چوپال کی پرلی طرف قبرستان کے ایک ویران گوشے میں کسی گبرو کو دبکتا دیکھ کر پکار اٹھتا "آج گاڑی لیٹ معلوم ہوتی ہے"۔ تو لوگ بے اختیار ہنستے اور خود شمشیر کے قہقہے ان سب سے بلند ہوتے۔ مگر ہر روز کوئی اسی کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیتا "شمشیر چچا۔ جانے کیا بات ہے کہ پہلے تم ہنستے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے گھنگھرو سے بج رہے ہوں، اور اب تم ہنستے ہو تو یوں لگتا ہے جیسے چٹانیں لڑھک ۔۔۔ رہی ہوں پربت پر سے، اور پھر نہ تمہاری آنکھیں چمکتی ہیں، نہ چہرہ دمکتا ہے، تم ہنستے ہو تو تمہارے پپڑی جمے ہونٹوں سے خون رسنے لگتا ہے، تمہارے ماتھے کی لکیریں گہری ہو جاتی ہیں، آخر کیا بپتا پڑی ہمارے چچا پر کہ دنوں میں بجھ کر رہ گیا!"

پربت کی چوٹی پر سے لڑھکتی ہوئی چٹانوں کا تانتا بندھ جاتا۔

اور وہ کہتا "یعنی مطلب یہ ہے تمہارا کہ ہم بوڑھے سرے سے ہنسنا ہی چھوڑ دیں، اور یہ نعمت بھی تم نوجوانوں کو سونپ دیں۔ کیوں بھئی؟ ہم نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟ ہم نے تمہیں سپرد کر رکھی ہیں محبتیں، اور راتوں کی ملاقاتیں اور تنہائیوں کے گیت اور لال چہرے اور لو دیتی ہتھیلیاں۔ اب یہ ہنسی بھی چھین لو ہم سے کہ ہم سچ مچ کے بے حیا بن کر رہ جائیں۔ واہ! ۔۔۔ او بھئی، یہ ایک مان سے عطر کی پھریری نکال کر تمہیں بھی تو سنگھاؤں۔ کہتے ہیں جس نے حنا کا عطر نہیں سونگھا۔ اسے ماں نے ابھی جنا ہی نہیں۔"

۔۔۔ اور چٹانوں کا ایک اور ریلا گڑگڑاتا ہوا اتر پڑتا!

لیکن لوگوں کا اندازہ غلط نہ تھا، اگرچہ وہ اس کی وجہ نہیں جانتے تھے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اپنے بیٹے دلیر خان کی شادی پر اس نے محض دکھاوے کی خاطر جو دھوم مچائی تھی، اور سونے چاندی کے زیوروں کے جو انبار لگا دیئے تھے۔ وہ درحقیقت مہاجن کی بھرپور توجہ کا نتیجہ تھے۔ اور شہنائیوں اور گیتوں اور تہنیتوں کے ہنگامے کے بعد جب اس نے حالات کا جائزہ لیا تھا، تو ایک رات گھبرا کر پکار اٹھا تھا "دلیر خان دیا بجھا دو بھئی۔ تیل خواہ مخواہ جل رہا ہے!"

ملحقہ کمرے کے دروازے کی روشن جھریاں اچانک مٹ گئیں۔

اور اس نے لحاف لپیٹ کر سونے کی کوشش کرنا چاہی، مگر کروٹوں کے بہت سے دائرے بنانے کے بعد وہ اٹھ بیٹھا۔ اُسے اندھیرے سے ہول آنے لگا، طاق پر سے دیا سلائی کی ڈبیا اٹھا کر اس نے چراغ جلایا تو ملحقہ کمرے سے آواز آئی "کیا بات ہے ابا؟" ۔۔۔ اور وہ جھنجھلا کر بولا۔ "ارے ابھی تک جاگ رہے ہو تم لوگ؟" ۔۔۔ اور اس نے دیا بجھا کر پھر لحاف کی پناہ ڈھونڈی۔

بار بار اس کے دماغ کو اس احساس کی ان گنت سوئیاں کریدنے لگتیں، کہ وہ اپنی اچھی خاصی پونجی کو برباد کرنے کے علاوہ تین ہزار کا مقروض ہے، اور اب اس کا بیٹا نوجوان ہے اس کی شادی بھی ہو چکی ہے، اب اس کے بچے ہونے لگیں گے، اخراجات بڑھتے جائیں گے، اور زمینیں اجڑتی جائیں گی۔ پہلے سندھ کے پانیوں سے اس کی زمینوں پر ہر سال زندگی کی تازہ تہیں پھیل جاتی تھیں، ان لوگوں پر اسے بہت ترس آتا

تھا جن کی زمینیں دریا سے دور تھیں، جو ہمیشہ بارشوں کے محتاج رہتے تھے، بارشوں کے لیے مسجدوں میں دعائیں مانگتے تھے، غریبوں میں گڑ اور گھنگھنیاں بانٹتے تھے، نفل پڑھتے تھے، اور پھر مایوس ہو کر گالیاں دینے لگتے تھے، لیکن اب سندھ سے ایک بہت بڑی نہر نکالی جا رہی تھی، اور دریا سمٹ اور سمٹ کر بہت دور بھورے پہاڑوں کے قدموں میں رینگ رہا تھا، پچھی بنجر شور زمینوں پر جب وہ مٹر کا اکا دکا پودا دیکھتا اور ڈھور ڈنگر ان دور دور تک بکھرے ہوئے پودوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے، تو وہ بہت دکھی ہو جاتا۔ زمینیں روز بروز بگڑتی اور اجڑتی جا رہی تھیں، اور سندھ کا پانی ان وسیع تھلوں کے صدیوں کے سوکھے سڑے معدوں میں غرق ہو رہا تھا، جن پر نوابوں اور جاگیرداروں کا قبضہ تھا، اور جو ان تھلوں سے بیگانہ رہ کر بھی پہلے سے نہایت شاداب ریاستوں کے مالک تھے۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" اس نے ایک روز ذیلدار سے کہا تھا۔ "کچھ پتہ نہیں پڑتا کہ ایک ہزار غریب کسانوں کی زمینوں کو اجاڑ کر صرف ایک زمیندار کی آسودگی کا سامان کیوں ہو رہا ہے، بھئی یہ بات عجیب الٹی سی ہے، خدا کی ان نعمتوں میں تو ہر انسان برابر کا حصہ دار ہے، دریا کے پانیوں پر بھی کبھی کسی کا قبضہ ہوا ہے بھئی ذیلدار؟"

ذیلدار درشے میں پائی ہوئی نیاز مندی کا مظاہرہ کرتا "شمشیر خاں سرکار جو چاہے کرے، چاہے تو تھلوں میں دریا بہا دے، چاہے تو بھرے بھرے کھیتوں میں آگ لگا دے۔ ایسی باتیں یوں کھل کر نہ کیا کرو، سرکار کو پتہ چلا تو دھر لیے جاؤ گے۔ اور بھئی خدا اور سرکار پر کون انگلی اٹھائے۔"

"مگر دریا کے پانی پر کسی کا اجارا تھوڑا ہے۔" وہ حیران ہو کر کہتا۔

"سرکار چاہے تو ہوا پر بھی لگان لگا دے۔" ذیلدار حسب عادت سرکار کی وکالت کرتا۔

اور پھر شمشیر خاں کے دماغ میں خوش مزاجی کی رَو چلنے لگتی "ہوا پر بھی لگان؟ بھئی سچ مچ اگر سرکار ہوا پر بھی لگان لگا دے، تو عجیب تڑاک پھڑک شروع ہو جائے، ہر پل واویلا مچا رہے، ارے بھئی کیا ہوا؟ کیسا شور ہے؟ — کچھ نہیں بھئی، ادھر اس گھر میں ہوا ختم ہو گئی ہے سارے گھر والے تڑپ رہے ہیں، پانسو کے نوٹ دے کر میراسی کو شہر بھجوایا ہے کہ سرکار سے ہوا کے کنستر خرید لائے — آئے آئے نا ئے! اور چوہدری، ایک بات کہوں، یہ سامنے دادا شہباز بیٹھا ہے نا۔ ہوا پر لگان لگے تو سب سے پہلے یہی دم توڑے گا بچارا۔"

"کیوں؟" کوئی سوال کرتا۔

"ایک تو غریب ہے، صبح کی بگھاری ہوئی دال دوسرے دن شام تک چلتی ہے، اور پھر دمہ کا مریض ہے، ادھر ہوا بند ہوئی، ادھر دادا شہباز انا للہ ہوئے، کیوں دادا؟"

دادا شہباز پچھتر چوہتر برس بڑھاپے کے آخری نقطے کو چھونے کے باوجود سچی بات اور مذاق سے باز نہ آتا تھا۔ پوپلے منہ کو کھجا کر کہتا "ہم تو بھئی مٹکا بھر لیں گے ہوا سے، اور چھپا دیں گے اُسے کوڑے کے ڈھیر میں، جب بھی ہوا نہ ملی، تو کوڑا ہٹایا، مٹکے پر سے ڈھکنا کھسکایا، پھیپھڑے بھر لئے، اور پھر مٹکا بند، تجھے ایک بوند بھی دیں تو نام بدل ڈالنا۔ کنگوار کہہ دینا، ہاں۔"

قہقہے پڑتے، تمباکو کے دھوئیں اٹھتے، کھانسیوں کے پٹاخے چھوٹتے، شمشیر ہر کسی پر پھبتی کستا "ابے آرام سے کھانس، ایسی کھانسی بھی کیا جیسے اونٹ کا گھٹنا ٹوٹے" — "ابے حقہ ادھر گھما، چوہے کی طرح لپٹ جاتا ہے اس سے" — "ابے سنبھل کر بیٹھ، تو نے تو دکان کھول رکھی ہے!" — مگر جب وہ گھر آتا، تو تھلتھلاتے ہوئے پیٹ والا مہاجن دوہری ٹھوڑی میں تہرے بل ڈال کر اُس کے کمرے میں کسی بجری کے رستے آ نکلتا، اور اندھیرے میں سوکھے سڑے پنجے اُس کی طرف لپکتے، اور ملحقہ کمرے کی روشن جھریاں بل کھا کر سانپوں کی طرح رینگنے لگتیں۔ "دیا بجھا دو دلیر" وہ پکار اٹھتا "تیل ضائع ہو رہا ہے۔" — اپنی ہی آواز سن کر وہ چونک اٹھتا، آدھی رات کو اٹھ کر صندوق کھولتا کہ شاید کسی کرنے میں کپڑے کی کسی سلوٹ میں کوئی نوٹ اٹک کر رہ گیا ہو، اور پھر لحاف کی پناہ گاہ میں گھس جاتا — صبح کو اٹھتا تو اس کی کنپٹیوں پر بالوں کا ایک اور گچھا بھوسلا رنگ اختیار کر چکا ہوتا۔

"یعنی ہم بوڑھے ہو رہے ہیں۔" اُس نے ایک روز سوچا، اور بنارسی پگڑی اتار کر پلنگ پر پٹخ دی، اس کے بعد ہر روز سفیدی بالوں کی جگہ لیتی گئی۔ اور لوگ حیران ہونے لگے، کہ شمشیر پر بڑھاپا اچانک یہاں

طرح کیمیں لٹک پڑا،

ایک روز پٹواری نے چوپال پر آ کر خبر دی، کہ انگریز نے جرمن کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا ہے، کمزور قوموں کی حفاظت کیلئے ــــــ شمشیر کی آنکھیں چمک اٹھیں، خلافِ معمول اتنے بڑے واقعہ پر خیال آرائی نہ کی۔ مگر چپ چاپ بیٹھا رہا، چہرے پر کئی رنگ آئے گئے، اور پھر آگئے، آخر تھا، تھک کر گھر آیا، اور دلیر کو الگ لے جا کر کہا، "لام چھڑ گئی، تو نے اس روز کہا تھا، کہ انگریزوں کا پھٹری والا وزیر خواہ مخواہ جرمن کو راضی کر رہا ہے، وہ دھوپ کر رہا ہے، تو نے ٹھیک ہی کہا تھا، شکر ہے تو نے پڑھ لیا، ورنہ ہم ان پڑھ لوگ تو ساری عمر اندھیر نگری میں بسر کر دیتے ہیں۔ تو بات یہ ہے دلیر بیٹا ــــــ"

اُس نے ہزار چاہا، کہ اعصاب کو قابو میں رکھے، اُس کا رنگ نہ بدلے اُس کے ہونٹ نہ کانپیں، اُس کی بھویں نہ لرزیں، مگر اس وقت اُس کی ذاتی غرض نے شفقتِ پدری کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا تھا۔ ایک دم رُک کر وہ سیدھا ہو بیٹھا، اور پھر یوں بولا جیسے اُس نے ساری عبارت برسوں سے رٹ رکھی تھی، "بات یہ ہے دلیر بیٹا کہ پچھلی لام میں جو پڑھا لکھا نوجوان فوج میں بھرتی ہوا، وہ واپس آ کر تحصیلدار اور صاحب ضلع اور کپتان پولس بنا۔ ایسے بھی کئی منصف میں نے دیکھے ہیں، جو بات کرتے تھے، تو یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے فوج کو حملہ کا حکم دے رہے ہوں۔ ــــ تو اب میرے خیال میں اللہ کا نام لے اور بھرتی ہو جا۔ موت سے ڈرنا جوانمردوں کا کام نہیں، یہ گھڑی تو مقرر ہے ٹالے ٹل نہیں سکتی، جنگ کے طوفان سے لاکھوں بچ کر نکل آتے ہیں، اور یہاں کنڈھیلوں کو خربوزہ کھا کر یا چربی کا حلوہ ٹھونس کر یا ویسے ہی بیٹھے بٹھائے ہنستے کھیلتے دم توڑ دیتے ہیں، چل چلاؤ تو لگا ہی رہتا ہے، تو پھر میرے بیٹے، میں چاہتا ہوں، کہ جب تو لام سے واپس آئے تو بہت بڑا افسر بن کر آئے، لوگ تیرا نام لیں تو میں فخر سے اکڑ جاؤں، یقین جانو، اس طرح میرے سفید ہوتے ہوئے بال پھر سے کالے ہونے لگیں گے، دل کا اطمینان سب سے بڑا خضاب ہے۔"

دلیر خاں فوجی سپاہیوں کے کھڑکھڑاتے ہوئے تہمد، دو گھوڑا بوسکی کی قمیص، بنارسی پگڑیاں اور پھر عطر کی پھریریاں اور انگلیوں میں ناچتا ہوا ایک سا بید کلائی پر گھڑی، اور ان سب پر مستزاد فوں فاں اور ٹھاٹھ ــــــ غرض ہر بات سے متاثر تھا، اور یہ تاثرات اُس وقت بہت گہرے ہو جاتے تھے، جب گاؤں کی ہر اٹھتی جوانی عطر کی خوشبو اور انگریزی قسم کی لسواری مٹھائیوں کے چکر میں آ کر محض فوجیوں ہی کا اجارہ بن چلی تھی، ساتھ ہی اُسے اپنے باپ کے قبل از وقت بڑھاپے کا بھی علم تھا، اور وہ یہ بھی جانتا تھا، کہ رات کو گھر میں دیر تک چراغ جلانے کی ممانعت کیوں ہے!

مگر ابھی شاداں کے ناخنوں پر حنا کی نئی نکور لالی مٹنے نہیں پائی تھی، اگرچہ اس نے شادی کے دس روز بعد ہی سارے گھر کا کام سنبھال لیا، اور نئی نویلی سہاگنوں کے پرانے رواجوں کے برعکس گھر کی جھاڑ پونچھ کے علاوہ تا اب سے سب گھر والوں کے کپڑے تک دھلاتی تھی، لیکن آخر وہ ابھی دلہن تھی، اُس کی چوڑیوں کے چھناکے میں ترنم تھا، اس کی آواز کی نرمی میں تازہ غزل کی طراری مترنم دھڑکنیں سی پیدا کرتی تھی، وہ قدم اٹھاتی تھی، تو یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے دوسرا قدم زمین پر نہیں آئے گا، ہوا میں پڑے گا، اور وہ اوپر ابھر جائے گی، اور ابھرتی چلی جائے گی۔ اس کی لانبی آنکھوں کو سرمے کی لکیر ابھی تک نیم خوابی کا خمار بخشنے جا رہی تھی۔ شرماتے وقت ابھی تک اس کا دایاں ابرو اوپر اٹھ کر کمان کا سا خم کھا جاتا تھا۔ اور گوری ٹھوڑی کی گولائی حباب کی طرح کپکپا اٹھتی تھی، دلیر خاں کے نزدیک اتنے بڑے سرمائے کو کھلا چھوڑ دینا بزدلی تھی۔ لیکن جب اعلانِ جنگ کے ساتھ ہی گاؤں نوجوانوں سے خالی ہونا شروع ہوا، اور چند لوگوں نے اس کی ہچکچاہٹ پر پھبتیاں بھی کسیں، تو وہ ایک صبح کو اپنے باپ سے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی دعائیں لیتا اور شاداں کے سلگتے ہوئے لبوں کے گہرے گوشوں کا آبِ حیات پیتا گاؤں سے رخصت ہو گیا۔

دلیر خاں کے جاتے ہی گھر خالی خالی نظر آنے لگا۔ شاداں بھی اداس رہنے لگی، ہر وقت پڑی کھاٹ توڑ رہی ہے، برتنوں میں چڑیاں ناچ رہی ہیں، آنگن میں کوؤں نے اودھم مچا رکھا ہے، سلیقے اور سگھڑاپے کا سارا سحر ٹوٹ گیا، زیور اترنے لگے۔ ریشمی لہنگے کا کنارا زمین پر گھسیٹتے گھسیٹتے بے رنگ ہو گیا، آنکھوں میں بھولے سے سرمہ پڑتا بھی، تو دن ڈھلے تک بہ جاتا، شمشیر اُسے دلاسہ دینے کی کوشش کرتا۔ مگر جانتا تھا، کہ جوانی

ہو محبت عبادت کی حیثیت رکھتی ہے، اور پھر شاداں تو ویسے بھی بیمار ہے۔ اُسے بہت زیادہ کام نہیں کرنا چاہئے ——— لیکن یہ اداسی یہ آنسو یہ جماہیاں ——— " شاداں بیٹی یہ بڑا شگون ہے، جوانمردوں کا کوئی وطن نہیں ہوتا۔ وہ عمر بھر نکھٹو بن کر گھر میں پڑے نہیں رہ سکتے، خدا کے لئے ہنس کھیل مسکرا ——— سنتی ہے شاداں بیٹی ؟"

شاداں شمشیر کی طرف یوں دیکھتی جیسے کہہ رہی ہے "ٹھیک ہے ہنسنا کھیلنا بڑی اچھی باتیں ہیں۔ مگر کس سے ہنسوں ؟ کس کے ساتھ کھیلوں؟ بوڑھے چچا تم کیا جانو ——— تم کیا جانو ؟"

شمشیر سب کچھ جانتا تھا، وہ ہر ہفتے دلیر کے خط کا جھوٹ تراشتا "آج پھر خط آیا ہے " وہ کہتا " وہ لکھتا ہے، شاداں سے کہئے کہ میرے لئے دعا کیا کرے۔ اور اس نے لکھا ہے اگرچہ کڑک اور دھواں دھار طوفانوں کے بعد مطلع صاف بھی ہو جاتا ہے، سورج بھی چمکتا ہے، ہری بھری گھاس بھی اُگتی ہے " ——— شاداں کو کبھی کبھی شک گذرتا کہ چچا جھوٹ بول رہے ہیں۔ آخر اس نے چھ مہینے تو دلیر کے ساتھ گذارے تھے، اور وہ جانتی تھی کہ دلیر مڈل پاس سہی، پر اُسے ایسی باتیں قطعی نہیں آتیں، اُسے تو ماہیے، ڈھولے، ٹپے اور دوہڑے کے سوا اور کچھ معلوم نہیں، یہ تو بڑی دانائی کی باتیں ہیں۔

ادھر شمشیر کے ذہن میں شمشیر اور دلیر کے وزن پر کئی نام گھڑ لئے گئے تھے، مگر ان سب میں شیر خاں اُسے کچھ ایسا بھایا، کہ وقت سے پہلے ہی گاؤں بھر میں اعلان کر دیا۔

" اور اگر لڑکی ہوئی ؟ " کسی نے پوچھا،

" تو شیرنی " شمشیر نے جواب دیا۔

" میں کہتا ہوں اگر نہ لڑکا ہوا نہ لڑکی ہوئی ؟ تو ؟ " دادا شہباز شمشیر کے پوپلے منہ پر گول مول مسکراہٹ ناچنے لگی۔

" عورتیں لڑکا لڑکی کے سوا اور بھی کچھ جنتی ہیں کیا ؟ "

" ہاں ملا "

" کیا ؟ "

" یہی لنگور، گیدڑ، بندر "

لوگ سنجیدہ ہو گئے، کیونکہ موضوع عام نہیں تھا۔ بلکہ خاص شاداں سے متعلق تھا، اور شہباز حسب عادت زیادتی پر اتر آیا تھا مگر شمشیر نے کہا " بھئی چچا، مذاق کا کوئی رنگ روپ بھی تو ہونا چاہئے، یہ کیا، کہ ڈھیلا کھینچ مارا اور کہا، ہم مذاق کر رہے تھے "

" منشی جی سے پوچھ لو " دادا شہباز ہار کب مانتا تھا۔ " امرتسر میں ایک عورت نے بندر جنا ہے، زندہ ہے، اسپتال میں ہے، ماں کا دودھ پیتا ہے، البتہ دم ذرا چھوٹی ہے "

دادا شہباز کا مذاق برداشت کی حد سے باہر ہو چلا تھا، مگر شمشیر کو وہ دن نہیں بھولے تھے، جب اُس نے دادا شہباز کی ایک موٹی تازی شرمیلی بہو کے پیٹ کو تھپتھپا کر کہا تھا " خضر کی عمر اور سکندر کا بخت پاؤ۔ اب آ بھی جاؤ نا "

اور جب بچہ پیدا ہوا، تو وہ سچ مچ شیر ہی نکلا۔ بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، موٹا سر، گول چہرہ، گورا رنگ ——— " یہ دادا شہباز " مارے خوشی کے اُس کے گلے سے اکٹھی آٹھ دس آوازیں نکل گئیں " سنتے ہو؟ شیر پیدا ہوا ہے شیر "

" سچ سچ سچ " دادا شہباز نے ہمدردی کی " ہائے ہائے ہائے انسان کے گھر میں حیوان، تیرے کھیل نیارے ہیں رے مولا، لڑکی ہی ہوتی۔ پر یہ شیر یہ دم والا شیر، شمشیر، میں تمہارے کسی کام آ سکتا ہوں ؟ "

بوڑھے کو بازو سے پکڑ کر گھر لے آیا، ننھا دکھایا، اور پھر اُس کے منہ میں مصری کی ڈلی ٹھونس کر بولا " سیدھی طرح مبارک دے۔ ورنہ دو بڑی ڈلی سے باچھیں چیر ڈالوں گا "

شہباز چوکنے والا کب تھا۔ مصری کو ایک طرف کے جبڑے میں سنبھال کر بولا " ہم سولہ سترہ روپے کے بدلے فرانس کے میدانوں میں جانیں دینے جا نکلے تھے، مصری کی ڈلی کے بدلے باچھیں چیری گئیں، تو ہمارے نیارے ہیں ہمارے، جا نہیں دیتے مبارک ——— " اور پھر سنجیدہ ہو کر اس نے شمشیر پر مبارک بادوں کی بوچھار کر دی،

دلیر ابھی جھانسی ہی میں تھا کہ اُسے باپ بن جانے کی اطلاع ملی فوراً ریشمی کپڑوں کی ایک گٹھڑی پارسل بھجوا دی، ادھر شاداں کو ہنسنے کھیلنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ ادھر شمشیر کے چہرے کی جھریاں مسرت کی لہروں میں ٹوٹنے لگیں، اور اس کی حس مزاح تیز ہونے لگی، اب اُسے ہر مہینے بیٹے کی طرح

سے بیس روپے مل جاتے تھے، اور وہ ہر روز مہاجن کی دکان کے سامنے سے گذرتے ہوئے کہتا تھا "بس ایک سال چاچا، ایک ایک کوڑی چکا دوں گا، پر دیکھیو، وہ جو تم پچاس کے پانسو اور ہزار کے دس ہزار بنا لیتے ہو نا؟ وہ جادو کا کھیل مجھے نہ دکھانا، میں مداریوں سے نفرت کرتا ہوں"۔

مہاجن ہنستا، یہ ہنسی پہلے تو اس کی چندھی آنکھوں میں چمکتی، پھر گالوں کے ابھار میں ہونٹوں کا شگاف پیدا ہوتا اور پیٹ نیم بسمل مرغے کی طرح تڑپنے لگتا، پیٹ کے کافی دیر تک تڑپنے کے بعد اُس کے حلق میں گڑگڑاہٹ پیدا ہوتی، سانسوں میں کشتیاں ہوتیں، اور قہقہہ کھانسی، چھینک اور چیخ کا ایک مرکب بن بن کر اس کے نتھنوں اور ہونٹوں سے ایک دھماکے کی طرح ابل پڑتا، اور پھر ایک زہرہ گداز ڈکار کے بعد مہاجن کہتا "بڑے پاپی ہو تم"

شمشیر خاں اکثر کہا کرتا تھا کہ مہاجن کا قہقہہ سب سے پہلے اس کے معدے میں بیدار ہوتا ہے، چربی کی ایک تہ سے سر نکال کر ادھر اُدھر دیکھتا ہے، ابھرتا ہے، مگر جب ٹھوڑی تک پہنچتا ہے تو بٹ جاتا ہے، ایک حصہ نتھنوں، دوسرا منہ کے رستے باہر نکلتا ہے، تیسرا حصہ ٹھوڑی کی گدگدی آرام گاہ میں لیٹ رہتا ہے، اور جب مہاجن ہنس چکتا ہے، تو یہ بقیہ حصہ ڈکار بن جاتا ہے۔

بہت کم لوگ جانتے تھے، کہ مہاجن کے قہقہے کی طرح اُس کی زندگی کا ہر پہلو اور اس کی ہر حرکت ایک طویل عمل کی عادی بن چکی تھی، لال لانبی پوتھیوں کے ٹاکروں میں سیاہ روشنائی کی ننھی ننھی بندیاں کئی گھروندوں کی تباہی کی ضامن تھیں، اور ہر رات کڑوے تیل کی روشنی میں ان بندیوں میں اضافہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ اور پھر وہ نہایت سبک سے جاتو کی گھر چنی اور وہ گھِسا ہوا موم اور "ہرے رام ہرے رام"۔

ایک روز شمشیر کو دلیر کا خط ملا، کہ اگرچہ وہ ننھے شیر خاں کو دیکھنے کے لئے حد سے زیادہ بیتاب ہے، مگر سرکاری حکم کے مطابق وہ کسی نامعلوم مقام کو جانے کے لئے آج کل کراچی میں ہے، وہاں سے باقاعدہ خط لکھتا رہے گا۔ چند روز کے بعد شمشیر کو معلوم ہوا، کہ دلیر سمندر پار جا چکا ہے، اور اپنی تین چوتھائی تنخواہ اُس کے نام لکھوا گیا ہے۔ شمشیر کا مقصد پورا ہو رہا تھا، لیکن وہ پٹواری سے ہٹلر کی فاتحانہ یلغاروں کے قصے ہر روز سنتا تھا۔ اور ان لوگوں پہ اُسے بہت رحم آتا تھا، جو اس گرجتی گونجتی اور بجلی کی سی تیزی سے بڑھتی ہوئی فوج کے مقابلہ پر ڈٹے ہوئے ہیں "کچھ سنا شمشیر خاں"۔ ایک روز پٹواری نے اُسے ایک خبر سنائی "دس دن ہوئے میں نے تجھے بتایا تھا، کہ جرمن دنیا کے سب سے خوبصورت شہر پیرس میں داخل ہو گئے، اب آج کی خبر ہے کہ فرانس نے جرمنی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے"۔

"دس دن میں سارے ملک فرانس پر قبضہ" شمشیر بولا "حلوے کی طرح نگل گیا کمبخت"۔

"فرانس ہے بھی حلوہ" دادا شہباز چہکا "میٹھا میٹھا، تر و تازہ، رنگ برنگا"۔

اچانک شمشیر سیدھا بیٹھ گیا "یہ فرانس کہیں دور ہے نا منشی جی، کراچی سے کوئی جہاز اگر ۱۱ جون کو چلے تو ۲۲ جون تک فرانس پہنچ سکتا ہے کیا؟"

اُسے تسلی دی گئی، کہ دلیر ابھی فرانس نہیں پہنچ سکا ہوگا۔ مگر اب ہر روز پٹواری اُسے ایک وحشتناک خبر سناتا، اور اس کے چہرے پر جھریاں پھر سے اُبھرنے لگتیں "انگلستان پر ہر روز تڑاتڑ حملے ہو رہے ہیں، مکان جل رہے ہیں، عمارتیں گر رہی ہیں، ملبے کے نیچے سے عورتوں اور بوڑھوں، بچوں کی لاشیں، اور خون کے چھینٹے، انگریزوں کے خون کے چھینٹے، ہمارے حاکم کے خون کے چھینٹے"۔

"بھئی سمجھ میں نہیں آتی یہ بات" ایک سادہ دہقان نے حقے کیلئے تمباکو مسلتے ہوئے کہا۔ "انگریز بھی مرتے ہیں کیا؟"

شمشیر کو جی بہلا دینے کے لئے ایک موضوع ہاتھ آ گیا "نہیں نہیں میرے عزیز، انگریز کہاں مرتا ہے، انگریز تو قطب صاحب کی لاٹھ ہے، ساگوان کا شہتیر ہے، فولاد کا ڈھانچہ ہے، میرے بھائی، انگریز بھی تو ہم جیسا انسان ہے، فرق صرف اتنا ہے نا کہ وہ گورا ہے اور ہم ذرا سانولے ہیں، اُس کے پاس جہاز ہیں، ہمارے پاس اونٹ، اُس کے پاس بندوقیں ہیں، ہمارے پاس لاٹھیاں، اس کے پاس کپڑے کی مشینیں ہیں اور ہمارے پاس بوستان جولاہے کی کھڈی، جس میں اس کا ننھا بچہ گر کر اللہ میاں

کے ہاں سدھار گیا تھا بے چارا ۔ اور پھر انگریز کے پاس جو چل ہے اور ہمارے پاس دادا شہباز، جو آدھے کا ڈھلانی موڑ کاٹتا ہے تو ایک قدم پر پندرہ بار کھانستا ہے، اور جس کی بیگھہ بھر زمین میں سرکاری سڑک گزرنے والی ہے :

اور پھر پٹواری نے روز ایک تازہ پھڑکتی ہوئی خبر سنانا شروع کی۔

"آج گاندھی جی نے ہر انگریز سے اپیل کی ہے، کہ وہ جرمنوں پر اپنا دروازہ کھلا چھوڑ دے، ! دروازے سے کسی قسم کا لین دین نہ کرے، جرمن خود ہی تنگ آ کر واپس جرمنی چلے جائیں گے "۔

واہ رے میرے ملنگ سائیں، تیری دور بلائیں " شمشیر حاشیہ آرائی کرتا۔ " دشمن کچھ ایک چٹکی تک نہ لو، تو پھر دشمنی کا ہے کی! دروازہ کیوں کھلا چھوڑ دو، لٹھ کیوں نہ جاؤ تالو پر کہ بھرکس نکل جائے، مائے، کتنا جی چاہتا ہے کہ گاندھی جی چرخے کی تکلی پر سوت کاتنے کی جگہ اس سے کسی دشمن کی آنکھ نکال لیتے "۔

" دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی " دادا شہباز نے کہا " اور ادھر سے حکم ملتا ہے، کھڈیاں بناؤ "۔

بات معقول تھی، مگر وہ شمشیر ہی کیا جو دادا شہباز کی بات نہ کرے۔

"تم نے یہ بال کڑکتی دھوپ میں سفید کئے ہیں دادا ۔ ہو سکتا ہے کھڈیوں کے بہانے مورچے بنوائے جا رہے ہوں "۔

"اور یہ دروازے کھلے چھوڑ دو ؟"

"یعنی اندر آتے ہی دبوچ لو "۔

"اور یہ چرخہ چلاؤ ؟"

"یعنی چرخہ چلاتے ہوئے کسی سے چل جائے تو تکلی چبھو دو، ہتھی دے مارو گلے پر "

"لٹھ کیوں نہ دے مارو کھوپڑی پر؟"

"اس طرح دشمن خفا ہو جاتا ہے نا بھولے دادا —— ہاں تو منشی جی کوئی اور خبر؟"

"انگلستان نے فرانس کے بیڑے پر قبضہ کر لیا ہے، زبردستی"۔

"یعنی گاندھی جی کی نصیحت نہیں مانی!"

چوپال پر گپوں اور قہقہوں کے ہجوم میں وہ بہت حد تک بہلانے شمشیر کے روپ میں اجاگر ہو جاتا، مگر گھر لوٹتے ہی اس کا ضمیر اس کے چٹکیاں لیتا، دلیر کو جنگ پر بھیجنے کا مقصد اس کے سامنے آتا، تو وہ اپنے آپ کو نہایت کمینہ، ذلیل اور خود غرض محسوس کرتا، پریشان ہو کر اندھیرے میں آوارہ پھرتا رہتا، اور جب کہیں چین میسر نہ آتا، تو صندوق کھول کر دلیر کا بھیجا ہوا روپیہ گننے لگتا!

اُنہیں دنوں دلیر کا خط آیا، کہ وہ اب مصر میں ہے، اور خوب مزے میں ہے، اور مصری اذان بڑی سُریلی ہوتی ہے اور مصری لوگ بڑے اچھے ہوتے ہیں، اور ہم روز تماشے دیکھتے ہیں، سیریں کرتے ہیں۔ اور —— " یعنی جنگ کا ذکر تک نہ تھا۔ شادا‌ں نے یہ سُنا، تو شمشیر کو چھاتی ہوئی صحن میں بھاگ گئی، اور شمشیر خط کو دوبارہ اور پھر سہ بارہ پڑھوانے کیلئے پٹوار خانے کے چکر کاٹنے لگا۔

—— "اٹلی نے سمالی لینڈ پر حملہ کر دیا"۔ ایک دن پٹواری نے خبر سنائی۔

"سمالی لینڈ مصر کے قریب ہی ہے"۔

" ارے ! "

—— "ایک ہزار جرمن ہوائی جہازوں نے انگلستان پر حملہ کیا "

"خدا کی پناہ ۔ یعنی ٹڈی دل ہوائی جہازوں کا !"

—— "اٹلی نے مصر پر حملہ کر دیا"۔

" —— "

گاؤں والوں کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا، کہ انہوں نے شمشیر کی آنکھوں میں آنسو دیکھے، وہ چپ چاپ چوپال پر سے اُٹھ کر گھر کو چل دیا، اپنے کمرے میں آ کر اُس نے صندوق کھولا، اور دلیر کی کمائی کو فرش پر بکھیر کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ وہاں سے اُٹھ کر دھم سے پلنگ میں گر پڑا، شاداں بھاگی آئی، تو شمشیر بولا "نہ جانے اب تک کیا کچھ ہو چکا ہوگا، دُعا کر بیٹی، دعاؤں کا تانتا باندھ دے، اتنی دعائیں مانگ کہ اللہ میاں کے دربار میں شور مچ جائے، رو رو کر، بلک بلک کر، سسک سسک کر دعائیں مانگ، دلیر کی زندگی کے لئے دعائیں مانگ، اور مجھ پر لعنتیں بھیج، کہ میں نے قرض اتارنے کے لالچ میں اپنے اکلوتے لعل کو آگ کی بھٹی میں جھونک دیا، یہ نہ سوچا کہ میں اجڑ جاؤں گا، یہ نہ سوچا کہ شاداں میری اچھی بیٹی کا سہاگ ابھی نیا نویلا ہے، یہ نہ سوچا کہ —— "

اس کا گلا رندھ گیا، اور سر تکیے پر رکھ کر رونے لگا۔

شاداں چلی گئی۔ شیر کو فرش پر بٹھا کر شمشیر کی پیٹھ پر دونوں ہاتھ رکھ کر بولی: "میرے چچا! کچھ بتاؤ تو سہی آخر کیا ہوا؟ کچھ تو کہو"

شمشیر نے بازو سے اپنی آنکھوں کو چھپا کر کہا: "دیر مصر میں ہے اور مصر پر اٹلی نے حملہ کر دیا ہے۔ اب وہاں جہاز بم برسا رہے ہوں گے، توپیں چل رہی ہوں گی، بندوقوں کی تڑ تڑ اور گرد و غبار اور دھواں اور دھائیں دھائیں ——— میرا نازوں سے پالا دیر، میری حرص کا شکار دیر، میرے دیر، میرے ———" وہ پھر رونے لگا۔

چھ مہینے تک شمشیر اور شاداں کے آنسو خشک نہ ہوئے اور دعائیں بند نہ ہوئیں، مزاروں پر دیئے جلے، بھکاریوں میں گڑ بانٹا گیا، بکرے قربان ہوئے، دونوں ایسے حواس باختہ ہو گئے، کہ رات کو گھر میں دیا تک نہ جلتا اور اگر جلتا تو جلتا ہی رہتا، کپڑے میل سے اٹ جاتے تو یونہی رسماً تھوڑا تھاپ کر الگنی پر ڈال دیے جاتے، شیر بیمار پڑتا تو کسی آتی جاتی بڑھیا سے دوا پوچھ لی جاتی۔ چوپال پر پٹواری سے لوگ نئی خبروں کا تقاضہ کرتے تو وہ کہتا۔ "یوں تو نئی خبریں تو بہت ہیں، پر اگر چچا شمشیر نہ ہو تو بات کا سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے، اسے آنے دو" ——— مگر شمشیر کو اب چوپال پر بیٹھ کر گپیں ہانکنے کی فرصت ہی کہاں تھی، وہ نوجوان تک اداس ہو گئے تھے۔ جن پر نہایت کڑی مگر شگفتہ تنقید کر کے وہ قہقہوں کا طوفان مچا دیتا تھا۔

چھ مہینے کے بعد اسے دیر کا خط ملا، کہ لڑائی میں اس کے کندھے پر معمولی سے زخم آئے تھے، اور اب وہ تندرست ہو کر عنقریب "انڈیا" آنے والا ہے۔

"انڈیا؟" اس نے پٹواری سے پوچھا،

"ہاں۔ یعنی ہندوستان"

"یہ انگریزی ہے؟"

"ہاں"

"یعنی دیر اب انگریزی بھی جانتا ہے؟"

"یہی معلوم ہوتا ہے"

"اری شاداں بیٹی" وہ گھبرا کر پکارا، "کچھ سنتا ہے؟ دیر انگریزی بھی بولنے لگا، اور اب واپس آ رہا ہے، اور دیکھ۔ وہ مرغی پھر رہی ہے نا۔ وہ گوری سی، بانجھ کمبخت، جو بڑے نخروں کے ساتھ تین مہینے بعد ایک ذرا سا انڈا برآمد کرتی ہے، اسے ذبح کرا لے، اور ساتھ ہی گردھر کی دکان سے خوشبو چاول لے آ اور دیکھ، بڑے مٹکے میں جو گڑ پڑا ہے نا، وہ بچوں میں بانٹ دے ——— ہاں" ——— باہر گلی میں آکر وہ خواہ مخواہ ایک نوجوان کے پیچھے پڑ گیا "ارے طرے باز! ارے بائیں مڑتے ہوئے دائیں دیکھنے والے، بات سن پگڑی کو اتنی کلف نہیں لگانی چاہیے کہ اچھی خاصی ملائم ململ ٹین کا پترہ بن کر رہ جائے!"

شمشیر پھر چوپال کی رونق بن گیا، "جنگ کی کوئی نئی خبر؟" اس نے پٹواری کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "کوئی تر و تازہ خبر ہو بھئی، ننھے ننھے گاؤں اور چھوٹی موٹی کھاڑیاں اور تل بھر کے جزیرے، انہ نہ بہت ہو چکیں یہ باتیں، کوئی ایسی خبر سناؤ منشی جی، کہ او سالوں کو ٹھکانہ ملے"

داد شہباز ایک بڑھے سے کسی بلغم توڑ نسخے کے اجزا پوچھ رہا تھا، یکایک چونکا۔ دھکیل کر شمشیر کے سامنے آ گیا۔ "کیا کہا میاں شمشیر؟ ہائے ہائے، انسان بھی کتنا طوطا چشم ہے قرآن کی قسم ——— ارے تمہارا دیر مصر میں تھا تو تم وہاں کے ہر ٹیلے کی خبر سنتے تھے، اور اب تمہارا دیر مصر سے واپس آ رہا ہے، تو تم ننھے منے گاؤں اور چھوٹی موٹی کھاڑیوں کا ذکر ہی نہیں سنو گے؟ کوئی بہت بڑی خبر سنو گے تم؟ تو بھئی جنگ کی بہت بڑی خبر تو وہی ہوتی ہے نا جس میں ان گنت انسان کھیت رہیں، اور میاں شمشیر، جو جوان تمہیں بہت بڑی خبر سنانے کیلئے جانیں دیں گے، ان کے بھی تو باپ ہوں گے، ان کی بھی نئی نویلیاں بیویاں ہوں گی، اور معصوم بچے اور پیارے دوست اور ہمدرد رشتہ دار، ان کی امیدیں اور ان کے حوصلے، چاہے وہ جرمن ہوں چاہے انگریز چاہے ہندوستانی، میں انسانوں کی بات کر رہا ہوں"

شمشیر کا چہرہ ایک خوفناک ندامت آمیز سنجیدگی کے ہالے میں گھر گیا۔ مٹی ہوئی جھریاں پھر سے ابھر آئیں، پہلو بدلا، اور سر پہ ہاتھ پھیر کر شہباز کی طرف دیکھا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو چچا" ——— اس کی آواز کھوکھلی تھی، اور بج رہی تھی، اور اس میں گھبراہٹ کے اتار چڑھاؤ تھے۔ "میں نے تو ویسے ہی بات کی تھی، کہ ——— بات یہ ہے دلوا کہ تم

ٹھیک کہتے ہو۔"

"میں نے غلط بات کب کہی ہے ؟" شہباز اُلجھ رہا تھا۔

"صرف اب۔" شمشیر موضوع کو بدلنا چاہتا تھا۔

لوگ ہنس پڑے

"میرا مطلب ہے، میں نے کبھی نہیں کہی —— "

"سچ بات"۔ شمشیر نے دادا شہباز کا فقرہ پورا کر دیا، اور چوپال قہقہوں سے گونج اُٹھی،

مگر شہباز اپنے احساسات کی تلخی سے ابھی تک پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا، بولا "تم مجھ سے بہت چھوٹے ہو۔ شمشیر اور تم نے مجھ سے کم دنیا دیکھی ہے، پچھلی لام کو ان آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، سینکڑوں جرمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اور سچ کہتا ہوں۔ دشمن کی ہر لاش سے میرے دل کا ایک ٹکڑا چپک کر رہ گیا۔ اندھیری گرجتی دہاڑتی راتوں میں مردہ جسموں سے ٹھوکریں کھائیں، اور ٹھوکر کھا کر گرا بھی تو لاشوں پر۔ کسی کی انتڑیاں باہر پڑی ہیں، کسی کا بھیجا چٹان پر بکھر گیا ہے، کسی کی ٹانگیں غائب ہیں، کوئی مرنا چاہتا ہے اور مر نہیں سکتا۔ کوئی جینا چاہتا ہے مگر جی نہیں سکتا، میں نے ایک روز ایک لاش دیکھی، جرمن سپاہی تھا، اتنا خوبصورت کہ مورت چھاپ لینے کو جی چاہے، میں نے اس کی جیبیں ٹٹولیں، تو اندر سے سنہری بالوں کا ایک گچھا نکلا۔ اور کسی پھول کی چند سوکھی پتیاں، اور ایک بڑی پیاری تصویر —— ایک لڑکی کی —— جس کی آنکھیں اتنی گمبھیر تھیں قرآن کی قسم، کہ جہان ڈوب جائے، اور اس کی آنکھیں جیسے پوچھ رہی تھیں۔ "سچ سچ کیا تم واپس نہیں آؤ گے ؟" میری آنکھوں میں آنسو آگئے، توپوں کی دھائیں دھائیں اور دھوئیں اور دھول کی اُس دنیا میں میری آنکھوں میں آنسو آگئے، میں نے یہ تینوں چیزیں اُس کی جیب میں ڈال دیں، اُس کے چہرے کو دیکھتا رہا اور میاں شمشیر، میری بات سننا، میں سچ کہتا ہوں میں چیخ کر پیچھے ہٹ گیا، اس کے منہ سے اچانک چند مکھیاں نکلیں، اور اُس کے نیلے ہونٹوں اور ننھی ننھی سنہری مونچھوں پر بیٹھ کر بھنبھنانے لگیں —— یہ نوجوان بھی تو دنیا کو بہت بڑی خبر سنانے کے لئے مرا —— اور میں نے ان تمام خونوں کے بدلے سات روپے پنشن پائی۔

—— یہ سات ٹھیکریاں —— یہ سات لعنتیں ——" دادا شہباز کی آواز بھرّا گئی، اور وہ لاٹھی سنبھالتا چوپال پر سے اُتر گیا۔

"دادا"۔ شمشیر نے اُسے پکارا۔

وہ بغیر مڑے بولا "میں پاگل ہو جاؤں گا، مجھے جانے دو۔"

"دادا"۔ شمشیر ننھے بچے کی طرح پکارا، اور پھر سر جھکا کر بیٹھ گیا ایک مجرم کی طرح، شرمندہ اور نڈھال —— جیسے دُنیا کی ساری جنگوں کا ذمہ دار صرف وُہی ہو۔

صبح کو اُٹھا، تو شاداں کے چہرے پر غیر معمولی تازگی دیکھ کر اُس کا احساسِ مسرت پھر سے جاگ اُٹھا، اور جرمن سپاہیوں کی لاشیں ایک طرف سرک گئیں، "دلیر آرہا ہے" —— "دلیر مصر سے بخیریت واپس آرہا ہے" —— اس کی ذاتی تسلی کے لئے یہی خیال کافی تھا، اور دادا شہباز کی بھرائی ہوئی آواز اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں —— "اور میں پاگل ہو جاؤں گا" —— بڑھاپا کتنا ذکی الحس ہوتا ہے، اُس نے سوچا،

بڑھاپا کتنا ذکی الحس ہوتا ہے، اُس نے ایک مرتبہ پھر سوچا یعنی دلیر آرہا ہے، تو آ کر واپس بھی تو جائے گا۔ اور واپس لاہور یا دلی تو نہیں جائے گا، جنگ پر ہی جائے گا۔ اور جنگ سے اِنسان ایک مرتبہ بچ نکلے، تو اس کا یہ مطلب تو نہیں، کہ ہمیشہ بچتا چلا جائے۔

دادا شہباز۔ قتلے کر ڈالوں تیری زہریلی زبان کے —— بات کیا تھی اور تو نے کہاں پہنچا دی!

اُس نے بہت کوشش کی، کہ مسکرائے، قہقہے لگائے، بھنبیلا کسے، مگر اُس کے ذہن پر اچانک ایک خوبصورت چہرہ اُبھرتا، اور بہ نیلے ہونٹوں اور سنہری مونچھوں پر مکھیاں بھنبھناتیں، اور کلیجے میں کرچ سے سنگین پیوست ہو جاتی اور انتڑیاں باہر ابل پڑتیں —— وُہ شاداں سے کہتا "بیٹی کوئی بات سناؤ" —— مگر وہ مسکرا کر بات کاٹنے لگتی۔

"ارے بھئی کوئی بات سناؤ!" وہ گلی کے نکڑ پہ بیٹھے ہوئے لڑکوں سے کہتا،

"دلیر کب آئے گا ؟" سوال کا جواب سوال ہی میں ملتا۔

"دلما گھر کی بات سناؤ" اُس نے چوکے لگانے والے شہباز سے
بہم کی التجا کی،

"بات ؟" بڈھے نے پوچھا "یعنی کوئی بہت بڑی خبر ؟"
اور شمشیر کے جی میں آئی کہ ہڈیوں کے اِس ڈھانچے کو توڑ مروڑ کر
ہوا میں پھینک آئے!

چند روز بعد اُسے دلیر کا خط ملا کہ وہ گھر نہیں آئے گا۔ کراچی
پہنچتے ہی اُس کی رجمنٹ رنگون چلی گئی ہے اور رنگون سے سنگاپور
جانے کا مقصد ہے۔

"دلیر نہیں آرہا" ایک دھماکے کی طرح یہ الفاظ اُس کے لبوں
سے نکلے، اور شاداں جو مسالہ رگڑ رہی تھی، دم بخود ہوکر دیوار سے
لگ کر بیٹھ گئی،

"دلیر نہیں آرہا، وہ رنگون جارہا ہے" اُس نے دادا شہباز
کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے چوپال پر اعلان کیا۔

"بہت بڑی خبر ہے بھئی" دادا شہباز کی لے ابھی نہیں ٹوٹی
تھی،

شمشیر بگڑ گیا "دیکھو دادا۔ بہت لحاظ کیا تمہارا۔ تم چند دنوں
سے ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہو، یہ اچھی بات نہیں، میں تمہارے
سفید بالوں کی عزت کرتا ہوں ورنہ ——" اور وہ غصّے سے کانپتا
ہوا چوپال پر سے اُٹھ آیا،

پٹواری نے آواز دی "جنگ میں یونہی ہوتا ہے چچا"۔
اور شمشیر نے پلٹ کر پٹواری کی طرف یوں دیکھا، جیسے بس چلے
تو اُس کی کھوپڑی ادھیڑ کر رکھ دے،

لیکن اُسی روز ایک شہباز یا پٹواری کیا، وہ سارے گاؤں سے بگڑ
گیا، شاداں تک کو جھڑک دیا "دبے کی زبان ہوتی تو شاید یہ مرچیں اثر
کرتیں، مگر اب تو گلے سے ناف تک جلتا ہوا تنیذ رکھ دیا ہے تمہارے
سالن نے —— بڈھوں کو جان سے مارنے کے اور بھی تو طریقے ہیں کنگر
جاد و کنپٹی پر۔ کڑاہی دے مارو ماتھے پر —— لے جاؤ، میں
نہیں کھاؤں گا"

مگر آہستہ آہستہ وہ سنبھل گیا، اس کا بیٹا رنگون میں تھا، اور اُس کے
خیال میں یہ ناممکن تھا، کہ جنگ مغرب سے ہٹ کر ہزاروں میل کی الٹی چھلانگ
بھرے اور مشرق کے مرغزاروں میں ناچنے لگے "مشرق میں کیا رکھا ہے"
پٹواری نے کہا تھا "مشرق کے لئے دوسرے ہم اور تو ہیں تھوڑی ہیں کہ
اب یہ تکلف بھی کیا جائے!"

"ایک جاپان ہے" دادا شہباز نے جہاندیدہ سیاستدان کے
سے انداز میں کہا تھا "سو کبھی نہانے گی یا اور بگڑے گی گیا، برسوں سے
سر پیٹ رہا ہے پر یہ انگریز ابھی تک اس کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے ہیں۔
اور بھئی جاپانی مال تو تم جانتے ہی ہو۔ جاپانی کھلونے، اِدھر بچے کے ہاتھ
میں آئے اُدھر دانت نکال بیٹھے، اور جاپانی ریشم کے کپڑے۔ ایک
تاگا ٹوٹ آئے تو سمجھو سارا تانا بانا اشارے کا منتظر ہے۔ اِن کے جہاز
بھی تو ٹین کے بنے ہوتے ہیں، اور ان کے سپاہی ٹھنگنے، ناٹے، ہم یوں
جا کر اُن کی کھوپڑی پہ تھپڑ مارو تو زمین میں دھنس جائیں"

"نہیں نہیں" پٹواری نے دادا شہباز کو ٹوکا تھا "یہ بات تو
نہیں دادا۔ مگر جنگ ابھی اِدھر نہیں آئے گی۔ جنگ زندہ لوگ لڑتے ہیں
لاشوں نے بھی کبھی لڑائیاں کی ہیں بھولے بادشاہو"۔

اُدھر دلیر کے خط پر خط آرہے تھے، رنگون کے پگوڈے، برما کے
جنگل، ناریل اور کیلے، اور —— "ہم بڑے مزے میں ہیں، رنگون
برما کی جنت ہے، جنگ نہ ہوتی تو میں شاداں، شیرا اور آپ کو یہاں بلا لیتا"
شمشیر پٹواری کے پاس دوڑا آیا "کیا رنگون میں بھی جنگ ہورہی ہے
منشی جی ؟"

پٹواری نے کان پر قلم دھر کر کہا "یہ جنگ کہاں نہیں ہورہی چچا"
جنگ صرف توپ بندوق کی تو محتاج نہیں، بھوک کی بھی تو جنگ ہوتی
ہے، غلامی کی بھی جنگ ہوتی ہے، انتظار کی بھی جنگ ہوتی ہے، جنگ
ہر جگہ ہو رہی ہے، رنگون میں بھی ہو رہی ہے، ہمارے گاؤں میں بھی ہو
رہی ہے، یہ ازلی و ابدی جنگ، یہ جنگ جو کبھی ختم نہ ہوگی۔ یہ جنگ جو
دریا سے نہریں نکالتی ہے، جو سرسبز کھیتوں میں سے سڑکیں گزارتی ہے،
جو پانی پر لگان لگاتی ہے، جو پولیس کے سپاہی کو نمرود کے اختیارات
بخشتی ہے، جو غریبوں کے کھدر میں جوئیں ڈالتی ہے، جو امیروں کے
ریشم میں گھٹیا کی صورت میں پروان چڑھتی ہے، تم ہر روز جنگ جنگ

پکارتے ہو، جنگ ہر جگہ جاری ہے، ہماری زندگی خود ایک جنگ ہے"

"مگر جنگیں ختم بھی تو ہوتی ہیں"

"نہیں، کئی ایسی جنگیں بھی ہیں جو قیامت تک جاری رہیں گی، اب یہ جنگ ختم نہ ہوگی تو ایک نئی جنگ آ دھمکے گی۔ وہ امن کی جنگ ہوگی، امن قائم کرنے کیلئے تجارت کی جنگ ہوگی، تجارت بڑھانے کے لئے سمندری راستوں کی جنگ ہوگی، ان کے عقب میں انسان کے پیدائشی حقوق کی جنگ ہوگی، اور جب یہ جنگ ہوگی ——— جب یہ جنگ ہوگی ———"

اور پٹواری نے کان پر سے قلم اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا اور بولا "کھتونی کہاں گئی؟"

چند روز کے بعد اس نے پٹواری سے خبر سنی "جاپان نے امریکہ پر حملہ کر دیا" اور پھر اتنے ہی روز بعد اسے معلوم ہوا کہ جاپان نے سنگاپور لے لیا۔

مگر دلیر تو رنگون میں تھا، اور رنگون سنگاپور سے بہت دور ہے، گھر آ کر اس نے شیر کو اٹھایا، اور صحن میں ٹہلنے لگا "تیرا ابا رنگون میں ہے اور جنگ ہو رہی ہے سنگاپور میں۔ اور سنگاپور بہت دور ہے رنگون سے"۔ بچے نے ناک پر ہاتھ رگڑ کر دادا کے بال پکڑ لئے، اور جب بڑی مشکل سے اس نے بچے کی گرفت ڈھیلی کی، تو بچہ رونے لگا، شاداں بھاگی آئی، اور وہ رو رہی تھی، اس کی آنکھوں کے ڈوروں میں خون تھا۔ اس کے گالوں میں خون تھا۔ اس کے ہونٹوں پر خون تھا۔
اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ شمشیر نے محسوس کیا کہ ساری کائنات پر انسانی خون کے چھینٹے بکھر گئے ہیں، لاشیں پہیوں تلے چیخ رہی ہیں۔ کھوپڑیاں فضا میں اڑتی پھر رہی ہیں، کسی آسیبی ہاتھ نے افق پر سے لپک کر کھیتوں کی ہریاول کو نچوڑ لیا ہے، اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے جس میں تازہ خون کی بو ہے، سڑتی ہوئی نعشوں کی بو ہے، جھلسے ہوئے چمڑے کی بو ہے،

"دیا جلاؤ" وہ پکارا

کچھ دیر تک انتظار کرنے کے بعد وہ پھر تڑک کر اٹھا، اور صحن میں جا کر چنگھاڑا "شاداں میں بک رہا ہوں، دیا جلاؤ"

وہ اس وحشتناک خاموشی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا، انت

بھینچ کر چلایا "دیا جلاؤ شاداں مجھے اندھیرا لگ جائے گا"

دروازے پر کسی کی دستک ہوئی "کون ہے؟" وہ اسی غصّے سے پکارا۔ اور دروازے تک گیا۔ مہاجن کی ٹھوڑی جھٹیٹے میں تھیلی کی طرح لٹک رہی تھی "اب کے تم نے قسط نہیں دی"

"نہیں دوں گا قسطیں" شمشیر نے کواڑ پر گھونسا جما کر کہا "کب تک دیتا رہوں گا قسطیں، میں نے تمہاری قسطوں کے لئے اپنا بچہ موت کے منہ میں ڈال دیا، اپنے آنگن کی رونق لٹا دی، اپنی روح کو نچوڑ کر تیری پیاس بجھانی چاہی، پر تیری پیاس نہیں بجھے گی، تو نے میرے دلیر کو رڑکا۔ اب تو میرے شیر کو بھی چبائے گا ——— جا نہیں دیتا قسطیں، بتا لے جا کر اپنے ہونوں سوتوں کو ——— نالش کر دے ———"

پیچھے سے شاداں نے آ کر اسے کھینچ لیا "آپ کس سے بول رہے ہیں سیٹھ تو چلا گیا"

"دیا کیوں نہیں جلایا تم نے؟"

"جلایا ہے"

"کہاں جلایا ہے؟ کدھر جلایا ہے؟ جلایا ہوتا تو ———" مگر دیا جل رہا تھا، اور دیئے کی روشنی میں شاداں کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ خود شمشیر کا سارا وجود جل رہا تھا، وہ دھم سے بستر پر جا گرا، بہت دیر کے بعد کروٹ بدلی، اٹھ بیٹھا، سر کو دبایا۔ اور ہولے سے بولا "شاداں بیٹی، ذرا ادھر آ کر دیا بجھا دے، تیل ضائع ہو رہا ہے خواہ مخواہ"

دلیر کی خاموشی اور خطرناک ثابت ہوئی، قسم قسم کے وسوسے شمشیر کو پریشان کرنے لگے، شاداں گھلتے گھلتے کانٹا ہو گئی، اس کا دودھ خشک ہو چلا تھا، پڑوس کے دھوبیوں سے وہ بکری کا دودھ خرید لاتی تھی۔ مگر شیر ہمک ہمک کر ماں کے سینے سے چمٹ جاتا، ادھر پٹواری نت نئی اور خطرناک خبریں سنانے لگا۔ دادا شہباز شمشیر کو بہلانے کی کوشش کرتا، مگر شمشیر مری ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ ٹال جاتا، ہر روز مدرسے جاتا۔ جب ماسٹر جی ڈاک کھولتے تو وہ بت بنا ایک طرف کھڑا رہتا ——— "تمہارا خط نہیں آیا چچا" ماسٹر جی کہتے، اور وہ سر جھکائے گھر کو پلٹ آتا۔

ہر صبح کو مدرسے میں سارا گاؤں جمع ہوتا تھا۔ سب اپنے اپنے بیٹوں، بھتیجوں، نواسوں اور پوتوں کے خط لینے آتے، اور دکھوں کی گٹھڑیاں

اٹھاکر واپس جاتے، اور پھر ایک دن اچانک ڈاک کے بھرے بھرے تھیلے میں سے سرکاری خطوط کا ایک ڈھیر سا برآمد ہوا، ایک خط شمشیر کے نام بھی تھا۔ اُسے سرکار نے اطلاع دی تھی، کہ دلیر جاپانیوں کا قیدی ہو چکا ہے،

خط کھلتے جاتے تھے، اور آنکھیں بھیگتی جاتی تھیں، اچانک ایک طرف ایک بوڑھے نے چٹاخ سے اپنی گنجی کھوپڑی پر ہاتھ مار کر کہا "میں اجڑ گیا" —— اور پھر ہر طرف سسکیاں اور فریادیں اور شیون —— ڈاکخانہ ماتم کدہ بن گیا، کوئی جنگ میں مارا گیا تھا، کسی کا کچھ پتہ ہی نہیں تھا، کوئی جاپانی قیدی تھا —— آن کی آن میں گاؤں کے بہت سے گھروں میں واویلا مچ گیا، چھاتیاں کوٹی جانے لگیں، بال نوچے جانے لگے، گلیوں میں بھگدڑ مچ گئی، "جنگ ہر جگہ ہے" شمشیر کے کانوں میں ٹوری کے الفاظ گونج رہے تھے۔

"شاداں۔ شاداں!" اور صحن کے کونے میں بیٹھی ہوئی شاداں نے سر اٹھایا، اس کی آنکھیں سوج رہی تھیں اور کھلے بال زمین کو چھو رہے تھے۔ "میں سن چکی ہوں" اُس نے بلکتے ہوئے کہا،

"شیر کہاں ہے؟" شمشیر نے پوچھا،

"پڑا ہوگا کہیں" شاداں گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔

شیر اندر کمرے میں ایک کھٹولے کے نیچے لڑھکتا پھر رہا تھا۔ اسی نے منہ میں مٹی تھی، اور بالوں میں تنکے اٹک گئے تھے، شمشیر نے اُسے اٹھایا، چوما، چوم چوم کر اُسے نڈھال کر دیا، اور پھر اُسے شاداں کے پاس بٹھا کر بولا "یہ سب میرا کیا دھرا ہے، مجھ بوڑھے کا، مجھ خناس کا، بیٹے کو یوں جنگ میں بھیجا جیسے جہاد کا حکم مل چکا ہے، —— میں —— میں —— " مگر اُس نے اچانک محسوس کیا کہ یہ مقام اور یہ موقعہ ایسی باتوں کا نہیں، پلٹ کر اپنے پلنگ پر آیا، وہاں سے اٹھ کر مرحوم نوجوانوں کے والدین کے پاس جا نکلا۔ ایک گھر میں اُسے پٹواری مل گیا۔ بولا "بڑا افسوس ہوا چچا"!

شمشیر نے ہاتھ اٹھا کر انگلیوں کو ایسا چکر سا دیا، جیسے کہہ رہا ہے "قسمت"

"تم جب اپنے کلیجوں کے ٹکڑوں کو جنگ کی بھٹی میں جھونک رہے تھے، تو تمہیں یہ کسی نے نہ بتایا کہ —— " اُس وقت ذیلدار فاتحہ خوانی کے لئے آ نکلا۔ اور پٹواری دبک کر دیوار سے لگ گیا،

جاپان کی فاتحانہ یلغار برق رفتاری سے بڑھ رہی تھی، اِدھر جرمنی نے اتحادیوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ مگر اب گاؤں والے بالکل بے حس تھے، جیسے جنگ کے ساتھ اُن کی ساری دلچسپی اور وابستگی اُن کے بیٹوں اور پوتوں کی وجہ سے تھی، اور جب وہ کٹ مرے، یا قیدی ہو گئے تو جنگ ختم ہو گئی، باہر چراگاہوں میں ریوڑ چرنے جاتے، تو ان کے پیچھے بوڑھے بوڑھے گڈریے ہوتے۔ کھانستے اور ہانپتے ہوئے کھیتوں کی رکھوالی کرنے والیاں اپنے بھائیوں اور خاوندوں کی یاد میں دھیمے سروں میں گاتیں اور روتیں، چوپالوں پر الاؤ کے اردگرد دہقان چپ چاپ بیٹھے رہتے، گلیوں میں خاک اڑتی، ٹھنڈی کنواری صبحوں کو بوڑھیوں کی سسکیاں اور کھانسیاں داغدار کر دیتیں، پھولتی ہوئی شفق کے کلیجے میں خرخراتے ہوئے گلے والے عمر رسیدہ مؤذن کی آواز برچھے کی طرح گھس جاتی۔ زندگی جیسے پاؤں گھسٹتی پھر رہی تھی، ماری ماری، خانماں برباد اور پریشاں حال، گھومتی اور چکراتی ہوئی اونچی لگروں پر رکتی اور گہری کھاڑیوں میں بھٹکتی ہوئی —— لال گالوں اور چمکتی آنکھوں اور سریلے گیتوں کی تلاش میں —— مگر لال گالوں کو گدھ نوچ کرنے گئے تھے، چمکتی آنکھیں مصر کے ریگستانوں اور برما کے جنگلوں میں بجھ چکی تھیں اور سریلے گلوں کا رس صحرائی مکھیوں نے چوس لیا تھا، —— اور جنگ جاری تھی ——

عوام کی جنگ، —— جمہوریت کی جنگ —— نوعِ انسان کی آزادی کی جنگ —— اور دریائے سندھ سے ایک بہت بڑی نہر نکالی جا رہی تھی، اور دادا شہباز کی ایک بیگھہ زمین پر سے پکی سڑک گذرنے والی تھی، اشیائے خوردنی نابود ہو رہی تھیں۔ ایک ہندوستانی نے ایک یورپین نازنین کے بوسے ہزاروں روپیہ کا چندہ جنگ میں دیا تھا، اور بہاجن شمشیر کے پیچھے سائے کی طرح لگ گیا تھا "تھوڑی سی رقم ہی تو باقی ہے، چکا دو، مجھے نیا دھندا شروع کرنا ہے" —— "نیا دھندا!" —— پٹواری نے کہا تھا "یعنی اناج کے ذخیرے اور ریزگاری کی تھیلیاں اور —— " —— "نہیں نہیں" مہاجن

نے شمشیر کے بلوں میں سے میل کی مروڑیاں نکال کر کہا تھا "میں کانگریسی ہوں، میں ایسا نہیں کروں گا!"

ہے شمشیر چچا ——— جیسے ہر گاؤں والا پکار رہا تھا ——— ارے کچھ بولو، کوئی پھبتی، کوئی مذاق، کوئی لطیفہ ——— کچھ سناؤ بھی ورنہ ہماری روحیں بجھ جائیں گی۔ ہمیں نوجوان بھائی اور بھتیجے اور پوتے راتوں کی خاموشیوں میں آ آ کر ستاتے ہیں۔ لال لال آنکھیں نکال کر ہمیں اپنے پھٹے ہوئے پیٹ، کٹے ہوئے بازو اور نچی ہوئی رانیں دکھاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں "مبارک ہو، مبارک ہو، مبارک ہو" ——— ہے شمشیر چچا کوئی بات سناؤ، ہمارے کانوں میں ہمارے عزیزوں کی کراہیں برمے کی طرح گھسی جا رہی ہیں، ہماری بیوہ بہنیں۔ ہماری لٹی ہوئی بیٹیاں، ہمارے کچلے ہوئے بچے! ——— شمشیر چچا، ہے شمشیر چچا!

مگر شمشیر چچا پر تو کوئی اور دھن سوار تھی۔ وہ اب چپ چاپ رہنے لگا تھا۔ ہر روز ڈاکخانے میں جانا اس کا معمول ہو گیا تھا، وہاں سے ناکام لوٹ کر وہ پٹواری کے پاس چند لمحے گذارتا اور پٹواری کے زرد سوکھے ہوئے چہرے میں دھنسی ہوئی بڑی بڑی بے رونق آنکھیں چمک اٹھتیں، "یہ جنگ کبھی ختم نہیں ہوگی، یہ جنگ کرۂ ارض کی آخری جنگ ہے، اس جنگ میں آدم کی اولاد جل بجھ کر بھسم ہو جائے گی، اور پھر اس راکھ سے ایک نئے آدم کی تعمیر ہوگی، جس کی اولاد صحیح انسان ثابت ہوگی، وہ ایک گھر کی آبادی کے لئے میں گھر نہیں اجاڑے گی، وہ ایک انسان کو موٹر مہیا کرنے کے لئے سینکڑوں انسانوں کی ٹانگیں نہیں کاٹے گی، ساری دنیا کی پیداوار ساری دنیا کے باشندوں کی ملکیت ہوگی، اس وقت، چچا شمشیر ——— صرف اس وقت ——— صرف تبھی ——— " اور وہ کان پر سے قلم اٹھا کر کہتا "یہ کمبختی کہاں گئی؟"

مہاجن کی دکان کے سامنے سے گذرتا تو مہاجن لجاجت سے کہتا "بھئی چکا دو نا باقی حساب، اب نیا دھندا شروع کرنا ہے، اور پھر اب تو تمہارا بیٹا قیدی ہے، اس کی ساری تنخواہ تمہارے نام آتی ہوگی!"

اب تو تمہارا بیٹا قیدی ہے! ——— اب تو تمہاری قسمت جاگ اٹھی ——— اب تو تمہاری برسوں کی تمنا پوری ہوئی ——— اب تو تمہاری پانچوں گھی میں ہیں! ——— لعنت ہو، شمشیر کو ہر کوئی چڑاتا تھا، دادا شہباز بھی جو کہتا تھا "آ جائے گا، قیدیوں کو تو بڑے آرام سے رکھتے ہیں، دیر سویر ضرور آئے گا" ——— دادا شہباز اس سے مذاق کرتا تھا!

آہستہ آہستہ گاؤں پر سکون چھاتا چلا گیا، مگر اس سکون میں زندگی کم تھی اور موت زیادہ، ہواؤں میں بیواؤں کی آہیں اور یتیموں کی کراہیں تھیں، کھیتوں کا رنگ زہر کی طرح کسیلا تھا، مویشی تک اداس نظر آتے تھے، ہر جمعرات کو چوپال سے پرے گاؤں کے قبرستان میں بزرگوں کی قبروں پر چراغوں کی قطاریں جلنے لگیں۔ ہر ماں، ہر بیوی اور ہر بہن جمعرات کو مٹی کے دیوں میں تیل بھر کر بزرگوں کے پاس جاتی، ان کے سرہانے دیے رکھ کر دعائیں مانگتی ——— "میرا بیٹا واپس آئے، میرا مالک واپس آئے، میرا بھیا واپس آئے" ——— "کوئی واپس نہیں آئے گا!" پٹواری نے کہا تھا "میں کہتا ہوں، تم جن بھائیوں اور بیٹوں کو واپس بلا رہی ہو وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے، وہ مر چکے ہیں یا مر رہے ہیں، ان کے ذہن مر چکے ہیں، ان کے عقیدے مر چکے ہیں، ان کے جسم شاید واپس آ جائیں، لیکن وہ اپنی روحوں کو وہیں دفن کر آئیں گے، اور اس لئے جب وہ واپس آئیں گے تو تمہارے بھائی اور بیٹے نہیں ہوں گے۔ وہ مغرب کے بیٹے ہوں گے اور جب میکسیکو میں کسی حبشی پر کوئی امریکن گولی چلائے گا، تو درد کے مارے وہ چلا اٹھیں گے، جب شنگھائی میں کوئی جاپانی کسی چینی کے تھپڑ مارے گا، تو وہ تلملا اٹھیں گے، جب دلی میں کوئی گورا کسی ہندوستانی کے بھیجے پر لات جمائے گا تو وہ تڑپ اٹھیں گے اور پکار اٹھیں گے، اور ان کی پکار ہندوستان سے نکل کر لندن کے قلعوں سے ٹکرائے گی۔ واشنگٹن کے محلوں میں گونجے گی، روس کے ——— "

"میرے خیال میں یہ پٹواری یا تو ریم بنانے لگے گا، یا قید ہو جائیگا!" ذیلدار نے ایک روز تنگ آ کر کہا تھا۔

پٹواری کی باتیں پرسکون تالاب کی سطح پر گرتے ہوئے ننھے ننھے

سنگریزوں کی مانند تھیں، لہروں کے دائرے اپنے محیط وسیع کرتے ہوئے پھیلنے لگتے اور مٹ جاتے۔ اور پھر تالاب سو جاتا —— ایک سال گذر گیا۔ دو سال گذر گئے، کبھی کبھی یورپ کے محاذ سے کسی نوجوان کی موت کی خبر آتی، تو اس تالاب میں چٹان سی گر پڑتی، تالاب تھلملا کر رہ جاتا، لہریں دیر تک اس کی سطح پر ناچتی رہتیں، اور پھر سکون چھا جاتا۔ —— سکون، جو ہر انجام کا آغاز ہے،

ٹھیک ہی تو ہے، ماں بیوائیں جن کے پریشان بال، خشک ہونٹ اور چھلکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر کائنات بھی سسکیاں لینے لگتی تھی۔ وہ بہنیں جن کی چیخ پکار کا خلوص غیر فانی اور ابدی معلوم ہوتا تھا —— اب تینجنوں میں چرخے گھماتیں، چہلیں کرتیں، قہقہے لگاتیں، ٹھوکے دیتیں اور کہتیں "یہ تیری اوڑھنی کا رنگ تو بالکل نئے نئے خون کا سا ہے بہن نندی" —— "اور تیری لونگ، اتنی اچھی ناک پر اتنی بھونڈی لونگ، جیسے مصری کی ڈلی پر مکوڑا چپک کر رہ جائے" —— ناکوں آنکھوں، بالوں اور اوڑھنیوں کے گورکھ دھندے میں گھری ہوئی یہ بیویاں اور بہنیں مصر کی ریتوں اور برما کی پتاوں میں گلی ہوئی ہڈیوں کو فراموش کر چکی تھیں، صرف ماؤں کی محبت زندہ تھی، یہ ابدیت سے بھی گہری اور لامحدود محبت، جو انقلاب کا نام نہیں جانتی، جو خدا کی طرح اٹل ہے، —— اندھیری شاموں میں جب یہ بوڑھی مائیں دیئے پلو تلے دیئے چھپا کر بزرگوں کی قبروں پر جاتیں، اور جب مقبروں پر یہ ہولے دیئے، جو اب تعداد میں بہت کم رہ گئے تھے، ہوا کے جھونکوں میں اپنی آتشیں زبانیں تھرتھراتے اور قریب بیٹھی ہوئی ماؤں کے فق چہروں میں دھنسی ہوئی آنکھیں شہاب ثاقب کی طرح چمک اٹھتیں تو شمشیر جس کی خاموشی اس عرصہ میں آوارگی کی صورت اختیار کر چکی تھی، بہک کر گھر آتا، اور ننھے شیر کو پاس بٹھا کر شاداں سے کہتا "بیٹا آج جمعرات ہے، دیا تو جلا دیا ہوتا مزار پر، کون جانے اسی تیل کے صدقے خدا ہمارے گھروندے کو پھر سے روشن کر دے" —— تو شاداں لکڑیوں کا تانتا باندھ کر اٹھتی۔ اور کہتی "یہ بہت دیئے جلائے چچا، اور پھر دیے بجھ جاتے ہیں تو تیل مجاور الٹ کر لے جاتے ہیں، دیئے جلانے سے کیا ہوگا!"

شمشیر کے لئے دلیر کی دُوری اب اتنی تشویشناک نہیں رہی تھی، جتنا شاداں کا تغیر۔ دلیر کی قید کے پہلے ہی سال کے آخری مہینوں میں اُس کے دبلے پتلے جسم میں تازہ خون دوڑنے لگا تھا۔ صبح سویرے بناؤ سنگار میں کتنی دیر لگا دیتی، بہترین لباس پہنتی، شیر کو گھر کرتی، اور پڑوس میں دھوبیوں کے گھر چلی جاتی، ہر مہینے دلیر کی تنخواہ سے دس روپے شمشیر سے بِر آلے لیتی "مجھے بھی زندہ رہنا ہے"۔ وہ کہتی "جہاں کا سب شیطان کی کانٹ بنتا چلا جائے تو میرا کیا بس، میرا بھی تو حق ہے"

شمشیر چپ چاپ دس روپے ہر مہینے اس کے حوالے کر دیتا، وہ جانتا تھا، کہ جنگ میں صرف جانیں ہی نہیں، آبروئیں اور عزتیں بھی ملیامیٹ ہو جاتی ہیں۔

"سنبھلو، سنبھلو" دادا شہباز کہا کرتا تھا "سنبھلو شمشیر، ہوش کئے ہو کر رہو، آخر دوسروں کے بیٹے بھی تو قیدی ہیں"

مگر شمشیر کو سنبھلنے کی توفیق ہی کہاں تھی۔ وہ ہمیشہ کے لئے ڈگمگا چکا تھا، اُس لٹو کی طرح جو فرش پر گرتا ہے تو ایک جگہ قرار نہیں پا سکتا۔ اُس کی نوک کو جیسے زمین کے اندر سے کوئی چیز اچھال کر پرے پھینک دیتی ہے، اسے کوئی مرکز نہیں ملتا۔ کوئی منزل میسر نہیں آتی، سنبھلنے کے لئے فرصت چاہئے، اور شمشیر کے پاس بہت کم فرصت تھی، مہینے میں محاذ جنگ سے ایک دو موتوں کی خبر آ جاتی، تو وہ فاتحہ خوانی کے لئے چلا جاتا، لوگ امن کے لئے قرآن مجید کے ختم کرتے، تو اُن میں شامل ہو جاتا، اور جب پلٹتا تو پٹواری کہتا "امن؟ امن تو صرف ایک لفظ ہے، امن جنگ کا دوسرا نام ہے، اور امن کی جنگ اصلی جنگ سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے، بنگال کا قحط کیا تھا؟ یہ امن کی جنگ تھی، یہ ہر چیز کی گرانی۔ یہ امن کی جنگ ہے، یہ اغوا اور زنا کے نت نئے شوشے، یہ امن کی جنگ ہے، —— امن؟ تم امن کیلئے دعائیں مانگتے ہو؟ حالانکہ تم دو صدیوں سے امن کے مزے لوٹ رہے ہو، دو صدیوں سے تم اس چپ چاپ جنگ میں مبتلا ہو، ایسی جنگ جو تم محسوس نہیں کر سکتے، ایسی جنگ جو تمہارا خون نہیں بہاتی، صرف تمہارے دماغ اور دل کو نچوڑ کر گلے ہوئے چیتھڑے کی طرح پرے پھینک دیتی ہے —— ارے یہ گھنٹی کہاں گئی؟"

مگر اب جنگ کی تازہ خبریں حوصلہ افزا ثابت ہو رہی تھیں اور شمشیر پٹواری سے بحث کرنے لگا تھا: "ارے بھئی امریکی فوج جزیرۂ جاپان پر اُتر آئی ہے نا ——— جنگ کو ختم سمجھو"۔

"یہ نئی جنگ کی ابتدا ہے" وہ گھٹنوں کو گھٹنے تلے رکھ کر کہتا،

"روسی برلن میں گھس گئے"

"یہ نئی جنگ کی ابتدا ہے"

"مسولینی کو سولی پر چڑھا دیا گیا"

"یہ نئی جنگ کی ابتدا ہے"

"یورپ میں جنگ ختم ہو گئی۔"

"اب نئی جنگ شروع ہو گی"

"جاپان کے شہر ہیروشیما پر ایک نیا بم گرایا گیا — ایٹم بم — ذیلدار کہہ رہا تھا"

"مجھے معلوم ہے"

اُس روز شمشیر کی آنکھیں چمک اُٹھیں، اور ہونٹوں کی پپڑیاں اچٹ کر گر گئیں، مدت کے بعد اُس نے پھبتی اور مذاق کی طرف توجہ دی۔ "بڑی دیر کے بعد نظر آئے ہو بھئی" اُس نے ایک نوجوان سے کہا۔ "سناؤ، آج کل کونسی گپھا آباد کر رکھی ہے"

اور پھر "ابے کُھل کر قدم اُٹھا۔ یوں چل رہا ہے جیسے تہمد کھل گیا ہو تیرا"

ایٹم بم کی خوشی میں اُس روز اُس نے ایک بڑھیا پر بھی حملہ کر دیا "لہنگا سنبھال خالہ، بلاوا دے رہا ہے"

بڑھیا پلٹ کر کھڑی ہو گئی، اور پھر رو دی "تم سچے ہو شمشیر، تمہارا دلیر واپس آجائے گا نا۔ اور میرا احمد ——— وہ ادھر تین سال ہوئے مصر میں ——— " اور وہ روتی ہوئی وہیں بیٹھ گئی "تم مجھ سے مذاق کرتے ہو؟ کیوں نہ کرو، تمہارا بیٹا جو واپس آرہا ہے، اور میرا بیٹا ——— میرا بیٹا ——— " سر پر ہاتھ رکھ کر وہ اٹھی، اور اپنے بیٹے کے ماتم کو تازہ کرتی ساری گلی کو چونکاتی چل دی۔

"ارے اللہ" شمشیر نے گلی میں جمع ہوتے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا اُن کے چہروں پر غم اور غصّہ کے آثار تھے، اور وہ سب نفرت سے شمشیر کو گھور رہے تھے "ارے!" شمشیر نے دوبارہ کہا، اور سر کو دونوں ہاتھوں میں دبا کر وہیں بیٹھ گیا، اور بہت دیر تک بیٹھا رہا۔

رات کو چوپال پر لوگ اکٹھے ہوئے، تو ذیلدار نے ایٹم بم کا ذکر چھیڑ دیا "اس کی طاقت پانچ لاکھ ساٹھ ہزار من بارود کے برابر ہوتی ہے، جب ہیروشیما پر بم گرا، تو جو لوگ باہر تھے، وہ وہیں دم توڑ بیٹھے اور جو اندر تھے وہ مارے حبس کے تڑپ پھڑک کر رہ گئے، لاشوں کے چہرے تک نہیں پہچانے جا سکتے، بم گرا تو سات آٹھ میل اونچا دھوئیں کا مینار اُبھر آیا، ہیروشیما بالکل مٹ چکا ہے، پچاس ہزار سے زیادہ جاپانی مر چکے ہیں، ہزاروں ہسپتالوں میں ہیں، ہزاروں کا کچھ پتہ ہی نہیں۔ بس اب جنگ کو ختم سمجھو"۔

"ہت تیری نکٹے ناٹے کی" ایک دہقان بولا "کیسے گرجتا دھاڑتا بڑھا تھا، اور کیسے دبوچا انگریز نے"

"نہیں نہیں۔ امریکہ نے" اعتراض ہوا۔

"ابے نہیں۔ انگریز نے"

"امریکہ نے"

"انگریز نے"

"سارے عالمِ انسانیت کی بدبختی اور بدطینتی نے" پٹواری بولا۔ اور سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے "جنگ میں زہریلی گیس استعمال کرنا منع ہے، مگر زہریلی گیس سے ہزار درجہ خطرناک ایٹم بم استعمال کرنا، جائز ہے، بھئی بڑے چھچھلے ہیں جنگی اصول۔ اُس وقت جب ہٹلر نے گیس چھوڑنے کی دھمکی دی تھی تو کانفرنسیں بلائی جانے لگیں، کمیٹیاں ہونے لگیں۔ اور اب ——— یہ ایٹم بم ———"

ذیلدار کڑک کر بولا "منشی، بکواس بند کر!"

"میں کہتا ہوں" پٹواری تو جیسے دیوانہ ہو گیا تھا "یہ ایٹم بم کوئی نئی چیز تو نہیں، ہم ہندوستانیوں کے لئے تو ایٹم بم کوئی عجوبہ نہیں، بنگال میں کس ایٹم بم نے قحط ڈالا۔ آسام میں کس ایٹم بم نے لڑکیوں کی جوانیاں لوٹیں، راجپوتانہ اور پنجاب میں کس ایٹم بم نے بیواؤں اور یتیموں کی فوج کی فوج پیدا کر دی، ہندوستان پر تو پچھلی دو صدیوں سے ایٹم بموں کی بارش جاری ہے، اور تم منہ کھولے ہیروشیما کے

ایٹم بم کی باتیں یوں سُن رہے ہو، جیسے تمہارے لئے جنت کا دروازہ کھُل گیا ـــ ایٹم بم کی خبریں تم اخباروں میں کیوں پڑھتے ہو۔ تدب دین سے پوچھو، لال بیگ سے پوچھو، نور خاں سے پوچھو، چچا شمشیر سے پوچھو ـــ اور ـــ"

"بکواس بند کرو میں کہتا ہوں" ذیلدار گرجا۔ اور پٹواری تھر تھر کانپتا چوپال پر سے اُٹھ کر چلا گیا۔

"منشی پاگل ہو جائے گا" ایک شخص نے رائے ظاہر کی۔

مگر ذیلدار کی غضبناک خاموشی کا تقاضا تھا کہ حاضرین بھی خاموش رہیں، کڑی نگاہوں کی گھرکی نے اس اصول توڑنے والے کو کپکپا کر رکھ دیا تھا۔

اب تو نت نئی چٹپٹی خبروں کا تانا بندھ گیا۔

"برطانیہ میں چھ سال کے بعد سب لوگوں نے صحیح معنوں میں چھٹی منائی، جنگ ختم ہو رہی ہے۔

"روس نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا"

موئے کو مارے شاہ مدار ـــ جنگ ختم ہو جائے گی۔

"جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے"

اللہ بس باقی ہوس ـــ جنگ ختم ہو گئی،

جنگ ختم ہو گئی ـــ جنگ ختم ہو گئی ـــ پتلیاں چمک اُٹھیں، گالوں پر گلال پھر گئے، قیدی اور عدم پتہ بیٹوں کی مائیں لاٹھیاں ٹیکتی گلیوں میں آ گئیں۔

"سچ مچ؟ ـــ سچ مچ؟"

"ہاں ہاں۔ جنگ ختم ہو گئی، جنگ بالکل ختم ہو گئی۔ اب جنگ نہیں ہو گی۔ اب جنگ بالکل نہیں ہو گی"

"سچ مچ؟ ـــ سچ مچ؟"

اتنی بڑی سچائی پر ایمان لانے کے لئے بھی تو شیر کا کلیجہ چاہیئے۔

"جنگ ختم ہو گئی شاداں بیٹی!" شمشیر گھر جا کر چلایا، اور شیر کو اٹھا کر اس پر بوسوں کی بوچھار کر دی،

"سچ مچ؟" ـــ مگر شاداں کے اس استعجاب میں مسرت کے بجائے صرف حیرت تھی،

"ارے کوئی یقین نہیں کرتا۔ شیر بیٹا، تیرا ابا اب واپس آ جائیگا۔"

"سچ؟" ننھے نے بڑی بڑی گول مول آنکھیں پھاڑ کر دادا کو دیکھا۔

"کیا لائے دا؟"

"تمہاری سواری کا گھوڑا۔ عید کے لئے کپڑے اور ٹوپیاں اور بوٹ اور چھڑی اور ـــ"

"پٹاخے"

"ہاں ہاں پٹاخے اور پھلجھڑیاں اور ـــ"

"خاک لائے گا" شاداں نے بگڑ کر کہا۔

"کیوں؟" جیسے شاداں نے بڈھے کا منہ نوچ لیا تھا۔

"تنخواہ تو ساری صاحب ہضم کر گیا، وہ تو اپنی جان بچا کر بھی لائے تو شکر کرو خدا کا" اور اس نے نقرئی چوڑیوں کی گھنگھریاں چھنکائیں اور شیر کو گھسیٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی،

کانٹوں کا وہ گچھا جو شیر کی قید اور شاداں کی سرد مہری نے اس کے حلق میں ٹھونس رکھا تھا، اُچھل کر جیسے اُس کے دماغ میں کودنے لگا، مگر اب جنگ ختم ہو چکی تھی، اور اندر ہی اندر گھلنے سے یہی بہتر تھا کہ دلیر کی راہ دیکھی جائے،

دو تین ہفتے بعد اُسے معلوم ہوا کہ انگریزوں نے سنگاپور پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے، اور پھر آہستہ آہستہ خبریں آنے لگیں، کہ قیدیوں کے جہاز ہندوستان آ رہے ہیں۔ "دامن کوہ کے ایک گاؤں کا نوجوان جو سنگاپور میں جاپان کا قیدی رہا گھر واپس آ چکا ہے" اُس نے ایک روز ہرکارے کی زبانی سُنا، اور اُسی روز ایک ننھی سی بقچی کاندھے پر بٹھا کر اسی گاؤں کی راہ لی، گاؤں والوں نے بھی اپنے اپنے عزیزوں کے نام اور نمبر لکھ کر دیئے، اور وہ ایک ذمہ دارانہ حیثیت سے، بالکل پرانے بادشاہوں کے ایلچیوں کی طرح پہاڑ کے دامن کی طرف چلا،

وہاں جا کر اُسے نووارد سپاہی کی زبانی معلوم ہوا کہ قیدی بیشمار تھے، اور انہیں ملایا اور جاوا اور دوسرے جزیروں میں بکھیر دیا گیا تھا، اس لئے وہ کوئی یقینی خبر نہیں دے سکتا تھا، مایوس ہو کر گھر کو پلٹا،

تھکا ماندہ کھانستا کھنکارتا جب وہ اپنے گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر پہنچا، تو اُس نے کچھ دور پٹواری کو اپنی طرف آتا دیکھا، پہلے پہل

کا ایک جمگھٹ بہت پرے چپ چاپ کھڑا پٹواری کی طرف دیکھ رہا تھا۔

سورج غروب ہوا چاہتا تھا۔ مگر جیسے شمشیر کے گاؤں میں پہنچ جانے کا منتظر کھڑا تھا۔ دھوپ پیلی پڑ گئی تھی، درختوں کے پتے اداس اور نڈھال ہو کر بل کھا گئے تھے۔ کھیتوں پر مردنی کا عالم تھا، ٹھکانوں کو جاتے ہوئے پرندوں کی آوازوں میں شیون تھا، پگڈنڈی کے لہراتے ہوئے زریں فیتے پر ایک گدھا دھوپ میں ہانپ رہا تھا۔

"واپس آ گئے چچا؟" پٹواری نے پوچھا۔

"ہاں۔ واپس آ گیا ہوں۔ نامراد،" شمشیر نے کہا۔ "مگر تم کہاں چلے؟"

"میں یہاں سے جا رہا ہوں، ہمیشہ کے لئے"

"کیوں؟ خیریت تو ہے نا؟"

"خیریت؟" پٹواری کے ہونٹوں پر ایک عجیب زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر وہیں چمٹ کر رہ گئی۔ "خیریت امن کی طرح بے معنی لفظ ہے، امن کے لفظ سے معنی نچوڑنے کے لئے ماسکو میں مولوٹاف، بیونز اور بیون کی کانفرنس ہونے والی ہے۔ اور تمہیں خیریت کا مطلب سمجھانے کے لئے وہ مجمع تمہارا منتظر کھڑا ہے، جاؤ بابا۔ تم جو ہر کسی کا مذاق اڑاتے تھے، تم جو بڑی بڑی خبریں سننے کے شوقین تھے، تم جو ہنسنے ہنسانے کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہ تھے، جاؤ، وہاں اُس مجمع میں دادا شہباز سے پوچھو کہ خیریت کیا چیز ہے، اور پھر اپنے گھر جانا، وہاں کہیں طاق پر تمہارے بیٹے کا تار پڑا ہوگا۔ وہ آ رہا ہے۔"

"دلیر آ رہا ہے؟" شمشیر یکبارگی چونک کر پٹواری سے لپٹ گیا مگر وہ لوہے کی لاٹھ کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا، اور اُسی خوفناک سنجیدگی سے بولا۔ "ہاں، واپس آ رہا ہے تمہارا دلیر، سو تم تار اٹھا کر شیر کو پکارنا جسے کل صبح اُس کی ماں نے دلیر کا تار ملنے کے بعد لاہور کے کسی یتیم خانے کے سفیر کے حوالے کر دیا ہے۔"

"تار ملنے کے بعد؟"

"اور پھر پکارنا۔ شاداں۔ شاداں بیٹی۔ تمہاری وہ شاداں بیٹی جو شاید ہیروشیما پر ایٹم بم گرائے جانے کی منتظر تھی، جو رات کو تمہارے پڑوسی دھوبی کے ساتھ بھاگ گئی ہے بتوں کی طرف"

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"اور پھر تجوری کھول کر وہ روپیہ گننا جو تم نے جنگ کی برکت سے کمایا۔ تمہیں امن اور خیریت کے تمام معانی ازبر ہو جائیں گے۔"

وہ شمشیر کے مردہ ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبا کر پلٹا، اور پگڈنڈی پر ہو لیا، سورج دریا کے پرے کنارے پر پھیلی ہوئی پہاڑیوں میں ڈوب چکا تھا۔ شفق نے پٹواری کے سفید لباس میں آگ سی لگا دی۔ وہ ایک شعلہ سا بن گیا — دھرتی کے کلیجے میں سے نکلتا ہوا شعلہ — رواں دواں — رواں دواں — اور پھر یہ شعلہ بجھنے لگا۔ دھوئیں کا ایک بونا سا بن گیا۔ مشرقی افق کی دھند میں گھلتا ہوا یہ سایہ بڑھتا گیا، پھیلتا گیا۔ ناپید ہوتا گیا — اور پھر اُسی افق سے چاند بن کر ابھرا، جگمگاتا ہوا، ہنستا ہوا — جیسے مغرب میں مرتے ہوئے سورج کے تعاقب میں ہے!

علی عباس حسینی

برف کی سل

ہمسائی کے ہاں شادی تھی۔ "بڑی آپا" کہنے والی انور بیاہی جا رہی تھی۔ گھر میں سینکڑوں عورتیں موجود تھیں —— بوڑھی، جوان، شادی شدہ، بن بیاہی، خوبصورت، بدصورت، آدمی کا بچہ! — ہر ایک کے چہرے پر ہنسی کھیلتی تھی۔ ہر ایک خوش دکھائی دیتی تھی۔ مگر کوئی جمیلہ کی طرح بے آپے نہ تھی۔

نہ جانے کیوں آج وہ بوکھلا سی گئی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کا دل گا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں رہ رہ کے اس کے جسم بھر میں ایک مترنم سی لہر دوڑ جاتی تھی۔ جیسے کوئی اس کے سازِ زندگی کو بار بار چھیڑتا تھا۔ جیسے کوئی اسے بار بار گدگداتا تھا۔ جیسے کوئی بار بار چٹکیاں لیتا تھا —— وہ اپنی رگوں میں گرم خون کی روانی محسوس کرتی تھی، جلتا ہوا، اُبلتا ہوا، جوش مارتا ہوا! اس کا جی چاہتا تھا، کسی طرح یہ خون بہہ نکلے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ گھر بھر میں اچکتی پھرے، تھرکتی پھرے، گاتی پھرے، ہنستی پھرے! — وہ ایک جگہ ذرا دیر بیٹھتی، پہلو بدلتی، مسکراتی، کھڑی ہو جاتی، انگڑائی لیتی، آگے بڑھ جاتی۔ وہ ایک تتلی تھی، نازک، حسین، دلربا۔ مگر بلا کی بے چین! کسی پھول پر جم کر نہ بیٹھنے والی! کسی غنچے پر نہ ٹھہرنے والی!

ڈومنیاں گا رہی تھیں، بوڑھی پھٹی آواز سے، بے سرے پن سے "آیا بنا رے! آیا بنا رے" کی رٹ لگائے ہوئے تھیں۔ جوان کی آواز میں رس تھا۔ تو اس کی آنکھوں میں بھی مدہوشی تھی۔ کالی سیاہ پتلیاں، بڑے بڑے دیدے، دنبالہ دار سرمہ لگا ہوا، ہونٹوں پر پان کی دھڑی جمی ہوئی، چست انگیا میں بوٹی بوٹی پھڑکتی ہوئی۔ اس پر شرارتیں کہ توبہ ہی بھلی! وہ کولھے مٹکاتی، ہاتھ چمکاتی، آنکھیں مارتی اور کسی نہ کسی کی فرمائش پر اس کی رشتہ دار کو ننگی ننگی گالیاں گا گا کر سنا دیتی —— جمیلہ کو یہ فحش مذاق، شادی بیاہ کی یہ گندی گالیاں کبھی نہ بھائی تھیں۔ لیکن آج یہ گالیاں شراب کی طرح تلخ ہونے پر بھی سرور انگیز تھیں۔ وہ یہ بھول جاتی کہ اس کا دوپٹہ سرک کر کہاں سے کہاں پہنچا۔ وہ یہ بھی بھول جاتی کہ پاس کوئی بڑا کھڑا ہے یا بیٹھا، وہ بار بار ہنستی، تالی دیتی اور انگڑائیاں لیتی!۔

ناک چوٹی گرفتار حسنیٰ کو اس نے کبھی اچھا نہ سمجھا تھا۔ اس کی کنجی آنکھیں، اس کے گھنگھر یالے بال، اس کا شبھی رنگ، جمیلہ کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ مگر آج وہی حسنیٰ سرخ ساری میں بیر بہوٹی بنی ہوئی ایسی پیاری معلوم ہوتی تھی کہ جی چاہتا تھا اسے کلیجہ میں بھر لو۔ جیسے جمیلہ کے دل میں سوائے محبت کے کسی جذبے کی گنجائش ہی نہ رہ گئی ہو۔ جیسے اس نے اس راز کو پا لیا ہو جو حسنیٰ کو گھنٹوں سنگار کرنے پر مجبور کرتا تھا —— سپاہی کا ہنر ہے اپنے اسلحہ کو صاف اور تیز رکھنا، ادیب کا ہنر ہے اپنے قلم کی نوک پلک دیکھتے رہنا، اور عورت کا ہنر ہے اپنے کو ہر آن حسین تر بناتے رہنا! —— حسنیٰ اس کے سوا اور کیا کرتی تھی؟ وہ اپنے کو کسی کے پیش کش کے قابل بناتی تھی۔ پیش کش! — ہاں ہاں پیش کش ہی میں عورت کی فتح ہے! جیت ہے! حکومت ہے! اکڑنے، اترانے، چمکانے والے مردوں پر حکومت! —— اور اس نے پھر انگڑائی لی ——

اس موئے دوپٹے کو آج کیا ہوا ہے؟ جب دیکھو سر سے کھسکا جا رہا ہے! آہنہ، ہو گا! کون دیکھتا ہے؟ سب عورتیں ہی عورتیں تو ہیں۔ اور سب خوش، اپنے کو بھولی ہوئی، مگر میری طرح کوئی بے آپے نہیں، شاید دلھن ہو چلو دیکھیں۔ گٹھری بنی لپٹائی، سمٹی سمٹائی بیٹھی ہے، خون کا منجمد قطرہ! ....

بخورات سے رندھا اور بسا ہوا کمرہ، شنجرفی گھونگھٹ میں سے جھلکتا ہوا شہابی چہرہ، عطر عروس کی لپٹ، حنائی ہاتھوں سے چھوٹا سا سلام! جمیلہ نے بلائیں لینے کی جگہ دلھن کو گود میں سمیٹ کر پیار کر لیا۔ انور نے شرما کر احتجاج کی "بڑی آپا!" اس تخاطب نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ توبہ یہ ہندوستانی رشتے! قدم قدم پر چھوٹے بڑے کا خیال۔ آدمی کس سے بولے، کس سے ہنسے؟ اس نے جھنجھلا کر کہا "بھاڑ میں جائیں بڑی آپا!" اور باہر چلی آئی۔

گھر بھر میں بجلی کی روشنی، دالانوں میں، کمروں میں بجلیاں گٹے لگے ٹمٹ

کے تخت، صحن میں شامیانے کے نیچے صحنک کی تیاریاں، شامیانے کے پیچھے سے جھانکتا ہوا چودھویں کا چاند۔ اس نے میز کا ل کی طرف دیکھ کر دونوں ہاتھ بلند کیے، انگلیوں میں انگلیاں پھنسائیں اور پھر انگڑائی لی پھر ہاتھ نیچے لاتے ہوئے خود ہی مسکرا کر گنگنانے لگی۔ "اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن!"

میزبان بی بی نے پکار کر کہا "اری جمیلہ بیگم! کچھ مہمانوں کا بھی خیال ہے؟ سب کو پان پتہ مل رہا ہے؟" —— بڑی محبت تھی اس کی تھکی ہوئی بوڑھی آواز میں۔ "وہ اپنانے کا انداز تو دیکھو۔ خود اسے بھی میزبانی میں داخل کر لیا۔ اب چاہے رات بھر اسے پان کا ٹکڑا نہ ملے، ایک کھیل اڑ کر حلق میں نہ جائے۔ مگر وہ شکایت کر ہی نہیں سکتی۔ وہی تو منتظم ہے، اسی کی لڑکی اسی کی عزیزہ اسی کی بہن کا تو بیاہ ہے! —— وہ دوپٹہ درست کرتی ہوئی ہنس کر بولی۔ "جی ہاں، آپ ادھر سے بےفکر رہیں۔ سب کو ساری چیزیں پہنچ رہی ہیں۔"

حسنیٰ نے چپکے سے بغل میں کھڑے ہو کر کہا "تو پھر مجھے پان کھلواؤ نا!"

جمیلہ نے حسنیٰ کے اس طرح خاموشی سے پاس آنے پر کوئی تعجب نہ محسوس کیا۔ وہ تو بڑی دیر سے جمیلہ کے پاس ہی تھی۔ پیش کش نہیں ہوئی! اس نے حسنیٰ کو بڑی محبت سے دیکھا، کیسی چھوٹ پڑ رہی تھی چاند کی اس کے گورے گورے گالوں پر! اس نے حسنیٰ کے لپ اسٹک سے لال ہونٹوں پر اپنے گلے کی انگلی ماری۔ پھر اس کی صراحی دار گردن میں بانہہ آویزاں کر کے کہا "وہ چاند تمہیں آنکھیں مار رہا ہے حسنیٰ!"

حسنیٰ نے جمیلہ کے اس فقرے کے جواب میں اسے صرف مسکرا کر دیکھا اس مسکراہٹ میں غضب کی ہمدردی و یگانگت تھی۔ جمیلہ کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے حسنیٰ کے دل میں بھی وہی جذبات انبساط موجزن ہیں جو اسے دیر سے گرمائے ہوئے تھے۔ جمیلہ نے ایک رکتی ہوئی ٹھنڈی سانس لی۔ یہ اٹکتی، کھٹکتی، سینہ میں چبھن سی پیدا کرتی ہوئی سانس "افسردگی، اضمحلال، یا افسوس کے اظہار کا ذریعہ نہ تھی۔ بلکہ یہ مسرت کے جام لبریز کی ایک لہر تھی۔ چھلک جانے والی، چھلکا دینے والی ایک کیفیت! جیسے سبک قدم صبا کلیوں کو کھلاتی چل رہی ہو، جیسے آنکھیں لڑانے والا چاند دل میں اتر آیا ہو ——!

حسنیٰ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ پھر سرگوشی کے انداز میں شعر پڑھا۔

کس کے چہرے کا حیرتی ہے ماہ؟ جلد تن ایک دیدۂ وا ہے!

جمیلہ نے ایک پھسلتی نظر ماہ چہار دہم پر ڈالی۔ پھر حسنیٰ کے مہوش چہرے پر آنکھیں جمائیں۔ دفعتاً اس کے ہاں ایک عجیب سی خواہش پیدا ہو گئی۔ ایک مردانہ خواہش! حسنیٰ کے شباب و حسن کو لوٹ لینے والی خواہش! وہ کاش میں مرد ہوتی! "اس نے ایک کھٹکتی ہوئی سانس لیکر سوچا۔ اس نے حسنیٰ کی گردن میں پڑی ہوئی بانہہ پر اپنا بوجھ بڑھا دیا۔ حسنیٰ اس کی طرف جھکنے لگی۔ شاخ بار ور کی طرح جھکنے لگی........

"بی بی! اچھے میاں بڑی دیر سے آپ کے لیے پلک رہے ہیں۔"

جمیلہ نے حسنیٰ کے بچے کی کھلائی کو رقیب کی نظروں سے دیکھا۔ کمبخت آگئی یہ مردار اپنے اچھے میاں کو لے کر۔ مگر جب حسنیٰ اس کی بانہہ اپنی گردن سے آہستہ سے الگ کر کے پھول سے بچے کی طرف پلٹی تو جمیلہ نے ماں بیٹے دونوں کے چہروں پر ایک ایسی چمک دیکھی جو دل میں تیر و نشتر کی طرح پیوست ہو گئی۔ اسے دفعتاً محسوس ہوا کہ اس کی خوشی نامکمل ہے، اس کی محبت ناقص ہے۔ وہ اب تک بے ثمر ہے! ——

اس کی نظروں میں ساس نندوں کا شکایت بھرا چہرہ پھر گیا۔ پانچواں سال تھا اس کی شادی کو، مگر وہ ایک "چوہیا" بھی وہ اب تک نہ جن سکی تھی۔ نہ میاں کو آج تک اس کی فکر ہوئی تھی، نہ اسے پروا۔ وہ تو ضبط تولید کے قائل تھے، اور خود جمیلہ "تخلیق" کی تکالیف سے ترساں تھی۔ وہ محبت کے روحانی پہلو، اس کے اغراق، اس کی مثالیت کی قائل تھی، لیکن اس طیب و طاہر جذبے میں بہیمانہ افعال و حرکات کا اشتراک، اسے صدمہ کر یہہ معلوم ہوتا تھا۔ اس میں جذبۂ مقاومت ابھار دیتا تھا۔ لیکن آج اچھے میاں اور حسنیٰ کے چہروں کی چمک نے اسے محسوس کرا دیا کہ تولید میں "خالقیت" ہے۔ عورت کا ربانی فریضہ! —— اس کے جسم میں لرزش سی پیدا ہو گئی، جیسے اس نے کوئی قصور کیا ہے، جیسے وہ کسی چوری میں پکڑی گئی ہے، جیسے بھری برادری اسے سبک نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ جیسے وہ سچ مچ عورت اور مرد کی درمیانی جنس ہے!

اس نے پلٹ کر حسنیٰ کی بھری گود کو دیکھا۔ اسے جمیلہ کی موجودگی کا احساس تک نہ تھا۔ وہ اچھے میاں کو سینے سے چمٹائے آنکھیں بند کیے جھوم رہی تھی۔ بچہ ماں کے گال پر گال رکھے ننھے ننھے ہاتھوں سے

چاند کو بلا رہا تھا۔ جمیلہ کو محسوس ہوا جیسے وہ پتلی پتلی انگلیاں اس کے سینے کو چھوتی ہوئی دل میں در آئیں اور اسے مسلنے لگیں ـــــ وہ کچھ شرمائی کچھ مرجھائی سی وہاں سے چلی، تصور سے بدحواس ہو چلی۔ درمیان میں ایک پانچ برس کی بچی سے ٹکرائی۔ چونکی، تو دیکھا کھڑی ہوئی منزل کے لئے دوسرا سنگِ میل ہے اس نے بسورتی ہوئی بچی کو جلدی سے گود میں اُٹھا لیا گھبرا گھبرا کر منہ چوما اسے چاند دکھایا، بہلانے کے لئے گا گا کر سُنایا :۔

چندا ماما دور کے   لڈو بنائے بُور کے
لڈو گیا ٹوٹ   چندا گیا رُوٹھ

بچی ہنس دی "کہاں رُوٹھا ہے۔ ہنس تو رہا ہے"۔ جمیلہ نے پیار کر کے ٹھنڈی سانس لی۔ "روٹھا نہ ہوتا تو ہمارے پاس کیوں نہ آتا ؟" ـــ بچی کو گود سے اُتار کر آگے بڑھ گئی۔ دل میں آیا چلو گھر چلیں۔ خیال آیا بی بیاں صحن میں ڈھونڈیں گی۔ اُنہہ! بہت سی سہاگنیں ہیں، شادی کا بھرا گھر ہے۔ کس کو اتنا دھیان کہ بن بچوں والی جمیلہ غائب ہے۔ بن بچوں والی ـــــ بانجھ! ـــ ہائے اللہ کہیں ایسا ہی تو نہیں ہے ؟ ـــــ

ایک ہُوک سی اُٹھی۔ وہ تلملا گئی۔ اُن سے کہوں گی ڈاکٹرنی کو دکھاؤ، حکیم کو بلاؤ ـــ مگر ـــ مگر بڑی ہی بے شرمی ہے! ـــ اس کے قدم اور جلدی جلدی اُٹھنے لگے۔ وہ جلدی سے ہمسائی کی کوٹھی اور اپنے بنگلے کے درمیانی دروازے میں سے نکل گئی۔

بنگلہ اندھیرا تھا۔ نوکر چاکر، ماما دائیاں، میاں، سب ہی تو آج شادی کے گھر میں ہاتھ بٹانے، برات اُتارنے، مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے میں مشغول تھے۔ اسی لئے اسے یہ پُرانا گھر اجنبی سا معلوم ہوا۔ مگر وہ ذرا نہ جھجکی۔ وہ سیدھے اپنے کمرے میں چلی گئی، اس نے بٹن دبا کر روشنی کی۔ وہ اپنی سنگار میز کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اُس نے قدِ آدم آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ چوڑی پیشانی پر سیاہ چمکتی ہوئی زلفیں، پتلی جھکی ہوئی بھووں کے نیچے دو سیاہ چمکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں۔ اُن میں سُرخ سُرخ ڈورے۔ پتلی چھوٹی ناک، میانہ دہانہ، ٹھوڑی کے ٹھیک بیچ میں ایک ہلکا سا گڑھا اور اس میں ایک چھوٹا سا سیاہ تل ـــ اسے خود ہی اپنی صورت پر پیار آ گیا۔ وہ مسکرائی۔ اُس نے اپنی پتلی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے اور زبان نکال کر خود اپنی صورت کا منہ چڑا دیا! ـــ پھر وہ زور سے ہنسی اور اسی طرح ہنستی میاں کے دفتر میں گئی۔ اس نے ان کی میز پر رکھے ہوئے ٹیلیفون کا "ریسیور" اُٹھایا، ہمسائی کے مردانے کا نمبر بتایا اور انتظار کرنے لگی۔ کسی نے وہاں سے "ہیلو" کہا۔ اس نے کہا "محتشم صاحب کو ٹیلیفون پر بھیجو"۔

اس کا دل دھڑکنے لگا۔ بڑی بے حیائی ہے۔ وہ دل میں کیا سمجھیں گے۔ ہاتھ کانپنے لگا۔ اس نے "ریسیور" میز پر رکھ دیا۔ اس کا جی چاہا وہ یہاں سے بھاگ جائے۔ آخر آج اسے ہو کیا گیا ہے؟ وہ کیوں بوکھلائی بوکھلائی سی ہے؟ آخر میاں سے کیا کہے گی؟ اس کے نتھنوں پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلکنے لگے۔ اس نے "ریسیور" اُٹھایا کہ اسے چپکے سے ٹیلیفون کے "ٹرنسمیٹر" پر رکھ کر گفتگو کا موقع ہی نہ دے۔ لیکن اُس کے اُٹھاتے ہی آواز آئی۔ ان کی پیاری آواز ـــ "ہیلو"۔ گھبرا کر بول اُٹھی "فدا ـــ ذرا یہاں آئیے کام ہے!"

"اچھا آپ ہیں! ابھی آیا سرکار!"

اب کیا کیا جائے؟ اب تو راہِ فرار بھی مسدود ہو گئی! وہ تھوڑی دیر کھڑی کھڑی کانپی۔ پھر دفتر کی روشنی بجھا کر اپنے کمرے میں آئی۔ دو مسہریوں پر سپید سپید چادریں، پائینتی ریشمی دلائیاں، سرہانے دو دو تکئے۔ ایک طرف اس کی سنگار میز۔ اس پر آرائش و زیبائش کے سامانوں میں مشرق و مغرب کی آمیزش۔ کنگھا، برش، پاؤڈر، کریم، سینٹ، عطر، سرمہ، چاندی کا گلوری دان، کچھ انگوٹھیاں۔ دوسری جانب ان کی میز۔ اس پر مردانے برش اور کنگھے کے ساتھ ساتھ ایک جوڑی ڈمبل ـــ

"کس قدر خوبصورت ہے ان کا جسم! تیس برس کے قریب عمر مگر بوٹی بوٹی کسی ہوئی۔ پھرتی، قوت اور مردانگی کا نمونہ! جب ہی تو بڑے گھمنڈ سے کہتے تھے "تمہاری جسمانی خوبصورتی بچہ نہ ہونے ہی تک ہے، پیاری بنّو!" ـــــ اور میرے شرمانے اور دوپٹہ میں مُنہ چھپانے پر کس طرح ہنستے ہیں۔ "مخفی کہتی ہے۔ حجابِ نوعروساں در بر شوہر نمی ماند۔ اگر ماند شبے ماند شب دیگر نمی ماند!" اور تم ہو کہ اب تک چھوئی موئی بنی ہو! لجا ؤ! جھینپو! " ـــــ اور آج کیا کہیں گے وہ؟ انہیں کی بات سچ ہوئی! میں ان سے برابر لڑی کہ ہر عورت فطرتاً رنڈی نہیں

ہوتی۔ وہ کہتے "تم اپنا ذکر نہ کرو۔ تم عورت نہیں ہو، تم تو قطبین کی نہ پگھلنے والی برف کی سِل ہو، ہاتھی دانت کی مورتی ہو، سنگ مرمر کی پری ہو!" ـــــ ہائے اللہ یہ مجھے کیا ہو گیا کہ میں نے ان کو خود سے بلا لیا۔ وہ چاہیے میرے دکھانے کو کتنا ہی خوش ہوں، لیکن دل میں ضرور کہیں گے "نکلی جمیلہ بھی رنڈی ہی!" ۔ اور وہ اپنی مخصوص ہنسی ہنسیں گے، وہی جس کا ہر قہقہہ کہتا ہے "تمہارا میاں کبھی غلط بات کہتا ہی نہیں بنو! ـــــ وہ عورت کی رگ رگ پہچانتا ہے، بی بنو!" ـــــ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ جیسے کوئی سچ مچ وہاں کھڑا ہے، جیسے کوئی سچ مچ اسے جھینپتے دیکھ رہا ہے۔ وہ اسی طرح کھڑی کھڑی دو ایک بار جھومی اسے محسوس ہوا کہ اس میں قوت مقاومت نہیں رہ گئی اور اب بات اس کی برداشت سے باہر ہو گئی۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کے آہٹ پر کان لگائے، کہیں وہ آ تو نہیں رہے ہیں! اس نے جلدی سے روشنی گل کی اور لمبے لمبے قدم رکھتی، مڑ مڑ کر دیکھتی، ـــ ہمسائی کی کوٹھی میں چلی گئی ـــ

دیوار تو درمیان تھی ہی۔ بس اپنی پھلواڑی طے کی اور ان کے صحن میں جا لی۔ لیکن اتنی راہ اس گھبراہٹ سے گذری کہ ہمسائی کے ہاں پہنچتے پہنچتے وہ ہانپنے لگی۔ دل دھڑک رہا تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہمسائی کی شکایت اور سہیلیوں کے طعنوں کا جواب وہ بڑی مشکل سے رُک رُک کر دے سکی۔ جب ذرا دم ٹھکانے ہوا تو ان انوکھے جذبات و خیالات کو بھلانے کے لئے وہ کام پر پل پڑی۔ اس نے ساری بیویوں کو کھانا کھلایا، پان پہ پان بنا کے دئے، دلھن کو سنوارا، دولھا کے اندر آنے پر رسمیں کرائیں، اور تاروں کی چھاؤں میں اللہ کو سسرال رخصت کر کے وہ گھر پلٹی ـــ تھکی ہوئی چور، افسردہ و مضمحل، بابل کے پُر حسرت گیت کی کھٹک دل میں لئے ہوئے ـــــ

پھیکی چاندنی اب بھی پھیلی تھی۔ پھولوں پر شبنم کے موتی جھلک رہے تھے، ہوا میں خنکی کے ساتھ ساتھ ایک خوشبودار مستی تھی، آس پاس کے درختوں سے چڑیوں کے چہچہانے کی آواز کانوں میں ایک خوشگوار جھنجھناہٹ پیدا کر دیتی تھی ـــــ اس نے انگڑائی لی۔ رگوں کے ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ ساتھ ایک غنچے کے چٹخنے کی آواز بھی سنائی دی پلٹ کر دیکھا تو گلاب کی ایک کلی کھل رہی تھی۔ وہ گنگنا اٹھی۔

"ہو گئیں کیاریاں ہری ہری جیسے کہ رت پلٹ چلی، کلیوں پہ مسکرا دیا، ہنسنے لگی کلی کلی!" رُت پلٹ چلی۔ رُت پلٹ چلی۔ اس نے بار بار دہرایا۔ اس کا اضمحلال غائب ہو گیا۔ اس کے دل میں تمام وہی جذبات عود کر آئے جو ٹیلیفون کرنے سے پہلے موجزن تھے۔ اس کا بے ساختہ جی چاہا وہ میاں کو جگا کر کھینچ لائے۔ چلو پھولوں کا کھلنا دیکھو، گلوں کے کٹوروں میں شبنم کے موتی دیکھو، اور رات کی دن سے ہم آغوشی دیکھو ـــــ

اس کے قدم تیز ہو گئے، اس کا تنفس تیز ہو گیا، اس کی گردن آگے بڑھ گئی، گویا وہ اپنے میاں کی طرف اسی طرح کھنچی جا رہی تھی۔ جیسے فولاد مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔ دالان میں پہلے میاں کے دفتر کا کمرہ ملتا تھا اس نے اپنی سانس کو قابو میں کرنے کے لئے اسے کھول کر جھانکا۔ اسے یقین تھا۔ یہاں کوئی نہ ہوگا۔ "وہ" اپنی مسہری پر دراز آرام کرتے ہوں گے۔ لیکن صبح کے دھندلکے میں کوئی مخملی قالین پر پڑا ہوا معلوم ہوا۔ اسے تعجب سا ہوا۔ اس نے اندر ہاتھ بڑھا کر سوئچ دبا دی ـــــ

اس کی جوان ماما رمضانی بے خبر سوئی تھی۔ لٹیں چھٹکی ہوئی، کپڑے بے ترتیب، لٹے ہوئے مسافر کی بے پروائی! جمیلہ نے جھنجھلا کر سوچا "اس مالزادی کو یہاں لیٹنے کی کس نے اجازت دی!" اس نے ادھر ادھر نظر ڈالی۔ میاں کا ایک موزہ میز پر رکھا تھا، ایک نیچے گرا تھا، کالی شیروانی رمضانی کے سرہانے فرش پر پڑی تھی، اور وہ بغل والے حمام میں لہرا لہرا کے گا رہے تھے ـــــ

"داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے!"

"مرمر کی پری" نے "چیخ روکنے کے لئے" اپنے ہی ہاتھ سے اپنا منہ بند کر لیا!

ابراہیم جلیس

لڑائی

کنگسوے سے بارکس تک گلبرٹ کو راستے میں کئی عورتیں ملیں۔ اچھی صورتوں والی، دلآویز جسموں والی، خوش رنگ لباسوں والی عورتیں، لیکن اُس نے کسی کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ تیز تیز قدم اُٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ سُورج کی تیز چمک سے اس کا غصّہ سے تمتایا ہوا چہرہ اور بھی لال بھبوکا ہوا جا رہا تھا۔ ایک مس فلورا سے جھگڑا ہو جانے پر وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے دنیا کی ساری عورتوں سے اس کی چل گئی ہے۔

بارکس کے پھاٹک پر ایک ٹرک گھرگھراتی ہوئی اسٹارٹ ہو رہی تھی — اسٹیرنگ پر واٹسن — گلبرٹ کا ہم وطن اور ہم راز دوست جھکا ہوا تھا۔ گلبرٹ کے تمتاتے چہرے، اکڑے تیور اور کھنچے ابرو دیکھ کر وہ مسکراتا ہوا ٹرک سے اُترا اور بولا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فلورا سے آج پھر تمہارا جھگڑا ہو گیا ہے یار بڑے جھگڑالو عاشق ہو تم —"

گلبرٹ نے پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ٹھونس کر جسم اکڑاتے ہوئے کہا۔ "فکن ڈیم مس فلو —"

واٹسن گلبرٹ کی رگ رگ سے واقف تھا۔ شاید گلبرٹ بھی اپنے بارے میں اتنے صحیح معلومات نہیں رکھتا تھا۔ جتنے کہ واٹسن کو معلوم تھے۔ واٹسن کی عادت تھی کہ وہ جس سے ملتا تھا اس کو صرف دیکھتا ہی نہیں تھا۔ بلکہ باضابطہ طور پر اس کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ گلبرٹ تو اس کا چوبیس گھنٹوں کا ساتھی تھا۔ اس لئے اس نے گلبرٹ کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔ "تو آؤ — کسی بار میں چل کر غم غلط کریں۔ یہ کسی سپاہی کے شایانِ شان نہیں کہ وہ اتوار کی تعطیل یوں مُنہ لبسورتے گزار دے۔ مُنہ لبسورنے کے لئے تو اور چھ دن پڑے ہیں۔"

گلبرٹ اس وقت کہیں نہیں جانا چاہتا تھا۔ آرام سے بستر پر لیٹے یا سبز کینوس کی آرام کرسی پر بیٹھے سگار پیتے ہوئے جارج سے انتقام لینے کے طریقے سوچنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے مُنہ بناتے ہوئے کہا۔ "نہیں بے — فکن میں کہیں نہیں آؤں گا۔"

واٹسن ایسے موقعوں پر گلبرٹ کو دوستانا سمجھاتا نہیں تھا۔ بلکہ اسے پکڑ کر سینے سے لگا لیتا۔ گلبرٹ وقتی طور پر اس پر برس پڑتا اور ممکن ہے گھونسے بھی لگا دیتا لیکن گھونسوں کی تعداد جیسے جیسے بڑھتی جاتی واٹسن کی ہنسی بھی کھنکھنانے لگتی۔ حتیٰ کہ گلبرٹ بھی کھسیانے لگتا اور بات ختم ہو جاتی . . . . . . اور بات ختم ہو گئی۔

گلبرٹ واٹسن کی پہلو والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹرک گھرگھراتی ہوئی چل نکلی۔ بارکس کے منچلے سپاہیوں کا گیت . . . . . . چک چک چک — بوم چک . . . . بوم چک — مدھم ہوتا ہوتا مر گیا۔ اور پلاٹنا اسٹریٹ کے چوراہے سے شہر کا شور بلند ہوا — گھُم۔ گھُم۔ ایک بے مفہوم بے معنی شور جیسے لاتعداد مکھیوں کی بھنبھناہٹ — جو ٹرک کی گھرگھراہٹ پر بھی بھاری تھی۔

ڈبلیو۔ اے۔ سی ہوسٹل کے پھاٹک پر دس بارہ "پیٹی کوٹ سولجرس" کھڑی ہوئی تھیں۔ واٹسن نے شرارتاً انہیں سلام کرتے ہوئے گلبرٹ کی کمر میں کہنی ماری اور بولا۔ "ہاں اب سناؤ کیا ہوا —"

گلبرٹ نے جیب سے سگریٹ کیس نکالتے ہوئے کہا۔ "ہوتا کیا ہے — فکن وہ سالا جارج — میں اسے جان سے مار دوں گا۔ وہ میرے ہر راستے میں روڑا بن کر آ جاتا ہے۔"

واٹسن عادتاً مسکرانے کے بجائے کچھ سنجیدہ ہو گیا اور "ہوں" کہہ کر ٹرک کی رفتار تیز کر دی۔ سڑک سنسان تھی۔ کبھی کبھار کوئی اچھی شکل وصورت اور اچھے لباس والی عورت بھی نظر آ جاتی تھی۔ ورنہ جتنی عورتیں فٹ پاتھ پر چل پھر رہی تھیں۔ نچلے طبقے کی نچلی قسم کے رنگ والی۔ بے ڈھنگی خالص ہندوستانی — پیلی پیلی تیز دھوپ سیمنٹ روڈ پر پڑی چندھیا رہی تھی۔ دونوں خاموش تھے — جارج! جارج!! وہ نہ صرف گلبرٹ کے راستے کا بلکہ واٹسن کے راستے کا بھی روڑا تھا۔ وہ امریکن تھا۔ گلبرٹ اور واٹسن دونوں انگریز —

یا جارج صرف ایک بوڑھا تھا اور گلبرٹ اور واٹسن صرف راہگیر —— جارج کی بدولت گلبرٹ اور واٹسن کو کبھی کبھی خفتیں اور ہزیمتیں اٹھانی پڑی تھیں۔ سڑکوں پر، ہوٹلوں میں، ٹانگہ اسٹانڈز پر، شراب خانوں میں، ناچ گھروں میں، وہ کاونٹر میں، ہیر کٹنگ سیلونس میں، فوٹو اسٹوڈیوز میں، رنڈیوں کے کوٹھوں پر، سوسائٹی کی لڑکیوں میں .... گلبرٹ نے واٹسن سے یا واٹسن نے گلبرٹ سے کہا ہو یا نہ کہا ہو۔ مگر دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ جارج کی موجودگی میں واٹسن کو بھی وہی زک اٹھانی پڑتی تھی جو کہ گلبرٹ کو —— پرسوں شام واٹسن چینی بار میں شراب پینے گیا تھا۔ اتفاق سے جارج اور واٹسن ایک ہی میز پر بیٹھے تھے۔ لیکن بیرہ جس تیزی اور مستعدی سے جارج کے آرڈرس کی تعمیل کر رہا تھا۔ اتنی ہی کاہلی اور بے دلی سے واٹسن کے آرڈرس سنتا تھا۔ حالانکہ اس دن واٹسن نے بیرے کو جارج سے تگنی زیادہ بخشیش دی تھی۔ بیرے نے خوش ہو کر خاص انداز میں اسے سلام تو کیا لیکن اس کی مسکراہٹ علانیہ طور پر کہہ رہی تھی —— صاحب ہر فرائی ڈے گڈ فرائی ڈے تو نہیں ہوتا۔ تم نے آج اتنی بخشیش دی۔ کل کہاں دو گے جارج صاحب تو روز اتنی بخشش دیتا ہے کہ ایک دن کی تنخواہ سے زیادہ پیسے مل جاتے ہیں۔

ٹرک موڑوں پر مڑتی، سنسان سڑک پر تیز دوڑتی، بھیڑ بھاڑ میں سست رفتار ہوتی چلی جا رہی تھی۔ گلبرٹ نے واٹسن کو اس طرح خاموش دیکھ کر پوچھا۔ "تم کیا سوچ رہے ہو —— لیکن بتاؤ ہمیں کہاں جانا ہے؟"

واٹسن نے جواب دیا۔ اتوار کے دن پروگرام بنا کر سیر کرنا صریح حماقت ہے۔ ارے کہیں چلیں گے —— جہاں جی چاہا ——

جہاں جی چاہا!!

گلبرٹ نے منہ لٹکاتے ہوئے کہا "مگر تمہاری یہ فکن خاموشی مجھے مطلق پسند نہیں۔ کچھ باتیں کرو۔"

واٹسن نے مسکرا کر پوچھا "کیا باتیں کریں —— ! تم ہی سناؤ کچھ۔"

گلبرٹ کے ذہن پر جیسے ابھی تک جارج ہی سوار تھا۔ اسے جارج کے علاوہ اور کوئی موضوع ہی نہ ملتا تھا۔ اسی لئے اس نے پھر اسی کو باتوں کا موضوع بنا ڈالا۔ "یار واٹسن —— کل اس بڈھے جارج نے پھر میری بے عزتی کر دی۔ میں ناچ گھر جانا چاہتا تھا۔ تانگے کو پانچ روپے میں ہائر کیا۔ سمجھے پانچ روپے میں صرف دو فرلانگ کے لئے —— لیکن نہ جانے آسمان پھٹ پڑا یا زمین تڑخ اٹھی اور جارج نازل ہو گیا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی سالے تانگے والے نے تانگہ اسی کی طرف بڑھا دیا۔ اور بغیر کرائے کی بات چیت کئے جارج تانگے میں بیٹھ گیا۔ اور مجھے ایسی طنزیہ اور حقیر نظروں سے دیکھتا رہا۔ کہ جی چاہتا تھا کہ وسکی کے چاروں پگ کا نشہ ایک ہی گھونسے میں بھر کر اس کے جبڑوں پر اتار دوں۔ لیکن ....

واٹسن نے بات کاٹی۔ لیکن یہ تو کوئی بڑی ہتک نہیں۔ تین چار روز پہلے گرین کیفے" میں میرے ساتھ ایلیفنٹ برج کی ایک چھوکری ساتھ تھی۔ میں اسے" ارما آف دی سادرن سیز" دکھانے پلازا لیجانے والا تھا۔ میں نے اسے چار ہی بجے سے انگیج کر لیا تھا۔ ٹیکسی میں شہر کی ساری سڑکیں گھما ڈالیں۔ گرین میں ڈنر کھلایا۔ اور جب ہم شمپین کے خم لنڈھا رہے تھے —— اور جب ہم شمپین کے خم لنڈھا رہے تھے !! - گلبرٹ نے جملہ دہرایا - اور جب تم شمپین کے خم لنڈھا رہے تھے —— ؟

واٹسن نے کہا۔

ہاں جب ہم شمپین کے خم لنڈھا رہے تھے —— وہ —— وہ سالا جارج آ موجود ہوا۔ اور وہ ندیدی چھوکری ایک منٹ کی اجازت لے کر اس سے ملنے چلی گئی۔ میں نے ایک منٹ، دو منٹ، تین منٹ، ساٹھ منٹ انتظار کیا —— شمپین کے خم کے خم لنڈھاتا رہا مگر ...

گلبرٹ نے اس کی بات اچک لی۔

مگر یہ بھی کوئی بڑی ہتک نہیں۔ تمہاری اس ہتک کا کسی کو بھی پتہ نہ چلا ہوگا۔ اس کیفے میں جتنے آدمی بیٹھے تھے سبھوں نے یہ سمجھا ہوگا۔ کہ تم نے اس لڑکی کو صرف ڈنر کی دعوت دی تھی۔ اب یہ کرو کہ وہ لڑکی جہاں بھی ملے اس سے انتقام لو۔ ایک روپیہ دیئے بغیر اسے پورے چوبیس گھنٹے انگیج کر لو۔"

واٹسن نے کہا۔

یار۔ تم انتقام کی کہہ رہے ہو۔ میں تو اب اس لڑکی سے آنکھ ملا کر بھی بات نہیں کر سکتا۔ یہ پیسوں کی بھوکی چھوکریاں اسی کو طاقتور مرد سمجھتی ہیں۔ جس کی پاکٹ میں زیادہ دام ہوں۔ اور پھر وہ ایک چھوکری ہے۔ اور ہماری تہذیب بیہودہ ہے۔ اس تہذیب میں تو ایک آوارہ کی ذلیل سی ذلیل عورت تک کی عزت کرنی پڑتی ہے۔ میں "لیڈیز فرسٹ" کے اخلاق سے تنگ آ گیا ہوں۔

"عورت پہلے آ گئی تہذیب پیچھے رہ گئی —— مجھ پر لعنت ہو۔" گلبرٹ نے بھنچی ہوئی مٹھی اپنی آہنی ران پر مارتے ہوئے کہا۔ "تو پھر جارج سے انتقام لو ——"

واٹسن نے چوراہے پر کھڑے ہوئے ٹریفک کے سپاہی کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کا نوٹس لئے بغیر غلط سائیڈ پر ٹرک موڑ دی اور ہنس پڑا۔ جیسے چوراہے پر ٹریفک کا سپاہی نہیں کھڑا تھا بلکہ جارج کھڑا تھا۔ اور واٹسن نے اپنا انتقام پورا کر لیا تھا۔ یہ انتقام ذلیل قسم کا تھا۔ مگر ہنسی نے دونوں کے دلوں کو تھوڑی دیر کے لئے ہلکا اور شگفتہ بنا دیا تھا۔ واٹسن نے کہا۔

"جیمس اسٹریٹ کے ایک ہیر کٹنگ سیلون میں جارج سے میں نے انتقام لے لیا ہوتا مگر عین وقت پر وہ مل گئی تھی وہ —— یار وہ کیا نام ہے اس کا ——؟ وہی جس کے بائیں گال پر ایک ننھا سا سیاہ تل ہے"

گلبرٹ نے پوچھا —— "کون میریا ——؟"

واٹسن نے کہا —— نہیں یار وہ جو الگزنڈرا بار کی دوسری منزل پر رہتی ہے۔ اس کا نام شاید "الف" سے شروع ہوتا ہے"

گلبرٹ نے کہا —— "فریڈا ——!!"

واٹسن نے کہا —— ہاں ہاں فریڈا —— پیاری فریڈا —— وہ بال ڈریس کروانے وہاں آ گئی تھی۔ مگر مجھے دیکھ کر اپنا مرمریں ہاتھ میری بغل میں اڑس کر سینٹی شو چلنے پر اصرار کرنے لگی۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر کچھ ایسا شوخ رنگ لپ اسٹک چڑھا ہوا تھا۔ کہ میں بالکل ہی بھول گیا کہ وہاں جارج موجود ہے اور اس سے مجھے انتقام لینا ہے۔ ہاتھوں میں جمع ہوتی ہوئی جسم کی ساری طاقت میں نے فریڈا کی بانہہ کو اپنی بغل میں نہایت گرمجوشی سے دبانے میں صرف کر دی۔ اور ....

گلبرٹ آگے بولا۔

"اور میں بھی اسی سیلون میں جارج کو جہنم بنا دیتا۔ اور اس سیلون والے کی بیوی کو بیوہ بنا دیتا۔ اصل میں وہ سیلون والا ہے بڑا بدتمیز۔ میں آدھ گھنٹے سے سیلون میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا کہ اب کوئی کرسی خالی ہو اور میں شیو بنوا لوں۔ لیکن جونہی پھر آ دھمکا یعنی وہی جارج۔ —— اس وقت ایک کرسی خالی ہوئی اور سیلون والے نے وہ کرسی جارج کے حوالے کر دی۔ میں اس سے اُلجھ پڑا کہ میں آدھ گھنٹے سے انتظار کر رہا تھا تو سالے نے کوئی جواب ہی نہ دیا۔ اگر اس وقت یہاں تین چار فکن ہندوستانی اور حبشی سپاہی نہ ہوتے تو میں دونوں کو موت کی آگ میں جھونک دیتا۔"

واٹسن نے کہا ——

"تم نے بہت اچھا کیا۔ گلبرٹ جو اُن حبشی اور ہندوستانی سپاہیوں کے سامنے جارج سے کچھ نہ کہا۔ جارج ہمارا رقیب —— ہمارے کا روڑا ہے تو کیا ہوا۔ ہے تو وہ اونچی نسل کا۔ یعنی ہماری تمہاری نسل کا۔ اگر تم اس وقت اس سے لڑ پڑتے تو نیچی نسل اور ذلیل رنگ کے حبشیوں اور ہندوستانیوں کے سامنے رنگ و نسل کی ساری عزت کرکری ہو جاتی"

گلبرٹ تائید میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ٹرک ایک چھوٹے سے خوبصورت مکان کے پھاٹک پر رُکی۔ برآمدے کے کھمبوں کے ساتھ عشق پیچاں کی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ برآمدے کے بیچوں بیچ ایک تپائی رکھی ہوئی تھی۔ جس پر سبز رنگ کا ٹیبل کلاتھ پڑا ہوا تھا۔ تپائی کے اطراف پیلی پیلی چمکدار بید کی چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کرسی پر فلورا کالی کالی بُندکیوں والا پیلا فراک پہنے اپنی ایک ننگی پنڈلی تپائی پر ٹکائے کوئی واہیات سا شہوت انگیز ناول پڑھ رہی تھی۔

ٹرک کی آواز سن کر اور گلبرٹ اور واٹسن کو دیکھ کر مسکراتی ہوئی پھاٹک تک آئی۔ باہر ٹرک سڑک کے کنارے اپنی دونوں بجھی بجھی آنکھوں سے سامنے خلاء میں گھورتی چپ چاپ کھڑی تھی۔

پچیس تیس منٹ بعد گلبرٹ، واٹسن اور فلورا باہر نکلے۔ فلورا نے نارنجی اور گہرے اُودے رنگوں کے دلآویز امتزاج والا فراک پہنا

پہنا ہوا تھا۔ فراک کا وہ حصہ جو ساڑھے چار بالشت گول کر کے نیچے سے سپید سپید مرمریں گھٹنوں تک پھیلا ہوا تھا گہرے اودے رنگ کا تھا۔ کمر کے اوپر سے فراک کا رنگ نارنجی تھا۔ جو اس کی گٹھیلی نوکیلی چھاتیوں پر خوب پھنس کر آیا تھا۔ پیچھے بیٹھ پر چوٹی کے برابر چھ بٹن لگے ہوئے تھے۔ بٹنوں کے لگ جانے کی وجہ سے فراک پر ایسی خفیف سی جھریاں ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ چمٹ گئی تھیں جیسے یہی جھریاں دیکھنے والے مردوں کی ریڑھ کی ہڈی میں جنسی ارتعاش بن کر اُتر جاتی ہیں۔ فلورا کے بال سنہرے تھے اور پریشان پریشان —— اُودے اُودے اسٹریپس والے سینڈل میں اپنے سپید سپید پاؤں اُٹھاتی، کولہے مٹکاتی، گلبرٹ اور واٹسن کے بیچ میں چل رہی تھی۔ گلبرٹ کے ہونٹوں پر ایک ظفرمند مسکراہٹ تھی اور واٹسن کے ہونٹ "نارماشیریر" کا گایا ہوا بوڑھا گیت سیٹی کی آواز میں اگل رہے تھے۔ ٹرک کو وہیں چھوڑ کر وہ کنگسوے کی طرف پیدل ہی چلنے لگے۔ بوڑھی ترک اپنی موٹے مدھم شیشوں والی آنکھوں سے فلورا کے چھلکتے کولھے اور تھرکتی پنڈلیاں بڑی دور تک دیکھتی رہی اور دیر تک سوچتی رہی۔

چلتے چلتے فلورا نے چونک کر گلبرٹ سے پوچھا۔ "اگر راستے میں جارج مل جائے تو —— ؟"

گلبرٹ نے پوری انگریزی نخوت کا مظاہرہ کیا۔ "لیکن ہم ڈارلنگ —— میں اس کے سارے پیسے لوٹا دوں گا۔ ڈونٹ وری —— کتنے پیسے دیئے تھے اس نے تم کو —— ؟"

فلورا نے کہا۔ "ساٹھ روپے —— "

گلبرٹ نے جیب سے منی پرس نکال کر اسے دکھاتے ہوئے پوچھا۔

"بس صرف ساٹھ روپے —— لیکن —— میں اس کو دوگنے دام بھی دے سکتا ہوں، تم فکر نہ کرو پیاری —— !" اور پھر پرس اس نے اپنی جیب میں رکھ لی۔ خالص انگریزی انداز میں۔ بالکل اسی طرح جس طرح اٹلانٹک چارٹر پاس ہونے کے بعد ایک محفوظ مقام پر رکھ دیا گیا۔

وکٹوری بار پہنچ کر تینوں نے خوب شراب پی۔ واٹسن ابھی تک نارماشیریر کا بوڑھا گیت سیٹی کی دھن میں گا رہا تھا۔ گلبرٹ اور فلورا شہوت آمیز محبت کی باتیں کرتے رہے۔ اسی اثنا میں جارج بھی وکٹوری بار میں داخل ہوا۔ فلورا کو دیکھ کر مسکراتا ہوا اس کے قریب آیا۔ دونوں تعیوں کے چہرے فق ہو گئے کہ کہیں فلورا پھر جارج کے ساتھ نہ چلی جائے کہیں —— !! کہیں فلورا .... !!

فلورا نے جارج کے قریب آتے ہی کہا —— میں نے تمہارا بڑی دیر تک انتظار کیا ڈارلنگ مگر ......

جارج نے مسکراتے ہوئے جواب دیا —— مگر کر کی بات نہیں۔ میں خود بھی آج صبح سے بہت مصروف تھا۔ اچھا کل ......

ابھی جارج نے پوری بات کہی بھی نہ تھی کہ گلبرٹ نے جیب سے منی پرس نکالا کہ کہیں جارج فلورا کو کل کے لئے پھر انگیج نہ کرلے۔ پرس کو میز پر رکھتے ہوئے کہا ——

جارج یہ رہے تمہارے ساٹھ روپے جو تم نے فلورا کو دیئے تھے۔ اب فلورا میری ہے۔ اب فلورا ہمیشہ کے لئے میری رہے گی۔"

جارج نے پہلے تو اپنی مسکراتی آنکھیں گلبرٹ کی شعلہ بار آنکھوں سے ملا دیں اور پھر مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے بولا۔

مبارک ہو گلبرٹ —— فلورا اب ہمیشہ تمہاری ہی رہے گی۔ مائی فرینڈ گلبرٹ ——

اور اس نے نکاح پڑھانے والے پادری کی طرح دونوں ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "مقدس خدا سے دُعا ہے کہ تم دونوں پر یسوع مسیح کی رحمتیں ہمیشہ نازل ہوتی رہیں۔"

گلبرٹ اور واٹسن رقیب کی اس زہریلی ہنسی کو یہ جبر پی رہے تھے۔ جارج گلبرٹ کی کرسی کے پیچھے آیا اور جھک کر اپنی دونوں ہتھیلیاں گلبرٹ کے کندھے پر رکھ دیں۔ اور بڑے پیار سے اُس کے تمتماتے ہوئے گال تھپکتے ہوئے بولا۔

مائی ڈیر فرینڈ —— تم بہت غصیلے ہو۔ ابھی بہت نو عمر ہو نا —— ! عورت کے بارے میں بہت سنجیدگی کی ضرورت ہوتی ہے —— خیر سیکھ ہی جاؤ گے —— فلورا ہی سکھا دے گی کسی دن —— ہاں اچھا —— کل تم تینوں کو کنگسوے کے چوراہے پر ضرور ——

ٹھیک ساڑھے چھ بجے شام۔ برس اسٹینڈرڈ ٹائم ـــــ کل ڈوروتھی سے میری شادی ہو گی۔"

گلبرٹ اور واٹسن نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

ڈوروتھی ـــ!

ڈوروتھی ـــ!!

اور جارج ڈوروتھی کو جو ہوٹل کے باہر کار میں بیٹھی تھی بلانے کے لئے چلا گیا۔ جارج پھر جیتا ـــــ امریکہ پھر جیتا ـــــ گلبرٹ اور واٹسن آخری بار ہزیمت خوردہ رقیبوں کی طرح ایک دوسرے کے بجھے بجھے چہروں کو دیکھنے لگے مگر ان کی نظریں کہیں اور تھیں ـــ کسی بہت ہی چمکیلے چہرے کی زد میں ـــــ ڈوروتھی کے چاند سے چھوٹتی ہوئی کرنوں سے اُلجھی ہوئی۔

ڈوروتھی کیپٹن باربرا کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اور ساری چھاؤنی کی اکلوتی خوبصورتی ـــــ اور "ہیومیڈیو بلڈ" تھا اس کے جسم میں۔ بارکس کے سپاہی ڈوروتھی کے لئے پاگل تھے۔ لیکن ڈوروتھی سوائے گلبرٹ کے کسی کو بھی میٹھی مسکراہٹ اور ملائم نظروں سے نہیں دیکھتی تھی۔ اس نے ڈریم لینڈ کے پارک میں کئی سپید سہانی شامیں گلبرٹ کے ساتھ گزاری تھیں۔ گلبرٹ نے اس کے قرمزی ہونٹوں کو کئی بار چوما تھا۔ اس کی ایک قدم پر ایک بل کھانے والی کمر کے گرد اپنے لمبے چوڑے بازو کے گھیرے ڈالے تھے۔ وہ ڈوروتھی ـــ وہی ڈوروتھی .... وہی ڈوروتھی جارج کے پہلو میں سمٹی سمٹی اپنی ملائم نظروں میٹھی مسکراہٹ اور شیریں اداؤں کے ساتھ بار کے سرخ قمقموں کے سُرخ اجالے میں بجلی کی طرح چمکی اور بار میں بیٹھے ہوئے سارے سپاہی اپنے اپنے جام اور اپنے اپنے دل تھام کر رہ گئے۔ جارج نے جان بوجھ کر ڈوروتھی کا گلبرٹ سے تعارف کرایا۔ لیکن گلبرٹ نے میز پر کہنیاں ٹیک کر اپنے بھدے بالوں والا سر ہتھیلیوں میں تھام لیا۔ کچھ دیر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اور معاً اٹھا۔ ـــــ اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا بار کے سرخ اجالے سے باہر نکلا۔ اور اندھیرے میں روپوش ہو گیا۔

(۲)

بہت دنوں بعد گلبرٹ ایک بار پھر اُجالے میں جیمس اسٹریٹ پر سگار کا دھواں اڑاتا تھکے تھکے قدموں سے چلتا نظر آیا ـــــ اکیلا۔ گلبرٹ کے ہمراز اور غمگسار دوست واٹسن کی بدلی جنوب کی کسی دوسری چھاؤنی میں ہو گئی۔ اور گلبرٹ سکندر آباد کی سڑکوں پر اکیلا رہ گیا۔ دن بھر سڑکوں پر مارا مارا پھرتا۔ دوکانوں میں بے مقصد گھستا۔ چیزوں کو اُلٹ پلٹ کر کے دیکھتا۔ باہر نکل آتا۔ ہوٹلوں میں جاتا۔ بغیر کسی خواہش کے خوب شراب پیتا۔ بدصورت سے بدصورت لڑکیوں کا تعاقب کرتا۔ سنیما گھروں میں جاتا۔ یہ معلوم کئے بغیر کہ کونسی پکچر چل رہی ہے ٹکٹ خریدتا اور جا بیٹھتا۔ لیکن اوقات انٹرول سے پہلے ہی بارکس چلا جاتا۔ بارکس میں اپنی مخصوص سبز کینوس کی آرام کرسی پر گھنٹوں بیٹھا چپ چاپ سگار پیتا رہتا۔ اتوار کے اتوار فلورا کے گھر جاتا۔ اس کے ہونٹ خریدتا۔ چوستا چوستا مگر اسے وہ مزا میسر نہ آتا تھا جس کے لئے اس کے سارے حواس پیاسے رہتے تھے۔

انہی دنوں فلورا کا سگا بھائی پال پنجاب کی کسی چھاؤنی سے بدل کر سکندر آباد چھاؤنی آ گیا۔ گلبرٹ کو پال کے روپ میں اس کا اپنا پیارا دوست واٹسن مل گیا۔ پال اور واٹسن کے عادات میں (شکل و صورت اور رنگ و نسل سے قطع نظر) ایسی حیرت ناک مشابہت تھی۔ کہ کئی بار گلبرٹ نے پال سے کہہ بھی دیا۔

"یار سکندر آباد اب پھر سکندر آباد ہو گیا ہے۔"

پال کے لئے یہ جملہ بظاہر بے مطلب اور بے معنی تھا۔ لیکن گلبرٹ اس سے کہتا "معنی پوچھ کر مزہ کرکرا نہ کرو۔ مجھے لطف اندوز ہونے دو۔ میں بڑے طویل عرصے سے بے مزہ زندگی گزار رہا تھا۔"

گلبرٹ پال کے ساتھ بڑی بے تکلفی کے ساتھ گھومتا رہتا تھا اور گلبرٹ کے بعض یورپین نسل کے دوستوں کو تعجب ہو رہا تھا اور بُرا بھی معلوم ہوتا تھا کہ گلبرٹ اتنی اونچی نسل کا انسان ہو کر ایک اینگلو انڈین لڑکے کے ساتھ یوں بے تکلف ہو گیا ہے اور جنہیں گلبرٹ اور فلورا کے داستانِ معاشقہ کا علم تھا۔ وہ تو اور بھی چڑے ہوئے تھے کہ گلبرٹ اعلیٰ نسل کے سرخ سُرخ خون میں ہندوستانی لہو کی سیاہی مائل سُرخی کی آمیزش

رہا ہے۔

اور خود پال کو بھی گلبرٹ کی یہ بے تکلفی مطلق پسند نہیں تھی لڑائی شروع ہونے سے اب تک وہ کئی چھاؤنیوں میں رہ کر آیا تھا۔ اور اپنی آنکھوں سے اپنی سیاہ چمڑی کی درگت دیکھی تھی۔ ہزاروں واقعات میں سے ایک نمایاں واقعہ ...... ایروڈروم کا بھی تھا جس میں پال کی اتنی بڑی ہتک ہوئی تھی کہ اس کی اور کالنس کی باضابطہ باکسنگ ہو گئی تھی پال اور کالنس ایک ہی ہوائی جہاز سے اُترے تھے ایروڈروم سے چھاؤنی کو جو لاری سپاہیوں کو لیجاتی تھی۔ اس کا ڈرائیور ایک یورپی نسل کا گورا تھا۔ پال کا رینک کالنس سے اونچا تھا۔ لیکن ڈرائیور نے اگلی سیٹ پال کو اس لئے نہیں دی تھی کہ وہ اینگلو انڈین ہے۔ کالا ہے۔ نیچ ہے۔ وہ —— پال کا ڈرائیور سے جھگڑا بھی ہو گیا مگر رینک پر کلر بار ہمیشہ سے بھاری رہا ہے۔ تمدن کی تاریخ کے پاس اس کے ان گنت ثبوت موجود تھے۔ اور پال نے کوفت دُور کرنے کے لئے ایک سگریٹ سلگائی تھی۔

اب یہاں سکندر آباد میں پال اور گلبرٹ ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملائے گھومتے تھے لیکن پال کو ایسا محسوس ہوتا جیسے بیچ میں ایک دیوار رنگ حائل ہے جو بظاہر نہیں دکھائی دیتی البتہ شراب خانوں، ہوٹلوں کے بیرے، دوکانوں کے سیلسمین، ٹیکسی ڈرائیور، تانگے والے، بوٹ پالش والے، باربر، بھیک بخشیش مانگنے والے لونڈوں کو صاف نظر آ جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہ لوگ پال کی موجودگی کے باوجود گلبرٹ کو گھیر لیتے تھے۔ سلام کرتے، گڑگڑاتے تھے۔ اور پال اپنے آپ کو اکیلا شرمندہ اور بے وجود محسوس کرتا تھا۔ اسی لئے پال اکثر گلبرٹ سے کترانے کی کوشش کرتا تھا لیکن گلبرٹ اسے خود ہی کبھی نہ چھوڑتا تھا۔ پال اس کو گلبرٹ کی بے تعصب ذہنیت سمجھتا تھا۔ لیکن گلبرٹ کی ذہنیت کبھی بے تعصب نہیں تھی۔ وہ شائد اس لئے پال سے اتنا زیادہ قریب ہو گیا تھا۔ کہ پال کے پیکر میں اس کو اپنا ہمراز واٹسن نظر آتا تھا۔

سولہ اگست ۱۹۴۵ء کی شام الگزنڈرا بار میں سارے بیروں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کسی نشے میں دُھت رقاصہ کی طرح ناچ رہی تھی۔ ہونٹوں کے مسام مسام سے چنچل خوشی ابل رہی تھی۔ بار کا آرکسٹرا فتح کے سریلے نغمے بکھیر رہا تھا۔ آرکسٹرا کی آواز جب کچھ دھیمی ہو جاتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے جرمنی اور جاپان ایک ساتھ رو رہے ہیں۔ اُن کے جھنڈے زمین پر گر گئے ہیں۔ آنسو پونچھنے کے لئے کوئی کپڑا بھی باقی نہیں رہا۔

گلبرٹ اس وقت جانے کہاں سیرگشت کر رہا تھا۔ بار میں پال اکیلا ہی بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ کہیں نظر نہ آیا۔ تو وہ گھر لوٹا۔ تاکہ آنٹی سے کہہ آئے کہ وہ آج رات وکٹری ڈانس میں شریک ہونے جا رہا ہے۔ اور رات بڑی دیر سے لوٹے گا۔ وہ انتظار نہ کریں۔

آنٹی جیسے پال کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ پال کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے آبدیدہ ہو کر بھرائی ہوئی آواز میں پال سے کچھ کہا اور پال کی انگلیوں سے سگریٹ چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ اور چہرے کی آب اڑ گئی۔

بڑی دیر تک دونوں پاؤں پھیلائے اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے کھڑے رہے، وہ شعلہ بار نگاہوں سے اندھیرے میں جانے کیا دیکھ رہا۔ اندر کمرے میں فلورا سارے گھر والوں سے منہ چھپائے بلانکٹ میں دبکی پڑی تھی۔ اسی اثنا میں باہر کا پھاٹک ٹکراتا ہوا کھلا۔ گلبرٹ اندر آیا اور پوچھا۔ "تم کہاں گم ہو گئے تھے پال —— میں تمہیں بہت ڈھونڈتا رہا۔ آج اس فکٹری بال میں چلو گے یا نہیں"۔

پال کی پلکوں میں آنکھیں نہیں تھیں بلکہ دو سرخ سرخ شرارے تھے۔ وہ چپ چاپ گلبرٹ کو دیکھتا رہا —— گلبرٹ نے حیرت سے پوچھا۔

"تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو —— ؟"

پال تین چار لمحے پھر خاموش رہا۔ اور بہت غراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"گلبرٹ ...... اب تمہیں فلورا سے شادی کرنی پڑے گی"

گلبرٹ نے پال کے چہرے کا بدلا ہوا رنگ، اکرنٹ بیچے اور بوڑھی آنٹی کی آنکھوں میں آنسو اور شیمہ بیک وقت ٹپکتے دیکھ کر ٹالنے کی خاطر کہہ دیا۔

"سارے ہو جائے گی لیکن شادی —— مگر اب تو ڈانس میں چلو۔"

پال نے آواز میں زیادہ تلخی اور غراہٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"نہیں ——— تم یہاں سے اس وقت تک نہیں جا سکتے جب تک کہ فلورا سے شادی کرنے کا تحریری وعدہ نہ دو ——— ورنہ ———"

اب گلبرٹ سٹپٹا گیا۔ اور بولا۔

کیوں شادی کروں ——— ! میں تو شادی شدہ ہوں۔ وہاں بارک شائر میں میری بیوی میری واپسی کا انتظار کر رہی ہے۔ اب تو لڑائی ختم ہو گئی ہے اور . . . . . .

پال بپھرا ———

نہیں۔ لڑائی ابھی کہاں ختم ہوئی۔ ابھی لڑائی جاری ہے۔ اب تمہیں اور مجھے لڑنا ہے۔ اب ہزاروں گلبرٹوں اور ہزاروں پالوں کو لڑنا ہے۔ لکھو اس کاغذ پر ———

گلبرٹ نے کاغذ لیکر تپائی پر رکھ دیا۔ اور خود بھی غصیلی آواز میں بولا۔

"نہیں لکھوں گا ——— کیوں لکھوں آخر ——— ! میں کسی ایک اینگلو انڈین لڑکی سے ہرگز شادی نہیں کرتا۔"

پال نے گلبرٹ کی قمیص پکڑ لی اور گرج کر کہنے لگا۔

"تمہیں شادی کرنی ہوگی۔ تم ہی نے فلورا کو ورغلایا ہے ———"

گلبرٹ نے قمیص چھڑاتے ہوئے جواب دیا۔

میں کہتا ہوں میں ہرگز ہرگز شادی نہیں کروں گا۔ مجھے اس کے حمل سے کوئی واسطہ نہیں۔ کوئی تعلق نہیں۔

پال غصے کی زیادتی سے جیسے پاگل ہو گیا اور اس نے ڈراؤنی آواز میں چیختے ہوئے گلبرٹ کے جسم پر تڑاتڑ گھونسے لگانے شروع کر دیے جیسے صدیوں کی بنیادوں پر کھڑی رنگ و نسل کی مضبوط دیوار کو توڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔

باہر اندھیرے میں فتح کے پھریرے لہرا رہے تھے۔ لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ لڑائی جاری تھی۔

دھرم پرکاش آنند

دلِ ناتواں

یہ تمہاری جستجوئے حُسن خود فریبی ہے۔ یہ ناحق کی آشفتہ سری تمہاری شکست کا آئینہ ہے۔

میں کافی ہاؤس کے ایک کونے میں بیٹھا بوند بوند کر کے زہر کو پیتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ دفتر کا سارا کام چھوڑ کر آج پھر کافی ہاؤس کیوں چلا آیا ہوں۔ یہ کافی بخار کی دوا کی طرح کڑوی اور بدمزہ ہے۔ میرے دماغ میں خشکی سی پھیلنے لگی ہے۔ لیکن میں برابر پیے جا رہا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ناحق کی بے خوابی کا سامنا ہوگا۔

اکیلا بیٹھتا ہوں۔ نہیں۔ بالکل اکیلا نہیں۔ راؤ ہے، گوپال ہے، کبھی کبھی وینکٹ بھی آ بیٹھتا ہے۔ اور تب میں بوند بوند نہیں، گھونٹ گھونٹ کافی پینے لگتا ہوں۔ کڑوی، بدمزہ، خشک کافی۔

اور میں راؤ سے پوچھتا ہوں۔ ”راؤ تم شادی کیوں نہیں کرتے؟“

راؤ ایک بنک میں ملازم ہے، اچھی تنخواہ پاتا ہے۔ تینتیس سال کی عمر کا ہے۔ کنوارا ہے۔

”راؤ یہ نہ کہو کہ تمہیں بیوی نہیں ملتی۔ تم چاہو تو کل ہی شادی رچا لو۔ لیکن تم اُن لوگوں میں سے ہو جو لڑکی کے تصوّر سے تو محبت کرتے ہیں۔ لیکن لڑکی کے وجود سے لرزاں رہتے ہیں۔ تم بیوی کو نہیں، اپنے آپ کو ڈھونڈ رہے ہو۔ تم اسے کبھی نہیں ڈھونڈ پاؤ گے۔ تمہاری شادی کبھی نہیں ہوگی۔ . . . . وہ دیکھو ایک اور لڑکی کافی ہاؤس میں داخل ہوئی ہے۔ دروازے پر رُک گئی ہے۔ گوپال گہری نظروں سے اُس کے دلکش جسمانی نشیب و فراز کو دیکھ رہا ہے۔ اور وہ یہ دیکھ رہی ہے کہ جس کو وہ ڈھونڈنے آئی ہے۔ وہ کافی ہاؤس میں ہے کہ نہیں۔

گوپال، اُدھر مت دیکھو۔ دوست، اِس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر کسی بھرے ہوئے جسم والی لڑکی سے محبت کرنی ہے تو تمہیں ایسی بہت سی لڑکیاں مل جائیں گی۔ اُدھر سے ملے ہو؟ اُس کے جسم کا نکھار دیکھا ہے؟ ہاں، تم کچھ دن تو اُس کی محبت میں مبتلا رہے ہو۔ لیکن [illegible] معلوم تھا تم لوٹ آؤ گے۔ اُس کا تمہیں تین چار ملاقاتوں تک [illegible] رہا۔ بہت کافی ہے۔ دلکش جسمانی نشیب و فراز کے باوجود اُس [illegible] بچی نہیں۔ بچے گی بھی نہیں۔ اُس میں کچھ خامیاں ہیں۔ ملاقات کے [illegible] بعد تمہیں ہر ایک لڑکی میں کچھ خامیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ اُن خامیوں [illegible] بیان کرو گے؟ کیا کرو گے بیان کر کے۔ تم گھوم پھر کر پھر اسی میز پر [illegible] گے۔ اور گھونٹ گھونٹ کر کے کڑوی کافی پیو گے۔ اور کہو گے ”کوئی [illegible] صورت لڑکی نہیں ملتی۔“ تم لڑکی کے رنگین تصوّر کو لڑکی کے مادی وجود میں ڈھونڈتے ہو۔ اس کا نتیجہ سوائے ناامیدی کے اور کیا ہوگا۔

راؤ۔ یہ بات بات پر اپنے خیالات کا جائزہ لینے کی عادت [illegible] لئے بہت بُری ہے۔ تم ہر وقت اپنے آپ سے پوچھتے رہتے ہو کہ [illegible] کیوں ہوا۔ تم اپنی شکست کی وجہ جنسی بھوک میں ڈھونڈتے ہو۔ [illegible] خیال ہے کہ اگر تمہاری زندگی میں کچھ ایسی لڑکیاں آئی ہوتیں جنہوں نے اپنے جسم کو تمہارے حوالے کر دیا ہوتا تو تمہاری دماغی کیفیت [illegible] ہوتی۔ اور تم اتنے پریشان نہ پھرتے۔ لیکن یہ تم اس لئے کہتے ہو کہ [illegible] ابھی تک کسی لڑکی کے جسم کو چھوا تک نہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ تم [illegible] اور تمہاری بیماری کا واحد علاج عورت کی صحبت ہے۔ لیکن میری مانو۔ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ مریل رہے ہو تم؟ یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ [illegible] غلطی پر ہوں۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ تم اگر کسی عورت کے پاس سے بھی گزر جاؤ تو تمہارے جسم میں ایک خوش کن سنسنی اور تمہارے دل [illegible] ایک میٹھی ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔ کیا پھر گندا سے کافی ہاؤس میں [illegible] کی بات سنانے لگے ہو؟ وینکٹ، راؤ پھر پُرانی کہانی لے بیٹھا ہے [illegible] سنا لینے دو۔ بیمار کی دوا تو ہمارے پاس نہیں ہے لیکن یہ واقعہ سنا دینے سے اِس کے دل کو تھوڑی سی تسکین ضرور مل جاتی ہے۔ راؤ، تم نے کہا

ابھی شروع بھی نہیں کی، اور تمہارا منہ لال ہونے لگا۔ تمہیں آدمی کس نے بنایا ہے
نہ تو کچی مٹی کے گھڑے ہو جو پانی کے مس سے بکھر جاتا ہے۔ طوفان کا مقابلہ
کیا کرے گا۔ سناؤ، سناؤ، ہم سن رہے ہیں۔" ان دنوں ہم بھی میز کے گرد بیٹھے
کافی پی رہے تھے۔ ویسی باتیں ہو رہی تھیں جو ہر روز ہوا کرتی ہیں۔ وینکٹ
جس کا چہرہ اُس کے باطن کے رنگ سے بھی زیادہ سیاہ ہے، کہہ رہا تھا۔
"یار کوئی آرٹ سرکل بنائیں یا کوئی میوزک سوسائٹی قائم کریں۔ میں اپنے
آپ کو بحیثیت پبلسٹی انچارج پیش کرتا ہوں۔ لیکن پبلسٹی کے اس شاہکار
کو کالج کی لڑکیوں تک کون پہنچائے گا؟ گوپال، تم یہ کام کر سکو گے؟" گوپال
بھلا کیوں کرنے لگا؟ اُسے کیا پڑی ہے کہ دوسروں کی دوستی کے لئے
لڑکیاں مہیا کرتا پھرے؟ خود اس کی بہت سی دوست ہیں۔ بمبئی میں
پہلے پہل اُس کی دوستی ایک مرہٹی لڑکی سے ہوئی تھی۔ وہ بی۔ اے میں
پڑھتی تھی۔ پہلی ملاقات میں گوپال نے اُس کے چہرے کی تعریف کی اور اُس
سے کہا تمہاری شکل مجھے لاہور کی ایک لڑکی کی یاد دلاتی ہے جو ہر اتوار
کو میرے گھر پر آ کر میری کتابوں کو بڑے قرینے سے میز پر سجا دیا کرتی تھی۔
میں ایک اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ دوسری ملاقات میں گوپال نے اُس لڑکی
کے جسم کی تعریف کی، اور کہا کہ میں بمبئی میں اکیلا ہوں، بالکل اکیلا۔ اپنے
اکیلے پن کو مٹانے کے لئے میں شراب پینے لگا ہوں۔ اور یہ کہہ کر اپنے
چہرے پر ایک بڑا غریبانہ سا جذبہ لا کر سگرٹ سُلگانے لگا۔ لڑکی اُس
کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھتی رہی۔ شاید سوچ رہی تھی کہ کس جذبے
کو اپنے دل میں جگہ دے۔ گوپال سگرٹ کا کش لگاتا ہوا کرسی میں آرام
سے بیٹھ گیا۔ چھت کی طرف دیکھتا ہوا دھوئیں کے دائرے بنانے لگا۔
اور اس کا بایاں ہاتھ لڑکی کے ہاتھ کو ڈھونڈ کر اُسے آہستہ آہستہ سہلانے
لگا۔ تیسری ملاقات میں گوپال اس لڑکی کو اپنے گھر لے گیا۔ اور کہنے لگا۔
"تمہیں دیکھ کر مجھے کچھ ہو جاتا ہے۔ میرے دماغ میں کھلبلی سی مچ جاتی
ہے۔ میں اور بھی بہت سی لڑکیوں سے ملا ہوں لیکن ایسا اثر مجھ پر پہلے
کبھی نہیں ہوا۔ تمہاری قربت میں میں اپنے آپ کو بھولنے لگتا ہوں۔"
اور یہ کہہ کر گوپال نے لڑکی کی اُس شرافت کو چھین لیا جس کو لڑکی اتنی دیر
سے محفوظ رکھتی چلی آئی تھی، جس پر اُس کے ماں باپ کو ناز تھا۔ جس پر
سماج اس کو ایک اچھے گھرانے کی بیٹی کے نام سے یاد کرتی تھی۔ لڑکی نے
کہا۔ "تم وحشی ہو۔ جانور ہو۔ کمینے ہو۔" اور اٹھ کر چلی گئی۔ لیکن دس پندرہ
دن کے بعد خود ہی گوپال کو ٹیلیفون پر کہنے لگی "کیوں ناراض ہو گیا؟ بہت
دن سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کب ملو گے؟" اور تب آہستہ آہستہ گوپال
نے اس لڑکی کی معرفت اُس کی کئی سہیلیوں سے دوستی پیدا کر لی۔ اور
اب وینکٹ آرٹ سرکل بنانے کے متعلق سوچ رہا ہے۔ گوپال کی مدد
لینا چاہتا ہے۔ گوپال اپنی خوش قسمتی کیوں بانٹے؟ اس کا جواب ٹھیک
ہی تو تھا۔ "کوشش کی ہوگی، اگر دوست، تمہارے تو بیوی ہے، بچے ہیں۔"
"اس سے کیا ہوتا ہے۔ بچے ہونا خوش قسمتی کی نشانی تھوڑے ہی ہے۔ یہ
تو شادی کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور جس عورت سے شادی کی جائے۔ اُس
سے محبت ہو بھی سکتی ہے۔ نہیں بھی ہو سکتی۔ اور محبت تو قناعت کا
دوسرا نام ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ مجھے میری چیز مل گئی، میں
اسی میں رچ جانا چاہتا ہوں۔ مست ہو جانا چاہتا ہوں۔ میرے لئے
اس کے پرے کچھ نہیں۔ لیکن وینکٹ کیسے قناعت کرے، ایک وینکٹ
ہی کیوں، کوئی بھی کیسے قناعت کرے۔ اصل میں تو آدمی کی شخصیت کے
اظہار کا سنگِ بنیاد خود غرضی ہے۔ میں جس دُھن میں مست ہوں میری
خوشی کے لئے مجھے اُس وقت اُس دھن کا، اُس ذہنی یا دلی کیفیت کا
عکس ملنا چاہئے۔ آدمی کی ذہنی کیفیتیں تو دن کے پہروں کی طرح ہیں۔
جن میں مختلف راگ چاہئیں۔ ایک صورت تو ایک ہی کیفیت کو پورا
کرتی ہے۔ اور ایک ہی ضرورت کو۔ وہ بہت سی کیفیتوں کو پورا کیا کرتی
تھی۔ محبت کے پہلے جوش میں۔ پر اُس وقت دلہن ایک عورت تو نہیں
ہوتی۔ زمین و آسمان کی سب عورتوں کا مرکب ہوتی ہے۔ ایک ماحول ہوتی
ہے۔ جو آدمی کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے۔ لیکن جو ایک عورت
ہے وہ کب تک ساری عورتوں کا مرکب بنی رہ سکتی ہے۔ اکثر لوگوں
کو یہ بات شادی کے کچھ ہی مہینوں بعد معلوم ہو جاتی ہے۔ اکثر کو کئی برس
بعد۔ اور تب جو زندگی کے دوسرے جھنجھٹوں میں اُلجھ کر نہیں رہ گئے انہیں
پھر دوسری عورتوں کی تلاش شروع ہو جاتی ہے، دوسری دُھنوں
کے عکس کی۔" "وینکٹ، تمہارے دانت مصنوعی ہیں، لیکن تمہارا جواب
بڑا معقول تھا۔" "ہاں، تم نے کہا تھا، بیوی ہے، بچے ہیں اور ......
اور حسرتیں ہیں۔" "وہ دیکھو کون آئی ہیں۔ باتیں بند کرو بھئی، ذرا دیکھ لینے

دو۔ دروازے میں دو لڑکیاں کھڑی ہیں۔ اُن کی نگاہیں اِدھر اُدھر کچھ ڈھونڈ رہی ہیں۔ وہ مسکرانے لگیں۔ ایک میز خالی نظر آئی ہے۔ سانولی کو نہیں دوسری کو دیکھو۔ سر کا ایک مبہم سا جھٹکا، ہونٹوں پر ایک دلنواز مسکراہٹ، بازو کے سہارے چھاتی سے لگی ہوئی کتابوں پر ذرا سا دباؤ ہاتھ میں تھمے ہوئے بیگ کی ہلکی سی جنبش، اور وہ خالی میز کی طرف بڑھی اپنی سانولی سہیلی کے ساتھ۔ راؤ تمہارے لبوں میں تھما ہوا سگرٹ لرزنے لگا ہے۔ راؤ، تمہارے ہاتھ کانپنے لگے ہیں، یہ دیکھو، دیا سلائی بجھے جا رہی ہے۔ ہاتھ کو مضبوط رکھو نہیں تو سگرٹ نہیں سُلگے گا۔ تمہاری آواز میں بھی تھرتھراہٹ ہے۔ ذرا اونچا بولو دوست! ان لڑکیوں میں سے ایک کو جانتے ہو؟ کس کو؟ وہ جس کی دونوں چوٹیاں کندھوں پر سے ہوتی ہوئی اُن بازوؤں کو چوم رہی ہیں جنہوں نے کتابوں کو تھام رکھا ہے؟ اُس کو جس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ہے جیسے کسی نے آئینے کی مدد سے سورج کا عکس ڈال دیا ہو؟ اُس کو جس کے گالوں میں مسکراتے وقت دو دلنواز چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ جاتے ہیں؟ بڑے خوش قسمت ہو کم بخت۔ گندا؟ کیا پیارا نام ہے۔ مطلب کیا ہے اس کا؟ ایک سفید پھول جو مغربی گھاٹ کے پہاڑوں پر اُگتا ہے؟ دیکھو وہ تمہاری طرف دیکھ رہی ہے۔ مسکراؤ، گدھے کہیں کے مسکراؤ۔ اچھا رہنے دو۔ وہ تمہاری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اُس کی نگاہیں دور کھڑے ہوئے بیرے کو اپنی طرف مخاطب کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جاؤ اُس سے مل لو۔ باتوں باتوں میں اُسے کل یا پرسوں کے لئے اپنے ساتھ کافی پینے کی دعوت دے آنا۔ نہیں، خدا کی قسم ہم میں سے کوئی بھی تمہاری باتوں میں خلل انداز نہیں ہوگا۔ ہاں، ایک بات، ہم جب کسی خالی میز کی تلاش کرتے ہوئے وہاں سے گزریں تو ہمیں دیکھ کر مسکرا دینا جیسے تم نے ہمیں پہچان لیا ہو۔ اُس وقت ہم کنکھیوں سے گندا کو دیکھ رہے ہوں گے۔ تمہاری نظروں کا تعاقب کرتی ہوئی وہ بھی ایک اُڑتی ہوئی نگاہ ہم پر ڈالے گی۔ ہمیں معلوم ہے کہ جس وقت وہ ہمیں دیکھے گی ہماری نگاہیں اُس پر سے ہٹ کر خلاء میں کھو جائیں گی۔ لیکن اُسے یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ ہم تمہارے دوست ہیں۔ گوپال، تم زیر لب مسکرانے لگے! دوست، تم ہماری باتوں کو بہ قرقانہ سمجھتے ہو نا! پر تمہیں معلوم ہے کہ گندا کا ہمیں ایک نگاہ دیکھ لینے سے کیا فائدہ ہے؟ ہمیں محسوس ہونے لگے گا کہ ہم اُس سے ایک قدم نزدیک آ گئے ہیں۔ ہم اب کافی ہاؤس میں آنے والی عام بھیڑ کے نہیں رہے۔ بلکہ کسی غیر مرئی زنجیر سے کھنچ کر ایک ایسے مخصوص حلقے کے ممبر بن گئے ہیں جس کے ایک کارکن کی گندا سے جان پہچان ہے۔ اور اس طرح گندا کو قریب سے نہ جانتے ہوئے بھی اُس میں اور ہم میں ایک اپنا پن سا پیدا ہو جائے گا۔

راؤ، تم گندا کے پاس جانے گئے ہو؟ آج تو بڑی ہمت دکھا رہے ہو بھئی۔ اچھا جاؤ۔ جاؤ۔ جاؤ۔ وینکٹ، یہ راؤ کیا آج کچھ پی کر آیا ہے کہ اتنی دلیری دکھا رہا ہے۔ وینکٹ، راؤ اب پرے کونے میں کیا جھانک رہا ہے؟ جانتا ہے کہ اُس کونے میں اس کی جان پہچان کا کوئی فرد موجود نہیں۔ لیکن پھر بھی جھانک رہا ہے۔ شاید کچھ تو اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتا ہے اور کچھ باقی لوگوں کو۔ کہ وہ واقعی کسی کی تلاش میں ہے۔ خدا خدا کر کے اب اُس میز کی طرف چلا تو ہے جہاں وہ دو لڑکیاں بیٹھی ہیں۔ بھئی واہ، وہاں تو وہ رُکا ہی نہیں۔ ہوا میں مُنہ اُٹھائے خلاء میں آنکھیں گاڑے دروازے پر پہنچ گیا ہے۔ اب جھانک جھانک کر باہر دیکھ رہا ہے۔ شاید اب کسی کے انتظار کا بہانہ کر رہا ہے۔ کبھی کبھی کنکھیوں سے گندا کی طرف بھی دیکھ لیتا ہے کہ کہیں وہ تو اُس کی طرف نہیں دیکھ رہی۔ بار بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر باہر جھانکتا ہے، پھر گھڑی کی طرف دیکھتا ہے اور سر ہلاتا ہے جیسے کہہ رہا ہو کہ اب آنے والا نہیں آئے گا۔ اب تک راؤ نے اپنے دل کو تسلی دے لی ہے کہ اب وہ اپنی شرافت کھوئے بغیر گندا سے بات چیت کر سکتا ہے۔ اُس کی میز کے پاس سے ہو کر گزرتے ہوئے وہ یکایک ٹھہر جائے گا۔ اور حیران کن لہجہ میں کہے گا "ہیلو، آج تم کافی ہاؤس میں کہاں؟" تب وہ اپنی گھڑی کی طرف دیکھے گا۔ اور بڑبڑائے گا "کہتا تھا ڈیڑھ بجے آؤں گا۔ پونے دو ہونے کو آئے، کم بخت ابھی تک آیا ہی نہیں"۔ آخر کار۔ آخر کار وہ گندا کے پاس پہنچ ہی گیا۔ گندا مسکرائی ہے۔ اُس کی سہیلی نے بھی سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا ہے۔ اور راؤ کے مُنہ سے بات بھی نہیں نکلی۔ اُس

کا چہرہ سُرخ ہو اُٹھا ہے۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر ٹیک دیئے ہیں اور تھوڑا سا آگے کو جُھک گیا ہے۔ اُس کے ایک ہاتھ میں سگرٹ ہے۔ سگرٹ کا دُھواں کانپتا ہُوا ہوا میں اُٹھ رہا ہے۔ ضرور اُس کا سارا جسم کانپ رہا ہوگا۔ وہ کبھی ایک پاؤں کے پنجے پر زور ڈال کر کھڑا ہوتا ہے۔ کبھی دُوسرے پر۔ اُس نے جیب سے رُومال نکالا ہے اور ہتھیلی کو پونچھنے لگا ہے۔ ضرور اُسے پسینہ آ رہا ہوگا۔ آخر جو صاف کرتے ہانپتی ہوئی آواز میں اُس نے پُوچھ ہی لیا ہے "تمہارے والد صاحب بمبئی ہی میں ہیں کیا؟" "ہاں" کندا نے جواب دیا ہے۔ "بہت دن سے اُن سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ غالباً اس اتوار کو ان سے ملنے آؤں گا۔" کندا مسکرائی ہے۔ اُس کے گالوں کے دلنواز گڑھے اور گہرے ہو گئے ہیں۔ وہ کہہ رہی ہے "میں والد صاحب سے کہہ دُوں گی۔" بس اور کچھ نہیں۔ راؤ اور کچھ نہیں بولا۔ اُس سے اور کچھ بولا نہیں گیا۔ اُس نے کندا کو اگلے دن یا اُس سے اگلے دن اپنے ساتھ کافی پینے کی دعوت بھی نہیں دی۔ اُس نے ٹھیک طرح سے اُس کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ اُس کا بدن کانپتا رہا۔ اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی رہی۔ اُس کی آواز لرزتی رہی۔ وہ واپس آ گیا۔ اب اُس کے ماتھے پر پسینہ ہے۔ اُس کا چہرہ لال ہے۔ اُس کے لب خشک ہیں اور اُن پر ایک شکستہ سی مسکراہٹ ہے۔ اُس کا جسم گرم ہے۔

بھئی اس سارے قصّے کا مطلب کیا ہے۔ آخر تم ثابت کیا کرنا چاہتے ہو۔ کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی مرکز پر اُسی زمین کو گھسے جا رہے ہو۔

میں کچھ نہیں ثابت کرنا چاہتا۔ ہم سب یہاں بیٹھے ہیں۔ ہم سب ایک ہی لڑکی کو کافی ہاؤس کے اندر آتا دیکھتے ہیں۔ لیکن اسی حقیقت کی بنا پر ہمارے زاویۂ نظر مختلف ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے مجھے کافی ہاؤس پسند ہے۔ اس میں نہ صرف خوبصورت لڑکیاں ہی آتی ہیں۔ بلکہ اُن کا یہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کے دل و دماغ پر کیا اثر ہوتا ہے۔ مجھے اُس کا تجزیہ کرنے کا بھی موقع ملتا ہے۔ وینکٹ، گوپال، راؤ، میں، ہم سب صرف ایک ایک شخص نہیں، ہم نمونے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک سماج کے کسی خاص فرقے کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتا ہے، وینکٹ تاجر ہے۔ پندرہ سال ہوئے وہ تیس روپے ماہوار پر ایک دفتر میں ٹائپ کرنے کے کام پر ملازم تھا۔ آج وہ اپنا مالک آپ ہے۔ بمبئی میں اشتہار بازی کی ایک مشہور کمپنی اُس کے ہاتھ میں ہے۔ مہینے میں دس ہزار کی آمدنی اُس کے لئے معمولی بات ہے۔ تیس روپیہ ماہوار سے دس ہزار روپیہ ماہوار اور پندرہ سال کا عرصہ۔ تیس سے پچاس ہوئے ہوں گے۔ پچاس سے سو، سو سے ہزار۔ قدم قدم پر وینکٹ نے سوچا ہوگا۔ کہ اور زیادہ پیسہ بنانے کا کونسا طریقہ ہے۔ اس کا جو تخیل تھا۔ جو دماغ تھا۔ اُن کو اس نے اپنے پر قابو نہیں پانے دیا۔ بلکہ اُن کو اپنا خدمت گار بنا کر رکھا۔ وہ زندگی کی دوسری اصلیتوں سے ہم آہنگ ہو گیا ہے۔ اُس کے لئے رائیوں کا راگ، شاعروں کی شاعری، مصوّروں کے شاہکار، خبطی لوگوں کے ڈھیلے دماغوں کا نتیجہ ہیں جو بذاتِ خود کوئی خوبصورت چیز نہیں صرف اُس جیسے ٹھوس آدمیوں کا بیکار وقت میں دل بہلانے کا ایک ذریعہ ہیں۔ وینکٹ چیز کو دیکھتے ہی اُس کی اپنی زندگی میں وقعت کو پہچان لیتا ہے، وہ کسی قسم کی غیر مادی رنگینیوں کو اپنی آنکھوں پر پردہ نہیں ڈالنے دیتا۔ اُس نے عورت کی ہستی کا بھی نچوڑ نکال کر رکھ دیا ہے۔ اُس کے لئے عورت گوشت کا ایک دلکش تودہ ہے، جس کے جسم کے اُتار چڑھاؤ سے، جس کی شخصیت کے مخصوص اندازِ اظہار سے دل میں ایک عجیب سنسنی پیدا ہوتی ہے۔ اُس گوشت کے دلکش تودے کو چھونے کو جی چاہتا ہے۔ یہ لمس آدمی کے جسم میں ایک طوفان اور دماغ میں ایک ہیجان پیدا کر دیتا ہے، ایک طوفان جس سے آنکھیں چمکنے لگتی ہیں، نتھنے پھولنے لگتے ہیں، جسم سے آگ کے شرارے چھوٹنے لگتے ہیں، ایک ہیجان جس میں دُنیا کی سُدھ بُدھ کھو جاتی ہے، جس میں قوسِ قزح کی رنگینی، بجلیوں کی کڑک، بھونچالوں کے دھچکے، سب کچھ خلط ملط ہو کر شامل ہیں، اور پھر آدمی اُس گوشت کے تودے کو بازوؤں میں بھینچتا ہے اور اپنا بناتا ہے، اور پھر اُس عورت کی، اُس گوشت کے دلکش تودے کی نوعیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ اصلیت کا پیروکار پھر اپنے اصل اور ٹھوس کاموں میں مشغول ہو جاتا ہے۔ وینکٹ کے لئے عورت کی خوبصورتی کی تعریف بھی وہی ہے جو شاعروں کی شاعری کی، یعنی بیکار وقت میں دل بہلانے کا ذریعہ۔

کیوں وینکٹ، ٹھیک ہے نا؟ تمہارے لئے عورت کی خوبصورتی کو پرکھنے کی کسوٹی اُس تک رسائی کا امکان ہے جس کو نہیں پایا جا سکتا۔ نہیں خریدا جا سکتا (میرا مطلب ضروری طور پر پیسوں سے نہیں) وہی زیادہ خوبصورت ہے۔ لیکن اُس کے پانے کی ناکام آرزو میں تم اپنا وقت کھونے والے نہیں۔ وہ گوپال ایسے خوبصورتی کے پجاریوں کے، اپنا وقت اور دماغ ضائع کرنے کے ذریعے ہیں۔ تم تو "نو نقد نہ تیرہ ادھار" پر یقین رکھتے ہو۔ جو مل گئی، جیسی مل گئی، جہاں مل گئی، اگر آسانی سے مل گئی تو وہی بھلی۔

گوپال، تم مسکرا نا نہ چھوڑ دو گے؟ تم نے بھی کبھی اپنے آپ کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے؟ تم اپنے آپ کو دوسروں سے بہت مختلف سمجھتے ہو۔ لاکھوں میں ایک، عام آدمیوں سے بہت اُونچے، بہت پرے۔ اگر میری مسکراہٹ بھی اُتنی معنی خیز ہو سکتی جتنی کہ تمہاری (اگرچہ زیادہ پائپ پینے سے تمہارے دانت زرد ہو گئے ہیں) تو میں تمہارے بھولے پن پر ضرور مسکرا دیتا۔ کہ باقی سب کو ٹھیک سمجھنے والے تم اپنے آپ کو ٹھیک نہیں سمجھ سکے۔ تم لاکھوں میں ایک نہیں ہو، لاکھوں جیسے ایک ہو۔ تم بھی سماج کے ایک مخصوص فرقے کے اُتنے ہی نمائندہ نمونے ہو جتنا کہ وینکٹ تمہاری قسمت میں بھٹکنا لکھا ہے۔ تم ذہنی تسکین سے ہمیشہ اُتنا ہی دُور رہو گے، جتنا کہ اب ہو۔ تم کبھی برازیل جانے کی سوچتے ہو کبھی نیوزی لینڈ۔ لیکن اگر تم سائبیریا بھی چلے جاؤ تو وہاں پہنچ کر تم اُس سے بھی پرے جانا چاہو گے۔ تم تصور کو حقیقت میں بدلنا چاہتے ہو۔ تخیل کو اصلیت سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہو، لیکن یہ نہیں ہو سکتا۔ تصور اور حقیقت دو مختلف چیزیں ہیں۔ اگر تم تصور کو حقیقت کا جامہ پہناؤ گے تو تمہیں نا اُمیدی ہو گی۔ کیونکہ تصور حقیقت بن کر حقیقت کی طرح ہی غیر دلچسپ ہو جائے گا۔ تم آسمان کو چھونے کے منصوبے باندھتے ہو۔ لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ تم اگر اُڑ کر آسمان تک پہنچ گئے تو آسمان بھی سوائے پانی اور ہوا کے اور کچھ نہیں ہو گا، اور اُس آسمان کے پرے تمہیں ایک اور آسمان نظر آئے گا۔ آخر سراب کے سہارے نخلستان کی تلاش میں کب تک ریگستان کی صحرا نوردی کرتے رہو گے۔

یا تو وینکٹ کی طرح تخیل کو حقیقت کا غلام بنا لو اور سمجھ لو کہ اصلیت تخیل کی آخری عملی منزل ہے، یا پھر یہ جان لو کہ اصلیت تصور کی پہلی سیڑھی ہے۔ جس کی آخری سیڑھی پہنچ سے بہت پرے ہے۔ لیکن خیر چھوڑو، تم تو خوبصورتی کو پکڑ لینا چاہتے ہو۔ مرمریں باہوں پر سر رکھ کر سونا چاہتے ہو۔ نرم، لمبے بالوں سے کھیلنا چاہتے ہو۔ شدتِ جذبہ سے کانپتی ٹھوڑی کو ہاتھوں میں لیکر اس کی چمکتی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا چاہتے ہو، تُرنج بھرے مدار ہونٹوں سے اپنے ہونٹ پیوست کرنا چاہتے ہو۔ یہ سب کچھ ممکن ہے اور تم یہ سب کچھ کرتے ہو۔ لیکن یہ کرتے ہی تم اُس دوشیزہ سے دُور ہو گئے ہو۔ تمہارا ذہن کہتا ہے اِن مرمریں باہوں سے بھی زیادہ مرمریں باہیں ہو سکتی ہیں۔ ان بالوں سے بھی زیادہ خوبصورت لمبے بال ہو سکتے ہیں، ان آنکھوں سے بھی زیادہ خوبصورت آنکھیں، ان ہونٹوں سے بھی زیادہ بھرے ہوئے ہونٹ۔۔۔ اور تب تم اس نئی دوشیزہ کی تلاش میں کھو جاتے ہو۔ اور جب وہ مل جائے تو تمہیں پھر محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس سے پرے اس سے بھی زیادہ خوبصورت ایک اور دوشیزہ ہے اور تم اپنی اس جستجوئے تسکین کو کچھ پُر اُمید بنانے کیلئے شراب کا سہارا لینے لگے ہو۔ تمہاری دوپہر کافی ہاؤس میں کٹتی ہے۔ لیکن شام کو تمہارا بسیرا میخانے میں ہوتا ہے۔ میرا مطلب ساقی اور جام والے میخانے سے نہیں بلکہ ڈنشا، ڈنشا اینڈ کمپنی کی شراب کی دکان سے ہے جہاں نہ ساقی ہے نہ جام، صرف تمہارے اشاروں پر ناچنے والا بیرا ہے جو بہ حیثیت ایک مرد تمہاری غربی کو اُس وقت پرکھتا ہے جب تم "وائٹ ہاؤس" وسکی یا "ڈائگرز" رم پی کر اس کو انعام دینے لگتے ہو۔ پی کر کچھ نا اُمیدی کم ہوتی ہے۔ کچھ سکون ملتا ہے، کچھ اُمید بندھتی ہے کہ اب جو لڑکی ملے گی وہ خوبصورتی کا مکمل مجسمہ ہو گی۔ اور دل کو ڈھارس بندھتی ہے کہ اب تمہاری جستجوئے تسکین کی آخری منزل قریب ہے۔ پر دوست، اتنی لڑکیوں سے ہم صحبت ہونے کے بعد بھی تم ابھی تک تلاشِ حُسن میں سرگرداں ہو۔ تمہارا علاج ڈنشا، ڈنشا اینڈ کمپنی کا شراب خانہ ہی ہے یا وہاں سے جھومتے نکلنے کے بعد کسی سڑک کا کنارہ ——

رُک جاؤ، رُک جاؤ، اپنے اس نفسیاتی تجزیہ کو ذرا دم لینے دو۔ راؤ کی خوبصورت دوست نے سر اور ہاتھ کی ایک ہم آہنگ جنبش سے بالوں کی ایک چوٹی کو پیچھے پیٹھ پر ڈال دیا ہے۔ اب وہ اپنی سہیلی سے کچھ کہہ رہی ہے۔ شاید پوچھ رہی ہے کھانے کو کچھ اور تو نہیں چاہئے) اب وہ بائیں ہاتھ سے بیرے کو بل لانے کے لئے اشارہ کر رہی ہے۔ لیکن

ڈینکٹ! اگر تمہیں کُندا کی سہیلی مل جائے (ذرا سا لالچ ضرور ہے) تو کیسی رہے!

گوپال، تم اپنی معنی خیز مسکراہٹ (تمہارے دانت پہلے ہی سے) کے غیر مرئی ایلچی اُس خوبصورت لڑکی کی طرف بھیجو جس کے گالوں میں بات کرتے وقت چھوٹے چھوٹے دلنواز گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ جانتے ہیں راؤ ابھی اُس سے باتیں کر کے آیا ہے۔ راؤ اُس کے باپ کو جانتا ہے۔

راؤ، کیا کہنے ہیں تمہاری دلیری کے۔ تم سب خوبصورت لڑکیوں کے باپوں کو جانتے ہو۔ تم اُن میں سے ہو جو سوال کا حل سوال کو نظر انداز کرنے میں ڈھونڈتے ہیں۔ تم ہمیشہ یہی کہتے رہو گے میں رما کے باپ کو جانتا ہوں۔ میں کرشنا کے بھائی کو پہچانتا ہوں، کملا کے چچا سے میری واقفیت ہے۔ لیکن میں رما اور کرشنا اور کملا کے ساتھ "نمستے، نمستے" سے آگے کبھی نہیں بڑھا۔ راؤ، تم کبھی آگے بڑھو گے بھی نہیں۔ تم نے تصور اور اصلیت کے درمیان ایک بڑی اونچی دیوار تعمیر کر رکھی ہے۔ تم کئی بار تصور کے پروں پہ اُڑ کر دیوار کے اس طرف جھانکتے ہو، جدھر اصلیت ہے اور کھائی کی گہرائی دیکھ کر تمہارا دل کانپ اُٹھتا ہے۔ تم جھانکنے تک سے ڈرتے ہو، کودو گے خاک۔ تم عورت کو روئی مادی وجود سمجھ کے ہچکچاتے ہو۔ تمہارے لئے عورت ڈر کی چیز ہے۔ تم اپنی خود اعتمادی کھو بیٹھے ہو۔ تم اپنے سے ہمیشہ یہی سوال پوچھتے رہتے ہو کیا مجھے کوئی عورت پسند کر سکتی ہے؟ اگر میں کسی عورت سے کوئی مذاق کروں تو کیا وہ میرے مُنہ پہ تھپڑ تو نہیں کھینچ مارے گی۔ اور اگر بھولے سے کسی کو مجھ سے عشق ہو بھی گیا تو میرا کوئی دوست اُسے مجھ سے چھین کر تو نہیں لے جائے گا۔ تم دل ہی دل میں لڑکیوں سے ملنے کے ارادے باندھتے رہتے ہو۔ اُن کو قابو میں رکھنے کے طریقے سوچتے رہتے ہو۔ اپنی کشش بڑھانے کیلئے اپنے اندازِ بیان کو، اپنے جذبات کے اظہار کو ایک مخصوص ڈھنگ میں ادا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہو لیکن وقت آنے پر ہمت ہار دیتے ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ تم سب سے بدقسمت ہو کیونکہ تمہارے اس ڈر نے تمہیں زندگی کی تھوڑی سی خوشی حاصل کرنے سے بھی روک رکھا ہے۔ ڈینکٹ کو دیکھو، اُس کے مادی نقطہ نظر سے تمہیں اتفاق نہ سہی لیکن زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے کم سے کم اُس نے ایک خاص راستہ تو اختیار کیا ہوا ہے۔ وہ عورت کو ایک مادی چیز سمجھتا ہے، خالص مادی چیز۔ شاعروں نے، فلسفیوں نے، ادیبوں نے عورت کے اردگرد جو رنگین، غیر مادی اور دلچسپ صفات کا ایک ہالہ سا بنا رکھا ہے، اُس کی ڈینکٹ کے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔ وہ جب ایسی شاعرانہ گفتگو سُنتا ہے تو چپکے سے مُسکرا دیتا ہے۔ اور سوچتا ہے کہ یہ عورت جس کی بابت اتنی رنگین بیانی کی جا رہی ہے اگر میرے بازوؤں میں نہ آئی تو کسی اور مرد کے بازوؤں کی زینت ہو گی۔ وہ خلا میں نہیں تیرے گی اور نہ ہی شاعروں کی تمام شاعری اُس دوسرے مرد کو اُس عورت سے وہی فائدہ اُٹھانے سے روک سکے گی۔ جو میں اُن عورتوں سے اُٹھاتا ہوں جو مجھے مل سکتی ہیں۔

اسی طرح اگرچہ گوپال کی زندگی میں کافی تلخی، کافی ناکامی، کافی محرومی ہے۔ تو بھی وہ اپنے حال میں مست ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جو راستہ اُس نے اختیار کر رکھا ہے۔ اُس کا انجام سوائے تلخی اور ناکامی کے اور کچھ نہیں لیکن کم سے کم اُس کا راستہ معین تو ہے۔ اور جب وہ اُن سنگ میلوں کو دیکھتا ہے۔ جن کی مدد سے وہ اُس راستے پر بڑھتا ہے تو کچھ وقت کے لئے اُس کی زندگی بڑی ہری بھری ہو اُٹھتی ہے۔ اُس میں پھر بھرے بھرے ہونٹ، اور دلنواز مسکراہٹیں اور بکھرتے گیسو اور چمکتی آنکھیں گھومنے لگتی ہیں۔ لیکن اُس کی شکست اُس کی فتح ہی میں پنہاں ہے۔ کیونکہ وہ ہر سنگِ میل کو منزل سمجھنے لگتا ہے، اور جب سنگِ میل پر پہنچتا ہے۔ تو یکایک محسوس کرتا ہے کہ منزل ابھی اور آگے ہے۔

لیکن راؤ تمہاری نہ کوئی ابتدا ہے۔ نہ انتہا۔ تم تجربہ شروع ہی نہیں کرتے۔ اسلئے تم اپنی فتح اور شکست دونوں ہی سے ناآشنا ہو۔ تم آدمی نہیں، شتر مرغ ہو جو ریت میں سر چھپا کر دُنیا کی رنگینیوں اور مصیبتوں دونوں ہی سے بے بہرہ ہو جاتا ہے ——

پر بھلے آدمی تم کون سے تیس مار خاں ہو۔ تم نے کون سے قلعے فتح کر لئے ہیں۔ آتی جاتی لڑکیوں کو تو تم بھی ایسے دیکھتے ہو۔ جیسے مجنوں کے بعد عشق تمہارے ہی ورثے میں آیا ہے۔

ہاں عاشق تو ہوں، لیکن نہ ڈینکٹ جیسا، نہ گوپال جیسا، راؤ کی

طرح بزدل بھی نہیں ہوں۔ میرے لئے عورت نہ تو صرف گوشت کا لوتھڑا ہے اور نہ مجھے یہ خیال ہے کہ اب جس عورت سے میری جان پہچان ہوگی۔ وہ خوبصورتی کا مکمل مجسمہ ہے۔ میں تو عورت کو عورت بھی سمجھتا ہوں اور ایک خوبصورت شے بھی۔ عورت کو عورت سمجھ کر میں نے بھی اُس سے کئی بار رابطہ بڑھایا ہے۔ لیکن میں نے یہ خیال اپنے آپ پر کبھی غالب نہیں ہونے دیا کہ میں نے اس عورت کو پا کر خوبصورتی کے مجسمہ کو پا لیا ہے۔ کافی عرصہ پہلے میں بھی گوپال کی طرح ہر خوبصورت لڑکی کے پیچھے لپکا کرتا تھا۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ اُس خوبصورت شے کو پا کر بھی خوبصورتی کی حرص نہیں جاتی۔ تو میں نے جان لیا کہ کسی چیز کی خوبصورتی اُس کے نہ پانے ہی میں ہے۔ میں نے اپنی ناامیدی کو شراب کے گلاس میں غرق نہیں کیا۔ میں نے اپنے دل سے کہا کہ تلاشِ حسن تو جستجوئے آفاق ہے۔ اس کی ابتدا مجھ سے ہے۔ اس کی انتہا کوئی نہیں۔ اور اس لئے اب جب میں عورتوں کی خوبصورتی کی تعریف کرتا ہوں تو اس لئے نہیں کہ میں انہیں پا سکوں۔ بلکہ اس لئے کہ اس تعریف سے مجھے خوشی ملتی ہے۔ میری تلاشِ حسن کو تشفی ملتی ہے، مجھے قدرت کی تخلیق کی داد دینے کا موقعہ ملتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قدرت کی سب سے خوبصورت تخلیق عورت ہے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر قدرت کی تخلیق مرد ہے جو اس خوبصورتی کی داد دے سکتا ہے۔ کل کائنات خوبصورت ہے۔ سمندر کا ساحل سے ہمیشہ ٹکراتے رہنا، سوتے ہوئے مکانوں پر چھٹکتی ہوئی چاندنی، زور سے برستی ہوئی بارش کی ٹپ ٹپ، سُونے میں ہوا سے ہلتے ہوئے پتوں کی سرسراہٹ۔ کتنی خوبصورتی ہے ان میں، عورت کی خوبصورتی کائنات کی اس خوبصورتی کی زنجیر کی ایک اور کڑی ہی تو ہے۔ عورت کا حسن کتنا متحرک اور نرالا ہے۔ اُس کا رنگ لمحہ بہ لمحہ بدلتا رہتا ہے۔ اسی لئے اس خوبصورتی کی کوئی تھاہ نہیں، کوئی کنارہ نہیں، کوئی منزل نہیں۔ میں تو اب عورت سے پیار نہیں کرتا، عورت کے اظہارِ حسن سے پیار کرتا ہوں یا یوں کہو کہ یکبارگی ہی بہت سی عورتوں سے پیار کرتا ہوں۔ کیونکہ کسی ایک عورت کا حسن مکمل نہیں۔ میں عورت کو نہیں پکڑتا اُس کے حسن کی یاد دل میں رکھ لیتا ہوں۔

اسی لئے کھوئے کھوئے رہتے ہو شاید!

ہاں، میری زندگی نہ ختم ہونے والا ایک تعاقب ہے۔ ہمیشہ تلاشِ حسن میں سرگرداں رہتا ہوں۔ اسی لئے چاہوں نہ چاہوں راہ چلتی ہر لڑکی کو دیکھنے کے لئے میری نگاہ بے ساختہ اوپر اٹھ جاتی ہے۔ اگر اُس کی پیٹھ میری طرف ہے تو دل ہی دل میں اُس کے بال بنانے کے انداز کا جائزہ لیتا ہوں۔ جوڑا بنا رکھا ہے اُس نے؟ پنجابی انداز میں؟ مراٹھی انداز میں؟ گجراتی انداز میں؟ کتنی خوبصورتی ہے گجراتی لڑکیوں کے بال بنانے کے انداز میں۔ ایجنتا کی تصویروں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ وہ بالوں کو کس کر جوڑے کی لپیٹ میں نہیں لیتیں گویا اُن سے دشمنی ہو۔ وہ بالوں کو بھی جسم کا ایک ذی حس حصہ سمجھتی ہیں اور اس پیار سے اُن کو جوڑے کی شکل میں گوندھتی ہیں کہ بال اور جوڑا دونوں میں جان ڈال دیتی ہیں۔ اظہارِ خوبصورتی کی کتنی سمجھ ہے ان کو۔ بالوں کو گردن کی پشت تک کچھ ڈھیلا ڈھیلا چھوڑ دیتی ہیں اور جہاں گردن اور کندھے ملتے ہیں وہاں بالوں کو کچھ اس صفائی سے جوڑے کی شکل میں سمیٹتی ہیں جیسے کوئی سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہو۔ اور جب بات کرتے وقت اُن کا سر دائیں بائیں یا آگے پیچھے ہلتا ہے تو گردن کی پشت پر کا جُوڑا اِدھر اُدھر سرکتا ہے۔ اور بذاتِ خود باتیں کرتا معلوم ہوتا ہے۔ یا پھر کوئی ایسی لڑکی نظر آ جاتی ہے۔ جس نے بالوں کی دو چوٹیاں کر رکھی ہیں۔ کتنے لمبے بال ہیں اِس کے۔ دونوں چوٹیوں کے سرے کولھوں کو چھو رہے ہیں، ڈھیلا ڈھیلا گوندھا ہے بالوں کو، اور سروں کے پاس تو اُن کو بالکل سرکش ہی رہنے دیا ہے، اُن کے سرے پیارے گول چھلے سے بن گئے ہیں۔ کتنی شفقت اور محنت سے اِس نے بالوں کے سرے کو یوں گول کیا ہوگا! یا پھر اگر کوئی ایسی لڑکی سامنے سے آ رہی ہو تو اُس کی مستانہ چال کو دیکھتا ہوں۔ اُس کی پیشانی پر بکھری ہوئی پریشان زلف کو دیکھتا ہوں جسے وہ اپنی انگلیوں کے نازک لمس سے سر پر پیچھے کرتی ہے۔ لیکن جو سرکش ہی اُسی تیزی سے پھر پیشانی پر ٹپک آتی ہے۔ آنکھوں کی مسرت خیز چمک کو دیکھتا ہوں، ہونٹوں پر کھلتی ہوئی مسکراہٹ کو دیکھتا ہوں، ساڑھی کی فنی لپیٹ سے نمایاں تر ہوتے ہوئے جسم کے دلآویز خطوط کو دیکھتا ہوں اور پھر......

ہاں ہاں اور پھر......

ـــــ

۔۔۔۔۔۔ اور پھر کبھی کبھار کسی کو بلا لیتا ہوں۔

کسی خوبصورتی کی دیوی کو؟ کسی مجسمۂ حسن کو؟

نہیں، خوبصورتی کا خواب میرے دماغ سے باہر کوئی ہستی نہیں رکھتا۔ اصلیت خوبصورت نہیں ہے۔ اُس پر خوبصورتی کا خول میں چڑھاتا ہوں۔ خوبصورتی کی صُورت میرے تخیل کے رنگین گوشوں سے باہر قدم رکھتے ہی ناپید ہو جاتی ہے۔ میں عورت کو خوبصورت اس لئے کہتا ہوں کیونکہ وہ میری خوبصورتی کی پیاس کو اور بھی بڑھاتی ہے لیکن کوئی بھی عورت میرے خوابوں کی تعبیر نہیں کیونکہ کسی ایک عورت کا حسن مکمل نہیں۔

تو پھر کس کو بلاتے ہو؟

کسی کو بھی، جو خوبصورتی میرے تخیل میں ہے اُس کی جھلک۔ صرف جھلک۔ مجھے کسی لڑکی میں مل جاتی ہے۔ میں اُس جھلک کو وسعت دیتا ہوں۔ قطرے کو سمندر بنا لیتا ہوں اور اُس کے خیال میں کھو جاتا ہوں۔ کچھ وقت کے لئے اُس کی اور خامیاں میری نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ دل میں یکبارگی ایک طوفان سا اُٹھتا ہے۔ اُس لڑکی سے ملنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ حوصلہ کرتا ہوں اور لڑکی کو بُلا لیتا ہوں۔

اب سمجھے۔ پچھلے ہفتے جس لڑکی کو کافی ہاؤس میں لئے بیٹھے تھے، وہ بھی خوبصورتی کی ایک جھلک تھی!

ہاں، اُس لڑکی سے ملاقات کی بھی ایک کہانی ہے۔ میں پچھلے سال اگست کے مہینے میں پُونا سے بمبئی آ رہا تھا۔ گاڑی میں بھیڑ بہت تھی۔ سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں بھی جگہ بہت مشکل سے ملی۔ ایک کونے میں دبک کر بیٹھنا پڑا۔ اُس کونے میں غسل خانہ تھا۔ غسل خانے کا دروازہ اچھی طرح بند نہ ہوتا تھا۔ ہلکی ہلکی بدبو سے دماغ پراگندہ ہو رہا تھا۔ سوچا اس ڈبے میں سے نکل بھاگوں۔ اُٹھنے ہی لگا تھا کہ پرے کونے میں بیٹھی ہوئی ایک لڑکی پر نظر پڑی۔ وہ کتاب پڑھنے میں مشغول تھی۔ اُس کا سر کتاب پر جھکا ہوا تھا۔ اُس کے سر کے آدھے بال دُھوپ میں چمک رہے تھے۔ اُس نے بالوں کی دو موٹی چوٹیاں کی ہوئی تھیں جو اُس کے دونوں کندھوں پر سے ہوتی ہوئی اُس کی گود میں جا کر ایک ہو گئی تھیں۔ میرے دماغ میں اُس کے بالوں کی خوبصورتی سرایت کر گئی۔

میں اپنے کونے کی گندی فضا بُھول گیا۔ اور لڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس کے بالوں کی خوبصورتی کو اپنے اندر جذب کرتا رہا۔ بالوں پر دھوپ کی چمک سے جو ایک مسرت خیز کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اُس کے لئے تشبیہیں ڈھونڈتا رہا ــــــ

کچھ دیر بعد لڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے آدمی نے (جو غالباً اُس کا باپ تھا) اُسے کچھ کہا۔ لڑکی نے کتاب پر سے نظر اُٹھائی۔ چاروں طرف دیکھا۔ بالوں کی چوٹیوں پر ہاتھ پھیر کر اُنہیں پیچھے سے دبایا۔ مسکرائی اور پھر سر جُھکا کر پڑھنے میں مشغول ہو گئی۔ مجھے اُس کی مسکراہٹ بہت بھلی لگی۔ اب جب میں اس واقعے پر غور کرتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اُس لڑکی کے چہرے میں کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ جسے غیر معمولی کہا جا سکے یا جو خاص جاذبِ نظر ہو۔ لیکن اُس وقت میں اُس کی خوبصورتی کا جائزہ اُس کے بالوں کی خوبصورتی سے لے رہا تھا۔ جو واقعی خوبصورت تھے۔ اور اس لئے اُس وقت مجھے اُس کا چہرہ، اُس کے خدوخال بہت دلآویز معلوم ہوئے۔ میں اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ کب وہ سر اُٹھائے اور مُسکرائے۔

اُنہی دنوں میں ایک رسالے کے لئے ایک کہانی لکھ رہا تھا۔ اس لڑکی کا اُس کہانی سے ذرہ کا بھی تعلق نہیں تھا۔ لیکن یہ لڑکی میرے دماغ پر کچھ اس طرح چھا گئی تھی۔ کہ میں نے اُس کے بالوں کی تعریف میں دو تین صفحے لکھے اور بے محل ہوتے ہوئے بھی اُن کو اُس کہانی میں جڑ دیا۔ وقت پا کر میں اُس لڑکی کو بھُول گیا۔ صرف اُس کے بالوں کی خوبصورتی کی یاد ذہن کے کسی گوشے میں گھر بنا کر رہ گئی۔

قریباً ایک سال بعد پچھلے ہفتے میں نے اُسی لڑکی کو کافی ہاؤس میں بیٹھے دیکھا۔ وہ ایک لڑکے کے ساتھ بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ راؤ اُس دن کافی ہاؤس میں نہ تم تھے، نہ دینکٹ۔ صرف گوپال ایک کونے میں بیٹھا ٹی پی رہا تھا۔ اور کافی ہاؤس میں داخل ہوتی ہوئی لڑکیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں بھی گوپال کے پاس بیٹھ گیا۔ کافی پیتے پیتے میں نے کئی بار اُس لڑکی کی طرف دیکھا۔ اُس لڑکی کی نظریں بھی دو تین بار مجھ پر پڑیں تھوڑی دیر بعد وہ اور اُس کا ساتھی اُٹھ کر چلے گئے اور میں گوپال سے باتیں کرنے میں محو ہو گیا۔

جب میں کافی ہاؤس سے باہر نکلا تو دیکھا کہ وہی لڑکی سامنے بس سٹینڈ پر کھڑی بس کا انتظار کر رہی ہے۔ معاً میں نے سوچا کہ وہ وہاں کھڑی نہ معلوم کب تک بس کا انتظار کرتی رہے گی کیوں نہ اُسے اپنی موٹر میں بٹھا کر اُس کی منزل تک پہنچا دوں۔

بس سٹینڈ پر پہنچ کر میں نے موٹر روک دی اور اُس کا دروازہ کھولتے ہوئے اُس سے کہا: "آپ کو کہاں جانا ہے؟" اُس نے جگہ کا نام بتا دیا۔ میں بھی اُدھر ہی جا رہا تھا۔ نہ جا رہا ہوتا تو بھی ضرور کہہ دیتا کہ اُدھر ہی جا رہا ہوں۔ وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے میری بغلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور اس جرأت کیلئے معذرت پیش کرتی ہوئی بولی۔ "آج کل بس کے لئے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہے اور مجھے آج گھر جلدی پہنچنا ہے۔" میں نے بات چلانے کے لئے کہا: "میں آپ کو ایک بار پہلے بھی مل چکا ہوں"۔ اور وہ بولی: "مجھے بھی کچھ کچھ یاد پڑتا ہے"۔ میں نے کہا: "میں یاد دلائے دیتا ہوں۔ پچھلے سال اگست کی بات ہے۔ ریل گاڑی میں، پونا سے بمبئی آتے ہوئے"۔ اور وہ کہنے لگی "ٹھیک ہے۔ اُس ڈبے میں کچھ چینی لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اور بہت شور و غل تھا"۔ اور میں نے کہا "آپ ایک کونے میں بیٹھی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ اور آپ نے اپنے بالوں کی دو چوٹیاں کی ہوئی تھیں۔ اور آپ کے بالوں پر سورج چمک رہا تھا جس سے آپ کے بال سنہری معلوم ہو رہے تھے۔ میں اُن بالوں کی خوبصورتی کو دیکھ رہا تھا۔ آپ پڑھنے میں محو تھیں۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ آپ کے بال دھوپ میں سنہری لگتے ہیں آپ کی مسکراہٹ بھی ضرور صبح کی نرم دھوپ کی طرح خوشگوار ہوگی"۔ وہ ذرا سی مسکرائی اور سامنے سڑک کی طرف دیکھتی ہوئی کہنے لگی "یاد نہیں پڑتا میں اُس وقت کونسی کتاب پڑھ رہی تھی۔ گجراتی کی تھی یا انگریزی کی؟" میں نے کہا "پچھلے سال آپ کو دیکھنے کے بعد میں نے آپ کا ایک کہانی میں ذکر کیا تھا۔ اور وہ کہانی بڑی مقبول ہوئی۔ یہ سب آپ ہی کی وجہ سے تھا۔ مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے"۔ وہ لڑکی صرف مسکراتی رہی۔ اُس کی منزل قریب آ رہی تھی۔ میں نے کہا "اگر آپ کو کوئی عذر نہ ہو تو کل کافی ہاؤس میں میرے ساتھ کافی پیجیئے"۔ اور اُس نے جواب دیا "میں وعدہ تو نہیں کرتی کیونکہ عام طور پر ہم چار پانچ سہیلیاں کالج سے چھٹی ملنے پر اکٹھی ہی کہیں چائے پینے بیٹھ جاتی ہیں۔ اور میں اُن کو چھوڑ کر آ نہیں سکتی لیکن میں کوشش ضرور کروں گی"۔

اگلے دن وہ مجھے کافی ہاؤس میں ملی۔ یہ بات تم سب کو معلوم ہے۔ جب وینکٹ اور راؤ میرے پاس بیٹھنے لگے تھے۔ تو میں نے کہا تھا: "میں آج اکیلا بیٹھنا چاہتا ہوں مجھے کسی کا انتظار ہے۔" راؤ تم کانپنے لگے تھے اور تم نے اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے ایک سگرٹ سُلگا لیا تھا۔ وینکٹ تم میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر بولے تھے "ہمیں بھی یاد رکھنا"۔

وقت مقررہ کے پانچ منٹ بعد وہ لڑکی کافی ہاؤس میں داخل ہوئی دروازے پر رُک کر اپنی گردن کو لمبا کرکے کسی کو ڈھونڈنے لگی۔ اُس کی نظر مجھ پر پڑی اور اُس کے پتلے ہونٹ ایک ہلکے تبسم کے زیرِ اثر تھوڑے سے کھل گئے۔ میں نے بیرے کو کافی لانے کے لئے کہا۔ وہ کہنے لگی معاف کیجئے مجھے تھوڑی سی دیر ہو گئی، اور وہ پھر اپنے پتلے ہونٹوں سے مسکرائی۔ میں نے اُس لڑکی سے پوچھا "آپ کا نام کیا ہے" اور وہ بولی "پدما"۔ میں نے کہا "بڑا پیارا نام ہے۔ پدم "کنول" کو کہتے ہیں۔ تم کنول ہو۔" اُس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "پدم کنول کو کہتے ہیں لیکن میرا نام پدما ہے اور پدما لکشمی کو کہتے ہیں مجھے اپنا نام بالکل پسند نہیں۔ کاش میرا نام اُرملا، یا اُوشا، یا سرودما ہوتا"۔ اور میں نے کہا اپنا نام کسی کو اچھا نہیں لگتا۔ لیکن پدما واقعی بڑا پیارا نام ہے۔ وہ چپ رہی اور اپنے بائیں ہاتھ کے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔ اور میں نے دیکھا کہ اُس کی ہتھیلیوں پر حنا کی صندلی تحریر ہے۔ میں بڑا حیران ہوا کیونکہ میرا خیال تھا۔ کہ آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیاں حنا ایسی دیسی [illegible] چیزیں پسند نہیں کرتیں۔ اُن کی پسند غازہ اور پاؤڈر اور لپ سٹک [illegible]۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ بمبئی ہے اور بمبئی میں سب کچھ ممکن ہے۔ اور میں نے کہا "پدما میں نے تمہارے بالوں سے متاثر ہو کر کچھ لکھا تھا۔ سنو گی؟" وہ بولی "میری پرورش بمبئی میں ہوئی ہے میری زبان اُردو نہیں۔ پھر بھی میں سمجھنے کی کوشش کروں گی"۔ اور میں نے پڑھنا شروع کیا۔ جب میں کہانی میں لڑکی کے بالوں کی تعریف کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ پدما اپنے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہے۔ اُس نے اپنے بالوں کی دونوں چوٹیوں کو جو اُس کی پیٹھ پر لٹک رہی تھیں پیار سے پکڑ کر آگے کر لیا ہے اور اب وہ اُس کے کندھوں پر سے ہوتی ہوئی اُس کی آغوش کو چوم رہی ہیں اور وہ انہیں پیار سے تھپتھپا رہی ہے۔ اور اب اُس نے ایک چوٹی کے

سرے کو ہاتھوں میں لے کر اُسے کھول ڈالا ہے۔ اور اُسے انجانے طور پر پھر گوندھنے لگی ہے۔ اور میں نے کہا کیا کسی اور نے کبھی تمہارے بالوں کی تعریف نہیں کی اور اُس نے چوٹی کے سرے کو شفقت سے گوندھتے ہوئے کہا۔ "معلوم نہیں" ....

جب وہ چلی گئی تو ونیکٹ نے پیچھے سے آکر میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور کہا "آج تو چڑیا کو پھانس لیا"۔ ونیکٹ برا نہ مانتا۔ اُس وقت میں انتہائی کوشش کے باوجود بھی تمہارے لئے اپنی آنکھوں کی نفرت کو نہ چھپا سکا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا۔ گویا کسی نے پوجا کے پھولوں پر تھوک دیا ہو۔ تم چپکے سے کھسک گئے تھے۔

"پھر تمہاری پدما کئی بار کافی ہاؤس میں آتی ہے۔ اُس دن کے بعد تمہیں اُس کے ساتھ ملتے تو نہیں دیکھا۔"

میں پھر اُس سے ملا بھی نہیں۔ میں گوپال ہوتا اگر پال تمہارے دانت بہت پیلے ہیں۔ دوست تمباکو پینا کم کر دو، تو پدما سے اگلے دن ملتا اور پھر اُس سے اگلے دن۔ جب تک کہ اُس کی خوبصورتی سے سیر ہو کر اُس سے مایوس نہ ہو جاتا۔ لیکن مجھے پدما کی خواہش نہیں، اُس کے بالوں کی خوبصورتی درکار ہے۔ اور وہ میں دُور سے دیکھ لیتا ہوں۔

"نزدیک سے شاید اور بھی بہتر ہو۔"

نہیں، اُس کے بالوں میں تو جو ہے سو ہے ان کی اصلی خوبصورتی میرے تخیل میں ہے۔ اور تصور بُعد میں ہے۔ قرب میں حقیقت ہے۔ اور حقیقت میں مایوسی ہے۔

عجیب آدمی ہو۔

ہاں، بہت عجیب ———

جدید، جدید تر

دھرم پرکاش آنند کے افسانوں کا مجموعہ

دھرم پرکاش آنند کے افسانے بہترین نفسیاتی تجزیے ہیں۔ ان تجزیوں میں وسعت ہے۔ ان کے تاثر کا دائرہ اُس کے اظہار کا پھیلاؤ ایک پورے سماجی طبقہ کا احاطہ کر لیتا ہے۔ اونچے متوسط طبقے کے ریشمیں خول میں کلبلاتی ہوئی زندگی کی زہر آلود تصویریں، ان تجزیوں کی سچائی، دیانت اور شدت آنند کے افسانوں کے تار و پود بنتے ہیں۔ اُس نے اپنے موئے قلم سے اس افسردہ گلشن میں وہ وہ نازک گُل بوٹے کھلائے ہیں کہ ایک پورے طبقے کی زندگی اور موت، اپنی تمام تر رعنائیوں اور افسردگیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آگئی ہے۔

(زیر طبع)

دیوار گر جاتی ہے ———
لیکن دھول دیر تک اڑتی رہتی ہے ———

گرتی دیواریں (ایک ناول)

ایک ایسے سماج کا زندہ مرقع ہے۔ جس کے گرد و غبار کی تاریکی نے بڑے بڑے مفکروں کو عاجز کر دیا ہے

لیکن

ایک فنکار کا قلم اسی تاریکی میں ایسے نقوش بھرتا ہے جن سے چاہے منزل نزدیک نہ آئے مگر منزل کا راستہ ضرور سجھائی دے جائیگا۔

گرتی دیواریں

میں اوپندر ناتھ اشک کی فنکاری نے یہی راستے سجھائے ہیں۔

(زیر طبع)

مکتبہ اردو لاہور

ممتاز مفتی

احسان علی

کیسی رنگیلی طبیعت تھی احسان علی کی۔ محلے میں کون تھا جو اُن کی باتوں سے محظوظ نہ ہوتا تھا۔ اگر وہ محلے کی ڈیوڑھی میں جا پہنچتے۔ جہاں بڈھیوں کی محفل لگی ہوتی۔ تو کھانسی کی آوازوں کی بجائے قہقہے گونجنے لگتے۔ چوگان میں بیٹھی ہوئی عورتوں کے پاس سے گزرتے تو دبی دبی کھی کھی کا شور بلند ہوتا۔ محلے کے کنوئیں کے پاس جا کھڑے ہوتے تو لڑکوں کے کھیل میں نئی روح دوڑ جاتی۔

جوان لڑکیاں، انہیں دیکھ کر گھونگھٹ تلے آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتیں اور پھر ایک طرف سے نکل جانے کی کوشش کرتیں۔ مٹیار عورتیں دیکھ پاتیں تو ان کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے۔ خواہ مخواہ جی چاہتا کہ کوئی بات کریں۔ بوڑھی عورتیں قہقہہ مار کر ہنس پڑتیں۔ مثلاً اس روز احسان علی کو چوگان میں کھڑا دیکھ کر ایک بولی۔ "یہاں کھڑے ہو کر کسے تاڑ رہے ہو احسان علی؟"

"یہ سامنے عورتوں کا جھرمٹ جو لگا ہے۔ نہ جانے کس محلے سے آئی ہیں۔" دوسری نے دور کھڑی عورتوں کی طرف اشارہ کیا۔

"اے ہے اب تو اپنے حمید کیلئے دیکھا کرو۔" بھابی کہنے لگی۔ "اللہ رکھے جوان ہو گیا ہے۔"

"اور تو کیا اپنے لئے دیکھ رہا ہوں بھابی"۔ احسان علی مسکرایا۔

اس بات پر ایک معنی خیز طنزیہ قہقہہ بلند ہوا۔ احسان علی ہنس کر بولا۔ "دنیا کسی صورت میں راضی نہیں ہوتی۔ چاچی اپنے لئے دیکھو تو لوگ گھورتے ہیں۔ کسی کے لئے دیکھو تو طعنہ دیتے ہیں مذاق اڑاتے ہیں"——جواب دینے میں احسان علی کو کمال حاصل تھا۔ ایسا جواب دیتے کہ سن کر مزہ آ جاتا—— شاداں نے یہ سن کر چاچی کو اشارہ کیا اور مصنوعی سنجیدگی سے کہنے لگی۔ "چاچی اس عمر تک اوروں کے لئے دیکھنا ہی رہ جاتا ہے نا"

احسان علی نے آہ بھری۔ بولے "کاش کہ تم ہی سمجھتیں شاداں"

"اتنی عمر ہو چکی ہے چچا پر تمہیں سمجھ نہ آئی۔" شاداں مسکرائی—— "ابھی دیکھنے کی ہوس نہیں مٹی؟"

"اچھا شاداں ایمان سے کہنا" وہ سنجیدگی سے بولے "کبھی تمہیں میلی آنکھ سے دیکھا ہے؟"

"ہائیں چچا" شاداں ہونٹ پہ انگلی رکھ کر بیٹھ گئی۔ "میں تو تمہاری بیٹی کی طرح ہوں"

"یہ بھی ٹھیک ہے"۔ وہ ہنسے "جب جوانی ڈھل گئی تو چچا جی سلام کہتی ہوں۔ لیکن جب جوان تھی۔ تو ہو جی پاس نہ پھٹکتی تھی کبھی۔ کیوں بھابی جھوٹ کہتا ہوں میں؟"

اس بات پر سب ہنس پڑیں اور احسان علی وہاں سے سرک گئے۔

ان کے جانے کے بعد بھابی نے کہا۔ "تو بہن احسان علی اور بات کرنے سے رہے۔"

چاچی بولی "ساری عمر تو عورتوں کو تاڑنے میں کٹ گئی اب تو باتیں ہی باتیں ہیں"

"نے بہن" شاداں نے مسکراتے ہوئے کہا "اب کرنا کیا رہ گیا ہے۔ اب بھی تو عورت کو دیکھ کر منہ سے رال ٹپکتی ہے۔"

"لیکن شاداں" بھابی نے کہا "شاباش ہے اس کو۔ کبھی محلے کی لڑکی کو میلی آنکھ سے نہیں دیکھا۔"

"یہ تو میں مانتی ہوں"۔ شاداں نے ان جانے میں آہ بھری۔

"یہ صفت بھی کسی کسی میں ہوتی ہے"۔ چاچی نے کہا۔

جب محلے والیوں کی یہ بات احسان علی نے پہلی بار سنی تو بولے "اتنا بھروسہ بھی نہ کرنا مجھ پہ شاداں"

"کیوں" چاچی نے ہنس کر کہا "یہ کیا جھوٹ ہے۔ تمہاری یہ صفت واقعی خوب ہے۔ میں تو منہ پہ کہوں گی احسان علی۔"

"اور چاچی یہ صفت نہ ہوتی ان میں تو ہمارا محلے میں رہنا مشکل ہو جاتا" شاداں بولی۔

احسان علی کھلکھلا کر ہنس پڑے اور بولے "چاچی کہتے ہیں ایک دفعہ ایک بلی کوئیں میں گر گئی۔ باہر نکلنے کیلئے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے۔ پھر بولی نہیں آج کی رات یہیں بسر کریں گے"۔

"بلی کا واقعہ کیا ہوا" چاچی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہماری سمجھ میں تو نہیں آیا" شاداں بولی۔

"بس تو چھوڑو اس بات کو" بھابی نے کہا "احسان علی کی بات کریدنے سے نکلے گا کیا؟"

احسان علی اس دوران میں ہنستے رہے پھر بولے "چاچی یہ میری صفت نہیں یہ تو محلے والیوں کی خوبی ہے بیچاری ایسی بنی ہیں کہ خواہ مخواہ ماں بہن کہنے کو جی چاہتا ہے۔ کیوں شاداں؟"

"ہائے اللہ۔ سنا تم نے چاچی؟" شاداں چلائی۔

"کبھی بھی ہو اس کی بات؟" بھابی مسکرائی

"سب سمجھتی ہوں" چاچی نے ہنس کر کہا۔

"خدا کا ہزار ہزار شکر ہے" شاداں بولی "کہ محلے والیاں ایسی ہیں۔ میں پوچھتی ہوں چچا اگر محلے میں کوئی ایسی ویسی ہوتی تو کیا واقعی۔ بچھ جاتے اُس پر؟"

"تم اُس کی باتیں سنو" بھابی نے کہا۔

"تو پھر کیسی باتیں بناتا رہتا ہے" چاچی ہنسی۔

"کسی محلے والی پر ریجھتے تو اک بار مزہ چکھا دیتی تمہیں چچا" شاداں آنکھیں چمکا کر بولی "جوتا دکھا دیتی میاں کو۔ کیوں بھابی؟"

"واہ" احسان علی مسکرائے "شاداں جس نے جوتا دکھا دیا سمجھو بات پکی کر دی"

"ہائے میں مر گئی" شاداں نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا۔

"احسان علی تجھ پر خدا کی سنوار" چاچی نے ہاتھ چلایا۔ اور احسان علی ہنستے ہنستے آگے نکل گئے۔ اُن کی عادت تھی کہ محفل پر اپنا رنگ جما کر چلے جایا کرتے۔

اگرچہ محلے والیاں اکیلے میں احسان علی کی گذشتہ زندگی پر ناک بھوں چڑھایا کرتیں اور ان کی فطری کمزوری پر مذاق اڑاتیں۔ لیکن جب وہ سامنے آجاتے تو نہ جانے کیوں ان کی آنکھوں میں چمک لہرا جاتی اور وہ خواہ مخواہ ہنس پڑتیں۔ جوان بیٹیاں تو اب بھی بچا بچا کر نکلنے کی کوشش کرتیں۔

جب احسان علی جوان تھے ان دنوں تو کسی عورت کا ان کے قریب سے گزر جانا بے حد مشکل تھا۔ خواہ مخواہ دل دھک دھک کرنے لگتا ماتھے پر پسینہ آجاتا۔ دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیتی "ہائے میں مر گئی یہ تو اپنا احسان علی ہے" ان دنوں بوڑھی عورتیں بھی مخدوش نگاہوں سے گھورتی تھیں۔ محلے کے مرد تو اب بھی انہیں دیکھ کر تیوری چڑھا لیتے۔ البتہ جب وہ کوئی دلچسپ بات کرتے تو وہ ہنسنے لگتے۔ اور یوں ہم کلام ہوتے جیسے اپنی فراخدلی کی وجہ سے ان کے گذشتہ گناہ معاف کر دیئے ہوں۔ لیکن احسان علی کی غیر حاضری میں وہ اکثر کہا کرتے "بوڑھا ہو گیا ہے لیکن ابھی ہدایت نہیں ہوئی۔ ہدایت تو اللہ میاں کی طرف سے ہوتی ہے۔ جنہیں نہ ہو انہیں کبھی نہیں ہوتی"۔

"حرامکاری کی لت کبھی جاتی ہے۔ بابا جی"

"ہاں بھئی یہ تو سچ ہے"۔

"دیکھو نا اتنی عمر ہو چکی ہے۔ باتوں میں کوئی فرق آیا ہے؟ وہی چھیڑ خانی — لاحول ولا قوۃ"۔

بات بھی سچی تھی اگرچہ احسان علی پچاس برس سے زیادہ ہو چکے تھے۔ لیکن وہی منڈی ہوئی داڑھی متبسم آنکھیں اور چھیڑ دینے والی باتیں۔ ان کی روح ویسے ہی جوان تھی۔ بچوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے دیکھتے تو وہیں کھڑے ہو جاتے۔ واہ واہ کرنے لگتے کھلاڑی کو داد دینے لگتے یا ایمپائر بن کر کھڑے ہو جاتے۔ لڑکے انہیں کھیل میں حصہ لینے پر مجبور کرتے۔ تالیاں بجاتے شور مچاتے "چچا جی ہمارے آؤٹ نہیں گے"۔ "نہیں ہمارے"۔ ایک ہنگامہ بپا ہو جاتا۔ کھڑکیوں سے محلے والیاں جھانکنے لگتیں۔ "لو دیکھو احسان علی گلی ڈنڈا کھیل رہے ہیں" چق کی اوٹ میں سے آواز آتی۔ "بھائی جی کیا پھر سے جوان ہونے کا ارادہ ہے"۔ سبز جنگلے سے شاداں سر نکالتی "ابھی تو اللہ رکھے پہلی جوانی ہی ختم نہیں ہوئی"۔ شاہ نشین سے چاچی بولتی۔ "تو پھر شاداں تو بھی کسی رُخ چین لینے نہیں دیتی۔ بس شکر کر کہ احسان علی کا دھیان اور کھیلوں سے ہٹا ہے۔ گلی ڈنڈا کھیلنے میں کیا عیب ہے"۔ مسجد سے آتا جاتا کوئی محلہ دار انہیں دیکھ کر ہنستا "کب تک اس لڑکیوں لڑکوں کے کھیل میں لگے رہو گے۔"

اب خدا کو بھی یاد کر لیا کرو۔" احسان علی ہنس کر گنگناتے "وقت پیری گرگ ظالم می شود پرہیزگار"۔ دوسرا آ کر کہتا "دنیاداری کی غلاظت سے اکتائے نہیں ابھی؟ صوم و صلوٰۃ کی پاکیزگی کو کیوں جاؤ —" احسان علی کہتے "باباجی غلاظت کا احساس ہو تو پاکیزگی کی آرزو پیدا ہوتی ہے نا۔" "تم میں احساس نہیں کیا؟" باباجی پوچھتے اور وہ جواب دیتے "احساس تو ہے پر غلاظت بھی ہے۔" اس بات پر کوئی لاحول پڑھ دیتا اور وہ ہنستے "لو بھائی جی اب تو شیطان بھی آ گیا۔" اور وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

احسان علی کے آنے سے پہلے محلہ کیسا ویران دکھائی دیتا تھا۔ اگرچہ موسم سرما میں دوپہر کے قریب محلے والیاں چوگان میں اکٹھی ہو کر ازار بند بُنا کرتی تھیں۔ دوپہر کے قریب جب چوگان میں دھوپ آتی تو چوکیاں بچھ جاتیں۔ مٹی کی ہنڈیاں رکھ دی جاتیں جن میں تیلیوں کے مٹھے بھرے ہوتے۔ بارہ بجے کھانے پینے سے فارغ ہو کر عورتیں وہاں جمع ہونا شروع ہو جاتیں۔ ایک بجے تک اچھا خاصہ میلا لگ جاتا۔ ہاتھ چلتے تاگے تیلیوں سے پھسلتے ہوئے عجیب آوازیں پیدا کرتے۔ تیلیاں ٹکراتیں، ازار بند بنتے ہوئے کسی کی بات چھڑ جاتی۔ گلے ہوتے، شکائتیں کی جاتیں۔ ایک دوسرے پر آوازے کسے جاتے۔ مگر قہقہے کی آواز نہ آتی۔

ادھر ڈیوڑھی میں مسئلے مسائل کی بات گرم رہتی۔ شریعت کے احکام بار بار دہرائے جاتے۔ حدیثوں کے حوالے دیئے جاتے۔ اولیاء کرام کی حکایات سنائی جاتیں۔ ہنگامہ تو رہتا تھا۔ مگر اس میں مزاح کی شیرینی نام کو نہ ہوتی۔ عورتوں کے مسلسل جھگڑوں اور مردوں کی خشک بحثوں کی وجہ سے وہ مسلسل شور محلہ کو اور بھی ویران کر دیتا۔ پھر احسان علی پنشن لے کر محلے میں آ بسے ان کے آنے کے بعد محلے کا رنگ بدل گیا۔ جب عورتیں ایک دوسرے کے گلے شکوے کرنے میں مصروف ہوتیں تو احسان علی آ نکلتے اور آتے ہی ایسی بات کرتے کہ سبھی ہنس پڑتیں اور محفل کا رنگ ہی بدل جاتا۔ طعنے اور تمسخر کی جگہ ہنسی مذاق شروع ہو جاتے۔ آپس میں جھگڑتی ہوئی عورتیں مل کر احسان علی کے خلاف محاذ قائم کر لیتیں اور محلے کے چوگان میں قہقہے گونجنے لگتے۔ محلے کے بزرگ خشک مسائل چھوڑ کر احسان علی کے چٹکلے سننے لگتے۔ بات بات پہ لاحول پڑھنے والے بڈھے لاحول پڑھنا بھول جاتے۔ لیکن پھر بھی عادت سے مجبور ہو کر کوئی نہ کوئی لاحول پڑھ دیتا۔ اس پر احسان علی کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔

"بھائی جی کیا آپ کو بات بات پر لاحول پڑھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں جب تک شیطان کا خطرہ لاحق نہ ہو لاحول کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔" احسان علی کو لاحول سے چڑ تھی چڑ۔ ہاں تو واقعی احسان علی کے آنے پر محلے میں ایک نئی روح دوڑ گئی تھی۔

پھر —— ایک روز ایک انوکھا واقعہ ہوا۔

چوگان میں عورتیں حسب معمول جمع تھیں۔ نئی روشنی کے نوجوانوں کی بات چل رہی تھی کہ شاداں نے دور سے احسان علی کو آتے دیکھ لیا۔ چاچی کو اشارہ کر کے باآواز بلند بولی "چاچی خدا جھوٹ نہ بلائے۔ آجکل تو چھوٹے چھوٹے لڑکے بھی چچا احسان علی بنے ہوتے ہیں۔ راہ چلتی لڑکی کو تاڑتے ہیں۔"

"ہائے ہائے" چچی نے شاداں کا اشارہ سمجھے بغیر کہا "تم تو خواہ مخواہ اُس بیچارے ——"

شاداں نے پھر سے اشارہ دہرایا۔ جسے دیکھ کر چچی کا غصہ مسکراہٹ میں بدل گیا۔

"آج کل کے مردوں کی کیا پوچھتی ہو چچی" شاداں نے پھر سے بات شروع کی۔ "بال کھچڑی ہو جاتے ہیں پر عورتوں کو تاڑنے کی لت نہیں جاتی۔"

"ہاں شاداں" چچی نے منہ بنا کر کہا "زمانہ ہی ایسا آیا ہے۔"

اس کے بعد، مجمع پر خاموشی چھا گئی ہر کوئی احسان علی کی بات سننے کی منتظر تھی۔ اگرچہ وہ سب یوں بیٹھ گئی تھیں۔ جیسے انہیں احسان علی کے آنے کی خبر ہی نہ ہو۔

احسان علی آئے اور چپ چاپ اُن کے پاس سے گزر گئے۔

اُنہوں نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا اور حیران ہو گئیں۔

"اللہ خیر کرے آج احسان علی کو کیا ہوا ہے" چاچی زیر لب بولی۔

"میں تو آپ حیران ہوں" شاداں ہاتھ ملنے لگی "اے ہے احسان علی اور چپ چاپ پاس سے گزر جائے۔"

"میں کہتی ہوں ضرور کوئی بات ہے" بھابی نے انگلی ہلاتے ہوئے کہا۔

"کہیں گھر سے لڑ کر تو نہیں آئے تھے" شاداں نے پوچھا۔

"اونہہ" چاچی نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہا۔ "جس روز نواب بی بی سے لڑا اس روز تو اور بھی چہکا ہوا ہوتا ہے۔ کیوں بھابی یاد ہے کل کیسے ہنس ہنس کر گھر کی لڑائی کی بات سنا رہا تھا؟"

"ہاں" بھابی مسکرائی "جیسے لڑائی نہ ہوئی تماشہ ہوا۔"

"اس کا کیا ہے" چاچی بولی "اس کے لئے تو ہر بات تماشہ ہے۔ چاہے موت کی ہو یا بیاہ کی"

"ہائے چاچی کیسی اچھی طبیعت ہے احسان علی کی۔ کبھی ماتھے پر تیوری نہیں دیکھی۔ ایمان سے رنگیلا ہے رنگیلا۔"

"یہی کہتی ہوں مزید آج کی بات ہے"۔ بھابی ہونٹ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔

شاداں ازاربند لپیٹتے ہوئے بولی "چلو تو چل کر نواب بی بی سے پوچھیں"۔

"اسے ہے دو جوڑے تو چڑھا لینے دے" بھابی نے کہا۔

"نہ ہونہہ دو جوڑے آتا ہو بہ جیسے کیا" اس نے اٹھ کر بھابی کے ازاربند کو زبردستی لپیٹ دیا۔

پہلے تو وہ نواب بی بی سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں پھر چاچی نے بات چھیڑی کہنے لگی "خیر تو ہے۔ احسان علی کو کیا ہے آج؟"

"ابھی اچھے بھلے باہر گئے ہیں" نواب بی بی نے جواب دیا۔

"وہ تو ہم نے بھی دیکھا تھا اسے باہر جاتے ہوئے" بھابی نے کہا۔

"میں نے تو بلکہ انہیں چھیڑنے کی خاطر کچھ کہا بھی تھا" شاداں بولی "میں نے کہا چلو دو گھڑی کا مذاق ہی رہے گا۔ پر انہیں یوں چپ چاپ دیکھ کر میں تو حیران رہ گئی۔ کہیں میری بات کا برا ہی نہ مان لیا ہو۔ توبہ میں نے بات ہی کیوں کی۔"

"اونہوں" نواب بی بی نے کہا "برا ماننے والا نہیں وہ۔"

"کسی فکر میں پڑا تھا۔ جبھی پاس سے گزر گیا" چاچی نے کہا۔

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے" نواب بی بی نے کہا "اپنے حمید کا خط آیا ہے آج۔ لڑکے نے اپنی شادی کے بارے میں لکھا ہے۔"

"ہائیں میں مر گئی" شاداں چلائی "آپ اپنی شادی کیلئے لکھا ہے کیا، تو یہ کیا زمانہ آیا ہے!"

"اس میں حرج ہی کیا ہے" چاچی بولی "اللہ رکھے جوان لڑکا ہے آپ کماتا ہے۔ کہہ دیا تو کونسی قیامت آ گئی۔"

"میں جانوں احسان علی کو ضد نہیں کرنی چاہئے اس بات میں۔"

"اونہوں انہیں خیال ہوتا اس بات کا تو یہاں تک نوبت ہی نہ آتی۔ میں کب سے کہہ رہی تھی کہ لڑکے کو نامزد کر دو لیکن ان کے اپنے چاؤ بھی ختم ہوں۔ اتنی عمر ہو چکی ہے۔ لیکن ابھی ہوس نہیں گئی۔"

"نہ بہن" چاچی بولی "مجھ سے تو آپ انہوں نے کئی بار کہا ہے کہ چاچی جہاں لڑکا کہے گا۔ اس کی شادی کر دیں گے۔ اللہ اللہ خیر صلا آجکل یہ کام لڑکے کی مرضی بغیر نہیں ہوتے۔ بات بھی سچی ہے۔"

"یہ بات ہے۔" نواب بی بی بولی "تو اب کیوں سر پیٹ کر باہر نکل گیا ہے۔ لڑکے نے اپنی بیوی تلاش کر لی ہے تو ——"

"اپنی بیوی آپ تلاش کر لی ہے؟" شاداں چلائی

"سچ؟" بھابی ران پر ہاتھ مار کر بولی۔

"ہاں بھابی" نواب بی بی بولی "پہلے تو آپ اپنی مرضی کی بیوی تلاش کرنے کی پٹی پڑھاتے رہے اور اب اس نے اپنی بیوی کا چناؤ کر لیا ہے تو میاں گرم ہو رہے ہیں"

"کون ہے وہ؟" چاچی نے پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم۔ اسکول میں پڑھاتی ہے۔ لڑکے نے فوٹو بھی بھیجی ہے اس کی۔"

"ہم بھی تو دیکھیں" شاداں نے منت کی۔

نواب بی بی اٹھ بیٹھی اور میز کی دراز میں سے فوٹو لے آئی۔

"ہائے چاچی یہ تو میم ہے میم" شاداں خوشی سے پھولی نہ سمائی۔

"اسے ہے" چاچی بولی "ایسی ہی تو ہوتی ہیں یہ اسکول والیاں۔"

"تو یہ کیسی بنی ٹھنی بیٹھی ہے" بھابی ہنسی

"کتنی خوبصورت ہے" شاداں بولی "احسان علی کو ایسی خوبصورت بہو کہاں سے مل سکتی تھی۔"

عین اس وقت احسان علی آ گئے شاداں کی بات سن کر وہ گھبرا گئے۔ ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے پھر کمرے سے باہر جانے لگے۔ لیکن شاداں کب چھوڑنے والی تھی انہیں "مبارک ہو چچا" وہ بولی "نئی بہو مبارک ہو۔ محلے کی لڑکیاں تو تمہیں پسند نہیں تھیں۔ اللہ رکھے

نمک نے یہ مشکل بھی آسان کر دی؟"

ایک ساعت کیلئے احسان علی کا منہ فق ہو گیا لیکن جلد ہی وہ سنبھل کر غصے میں بولے "وہ تو بیوقوف ہے بیوقوف اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ خوبصورت لڑکیاں دیکھنے کیلئے ہوتی ہیں بیاہنے کیلئے نہیں۔ بھلا دیکھو تو اس لڑکی کا اس گھر میں گزارہ ہو سکتا ہے کیا؟"

"کیوں اس کو کیا ہے" شاداں بولی "دیکھو تو کتنی خوبصورت ہے۔"

"یہی تو مصیبت ہے" وہ جھلاتے ہوئے بولے۔

"آپ جو ساری عمر خوبصورت لڑکیوں کے پیچھے پیچھے پھرتے رہے ہو احسان علی۔ اب کیا لڑکے کا جی نہیں چاہتا" بھابی بولی۔

"پیچھے پیچھے ہی پھرتا رہا ہوں نا بیاہ کر تو نہیں لایا کسی کو۔ یہ دیکھ لو یہ حمید کی ماں بیٹھی ہے" وہ جوش میں بولے "دیکھ لو کیا ناک نقشہ ہے۔"

"کیوں نواب بی بی کو کیا ہے" چاچی ہنسی۔

"میں کب کہتا ہوں کہ کچھ ہے۔ اگر کچھ ہوتا تو کیا میرے چولھے پر بیٹھ کر برتن مانجھتی رہتی؟"

"آخر حمید کا بھی تو جی چاہتا ہے کہ خوبصورت لڑکی ہو اس میں حرج ہی کیا ہے" شاداں مسکرائی۔

"میں کب کہتا ہوں کہ جی نہ چاہے لیکن چاچی یہ تیتریاں تو یارانہ لگانے کیلئے ہوتی ہیں۔ بیاہنے کیلئے نہیں۔"

"ہائیں" شاداں نے ناک پر انگلی رکھ لی "احسان علی تم نے تو حد کر دی۔"

"کوئی محلے کی بیاہ لیتا پھر چاہے جہاں مرضی ہوتی یارانے لگاتا پھرتا" احسان علی اپنی ہی دھن میں کہے گئے۔

"توبہ میری، احسان علی تم تو بات کہتے ہوئے کسی کا لحاظ نہیں کرتے" چاچی بولی۔

"لو اسے دیکھو نا ذرا" احسان علی نے پھر تصویر اُن کے سامنے رکھ دی "یہ آنکھیں!! راہ چلتے کو روکتی ہیں یا نہیں۔ توبہ آنکھ بھر کے دیکھا نہیں جاتا۔"

"اے ہے دیکھا کیوں نہیں جاتا۔ بھلی اچھی تو ہے" شاداں مسکرائی۔

"مرد کی آنکھ سے دیکھو تو معلوم ہو نا" احسان علی ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھنے لگے۔

"اپنی بہو کے بارے میں کہہ رہے ہو" چاچی ہنسی

"بہو تو جب بنے گی تب دیکھا جائے گا۔ چاچی ویسے بات کر رہا ہوں آخر مجھے بھی تو اسی گھر میں رہنا ہے" وہ مسکرائے۔

اس بات پر نواب بی بی کی بھی ہنسی نکل گئی بولی "ان کی تو عادت ہی ایسی ہے جو منہ میں آیا کہہ دیا۔"

ان کے چلے جانے کے بعد احسان علی پھر اسی طرح گم سم ہو گئے۔ حمید کی ماں نے کئی بار بات چھیڑنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے خیالات میں گم تھے۔ دفعتاً وہ اٹھ بیٹھے "حمید کی ماں مجھے آپ جاکر اس سے ملنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ معاملہ ہاتھ سے نکل جائے۔ سوٹ کیس میں دو جوڑے رکھ دے میں صبح پہلی گاڑی سے ہی چلا جاؤں۔"

حمید کے پاس پہنچ کر پہلے تو انہوں نے باتوں ہی باتوں میں اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ چٹکلے سنائے۔ اپنے تجربہ اور مشاہدہ کو پیش کرنے کیلئے آپ بیتیاں بیان کیں لیکن جب حمید نے کسی بات کا جواب نہ دیا تو وہ دلیلوں پر اُتر آئے۔ لیکن اس پر بھی حمید خاموش رہا تو انہوں نے اسے دھمکانا شروع کر دیا۔ جلد ہی دھمکیوں نے منتوں کی شکل اختیار کر لی۔ اس پر حمید بولا "ابا جی میں مجبور ہوں میں نسرین سے بیاہ کرنے پر مجبور ہوں" اس وقت احسان علی کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی ڈوبتا سہارا لینے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو۔ دفعتاً وہ پھر جلال میں آ گئے بولے "اچھا بیشک بیاہ لاؤ اسے لیکن وہ ہمارے یہاں کبھی نہ آئے گی کبھی نہیں۔ ہم اس سے کبھی نہ ملیں گے۔" اس پر حمید اُٹھ بیٹھا بولا "آپ کی مرضی" "لیکن اس لڑکی کو بیاہنے پر تم اس قدر مصر کیوں ہو؟" انہوں نے پوچھا "میں مجبور ہوں ابا جی" حمید نے کہا "ہماری شادی ہو چکی ہے" "ہو چکی ہے؟" وہ دھڑام سے صوفے پر گر گئے "ہو چکی ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" "یہ حقیقت ہے" حمید نے سنجیدگی سے کہا "اس بات کو ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔"

"ایک ہفتہ؟" انہوں نے پیشانی سے پسینہ پونچھا "یہ بات ہے تو پھر جھگڑا ہی کیا ہوا" دفعتاً ہنس پڑے لیکن اُن کی ہنسی بڑی کھسیانی تھی حمید اُٹھ بیٹھا اور ساتھ والے دروازے کو کھٹکھٹانے لگا "ایں!"

احسان علی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا "تم تو کہتے تھے۔ یہ گھر ہ پڑوسیوں سے متعلق ہے۔" "اور کیا کہتا ابا جی" حمید مسکرایا اور پھر آواز بلند کہا "نسرین۔ آجاؤ ابا تم سے ملنا چاہتے ہیں۔" "اوہ!" احسان علی کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی" تو یہ بات ہے"۔

نسرین بڑے پُر وقار انداز سے کمرے میں داخل ہوئی "سلام عرض کرتی ہوں"۔ سریلی آواز کمرے میں گونجی وہ ایک ساعت کیلئے وہ سامنے ٹنگی ہوئی تصویر کو گھورتے رہے پھر دفعتاً انہیں احساس ہوا کہ انہیں جواب میں کچھ کہنا چاہئے" بیٹھئے۔ تشریف رکھیے۔ تشریف رکھئے" وہ گھبرا کر بولے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اسی صوفے کے دوسرے سرے پر بیٹھ گئی ہے۔ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں جو ہونا تھا ہو چکا۔ فضول "ہاں بھئی" وہ حمید سے مخاطب ہوئے "تم انہیں محلے میں لائو نا۔ تمہیں وہاں آنا ہی پڑے گا۔ تمہاری ماں تمہاری راہ دیکھ رہی ہے" "سچ!" حمید بولا "کیا واقعی آپ چاہتے ہیں کہ ہم گھر آئیں؟" "اور تو کیا مذاق کر رہا ہوں میں۔ تمہیں چھٹی لینی چاہئے۔ ہاں"۔ "چھٹی تو میں نے پہلے ہی سے لے رکھی ہے" حمید مسکرایا۔ "تو پھر یہاں کیا کر رہے ہو۔ کیا حماقت ہے" انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی "کل ہی پہنچ جاؤ وہاں۔ اچھا میں اب جاتا ہوں۔ نسرین کو ساتھ لانا۔ سمجھے؟"

جس وقت حمید اور نسرین محلے میں داخل ہوئے وہ سب چوگان میں تھیں۔ نسرین نے کالا ریشمیں برقعہ اتارا۔ ایک ساعت کے لئے وہ جھک گئیں ــــــ رسمی سلام ہوئے۔ دعائیں دی گئیں۔ سر پر ہاتھ پھیرے گئے۔ جب دلہن اپنے گھر چلی گئی تو نکتہ چینی ہونے لگی۔ ایک بولی "سچ بہن دلہن کا ہمارے ساتھ کیا میل"۔ شاداں بولی "کیوں ہم کیا کم ہیں کسی سے" تیسری نے کہا۔ "منہ پر اللہ مارا پوڈر دو دو انگل چڑھا ہوا ہے"۔ چوتھی نے کہا "دیسے تو چودھویں کا چاند ہے۔ احسان علی کا گھر تو منور ہو گیا؟" "ہاں بہن" شاداں نے آہ بھر کر کہا "اُسے محلے والیاں پسند نہ تھیں"۔ شاداں نے سر اٹھایا تو سامنے احسان علی کھڑے تھے۔ بھابی بولی "سُنا احسان علی شاداں کیا کہہ رہی ہے۔" "لاحول ولا قوۃ" احسان علی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ شاداں کب

چھوڑنے والی تھی انہیں بولی "لو چاچی آج تو چچا کے منہ سے بھی لاحول سن لیا۔ احسان علی کو دفعتاً اس کا احساس ہوا تو لگے سرکنے وہاں سے۔ شاداں نے بڑھ کر ہاتھ سے پکڑ لیا بولی "اب کہاں جاتے ہو میں تو گن گن کے بدلے لوں گی۔ چاچی ہنسی بولی "کیسی مبارک دلہن آئی ہے کہ احسان کے منہ سے عربی کے لفظ نکلے"۔ "یہ چاچی" شاداں چلائی "ان سے بھلا پوچھو تو آج لاحول پڑھنے کی کیا ضرورت پڑی ہے انہیں" "ہائے ہے شاداں" بھابی بولی "کیا کہہ رہی ہے تو؟" "ٹھیک تو کہہ رہی ہوں"۔ شاداں چمکی "اس روز میں نے لاحول پڑھا تو احسان علی نے کس قدر شرمندہ کیا تھا۔ مجھے کہنے لگے جب لاحول پڑھا جائے تو شیطان کچھ دور نہیں ہوتا"۔ "اب تو اُسے جانے بھی دے گی یا نہیں" چاچی چڑ کر کہنے لگی "گھر جو آئی ہے اور تو نے اُسے یہاں پکڑ رکھا ہے"۔

اسی شام کو جب دولہا دلہن اپنے کمرے میں چلے گئے تو شاداں نے حسب معمول ازراہ مذاق چچا سے کہا "خیر سے دلہن گھر میں آئی ہے تمہیں تو شکرانہ کے نفل ادا کرنے چاہئیں احسان علی"۔ جب کبھی شاداں انہیں مذاق سے نفل یا نماز ادا کرنے کو کہا کرتی تو احسان علی جواب میں کوئی نہ کوئی فقرہ چست کر دیا کرتے لیکن اس روز وہ بولے "سچ ــــــ اچھا شاداں تو بھی کیا کہے گی کہ چچا نے کبھی میری بات نہیں مانی۔ آج تو تیری بات پوری ہی کر دیتے ہیں"۔ یہ کہہ کر وہ حمام کے پاس جا بیٹھے۔ اور وضو کرنے لگے پہلے تو سمجھتی رہی کہ مذاق کر رہے ہیں لیکن جب وہ جائے نماز پر کھڑے ہو گئے تو شاداں حیران رہ گئی۔

اگلے روز تمام محلے میں بات مشہور ہو چکی تھی۔ کہ احسان علی نے نفل پڑھے۔

"سچ"۔ بچی بولی۔

"کیا واقعی"۔ بھابی نے دونوں ہاتھوں سے سینہ سنبھال لیا ــــــ

"نہیں نہیں میں نہیں مانتی"۔

"تمہاری قسم"، شاداں نے ہاتھ چلا کر کہا۔

"مبارک قدم ہے دلہن کا" چاچی بولی "کہ احسان علی مصلے پر کھڑے ہوئے"۔

محلے کی ڈیوڑھی تک بات پہنچی تو ترپ۔ بحث ہونے لگی۔

"ابھی مغرب کے لئے وقت مقرر ہے!"
"میں کہتا ہوں شکر کرو کہ اس نٹ کھٹ نے سجدہ کیا!"
"آخر کب تک نہ کرتا سجدہ"
احسان علی کو آتے دیکھ کر ایک بولا۔ "آخر آ گئے نا راہ راست پر"
"ہاں بھئی اب تو چھپ چھپ کے نفل پڑھے جاتے ہیں"
"احسان علی تو کہا کرتا تھا۔ جب غلاظت کا احساس ہو تو ——"
"آ گئے نا عورتوں کی باتوں میں" احسان علی نے ہنسنے کی کوشش کی
"کون ہے بابا جی جو عورت کی بات میں نہیں آتا۔ سب مجھ سے ہیں۔"
"لیکن اس میں بُرا کیا ہے" بابا جی نے کہا "ہمیں تو بلکہ خوشی ہے کہ تم نے سجدہ کیا۔"

دو دن تو احسان علی کے گھر میں ہنگامہ رہا۔ عورتیں آتی جاتی رہیں۔ محلے کے کمین میراثی ڈوم اور بھانڈ بدھائی دینے کیلئے آ موجود ہوئے پھر تیسرے دن جب انہیں فراغت ہوئی تو نواب بی بی نے کہا "اب کیا دلہن کیلئے چار ایک جوڑوں کا انتظام بھی نہ کرو گے۔ اور محلے والے انہیں تو ولیمہ کی دعوت دینی ہو گی۔"

پہلے تو احسان علی شہر جا کر چیزیں خریدنے کیلئے تیار نہ تھے پھر جب انہوں نے دیکھا کہ نواب بی بی کے ساتھ حمید جانے کو تیار ہو گیا ہے تو وہ گھبرا گئے "بولے حمید کا جانا ٹھیک نہیں۔ دولہا کو دلہن سے علیحدہ کرنا مناسب نہیں" "تو پھر میرے ساتھ کون جائے گا؟" نواب بی بی نے چڑ کر پوچھا "تو میں ہی چلا جاتا ہوں" وہ بولے۔ اس بات پر حمید کہنے لگا "میرے جانے میں کیا حرج ہے ابا جی۔ آپ جو گھر ہیں۔ نسرین اکیلی تو نہ رہے گی" احسان علی نے اصرار کیا تو وہ بولا "آپ جا کر نہ جانے کیا اُٹھا لائیں گے"۔ "اوہ یہ بات ہے" احسان علی نے اطمینان کا سانس لیا۔ "تو دلہن کو بھی ساتھ لے جاؤ" اس بات پر نواب بی بی چلائی "لے ہے نئی دولہن کو ساتھ ساتھ لئے پھریں۔ لوگ کیا کہیں گے"۔ احسان علی خاموش ہو گئے۔ اور حمید اپنی والدہ کو ساتھ لے کر دو روز کیلئے شہر چلا گیا۔

پہلے روز تو وہ باہر نکل گئے۔ چوگان میں بیٹھی عورتوں کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ پھر ڈیوڑھی میں جا [illegible]۔ لیکن جلد ہی وہاں بھی نئی دلہن احسان کے نفلوں کی بات چھڑ گئی۔ وہ بہانے بہانے وہاں سے سرک آئے۔ بچوں نے انہیں گزرتے ہوئے دیکھا اور گے شور مچانے۔ ایک ساعت کیلئے وہ حسب معمول وہاں کھڑے رہے پھر دفعتاً کوئی خیال آیا۔ اس کھڑکی کی طرف دیکھا جو نسرین کے کمرے سے اس طرف کھلتی تھی۔ اس خیال پر وہ پھر چوگان میں آ کھڑے ہوئے چوگان میں شاماں نے انہیں پکڑ لیا اور لگی مذاق کرنے لیکن اس روز انہیں کوئی بات نہ سوجھتی تھی۔ بار بار اوپر کھڑکی کی طرف دیکھتے اور پریشان ہو جاتے۔

شام کو جب وہ گھر پہنچے تو نسرین مسکراتی ہوئی انہیں ملی۔ بولی "رات کیلئے کیا بنواؤں" "جو تم چاہو" وہ گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ نسرین انہیں کی چارپائی پر بیٹھ گئی تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے "اوہ ——" اُن کے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا نسرین چونک پڑی "کیا چاہیئے آپ کو" "میں تو بھول ہی گیا" وہ اپنی ہی دھن میں بولے "کیا" نسرین نے پوچھا "کچھ نہیں کچھ نہیں"۔ وہ بڑبڑائے "میرا مطلب ہے"۔ انہیں خود سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اُن کا مطلب کیا ہے اور وہ اس قدر مضطرب کیوں ہیں۔ اُن کی گھبرائی ہوئی نظریں جائے نماز پر جا پڑیں۔ اطمینان کا سانس لیا جیسے ڈوبتے کو سہارا مل گیا ہو "میرا مطلب ہے" وہ بولے "مغرب کی نماز کا وقت تو جا رہا ہے"۔ انہیں وضو کرتے دیکھ کر نسرین نے جائے نماز بچھا دی۔ اور آپ اس کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ کر سویٹر بننے لگی۔ وضو سے فارغ ہو کر وہ جائے نماز پر آ کھڑے ہوئے ابھی نیت باندھنے ہی لگے تھے کہ پیچھے سے خوشبو کا ایک لپٹا آیا۔ مڑ کر دیکھا۔ نسرین بیٹھی کچھ بُن رہی تھی۔ وہ پھر بڑبڑانے لگے "میرا مطلب ہے۔ یعنی ابھی تو وقت ہے۔ کافی وقت ہے ابھی یہ پاس ہی تو مسجد ہے" یہ کہہ کر انہوں نے جوتا پہنا اور پیشتر اس کے کہ نسرین کچھ کہے باہر نکل گئے۔ اس کے بعد انہیں پتہ نہیں کہ کیا ہوا۔ وہ بھاگے بھاگے چوگان سے نکل گئے۔ کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھے بغیر آگے چلے گئے۔ ڈیوڑھی خالی پڑی تھی۔ وہاں انہیں ہوش آیا۔ سوچنے لگے۔ پھر نہ جانے وہ مسجد کے دروازے پر کیسے پہنچ گئے۔ دروازے میں احسان علی کو دیکھ کر محلے والے اُن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ایک بولا "اس کو بھولا نہ جانئے جو صبح گیا گھر واپس آوے شام" دوسرا کہنے لگا "آخر کبھی نہ کبھی غلاظت کا احساس ہو ہی جاتا ہے" یہ سُن کر دفعتاً وہ مڑے جیسے وہاں سے بھاگ جانا

چاہتے ہوں۔ میں اس وقت بابا جی آ گئے۔ احسان علی کو پکڑ لیا "اگر واپس نہیں جانا کمبخت احسان علی" وہ انہیں گھسیٹ کر مسجد میں لے آئے۔

اس واسطے انہیں اطمینان سا ہو گیا بولے "یہ دیکھو میں تو نہیں گیا تھا جا رہا تھا" "چلو یونہی سہی" بابا جی نے کہا "تیسرا پہلا آخر کوئی نہ کوئی بہانہ یا وسیلہ بن ہی جاتا ہے۔ نئی بہو کے دم قدم کو دعا دو بھئی" پھر تھے نے کہا "وہ کہاں احسان علی کہاں مسجد" اگر مسجد کا امام وقت تنگ سمجھ کر گھبرا نہ ہو جاتا تو نہ جانے کیا کیا باتیں ہوتیں اس وقت۔

رات کو کھانے کے بعد نسرین نے انہیں کے کمرے میں اپنا بستر جما دیا۔ اور پھر آپ چارپائی پر بیٹھ کر اطمینان سے سویٹر بننے لگی۔ حقہ پیتے ہوئے وہ کچھ سوچنے کی کوشش کرتے رہے لیکن بار بار نگاہیں ادھر اُدھر بھٹکنے لگتیں۔ سامنے فرش پر نسرین کی خوبصورت سُرخ چپلی اُن کی آنکھوں تلے ناچی۔ کمرہ خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔ اُف وہ بار بار اپنی ناک سکیڑتے کیسی واہیات بو تھی: "ہاں وہ میری کتاب" وہ آپ ہی آپ گنگنائے "کتاب؟" نسرین کی آواز کمرے میں گونجی "میں دیتی ہوں آپ کی کتاب"۔ "نہیں نہیں" وہ چلائے "میں خود لے لوں گا" وہ اُٹھ بیٹھے لیکن نسرین پہلے ہی الماری تک پہنچ چکی تھی۔ لاحول ولا قوۃ بے اختیار ان کے منہ سے نکل گیا۔ وہ وہیں رُک گئے جیسے آگے بڑھنے سے ڈرتے ہوں "وہ نیلی وہ بائیں طرف، دائیں" وہ چلائے ـــــــ "وہاں رکھ دو" انہوں نے دور سے چارپائی کی طرف اشارہ کیا ـــــ "وہاں"۔

ان کی آنکھوں تلے کتاب کے لفظ ناچنے لگے۔ حاشیہ سرک سرک کر دائیں سے بائیں طرف جا پہنچتا اور پھر بائیں سے دائیں چلنا شروع کر دیتا۔ لفظوں کی قطاریں چلنے لگتیں اور پھر دفعتاً ایک جگہ ڈھیر ہو جاتیں ـــــ دور محلے والیاں ڈھولک بجا رہی تھیں۔ سامنے نسرین کس انداز میں بیٹھی تھی۔ کیا واہیات طریقے سے بیٹھی ہے انہوں نے سوچا کیا نمائشی انداز ہیں۔ اور وہ پھر چونکے "کیا بھئی نائی کی ماں نہیں آئی" وہ گویا کتاب سے پوچھنے لگے "کوئی کام ہے کیا؟" نسرین نے پوچھا "نہیں نہیں" وہ گھبرا گئے۔ "ویسے وہ سونے کو تو آنے کو کہہ گئی تھی" "اس کی کیا ضرورت ہے" نسرین بولی "میں جو ہوں" "اوہ" وہ از سرِ نو گھبرا گئے۔

"میں جو ہوں میں جو ہوں" دور محلے والیاں ڈھولک کے ساتھ گا رہی تھیں ـــ "اور گیارہ بج گئے" انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا "ابھی تو گیارہ ہی بجے ہیں" نسرین نے جواب دیا "وقت ہی نہیں گزرتا"

"وقت ہی نہیں گزرتا وقت ہی نہیں گزرتا" گھڑی کراہنے لگی۔

وہ اٹھ بیٹھے اور بے خبری میں حمام کے سامنے بیٹھ کر وضو کرنے لگے۔ رات کو وہ گھبرا کر اُٹھے۔ کمرے میں چھوٹی سی بتی جل رہی تھی۔ چاروں طرف عجیب سی بوجھل سی ہوئی تھی۔ سامنے نسرین سوئی ہوئی تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے پاؤں رضائی سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ "جیسے جیسے" کسی نے تمسخر سے ان کے کان میں کہا۔ سرہانے بالوں کا ڈھیر لگا تھا۔ سرہانے تلے پتلی پتلی انگلیاں پڑی تھیں جن پر ... چمک رہا تھا "فضول" انہوں نے منہ بنایا۔ اٹھ بیٹھے اور باہر نکل گئے۔ صحن میں چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ دور محلے والیاں گا رہی تھیں ـــ بال گوری لیے چھپر کاٹ ـــ نہ جانے کیوں انہوں نے محسوس کیا جیسے اُن کی زندگی کی تمام رنگینیاں ختم ہو چکی تھیں۔

اندر آ کر وہ سوچنے لگے "ہوں تو دو بجے ہیں" "وقت گزرتا ہی نہیں۔ وقت گزرتا ہی نہیں" گھڑی چلانے لگی۔

جائے نماز کو دیکھ کر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ جو چاہتا تھا ہو گیا۔ انہوں نے سوچا حمیدہ نے کس قدر فحش غلطی کی ہے بیوقوف۔ انہوں نے نسرین کی طرف دیکھ کر سوچا اور پھر ان جانے میں جائے نماز پر کھڑے ہو گئے۔ اس وقت انہیں نماز گویا یاد ہی نہ تھی میرے اللہ میرے اللہ دل سے آوازیں آ رہی تھیں جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر رو دیں بلکہ رو کے بغیر وہ سجدے میں گر گئے۔

میں اس وقت شاداں چاچی کے ساتھ کوٹھے سے نیچے اُتری "چپ" شاداں زیر لب بولی "وہ سو رہے ہوں گے۔ آج تو چچا احسان سے وہ مذاق کر کے رہوں گی۔ کیا یاد کریں گے" چاچی ہنس پڑی بولی "تجھے بھی تو ہر وقت شرارتیں ہی سوجھتی ہیں" "اور وہ کیا کرتے ہیں میرا" شاداں نے کہا۔

"ہائیں" انہیں سجدے میں پڑے دیکھ کر شاداں نے اپنا سینہ سنبھالا "میں مر گئی یہاں تو تہجد ادا کیا جا رہا ہے" "نہ جانے بہو نے کیا جادو کر دیا ہے"

"سچ" چاچی نے ہونٹ پر انگلی رکھ لی "اور یہ دیکھو دلہن سو رہی ہے جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو"

احسان علی چونک کر اُٹھ بیٹھے۔ ان کے گال آنسوؤں سے تر تھے۔ "ہائے میرے اللہ" شاداں نے چھاتی کو سنبھالا۔ احسان علی نے انہیں دیکھا تو دفعتاً منہ ڈھیلا پڑ گیا۔ چہرہ پر بجلیاں سی چمک گئیں جیسے تمکنت وہ بوڑھے ہو گئے ہوں "احسان علی" شاداں نے چیخ سی ماری۔

احسان علی نے منہ پھیر لیا۔ ایک ہچکی نکل گئی اور وہ سجدے میں گر پڑے۔ انہوں نے محسوس کیا گویا چینی کا نازک سا کھلونا ریزہ ریزہ ہو کر ڈھیر ہو گیا ہو۔

خدیجہ مستور

ایک بچی

اس دن شام ہی سے پھوار پڑ رہی تھی اور بس مجھے خواہ مخواہ ہی تو اُلجھن ہو رہی تھی۔ اُدھر چند سال سے اکثر یہی حالت رہتی اُگھٹی گھٹی، دبی دبی بیزاری اور اُلجھن سی ۔۔۔ اس پر شام ہی سے ہلکی ہلکی پھوار ۔۔۔ مجھے ہلکی ہلکی، دبی دبی کیفیتوں سے جانے کیوں نفرت سی ہونے لگتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جھما جھم بارش ہو تو سارا پانی مکانوں کی چھتوں سے ندی نالے کی طرح بہہ کر نکل جاتا ہے۔ لیکن یہ ہلکی ہلکی پھوار تو ایسے غضب کی ہوتی ہے۔ کہ ٹکڑے ٹکڑے مکان بھی ڈھ جاتے ہیں اس سے ۔۔ لاکھ کوشش کرنے کے باوجود میں اُلجھتی ہی چلی جا رہی تھی ۔۔۔ جتنی لمبی عمر ہو اتنی ہی لمبی اُلجھنیں۔ سوئی میں لمبا تاگا ڈال کر سینے لگو تو بار بار گتھیاں پڑ جاتی ہیں۔ میں بھی تو تیتیس سال کے لگ بھگ ہو رہی تھی ۔۔۔ ہے رے!

میرے سرہانے کی کھلی ہوئی کھڑکی سے سرد اور یخ ہوا خاموشی سے داخل ہو رہی تھی۔ اس پر بھی دماغ میں گویا انگیٹھی سی دہک رہی تھی ۔۔۔

رات کا ابتدائی حصہ تھا لیکن میری گلی میں انسان تو انسان کتے تک گم سُم ہو چکے تھے اور مجھے اس وقت یہ سکوت ہمیشہ سے زیادہ کھل رہا تھا۔ اس گلی کے مکان میں رہ کر تو یوں معلوم ہوتا کہ میں بھی وہی کہانیوں والی شہزادی ہوں جسے اُس کے باپ نے ناراض ہو کر جنگل کے قلعے میں قید کروا دیا تھا۔

لمبے چوڑے کمرے میں برابر برابر سلیقے سے بچھے ہوئے پلنگوں پر میری چار اور پانچوں بہنیں لحافوں میں گھُسی گٹھڑیاں بنی ہوئی پڑی تھیں ۔۔۔ چُپ چاپ، لحافوں تلے ڈھیر، جیسے میری طرح ان سب کو بھی کوئی اُلجھن گھیرے ہوئے ہو۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک کمرے میں برابر برابر پڑے ہوئے پلنگ ۔۔ جیسے ہم سب قیدی ہوں، جنرل وارڈ کے مریض یا کسی یتیم خانے کے یتیم ۔۔۔

"بھئی اللہ ۔۔۔ بھئی اللہ ۔۔۔" میرے سر میں دھمک سی ہونے لگی اور جیسے میرے اندر ہی اندر کوئی اُچھل کر جھٹکنے لگا۔ بھئی اللہ! سب سو گئے، سب لحافوں تلے دفن ہو گئے ۔۔۔ کوئی بھی نہیں بولتا۔ کیا سب کے سب حلق تک کھانا ٹھونس کر بیٹھے ہیں جو ہوں ہاں تک کرنے کی سکت نہیں رہی ۔۔ کھائیں گے نہیں تو اور کیا کریں گے یہ لوگ، گویا میری کمائی ہے بھی تو حرام کی۔ دن بھر ڈیڑھ سو روپلی کے لئے میں اپنا بھیجا کوڑھ مغز لڑکیوں سے چاٹ کر کھوں اور یہ سب آنکھیں منہ سے حلق تک بھر کے ۔۔۔ اور وہ چچا جان بھی تو نہیں آئے ابھی تک۔ کسی باہر رہتے؟ یہ بھی تو کچھ کم خود غرض نہیں ہیں۔ بیچارے اپنے بڑے بھائی کے مرنے کے بعد ان کی بیوی اور بچوں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ باتوں کے چٹخارے مکانوں کے خوار۔ آئیں گے گیارہ بجے باہر سے۔ کون اُٹھ کر دروازہ کھولے گا۔ بڑے آئے چچا جان بڑے تیمارداری برائے نام جائیداد کے حساب کتاب میں بھی گڑبڑ کرتے ہوں گے جبھی تو راتوں کو باہر رہتے ہیں۔ بڑھاپے میں جانے کہاں چھچھوندروں کی طرح چھپاتے پھرتے ہیں۔ چچی جان کو مرے ہوئے تیس سال ہو گئے۔ جبھی سے یہ رنڈوے ہیں۔ کہتے ہیں انہیں مرحومہ سے عشق ہے۔ ہاں بھئی ہوگا "مرحومہ سے عشق"۔ ورنہ روایت ہے کہ چچی جان زندگی بھر ان کے عشق کی لگام اپنی طرف موڑنے کی کوشش کرتی رہیں۔ مگر بھئی ہندوستانی مردہ پرست ہیں۔ مرحومہ سے عشق ہو جانا کچھ عجیب بھی نہیں جبھی تو اس سوگ میں راتوں کو باہر رہتے ہیں ۔۔۔ میں بھی مر جاؤں گی تو سب مجھے چاہنے لگیں گے۔ کیا لڑکی تھی کہ عمر بھر شادی نہ کی اور باپ کے بعد گھر سنبھال لیا ۔۔ بھئی اللہ! اس زندگی سے تو بہتر ہے کہ مر جاؤں جلدی ۔۔ مگر ابھی تو اُٹھ کر دروازہ کھولنا ہے ۔۔۔ اللہ کرے مر جائیں چچا جان۔

اور میری اُلجھن بڑھتی ہی گئی۔ روزانہ کی یکرنگی اور بے کیفی کا احساس جیسے چبھنے لگا ۔۔۔ یہی برابر برابر پڑے ہوئے پلنگ اور میری جوان بہنیں اور بوڑھی ماں ۔۔۔ جی میں آیا کہ سب کے پلنگ گھسیٹ گھسیٹ کر گڈمڈ کر دوں۔ میز پر رکھے ہوئے لیمپ پر اپنا تکیہ کھینچ ماروں اور میز کے نیچے بیٹھی ہوئی پالتو بلی کو اُٹھا کر کھڑکی سے نیچے گلی کے سرخ سرخ فرش پہ پٹخ ماروں تاکہ وہ اتنے زور سے چیختی ہوئی بھاگے کہ دور تک گلی کا سناٹا درہم برہم ہو جائے ۔۔۔ میری بہنیں مجھے دیوانہ سمجھ کر چیخیں مارنے لگیں اور میری اماں، اپنی جیتا صفت بیٹی کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر اپنا سینہ کوٹ لیں۔

مگر میں نے سوچا کہ یہ تو ایک بالکل فضول سی حرکت ہوگی کیونکہ اس کے بعد پھر یہی گھر ہوگا اور یہی سب کچھ ۔۔۔ بس ایک ذرا سا ہنگامہ، آزادی کا اتفاق جیسے الیکشن کے کرتب، جیسے نٹوں کا کھیل، جیسے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"یمن اللہ —— " میرے اندر پھر کوئی پاؤں پٹک کر ٹھنکا میں نے بیزار ہو کر کروٹ بدلی اور میرے سر کے نیچے صبح کا اخبار کھڑکھڑایا —— میں نے اسے اٹھا کر پلنگ کے نیچے پھینک دیا۔ اخبار پڑھتے پڑھتے بھی تھک گئی "پاکستان —— اکھنڈ ہندوستان —— زندہ باد برطانوی ہندوستان" میری اُلجھن نے ایک نئی راہ سُجھائی۔ جی میں آیا کہ بے تحاشا برطانوی ہندوستان زندہ باد کے نعرے لگاؤں تاکہ میرے پڑوس میں بسے ہُوئے مختلف سیاسی عقاید کے لوگ ایک دم چونک پڑیں اور مجھے بھر بھر گالیاں دینے لگیں۔ کتنی خوشی کی بات ہو گی ایک بار تو سب کے دل پر ایک سی چوٹ لگے۔ ایک ہی درد اُٹھے ایک مشترکہ جذبہ پیدا ہو؟ —— اور میں اپنا نعرہ بلند اور بلند کرتی جاؤں۔ سڑکوں پر گلیوں میں شہروں شہروں —— یہاں تک کہ گاندھی جی کو اپنے اکھنڈ ہندوستان اور مسٹر جناح کو اپنے پاکستان کی ایک نمایاں اور ٹھوس شکل نظر آ جائے۔ برطانوی ہندوستان زندہ باد! مگر میری توبہ! میں کر ہی کیا سکتی ہوں سوائے بستر میں لیٹ کر رات گئے تک اُلجھنے کے، میری زندگی میں کوئی انقلاب نہیں ہو گا —— خارجی نہ داخلی۔ دن بھر لڑکیوں کو پڑھاؤ —— ہندوستانیوں کے متعصبانہ عزائم سہو۔ میری ہیڈ مسٹرس سیاست کی ابجد سے ناواقف ہونے کے باوجود خالص اکھنڈ ہندوستانی ہیں۔ مسلمان استانیوں کی خفیہ پاکستانی میٹنگوں میں شرکت کرو جن میں ہندوؤں کے کفر سے نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے اور وہ میٹنگیں جو پانی پلانے والی مہترانی تک کو دیکھ کر خندہ پیشانی سے منتشر کر دی جاتی ہیں —— گھر آؤ تو ایک ایک کی سنو، ایک ایک کو سناؤ۔ رات کو پڑے پڑے بھول بھلیوں میں بھٹکو —— مہینے کی پہلی کو مٹھی بھر تنخواہ، لون مرچ اور آٹا دال کے حسابات کی نذر کرتے ہُوئے گرم کوٹ کی تمنا اگلے مہینے پر ملتوی کرتے جاؤ —— لعنت ہے۔

گیارہ بارہ بجے چچا جان آ بیٹھے اپنے پلنگ پر اینڈ اینڈ کر ہماری سرپرستی کرنے کو تو اس لئے اُٹھ کر دروازہ کھولو۔ چچا جان بقول خود خدا سے ڈرتے ہیں اس لئے ہماری سرپرستی کے لئے حاضر ہوتے ہیں —— اور حکومت برطانیہ کو مہذب ملکوں کے طعنوں کا ڈر ہے اس لئے نیم وحشی ہندوستان کو نہیں چھوڑ سکتی کہ کہیں یہ ملک پتھر کے زمانے کی طرف نہ لوٹ جائے۔ کانگریس اور مسلم لیگ الیکشن کے دانے پھر چمچیں لڑانے ہُوئے ہیں۔ میں اور میری بہنیں خواہ مخواہ ایک پھندے سے چھٹکارے کے لئے سوچ سوچ کر مری جا رہی ہیں —— وہ پھندا سا چھوکرا جسے محبت ہی کرنا نہیں آتی اور جس کی منگنی میرے رشتے کے خان بہادر ماموں کی ادھیڑ عمر صاحبزادی سے ہو چکی ہے —— میں نے دل شکستہ ہو کر صوبہ بنگال کے ایک مائی اسکول میں ہیڈ معلمہ کی جگہ کے لئے عرضی دے دی ہے اور میری بہن نے بجائے خودکشی کرنے کے ایک مقامی اسکول میں معلم بننا گوارا کر لیا ہے حالانکہ وہ ملازمت کو عورت کی توہین تصور کرتی ہے۔ عجیب مذاق ہے یہ دنیا —— اللہ کرے ساری دنیا میں ایسی بارش ہو جس میں ایٹم بموں کی جھڑیاں لگ جائیں —— مگر جبھی نہ جانے امریکہ اور برطانیہ کے دو گدھوں نے ایٹم بم کے راز سے اللہ میاں کو واقف بھی ہونے دیا ہے؟

میرے سر کے اندر دھک دھک سی ہونے لگی۔ نہ جانے یہ دل اس قدر پاؤں چلا کیوں ہے؟ کبھی کہیں دھک دھک ہو رہی ہے کبھی کہیں —— میں نے اپنا سر اُٹھا کر تکیوں پر دے مارا۔

"پنہیاں بھرت بھرت میں ہاری، ہو موری بہنیاں پرانی" گلی سے جیسے ١
کوئی نشے میں لٹکتا ہوا گزرا مست اور بے پروا۔ اور مجھے بھی یوں لگا جیسے میری بانہیں بھی تھک گئی ہیں بیکار سینے پر پڑے پڑے —— پہلو میں بے قدری سے رکھے رکھے اور سر پر ہالہ بناتے بناتے —— چولہے میں جائیں یہ بیہودہ خیالات

ہاں تو پھر اے اللہ میاں میری عرضی بنگال میں منظور کرا دو۔ بس وہاں پہنچ کر اپنی موجودہ الجھن کا ردِ عمل خوب دل لگا کر کیا کروں گی۔ مچھلی اور چاول کو ملا کر معتدل بنائی ہوئی غذا کا استعمال کیا کروں گی اور فرصت کے اوقات میں صرف روحانیات پر کتابیں پڑھا کروں گی۔ اللہ کرے میری عرضی منظور ہو جائے۔

کھٹ کھٹ کھٹ —— دروازے کی زنجیر کھڑکھڑائی جانے لگی —— کنجی ہوئے ہوئے کھڑکانا، ہو راجہ دھیرے دھیرے آنا۔ میرے دل میں میرا مردود پھر تلملایا۔ مگر دروازہ تو چچا جان کھٹکھٹا رہے ہیں۔ اللہ کرے کسی دن ہمارے ہاں ڈاکہ پڑے اور لمبے تڑنگے ڈاکو اس گھر کی سب عورتوں کو زبردستی اُٹھا کر لے جائیں۔

کھٹ کھٹ ——

نوجوانی کی نیند آ گئی نیفہ کو۔ اور کوئی بھی نہیں اُٹھتا۔ نہ اُٹھے۔ میں بھی نہیں اُٹھنے کی۔ چاہے سردی سے اکڑ کر دم نکل جائے ان کا میری جوتی کی نوک سے —— اور گھومیں آدھی آدھی رات تک۔

کھٹ کھٹ ——

شرم نہیں آتی کنواری بھتیجیوں کا آدھا درجن رکھے ہوئے ہیں کہاں بٹھائی تھیں؟

فیضو کو شاید رحم آ گیا۔

"جاگ رہی ہو نا بہو — ہاں ابھی رات بھی کتنی گئی ہے۔" چچا جان نے میرے پلنگ کے قریب آ کر کہا۔

"ہوں! —" میں نے جواب دیا۔

"لو یہ مٹھائی۔" انہوں نے رومال کی پوٹلی میرے لحاف پر پھینک دی اور سب لحافوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ "بچیوں میں بانٹ دو۔" وہ اوورکوٹ اتارنے لگے۔

بستروں سے سر بلند ہوئے جیسے واقعی سب بچیاں ہی تو ہوں۔

"ادھر لاؤ کیا ہے حضرت آپا جانی! —" تقاضہ ہوا تو مجھے غصہ آ گیا اس چھچھورے پن پر۔ میں نے پوٹلی اماں کے لحاف پر اچھال دی۔

"کیا بخارات دماغ کو چڑھ گئے آپا جانی؟" ساجدہ نے ایک بے تکا سا قہقہہ لگایا۔

"نہیں تو کوئی بات نہیں —" میں نے اپنی تلخی کو دبا کر کہا۔ میں کبھی کبھی ان سب سے ڈرنے لگتی ہوں۔ — مٹھائی کے حصے بخرے ہونے لگے اور میں نے لحاف منہ پر ڈال لیا۔ میری الجھن اس چاؤں بھاؤں میں اور بھی بڑھ گئی — اور میں نے طے کر لیا کہ بنگال ضرور جاؤں گی۔ بنگال کا جادو مجھ پر نہیں چل سکے گا۔ سنا ہے بنگال کے مرد تو اتنے بزدل ہوتے ہیں کہ اپنے ہاں کی مشہور اور مقبول پیداوار "بنگال کے جادو" پر بھی بڑی آسانی سے غیر بنگالیوں کا قبضہ گوارا کر لیتے ہیں۔ "ہونہہ! میری چوٹی تو بہت چھوٹی ہے۔ مجھے کیا ڈر ہے؟ بس اطمینان سے مچھلی بھات کھاؤں گی — اور — بنگال کا غذائی قحط تو ختم بھی ہو چکا۔

"ایک بچی لو گی — تم میں سے کوئی؟" چچا جان نے پوچھا۔ میں ایک دم بستر سے اچھل پڑی اور میری طرح میری سب بہنیں بھی۔ مگر اماں کو جیسے مٹھائی کھاتے کھاتے اونگھ سی آ گئی۔

"دھو بیگی دھنی" گوری سی گھونسن مجھ سے ہر روز پوچھ جاتی ہے۔

جی! — جی! ہم سب نے کورس میں کہا۔

"کسی کال کے مارے بنگالی کی اولاد؟" اماں نے پوری طرح برا مانتے ہوئے سوال کیا۔

"ارے نہیں بھابی! ان کنگلوں کی اولاد لے کر کیا کرنا ہے —" چچا جان کی عزت پر جیسے حرف آ گیا۔

"واہ آپ قحط کی وجہ سے ہی بنگالیوں کو یہ سمجھتی ہیں [illegible] لایا ہوا ہے۔" زہرا بالکل پنڈت نہرو کے انداز میں گرجی۔

"مگر جناب کال کے مارے لوگوں کی بے بسی سے فائدہ اٹھا کر ان کے لال چھین لینا بھی تو انسانیت کی توہین ہے۔" ناظمہ جھلا کر بولی جیسی سنجیدگی کے ساتھ ہائی اسکول کی طالبہ ہونے کا فرض ہے۔ بھن بھنائی۔

"اور بھوک کے ماں باپ کی گود میں ایک بوند دودھ کے لئے دم توڑتے ہوئے بچے دیکھتے رہنا ہی انسانیت ہے۔" ساجدہ بے تکے پن سے ہنس کر چلائی۔ بیچاری کو اپنے پھیلے ہوئے دہانے کی ہنسی بہت عزیز ہے۔

سب کے سب زور سے ہنس پڑیں جیسے لطیفہ ہی تو ہو گیا ہو۔

"لاحول ولا —" چچا جان کی جھنجھلائی ہوئی آواز نے سب کو خاموش کر دیا۔ "تم لوگ تو ہر موقعے پر اپنا اپنا تصنیف کردہ فلسفہ جھاڑنے لگتی ہو۔"

ساجدہ ہنسنے لگی۔ ناظمہ نے گھٹنے ٹکا کر جھومنا مناسب سمجھا اور فاطمہ کو اپنے بکھرے ہوئے بالوں میں گرہ دینا یاد آ گیا۔ باقیوں نے محض مسکرانے پر اکتفا کی — اور میں سوچنے لگی کہ "ایک بچہ — ایک بچہ مل جائے تو —" میری نسائیت کی گود میں مامتا ہمکنے لگی۔ "ارے! میں جھینپ سی گئی — "دھت — خان بہادر کا داماد بن کر سست ہے چند کہیں کا۔ میں تجھ سے کہیں بلند ہوں، میں غیر کی اولاد کو بھی اپنا سکتی ہوں —" کھسیانی بلی کھمبے پر جھپٹی۔

باہر بارش کی ہلکی ہلکی پھوار ننھی ننھی بوندیوں میں تبدیل ہو گئی اور سائبان پر جیسے کوئی گیت گنگنانے لگا۔

"وہ بچی شریف کی اولاد ہے سمجھیں تم لوگ!" چچا جان نے زور دار سفارش کی۔

"تمہاری ہی شرافت کا تو نتیجہ نہیں ہے میاں!" اماں نے ہنس کر چھیڑا! اور بھتیجیاں کھلکھلا اٹھیں۔ میرے دل میں جیسے سمندر کے کھاری پانی کی ایک لہر سر اٹھا کر لپکی کہ کہیں سچ مچ وہ چچا جان کی عیاشت کا پھل تو نہیں؟

"خدا کی قسم آپ تو مذاق کرتی ہیں بھابی جان!" وہ اپنا سنہرا بالوں سے ڈھکا ہوا سر جھکا کر شرمائے۔ ساجدہ بھی اس قدر بے تکے لگے۔ "کس کی بچی ہے؟" ناظمہ نے پوچھا۔

"کس کی بچی ہے وہ — کہاں ملی چچا جان! —"

"ایک مفلس آدمی کی۔ اس کی بیوی کا انتقال حال ہی میں ہوا ہے۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا چھوڑا ہے اس نے — وہ دو بچوں کو بیچنے کی ہے

نہیں [illegible] بیٹا بنے کا لازم ہے مگر ماں بچی کو سنبھالتا پھرے۔
بڑی [illegible] کی [illegible] تین برس کا ——"

"[illegible] ——" اماں کی حسرت زبان پا گئی۔ صرف آدمی درجن لڑکیاں [illegible] ایک بھی نہیں۔

"[illegible] —— اس کی نسل چلے گی اس سے۔" انہوں نے کارروباری انداز میں [illegible] سا جواب دے دیا۔ اور میں سوچنے لگی کہ پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان کے جھگڑوں میں پڑنے کی بجائے ہمارے لیڈر اس سے کا حل کیوں نہیں کرتے کہ نسل لڑکی چلاتی ہے یا لڑکا؟ کیونکہ پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان کا بنیادی تعلق براہ راست اسی مسئلے سے ہے۔

"تو پھر لڑکی لے کر کیا کرنی ہے اور پھر دودھ پیتی بچی ——؟" اماں کی دلچسپی ختم سی ہو گئی۔

"بڑی لڑکی بھی دے گی اس کے ساتھ؟" ناظمہ نے بقول خود "غور یا تدبر کرتے ہوئے" ہوئے سوال کیا۔

"نہیں پلی پلائی بچی نہیں دے گا وہ، چار دن بعد اسے گھر میں پیٹ بھر کھانے کی اُمید نہیں۔" انہوں نے جواب دیا۔

"تو پھر کیا فائدہ، جب تک بچی کے ساتھ بڑی لڑکی نہ ملے، جو کم از کم بچی کا گو موت تو کر ہی لے گی۔ چند دن بعد دیکھ نہیں تو گود میں ٹانگے ٹانگے پھرے گی اسے۔ چھوڑ اسے کہ کون برسوں کی مصیبت مول لے۔" ناظمہ نے لیٹ کر رضائی گردن تک اوڑھ لی۔

"میں لوں گی۔" ناظمہ کے مقابلے میں اپنی آواز مجھے کتنی بھلی لگی اور ناظمہ نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اُسے یقین نہ آ رہا ہو۔ کہ یہی زاہدہ ذرا سی بچی پالنے کو تیار ہے۔ جس نے کبھی اپنی چھوٹی بہنوں کو گود میں اُٹھانے کی زحمت نہ کی تھی۔

"میں بھی سن سکتی ہوں۔ کیا قیمت ہو گی؟" ناظمہ پھر ضد سوار ہوئی۔

"تھو ہے، انسان کی قیمت ادا کریں گی امیر زادی!" میں نے جل کر کہا۔

"چُپ رہو ناظمہ! آپا جان کے نزدیک انسان کی کوئی قیمت نہیں ——" ساجدہ نے اپنے مخصوص بے تکے پن میں ہنستے ہوئے کہا۔ اور میرے جی میں آئی کہ اُٹھ کر دو دو تھپڑ لگاؤں ان لڑکیوں کے —— چھوٹی ہو کر ——! میری ساری آزاد خیالی اور ترقی پسندی بے جان سی ہونے لگی۔

"اس بچی کو پال لو، بس یہی قیمت مقرر کی ہے اس کے باپ نے ——" چچا جان نے دو قول کا حق ادا کیا۔

"اے اللہ ہمارا ملک! اللہ کرے یہاں بھی اشتراکی نظام قائم ہو جائے جلدی سے ——" فاطمہ کی آواز بھرا گئی: "بیچارے بچے اور ان کے والدین ——" اسے اشتراکیت پر عبور رکھنے کا دعویٰ ہر وقت اُکسایا کرتا تھا۔

"اور تمہارا سر ——" زہرا کی قنوطیت گویا ہوئی۔ "ہندوستان میں کچھ بھی نہیں ہو گا۔ بس بڑی بڑی تنخواہ اور اپنے اندر ایک کمیونسٹ کو سہاگ کے جاؤ۔"

"آپ کل صبح بچی کو مجھے دکھا دیجئے۔ میں اس کی پرورش کروں گی۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں اعلان کیا —— میں نے سوچ لیا تھا کہ بنگال جا رہی ہوں پینتیس کے لگ بھگ ہوں شادی کرنا نہیں یا یوں کہو کہ شادی کرے گا ہی کون لیس جو بیا سے۔ یہ بچی مل جائے تو مستقل کنوارے رہنے کی شاندار دلیل پیش کر دیا کروں گی —— اور پھر میرے لئے بھی زندہ رہنے کا کوئی مقصد ہو جائے گا ——

باہر بارش تیز ہوتی جا رہی تھی۔

"کیا کرو گی بچی لے کر، تمہارے لئے اتنی بہت سی بہنیں کیا کم ہیں پالنے کے لئے۔" اماں نے میری دوڑتی ہوئی گاڑی کے آگے ایک پتھر لڑھکا دیا۔

"جی!" مجھے رونا سا آ گیا۔ "میری بہنیں —— میں انہیں پالتی رہوں، چاہے یہ سب مجھے جوتی کی نوک پر بھی نہ رکھیں۔ میں کسی سے کوئی گلہ نہیں کرتی۔ مگر یہ ضرور چاہتی ہوں کہ کوئی میرا بھی ہو —— میرا اپنا۔ مجھے اس پر بالکل اختیار ہو۔ میں چاہتی ہوں —— میں چاہتی ہوں۔" میری آواز بھرانے لگی۔ آنکھیں جل اُٹھیں اور کنپٹیاں دل کی طرح دھڑکنے لگیں۔

"ملکیت کا جنون انسانیت کو تباہی کے غار میں دھکیل کر رہے گا۔" فاطمہ جوش کے ساتھ بولی۔ "آپ بچی کو اس لئے پالیں گی کہ اس پر آپ کو پورا اختیار ہو —— مارکس کہتا ہے ——"

"چُپ رہو مارکس کی نانی ——" زہرا بڑبڑائی۔ "آپا جان ہمیں پڑھا دیتی ہیں اسی لئے اب ہمیں ذلیل سمجھنے لگی ہیں۔ ہماری بدنصیبی اس سے پہلے کہ ہم کسی لائق ہوتے ابا مر گئے۔ خیر اطمینان رکھئے ہم اپنا بوجھ نہیں رہنے دیں گے آپ پر ——"

"اپنی چونچ بند کیجئے مستقبل کی داستان جو۔" ناظمہ اُبھری زہرا پر۔

"بھئی اللہ! میرا جی چاہا اپنا سر پھوڑ لوں ——" میری حالت کا کسی کو

"قدانہ نہیں مجھ سے کسی کو ہمدردی نہیں ہے، میں کسی سے بھی اپنا دکھ درد نہیں کہہ سکتی اور اگر کہوں تو سب مجھے نکو بنا لیتے ہیں — یہ ہے میری وقعت —"

میں بھری محفل سے رونا چاہتی تھی۔

"ہائے ہائے ——" ناظمہ نے کروٹ بدل لی۔ میرا جی چاہا اسی وقت خودکشی کرلوں۔

"تو پھر وہ بچی!" ناظمہ نے اصل موضوع کو پکڑا۔ "آپ کل ضرور اسے دیکھ لیجئے آپا جان۔"

"ہاں کل اسے لے آؤں گا۔ بڑا ثواب ہوگا اسے پال کر، دستوں کی بیماری میں مبتلا ہے، علاج ہو گیا تو ٹھیک ہو جائے گی —" چچا جان بولے۔

"عذاب ہو جائے گی لڑکی — جو بھی لے اپنی ذمہ داری پر لے۔ مجھ سے سب بچوں کی چیں پیں برداشت نہ ہوگی۔ صاف بات ہے۔" اماں نے پھر ایک پہاڑ لڑھکانے کی کوشش کی۔ "میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم میں سے کوئی اسے نہیں پال سکے گا، بڑے دل گردے کا کام ہے بچے پالنا۔ ابھی تم لوگوں کو شعور ہی کہاں ہے۔"

"اماں جان! آپ کے ہاں آپا جان کوئی چودہ سال کی عمر میں پیدا ہوئی تھیں نا؟" ناظمہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ زہر چھڑکتی۔ اماں تپ کر چپ ہو گئیں۔

"اگر وہ خوبصورت ہو تو آپ ضرور لے لیجئے۔" ساجدہ ہنستے ہوئے بولی — "گھر بھلا لگے گا بچے سے۔"

"اس کے باپ سے پکے اسٹامپ پر لکھوا لیجئے گا۔ کہ اس نے ہمیشہ کے لئے دے دی۔ اب اس کا کوئی اختیار نہیں رہا —" ناظمہ بولی۔

"اچھا اچھا آتو جانے دو۔ لڑکی ذات ہے چار دن میں بڑھ کر اس لائق ہو جائیگی کہ گھر کے کام کاج کر دیا کرے گی۔ آپا جان کے پاؤں دبا دیا کریگی۔" — زہرا بولی۔

"ہاں بڑھاپے میں کچھ تو سہارا ہوگا اُن کا۔" ناظمہ نے کہا۔

"لعنت ہے سب پر۔ ایک معصوم بچی کے لئے غلامی کا جال بُن رہی ہیں۔ اس سے تو مر جائے وہ —" فاطمہ چلائی۔

"اپنی اپنی رائیں محفوظ رکھئے آپ لوگ —" مجھے ایک دم تاؤ آگیا "تمیز بھی ہے بات کرنے کی — چچا جان! صبح بچی کو ضرور لے آئیے۔" میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"ابھی بات ہے۔ اب سو جاؤ سب۔ [illegible] آپا جان نے لحاف سے منہ ڈھک لیا اور کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ [illegible] کا خمار بڑھ رہا تھا۔

"میاؤں — میاؤں —" پالتو بلی میرے پلنگ کے نیچے گھوم گھوم کر گویا اظہار خیال کرنے لگی۔ میں نے اپنا جسم تکیوں پر گرا دیا — ٹھنڈک کی ایک لہر سی میرے جسم میں دوڑ گئی۔

ایک ننھی سی بچی ہنستی کھیلتی، ہاتھ پاؤں مارتی میرے احساسات پر چھانے جا رہی تھی — زندگی کی تمام محرومیاں اور ناکامیاں جو کانٹوں کی طرح کھٹک رہی تھیں ذہن میں یوں دب گئیں جیسے تھیں ہی نہیں۔

میری ہستی یکدم بجنے لگی۔

میں اسے لے کر بنگال چلی جاؤں گی — ایک آیا رکھ لوں گی تاکہ وہ دن بھر اُسے اٹھائے اسکول میں میرے سامنے رہے۔ اسکول سے واپس آ کر بس بچی ہی کے کاموں میں لگ جایا کروں گی۔ اسے اچھی طرح نہلا دھلا کر خوبصورت سلے ہوئے کپڑے پہناؤں گی، کنگھی کروں گی۔ اور پھر صفائی سے دودھ بنا کر اپنے ہاتھوں سے پلاؤں گی۔ میں خود بنگالی عورتوں کی طرح ایک ہلکی سی دھوتی میں اپنا پورا جسم لپیٹ کر، بال کھول کر، ٹھنڈی ٹھنڈی زمین پر بیٹھ کر اسے جھولا جھلایا کروں گی — رات کو اپنے پہلو میں لٹا کر لوری دیا کروں گی۔ "آ جا ری نندیا تو آ جا ذرا بٹیا کو میری سُلا جا ذرا۔" وہ میرے سینے سے لگی آنکھیں جھپکا جھپکا کر مسکراتی ہوئی سو جائے گی — زلفِ بنگال کی سی سیاہ راتوں میں جب میں کوئی خواب دیکھ کر چونکوں گی تو میں تنہا نہیں ہونگی بلکہ وہ میرے سینے سے لگی ننھی ننھی سانسیں لے رہی ہوگی — آہ میرے اللہ!

اور پھر میری ننھی تھوڑے دنوں بعد بولنے لگے گی۔ میری باتیں سمجھنے لگے گی — میں ہنسوں گی تو وہ قہقہے لگائے گی۔ میں روؤں گی تو وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے میرے آنسو پونچھے گی۔ جب کبھی کچھ سوچ کر میں سو جایا کروں گی، تو وہ میرے چہرے کو اپنے نرم نرم ہاتھوں میں دبا کر اپنی فکر مند آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال کر، وجہ پوچھا کریگی — پھر میں اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا کروں گی — میری ننھی! میری بچی! — کتاب اٹھا لاؤ میں تمہیں پڑھاؤں گی، اور میری ننھی نہایت ذہانت سے فر فر اپنا سبق پڑھ ڈالا کرے گی — اللہ! میری ننھی مجھے مل جائے —"

[illegible] دھڑکنے لگا۔ "سنو بی تم لوگ!" میں نے [illegible] کے منہ پہ شان سکھانا چاہا۔ "میں بچی صرف اس لئے رہی ہوں کہ اسے اپنی بچی سمجھوں، سمجھیں تم لوگ، خواہ وہ کالی کلوٹی ہو — خواہ اس [illegible] بادرچی خانے میں بکھرے ہوئے جھوٹے برتنوں کی طرح ہو — میں ماں بن کر اسے پالوں گی — میں اسے اپنے ساتھ بنگال لے جاؤں گی — میری زندگی اس کے لئے وقف ہے۔" میرے مکان کے کنگرے آسمان کو چھونے لگے: ہوں — ہوں! میری چھوٹی بہنیں اس طرح ہوں ہوں کرنے لگیں جیسے میں بکواس ہی تو کر رہی تھی۔

"تم لوگ کیا سمجھتی ہو؟ کیا میں اتنی قربانی نہیں کر سکتی اس بچی کے لئے"

مجھے غصہ آگیا۔

"ہیرا — ہیرا!" ساجدہ نے تالیاں بجائیں۔

"بدتمیز کہیں کی — کمینی! —" میری زبان مارے تاؤ کے اینٹھ کر رہ گئی۔

"ناہید!" اماں نے پکارا

"کہئے!" میں نے شمشیر بکف انداز میں جواب دیا۔

"بچی سے محبت کرو گی، اس کے لئے زندگی وقف کر دو گی تو دنیا کیا کہے گی؟"

— اماں نے بزرگانہ لہجے میں پوچھا۔

"کیا کہے گی دنیا — میں پروا نہیں کرتی۔"

"یہی کہ تمہاری حرامی بچی ہے۔ پڑھی لکھی لڑکیوں کا نام پہلے ہی بدنام ہے۔"

اڑاڑا دہم — میرا مکان ڈھینے لگا۔

ریل چھوٹ گئی۔ میں خالی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور کانوں میں انجن سنسنا رہا تھا۔

میں چپ ہو گئی۔ میں اسے اپنی بچی سمجھوں گی اور کہوں گی — لیکن کوئی اور کہے گا تو — کوئی اور یہی سمجھے گا تو — میں تو ڈوب کر مر جاؤں گی۔ میرے کنوارے پنے پر تو خواہ مخواہ کلنک لگ جائے گا۔ "ممکن ہے بنگال میں کوئی میرا چاہنے والا منتظر ہو، ممکن ہے — مگر یہ حرامی بچی کا ٹیکا دیکھ کر کس میں ہمت ہے کہ مجھ سے شادی کرے؟" شادی کی دبائی ہوئی خواہش نے بھرپور وار کیا۔

"ہمئی اللہ — ہمئی اللہ —" میں پھر اُلجھنے لگی۔

باہر پھوار گر رہی تھی —

عزیز احمد

مدن سینا اور صدیاں

تب وی تال نے کہا:۔

—————— "مہاراج! اگلے زمانے میں ایک راجہ تھا جس کا نام ویرا بانہو تھا۔ اننگ پورہ اُس کی راجدھانی تھی۔ اور دور دور کے راجے اُس کو راج دیتے تھے۔ سات سمندر پار کے سوداگر چھوٹے چھوٹے جہازوں میں بیٹھ کر بھارت دیش میں آتے، اور اُس کی راجدھانی سے موتی، مہنگے ہیرے، اور نہ جانے کیا کیا خرید لے جاتے۔ بیوپار کی برکت سے اننگ پورہ کے ویش بہت امیر ہونے لگے۔ اور اننگ پورہ کے ویش سوداگروں کے مکان روپ اور صفائی میں دوسرے ملکوں کے راجوں کی ڈیوڑھیوں کا مقابلہ کرنے لگے۔ انہیں ویش امیر سوداگروں میں سے ایک کا نام ارتھادت تھا۔ اُس کے ایک بیٹا تھا انمول ہیرے جیسا، جس کا نام دھن دت تھا۔ ایک بیٹی تھی جو دوسری تمام لڑکیوں میں یوں دمکتی جیسے کوئلے میں سچا موتی۔ اِس کا نام مدن سینا تھا۔

ارتھادت اپنے بیٹے دھن دت کو ساتھ لے کر سمندر کنارے کے کسی شہر کو چلا جاتا تھا جہاں افریقہ اور سدم دیس کے سوداگر مال خریدنے آتے تھے۔ اُس کی بیٹی مدن سینا اپنی سکھیوں، سہیلیوں کے ساتھ باغ میں کھیلا کرتی۔

ساون کا مہینہ آیا۔ مدن سینا اور اُس کی سکھیاں جھولتی اور گاتی جاتی تھیں۔ آکاش بادل کی رضائی اوڑھے ہلکی ہلکی پھوار برسا رہا تھا۔ مدن سینا اور اُس کی سکھیاں تتلیوں کی طرح چہچہا رہی تھیں۔ اتنے میں ہوا کا ایک جھونکا آیا اور بڑی بڑی بوندیں درختوں سے گرنے لگیں۔ کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی اور دھرم دت کو پاس کھڑا دیکھ کر مدن سینا کی ایک سکھی بول اُٹھی: "تیرا دوست یہاں نہیں۔ وہ تو اپنے پتا جی کے ساتھ سمندر کنارے کے شہر کو گیا ہے۔"

مدن سینا نے دیکھا کہ دھرم دت اُسے برابر گھور رہا ہے۔ شرم سے اُس نے گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ دھرم دت اُسی طرح گم سم کھڑا رہا جیسے وہ اندھا، گونگا یا بہرا ہے۔ بیچارا کیا کرتا۔ اتنی دیر میں پریم کے تیروں نے اُس کی سمجھ بوجھ کو چھلنی کر دیا تھا۔ وہ سوداگر بچہ بھلا کیا جانتا تھا کہ اُس کے دوست دھن دت کی بہن مدن سینا جوان ہو کر ایسی سندر نکلے گی۔ وہ ایک پاگل کی طرح مدن سینا کو گھور ہی رہا تھا کہ مدن سینا اور اس کی سکھیاں چڑیوں کی طرح آپس میں چہچہائیں، کھلکھلائیں، اور تتلیوں کی طرح پھُر سے اُڑ کر مدن سینا سمیت مکان میں کہیں غائب ہو گئیں۔

جب دھرم دت کی آنکھوں نے مدن سینا کو اوجھل پایا تو اُس کے دل کو بڑا دھچکا لگا۔ گم سم وہ اپنے گھر واپس پہنچا۔ اور صبح تک چاندنی کی کرنوں کے زخم سہتا۔ چاندنی کے بھالے کھاتا۔۔۔ بچھونے پر کروٹیں بدلتا رہا۔

تڑکے تڑکے اُٹھ کے وہ سیدھا ارتھادت کے باغ کی طرف چلا۔ اب بھی آسمان سے ہلکی ہلکی پھوار برس رہی تھی اور پتیوں کے کٹوروں میں پانی اور اوس میں امتیاز مشکل تھا۔ ابھی اننگ پورے سے رات کے اندھیارے کا بادل اُٹھنے نہیں پایا تھا۔ باغ میں مدن سینا اکیلی تھی۔ بالوں کے لئے پھول چُننے آئی ہو گی۔ اُس کی سہیلیاں معلوم نہیں اپنے اپنے گھروں میں تھیں یا ابھی مدن سینا ہی کے یہاں پڑی سو رہی تھیں۔ شاید اوس اور صبح کاذب کے پانی کی بوندوں اور ہوا کی بھینی بھینی خوشبو اور پتوں میں گرگٹوں کی سرسراہٹ سے اِنہیں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اُن کے بڑے ابھی جاگنے نہیں پائے تھے یا شاید جاگ جاگ کے سو گئے تھے۔

اکیلی مدن سینا نے پھول توڑنے میں پیر پیروں کی چاپ سُنی اور اُس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اور پھر اس نے کسی کو چھلانگ بھرتے دیکھا اور کانٹوں کی باڑھ سرسرا کر رہ گئی۔

پھر مدن سینا نے دھرم دت کو اپنے پاس کھڑا پایا۔ اس طرح کہ گویا وہ اسے اپنے ہاتھوں میں جکڑے گا۔ اور خوف سے اُس کا جسم کپکپانے لگا۔ اس

اس افسانے کی لڑی میں مدن سینا کا قصہ کتھا سرت ساگر سے، اور ڈوری گن کا چاسر کے فرینکلن کے قصے سے ماخوذ ہے۔ اس سلسلے کے مرکزی خیال کے ارتقا اور نشو و نما کو ظاہر کرنے کے لئے اِن دونوں قصوں کی ضرورت تھی۔ باقی تمام حصے طبعزاد ہیں۔

کے ہاتھوں سے شبنم اور پانی سے دُھلے پھول گر گئے۔ اور بارش کی ہلکی ٹھنڈی پھوار میں بھی اُس کی مانگ کے نیچے پیشانی پر پسینے کے گرم گرم قطرے نمودار ہوئے اُس نے چیخنا چاہا مگر چیخ نہ سکی۔ اس ڈر کے مارے کہ اُس کی ماں سہیلیاں اسے اس نوجوان کے پاس اس وقت دیکھیں گی تو اُسے نردوش نہ سمجھیں گی۔ اور کیا اُس کی سکھیاں اُسے یہ کہہ کے بدنام نہ کریں گی کہ وہ خود بڑی رات گئے یا اتنے تڑکے دھرم دت سے ملنے آئی ہوگی۔

اتنے میں دھرم دت کے ہاتھ جو اُسے بھینچنے کے لئے اُٹھ رہے تھے، نیچے گر پڑے۔ دھرم دت اُس کے چرنوں میں گر پڑا۔ "مدن سینا تو میری نہ ہوئی تو میں مر جاؤں گا۔"

مدن سینا نے اُس سے کہا۔ "دھرم دت یہ آج تجھے کیا ہو گیا۔ تجھے معلوم ہے میں کنواری ہوں اور میرے پتا نے میری منگنی ایک دوسرے دیش سوداگر سمدر دت سے کی ہے۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں اُس سے میرا بیاہ ہونے والا ہے۔"

دھرم دت زمین سے اُٹھ کھڑا ہوا اور دانتوں سے اپنا ہونٹ کاٹ کے اُس نے کہا۔ "جو ہونا ہے ہو جائے۔ تیرے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔" اُس کے ہاتھ پھر اُٹھے۔ مدن سینا کو بھینچنے کے لئے۔ اور وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔ کہیں یہ زبردستی نہ کرے۔ بدنامی کے ڈر سے وہ چلا بھی نہیں سکتی تھی۔ اُس نے جلدی سے پیچھے ہٹ کر کہا۔

"سُن تو۔ پہلے میرا بیاہ تو ہو جانے دے۔ میرے پتا کی تمنا تو پوری ہو جائے کہ وہ مجھ کنواری کو دُلہن بنتی دیکھیں۔ پھر میں تیرے پاس ضرور آؤں گی کیونکہ تیرے پریم نے میرے دل کو موہ لیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ دونوں ہاتھوں سے اُسے روکتی ہوئی اور پیچھے ہٹی۔

راستہ روک کے دھرم دت نے کہا۔ "میں ایسی عورت سے پریم نہیں کر سکتا جو پہلے کسی اور مرد سے ہم آغوش ہو چکی ہو۔"

اور مدن سینا نے ڈر کر کہا۔ "اچھا تو میں بیاہ ہوتے ہی فوراً تمہارے پاس آؤں گی اور اس کے بعد اپنے پتی کے پاس جاؤں گی۔"

اس پر بھی دھرم دت نے اُس کا ہاتھ پکڑ ہی لیا اور اُس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک مدن سینا نے بھگوان کی قسم کھا کے اپنے وعدے کی توثیق نہیں کی۔ تب اُس نے اُس کا ہاتھ چھوڑا اور چھلانگ مار کے کانٹوں کی باڑ کود گیا۔

پانی کی پھوار رُک گئی تھی۔ مدن سینا کا دل جو دھک دھک کر رہا تھا اب بیٹھنے لگا۔ وہ بہت اُداس اُداس گھر کے اندر گئی۔

جب بیاہ کا دن آیا اور سب رسمیں پوری ہو چکیں تو مدن سینا اپنے پتی سمدر دت کے گھر گئی۔ خوشیوں میں دن گذرا اور جب اکیلے میں اُس کے پتی نے اُسے اپنے آغوش میں جکڑنا چاہا تو وہ تڑپ کے نکل گئی اور دھیرے دھیرے روتے اور آنسو پونچھتے ہوئے سر جھکا کر اُس نے کہا ــــ "میرے پتی، میرے بالم، میرے ناتھ، میں تجھے اپنی جان سے زیادہ چاہتی ہوں۔ لیکن پہلے جو کہتا ہے سُن اُٹھ اور وعدہ کر کہ تو مجھے سزا نہیں دے گا۔ تاکہ میں جو کہنا چاہتی ہوں، تجھ سے کہہ سکوں۔"

جب سمدر دت قسم کھا چکا تو مدن سینا نے چند روز پہلے جب اُس کے والد اور بھائی سفر پر تھے۔ دھرم دت کے باڑھ پھاند کے آنے اور بارش کی ہلکی پھوار اور شبنم اور آنسوؤں کی کہانی اُسے سنائی۔ اور آخر میں اُس سے کہا۔ "میرے ساجن اب تو بتا، اب میں کیا کروں، میں تو اُس پاپی سے بچن ہار چکی۔"

سمدر دت قسم تو کھا ہی چکا تھا۔ نہ وہ اُسے سزا دے سکتا تھا نہ اُسے روک سکتا تھا۔ اُس نے مدن سینا کو اجازت دے دی کہ اپنا قول پورا کرنے کو جہاں اُس کا جی چاہے جائے۔

وہ اُٹھی، اور اپنے پتی کے گھر سے باہر چلی گئی۔

اُس رات کو آسمان پر گہرے بادل چھائے تھے۔ مگر بجلی نہیں چمک رہی تھی کہ اندھیرے کی سڑک پر کوئی چور ڈاکو گھات لگائے بیٹھا ہو تو نظر آ جائے یا کوئی کالا یا چتکبرا سانپ کہیں کنڈلی مارے بیٹھا ہو تو پاؤں پڑنے سے پہلے ہی راہی کو خبر ہو جائے۔

مدن سینا اس اندھیرے کی وجہ سے اپنے جیون سے اور بھی بے پرواہ ہو کر دھرم دت کے گھر کی طرف جا رہی تھی کہ بڑ کے ایک موٹے تنے کے پیچھے سے لپک کے ایک ہٹے کٹے ڈاکو نے اُسے دبوچ لیا۔ نہ وہ اُسے چھوڑنا چاہتا تھا نہ اُس کے زیوروں کو۔ اُس کے آگے ہاتھ جوڑ کے دیش سوداگر کی لڑکی نے دھرم دت سے اپنے وعدے، شوہر کی اجازت اور سب واقعات بیان کئے اور آخر میں منت کر کے کہا۔ "ڈاکوؤں کے راجہ بس مجھے گھنٹہ بھر کے لئے چھوڑ دو۔ میں اپنا قول پورا کر لوں۔ اُس کے بعد میں یہیں واپس آؤں گی۔ جیسا سلوک

تمہارا ہی چاہیے کرنا اور تم کوئی چیز [illegible] اپنا بچن پورا کروں گی۔"

ڈاکو نے یہ سُن کر اُسے جانے کی اجازت دے دی۔ اور وہ سیدھی دھرم وت کے گھر پہنچی۔ جو اتنے دنوں سے اُس کے عشق اور اُس کی تمنا میں بے چین تھا لیکن اُسے اپنے گھر میں دیکھ کر اچنبھے سے اُسے سکتہ ہو گیا۔ پھر اُس نے پوچھا۔ "تم یہاں کیسے آنے پائیں؟"

مدن سینا نے اپنی اور اپنے بالم کی گفتگو اس کے سامنے دہرائی تو دھرم دت جو اُس کے سوا کسی اور کو بھی چاہ نہ سکتا تھا کہنے لگا۔ "تم نے تو اپنا بچن پورا کیا لیکن تم جو کسی دوسرے کی پتنی ہو میرے کس کام کی ہو جس طرح تم آئی ہو ویسی ہی چلی جاؤ کوئی تمہیں دیکھنے پائے" ایک آنکھ سے ہنستی اور دوسری سے روتی مدن سینا اُسی راستے واپس ہوئی۔ لیکن اُس نے ڈاکو سے بھی بچن ہارا تھا اور اُس بڑ کے سامنے اُس ڈاکو سے ملنا تھا۔ بڑ کے پاس پہنچتے پہنچتے اُس کا دل بیٹھنے لگا۔

بڑ کی آڑ سے ڈاکو کلہاڑی لئے پھر دھم سے سامنے آ کودا۔ اُسے مدن سینا کے آنے کی تو آشا نہیں تھی۔ مگر وہ دوسرے امیر راہگیروں کو لوٹنے کا انتظار کر ہی رہا تھا۔ مدن سینا کو اتنی جلدی واپس آتے دیکھ کر اُس نے کہا۔ "کیوں کیا ہوا؟"

اور مدن سینا نے یہ قصہ بیان کیا کہ دھرم دت نے ہاتھ لگائے بغیر ہی اُسے چھوڑ دیا۔ اس پر اس ڈاکو نے اُسے کہا، جو اب تک اپنی کلہاڑی سے درخت کی ٹہنی کی طرح ہزاروں کے سر توڑ چکا تھا۔ "تیری سچائی سے خوش ہو کے میں بھی تجھے چھوڑتا ہوں۔ جا اپنے سونے چاندی اور عزت کے زیوروں سمیت اپنے گھر جا۔"

سمدر دت جس کا دل پہاڑی ندی کی طرح سر پٹک رہا تھا۔ کواڑ پر ہلکی سی تھاپ کی آواز اور زیوروں کی چھنا چھن سُن کے اُٹھا۔ مدن سینا نے اُس کے چرنوں کو چھو کے جب سر اُٹھایا تو اُس کی آنکھوں میں جو آنسو چھلک رہے تھے۔ وہ رنج یا بیکسی کے نہیں خوشی اور پریم کے تھے۔ سمدر دت سے اُس نے رات کی کہانی سنائی۔ کس طرح سچ اور اپنے بچن کے پاس کی وجہ سے دھرم دت اور ڈاکو دونوں کے دلوں میں بھگوان نے ترس اور رحم ڈالا۔ کس طرح وہ پاک اور اچھوتی اپنے ساجن، اپنے ناتھ کے پاس واپس آئی۔ سمدر دت کو اپنے گھرانے کی آبرو بچنے سے زیادہ خوشی اس کی ہوئی کہ اُس نے ایسی سچی اور قول کی پکی استری پائی اور اُس کے بعد مرتے دم تک دونوں نے ہنسی خوشی دن گذارے۔

قصہ ختم کر کے ویتال نے مہاراج تری وی کرم سینا سے پوچھا۔ "بے سالی کی۔ اب مہاراج یہ بتائیں کہ ان تینوں میں سب سے زیادہ فراخدلی سے کس نے کام لیا۔۔۔ مدن سینا کے پتی نے یا دھرم دت نے یا ڈاکو نے؟"

تب مہاراج نے کچھ سوچ کے اُسے جواب دیا۔ "ویتال سنو تینوں میں سچ پوچھو تو دراصل فراخدل وہ ڈاکو ہی تھا۔ اُس کا پتی ہی اُسے کیسے جانے دیتا۔ جب کسی پتنی اور کسی مرد میں کسی قسم کا بندھن ہو تو کوئی شریف پتی اُسے کیسے روک سکتا ہے۔ دھرم دت اس لئے اُس سے دست بردار ہو گیا کہ وقت گذر جانے کی وجہ سے اُس کا عشق سرد ہو چکا تھا اور شاید وہ ڈرتا تھا کہ مدن سینا کا پتی دوسرے دن راجہ سے اُس کی شکایت نہ کر دے۔ لیکن ڈاکو، وہ بے اصول، بدمعاش، اندھیارے کا باسی، وہ سچ کا فیاض اور فراخدل تھا کہ اُس نے ایسی خوبصورت عورت کو جواہرات سمیت چلے جانے دیا۔"

معلوم نہیں ویتال اب کہاں ہے۔ اور کس حال میں ہے۔ کشمیر کے کسی پہاڑ پر جہاں ناتگر سے اس کی ملاقات ہوئی تھی، کوئی اور کیسی لکھ رہا ہے یا شہروں اور دیہاتوں میں آوارہ پھر رہا ہے۔ ممکن ہے وہ کبھی شیواگرام بھی گیا ہو۔ اور اُس نے مدن سینا کے اصولوں کو اہنسا اور ستیہ گرہ کے لقب سے سیاست پر چسپاں ہوتے دیکھا ہو۔ یہ صدیوں کا تانا بانا۔ سچائی کا تقاضا تو یہی ہے کہ غنیم حملہ کرنا چاہتا ہے تو گھر کے دروازے کھول دو۔ بھارت ماتا کی عصمت اور عزت کو ہاتھ لگائے بغیر وہ الٹے قدم واپس ہو جائے گا۔ اس کا کیا علاج کہ فاشست شہنشاہیاں دھرم دت اور ڈاکو اتنی شریف بھی نہیں۔

اور معلوم نہیں ویتال بابو کو پتہ ہے یا نہیں کہ مدن سینا کی اولاد چار دانگ عالم میں پھیل چکی ہے۔ اُس کی اور سمدر دت کی اولاد کا اثر بیتا ئیں راجہ سکماری تھو دھما تسادی کے فیصلوں پر بھی ہوا۔ بہار دانش، طوطی نامہ، داستان چہل وزیر اور معلوم نہیں کہاں کہاں پھرتے ہوئے اُس کے پوتے پڑپوتوں نے سُنا ہے کہ گرین لینڈ جانے والے وائکنگ سیاحوں میں گھر کر اس نے چستان کی پہاڑیوں کی بھی سیر کی۔ اِسی خاندان کی ایک شاخ نے صابریا کے برفستانوں میں قیام کیا جہاں سے انہیں گذشتہ جنگ عظیم کے بعد نکال دیا گیا۔

(۲)

لیکن مہاراج تری وی کرم سینا نے اپنے قولِ فیصل میں یہ کیوں کہا تھا جب کسی پتنی اور کسی اور مرد میں کسی قسم کا بندھن ہو تو کوئی شریف پتی اُسے کیسے

ہوسکتا ہے؟

کیا ابن حزم سے ہوتا ہوا یہ سلسلہ اندلس یا سپین تک پہنچا ہے۔ قرون وسطیٰ کے عیسائی آداب عشق میں اس کی تفسیر ملتی ہے۔ جب ملکہ اور خواتین ایک دربار عشق یا عدالت عشق ترتیب دیتی تھیں، جس میں عاشقوں کی بے وفائی اور معشوقوں کی جفا پر استغاثے ہوتے تھے۔ اور احکامات اور سزائیں دی جاتی تھیں۔

ایک خاتون الف کو مدن سینا کی طرح اپنے پتی ہی سے محبت تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس جاہلیت کے زمانے میں خاوند خداوند نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ کاؤنٹ اپنی زندگی اور اپنی خدمت کو مذہب اور خواتین کی خدمت کے لئے یکساں وقف رکھتے تھے۔ بہرکیف اس خاتون الف پر دھرم دت کی طرح ایک مرد شریف کاؤنٹ بی عاشق تھا۔ عاشق اور معشوق کی بحث و حجت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو دونوں حریفوں نے میری ملکہ شامپین سے فیصلہ چاہا اور اُس نے کئی خواتین کے مشورے سے یہ فیصلہ صادر کیا۔

"ہم اعلان کرتے ہیں اور ہم اسے امر طے شدہ سمجھتے ہیں کہ عشق ایسے دو افراد کے درمیان اپنی طاقتوں کا اثر نہیں ڈال سکتا جو ایک دوسرے سے منکوح ہوں۔ کیونکہ عشاق ایک دوسرے کو ہر چیز آزادی سے دیتے ہیں کسی جبر یا مجبوری سے نہیں۔ لیکن شادی شدہ جوڑے میں فریقین مجبور ہیں کہ بطور فرض ایک دوسرے کی خواہشیں پوری کریں۔ اور ایک دوسرے سے امر میں انکار نہ کریں. . . . "

اس فیصلہ کی تاریخ یکم مئی ۱۱۷۴ء ہے۔

اس کے آٹھ یا نو سال بعد اس فیصلہ پر دو یہودیوں کارل مارکس اور اینگلز نے نظر ثانی کی۔ اُن کا فیصلہ یہ ہے:-

"ہمارے بورژوا اپنے مزدوروں کی بیویوں اور بیٹیوں ہی پر اکتفا نہیں کرتے رنڈیوں کا تو ذکر ہی کیا، انہیں ایک دوسرے کی بیویوں کو پھسلانے میں انتہائی لطف آتا ہے:"

(۴)

مجھ جیسے راوی پر کون اعتبار کرے گا ——— اور یوں بھی ہندوستانی مؤرخ دل کا کون سند کے قابل سمجھتا ہے ——— لیکن میرے خیال میں سمدر دت اور مدن سینا کی اولاد اس طرح ولایت پہنچی ہوگی کہ جب شام اور مصر کی فتح کے بعد خسرو پرویز

قسطنطنیہ پر ایک طرف سے حملہ آور تھا اور اُس کا حلیف وحشی اور قوم کا آقا (خاقان) یورپی جانب سے۔ اُس وقت خسرو پرویز کو صلح کے لئے جو تاوان جنگ بازنطینی قیصر نے پیش کیا۔ وہ ایک ہزار طلائی مہروں، ایک ہزار نقرئی مہروں، ایک ہزار ریشمی عباؤں، ایک ہزار گھوڑوں اور ایک ہزار کنواری لڑکیوں پر مشتمل تھا۔

ان ایک ہزار کنواریوں میں سیرا یا شیریں شامل نہیں تھی۔ مشرقی افسانہ نگاروں کے برخلاف مغربی مؤرخوں کو اس سے اتفاق نہیں کہ یہ سیرا یا شیریں بازنطینی قیصر موریس کی بیٹی تھی۔ لیکن وہ یہ ضرور مانتے ہیں کہ سیرا یا شیریں کسی مشہور اعلیٰ رومی گھرانے کی چشم و چراغ تھی۔ جس طرح اُس کے رومی نام سیرا کو بگاڑ کر ایرانی افسانہ نگاروں نے اُسے شیریں بنا دیا ——— اس لفظ میں ایرانی تصور حسن کی رُوح پنہاں ہے ——— اُسی طرح اُس کے شوہر شہنشاہ کو اُس کی زندگی ہی میں پرویز کا لقب ملا۔ جو ظاہر کرتا ہے کہ اُس کے مردانہ حُسن میں ستاروں کی سی جگمگاہٹ تھی۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ خسرو پرویز کو اپنی ملکہ شیریں سے جس قدر عشق تھا، ملکہ اُسی والہانہ عشق سے اُس کا جواب نہ دے سکتی تھی۔ اب مدن سینا، دھرم دت اور سمدر دت کے مثلث نے یہ شکل اختیار کی۔

مدن سینا	..	..	شیریں
سمدر دت	-	..	خسرو پرویز
دھرم دت	..	..	فرہاد

فرق اتنا تھا کہ مدن سینا کو اپنے شوہر ہی سے محبت تھی۔ لیکن شیریں کا دل اپنے حسین شوہر شہنشاہ کا نہیں۔ ایک کمین دکتر مزدور کا غلام ہو چکا تھا یہاں تیشہ اور جوئے شیر اور کوہ کنی کا قصہ دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن مدن سینا کی طرح شیریں نے بھی وصل کا وعدہ کیا تھا۔ سمدر دت کی طرح خسرو پرویز نے اس وعدے کی توثیق کی۔ سمدر دت اپنے وعدے پر اس لئے قائم رہا کہ اُس وقت عورت خانگی جائیداد نہیں بننے پائی تھی۔ لیکن شیریں اور فرہاد دونوں ایرانی شاہان شاہ کی رعایا اور اس کی ملکیت تھے۔ یہ اور بات تھی کہ وہ شیریں کے جسم کا مالک تھا۔ اُس کے دل کا مالک نہ بن سکا۔ لیکن اُس نے سمدر دت کے برخلاف وعدہ پورا نہ ہونے دیا۔ گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب نے کم ظرفی سے اپنی جان دے دی۔ شیریں کا دل اور زیادہ ٹوٹ گیا۔ خسرو پرویز کو اس وعدہ شکنی اور کامل فتح کے بعد اتنی بھی مسرت

اور اتنا بھی اطمینان نصیب نہ ہو سکا جتنا عربی صوبوں کی فتح کے بعد اس نے اُن ہزار بازنطینی کنواریوں سے معلوم نہیں کس طرح دل بہلایا۔ اور دل بہلا ہی رہا تھا کہ اسکندرون کی خلیج پر ہرقلیس اعظم کی فوجیں اتریں —— رُومی شہنشاہ کے پیشرو نے شیریں اور ایک ہزار کنواریوں کو ایرانی کے سپرد کیا تھا۔ ہرقلیس نے تُرک خاں کو اپنی خوبصورت بیٹی بھینٹ چڑھانے کا وعدہ کیا۔ دست گرد کے قلعہ میں اپنی بے شمار خواصوں اور عورتوں کو جن کی تعداد تین ہزار تھی —— چھوڑ کر خسرو پرویز بھاگ نکلا اور پھر ایک تاریک بُرج میں اُس کے ساتھ اُس کے انسانیت ناشناس بیٹے نے وہی سلوک کیا جو اکثر تاریخ میں ہوتا آیا ہے۔ ہرقلیس ممکن ہے کہ اُن ہزار رومی لڑکیوں کو چھڑا لایا ہو۔ جو اب کنواریاں نہ رہی تھیں۔ ممکن ہے جب بازنطینی شہنشاہ زیتون کی شاخوں، اور بے شمار چراغوں میں گھرا ہوا قسطنطنیہ واپس ہوا تو اُس کے جلوس میں ہزارہا ایرانی دوشیزائیں ہوں۔ ممکن ہے اس سلسلے میں ایران کے پڑوسی راج اننگ پورہ کے تاجروں کی بیٹیاں بھی ہوں اور اس طرح مدن سینا کی اولاد قسطنطنیہ پہنچی ہو۔

جب بازنطینی شہنشاہ ہرقلیس قسطنطنیہ میں ایران سے مصر و شام کے صوبوں کو واپس چھین لینے کی خوشیاں منا رہا تھا تو شام کے ایک گمنام گاؤں پر عرب کے ایک غیر معروف شہر مدینہ کے باشندوں سے اُس کے فوجیوں کی کچھ جھڑپیں ہوئیں۔ اس واقعہ کو ہرقلیس نے اس وقت اتنی ہی اہمیت دی جتنی اُس نے اور ایرانی شاہان شاہ نے عربی پیغمبر کی چٹھیوں کو دی تھی۔

لیکن بہت جلد ریگستان کی فوجیں مروسے لے کر مصر تک چھا گئیں جو صوبے ہرقلیس نے ایرانیوں سے واپس چھینے تھے۔ عربوں نے فتح کر لئے۔ یہاں تک کہ حضرت ابوایوب انصاری کے پرچم کو صرف یونانی آتش روک سکی۔ اور یونانی آتش کے زیر سایہ مدن سینا کی اولاد قسطنطنیہ میں پروان چڑھی اور یہاں سے بہ سلسلۂ تجارت بڑھتی ہوئی مغربی یورپ تک پہنچی جنوبی فرانس میں اس نے مانی کے اثرات کو باقی رکھا۔ لاطینی مصنفوں سے اس کا حال لوکا پیوا اور چاسر نے سنا۔

لیکن جس طرح ویتال نے مہاراج تری وی کرم سینا سے پوچھا تھا میں آپ سے پوچھتا ہوں: "سب سے زیادہ کم ظرف کون تھا؟ خسرو پرویز؟ یا شیرو؟ یا فرہاد؟"

چاسر کے فرینکلن یعنی چودھویں صدی عیسوی کے ایک زمیندار نے جو غلام تو نہ تھا مگر عالی خاندان اور شریف النسل بھی نہ ہوتا تھا۔ کچھ اس قسم کا قصہ بیان کیا۔

آرموریکا میں جس کو بری ٹینی بھی کہتے ہیں۔ مدن سینا کی اولاد میں ایک خاتون تھی جس کا نام ڈوری گن تھا۔ اسی ملک میں ایک نائٹ بھی تھا ملک کے شریف ترین طبقے کا نمائندہ۔ اس کا نام آروے راگس تھا۔ اُسے اس خاتون سے عشق تھا اور وہ بیحد زحمت اُٹھاتا اور کوشاں رہتا۔ کہ بہترین طریقے پر اس خاتون کی خدمت کر سکے۔ اپنی خاتون کو خوش کرنے کے لئے اُس نے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے۔ بڑی بڑی مہمیں سر کیں۔ تب کہیں جا کر وہ ڈوری گن کو جیت سکا۔ بالآخر اس کی قابلیت و شہامت کو اس خاتون نے اپنے شایانِ شان پایا۔ خاص طور پر اُس کے عجز اور اُس کی تابعداری کی وجہ سے اُس کی خدمت اور اس کی درخواست پر اُس نے ایسا ترحم کا جذبہ محسوس کیا کہ اُس نے اُسے اپنا شوہر اپنا آقا بنایا۔ آروے راگس نے خود اپنی مرضی سے یہ قسم کھائی کہ وہ ایک نائٹ کی طرح اپنا خاتون کی خواہش کے خلاف کبھی اپنا حکم چلانے کی کوشش نہ کرے گا۔ کبھی رشک و حسد کا اظہار نہ کرے گا۔ ہمیشہ اُس کی اطاعت کرے گا۔ ہر بات میں اُس کی مرضی کا پابند رہے گا۔ بالکل اُسی طرح جیسے کوئی عاشق اپنی معشوقہ کی مرضی کا پابند ہوتا ہے۔

ڈوری گن نے بڑے انکسار سے اُس کا شکریہ ادا کیا: "جناب جس طرح مجھے آپ نے اپنی مردانہ شرافت سے اس قدر حکومت بخشی ہے۔ اُسی طرح میں بھی اس کا وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کی خادمہ اور سچی بیوی رہوں گی۔ اس کا میں آپ سے پکا عہد کرتی ہوں"۔

دوست اور عشاق ایک دوسرے کی تابعداری کرتے ہیں۔ محبت ایک فریق کے استبداد اور دوسرے کی غلامی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ جب استبداد آتا ہے تو عشق کا دیوتا اپنے پر پھڑپھڑاتا ہے اور یہ جا، وہ جا، رخصت۔ ہر چیز کی طرح محبت کی روح بھی آزاد ہے۔ فطرتاً عورتیں بھی غلامی نہیں، آزادی چاہتی ہیں —— (اقبال نے زمرّد کے گلوبند کی ایک ہی کہی) —— اور مرد بھی۔

یہ معاہدہ سیدھا سادہ مگر کتنا عاقلانہ تھا۔ خاتون کو اپنا شوہر کیا ملا بیک وقت آقا بھی ملا اور خادم بھی۔ محبت میں غلام اور عاشق ہیں آقا۔ آقا کو آقائی بھی ملی اور خدمت بھی۔ خدمت؟ نہیں اس سے زیادہ تو آقائی ہی کیونکہ اُسے بیوی

کارہائے نمایاں سرانجام دینا نائٹ کا فرض تھا۔ اس فرض کی انجام دہی کے لیے آرویگس انگلستان کے کسی حصے میں گیا جسے برطانیہ بھی کہتے ہیں کتاب کہتی ہے کہ یہاں اُسے دو سال لگ گئے اس درمیان میں اُس کی بیوی ڈوری گن اُسے اپنے دل کی زندگی کی طرح چاہتی رہی۔ اُس کے فراق میں روتی اور آہیں بھرتی، تڑپتی، راتوں کو جاگتی، نالہ و زاری کرتی، فاقے کھینچتی۔

آخر آرویگس کے خط کبھی کبھی آتے۔ کبھی وہ برٹینی کے ساحل پر کھڑی ہو کے اُس کے جہاز کا انتظار کرتی اور چٹانوں کو دیکھ دیکھ کر ہول کھاتی۔ اس ڈر سے دعائیں مانگتی کہ کہیں اُس کے شوہر اُس کے محبوب کا جہاز بھی اِن چٹانوں سے ٹکرا کے پاش پاش نہ ہو جائے۔ خدایا تو دیکھتا ہی ہے کہ کتنے انسانوں کو یہ چٹانیں غارت کرتی ہیں۔ لاکھوں انسانوں کی جانیں اِن چٹانوں نے چھینی ہیں۔ کیا ایسے انسانوں کا حشر ہونا ضروری ہے جو تیری صنعتوں میں تیرے شاہکار سمجھے جاتے ہیں جنہیں تو نے اپنی شبیہ کے مطابق بنایا ہے ——— بہت کم وہ خوش ہوتی یا ہنستی بولتی۔ مگر مئی کی چھ تاریخ کو اپنی سہیلیوں کے جبر اور ضد سے وہ ایک باغ میں گئی۔ اس باغ میں ڈوری گن کے ساتھ ایک اسکوائر ناچ رہا تھا ——— اسکوائر یعنی قرونِ وسطیٰ کا ٹرازبردار لیکن کسی نائٹ کا محض ہمراہی یا اردلی اور اُس کی خاتون کی متابعت کرنے والا ایک ماہر کا سپاہی ملتفت ——— تازگی اور آراستگی میں شمالی یورپ کے مئی کے مہینہ کا جیسا۔ اس کا نام آرے لیس تھا۔ ناچنے اور گیت گانے میں عدیم المثال تھا۔ نوجوان تھا، مضبوط تھا، صالح تھا امیر تھا اور عقلمند تھا۔ لوگ اُسے پسند کرتے تھے اور اُس کی قدر کرتے۔ اس زندہ دل اسکوائر کو دنیا میں سب سے زیادہ ڈوری گن سے محبت تھی۔ اس حال میں اُسے دو سال سے زیادہ ہو گئے تھے لیکن اُس نے اپنا دردِ دل کسی سے نہ کہا تھا۔ نااُمیدی اُس پر غالب تھی۔ زبان سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا ——— صرف اپنے گیتوں میں وہ اپنے دل کا دُکھ کچھ نہ کچھ نچوڑ لیتا۔ عام انداز میں واسوخت لکھتا۔ یہ بتاتا کہ وہ عشق میں گرفتار ہے اور کوئی اُسے نہیں چاہتا۔ گیتیں، نغمے، نظمیں، واسوختیں لکھتا، اور بتاتا کہ وہ اپنے غم کا اظہار نہیں کر سکتا مگر وہ اس طرح عذاب بھگت رہا ہے جیسے دوزخ میں کوئی خبیث روح صدائے بازگشت کی طرح اُس کی قسمت میں بھی موت لکھی ہے۔

لیکن اس ناچ کے موقع پر اُس نے ہمت کر کے ڈوری گن سے حالِ دل کہا: "میں جانتا ہوں کہ میری ساری خدمت بیکار ہے۔ میرا دل پارہ پارہ ہو رہا ہے۔ خاتون میرے رنج اور درد پر رحم کیجئے۔ کیونکہ آپ کا ایک لفظ مجھے جِلا یا مار سکتا ہے۔"

وہ آرے لیس کی طرف دیکھنے لگی: "اس سے پہلے میں نہیں سمجھ سکی تھی کہ تمہارا مطلب کیا ہے لیکن آرے لیس اب میں تمہاری خواہش کو سمجھ گئی۔ اُس خدا کی قسم جس نے مجھے روح اور جان دی، کہ کسی اور کی بیوی ہوتے ہوئے میں بیوفائی نہیں کر سکتی۔" پھر اُس نے مذاق میں کہا: "آرے لیس، اُس خدائے بلند و برتر کی قسم جو اوپر ہے چونکہ میں دیکھتی ہوں کہ تم اس قدر گڑگڑا کر التجا کر رہے ہو۔ اس لیے سنو کہ کسی دن میں تمہاری معشوقہ ہوں گی۔ جس دن برٹینی کے ساحل کی یہ دیو ہیکل چٹانیں جن سے ٹکرا ٹکرا کے جہاز اور کشتیاں پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ ساحل سے ہٹ جائیں گی۔ ایک ایک پتھر ہٹ جائے گا۔ اُس دن میں وعدہ کرتی ہوں میں تمہاری معشوقہ بنوں گی۔"

اس سے زیادہ ناممکن اور کیا چیز ہو سکتی۔ فرہاد کو پہاڑ کاٹنے کی جو شرط پیش کی گئی تھی۔ اُسے انسان کی محنت پورا تو کر سکتی تھی۔ وہی شرط یہاں پیش کی گئی لیکن وہ اگر کٹھن تھی تو یہ ناممکن۔

آرے لیس اپنے گھر واپس گیا۔ اُسے یقین آ گیا کہ اب موت سے بچنا مشکل ہے۔ اپنے دل کو اُس نے سرد ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ سورج کے دیوتا سے اُس نے گڑگڑا گڑگڑا کر دعا مانگی کہ کسی معجزے کے ذریعے یہ چٹانیں ہٹ جائیں۔ دعائیں پوری نہ ہوئیں اور ڈوری گن کا شوہر گھر واپس آ گیا۔ اپنے نوجوان اور شریف و باعزت نائٹ کو دوبارہ پا کے وہ پھولے نہ سماتی تھی۔

جادو اور طلسمات، انسان عاقل کی عقل سے زیادہ پرانے پیشے شاید مشرق میں چل نکلے، پھر مغرب میں کچھ ایسے مقبول ہوئے کہ جون آف آرک کی جان اس الزام میں گئی۔ اور اس الزام میں اٹھارویں صدی میں کیسانووا کو ایسی سخت قید بھگتنی پڑی کہ اُس سے اُس کا نکل بھاگنا، انسان کی قوتِ ارادی اور اُس کے جذبۂ آزادی کا معجزہ ہے۔ کسی لاطینی مصنف کے دماغ نے جو مشرقی داستانوں سے سرشار تھے۔ مدن سینل کے ڈاکو کو جرانگ پورہ کی ایک سڑک پر بڑ کے پیچھے چھپ کے راہگیروں کو لوٹا کرتا تھا۔ ایک جادوگر راہب بنا دیا یہ راہب تو جادوگر بھی تھا، اور فلسفی بھی۔ آرے لیس اور اُس کے بھائی کو مشرقی طلسمات کے تماشے دکھلانے لگا، جیسے کٹھ پتلی کا کھیل۔ بازوں سے چھوٹے چھوٹے پرندوں کا شکار، شکاری کتوں سے ہرنوں کی ڈاروں کی ڈاروں کا شکار۔ اور اُس نے اپنی شعبدہ کاری سے آرے لیس کو ڈوری گن کے ساتھ خود اپنے آپ کو ناچتا دکھایا۔ اور بالآخر ایک ہزار پونڈ کے معاوضے میں اُس نے برٹینی کی ساری چٹانیں غائب کرنے کا ذمہ لیا۔

اور قرونِ وسطیٰ میں جادو کا جو زور تھا۔ اُس زور سے چٹانیں غائب ہو

گئیں۔ لب ہوجیں نرم نرم خراماں خراماں چھیلتی چھیلتی بری طینی کے ساحل تک آجاتیں۔ پہاڑوں سے سر نہ ٹکراتیں، چٹانوں سے پٹک کر جھاگ نہ اُگلتیں۔

جادو نے وہی کام کر دکھایا جو ذہا دبیسے پتھر پھوڑنے والے کے تیشے نے کیا تھا۔

آرتے لیس نے ڈوری گن کو اُس کا وعدہ یاد دلایا۔ اپنے دردِ عشق کا ذکر کیا۔ اُسے سمجھایا کہ اب بھی وہ اپنا وعدہ پورا نہ کرے تو وہ اُس کی بیگناہ موت کی ذمہ دار ہوگی۔ اپنے باغ کو اُس نے ملنے کا مقام تجویز کیا۔

وہ رخصت ہوگیا، تو وہ حیران کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اُس کے چہرے پر خون کے ایک قطرے کے آثار بھی نہ تھے۔ ایک دو روز روتی آہ وزاری کرتی رہی۔ اس طرح غش کھا کھا جاتی کہ دیکھنے والوں کو دُکھ ہوتا۔ لیکن کسی سے اُس نے کہا نہیں کہ اُس کی حالت غیر کیوں ہے۔ کیونکہ اُس کا شوہر دو تین دن کے لئے باہر گیا ہوا تھا۔ اکیلے میں وہ قسمت کا گلہ کرتی جس نے اُس کے لئے یہ جال پھیلایا تھا۔ جس سے نکلنے کا موت یا بے عزتی کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ پھر بھی وہ سمجھتی کہ جسم کی بے حرمتی سے تو موت ہی اچھی ہے۔ اس سے پہلے بھی تو شریف بیویوں اور کنواریوں نے اپنے جسم کو پامالی سے بچانے کے لئے اپنی جانیں لے لی ہیں۔

ایک دو روز وہ یہی سوچتی رہی یہاں تک کہ اُس کا قابلِ عزت نائٹ آروے راگس گھر واپس آیا اور اسے زار زار روتے دیکھ کے اس کا سبب پوچھا، تو وہ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بالآخر اُس نے آرتے لیس سے اپنی شرط کا ذکر کیا۔ جس کا پورا ہونا ناممکن تھا۔ مگر جو پوری ہوگئی اور اپنے وعدے کا ذکر کیا۔

اس کے شوہر نے اپنے چہرے کو بشاش بنا کے دوستانہ الفاظ میں اُسے سمجھایا: "کہ قول پورا کرنے سے بڑھ کے انسان کا کوئی اور فرض نہیں" پھر وہ بھی بے اختیار رونے لگا اور اُس نے کہا اور کسی سے اس واقعہ کا ذکر نہ کرنا تاکہ میں اس طرح اپنا رنج برداشت کر سکوں اور تم بھی اپنے چہرے سے تکدر ظاہر نہ ہونے دینا۔ تاکہ لوگ اس کا سبب نہ تاڑ جائیں۔" پھر اُس نے اپنے ایک اسکوائر اور ایک خادمہ کو حکم دیا۔ کہ ڈوری گن کو فلاں مقام پر پہنچا آئیں۔

بازار ہی میں آرتے لیس ملا اور ڈوری گن سے پوچھا کہ کہاں جا رہی ہے۔ اُس نے جواب دیا: "افسوس۔ تمہارے باغ کو، جہاں تم نے بلایا تھا اور جہاں اپنا وعدہ پورا کرنے کے لئے جانے کا میرے شوہر نے حکم دیا ہے۔"

اس واقعہ پر آرتے لیس کو سخت حیرت ہوئی اور اُسے بڑا ترس آیا ـــــ اُس پر بھی کیونکہ وہ اس طرح گریہ وزاری کر رہی تھی۔ اور قابلِ عزت نائٹ آروے راگس پر بھی جس نے اُسے اپنا وعدہ پورا کرنے کے لئے کہا تھا۔ تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اُس نے فیصلہ کیا کہ اپنی ہوس پر قائم رہنا بڑی کمینگی ہوگی۔ فیاضی اور شرافت کے خلاف بڑا سخت جرم ہوگا۔ اس لئے اُس نے خاتون کو اُس کا ہارا ہوا قول معاف کر دیا۔ اور کہا: "اسکوائر۔ نائٹ کا اردلی بھی شرافت کا فرض اُسی طرح بے جھجک ادا کر سکتا ہے جیسے کوئی نائٹ۔"

جادوگر راہب کو اُس نے پانچ سو پونڈ لے جا کے دیئے۔ اور باقی رقم کے لئے مہلت مانگی۔ جادوگر کے پوچھنے پر آرتے لیس نے کہا کہ اُس کی محبوبہ اُس کے باغ تک آئی مگر اُس کی نہ ہوئی۔ آروے راگس نے اپنی شرافت سے گوارا کر لیا۔ کہ خواہ صدمہ اور کوفت سے اُسے موت ہی کیوں نہ آئے وہ اپنی بیوی کو بدعہدی کا مرتکب نہیں ہونے دیگا۔ اور جب اس نے خود ڈوری گن کو اس قدر مغموم دیکھا تو اُس نے اُسے بغیر چھوئے ہوئے باغ سے واپس جانے کی اجازت دی۔

جادوگر راہب نے اُسے ہزار پونڈ معاف کر دیئے۔ اور کہا ایک راہب بھی تم لوگوں کی طرح شرافت کے کام کر سکتا ہے۔

چاسر کے فرینکلن نے دیتال کی طرح پوچھا: "آقاؤ قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں، بتاؤ ان میں سب سے زیادہ شریف اور فیاض کون تھا؟" اس قسم کے سوال قرونِ وسطیٰ میں اکثر پوچھے جاتے تھے۔ اور سوالاتِ عشق کہلاتے تھے۔

کلاس میں ایک لڑکی نے اُٹھ کے پروفیسر کو جواب دیا: "میرے خیال میں ڈوری گن سب سے زیادہ فیاض تھی۔ وہ خودکشی کر سکتی تھی، لیکن اس طرح اُس کا وعدہ پورا نہ ہوتا۔"

سب ہنسنے لگے۔

(۴)

جس شب ڈگبیر پلیس میں ہسپانیہ کے مظلومین کی امداد کے لئے ناچ اور تفریح کا جلسہ تھا۔ اُس شام کو پانی زور سے برسا تھا۔ مالابار ہل کی

سڑکیں ڈھلوانوں پر موٹر کے ٹائروں کو پھسلا پھسلا کے گویا نیچے گرا رہی تھیں رگھبیر پیلیس سے کوئی ایک فرلانگ ادھر اُدھر موٹروں کا ایسا ہجوم تھا کہ راستہ ملنا ہی مشکل تھا۔ مجبوراً سر سمدر نے اپنے شوفر سے کہا: "اگر گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی تو ہم یہیں اُتر جاتے ہیں۔ کیوں ڈارلنگ"؟

جہاں سال لیڈی سمدر نے بے بسی سے اپنی سفید ساڑھی اور اس کے کامدانی کام اور نفیس نارسی بورڈر کی طرف دیکھا۔ یہاں سے رگھبیر پیلیس تک فرلانگ بھر کا فاصلہ طے کرنے میں سر سمدر کے شارک اسکن کے جاکٹ پر اگر کوئی دھبہ آجائے تو کوئی خیال بھی نہ کرے گا، لیکن اس ساڑی پر سوئی کی نوک کے برابر بھی کوئی داغ لگ جائے۔ تو اُس کی شام کرکری ہو جائیگی۔

"میں سمجھتی ہوں اُترنا ہی پڑے گا۔ اس طرح تو گھنٹہ بھر سے پہلے راستہ نہیں ملے گا"۔

ڈرائیور نے بڑی مشکل سے اس قدر دروازہ کھولنے میں کامیابی حاصل کی کہ چندرما ـــ یہ لیڈی سمدر کا نام تھا ـــ بمشکل اپنی ساڑی کو اپنے جسم سے لپٹا کے اُتر سکی۔ اور پھر موٹروں کی بھیڑ میں آدمیوں اور مڈگارڈوں سے دامن بچاتی ہوئی اپنے شوہر کے ساتھ وہ رگھبیر پیلیس کے پورٹی کو تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ پورٹیکو ہی میں مسز سنگھ کھڑی تھی۔

وہ مسکرا کے اِن دونوں کی طرف بڑھی۔ "شام بخیر چندرما۔ آپ اچھے تو ہیں سر سمدر۔ آپ کو کہاں اُترنا پڑا ـــ ایک فرلانگ ـــ ہاہا" اس کا موٹا جسم، سر کے مصنوعی گھنگھریالے بال، نچلا چوڑا ہونٹ: اور اورنگ آبادی ہمرو کا کوٹ "سب اسی ہنسی میں لہرائے۔ "چندرا ڈارلنگ، بشماش نگر کے تینوں راجکمار اُس میز پر ہیں ـــ تینوں جہابیر، رگھبیر اور رگھوبیر۔ تینوں تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ خصوصاً رگھوبیر۔ . . . اوہ ڈارلنگ جب سے اس نے تمہاری تصویر "ان لُکر" میں دیکھی ہے ـــ وہی جو ڈنکن نے کھینچی تھی۔ تب سے تمہارے متعلق بحران میں مبتلا ہے۔ قطعی طور پر بحران میں۔ . . اور آج تم بالکل جادو کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہو۔ ساحرہ سی ـــ کیوں سر سمدر . . ڈارلنگ مجھ پر فرض ہے کہ تمہیں ان سب سے ملاؤں۔ اس طرف سر سمدر"۔

مسز نوشیرواں افراسیاب سے باتیں کرتے مڑ کر سر سمدر نے مسز سنگھ سے کہا: "ابھی ایک منٹ میں مسز سنگھ۔ آپ لوگ جائیں میں ابھی وہاں آتا ہوں"۔

مسز نوشیرواں نے ایک نوجوان یوروپین عورت کو دیکھ کر سلام کے لئے سر خم کیا۔ اس کے ساتھ ایک گہرے سانولے رنگ کا ہندوستانی نوجوان تھا

"کون ہیں؟" سر سمدر نے پوچھا۔

"مسٹر اور مسز وحید امجد" مسز نوشیرواں نے اس گذرتے ہوئے جوڑے کا غائبانہ تعارف کراتے ہوئے کہا۔ یہ عورت آسٹرین ہے۔ . . . . کئی رجواڑوں میں پیانو بجانے کی تعلیم دے چکی ہے۔ اپنے شوہر کی تقدیر اس کی بنائی ہوئی ہے۔ اُس کا تشہیر و اشتہار کا کاروبار ہے اور اب یہ حالت ہے کہ میرین ڈرائیو میں دو سو روپے کے فلیٹ میں رہتا ہے۔ شادی سے پہلے مجھ سے ڈیڑھ سو کی نوکری مانگنے آیا تھا۔ . . . لیکن سمدر۔ کچھ پیو گے نہیں"؟ اُس نے سمدر کا بازو پکڑ کے کہا: "آج دو بار ہیں۔ ایک اوپر اور ایک قطب شمالی والے کمرے میں۔ اور یہ قطب شمالی وغیرہ کمرہ دیکھنے کے قابل ہے۔ چلو"۔

اس برآمدے کے بعد ایک اور بڑا نیم برآمدہ سا تھا، جس میں کہیں میک کا ناچ آرکسٹرا ٹانگو بجا رہا تھا اور کوئی چار سو جوڑے ناچ رہے تھے۔ روشنی اور ہسپانوی موسیقی کے سیلاب میں طرح طرح کے ہندوستانی اور یورپی زنانے لباس، کالے یا نیم سفید پوش مردوں کے ساتھ گھوم رہے تھے۔ گویا روشنی موسیقی کی صوتی حرکت اور انسانی جسم اور جنسوں کی کشش کی حرکت سب ایک زندگی کی مرکب حرکت میں ضم ہو رہی تھیں۔ میزوں کے درمیان سے جان پہچان والوں کو سر کے اشارے یا تبسم سے سلام کرتے یا جواب دیتے۔ کسی کسی میز پر ایک آدھ منٹ کے لئے ٹھہر کر کوئی بات کرتے ہوئے وہ بائیں طرف کے دروازے میں مڑے اور اس مشہور "قطب شمالی" والے کمرے میں پہنچے۔ جہاں ایر کنڈیشننگ کے ذریعہ اس قدر سردی کا انتظام کیا گیا تھا کہ رقص کے سانسوں اور موسیقی سے گرم کمرے سے نکل کے یہاں داخل ہونے پر یقیناً سردی معلوم ہوتی تھی۔ کمرے کی دیواروں پر اور دیواروں کے ساتھ ساتھ، اور فرش پر روئی کے گالوں اور سفید کاغذ کی کترن سے برف کی طرح طرح کی شکلیں تھیں، برفانی پہاڑ، برفانی ٹیلے جما ہوا برف۔ برف کے جزیرے۔ ایک طرف ایک وھیل نما صوفا تھا۔ ایک طرف قطب شمالی کے ریچھ کی شکل کی ایک کرسی تھی۔ ایک اسکیمو خیمے کے نیچے شراب کی بوتلیں اور گلاس، طرح طرح کے مرکبات، طرح طرح کے جام تھے اور دو انگریز لڑکیاں اسکیمو کپڑے پہنے ساقی گری کر رہی تھیں۔ "جون۔ میرے لئے

ایک گملٹ اور تم سمدرو۔

"گملٹ" سر سمدر نے اختصار سے جواب دیا "شکریہ۔"

کُھلے ہوئے دروازے سے سر سمدر نے راجکاری کی میز کی طرف دیکھا۔ تین نیم ڈراویدی راجکمار۔ تینوں کلر ٹنگ کالا سا، بال گھنگھریالے، تینوں ٹیل کوٹ پہنے۔ تینوں انگلستان کے پبلک اسکولوں کے پڑھے ہوئے ایٹن اور ہیرو اور پھر آکسفورڈ۔ ساتھ ہی ایک امریکن لکھ پتی، ہندوستان میں ایک امریکی موٹر کمپنی کا جنرل ڈائریکٹر اور ہوائی فوج کا ایک انگریز گروپ کیپٹن۔ میز سے کا ایک گوموڈورو اور کیمی... ... پارسی، مسلمان، ہندو میز پر وہسکی، سوڈے، برانڈی، جن، کاک ٹیل اور گملٹ کے گلاسوں کی شفاف چمک اور اس ہجوم میں گوموڈورو کی سفید وردی کو اُس نے اُٹھتے دیکھا۔ میز کے دوسرے کنارے سے اُس کی اپنی بیوی چندرا ہنستی ہوئی اُٹھی۔ پھر وہ رقص کرنے والوں کے ہجوم میں رقص کے سیلاب میں غائب ہو گئے۔ اور سر سمدر نے اپنا گملٹ ختم کیا۔ محسوس کیا کہ اُس کے ادھیڑ اعصاب کو اس سے زیادہ تیز چیز کی ضرورت ہے۔ جوّن کی طرف مسکرا کر اُس نے کہا "بس بریڈلے۔ ڈبل جن پلیز۔" جوّن نے پیسے لے کے ڈبل جن کا گلاس اُسے اور وہسکی سوڈا کا گلاس سر نوشیرواں کو دیا۔ قطب شمالی والے کمرے میں اُس سے چند قدم کے فاصلے پر وسیل زاصوفے پر مہاراجہ وشواشش نگر شارک اسکن کا جیکٹ پہنے، بڑے انداز سے کاک ٹیل کا گلاس گھما گھما کے خورشید مقدس جی سے باتیں کر رہے تھے —— بوہرہ تاجر جو اپنے سسر کے سٹے کے روپیہ کی وجہ سے اب لکھ پتی بن گیا تھا۔ خان بہادر بن ہی چکا تھا۔ اور ابھی سے راجوں اور مہاراجوں سے اس طرح کندھے سے کندھا بھڑا کے ملنے کی کوشش کرتا تھا گویا وہ اُس کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں۔ ریس کورس پر پانی کی طرح روپیہ خرچ کرتا۔ اُس کا اپنا اصطبل مہاراجہ مانڈو کے اصطبل سے کچھ کم نہیں تھا۔ اور اُس کا گھوڑا ذوالفقار دو سال سے برابر عرب ڈربی جیت رہا تھا۔

سر نوشیرواں نے رازدارانہ انداز میں سر سمدر سے کہا "اس بوڑھے کو دیکھو ——"

"ہوں"

کھلے ہوئے دروازے سے پھر بوڑھے کو موڈورو کی آغوش میں

ادھیڑ سر سمدر نے اپنی جوان بیوی کا جیتا جاگتا مسکراتا جسم دیکھا۔ موسیقی ختم ہوئی، دوبارہ شروع ہوئی۔ اب راجکمار رگھوبیر کے ساتھ اُس کی بیوی ناچنے کو اُٹھی۔ ٹم ٹم ٹن ٹن۔ من۔ من۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔" قطب شمالی والے کمرے کے مصنوعی برفانی فرش پر سر سمدر کے پاؤں ناچ کا انداز کرنے لگے۔ بینڈ نے ایک جھرجھری لی، ہنسی، قہقہوں، ہم آغوش جسموں کی گفتگو کی رفتار، جن کے گلاس میں سما گئی۔ ایک انگریز لڑکی آرکسٹرا کے پاس کھڑی ہو کے ہسپانوی انداز میں، انگریزی لہجے کے ساتھ ایک دھن "پوٹما" گانے لگی۔ "رافائے لی جو" اور "جو" کا ادا معلوم ہوتا تھا قیامت لائے گا۔

رگھوبیر کے جسم سے لپٹی ہوئی، آنکھوں سے آنکھیں بندھی ہوئی لیکن ٹانگیں —— متحرک اور جسم کے سارے ہیجان سے بے پروا اور بے تعلق ...... مشین کی طرح، کوچ کرتی ہوئی فوجوں کی طرح، موسیقی کی پابندی کرتی ہوئی ٹانگیں اُلجھے بغیر، ذرا سی بھی غلطی کئے بغیر برابر رقص کر رہی تھیں۔ سر سمدر نے جلدی سے جن کا گلاس ختم کیا۔ مسکرا کے جوّن کا شکریہ ادا کیا۔ اور سر نوشیرواں سے پوچھا "اوپر بھی ناچ ہو رہا ہے؟"

"ہاں مگر وہاں ذرا دوسرے درجے کے لوگ ہیں۔"

"تو بہت ہی دلچسپ ہوگا۔" سر سمدر نے کہا۔ اور اُس نے محسوس کیا کہ اگر وہ یہیں نیچے کے رقص کے کمرے میں ناچے گا۔ تو اُس کی بیوی کی آزادی میں خلل پڑے گا اور وہ پورا لطف نہ اُٹھا سکے گی۔

وہ سر نوشیرواں افراسیاب کو وہیں چھوڑ کے اپنے سیاہ پتلون کی جیب میں ایک ہاتھ ڈالے مسکراتا ہوا باہر نکلا۔ اُس کی بیوی چندرا رگھوبیر کے جسم سے دو انچ بھر دُور ہٹ کے اُس کی طرف دیکھ کے مسکرائی۔ اُس نے بھی مسکرا کے اُس کی مسکراہٹ کا جواب دیا۔ پھر باہر کے برآمدے کی بھیڑ سے ہوتا ہوا چوڑے چوبی زینے پر سیٹی بجاتا ہوا چڑھنے لگا۔

"دوسرے درجے" کے کچھ لوگ نیچے اُتر رہے تھے۔ اس "دوسرے درجے" میں مہاراجاؤں، اعلیٰ ترین حکام اور لکھ پتی کارخانوں کے مالکوں کے سوا سب ہی شامل تھے۔ جونیئر آئی۔ سی۔ ایس چھوٹے کارخانوں کے مالک، بڑے تاجر، فلم کمپنیوں کے ڈائریکٹر اور ہندوستانی پردۂ سیمیں کے درخشاں ستارے مہاراجاؤں کے کنٹرولر اور لے ڈی۔ سی۔ میجر اور اُن سے کم درجے کے

زرجی افسر

اوپر کا ناچ ہال بہت بڑا تھا اور کوئی ایک ہزار کے قریب لوگ اُس کے بے شمار ستونوں کے درمیان ناچ رہے تھے۔ چاروں طرف برآمدوں میں میزیں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں اور سرسمد واپس جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا۔ کہ مہاراجہ مانسرود کے ایک اے ڈی۔ سی نے سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اُسے دیکھ لیا: "ہلو سر سمد۔"

"اوہ۔ گڈ ایوننگ" سرسمد نے جواب دیا۔ وہ اکثر مہاراجہ مانسرود کی پارٹیوں میں بلایا جا چکا تھا۔ "یہاں اُوپر تو تل رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔"

"سرسمد اگر آپ جگہ تلاش کر رہے ہیں تو ہماری میز پر چلئے۔"

"ضرور شکریہ۔"

اس اے ڈی سی کا نام آفریدی تھا۔ میز پر بمبئی کے ایک مشہور تاجر کا بیٹا اکرام بھائی۔ دو لڑکیوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آفریدی نے سرسمد کا اُس سے اور دونوں لڑکیوں سے تعارف کرایا۔ ایک لڑکی کا نام اُس نے چھایا دیوی بتایا۔ یہ اینگلو انڈین تھی۔ لیکن بڑی ہی فیشن ایبل ساڑی پہنے۔ ایک زمانے میں فلمستان کی مشہور پری رہ چکی تھی۔ یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب ہندوستانی فلموں کی پریاں بالعموم اینگلو انڈین ہی ہوتی تھیں، اور بولتے فلم کا شمار نوادرات میں ہوتا تھا۔ پھر ان ستاروں پر زوال آیا۔ بہت کم باقی رہیں۔ زیادہ تر اِدھر اُدھر نکل گئیں۔ چھایا نے بھی اودھ کے ایک تعلقدار صاحب سے شادی کی۔ وہ پی کے اسے خوب ٹھوکتا تھا۔ تین چار سال بعد یہ طلاق لے کے اُٹھ کھڑی ہوئی اور اب "غیر وابستگی" کے عالم میں بمبئی میں مقیم تھی۔ دوسری لڑکی شیریں پارسی تھی۔ موٹی، بھدی، پست قد اور بے ہنگم چہرے پر چوتھائی انچ غازے کی تہ جمی تھی۔ بالائی لب کے روئیں جو اس غازے کے بغیر شاید اچھی خاصی مونچھیں معلوم ہوتے، اب بھی غازے کی اس دبیز تہ سے بغاوت پر آمادہ تھے۔

آفریدی نے سب کے لئے وہسکی اور سوڈا منگوایا۔ سرسمد نے چھایا سے ناچنے کی فرمائش کی۔ یہ دی آنا کا والٹس تھا۔ ہلکا، شیریں، تیز۔ اُس نے اپنے سینے کے مقابل چھایا کا نوجوان جسم محسوس کیا۔ بھرے بھرے بازو اور شانے۔ سینہ ابھی تک سخت۔ بال رنگے ہوئے مگر گھنے، اور گردن اور شانوں اور پشت کو حسین سے حسین تر بناتے ہوئے جسم گداز اور گٹھا ہوا ہونٹ سرخ، آنکھیں چمکتی ہوئی اور بناتی ہوئی۔

"آپ بہت اچھا ناچتے ہیں سرسمد" چھایا نے اُس سے کہا اور اُس کے دانتوں اور اُس کی پلکوں نے مل کے جال پھینکا۔

"نہیں مجھے تو ناچنا کچھ یوں ہی سا آتا ہے۔ لیکن آپ بہت اچھا ناچتی ہیں جیسے کوئی پری ناچے۔" اس کلمۂ تحسین پر وہ ہنسی، اُس کا پورا جسم ہلا اور ہلتے ہی سینوں سے لے کر رانوں تک اُس کے چمٹے ہوئے گداز جسم کے تمام عضلات میں ہنسی اور گدگداہٹ کی سی جُنبش ہوئی۔ اِس جُنبش نے سرسمد کے اُدھیڑ جسم سے ٹکر کھائی۔ "آپ بہت خوبصورت ہیں۔ غیر معمولی جیسے گریٹا گاربو۔"

"اوہو" اُس نے کلّے پھُلائے اور پھر ہنس کے کہا "یہ تو تعریف نہیں ہوئی سرسمد۔ گریٹا گاربو تو ہرگز خوبصورت نہیں۔"

"پھر آپ کسے خوبصورت سمجھتی ہیں؟"

"جون کرافرڈ۔ میرے خیال میں جون کرافرڈ بہت خوبصورت ہے۔"

"چھایا دیوی آپ اُس سے کہیں خوبصورت ہیں۔ آپ میں بڑی کشش، بڑی غیر معمولی دلفریبی ہے۔ بالکل کسی راجکماری کی سی"

وہ پھر ہنسی، پھر جسم کی ایک ایک رگ، ایک ایک عضو ہنسا۔ پھر اُس کی بوٹی بوٹی نے سرسمد کو چھیڑا۔ "دیکھئے سرسمد آپ نے پھر غلطی کی۔ راجکماریوں سے زیادہ تو ان کی ساریاں خوبصورت ہوتی ہیں۔"

"آپ کا ذہن ایسا ہی تیز ہے جتنی آپ کی صورت دلکش ہے۔ . . . چھایا دیوی آپ نے فلم کی زندگی ناحق چھوڑی۔ مجھے یقین ہے اب بھی آپ واپس جائیں تو بمبئی میں تو کوئی ایکٹرس آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔"

"وہ دن گذر چکے" چھایا نے کہا۔ "اب اس مارکٹ میں میری ساکھ نہیں رہی۔ ہاں اگر مجھے کسی بڑے آدمی کی مدد مل سکے تو شاید ــــ" اور اس کی بھوری آنکھوں نے سرسمد کی آنکھوں کو چھیدنے کی پوری کوشش کی، اس کا جسم رقص کے آخری گھماؤ میں سرسمد کے جسم سے اس قدر قریب آگیا کہ اس قربت کی تیزی نے دی آنا کے والٹس کے آخری گھماؤ کو دس درجہ اور زیادہ تیز کر دیا۔

میز کی طرف واپس آتے ہوئے اُس نے کہا "شکریہ چھایا دیوی . . . اس مسئلے کے متعلق پھر تفصیل سے بات چیت کریں گے۔ آپ دو ایک روز

میں مجھ سے آفس میں ملیں . . مجھ سے جو ہو سکے گا . . بمبئی کی تمام فلم ایکٹرسوں میں آپ . . . "

شیریں اکرام بھائی کی گود میں بیٹھی تھی۔ سرسمد نے وہسکی اور سوڈا اور خواتین کے لئے کاک ٹیل لانے کو کہا۔ آفریدی نیچے مہاراجہ کے پاس گیا تھا۔

شیریں نے اکرام بھائی کے کالر کو چھیڑتے ہوئے پوچھا "اس سیاہ پردے کے پیچھے کیا ہے۔ اور اُس نے دور ایک پردے کی طرف اشارہ کیا

سرسمد نے جواب دیا "بڑا خواب بھیڑیا"

"اوہ" شیریں نے مصنوعی طور پر سہم کے کہا۔

آفریدی آ گیا۔ اور دوسرا ناچ لیمبتھ واک شروع ہوا۔ آفریدی نے چھایا اور اکرام بھائی نے شیریں کو سنبھالا۔ دونوں لڑکیوں نے سرسمد سے معافی مانگی۔ اُس نے بھی اجازت چاہی وہ خود متوسط طبقے کی اس صحبت سے سیر ہو چکا تھا۔ چوڑے چوبی زینے اُتر کے پھر اُس نے نیچے کی رقص گاہ کا قصد کیا راستے میں کوموڈور نشے میں دُھت بحری فوج کے ایک اور افسر سے کاک ٹیل کا گلاس ہاتھ میں لئے کہہ رہا تھا "میرے خیال میں لیڈی سمدر بہت آسانی سے . . . "

سرسمد کو دیکھ کر اُس کے ساتھی افسر نے کہا "ششش ششش ش"

نشے میں جھوم کر کوموڈور نے کہا "ششش ش ش" اور دونوں دوسری طرف مڑ گئے۔ رقص گاہ کے ایک ستون کے قریب اُس کی بیوی رگھوبیر سے باتیں کر رہی تھی۔ لیکن اُس کی آنکھیں ایک نوجوان افسر کے چہرے پر جمی تھیں جو دور کھڑا ہوا اسی انگریز لڑکی سے باتیں کر رہا تھا جس نے کچھ دیر پہلے مائیکروفون پر فرانسیسی گیت گائے تھے۔ ایک ہندوستانی فوجی افسر جیکوسلاویکیہ کے سفارت خانے کے ایک افسر سے کہہ رہا تھا "یہ ٹیکسی ناچنے والی" وہ لڑکیاں جو دس روپیہ چندہ داخل کرنے پر آپ کے ساتھ ایک ناچ ناچتی ہیں۔ —

یہ جو ادھر سیدھے ہاتھ کی طرف کھڑی ہے۔ مِس اسکرین۔ ڈورا اسکرین ذرا اس کا جسم تو دیکھئے۔ مکمل . اگر یہ تیار ہو جائے تو میں آج اس سے شادی کر لوں" . . . سرسمد نے اُس لڑکی کی طرف دیکھا۔ اونچا قد، دبیز جسم، سینے خوب اُبھرے ہوئے، اینگلو انڈین۔ وہ مسکرایا اُس نے اپنی بیوی کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ لیمبتھ واک

. . . . . ناچنے والوں کے ہجوم میں اس نے اپنی بیوی کو دیکھا۔ ایک جھٹکے میں وہ رگھوبیر کے جسم پر آ گری، دونوں ہنسے، اور چمٹ گئے اور پھر ناچنے لگے۔

"تیتری میرے ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہے" وہ تلخی سے مسکرایا۔ اور قطب شمالی والے کمرے کی طرف چلا۔ بوڑھا سر نوشیرواں افراسیاب اب بھی وہیں تھا۔ اور وہسکی پر وہسکی چڑھائے جا رہا تھا "ہیلو سمدر! خوب لطف اُٹھا رہے ہو؟"

ناچ ختم ہوا مائیکروفون پر کسی نے اعلان سنایا "ہسپانیہ کے مظلوم پناہ گیروں کی امداد کے لئے لندن کے لارڈ میئر نے جو چندہ جمع کرنا شروع کیا ہے۔ اُس سلسلے میں ہم بمبئی سے بھی حتی الامکان مدد کر رہے ہیں۔ سب سے زیادہ مجھے اُن رضاکار خواتین کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے آج کے شو اور ناچ کو کامیاب بنانے کے لئے خاص طور پر محنت کی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ تعریف کی مستحق مس ڈورا اسکرین ہیں۔ مس ڈورا اسکرین بارسلونا کی فتح کے وقت اسپین میں موجود تھیں۔ انہوں نے وہاں کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ اُس شولری کے جذبے کے تحت جو نوجوانی اور انسان پرستی ہی کا حصہ ہے مس ڈورا اسکرین کے ایک پیار کا نیلام ہوگا . . " یہ کہہ کے وہ ہنسا۔ مجمع نے زور و شور سے تالیاں بجائیں۔ ہال میں مرد عورت سب سانس ساتھ کھچا کھچ بھر گئے۔ جو پیچھے تھے وہ اسٹولوں پر کھڑے ہو گئے۔

مس اسکرین۔ ڈورا۔ سینے خوب اُبھرے ہوئے، دبیز جسم، اونچا قد۔ ذرا اس کا جسم تو دیکھئے۔ مکمل۔ آرکسٹرا کے تخت پر مسکراتی کھڑی تھی، تبسم اور آنکھیں دونوں میں چمک تھی اور شاید شرم کی بھی ذرا سی جھلک ہو۔ پھر پیار کا نیلام ہوا، پچاس سے شروع۔ سو ہوا تو کپتانوں نے بولی بند کر دی۔ ہزار تک بڑے تاجر کارخانوں کے مالک بولیاں بولتے رہے۔ اُس کے بعد صرف کروڑپتی اور مہاراجے باقی رہ گئے اور بالآخر مہاراجہ وشواش نگر نے چار ہزار چھ سو روپیہ میں مس ڈورا کا ایک بوسہ خریدا۔ وہ مونچھوں پر تاؤ دیتے آگے بڑھے، اور بڑھائے گئے۔ اُن کی گھنی، خضاب لگی ہوئی مونچھوں نے ڈورا اسکرین کے لبوں کو ایک سیکنڈ کے دسویں حصے کے لئے چھوا۔ اور پھر حسینہ نے ہنس کے اپنا مُنہ ہٹا لیا۔ مہاراجہ کے تینوں بیٹے مہابیر، رگھبیر اور رگھوبیر مجمع کے پیچھے آپس میں کچھ کہہ کے ہنسے اور ٹہلنے لگے۔

اور سمدر سوچنے لگا "کیوں؟ نیلام کیوں؟ کیا مہاراجہ یوں چار ہزار چھ سو

نہیں جا سکتے تھے۔ یا نیلام ہی ہونا تھا تو کسی اور چیز کا کیوں نہیں ہوا۔ پکاسو کی کسی تصویر کا نیلام ہو سکتا تھا۔ جو جمہوریت پسندوں کی طرف سے لڑ رہا ہے۔ یا کسی اور تصویر کا، کسی بلا کا نیلام ہو سکتا تھا۔ ایک عورت کے بوسے کا انعام کیوں؟ کیا وہ بھی تجارت کا مال ہے؟"

تجارت کے مال کا خیال آتے ہی سمدر کو اپنی بیوی چندرا کا خیال آیا۔ اپنی بنائی ہوئی تیتری کا۔ یہ پر پرزے اُسی نے تو نکالے تھے۔ پروں کی جگہ ریشمی ساڑیاں سینکڑوں کی، ہزاروں کی ساڑیاں۔ پر نکل چکنے کے بعد اُڑنے سے کون روک سکتا ہے۔ اِدھر اُدھر اُس نے اپنی بیوی کو ڈھونڈھا۔ قطب شمالی والے کمرے کے دروازے پر سگریٹ کے دھوئیں میں اُس کا چہرہ چھُپا ہوا تھا۔

آہستہ سے چندرا کے پاس جا کے اُس نے کہا: "ڈارلنگ اب گھر چلو گی؟" چندرا مسکرانے لگی۔ چھایا کی طرح اُس کے دانتوں اور پلکوں سے مل کے جال بچھایا: "اب تو کہیں جا کے پارٹی پُر لطف ہو رہی ہے۔ اور آپ ابھی سے چلنے کو کہتے ہیں۔"

"تو پھر ڈارلنگ مجھے اجازت دو۔ صبح سویرے مجھے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی ایک مجلس میں جانا ہے اور بھی بہت سے کام ہیں۔ راجکمار رگھبیر سے کہنا وہ تمہیں گھر چھوڑ دیں۔"

آخری جملے کے طنز پر چندرا کے لبوں نے ذرا پیچ و تاب کھایا۔ مگر فوراً ہی سنبھل کے وہ مسکرانے لگی۔ اور اس کے ماتھے کی بندی کھل سی گئی۔

"شکریہ۔ ڈارلنگ" اُس نے اپنے شوہر سے کہا۔

ناچ تو شاید ڈھائی بجے ختم ہو گیا ہو گا مگر صبح کے پانچ بجے کے قریب وہ گھر آئی۔ رگھبیر ہی کی موٹر میں گاڑی سے اُترنے کے بعد رگھبیر نے چندرا کے ہاتھ کو ایک طویل بوسہ دیا۔ پھر سمدر کھڑکی سے ہٹ آیا۔ اور سوتا بن کر مسہری پر لیٹ رہا۔ چندرا دبے پاؤں آئی ___ اُس کی مسہری کے قریب۔ ایک لمحہ تک وہ سوچتی رہی کہ اپنے سوتے ہوئے شوہر کو پیار کرے یا نہیں؛ پھر اُس کے چہرے پر تلخی کی سیاہی اور اُس کے ہونٹوں پر ایک طنز آمیز ہنسی پیدا ہوئی۔ اور وہ ساری کو فرش پر پھینک، اپنی مسہری پر لیٹ رہی۔

سات بجے سر سمدر اٹھے۔ اُن کی تیتری مسہری پر غافل پڑی سو رہی تھی۔ اس کے پر توڑنا کس قدر آسان تھا؛ پر چاندی ہی کے تو تھے۔ چاندی کا دروازہ بند کر دو۔ تیتری اور اس کے پر دونوں غائب۔ اور تیتری پھر گملا کیڑا بن جائے گی

ایک طلاق کے بعد دوسرا ملنے میں اتنی آسانی نہ ہو گی۔ مگر اُنہیں چندرا پر بڑا ترس آیا۔ اُن کی بیوی مگر سن میں اُن کی بیٹی کے برابر۔ اور وہ سوچنے لگے۔ کہ اُن کی بیٹی ہوتی تو کیا وہ اُس کے پر نوچتے۔ کیا وہ اُسے رقاصہ دیکھ سکتے۔ اپنے وکیل کے پاس جانے کا ارادہ اُنھوں نے ملتوی کر دیا۔

کپڑے بدلتے ہوئے وہ سوچنے لگے۔ ہم سب میں زیادہ فیاض کون ہے ___ میں؟ جو مالک ہوں اور اپنی ملکیت پر جبر نہیں کرتا؛ یا وہ راجہ جس نے اپنا پیار بیچا؟ یا میری چندرا جس نے اپنی ریشمی آرام و آسائش کے لئے اپنے والدین کو اپنا جسم میرے ہاتھوں بیچ لینے دیا۔ وہ ہنسا۔ سماج کے اس کھنکتے ہوئے راج میں کون فیاض ہے؟ کون فیاض رہ سکتا ہے؟ یہاں تو ہر طرف لین دین ہی لین دین ہے۔ یہاں شکر و شکایت اور گلہ شکوہ کیا؟

(۵)

رات کے ساڑھے سات بجے کے قریب صغیر اپنے چھوٹے سے فلیٹ کو واپس آیا۔ ماہم میں مچھلیوں کی بُو یہاں تک آتی تھی۔ مگر شہر میں فلیٹ مہنگے تھے۔ دروازہ مقفل تھا؛ جس کے معنی یہ تھے کہ ناہید جہاں، اس کی بیوی ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ ابھی تک نہیں آئی تو کھانا کب پکے گا۔ قریب کے ایرانی ہوٹل کے کھانے کا نام سن کر اُسے اُبکائیاں آتی تھیں۔

ہندوستان میں اشتراکی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم میں وہ لوگ ہیں جن میں سے صرف چند کو "قلب او کافر، دماغش مومن است" کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس پہلی قسم کے زیادہ تر اشتراکی گورنمنٹ آف انڈیا یا صوبجاتی سرکاروں میں اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ ملک کے بہت سے ادیب، بہت سے شاعر، بہت سے اخبار نویس اسی قسم میں گنے جا سکتے ہیں۔ اگر وجہ جواز کی کمی تھی تو جون ۱۹۴۱ء سے وجہ جواز بھی مل گئی۔ اور اب یہ ممکن ہو گیا کہ کوئی مالا بار ہل بمبئی یا جوبلی ہل حیدرآباد یا مال لاہور یا کنگ ایڈورڈ روڈ نئی دہلی میں قیام کرے اور اشتراکی ہونے کا دعویٰ کرے۔ ان میں سے ممکن ہے۔ بعض ایسے ہوں، جنہیں اشتمالی تحریک سے تھوڑی بہت ذہنی ہمدردی ہو۔ مگر ایسا شاید ہی کوئی ہو جو وقت آنے پر اپنے فیشن ایبل پتے تک سے دست بردار ہونے کو تیار ہو۔ دوسری قسم کے اشتراکی وہ ہیں جو برسوں جیل بھگت چکے ہیں، مزدوروں کے ساتھ رہ کے انہیں کی خوراک کھا چکے ہیں۔ بیماریوں میں ایک خوراک دوا کے لئے ترس چکے ہیں۔ ایسے اشتراکیوں میں سے بہت سوں نے

کبھی سرکاری یا کسی اور آرام دہ ملازمت کی کوشش نہیں کی۔ جب موقع آیا تو اُس سے انکار کیا اور ۲۳ جون ۱۹۴۲ء کو اپنے لئے آرام طلبی یا جاہ طلبی کا بہانہ نہیں بنایا۔

صغیر اور اس کی بیوی ناہید جہاں دونوں کا شمار اس دوسرے قسم کے اشتراکیوں میں تھا۔ وہ اگرچہ یوپی کا رہنے والا تھا۔ لیکن عرصے سے بمبئی میں سُوت کے کارخانے کے مزدوروں کی تنظیم کرتا رہا تھا۔ اُس کی قابلیت اور اُس کی خوبیٔ تحریر کو دیکھ کر اب دو تین سال ہوتے ایک مقامی قومی اخبار میں اُسے ڈیڑھ سو روپیہ کی جگہ دی گئی تھی۔ جنگ کے زمانے میں اور وہ بھی بمبئی کی زندگی کے لئے ڈیڑھ سو روپیہ کیا ہوتے ہیں۔ لیکن اب وہ تنہائی اور ٹھوکروں کی زندگی سے تھک گیا تھا ــــ بیزار نہیں ہوا تھا۔ وقت پڑے تو وہ اب بھی ایک ادنیٰ سپاہی کی طرح اپنی خدمات پیش کرنے کو تیار تھا ـ لیکن دو سال کی جیل، خراب غذا، دن رات بیمار۔ مزدوروں کی قربت کی وجہ سے وہ تھک ضرور گیا تھا۔ اس نوکری نے اُسے دم لینے کی ذرا سی مہلت دی۔ اور قدرت نے اُسے ایک رفیق بھی عنایت کیا ۔ یہ رفیق یا رفیقۂ حیات اُس کی بیوی ناہید جہاں تھی۔ اس نے ایک متوسط طبقے کے بورژوا خاندان سے بغاوت کی تھی۔ تعلیم مکمل کئے بغیر چل کھڑی ہوئی تھی۔ آل انڈیا نرسس ایسوسی ایشن کی سرپرستی میں اس نے نرسنگ کی تربیت البتہ حاصل کر لی تھی اور اس کے سوا اسے لکھنے کا سلیقہ تھا۔ اردو افسانے اچھے خاصے لکھ لیتی تھی اور رسالوں سے کچھ نہ کچھ معاوضہ مل جاتا۔ افسانوں کے دو تین مجموعے بھی چھپ چکے تھے۔ جن سے یکمشت آمدنی ہو جاتی۔

صغیر سے ناہید جہاں کی ملاقات دہلی میں نئے ادیبوں کے ایک جلسے میں ہوئی۔ ناہید کا پہلا عاشق اُس سے الگ ہو چکا تھا اور اُس کی یادگار اُس کا پہلا بچہ اس زندگی سے، اب وہ تیس سال کی تھی، لیکن اب بھی اُس کے کندنی جسم پر زردی اور جھُریاں انہیں پھٹکنے نہ پائی تھیں۔ ہندوستانی لڑکیوں کے چہروں کی بے رونقی کے دو اسباب ہو کرتے ہیں۔ پہلے تو اس بے رونقی کا باعث تازہ اور صاف ہوا کی کمی تھی۔ بڑی حد تک یہ سبب اب بھی باقی ہے۔ لیکن ایک تھوڑی سی تعداد ایسی لڑکیوں کی بھی ہے ــــ خصوصاً بڑے شہروں میں ــــ جن کے نزدیک تازہ اور صاف ہوا کے استعمال کی واحد شکل یہ ہے کہ اُن کا چہرہ طرح طرح کے غازوں، لوشنوں، کریموں سے تھوپا اور رنگا جائے۔ تاکہ جب وہ ہوا کھانے نکلیں تو دائیں بائیں دونوں طرف چلنے والوں کے جنازے نکل جائیں جس پارٹی میں وہ جائیں وہاں آدھے نوجوان تو دیکھتے ہی بیہوش ہو جائیں۔ اور باقی آدھے جو بیہوش نہ ہوں وہ سجدے میں گر پڑیں۔ ناہید نے پچھلے سب سے بغاوت کی تھی، اور دوسرے سے احتیاط برتی تھی۔

صغیر کے چہرے پر البتہ زردی تھی۔ تھکن کی، زخمی سپاہی کے رخساروں کی زردی۔ زردی جو اُس کے دُبلے رخساروں سے ہو کر اُس کی مونچھوں تک چلی گئی تھی۔ اس دُبلے لانبے چہرے پر مونچھیں کتنی دلچسپ معلوم ہوتی تھیں۔ دلچسپ لیکن مضحکہ خیز نہیں۔ کیونکہ صغیر کی آنکھیں اگرچہ اندر دھنس گئی تھیں۔ اُن میں اب بھی کشش تھی۔ اب بھی ایک طرح کی جاذبیت تھی۔ اُس کے دُبلے لانبے چہرے کے خدوخال میں اب بھی تناسب تھا۔ اُس کا سینہ بھی اندر کو دھنس رہا تھا۔ مگر ناہید جانتی تھی اس کا علاج کتنا آسان ہے۔ حیاتین اے اور ڈی۔ اور سینہ کی مچھلیاں پھر اُبھر آئیں گی۔ اُسے خود اپنی تیس سال کی عمر کا احساس تھا۔ اُسے بھی رفاقت کی ضرورت تھی۔ اور چند ملاقاتوں کے بعد، چند روز ساتھ پھرنے کے بعد اُس نے صغیر کے لئے ایک طرح کی محبت محسوس کی۔ ایسی محبت جو والہانہ عشق کے مقابل اُنس سے زیادہ قریب تھی۔ ہمدردی، اُنس، رفاقت، دلسوزی انسانیت کی محبت ــــ اور اس طرح دونوں کی شادی ہو گئی۔ ناہید اپنے میاں کے ساتھ بمبئی گئی۔ جہاں اُسے ایک ہسپتال میں میٹرن کی جگہ مل گئی۔ اور اُس نے آہستہ آہستہ نرسوں کی تنظیم شروع کی۔

اُس روز صغیر نے اپنی کھادی کی شیروانی اتاری۔ کھادی کے کرتے اور پاجامے کو اُس نے بڑے چوکور آئینے میں دیکھا۔ جس میں ناہید جو لبوں پر سرخی نہیں لگاتی تھی، اپنے گداز، بھرے ہوئے جسم، چوڑے صحت مند سینے اور اُس پر سادہ یونیفارم کی بہار دیکھ لیا کرتی تھی۔ خصوصیت سے وہ اپنے بالوں کا تماشا دیکھتی جو اُس کے گھٹنوں تک پہنچتے تھے۔ اور صغیر کو ان بالوں سے عشق تھا۔ آئینے میں اپنے کھدر کے لباس کو دیکھ کر صغیر کو ذرا سی کوفت ہوئی۔ چند متناسب جسموں پر تو بے شک کھدر اچھے سے اچھے کپڑے سے زیادہ کھلتا ہے۔ ورنہ عموماً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی پتلے تپلے تکئے اور کسی گاؤ تکیہ پر کسی نے موٹا جھوٹا غلاف چڑھا دیا ہو۔

اُس کے لکھنے کے میز پر ایک چٹھی تھی۔ "میں مقبول کے ساتھ سینما دیکھنے جا رہی ہوں۔ ممکن ہے مجھے واپسی میں دیر ہو۔ نعمت خانے میں کچھ سینڈوچ اور بسکٹ رکھے ہیں۔ ناہید۔"

صفدر اس چٹھی کو پڑھ کے سکتے کے عالم میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اُس کا دماغ اچھی طرح سمجھ نہیں سکا۔ اُس کی متاہل زندگی میں یہ پہلی بار تھی کہ اُس کی بیوی، اُس کے کسی دوست کے ساتھ سینما دیکھنے گئی تھی۔ اور شاید تنہا۔ کم از کم مقبول دادر میں سیوا جی پارک کے قریب تنہا رہتا تھا۔ صفدر اپنے آپ سے حجت کرنے لگا۔ مجھے یہ فرض کر لینے کا کیا حق ہے کہ وہ مقبول کے ساتھ تنہا سینما گئی ہے۔ ممکن ہے اور بھی کئی لوگ ہوں۔

وہ اپنی میز پر بیٹھ کے کام کرنے لگا۔ آج کل وہ اس مبحث پر تحقیق کر رہا تھا کہ کیا مارکسیت مذہب کی غیر معاشی قدروں کو برداشت کر سکتی ہے۔ یہ شبہ اُس کے دل میں عرصے سے کھٹک رہا تھا کہ مارکس معاشیین کا نام فلسفیانہ اسلوب سے اچھی طرح مسلح نہیں تھا۔ مابعد الطبیعات پر اچھی طرح حاوی ہوئے بغیر فلسفے اور مذہب کو اُنہیں کے ہتھیاروں سے شکست دیئے بغیر مادیت ارتقاء بالضد کوئی باقاعدہ فلسفیانہ نظام نہیں بن سکتی۔ وہ عملی نظام بن جائے لیکن فلسفیانہ نظام نہیں بن سکتی۔ مارکس کے بہت سے عقیدتمندوں نے اس قسم کا شک محسوس کیا تھا۔ مثلاً بازارف، بوگدانوف، لونا چارسکی، برمن۔ ہل فونڈ، یوش کے وچ اور سُودرووف۔ انہی کے جواب میں لینن نے مادیت اور تجرباتی تنقید لکھی تھی۔ لیکن لینن کے دلائل سے صفدر کی تشفی نہیں ہو سکی تھی۔

وہ کام کرنے لگا۔ ساڑھے نو بجے۔ دس بجے۔ لیکن ناہید نہیں آئی۔ اب تک اُسے آجانا چاہیئے تھا۔ سینما زیادہ سے زیادہ ساڑھے آٹھ بجے ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ وہ لوگ فورٹ کے کسی سینما کو گئے ہوں۔ ممکن ہے بس ملنے میں دیر ہوئی ہو۔ اُس نے نعمت خانے سے سینڈوچ نکال کے کھائے۔ پھر کام کرنا چاہا۔ مگر ناہید کی ہنستی ہوئی صورت، اُس کے بھرے بھرے بادامی گال، اور سفید دانت، اُس کے چوڑے شانے، اُس کے جسم کی گرمی برابر حائل آ جاتے اوراق کو دھندلا کر دیتے۔ سطروں کا مطلب خبط کر دیتے۔ دماغ کی منطق سناد میں طرح طرح کے روڑے اٹکاتے۔ استدلال کے سامنے یکلخت اعصابی پہاڑ، جذباتی خندقیں پیدا کر دیتے۔ ایک خلا پیدا ہو جاتا اور دل میں ایک طرح کا درد سا ہونے لگتا۔

پھر گیارہ بجے دادر کی طرف سے اور فورٹ سے معلوم نہیں کتنی بسیں آئیں اور سامنے کی سڑک سے شور مچاتی گزر گئیں۔ اُس نے لینن کی کتاب اور اپنی نوٹ بک دونوں کو بند کیا اور ٹہلنے لگا۔ اب پہلی مرتبہ ایک عجیب طرح کا جذبہ اُبھرنے لگا۔ ایسا جذبہ جو اگر تکمیل کو پہنچے تو صدمہ کہلائے۔ لیکن اس ابتدائی درجے میں اُس کے لئے کوئی نام نہیں تھا۔ اس جذبے کے ساتھ ساتھ، اس کے متوازی ایک اور جذبہ تھا، خلجان کا سا۔ اس کا نام متعین تھا۔ شک۔

اُس نے سگریٹ سلگایا اور ٹہلنے لگا۔ سوچنے لگا کہ مجھے شک اور کسی قسم کے صدمے کا حق ہی کیا ہے۔ ناہید یا اُس کا جسم میری ملکیت تو ہے نہیں کیا اس جماعتی تمدن سے پہلے بربریت کے ... ری دور میں تمام عورتیں، تمام مردوں اور تمام مرد تمام عورتوں کی ملکیت نہیں ہوتے تھے۔ ممکن ہے یہی قانون فطرت ہو۔ ممکن ہے "جوڑے دار شادیاں" قانونِ فطرت کی خلاف ورزی ہوں۔ تمدن کی صبح کاذب کے ساتھ ساتھ تو یہ شادیاں وجود میں آئی ہیں۔ پہلے مائیں بہنیں حرام ہوئیں، پھر قبیلے کی عورتیں حرام ہوئیں۔ پھر ایک مرد اور ایک عورت کی جوڑے دار شادیاں ہونے لگیں۔

اور وہ سوچتا رہا۔ قانونِ فطرت، لیکن انسان کا کام تو فطرت کے قانون کی پابندی نہیں، اُس کی تسخیر ہے۔ ہل ... ٹریکٹر، دور بینیں اور خوردبینیں سب قانون فطرت توڑنے کے لئے ہیں۔ زمین اور زندگی اور ستاروں پر انسان کے حکم چلانے کے لئے ہیں۔

ناہید۔ ناہید۔ ناہید ابھی تک نہیں آئی اور مقبول یقیناً خوبصورت ہے۔ چھ فیٹ دس انچ قد پنجابی سرخ و سفید۔ لڑکیوں کی حد تک تو وہ اسم بامسمّٰی ہے۔ سب کی سب اُس پر کیسے مرتی ہیں۔

پھر دوسرا سگریٹ پہلے سگریٹ ہی سے جلا کے اُس نے سوچنا شروع کیا۔ ناہید اور مقبول۔ لیکن اِن جوڑے دار شادیوں میں صرف ایک شریک حیات کی پابندی عورتوں ہی پہ لازم قرار دی گئی۔ عصمت کا مطالبہ صرف اُن سے کیا گیا۔ رہ گیا یہ نظریہ کہ عصمت کی قید عورتوں نے خود اپنے اوپر عاید کی ہے۔ اس کے معاشی وجود کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ممکن ہے اس میں کچھ اصلیت نکلے۔ جب عورت اس قدر قربانی پر تیار ہو گئی تو مرد جو مویشیوں اور غلاموں کو اپنی خدمت اور مزدوری کے لئے استعمال کر رہا تھا۔ عورت کو بھی اپنی خادمہ کی طرح استعمال کرنے لگا۔ انسان قدیم کی سمجھ میں آگیا کہ بچے کی پیدائش میں باپ کا بھی کچھ حصہ ہوتا ہے۔ حقِ مادری اور قانونِ وراثت مادری کے خاتمے کے ساتھ ساتھ عورت کی جنس کو پوری معاشی اور عمرانی شکست ملی۔ کیا ناہید بھی میرا اس،

طرح کی باندی، اس طرح کی کنیز ہے۔ کیا اور سب آزادیوں کی طرح جنسی آزادی کا سوال خود بخود نہیں پیدا ہوتا۔ لاطینی لفظ "فیمولس" کے معنی گھریلو غلام کے ہیں اور فیمیلیا کے معنی غلاموں کی اُس کل تعداد کے ہیں۔ جو کسی ایک مرد کی ملکیت ہو۔ یہی لفظ فیمیلیا آج بھی اطالوی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

عورت کس لئے دوسرے مردوں کے پاس نہ جائے۔ اِسی لئے نا کہ وراثت پدری کی حد تک شک کا امکان باقی نہ رہے۔ میاں صغیر تمہارے پاس کونسا اثاثہ کونسی جائیداد ہے؟ رفتہ رفتہ عصمت کا یہ تخیل کم از کم مشرق میں اپنے معاشی پس منظر سے نکل کر مقصود بالذات بن گیا۔ عزت کو مال اور جان دونوں سے زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ ہم مشرقی ہمیشہ تصورات کے دیوانے رہے . . . از بام خانہ تا بہ ثریا از آنِ من۔ مشرقی مرد تو ہمیشہ بام خانہ سے ثریا تک علم کلام، جاہ جدلی، عزت نفس، عصمت تخیل کے ہوائی قلعے بناتے رہتے اور بام خانہ کے نیچے رہنے والی گھر والی کو انہوں نے ان خیالی محلوں کے پاس بھی نہ پھٹکنے دیا۔ امیر خسرو اپنی لڑکی کو دیوار کی طرف پُشت کرکے بیٹھے رہنے کی تعلیم دیتے رہے۔ کبھی کبھی مرد بھی ان ہوائی قصروں سے نیچے اُتر آتے۔ اور مردہ پرستی اور بہیمیت کے گندے دلدل میں ایسے غوطے لگاتے کہ حیرت ہوتی . . .

ابن یمین . . . اُس کا دیوان بڑی آب و تاب سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ صغیر اُس کے ورق الٹتا رہا اور صرف موعظت اور پند اور حق پرستی ہر ہر شعر سے ٹپکتا تھی۔ یہاں تک کہ وہ ایک غزل پر پہنچا۔ ایسی فحش غزل کہ میرزا کاظمی اور جعفر زٹلی شرما جائیں۔

ابن یمین کے دیوان سے اُس کے دماغ کی منطقی حرکت جو اُس کے جذباتی بے چینی سے برابر لڑ رہی تھی پھر اُسے گھریلو عورت کی طرف واپس لے آئی۔ اور صغیر نے سوچنا شروع کیا۔ قرون وسطیٰ بلکہ یونانِ قدیم کے ــــ اور پھر الف لیلا کے وہ دو مشہور ڈرامائی کردار۔ چالاک عاشق اور بیوقوف شوہر وہ ڈرامہ جس کو انیگلز نے بڑی خوبصورتی سے اس ایک جملے میں بیان کیا ہے۔ شوہروں نے بیویوں پر فتح پائی، لیکن ان شکست کھانے والیوں نے اپنی عالی ظرفی سے فاتحوں کے لئے تاج کا انتظام کر دیا . . . اور تاج؟ فرانسیسی اور سترہویں اور اٹھارویں صدی کے انگریزی ڈرامہ کا وہ سنگینوں کا تاج۔ سنگینوں کا تاج جو غریب شوہر کو تو نظر نہیں آتا۔ لیکن جسے اور سب دیکھ دیکھ کے ہنستے ہیں۔ سنگینوں کا تاج جس کے معنی یہ ہیں کہ اس بادشاہ کی ملکہ ہرجائی ہے۔ اِس بادشاہ کی ملکہ دوسرے سورماؤں کے جسم سے واقف ہے

اس رفتار تخیل سے ایک منٹ کے لئے منفی جذبۂ رشک ساری دماغی استدلال پر حاوی ہو گیا۔ آئینہ میں اُس نے اپنا چہرہ دیکھا جو لال ہو رہا تھا۔ اُس کے زرد چہرے کو لال ہونے کے مواقع بہت کم ملتے تھے۔ یہ سرخی زردی کی ضد نہیں، اُس کی انتہا تھی۔ آئینے میں اُسے اپنے سر پر کہیں سینگ نظر نہیں آتے۔ خدا کا شکر ہے۔ دُنیا، یہاں تک کہ ہندوستان۔ کم سے کم شہروں کا ہندوستان ــــ قرونِ وسطیٰ کو صدیوں پیچھے چھوڑ آیا تھے۔ ورنہ سینگوں کا اُگ آنا کچھ عجیب بات نہ ہوتی۔ اب ہنسنے والوں کے حربے دوسرے ہیں۔ زیادہ تر تو پیٹھ پیچھے بھونڈا مذاق کرکے، جس میں جنسی فعل کی طرف بازاری اصطلاح میں اشارہ ہوتا ہے۔ ہنس لیتے ہیں اور معاملہ رفت گزشت ہو جاتا ہے۔ بعض فدا بیدردی سے بدنصیب شوہر کے سامنے بھی ذکر کر دیتے ہیں۔ لیکن صاف صاف نہیں، اشارتاً اور طنزاً۔ اور اس امر سے بالکل مطمئن کہ اُن کے اپنے گھر محفوظ ہیں۔ فدا مسخرے اپنے گھروں کی تو نبض دیکھیں۔

لیکن اسی درمیان میں انسان نے جنسی تعلق میں ایک ایسا ارتقائی جذبہ تخلیق کیا ہے۔ جسے کوئی اور حیوان نہیں جانتا۔ عشق کا جذبہ، والہانہ کشش کا جذبہ، ایک دوسرے کے لئے مکمل قربانی اور کامل ایثار کا جذبہ۔ اگر اُس کی اور ناہید کی شادی کی تہ میں یہ جذبہ کسی نہ کسی طرح پیدا ہو چکا ہے۔ تو دونوں فریقوں پر عصمت واجب آتی ہے۔ تب تو وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے ہیں اور دونوں میں سے کوئی کسی اور کے لئے نہیں . . .

سینما کے بعد مقبول کے فلیٹ میں وہ انتظار کرتی رہی۔ یعنی اُس کا تحت الشعور انتظار کرتا رہا کہ وہ حسین نوجوان اُس کے سامنے صوفے پر بیٹھا ہے۔ اب اُس کا ہاتھ اُس کے جسم سے مس کر دے گا۔ اب اُس کے لب، اُس کے اپنے لبوں کو طلب کریں گے اور ناہید خود اپنے آپ کو کوئی جواب نہ دے سکی، کوئی فیصلہ نہ کر سکی کہ اگر ہاتھ بڑھیں یا لب قریب آئیں تو وہ مزاحمت کرے یا نہیں، اور مزاحمت کرے تو کس قدر۔ وہ خود تو جانتی نہ تھی۔ شاید عین وقت پر وہ تصفیہ کر سکتی۔ کھانے کے بعد اس تنہائی میں اور سب طرح کی باتیں ہوئیں۔ کاغذ کے کارخانوں کے مزدوروں کی انجمن کے متعلق جس میں مقبول کام

کر رہا تھا۔ دونوں کی زندگی کے متعلق۔ جنگ اور جدید ادب پر تبصرے ہوئے۔ کچھ شتبہ مذاق بھی ہوا اور مقبول نے ناہید کے حُسن کی تعریف بھی کی۔ لیکن عاشق کی تشنگی یا بے قراری کی کوشش کی تو صرف آنکھوں میں۔

اور آنکھوں کا باہمی ربط ناقص سا تھا۔ ایک طرح کی جنسی کشش موجود تھی۔ لیکن نگاہوں کا رابطہ جذب مطلق کا ربط نہیں تھا۔ مقبول کو اپنے دوست کا، اور ناہید کو اپنے شوہر کا لحاظ تھا۔ اور یہ لحاظ نہ بھی ہوتا، تب بھی نگاہوں میں صرف گُلگُنی سی گرمی تھی، آگ نہ تھی اور بجلی کا تو کہیں دور دور پتہ نہ تھا۔ اس لئے نہ ہاتھوں نے ربط قائم کرنے کی کوشش کی، نہ لبوں نے۔

مگر نگاہوں کی یہ ہلکی سی کشش کیا تھی؛ اور اس سے عارضی لطف کیوں حاصل ہوا؛ یہ سوال ناہید نے مقبول کے فلیٹ سے واپس ہوتے ہوئے سوچا۔ غالباً اس قسم کی خفیف سی جنسی کشش جو جسمانی ربط کی طلبگار رہتی ایک طرح کا نفسیاتی سیفٹی والو ہے۔ ایک مرد سے والہانہ عشق کے بعد جذبات کی سیرابی۔ دل کی خفیہ تمنائیں نکالنے کا ایک بے خطر ذریعہ۔ شاید اسی لئے مغربی تمدن کا حکم ہے کہ بیویاں اپنے شوہروں کے ساتھ رقص نہ کریں۔ دوسروں کے ساتھ ناچیں۔ اور دعوتوں کے میزوں پر اپنے شوہر کے ساتھ نہ بیٹھیں دوسرے مردوں کے پاس بیٹھیں۔ انہی رعایتوں سے شاید یورپ نے ازدواجی زندگی کی عصمت کو کامیاب بنانا چاہا۔ مطلق العنانی حکمرانی کے سوا یہی ایک صورت تھی۔

اب ساڑھے گیارہ ہو چکے تھے۔ وہ بس سے اُتر کر سیڑھیاں چڑھنے لگی تو پیچھے سے یہ خیال اُسے پریشان کرنے لگا کہ کہیں صغیر کو شک نہ ہو۔ کہیں وہ کچھ اور نہ سمجھ رہا ہو۔ اس کے بعد پھر عشقیہ ازدواجی زندگی میں ایک کانٹا سا کھٹکنے لگے گا۔ اسی لئے شاید عورتوں نے شروع شروع میں عصمت کو اپنے اوپر لازم گردانا تھا۔ پھر ناہید کو تعجب ہوا کہ کیوں وہ خود صغیر کے سامنے اپنی برأت پیش کرنا چاہتی ہے۔ اُسے یقین دلانا چاہتی ہے کہ وہ معصوم ہے اور وہ صرف اُسی کو چاہتی ہے۔ آخر وہ اُس کی ملکیت تو نہیں۔

اور صغیر نے زینوں پر اس کے قدموں کی چاپ پہچانی۔ دروازہ کھولا وہ ہنستی ہوئی کھڑی آنکھیں، اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے کچھ کہنا ہی چاہتی تھیں کہ وہ گداز گورے ہاتھ بڑھے اور ان ہاتھوں نے اس کے جسم کو گھیر لیا، وہ گداز نازک لبوں نے اُس کے لبوں پر مہر لگا دی اور یہ بوسہ یہ لمس اتنا سچا، اتنا والہانہ تھا کہ فریقین میں سے کسی کو نہ کچھ پوچھنے کی ضرورت رہی۔ نہ جواب دینے کی۔

"پیارے تم نے وہ سینڈوچ کھائے۔ جلدی میں تمہارے لئے میں اور کچھ نہ بنا سکی۔ کہو تو ابھی انڈوں کا خاگینہ تل دوں۔"

تب وی تال نے پوچھا "مہاراج آپ بتائیے اِن تینوں میں سب سے زیادہ فراخدل اور فیاض کون تھا؛ مقبول جس نے اپنے دوست کا لحاظ کیا، یا صغیر جس نے عورت کی ذات اور اُس کے حق کا لحاظ کیا۔"

مہاراج تری وی کرم سین نے کہا "ویتال! اس عجیب آنے والے زمانے کے لحاظ سے میں بھلا کیا تصفیہ کر سکتا ہوں کیونکہ تو کہتا ہے کہ اُس عجیب زمانے میں کشتیاں مچھلیوں کی طرح پانی کے اندر چلیں گی۔ اور مکان ہوا میں پنچھیوں کی طرح اُڑیں گے۔ اور لوہے کی نلیوں میں سے آگ نکلے گی۔ لیکن اس آگ کی بھٹی سے پگھل کر نکلنے کے بعد اگر انسان سچ مچ کھرا سونا بن جائے۔ اور ایسا واقعہ جیسا تو بیان کرتا ہے پیش آئے تو میں تو یہ کہوں گا کہ صغیر، ناہید اور مقبول تینوں برابر فیاض تھے۔ یا یہ کہ ان میں سے کوئی خاص طور پر فیاض اور فراخدل نہ تھا۔ ہر ایک اپنا اور دوسرے کا حق جانتا تھا۔ اور دل اور جسم کی محبت میں امتیاز کر سکتا تھا۔ ان دونوں کے فرق کو سمجھتا تھا۔"

"جے مہاراج کی" ویتال نے کہا اور خاموش ہو گیا۔

بلونت سنگھ

لمس

آدھی رات کے بعد گیدڑوں نے "ہُوا ہُو" کا شور مچانا شروع کیا تو کیا مجال رات بھر ایک لمحہ کو بھی زینب کی آنکھ لگی ہو۔ اسے اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں پہلے کی طرح ان کی کوئی مرغی نہ چھوٹی ہو جائے۔ وہ انگریزی مرغی کھو کر اس کے دل کو کس قدر افسوس ہوا تھا۔ مرغیاں باہر ڈربے میں بند رہتی تھیں۔ اندر جگہ نہیں تھی۔ . . . تاریک اور خاموش رات میں مرغی کی ذرا سی آواز بھی سنائی دیتی تو وہ کولہوں پہ ہاتھ رکھ کر ڈربے کی طرف چل دیتی۔

رات بھر جاگنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ صبح جب وہ بستر سے اٹھی تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس کا گھر چھوٹے سے قصبے کے ایک سرے پر تھا۔ کرایہ کا مکان بھی نہ تھا کہ بدل لیا جاتا۔ اپنا مکان بنوایا گیا تھا۔ ہر چند مکان میں جگہ بہت تنگ تھی۔ اور ان کا کنبہ مکان کی مناسبت سے بڑا ہی تھا۔ لیکن اس میں گزارا کرنا لازمی تھا۔

اس کا خیال تھا کہ آج وہ دن بھر کے کام دھندوں سے وقت نکال کر جی بھر کر سوئے گی۔ اس کا شوہر بڑی نہر پہ ٹھیکیداری کا کام کرتا تھا۔ گھر سے دو دو روز بلکہ اس سے بھی زیادہ غائب رہتا اور جب کبھی گھر آتا بھی تو ہوا کے گھوڑے پر سوار۔ ادھر آیا، اُدھر گھر کے سامان کو اوپر تلے کیا۔ کبھی بچوں سے پیار اور کبھی اس سے . . . اور پھر سائیکل اٹھائی اور غائب۔

سورج نکل آیا تھا۔ وہ چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گئی اپنی سوجی ہوئی آنکھوں کو ملنے لگی۔ اور تو اور آج اس کا چھ سالہ حنیف بھی اس سے پہلے جاگ اُٹھا تھا۔ شاید وہ رو دیا ہو اس نے اسے جگانے کی کوشش بھی کی ہو۔ لیکن اس کی سیانی بیٹی روشنک اگرچہ ابھی گیارہ سال کی بچی ہی تھی۔ لیکن ان معاملات میں بہت سمجھدار تھی۔ اس نے بھیا کا دل پرچائے رکھا ہوگا تبھی تو بیچارا معصوم بچہ فرش ہی پر پھسکڑا مارے میٹھا بسکٹ کے خالی ڈبے میں گتے کے پہیے لگا کر گاڑی بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور روشنک اپنے بھیا کے قریب ہی بچھی ہوئی چٹائی پر پیٹ کے بل لیٹی کہہ رہی تھی سے میز پوشش کی جھالر بن رہی تھی۔ جب سے اس کا ایک لڑکا فوت ہوا تھا اسے اپنے بچوں سے اور بھی زیادہ محبت ہو گئی تھی۔

یوں بھی اُس کی آنکھیں خراب ہی تھیں۔ گرمیوں میں تو تھوڑی بہت سرخی اس کی آنکھوں میں ضرور دکھائی دیتی تھی۔ بعض اوقات دکھنے بھی لگتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ صبح اُٹھ کر پہلے وہ دوپٹے کے آنچل سے آنکھوں کے کیچل کو صاف کرتی تھی۔ اور آج وہ اپنی آنکھوں کو اچھی طرح صاف بھی نہ کر پائی تھی کہ ماں کا محبت بھرا دل اُمڈ آیا۔ "اللہ خیر . . . میں واری جاؤں۔" کہتی ہوئی وہ چارپائی سے اُٹھ بیٹھی اور اپنے بچوں کو باری باری اس نے خوب سا پیار کیا۔ آج اسے اپنے بچے بہت ہی پیارے دکھائی دے رہے تھے۔

سب سے پہلے اسے دہی بلونا تھا۔ سکھڑ عورتیں دہی بلونے کا کام تو تاروں کی چھاؤں ہی میں کر لیتی تھیں وہ خود بھی اس طرح کیا کرتی تھی۔ لیکن آج اسے دیر ہو گئی تھی۔ چنانچہ جب دہی کی مٹکی کے قریب پیڑھی پر بیٹھی تو دل کو وہ اطمینان حاصل نہ تھا۔ اور پھر اب حنیف بھی اس کے گلے کا ہار ہو رہا تھا۔ بچے کو نہار منہ باسی روٹی پر مکھن رکھ کر کھانے کی عادت تھی۔ آج اتنی دیر ہو گئی تھی کہ بچارے سے بھوک برداشت نہ ہوتی تھی۔ وہ اسے پیار کر کے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ تھا کہ بس ٹھنکے جاتا تھا . . . وہ عجب مصیبت میں گرفتار تھی۔ . . . ابھی کل تک اس کے گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے۔ نہ معلوم کہاں کے رشتے دار آن ٹپکتے ہیں اگر کسی کے گھر میں قیام کرنا ہو تو یونہی دور کی رشتہ داریاں قائم کر کے انتہائی ڈھٹائی سے پاؤں جما دیتے ہیں۔ اپنے دکھ سکھ میں ان کی صورت دکھائی تک نہیں دیتی یوں بھی چلے آئیں تو خیر لیکن وہ اپنے بیمار عزیزوں کو بھی اُٹھا لاتے ہیں۔ ایک دن پہلے جو مہمان رخصت ہوئے تھے وہ بھی اپنی ایک چھوٹی سی بیمار بچی کو علاج کی غرض سے لے آئے تھے۔ اور پھر ان کا ہر قسم کا خرچ یہاں تک کہ ڈاکٹر کی فیس اور دواؤں کی قیمت بھی انہیں کے سر پڑی۔ اور اس پر قیامت یہ کہ ڈاکٹر نے جواب بھی دے دیا کہ لڑکی کا جانبر ہونا محال ہے۔ لیکن وہ لوگ اس وقت تک ان کے گھر سے نہیں ٹلے جب تک اُن کی بچی مر نہیں گئی۔ اندر والے جس کمرے میں بچی مری تھی۔ وہ اس کے فرش کو دھو ڈالنا چاہتی تھی۔ بلکہ وہ اس پلنگ کی نواڑ کو بھی دھلوا لینا چاہتی تھی۔ جس پر بیمار لڑکی پڑی رہتی تھی۔ ان جب باتوں

کرسو کر اسے عجب کراہت سی محسوس ہونے لگی۔ . . . اللہ ہی سب کا مالک ہے۔ . . لیکن اوروں کے گھروں میں جا کر مرنا تمہی ہی کی بات تو ہے . . . ان سب کاموں کے لئے بہت زیادہ وقت درکار تھا۔ ادھر حنیف تھا کہ بس روئے جا رہا تھا۔ . . . پہلے تو چمکارتی پچکارتی رہی آخر زچ ہو کر اس نے ننھے کا ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ بہن اسے اٹھا کر پرے لے گئی پھر وہ دودھ بلونے لگی اور بچے کی چیخوں کی آواز سن کر دوپٹے کے آنچل سے اپنے ہی آنسو پونچھنے لگی۔

خدا خدا کر کے دودھ بلویا ــــــ مکھن نکال کر لکڑی کے چوڑے دہانے والے برتن میں رکھا اور پھر آپ ہی آپ اس کی نظر اوپر اُٹھ گئی۔ اس جگہ کوّے بھی بہت زیادہ تھے۔ ہر وقت ان کی جھپٹوں کا ڈر لگا رہتا تھا چنانچہ اس نے چھت پر صحن کے آر پار بان کی رسیاں باندھ رکھی تھیں۔ . . . لیکن اب اُس نے دیکھا کہ بچوں نے رسیاں کاٹ ڈالی تھیں۔ اس طرح کام میں سے کام نکل آتا تھا۔ اور ہر ادھورے کام کو دیکھ کر اس کا دل پریشان سا ہونے لگتا تھا۔ وہ یہ سوچ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھی کہ ساتھ والے مکان سے بوڑھی جلاہی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ اُوپر پہنچی تو معلوم ہوا کہ منڈیر پر رکھا ہوا اُپلا پچھواڑے رہنے والے جلاہوں کے گھر میں جا پڑا تھا۔ سڑیل مزاج دادی بجے جا رہی تھی اور بیچاری روشنک دم بخود کھڑی تھی۔

اتفاق کی بات حنیف کا ہاتھ لگنے سے ایک ہلکا پھلکا اپلا اُن کے صحن میں جا گرا تو کونسا قہر آگیا۔ کوئی اینٹ پتھر تو نہیں کہ کسی کا سر پھٹ جاتا۔ . . . لیکن بڑھیا مفت میں اس قدر تڑخ گئی تھی۔ اس پر اسے بھی غصہ آگیا اور اس نے بھی کھری کھری سنا ڈالیں۔ ادھر سے بڑھیا کی بہو بھی ساس کی حمایت میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگی۔ اس پر اسے اور طیش آیا۔ پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر اس قدر چیخی اور چلائی کہ گلا بیٹھ گیا بڑی مشکل سے جا کر کہیں امن قائم ہوا . . اور وہ رسیاں باندھ کر نیچے آئی۔

روشنک کے اسکول جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ حنیف کی عادت تھی کہ وہ بھی بہن کے ساتھ ضرور جاتا تھا۔ عام طور پر بچے اسکول جانے سے کتراتے ہیں۔ حنیف پڑھائی کے قابل تو نہ تھا لیکن وہاں بچوں کے ساتھ کھیلنے کا شوق تو کھینچ لے جاتا تھا۔ اس نے جلدی سے توا چولہے پر رکھا۔ تاکہ بچوں کو کھلا پلا کر اسکول بھیجے اور بعد میں وہ باقی کاموں سے بھی نپٹ لے۔ پراٹھے پکتا اور کھانا کھلاتے وقت بھی حنیف تھوڑی بہت چھین جھپٹ کرتا رہا۔ بہنیں بیچاری نیک ہی ہوتی ہیں۔ بھائیوں کی زیادتیاں چُپ چاپ برداشت کر لیتی ہیں اِدھر وہ خود بھی چُپ تھی۔ حالانکہ حنیف کی چیخوں سے کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ لیکن وہ اس خیال سے دل پر جبر کئے رہی کہ اب اگر اس نے بچے پر ہاتھ اٹھایا تو مفت میں گھنٹہ بھر بڑبڑاتا رہے گا۔ کھانا کھا کر اسکول تو چلا ہی جائے گا۔

ابھی بچے تیار ہو ہی رہے تھے کہ نینو کمہارن چھم چھم کرتی آن پہنچی۔

نینو کمہارن قریب کے گاؤں میں رہتی تھی۔ ہفتے میں دو تین مرتبہ اپنے خاوند کے ساتھ گدھوں پر برتن لاد کر منڈی بیچنے جاتی اور جب لوٹتی تو اس کا خاوند تو گدھے ہانکتا ہوا اپنے سیل پرے گاؤں کو چلا جاتا لیکن وہ ان کے ہاں ضرور رک جاتی۔ وہ نئی نویلی دلہن تھی ابھی لال جوڑا بھی نہ اُترا تھا۔ شادی سے پہلے اگرچہ ہاتھ پاؤں کی مضبوط تھی لیکن اس کا جسم کمزور تھا مگر شادی ہوتے ہی معلوم اس پر کیا جادو ہو گیا کہ روز بروز اس کے جوبن میں چار چاند لگتے جا رہے تھے۔ گلے پھول رہے تھے۔ ان پر سرخی جھلک مارتی تھی۔ سارا جسم بھر گیا تھا۔ سانولا سلونا رنگ ایسا نکھرا کہ اب نیا ہی روپ نکل آیا تھا اور ادھر وہ خود تھی کہ شادی سے پہلے تو وہ اچھی موٹی تازی تھی۔ کیسے بھرے بھرے بازو اور کیا کاٹھ تھی اس کی۔ لیکن شادی کے بعد وہ روز بروز گھلنے لگی۔ کوئی ایسی فکر بھی نہ تھی۔ کھانے پینے کو خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ لیکن گال تھے کہ پچکے جا رہے تھے۔ آنکھوں کے نیچے گڑھے تھے کہ گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ جسم تھا کہ اس میں بھرتی نام کو نہ رہی تھی۔

جب نینو چھم سے ان کے صحن میں داخل ہوئی تو سونی سونی فضا میں رونق دکھائی دینے لگی اور حنیف کا ایک پاؤں تو پانی کے پاتے میں تھا اور ایک باہر کہ وہ اسے دیکھتے ہی جیسے رسّی تڑا کر بھاگا اور دوسرے لمحہ میں نینو کی گود میں تھا۔

نینو کی طبیعت کچھ ایسی تھی کہ کیا بچہ اور کیا بوڑھا جس نے ایک مرتبہ اس سے بات کر لی بس اسی کا ہو رہا۔ ہنسی تھی کہ پھوٹی پڑتی تھی۔ باتیں تھیں کہ پھول جھڑتے تھے۔ صورت تھی کہ دل میں کھبی جاتی تھی۔ . . . انسان اس کی موہنی صورت بس دیکھا کرے۔ خدوخال تو خیر معمولی ہی تھے۔ لیکن چہرے کی رنگت اور صحت ایسی کہ بس جی ہی نہیں بھرتا تھا۔

اگر کبھی مصروف ہوتی اور ایسے میں کوئی ملنے کے لئے آجاتا تو دل میں بُرا مان جاتی تھی۔ ہزار کوشش کرنے کے باوجود سیدھے منہ بات نہ کر پاتی تھی۔ لیکن نینو کی آنکھوں میں نہ معلوم کیا جادو تھا کہ وہ جب بھی پہنچ جائے۔ اسے اس کی آمد پر ہمیشہ دلی مسرت ہوتی تھی۔ نینو نہ صرف صورت اور سیرت ہی کی اچھی تھی بلکہ وہ تھی بھی چلبلی اور کام کرنے والی۔ . . جب آتی کاموں میں ہاتھ بٹاتی۔ ذرہ برابر بھی تکلف نہ کرتی۔ اس لئے اس کا آنا مبارک ہی ہوتا تھا۔

روشنک اسکول کو چلدی۔ حنیف ہٹ کر بیٹھا۔ نینو آئی ہوئی تھی اسے نینو سے بہت محبت تھی۔ بھلا وہ نینو کو چھوڑ کر اسکول کیوں جانے لگا۔ چنانچہ وہ نینو کی گود میں بیٹھا رہا۔ . . نینو کی شادی ہو چکی تھی لیکن اس کا لڑکپن نہ گیا تھا۔ اسے اس قسم کے کئی چھوٹے موٹے طریقے یاد تھے۔ جن سے وہ حنیف کو ہنسا کر خوش کر سکتی تھی . . . زینب نے سوچا چلو اگر نینو گھر کے کاموں میں اس کا ہاتھ نہ بھی بٹائے اور محض حنیف کا دل بہلائے رکھے تو بھی اسے کام کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔ . . . لیکن نینو کی باتوں سے معلوم ہو گیا کہ آج وہ زیادہ دیر تک نہ رُکے گی۔ اس کا خاوند قصبے میں کسی دوست سے ملنے کے لئے گیا تھا۔ اس لئے وہ ادہر چلی آئی۔

اور واقعی تھوڑی دیر بعد نینو کے خاوند کی آواز سنائی دی اور نینو اس بات پر اظہار تاسف کرتی ہوئی رخصت ہو گئی کہ آج زیادہ دیر بیٹھنے کا موقع نہ ملا حنیف نینو کے گلے سے لپٹا ہوا باہر تک گیا اور پھر گدھے کی سواری کرنے کے بعد بڑی مشکل سے کہیں واپس آیا۔ . . . اور واپس آتے ہی لگا ماں کا آنچل تھام کر ٹھنٹھنانے۔ . . . ماں جس طرف جاتی وہ روتا ہوا اس کے ساتھ ہو لیتا —— اس مرتبہ نینو کی آمد سے وہ گھاٹے میں رہی۔ اگر وہ نہ آتی تو کم از کم حنیف اسکول کو سدھارتا اور وہ مزے سے سارے کاموں سے نپٹ لیتی۔

باہر گونی میراسن کی بلند آواز سنائی دے رہی تھی۔ گونی بھی عجب باتونی عورت تھی۔ ادہر صبح ہوئی ادہر وہ آنچل سنبھالتی ہوئی گھر سے نکلی اور لٹو کی طرح سارے قصبے میں گھوم گئی . . . وہ عورت کیا تھی چلتا پھرتا اخبار تھی۔ اسے دیکھ کر عورتیں آٹے یا گوبر میں سنے ہوئے ہاتھ پھیلاتے اپنے اپنے گھر سے باہر آن کھڑی ہوتیں اور پھر گونی ناک پر انگلی رکھ کر اور بھنووں کو جنبش دے کر جو کوئی داستان چھیڑ دیتی تو بس اللہ دے اور بندہ لے، سننے والے کے کان پک جائیں لیکن خدا کی بندی کی زبان کو لگام کون دے۔ . . . اس کی آواز سنتے ہی زینب نے سوچا کہ کیوں نہ حنیف کو اس کے ہمراہ اسکول بھیج دے۔ لیکن گونی کو اندر بلانا ایک نئی مصیبت کو دعوت دینا تھا۔ . . . . اور وہی بات ہوئی گونی اندر آئی اور اس نے ابھی قصبے کی اسٹاپ پریس خبریں ہی سنائی تھیں کہ زینب کے سر میں درد ہونے لگا۔ یک نہ شد دو شد۔ . . . کسی نہ کسی طرح اس نے حنیف کو گونی کے ساتھ روانہ کر کے آئی بلا ٹالی۔ لیکن گونی کے چلے جانے کے بعد وہ اس قدر تھک گئی کہ دم لینے کے لئے پیڑہی پر بیٹھ گئی۔

اس کا دل اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ سر چکرا رہا تھا۔ دماغ پر غنودگی طاری تھی۔ جسم ٹوٹ رہا تھا۔ گونی نے آج ایک خبر کو بڑی اہمیت دی تھی۔ ان کے مکان سے تقریباً پچاس قدم پرے ایک بہت بڑی حویلی تھی۔ جس کی اوپر والی منزل پر ایک چوڑی والا اپنے کنبے سمیت رہتا تھا۔ چوڑی والے کی بیوی بہت طرح دار اور بانکی تھی۔ پہلے پہل اس نے اسے پڑوس والوں کے ہاں کسی شادی کے موقعہ پر دیکھا تھا۔ بیگاں اس کا نام تھا۔ کیا موہنی صورت پائی تھی اس نے۔ اور ادہر اس کا خاوند تھا۔ کچھ عجیب سی صورت تھی اس شخص کی۔ بدصورت نہ سہی لیکن اس کی شخصیت میں ذرہ برابر بھی کشش نہ تھی۔ لیکن عورت ہزاروں میں ایک تھی۔ اس رات شادی کے موقعہ پر عورتوں نے مل جل کر سوانگ رچایا۔ بیگاں نے مرد کا سوانگ بھرا۔ کیسی بے ڈول سی پگڑی باندھے اور ہاتھ میں موٹا سا سونٹا لئے وہ اینٹھتی ہوئی آگے بڑھی۔ ساس کی مصنوعی مونچھیں دوات کی روشنائی سے لکیریں کھینچ کر بنائی گئی تھیں جو بہت مضحکہ خیز نظر آ رہی تھیں۔ اور پھر اس کی چھاتیوں کا ابھار۔ مرد کا سوانگ اور بھی زیادہ مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ بھلا گونی میراسن سے چُپ کہاں رہا جاتا۔ ہانک لگائی۔ "حضور والا! پہلے انہیں تو سنبھالئے۔" عورتوں کی اس بے تکلف مجلس میں اس بات پر وہ قہقہے بلند ہوئے کہ دوہری ہو ہو گئیں۔

ان دنوں وہ لوگ قصبے میں نئے نئے آئے تھے۔ بیگاں کی بے تکلفی کو اس کے اطوار پر محمول کیا گیا۔ لیکن رفتہ رفتہ کئی قسم کی افواہیں اُڑنے لگیں چھوٹے سے قصبے میں اس قسم کی چٹپٹی باتیں چھپی ڈھکی رہ ہی نہ سکتی تھیں۔

خود اس نے دو تین مرتبہ غیر مردوں کو ان کے گھر میں گھستے ہوئے دیکھا تھا۔ زینب اللہ کے عذاب سے ڈرنے والی عورت تھی۔ وہ ان باتوں پر یقین ہی نہ کر سکتی تھی۔ کیونکہ یہ بھی عین ممکن تھا کہ جو غیر مرد وہاں آتے ہوں وہ اس کے خاوند کے دوست ہوں۔ لیکن ایک روز گرمیوں کی دوپہر کو تو اسے اس بات

کا یقین کیا ہی تھا۔ . . . اس دن گھر پر کوئی نہ تھا۔ گرمیوں کے موسم میں وہ عموماً پچھلے کمرے میں گھسی رہتی تھی۔ کیونکہ یہ کمرہ نسبتاً سرد تھا اور وہاں سورج کی کرنیں سیدھی نہ پڑتی تھیں۔ وہ کسی کام سے اُٹھ کر باہر والے کمرے میں آئی کہ اتفاق سے اس کی نظر اُٹھی اور بیگاں کے مکان پر جم گئی۔ بیگاں کا خاوند دن بھر چوڑیاں بیچا کرتا تھا اور وہ خود گھر پر تنہا ہوتی تھی۔ ایسے وقت میں کسی مرد کا آنا شک سے خالی نہ ہو سکتا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا! اس دن بیگاں نے بال دھو کر بکھیر رکھے تھے۔ چست قمیص پہن رکھی تھی۔ . . . اور پھر کھڑکی میں سے کسی مرد کا جھپٹ کر بڑھتا ہوا ہاتھ دکھائی دیا۔ بیگاں قلانچ بھر کر ہنستی ہوئی پیچھے چلی گئی اور اس کی رنگین چندیا مرد کے ہاتھ میں رہ گئی۔ اس وقت بیگاں کے لمبے اور گھنے بال کیسے لہرائے تھے . . . اور پھر بیگاں نے اپنے گھر کی کھلی کھڑکی بند کر دی . . . اور آج گوری نے نئی خبر سنائی تھی۔ کہ کل رات بیگاں نئے تھانیدار اربازخاں کے ہاں پہنچی ہوئی تھی۔ گوری نے کیسے گال پر انگلی رکھ کر کس قدر پُراسرار انداز میں یہ واقعہ بیان کیا۔ نیا تھانیدار دو ایک مرتبہ ان کے گھر کے آگے سے گزرا تھا۔ وہ ہٹا کٹا لمبا چوڑا طرے باز شخص تھا . . . کیا ان عورتوں کو خدا کا بھی کچھ خوف نہیں اور دوزخ میں حرام کار عورتوں کو جو عبرتناک سزائیں دی جائیں گی . . . پھر وہ اپنے ذہن پر زور دے کر سوچنے لگی کہ فاحشہ عورتوں کو مرنے کے بعد کون کونسی اذیتیں دی جائیں گی۔

اب تو ایک بجنے کو تھا۔ وہ یونہی بیکار وقت گنوا رہی تھی۔ اس نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اور ان پہ زور دے کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اندر والے کمرے میں گئی اور پھیلے ہوئے سامان پر نگاہ ڈالی۔ چارپائیاں الٹی سیدھی کھڑی یا بچھی تھیں۔ بڑے پلنگ کے پایوں کے نیچے رکھی ہوئی اینٹیں ادھر ادھر کھسک گئی تھیں۔ کھونٹی پر لٹکا ہوا بڑا ترازو ایک طرف کو لٹک گیا تھا اور اس کے اوپر تلے رکھے ہوئے پلڑوں پر پڑے ہوئے لوہے کے باٹ کھسک کر نیچے گرنے ہی کو تھے۔ وہ رضائیاں اور گدے جو جگہ کی کمی کی وجہ سے چھت پر لگے ہوئے کنڈوں میں اڑا دیئے گئے تھے۔ ان پر دو دو اُنگل گرد جمی ہوئی تھی۔ مکڑیوں کے لمبے چوڑے جالے ادھر اُدھر کونوں میں لہلہا رہے تھے۔ اس کے دل کا بوجھ اور بھی بڑھ گیا۔ یہ سب کام کرنا تھا۔ اس نے بے دلی سے بانس کے سرے پر جھاڑو باندھی اور جالے صاف کرنے کے لئے اسے اُٹھایا۔ ادھر اتفاق سے اس نے پلنگ کا سہارا لیا تو اس کے پایوں تلے سے اینٹیں کھسک گئیں اور پلنگ دھم سے زمین پر آن رہا۔ اوپر سے روشنک کے کھلونوں کا ٹرنک کھسک کر گر پڑا اور کھلونے ادھر اُدھر بکھر گئے۔ اسی گڑبڑ میں بانس ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور باٹ فرش پر لڑھک گئے۔ اسی افراتفری میں اس نے زور سے بانس پیچھے ہٹایا تو وہ چھت پر لٹکی ہوئی رضائیوں سے جا ٹکرایا۔ وہ بھی جیسے اشارے کی منتظر تھیں دھما دھم اس کے سر پر گرنے لگیں . . . ایک مرتبہ تو یوں معلوم ہوا جیسے کمرے میں زلزلہ آگیا ہو . . . اور جب یہ ہنگامہ ختم ہوا تو کمرے کی حالت اور بھی ابتر دکھائی دینے لگی۔ اب کام اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اس نے چڑچڑے پن سے بانس پرے پھینک دیا۔ اور خود زور زور سے پاؤں مارتی ہوئی باہر والے کمرے میں چلی آئی۔

صبح ہی سے اس کی طبیعت مضمحل سی تھی۔ آج بسم اللہ ہی لڑائی سے ہوئی تھی۔ اس نے دوپٹہ اتارا۔ پسینہ پونچھا۔ دوپٹے کو رسی پر اُچھال دیا۔ اور پھر گردن سے قمیص اُٹھا کر دستی پنکھے سے ہوا کرنے لگی۔

کھڑکی میں سے سامنے کے مکانات کا ختم ہوتا ہوا سلسلہ دکھائی دے رہا تھا۔ صابن اور میل والا پانی بہہ کر کچی سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ نیچے کی منزل والے غریب لوگوں کی کھٹمل بھری چارپائیاں دھوپ میں پڑی تھیں اور ان کے غلیظ کپڑے ہوا میں لہرا رہے تھے . . . اُوپر کی منزل پر کھڑکی میں سے بیگاں سر باہر نکالے کھڑی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہی تھی۔ تیز چمکتی ہوئی دھوپ میں اس کا چہرہ کس قدر حسین دکھائی دے رہا تھا۔ موئی حرام کار، روز بروز موٹی ہوتی جا رہی تھی اور گالوں کی سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔ کیسی صاف شفاف سرمگیں آنکھیں تھیں اس کی . . . ہونٹ کیسے ترشے ہوئے تھے . . . اس کے بالوں کی ایک لٹ بار بار اس کے چہرے پر آن گرتی تھی جسے وہ ہر مرتبہ پیچھے ہٹا دیتی تھی . . . اس وقت اس کے ہونٹوں پر مسرت انگیز اطمینان کی مسکراہٹ کھیل رہی تھی . . .

زینب نے کھڑکی بند کر دی اور دوسری کھڑکی کھلی رہنے دی۔ جہاں سے اسے دور تک پھیلے ہوئے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ اس طرف کوئی مکان نہ تھا۔ ویران زمین کا بہت بڑا ٹکڑا حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ زمین بنجر تھی۔ اس پر کبھی کوئی فصل نہ اُگ سکتی تھی۔ اِکا دُکا رُوکھا سوکھا درخت کھڑا دکھائی دے جاتا۔ یہ ہندوؤں کا مرگھٹ تھا۔ جس کے چاروں طرف پکی اینٹوں کی ایک پست سی دیوار کھینچ دی گئی تھی۔ چار دیواری کے اندر ایک کونے میں چھ لکڑی والا

ایک کنواں تھا۔ دن کو تیز دھوپ کی وجہ سے ہوائیں بھبکے سے اُڑتے ہوئے دکھائی دیا کرتے تھے یا رات کو مرگھٹ میں پڑے ہوئے لکڑیوں کے کندے چٹختے اور چنگاریوں کی ایک پھلجھڑی آسمان کی طرف اُڑ جاتی۔ . . . .

اس کی آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ اور پھر جیسے مکان کے باہر کی طرف دیوار کے ساتھ سائیکل رکھنے کی آواز آئی۔ کبھی کبھار اس کا خاوند اس طرف سے گذرتا ہوا چند گھڑیوں کے لئے اِدھر بھی آن نکلتا تھا۔ ہوا کے گھوڑے پر سوار . . . . چوکھٹ کے اندر جیسے دھم سے پاؤں رکھنے کی آواز آئی۔ . اس کی ادھ کھلی سی آنکھیں دیوار میں سے گڑی ہوئی لکڑی کی سیدھی موٹی کھونٹی پر جم گئیں جس کے نیچے تھیلا لٹکا ہوا تھا . . . کیسا بے کیف سا منظر تھا اس نے جیسے آنکھیں پھیر لینے کے خیال سے سر ایک طرف کو ڈال دیا۔ اور اس طرح بغیر کسی خاص کوشش کے اس کی نظریں چلچلاتی ہوئی دھوپ میں پھیلی ہوئی بنجر زمین پر دوڑنے لگیں۔ . . . حسب معمول گرد اور سوکھے پتوں کا ایک بگولا اُٹھا اور ایک بڑے بھاری ستون کی طرح دھرتی کی چھاتی پر گھومنے لگا۔ اس قدر تیز گردش . . . جیسے دھرتی کے سینے کو پھاڑ کر نہ معلوم کس طرف کو نکل جائے گا۔ . . لیکن دھرتی خاموش اور بےحِس تھی۔ وہ لاش کی طرح چُپ چاپ لیٹی تھی بگولا بڑی تندہی کے ساتھ گھومتا ہوا پرے چلا جاتا کبھی نزدیک دکھائی دینے لگتا۔ اور کبھی یوں معلوم ہوتا جیسے زمین کے اندر ہی کہیں غائب ہو گیا ہو اور کبھی پھر جھوم کر اُٹھ کھڑا ہوتا . . . . وہی ستون کا ستون . . . اس قسم کے بگولے ہمیشہ اُٹھا کرتے تھے۔ اسی طرح تیزی اور تندی دکھا کر ختم ہو جاتے تھے۔ لیکن زمین ویسی کی ویسی رہ جاتی۔ اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوتی تھی . . . یہ منظر کس قدر خشک، بے مزہ اور بے رنگ سا تھا . . . آہستہ آہستہ پاؤں کی چاپ رخصت ہوتی ہوئی معلوم ہوئی . غالباً اس کا خاوند چلا گیا تھا۔ اس نے کھڑکی سے منہ پھیر کر کروٹ بدلی . . . اس کے جسم کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ ہڈیاں جیسے پس کر رہ گئی تھیں۔ چھاتیاں جل رہی تھیں۔ ہوا گرم اور بوجھل تھی۔ دوپہر کے وقت کوئی کتا تک بھونکتا سنائی نہ دیتا تھا۔ صرف کہیں بہت دور کوئی شخص گنڈاسے سے چارا کاٹ رہا تھا۔ . . . .

مہندر ناتھ

زینت

"کھڑکی کھول دوں؟" اُس نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ اور میرا جواب سنے بغیر اس نے کھڑکی کھول دی۔

کھڑکی کھلتے ہی ہوا کا ایک زبردست جھونکا آیا۔ اور کمرے میں ایک عجیب ٹھنڈک سی پھیل گئی۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اُس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اور پھر کہنے لگا: "میں ہلکی ہلکی بارش میں عجیب حظ سا محسوس کرتا ہوں۔ ہلکی، ملائم، بے آواز بارش۔ یہ ننھی ننھی بوندیں کتنی خوبصورتی سے ان سرسبز پتوں پر گر رہی ہیں۔ اور ہوا خوشبو سے مہکتی ہوئی ان گرتے ہوئے پھولوں کو چوم رہی ہے۔ یہ سرسبز پتے، یہ سرخ پھول، کیا تمہیں پسند نہیں۔ آخر کیا چاہتے ہو تم؟

"چائے پیو گے۔ آج میں نے نیا ٹی سیٹ خریدا ہے۔ اس پیالے کی طرف دیکھو کتنا حسین اور خوبصورت ہے۔ میں پرانے پیالوں میں چائے نہیں پیتا۔ ہمیشہ دلفریب رنگین نئے پیالوں میں چائے پیتا ہوں۔ لو چائے پیو!

"چائے سے میرا جگر خراب ہو جائے گا۔"

"تو سگرٹ پیو، بالکل نیا تازہ۔ ایک کش تو لگاؤ۔ اگر خوشبو سے دماغ معطر نہ ہو جائے۔ تو پھر گلہ کرنا۔ ارے سگرٹ بھی نہ پیو گے۔ مجھے تو سگرٹوں سے محبت ہے۔ چائے کی پیالی سے محبت ہے۔ اور ادھر تم ہو کہ عورتوں کی محبت میں سرگرداں نظر آتے ہو۔ عورتوں کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہو۔ جہاں عورت نظر آئی وہیں جم گئے۔ خیر یہ رضائی اوڑھ لو۔ دیکھو کتنی پیاری ٹھنڈک ہے۔ جسم میں آہستہ آہستہ سرایت کرتی ہے۔ بالکل شراب کے نشے کی طرح۔

مجھے اس رضائی سے محبت ہے۔ ہر چھ ماہ بعد رضائی کو بدل لیتا ہوں۔ رات کے وقت جب سردی پاؤں سے بڑھتی ہوئی دماغ کی طرف جاتی ہے تو میں رضائی کو اپنے ارد گرد لپیٹ لیتا ہوں۔ کتنا سکون ملتا ہے اس نرم اور گرم رضائی میں۔ جیسے کسی حسین عورت کے گرم جسم سے لپٹا رہتا ہوں۔

رضائی عورت سے بدرجہا اچھی ہے۔ اسے نہایت آسانی سے ہر چھ مہینے کے بعد بدلا جا سکتا ہے۔ نئی بنوائی جا سکتی ہے لیکن دوست! عورت کو بدلنا اتنا آسان نہیں، زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ عورت سے شادی کر کے انسان کسی کام کا نہیں رہتا۔ صرف ایک بیوی کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ بیوی کے ناز نخرے برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ دن بھر شکوے شکایتیں، مار دھاڑ، بچوں کا شور، ایک غوغائے عظیم، ایک مسلسل جہنم، میاں! شادی کبھی نہ کرنا۔ میں نے اس لئے شادی نہیں کی —— اور کبھی نہیں کروں گا ——

باہر اُسی طرح بارش ہو رہی تھی۔ ننھی ننھی بوندیں، آہستہ آہستہ گر رہی تھیں۔ پتے اُسی طرح سبز تھے۔ پھول بارش میں نہا رہے تھے۔ ایک کبوتر کھڑکی کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اور غٹرغوں غٹرغوں کرنے لگا۔

"میری طرف کیوں گھور گھور کر دیکھ رہے ہو۔ ارے ہٹاؤ اس کبوتر کو۔ یہ کیوں چلا رہا ہے۔ یہ بھی آ گئے عشق کرنے۔" اس نے تالی بجائی۔ کبوتر ایک لمحہ کے لئے پھڑپھڑایا۔ اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"کیا پوچھنا چاہتے ہو۔ ارے "زینت" —— کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتے ہو۔ بڑے شریر ہو تم۔ میں خود اس قصے کو نہایت وضاحت سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ لوگوں نے میرے متعلق غلط افواہیں اڑا دی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ زینت میری داشتہ تھی، کوئی کہتا ہے کہ میں زینت سے شادی کرنے والا تھا۔ لیکن زینت نے انکار کر دیا۔ کیونکہ میں ہندو تھا۔ کوئی کہتا ہے میں نے زینت اور عارف کے درمیان لڑائی کرا دی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ میں لوگوں کی پروا نہیں کرتا۔ لیکن تمہاری پروا ضرور کرتا ہوں۔ تم کافی ذہین اور سمجھدار ہو۔ اس دنیا میں ذہین آدمی بہت کم ملتے ہیں۔ اس لئے تمہیں یہ راز کی باتیں بتاؤں گا؟

یہ واقعہ میرے ذہن پر اس طرح حاوی ہو گیا ہے کہ میں اس کے وجہ

تلے دب گیا ہوں میں اس بوجھ کو اتارنا چاہتا ہوں تاکہ میرا جی ہلکا ہو جائے ——— زینت کو تم نے کبھی نہ کبھی سٹوڈیو میں دیکھا ہوگا۔ مجھے اس کی آنکھیں پسند تھیں۔ اگر تم نے اُسے غور سے دیکھا ہے تو تمہیں اس بات کا ضرور احساس ہوا ہوگا۔ کہ وہ خود اتنی خوبصورت نہ تھی جتنا شباب نے اُسے خوبصورت بنا دیا تھا۔ وہ اکثر اپنے خاوند کے ساتھ سٹوڈیو میں آتی۔ اُس کا خاوند ——— جو بالکل موالی لگتا تھا۔ جونک کی طرح اس کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ اس کا خاوند کافی آوارہ اور اوباش قسم کا آدمی تھا۔ زینت کے خاوند کو علم تھا کہ اُسے اس سے اچھی بیوی کبھی نہ مل سکے گی۔ اسی لئے وہ زینت سے پل بھر جدا نہ ہوتا۔ زینت پر بہت سے لوگ فریفتہ تھے سٹوڈیو کے کئی ایکٹر اُس پر جان دیتے تھے لیکن کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی کہ آگے بڑھ کر اظہار محبت کر سکے۔ کبھی زینت کے خاوند سے ڈرتے تھے۔ خوف کھاتے تھے وہ جانتے تھے کہ اگر غلطی سے کسی نے زینت کے سامنے اظہار عشق کر دیا۔ تو اس کی لاش سڑک پر خون میں لتھڑی ہوئی ملے گی۔ شاید زینت خود بھی اپنے خاوند سے ڈرتی تھی۔ اُس کے ذہن پر ایک قسم کا جمود طاری تھا۔ اس کی باتوں، اس کی چال ڈھال، اس کی ہنسی، اس کی مسکراہٹ سے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا جیسے وہ پرواز کے لئے تیار ہے۔ لیکن کس کے ساتھ ——— ؟ شاید ابھی تک اُس نے یہ فیصلہ نہ کیا تھا۔ زینت کا خاوند زینت کی خوب خاطر مدارت کرتا۔ اُسے اچھے اچھے کپڑے سلا کر دیتا۔ سٹوڈیو میں اس کا کھانا لاتا۔ اگر رات کو شوٹنگ ہوتی۔ تو وہ درخت کے نیچے بیٹھ کر زینت کا انتظار کرتا رہتا۔ اور جب شوٹنگ ختم ہوتی تو دونوں اکٹھے گھر جاتے۔ اگر وہ کبھی زینت کو کسی خوبصورت لڑکے سے بات چیت کرتے دیکھ لیتا تو اُس کا خون کھول اٹھتا۔ رات بھر زینت کو گالیاں دیتا رہتا۔ اور جیب سے پشاوری چاقو نکال کر کہتا۔

سالی اگر دوسرے سے عشق کیا تو اس چھرے سے پیٹ چیر دوں گا۔ ناک کاٹ لوں گا!

اور زینت چھرے کو دیکھ کر چپ ہو جاتی۔ چاقو دیکھ کر اُس کا دل دہل جاتا۔ اور وہ بستر میں منہ چھپا کر رونے لگتی۔

اسی دوران میں عارف سٹوڈیو میں نوکر ہوا۔ دیکھنے میں خوبصورت وجیہہ دلکش جوان لیکن جب باتیں کرنے لگتا تو ساری دلکشی جاتی رہتی ایسا محسوس ہوتا کہ اگر یہ شخص باتیں نہ کرے تو اچھا ہے۔ عارف خاموش طبیعت کا آدمی تھا۔ وہ بہت کم باتیں کرتا۔ ہنستا تو چپکے سے مسکراتا تو چپکے سے، بیٹھتا تو چپکے سے، مجھے اس کی چپ سے نفرت تھی۔ وہ انسان ہی کیا جو باتیں نہ کر سکے۔ جو دوسروں کو باتوں سے مرعوب نہ کر سکے! یوں تو عارف کافی ذہین اور عقلمند تھا لیکن اس ذہانت کا کیا فائدہ جو دوسروں کو اپنی طرف نہ کھینچ سکے۔

مگر لڑکیوں کے معاملے میں عارف کافی خوش قسمت تھا۔ وہ زینت کی زندگی میں چپکے چپکے داخل ہوا۔ دونوں میں کسی ایک کو بھی معلوم نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور اُس کے بعد کیا ہوگا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے۔ بدمست شرابیوں کی طرح ——— عارف میں ایک خوبی تھی کہ وہ خوب شراب پی سکتا تھا۔ کتنے ہی جام پی جاتا لیکن کم بخت بدمست نہ ہوتا۔ آپے سے باہر نہ ہوتا۔ شراب پی کر اُس کی ٹانگیں نہ لڑکھڑاتیں۔ کسی کو گالیاں نہ دیتا۔ واہیات مذاق نہ کرتا۔ قے نہ کرتا۔ بس جام پر جام چڑھائے جاتا۔ اور مجھے تم جانتے ہی ہو کہ دو جام پینے کے بعد گھر سے باہر دوڑنے لگتا ہوں۔ عورتوں کو چھیڑتا ہوں، مردوں سے لڑتا ہوں، پاؤں لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ زبان میں لکنت آجاتی ہے! اور اگر زیادہ پی لوں تو قے پر قے کرنے لگتا ہوں ——— تمہاری قسم۔ نہایت ہی بیوقوف اور ناکام شرابی ہوں ——— "عورت اور شراب"۔ میرا مطلب ہے زینت اور شراب ——— دونوں اچھی چیزیں ہیں۔ مگر مجھے دونوں راس نہ آئیں۔ دونوں چیزیں، مجھے بدمست کر دیتی ہیں۔ شراب پی کر بہک جاتا ہوں، اور خوبصورت عورت دیکھ کر بھی ——— اور عارف! کم بخت عارف! خاموش عارف مجھ سے زینت چھین کر لے گیا یعنی زینت عارف کے پاس کیسے پہنچی — یہ بھی ایک دلچسپ قصہ ہے۔ ان دنوں ہم سب نے مل کر تہیہ کیا کہ ایک ڈرامہ سٹیج کیا جائے۔ زینت کے خاوند کی منت سماجت کی اور بڑی مشکل سے زینت کو سٹیج پر ایکٹ کرنے کے لئے راضی کیا۔ اس ڈرامے میں، میں نے بھی پارٹ کیا۔ عارف

اور زینت نے بھی! ——— اس کھیل کے دوران میں عارف اور زینت ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ عارف نہایت خاموشی سے سگریٹ سلگاتا۔ اور دھوئیں کو ہواؤں میں چھوڑتے ہوئے زینت کی طرف دیکھنے لگتا۔ زینت چپ تھی، خاموش تھی لیکن تیار تھی۔ شاید پھٹاؤ کا وقت آگیا تھا۔ میں سب کچھ سمجھ گیا لیکن زینت کے خاوند کو اس بات کا علم تک نہ ہوا۔ شاید اُسے اپنے پشاوری چاقو پر ناز تھا لیکن زینت کے پر و بال اس چاقو کے وار سے بہت آگے جا چکے تھے۔ زینت نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اب اپنے خاوند کیلئے نہیں رہے گی۔ اور عارف اس موقع کی تاک میں تھا کہ کب زینت اس کی آغوش میں آتی ہے ———

زینت کے خاوند اور عارف میں بہت فرق تھا۔ زینت کا خاوند اَن پڑھ، شرابی، اجڈ اور گنوار تھا لیکن عارف پڑھا لکھا، ذہین، خوبصورت اور ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ زینت عارف کی طرف کیوں راغب ہوئی؟ کیا یہ لیلےٰ مجنوں کی محبت تھی، یا شیریں فرہاد کی، [illegible] دوست! یہ لیلےٰ مجنوں کی محبت نہ تھی۔ زینت اپنے خاوند کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ وہ کسی ایسے آدمی کی تلاش میں تھی۔ جو اُسے ایک اچھا STATUS دے سکتا۔ جو اُسے اس گندی نالی سے نکال کر ایک اعلےٰ پائے کی ایکٹرس بنا سکتا۔ ابھی تک تو وہ چھوٹے موٹے پارٹ کرتی رہی تھی۔ لیکن اب اُسے آگے بڑھنے کی تمنا تھی۔ زینت کی پرواز میں محبت تھی، جنون تھا لیکن یہ محبت محض مرشی نہ تھی ایک Calculated Step تھا آگے بڑھنے کا۔ زینت نچلے طبقے کو چھوڑ کر متوسط درجے میں آنا چاہتی تھی۔ جہاں جہالت کم ہے۔ لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ روپیہ نچلے طبقے سے زیادہ ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ——— اور یہ سب باتیں سوچ سمجھ کر ایک صبح زینت عارف کے مکان کی طرف چل دی ——— اور عارف نے چپکے سے زینت کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ عارف خوش تھا۔ یہ اس کے خاموش عشق کی پہلی فتح تھی۔ اور شاید میری آخری شکست تھی۔ میں اس ڈرامے میں کیا کرتا رہا۔ مجھ پر کیا گزری۔ زینت میری طرف کیوں مائل نہ ہوئی۔ اس کی وجہ میں نہیں جانتا لیکن مجھے اس بات کا بے حد رنج ہوا کہ زینت عارف کے پاس کیوں چلی گئی۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا۔ اپنے آپ سے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ اپنی صورت سے گھن آنے لگی تھی۔ اور دوست یار کہنے لگے تھے ———

"ارے کل کا لونڈا۔ اور زینت کو اپنے گھر لے جائے۔ اور تم منہ دیکھتے رہ جاؤ۔ تمہارا اور عارف کا کیا مقابلہ۔ عارف تمہارے سامنے چھوکرا لگتا ہے، بےچارہ۔ سالا بازی لے گیا اس بار"

اور یہ سب کچھ سن کر میں کڑھتا۔ اپنے آپ کو گالیاں دیتا۔ اور جب کچھ بن نہ پڑتا تو عارف زینت کو گالیاں دینے لگتا اور سوچتا عارف اور زینت میں کبھی نہ بن سکے گی۔ یہ چار دن کی چاندنی ——— اور پھر اندھیری رات۔ پھر دیکھنا دونوں آپس میں کس طرح لڑیں گے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے ——— اور اس دوران میں کبھی کبھی عارف ملتا۔ اس کے ساتھ اکثر زینت ہوتی۔ دونوں اکٹھے سیر کرنے جاتے۔ سینما دیکھنے جاتے۔ بازار جاتے اور میں دن بھر کڑھتا رہتا اور اس کوشش میں سرگرداں رہتا۔ کہ کسی طرح ان دونوں میں اَن بن ہو جائے۔

کبھی کبھی مجھے اُمید بندھ جاتی کہ زینت کا خاوند عارف کو چاقو مار کر ضرور ہلاک کر دے گا۔ لیکن کافی عرصے تک زینت کا خاوند کچھ بھی نہ [illegible] ایک دن میں بازار سے گزر رہا تھا کہ زینت کا خاوند مل گیا اس کے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی۔ اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں اس نے مجھے دیکھا اور وہیں رک گیا۔ جیب میں سے پشاوری چاقو نکالا اور ایک ہی جھٹکے سے چاقو کا پھل اندھیرے میں بجلی کی طرح کوند گیا۔

میں لپک کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ پھر آگے بڑھا۔ اس کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔ میرے قریب آکر اُس نے کہا۔

"بابو! عارف کہاں ہے؟"

"مجھے کیا معلوم؟"

"سالا کہیں مل جائے تو پیٹ چیر دوں۔ کیا یہ شریفوں کے لچھن ہیں۔ اُلو کا پٹھا۔ میری بیوی چھین کر لے گیا۔ شرم نہیں آئی اس حرامزادے کو، بابو میں تو تمہارا لحاظ کرتا ہوں۔" آخری فقرہ سن کر میری جان میں جان آئی۔ "نہیں تو سالے کو کب کا مار دیا ہوتا۔ سالی

زینت کو کبھی نہ چھوڑوں گا۔ مجھے چھوڑ کر کہاں جائے گی ۔ بابو میں موالی ہوں موالی، مجھے اپنی جان تک کی پرواہ نہیں ۔ میں نے کیوں کے خون کر دیئے ہیں ۔ لیکن پولیس کی جرأت نہیں پڑتی کہ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے ۔ تمہاری قسم بابو! دونوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دوں ۔ لیکن تمہارا لحاظ کرتا ہوں "

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ۔ اور کہا ۔ گھبراؤ نہیں دوست! گھبراؤ نہیں ۔ زینت تمہاری ہے اور تمہاری ہو کر رہے گی ۔ عارف زینت سے شادی نہیں کرے گا ۔ عارف کو میں اچھی طرح جانتا ہوں ۔ وہ زینت کو کچھ دن اپنے پاس رکھے گا ۔ اور پھر زینت بازاروں میں گھومتی ہوئی نظر آئے گی ۔ تمہارے پاؤں چومے گی ۔ اچھا یہ چاقو ذرا جیب میں ڈال لو ۔ ارے مرد ہو کر عورت کے لئے روتے ہو ۔

تم ایک نہیں سو عورتیں رکھ سکتے ہو ۔ عورت کے لئے خون کرنا گناہ ہے ۔ چودہ سالہ قید کا گناہ عظیم ہے ۔ اور پھر تم جوان ہو، عورت تمہارے پاؤں کی جوتی ہے ۔ فکر نہ کرو ۔ زینت خود تمہارے پاس آئے گی ۔ اور اگر وہ نہیں، تو کوئی اور آئے گی ۔

" نہیں بابو! میں سالی کو ایسے نہیں چھوڑوں گا ۔ جب تک روپے نہ دے گی طلاق نہ دوں گا "

" ٹھیک ہے، سو فیصدی درست کہتے ہو ۔ طلاق نہ دینا جب تک تمہیں روپے نہ ملیں "

" سالی سمجھتی کیا ہے "

خوب سمجھتی ہے تمہیں، میں نے اپنے آپ سے کہا ۔ سالا سود خور پٹھان ہی نکلا ۔ چلے تھے چھرا مارنے ۔ بات ٹھہری آخر روپوں پر ——

زینت کے خاوند نے چاقو جیب میں ڈالا اور مجھے آداب کرتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا ۔

اس دن سے مجھے زینت کے خاوند سے نفرت ہو گئی ۔

زینت نے اپنے خاوند کو کچھ روپے دے کر طلاق لے لیا ۔

اب زینت اور عارف اکٹھے رہتے تھے ۔ عارف کو کافی عرصے کے بعد ایک حسین لڑکی ملی تھی ۔ اس نے اس حسن کی شراب کو جی بھر کر پیا ۔ زینت نے اپنے آپ کو عارف کے حوالے کر دیا ۔ زینت خوش تھی عارف خوش تھا ۔ اس کی آغوش میں زینت تھی، خوبصورت، جوان رسیلی ۔ وہ زینت سے عشق کر سکتا تھا ۔ محبت کر سکتا تھا ۔ اس کے سیاہ چمکیلے بالوں سے کھیل سکتا تھا ۔ اس کے رخساروں کو چوم سکتا تھا ۔ بلکہ چومتا تھا ۔ اس کے جسم سے پیار کرتا تھا ۔ اس کے جسم کی لطیف خوشبو سے لطف اندوز ہوتا تھا ۔ اور سب کچھ کرتا تھا لیکن جب زینت نے شادی کے لئے کہا ۔ تو عارف کا بنا بنایا گھروندا دھم سے نیچے آ پڑا ۔

عارف زینت سے شادی کر لے ؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا ۔ زینت اس سے پہلے ایک موالی کے گھر سات برس تک رہ چکی تھی ۔ اور وہ ایک اعلےٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا ۔ اگر وہ زینت سے شادی کر لے، تو اس کے ماں باپ کیا کہیں گے ۔ عارف کو اپنے ماں باپ کا اتنا ڈر نہ تھا ۔ دراصل وہ خود زینت سے شادی نہ کرنا چاہتا تھا ۔ زینت اس کے پاس رہ سکتی ہے ۔ اس کے گھر میں رہ سکتی ہے ۔ وہ اسے ایک داشتہ بنا کر رکھ سکتا ہے لیکن بیوی بنا کر نہیں ——

اس سے پہلے عارف کئی گھاٹنوں سے ایسا تعلق قائم کر چکا تھا ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ۔ کہ وہ ہر گھاٹن کو اپنی بیوی بنا لیتا، گو زینت گھاٹنوں سے بدرجہا اچھی تھی لیکن اس موالی کی آغوش —— ؟

توبہ! توبہ!! یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ اس کا ذہن یہ گوارا نہیں کر سکتا ۔ لوگ کیا کہیں گے ۔

" ارے ۔ اس موالی کی بیوی کو گھر میں رکھ لیا "

" کیا عارف کو کسی شریف گھرانے کی لڑکی نہ مل سکتی تھی "

" اجی! ان ایکٹروں کو ان باتوں کی کیا پرواہ "

" فلم انڈسٹری میں پڑھے لکھے نوجوان بھی آوارہ ہو جاتے ہیں "

عارف یہ طعنے برداشت نہیں کر سکتا تھا ۔ ورنہ بھی وہ اس درد سری کو مول لینا چاہتا تھا ۔ اس کے ذہن میں کبھی اس بات کا خیال ہی نہ آیا تھا ۔ کہ زینت شادی کے لئے اپنے آپ کو یوں بیدھڑک پیش

رہے گی۔

اور اسی بات پر عارف اور زینت کی لڑائی ہو گئی۔ عارف نے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اور زینت ایک ہوٹل میں چلی گئی۔

اس واقعہ کے بعد زینت میرے پاس آئی میں خوش تھا، کہ زینت نے عارف کو چھوڑ دیا ہے۔ اور میں دوستوں کو اس لڑائی کے قصے سناتا عارف دراصل کمینہ ہے۔ شرم نہیں آئی۔ زینت کو گھر سے نکالتے ہوئے میاں! تم ایک عورت سے عشق کرتے ہو، محبت کرتے ہو اور عورت سب کچھ تم پر نثار کرتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر تمہارے پاس آتی ہے۔ تم ہر طریقے سے اُس کے جسم سے لذت اخذ کرتے ہو۔ اور جب وہ شادی کے لئے کہتی ہے تو صاف انکار کر دیتے ہو؟ کہاں کی ہے یہ شرافت۔ سچ کہتا ہوں، عارف نہایت ہی ذلیل انسان ہے، ارے بھئی عارف نے ایک بار بھی زینت سے نہ کہا۔ کہ آؤ تمہیں ساڑھی خرید دوں کوئی نیا سینڈل منگوا دوں، سونے کی انگوٹھی لے دوں۔ یا کبھی کانوں کے آویزے ہی خرید کر دیتا۔ میں نے اتنا کم ظرف انسان کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے ایسے لونڈوں سے نفرت ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ زینت میرے پاس آئی۔ بڑی گھبرائی ہوئی تھی بچاری۔ میں نے اُسے ڈھارس دی اور کہا۔

زینت! تم گھبراؤ نہیں۔ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو۔ مجھ سے لو۔ تم یہاں رہ سکتی ہو۔ لیکن تم میرے پاس کیا کرو گی رہ کر۔ وہ ہوٹل اچھا ہے۔ اُس میں رہو لیکن تم یہاں آ سکتی ہو۔ یہاں کھانا کھاؤ۔ مجھ سے باتیں کرو، ہنسو، کھیلو اور بھول جاؤ۔ عارف کو، وہ کمینہ ہے۔ تمہیں اس دنیا میں کئی عارف ملیں گے۔ جوان لڑکی کو دیکھ کر کس کا دل زور زور سے دھڑکنے نہیں لگتا۔ وہ مسکرا پڑی۔ اور پھر اُس دن کے بعد وہ ہر روز میرے گھر آنے لگی۔ میں نے اُسے ریشمی ساڑھیاں خرید کر لے دیں۔ نئے سینڈل خرید کر دیئے۔ میں اُسے بازار لے گیا۔ سینما لے گیا۔ وہ اکثر میرے ساتھ رہتی۔ میں جو کہتا اُس پر عمل کرتی۔ کئی بار اُس نے میرا کھانا پکایا۔ ایک رات کا ذکر ہے۔ رات ٹھنڈی اور یخ بستہ تھی۔ وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کا ہاتھ اپنے سینے پر تھا۔ ——— میں نے کہا۔ زینت۔ میرے قریب آؤ!

وہ میرے قریب آ گئی۔

اس چارپائی پر بیٹھو۔

وہ چارپائی پر بیٹھ گئی

سینڈل اتار دو۔ اُس نے سینڈل اتار دیئے۔

رضائی اوڑھ لو۔ اُس نے رضائی اوڑھ لی۔

آرام سے لیٹ جاؤ۔ وہ آرام سے لیٹ گئی۔

اس کی ٹانگیں میری ٹانگوں کے ساتھ چھو رہی تھیں۔

میں نے کہا۔ اب بیٹھ جاؤ۔

اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا۔ تم خوبصورت ہو۔

اور وہ مسکرانے لگی۔

میں نے کہا۔ زینت سے نہیں۔ بلکہ اپنے آپ سے۔ کہ وہ آج تمہارے پاس ہے تمہارے قریب ہے۔ وہ اکیلی ہے۔ تم اکیلے ہو۔ باہر گھپ اندھیری رات ہے۔ ہوا ٹھنڈی اور یخ بستہ ہے۔ زینت خوبصورت ہے۔ جوان ہے، اس کی کمر میں لچک ہے۔ بانہوں میں گداز ہے۔ خون میں گرمی ہے جسم میں حدت ہے۔ آنکھوں میں شراب ہے۔ وہ تمہاری ہر بات مانتی ہے۔ تمہاری عزت کرتی ہے۔ تمہیں چاہتی ہے۔ تمہیں پیار کرتی ہے۔ تم نے کئی بار اس کے گالوں کو ہاتھ لگایا۔ لیکن وہ چپ رہی۔ کئی بار وہ تمہارے سینے سے چمٹ گئی۔ لیکن تم خاموش رہے۔ تم زینت سے الگ تھلگ رہے۔ تم اُس کے جسم کو چاہتے ہوئے بھی دھتکارتے رہے۔ اُس کے جسم کی مہک سے لطف اندوز ہو کر بھی اُس سے دور رہے آخر یہ کب تک۔ وہ کب تک تمہارے پاس اسی طرح رہے گی۔ وہ چلی جائے گی اور ضرور چلی جائے گی۔

لیکن ان باتوں کو جانتے ہوئے بھی میں زینت سے جسمانی طور پر الگ تھلگ رہا۔ میرے دل میں صرف ایک کانٹا تھا۔ اور وہ تھا عارف زینت عارف کے ساتھ رہ چکی ہے۔ عارف کے پاس رہنے کا اتنا رنج نہ تھا۔ جتنا اس بات کا کہ میرے ہوتے ہوئے اُس نے عارف کو کیوں پہلے انتخاب کیا۔ اگر عارف کے پاس جانے سے پہلے وہ میرے پاس آتی۔

تو میں مرد ہوں کے ساتھ پیار سے اُس سے شادی کر لیتا۔ لیکن اب نہیں۔ تنگ کیا گیا ہوں ۔ اور سے عارف کی مشترکہ کر لے اتنا۔ میاں دوسروں کا بگاڑ کیا سمجھتے ہو۔ تم عارف سے زیادہ خوبصورت ہو۔ تم چاہو تو دنیا کی بہترین عورت کو حاصل کر سکتے ہو۔ اور میں چُپ ہو جاتا۔ اور سوچتا۔ اور پھر سوچتا۔ کبھی کبھی خیال آتا۔ کہ ان چاندنی راتوں کو برباد نہ کیا جائے جیب میں روپیہ ہے جسم میں خون ہے۔ خون میں گرمی ہے۔ میں اکیلا ہوں۔ عورت میرے قریب ہے۔ میں زینت کے جسم کو چاہتا ہوں۔ زینت میرے جسم کو چاہتی ہے —— لیکن کم بخت عارف؟ عارف کا خیال آتے ہی میں پریشان ہو جاتا۔ سارے خون میں ایک ٹھنڈی سی لہر دوڑ جاتی سارا جوش و خروش ختم ہو جاتا۔ اور تم نے خود مجھے کئی بار پھٹکارا گالیاں دیں۔ اور میں خاموشی سے تمہاری گالیاں سنتا رہا ——

زینت اچھی ہے، خوبصورت ہے، پیاری ہے، میں اب بھی اس کے جسم کو چاہتا ہوں۔ لیکن عارف کی گرہ ایک پھندا بن کر اٹکی ہوئی ہے —— آہستہ آہستہ زینت سب کچھ سمجھ گئی۔ اور اُس نے مجھ سے ملنا چھوڑ دیا۔

اب وہ کیا کرتی ہے؟

پہلے اُس نے ایک سیٹھ کو داشتہ رکھا تھا۔ اب اس نے ایک خوبصورت لونڈے کو اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے اور اب کہتی ہے۔ کہ وہ کسی مرد سے شادی نہیں کرے گی۔ اگر مردوں کو یہ حق حاصل ہے کہ عورتوں کو داشتہ بنا کر اپنے گھروں میں رکھ سکتے ہیں۔ تو کیا عورتیں مردوں کو اپنے گھروں میں داشتہ بنا کر نہیں رکھ سکتیں۔ میرے پاس کس بات کی کمی ہے۔ اچھے خاصے روپے کماتی ہوں۔ حسین ہوں، جوان ہوں، چالاک ہوں۔ لوگوں کو اُلو بنا سکتی ہوں۔ اب شادی نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں کروں گی۔

بڑے مزے سے اس نے ایک خوبصورت لڑکے کو اپنے گھر میں رکھا ہُوا ہے۔ اور دونوں مزے سے رہتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ بارش تھم چکی تھی۔ سورج دور پہاڑوں کے پیچھے غروب ہو چکا تھا۔ اس نے چائے کی پیالی اٹھائی اور ایک گھونٹ پیتے ہوئے کہنے لگا۔

"کمبخت! خوبصورت عورت تھی میں نے اپنے ہاتھ سے کھو دی ہے"



آپ کے پسندیدہ فن کار
کے تازہ شاہکار
جھلملاتے ہوئے ستاروں کی طرح دلفریب
شریمتی بینا چودھری
N 16706
مسکراتے ہوئے پھولوں کی طرح مسرت خیز
سریندر کور
N 13518
لہراتے ہوئے بادلوں کی طرح رومان انگیز ڈھولک گیت
منور سلطانہ
N 13517
دی گراموفون کمپنی لمیٹڈ ۔ ڈم ڈم بمبئی مدراس دہلی لاہور



کولمبیا ریکارڈ
لو پھر بہار آ گئی
اس رومان انگیز موسم میں
یہ ریکارڈ سنیے
ودیاناتھ سیٹھ
نیناں کیوں روتے ہیں
GE.5045
جمیلہ بائی
اوگن چت نہ دھرو ۔ ٹھمری بھیرویں
GE.5026
پنجابی ڈھولک گیت
دلشاد بیگم
ریکارڈ نمبر

قاضی عبدالغفار:۔ "ایسا اچھا رسالہ ایسی دیدہ زیب صورت میں..."

نیاز فتحپوری:۔ "ہر دو مہینے کے بعد اتنا اور ایسا دلچسپ ادبی ماحاصل ذخیرہ..."

اختر انصاری:۔ "نیا دور دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ مضامین نظم و نثر کا ... رنگا رنگ مجموعہ معیار کی اس درجہ یکساں بلندی کے ساتھ! پھر اس کی ظاہری خوبصورتی حد درجہ نظر افروز ہے...."

احمد ندیم قاسمی:۔ "نیا دور کے مندرجات میں جدت اور بیداری کی ایسی روشنی نظر آتی ہے۔ آپکے انتخاب اور انداز ترتیب کی داد دینی پڑتی ہے"

نیا دور

دفتر ۶۲ غلاصی پالیم بنگلور سٹی

ایڈیٹر صمد شاہین

(دو ماہی رسالہ)

نیا دور نمبر ۶ شائع ہو گیا ہے

مضامین (۱) احمد علی:۔ آرٹ، سیاست اور زندگی (۲) کرشن چندر ادب کے نئے تقاضے (۳) ای ایم فارسٹر:۔ آرٹسٹ جنگ کے بعد (۴) ہیلی ٹی سرن شرما:۔ ترقی پسند جنسی ادب (۵) عزیز احمد:۔ فراق کی نظمیں

افسانے:۔ (۱) اختر اورینوی:۔ ڈائنامیٹ (۲) راما نند ساگر برف گری (۳) قدرت اللہ شہاب:۔ تلاش (۴) انور:۔ خون

نظمیں:۔ قاضی نذرالاسلام، احمد ندیم قاسمی، وامق جونپوری، محمود جالندھری ساحر لدھیانوی، علی جواد زیدی، منیب الرحمٰن، خلیق ابراہیم، رفعت سروش ابن انشا، کنول پرشاد کنول اور شور علیگ

نیا دور نمبر ۷ کے مضامین

مضامین (۱) محمد حسن عسکری نئی نفسیات اور ہیئت (۲) وقار عظیم نیا افسانہ (۳) اختر انصاری مجاز کی شاعری (۴) عبدالقادر سروری "شعلہ ساز" (۵) ممتاز شیریں ۱۹۴۶ء کے اچھے افسانے

افسانے:۔ سہیل عظیم آبادی وقت کی بات (۲) احمد ندیم قاسمی ہمن ہیرا (۳) دیوندر ستیارتھی ملکی (۴) رادھا کرشن آدمی اور جانور (۵) عزیز احمد جبوتا خواب (۶) دعوت (ایک طویل ڈرامہ) چیتن آنند

نظمیں:۔ وشوامتر عادل، وامق جونپوری، سلام مچھلی شہری، عزیز حامد مدنی وغیرہ

سب مضامین غیر مطبوعہ ہیں اور خاص نیا دور کے لئے موصول ہوئے ہیں۔

کتابی سائز ۱۴۰ صفحے، دیدہ زیب سرورق قیمت فی پرچہ عہ سالانہ چندہ چھ روپے

بقیہ تلاطم آؤٹ

نے ہمارے سامنے بیٹھ کر سب کچھ درست کیا۔ بڈی کے کہنے پر میری تھوڑی سی تعریف بھی شامل کی گئی۔

اب سیکنڈ شو کا پروگرام بنا۔ شیطان نے وہ اوور کوٹ اتار دیا۔ کیونکہ زیادہ سردی لگتی تھی اور پہلے اٹھوایا گیا تھا پھر سیدھا کر لایا گیا تھا پروگرام اسی سینما کا تھا جس میں پہلے گئے تھے۔ شیطان بولے۔۔۔ آج سردی زیادہ ہے آج پھر رضائیاں اوڑھ کر چلیں گے۔ اور ذکر حقے کا ساتھ چلے گا۔ ۔۔۔ ذرا سی دیر میں ہم رضائیاں اوڑھے اتنی ٹھنڈ میں ٹھنڈی سڑک پر جا رہے تھے اور تقسیم انعامات کا ذکر ہو رہا تھا۔ بڈی بار بار کہہ رہا تھا۔۔۔ "بولنے او لوائے، آج میں اپنے آپ کو ہیرو محسوس کر رہا ہوں، میں چمپئن ہوں میں نے ایک کپ جیتا ہے۔۔۔ یاہ ہُو دُا"

اور جب ہم شہر کے بہترین سینما میں رضائیاں اوڑھے پکچر دیکھ رہے تھے اور حقے کے کش لگا رہے تھے تو ہمارے آس پاس بیٹھے ہوئے حضرات نہ ہمیں چمپین سمجھ رہے تھے نہ ہیرو، بلکہ غالباً ایسی خواتین سمجھ رہے تھے جو حقہ پی رہی تھیں۔

ولولے حضرت زیبا درانی کی وہ کامیاب اصلاحی مثنوی جس کا مطالعہ ہر ہندوستانی مرد اور عورت کے لئے شمع راہ ہے قیمت

گیتوں بھری ریڈیائی گیتوں کا بہترین مجموعہ۔ از پروفیسر کے آر بالی۔ (زیر طبع)

جے ہند سیاسی نظموں کا بہترین مجموعہ، ایک مشہور سیاسی ورکر کے قلم سے (زیر طبع)

بھائیا مشہور آرٹسٹ ایشر سنگھ ایشر کی مزاحیہ نظموں کا مجموعہ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

غلامی انڈین نیشنل آرمی کے جانبازوں پر بہترین پنجابی سیاسی نظم از کامریڈ اننت رام قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

اس کے علاوہ مکتبہ اردو کی تمام کتابیں ہم سے طلب کریں

موجی بُک شاپ بازار تلواڑاں لدھیانہ

شفیق الرحمٰن

ننانوے ناٹ آؤٹ

بڑی مشکلوں سے ہم نے میچ جیتا، یا یوں کہیے کہ ہارتے ہارتے بچے اب ہم سیمی فائینلز جیت کر فائینلز میں آ گئے تھے۔ سب سے زیادہ سکور مقصود گھوڑے کا تھا۔ اُس نے صبح سے کھیلنا شروع کیا۔ کوئی سٹروک ایسا نہ تھا جو اُس نے نہ دکھایا ہو۔ بولرز کو خوب سزا دی اور دو گھنٹے کے بعد تین رنز بنائیں۔ اُس کے بعد جو اُچھل اُچھل کر کھیلا ہے تو دوپہر تک تین سے دس تک سکور پہنچا دیا۔ لنچ کے بعد وہ بہت تیز کھیلا، آگے بڑھ بڑھ کر جو ہٹیں لگانی شروع کی ہیں تو پانچ رنز کا اور اضافہ کر دیا۔ جب ہم شام کو دو پیٹ کر جیتے ہیں۔ اور آخری کھلاڑی نے ہٹ لگائی ہے تو مقصود گھوڑا پچیس رنز بنا چکا تھا۔

ہمارے مخالف بھی کافی گئے گذرے تھے وہ بھی اسی طرح کھیلے تھے اُن کی بولنگ کا یہ حال تھا کہ گیارہ کھلاڑیوں میں سے دس نے بولنگ کی تھی۔ گیارہواں وکٹ کیپر تھا اور مجبور تھا۔ ورنہ وہ بھی حسبِ توفیق مدد کرتا۔ کھیل دیکھنے والوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ دونوں ٹیموں کے ہارنے کا اتنا ڈر نہیں جتنا جیت جانے کا ہے۔

سیکنڈ شو دیکھنے کے لئے میں مقصود گھوڑے کو لے کر شیطان کے ہوسٹل میں پہنچا۔ اُن کے کمرے میں جا کر کیا دیکھتا ہوں۔ کہ بڑی مدھم روشنی میں ایک بڑے سے پلنگ پر چند حضرات رضائیاں اوڑھے کھانا کھا رہے ہیں۔ اُن میں شیطان بھی تھے۔ بولے ——"سردی بہت زیادہ ہے اور ہم تھکے ہوئے بھی ہیں"۔ شیطان میچ میں کھیلے تھے اور حسبِ معمول دونوں اننگز میں صفر سکور کی تھی۔ اُنہوں نے ہمارے لئے ایک رضائی منگوائی اور ہم دونوں بھی کھانے میں شریک ہو گئے۔ مقصود گھوڑا بولا "رُومی صاحب آپ کیسے ہیں؟" —— شیطان بولے "میں بفضلِ خدا خیریت سے ہوں اور خیر و عافیت آپ کی خداوند کریم سے نیک مطلوب ہوں۔ دیگر احوال یہ ہے کہ —— میں نے سینما کا پروگرام بتایا اور پوچھا کیا بجا ہے؟ —— شیطان گھڑی دیکھ کر بولے —— "جبرات

ہے"۔ ویسے سینما میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ شیطان بولے" ایک گھنٹے کا کیا ہے دس منٹ میں گذر جائے گا۔ آج سینما اسی طرح چلیں گے۔ رضائیاں اوڑھ کر —— اور نوکر بھی ساتھ چلے گا حقّہ لے کر۔ آج میچ جیتا ہے"۔

بڑی بحث ہوئی۔ مقصود گھوڑے نے کہا —— میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ رضائیاں اوڑھ کر نہ چلیں بلکہ —— شیطان جلدی سے بولے —— میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ مجھے مشورہ نہ دیں آج رضائیاں اوڑھ کر چلنا ہوگا۔ سردی بہت زیادہ ہے اور میرا اوور کوٹ ایسا ہے جیسے پہن کر اور زیادہ سردی لگتی ہے"۔

"وہی اوور کوٹ تو نہیں جسے اُلٹوایا گیا تھا؟" کسی نے پوچھا۔

"جی ہاں! پہلے اُسے اُلٹوایا گیا تھا۔ پھر سیدھا کرایا گیا ہے۔ شیطان بولے۔

"یہ روشنی بہت مدھم ہے۔ میں نے بات ٹالنے کو کہا۔ شیطان نے نوکر سے پوچھا —— "کیوں یہ بلب کتنے ہارس پاور کا لائے ہو؟"۔ اس غریب نے بلب کی ہارس پاور بتا دی۔ شیطان بولے —— آج بجلی ہی کم آ رہی ہے۔

کھانا ختم ہو چکا تھا۔ چلنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ نوکر حُقّہ بھر کر لے آیا۔ سب نے رضائیاں لیں۔ شیطان اپنی عینک ڈھونڈنے لگے کسی نے بتایا کہ ایک عینک تو اُن کی ناک پر ہے۔ بولے —— آج کل میرے پاس تین عینکیں ہیں۔ ایک دُور کی چیزوں کے لئے اور دوسری نزدیک کے لئے اور تیسری ان دونوں کو ڈھونڈنے کے لئے۔ میں بقیہ دو عینکیں ڈھونڈھ رہا ہوں۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ اگر جج صاحب کے کنبے میں سے کسی نے مجھے دیکھ لیا تو کہیں گے کہ عجب بدمذاق لڑکا ہے۔ شہر کے بہترین سینما میں رضائی اوڑھے بیٹھا ہے۔ اُن دنوں رضیہ مجھ سے رُوٹھی ہوئی تھی اور

میں کافی بیزار تھا۔ شیطان مجھ سے بیزار تھے۔ بار بار وہ یہی کہتے کہ میاں اگر بس یا لڑکی ہاتھ سے نکل جائے تو ذرا فکر نہیں کرنا چاہیئے ــــ دوسری ابھی آتی ہوگی۔

چلتے چلتے پھر کسی نے شیطان کو مشورہ دینے کی کوشش کی، وہ بولے ــــ میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ مجھے مشورہ نہ دیں۔

ذرا سی دیر میں ہم ٹھنڈی سڑک پر اتنی ٹھنڈ میں رضائیاں اوڑھے جا رہے تھے۔ اور ہمارے پیچھے زکر حق تھلے آ رہا تھا۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں جج صاحب نہ آئے ہوئے ہوں۔ ویسے وہ سیکنڈ شو میں اکثر آجایا کرتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر دیکھا تو پکچر شروع ہو چکی تھی۔ جج صاحب کی موٹر جیسی ایک موٹر باہر کھڑی تھی۔ اب تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ضرور اندر ہونگے میں نے اپنی رضائی تو مقصود گھوڑے کے سر پر ڈالی اور شیطان کی نظر بچا کر ایک طرف ہو گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو جج صاحب بیٹھے تھے۔ میں بالکل سیٹ میں دھنس گیا کہ کہیں نظر نہ آجاؤں مگر ذرا سی دیر میں ننھی میرے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے پیچھے بابا! پپا۔ جج صاحب ساتھ جج صاحب کی بیگم، حکومت آپا اور رضیہ بیٹھی تھیں۔ میں نے سلام کیا اور مجھے ننھی کی سیٹ ملی۔ ننھی میری گود میں بیٹھ گئی۔ جج صاحب نے پہلے تو میرے نہ آنے کی شکایت کی جسے امتحان کا بہانہ بنا دیا پھر بولے "وہ خواتین کون تھیں؟" میں چونک پڑا ــــ "کیسی خواتین؟ ــــ کب بھلا ــــ؟" بولے ــــ "ابھی ابھی تمہارے ساتھ آئی تھیں ــــ!"

"جی نہیں میرے ساتھ تو کوئی نہیں آیا۔ میں تو اکیلا آیا ہوں۔" میں صاف مکر گیا۔

"اور وہ کون ہیں ــــ؟" انہوں نے شیطان وغیرہ کی طرف اشارہ کیا ــــ "ارے لاحول ولاقوۃ!! ــــ یہ خواتین تو حقہ پی رہی ہیں۔"

شیطان وغیرہ حقہ پی رہے تھے ــــ "خواتین نہیں ہونگی ــــ کوئی اور ہوگا۔" میں نے کہا۔ وہ بولے ــــ "عجب پُراسرار شبیہیں ہیں۔ غالباً یہ خواتین نہیں ہیں ــــ یا شاید ہوں۔"

میں نے کن انکھیوں سے رضیہ کو دیکھا جو کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ فوراً اس نے منہ پھیر لیا۔ عرصے سے رضیہ مجھ سے ناراض تھی۔ ایسی ناراض تو پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ نہ مجھ سے بات کرتی نہ میری طرف دیکھتی۔ اور یہ بات روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ جتنا میں منانے کی کوشش کرتا اُتنا ہی وہ اور روٹھ جاتی۔ ہوا یہ کہ ــــ کالج میں ڈراما بھی اُن ہی دنوں ہوا۔ جن دنوں ٹینس ٹورنامنٹ ہو رہا تھا۔ ٹینس میں سرلا میری پارٹنر تھی۔ اُدھر ڈرامے میں بھی ہم اکٹھے تھے۔ شام کو یا تو میچ ہوتا اور یا پریکٹس ہوتی۔ اس کے بعد ریہرسل، اور رات کو میں اُسے چھوڑنے جاتا۔ نہ جانے ننھی نے ہمیں کہاں دیکھ لیا۔ جا کر رضیہ سے کہہ دیا۔ اگلے روز اتفاق سے اُس نے ہمیں کالج سے اکٹھے نکلتے دیکھ لیا۔ پھر چند دنوں کے بعد کھیل کے بعد سرلا بولی۔ میرے ڈیڈی شام کی ٹرین سے گزر رہے ہیں۔ مجھے سائیکل پر سٹیشن لے چلئے۔ ٹرین آدھ گھنٹہ ٹھیرے گی۔ اس کے بعد فوراً ہی ریہرسل کے لئے آجائیں گے۔ میں اُسے سائیکل پر لے کر نکلا ہی تھا۔ کہ رضیہ اور حکومت آپا مل گئیں۔ بس اُس دن سے رضیہ ناراض ہو گئی۔ نہ جانے اس میں ناراض ہونے کی بات کیا تھی۔ سرلا پارٹنر تھی۔ اور وہ سٹیشن پر جانا چاہتی تھی۔ اور پھر فوراً ریہرسل کے لئے واپس بھی آنا تھا۔ ہم دونوں کے پاس فقط ایک سائیکل تھی۔ اور رضیہ کا رُوٹھنا بالکل بے جا تھا۔ اُدھر سٹیشن پر ہمیں ایک نہایت ہی کرخت قسم کے دراز ریش بزرگ ملے جنہیں ہرگز ڈیڈی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

حکومت آپا حسبِ معمول خفا تھیں۔ شیطان کا خیال تھا کہ اُن کو مجھ سے ایک حسرت آمیز نفرت ہے۔ اور تو اور ننھی بھی کچھ کچھ ناراض تھی۔ ہم جج صاحب کے ہاں جو کچھ توڑتے پھوڑتے ننھی کے سر لگا دیتے شیشے کے گلاس، چینی کے گلدان، الماریوں کے شیشے غرضیکہ جو کچھ بھی ہم سے ٹوٹتا۔ ننھی کا نام لے دیتے۔ باغیچے سے جتنے پھول اور پھل ٹوٹتے وہ بھی ننھی کے سر لگتے۔

دوسرے یہ کہ شیطان کئی کئی مرتبہ کوکو بنتے۔ ننھی کوکو، بھوت اور چڑیلوں سے بہت ڈرتی تھی۔ رات کو ننھی کو سنا سنا کر شیطان کوکو بنواتے کوکو آنے والی ہے ــــ کوکو کب آئے گی؟ اب۔ کوکو آگئی۔ کئی مرتبہ تو یہ ہوا کہ ننھی سو رہی ہے اور شیطان نے کوکو کہہ کر ڈرا دیا۔ بعد میں کہہ دیا کہ میں تو کوکو بنوا رہا تھا۔ تیسرے یہ کہ شیطان رات کو ننھی کے پاس بیٹھ کر انگریزی ریکارڈ بجایا کرتے۔ انگریزی کے ریکارڈوں کے متعلق ننھی کا یہ خیال تھا کہ ایک کمرے میں مختلف قسم اور مختلف سائز کے بہت سے کتے اکٹھے ہو جاتے ہیں اور آپس میں خوب لڑتے ہیں۔ کبھی چھوٹے چھوٹے کتے اور کبھی بڑے بڑے، پھر بڑے اور چھوٹے کتے آپس میں لڑتے ہیں۔ جب تھک جاتے ہیں۔ تو خوب روتے ہیں۔ بعض اوقات ایک بوڑھا سا کتا اکیلا بیٹھ کر نہ معلوم کسے روتا ہے

بعض اوقات بلیاں اور مرغیاں خوب لڑتی ہیں۔ آپ نے ریگارڈ سس کرو بھی تو خوب لڑتی۔

میرا اور شیطان کا امتحان نزدیک تھا۔ اس لئے ہم دونوں جج صاحب کے ہاں سے ہوسٹل میں چلے آئے تھے۔ ہمارے ہوسٹل دور دور تھے لیکن ہمارا وقت اکٹھے ہی گزرتا۔ ادھر جج صاحب خوب کوٹھیاں بدل رہے تھے۔ پچھلے چند ماہ میں انہوں نے چار پانچ مرتبہ مکان بدلا تھا۔ شیطان جب کبھی اُن سے ملتے یہی پوچھتے کہ آج کل آپ کہاں رہتے ہیں۔ اُن کی پہلی کوٹھی میں ہمارے رہتے ہوئے چوری ہوئی تھی۔ جج کے ہاں چوری — عجیب ہی بات تھی۔ صبح صبح پتہ چلا کہ رات کو چوری ہوئی ہے لیکن سب چیزیں جُوں کی تُوں موجود تھیں۔ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ کیا چرایا گیا ہے۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ چور محض تفریحاً آئے تھے۔ بعد میں جا کر پتہ چلا کہ میرے سارے کپ جو انگیٹھی پر اور الماریوں میں رکھے تھے غائب ہیں بڑے نامعقول چور نکلے۔

وہ کوٹھی تھی بھی سُنسان سی جگہ میں۔ پھر ایک مرتبہ سارا کنبہ کسی دوسرے شہر میں گیا۔ میں اور شیطان سیکنڈ شو دیکھ کر بہت دیر سے لوٹے۔ کوٹھی میں بالکل اندھیرا تھا۔ ہم دیوار کود کر چھوٹے راستے سے اندر چلے آئے۔ اندھیرے میں آہٹ سنائی دی۔ دبے پاؤں جا کر دیکھتے ہیں تو ایک صاحب تالا کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ دیر دیکھتے رہے۔ جب تالا کھُل گیا تو شیطان نے چور کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے شکایت آمیز لہجے میں کہا — "یار بڑا افسوس ہے" اُس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن ہم نے اُسے کہیں نہ جانے دیا۔ بلکہ اُسے اندر لے آئے اُسے کافی پلائی گئی۔ چاکلیٹ کھلائے گئے۔ وہ بیچارہ بڑا پشیمان تھا میں نے اپنے کپوں کے متعلق پوچھا۔ وہ قسم کھا گیا کہ اُس نے کپ نہیں اُٹھائے۔ اگر وہ چوری کرتا بھی تو کپ کبھی نہ اُٹھاتا — سپورٹسمین چور معلوم ہوتا تھا۔ ہم نے ہاتھ ملا کر اُسے رخصت کیا۔ جج صاحب نے کوٹھی بدلی۔ نئی کوٹھی میں ہر روز بجلی فیل ہو جاتی تھی۔ پھر مکان بدلا اُس کے پڑوس میں رات دن قوالیاں ہوتی تھیں بینڈ بجتے تھے۔ ایک دو مرتبہ پھر اسی طرح ہوا۔ اب موجودہ مکان ایسی جگہ تھا کہ آس پاس بے شمار لڑکیاں رہتی تھیں۔ سہ پہر کو لڑکیاں سکولوں اور کالجوں سے لوٹتیں۔ شام کو خوب رونق ہوتی۔ شیطان نے اُس جگہ کا نام مینا بازار رکھا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ امتحان ختم ہوتے ہی ہم ہوسٹل چھوڑ کر جج صاحب کے ہاں آجائیں گے۔

جج صاحب بدستور اُن خواتین کو دیکھ رہے تھے جو شٹل کاک کھیل رہی تھیں۔ اور اُن کے متعلق ہی گفتگو ہو رہی تھی۔ رضیہ نے سر پہ دوپٹہ اس انداز سے رکھا تھا کہ مجھے صرف اُس کی ناک کا ذرا سا حصہ نظر آ رہا تھا۔ میرے خیال میں وہ ایک حسین ترین ناک کا حصہ تھا۔ حکومت آپا مجھ سے باتیں کر رہی تھیں۔ کہ میں اتنے دنوں سے کیوں نہیں آیا۔ اور آج کل اُس لڑکی کا کیا حال ہے۔ جو میرے ساتھ سائیکل پر تھی۔ وہ لڑکی بہت حسین بھی نہیں ہے لیکن بُری بھی نہیں ہے، بڑی شوخ سی ہے اور ہمیں کسی نے اور بھی باتیں بتائی ہیں۔ جو اس وقت کہنے کی نہیں ہیں۔ کیونکہ ننھی سُن رہی ہے۔ ننھی جو میری گود میں تھی بولی — میں بالکل نہیں سُن رہی ہوں۔ میں نے خوشامد کے طور پر ننھی کو کہانیاں سنائیں۔ — سنو ننھی ایک کہانی — ایک شخص شیر کا شکار کھیلنے جنگل میں گیا — شیر بولا — آہاہا۔ اچھا ایک اور کہانی سنائیں — سنو۔ دو چیتے کے شکاری اور ایک چیتا — ایک چیتے کا شکاری اور ایک چیتا — ایک چیتا — ! ننھی پھر رونے لگی۔

انٹرول ہوا اور روشنی میں جج صاحب کو یہ تو یقین ہو گیا کہ وہ خواتین نہیں ہیں۔ لیکن اب یہ بحث شروع ہوئی کہ یہ لباس کس قسم کا ہے اور یہ کس قسم کے حضرات ہیں اور کس سلسلے میں یہاں آئے ہیں۔ شیطان اور دیگر حضرات نے رضائیوں میں منہ سر لپیٹ رکھے تھے۔ ورنہ ضرور پہچانے جاتے۔ میں نے بات ٹالنے کے لئے اپنے کرکٹ میچ کا ذکر شروع کر دیا۔ کہ آج ہم ایک میچ جیت کر فائنلز میں آ گئے ہیں۔ دو روز کے بعد ہمارا میچ ہے چار روز تک رہے گا جس میدان میں میچ ہو گا وہ جج صاحب کی کوٹھی اور مینا بازار کے بالکل پڑوس میں تھا

وہ بولے — ہم ضرور دیکھیں گے۔ اسی ہفتے میں کئی چھٹیاں بھی ہیں۔ پکچر ختم ہوئی چلتے وقت میں نے کن انکھیوں سے رضیہ کو دیکھا۔ جو کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ جلدی سے اُس نے مُنہ پھیر لیا۔

ہمارے کلب کے کپتان گیدی صاحب تھے۔ اُن کا اصلی نام شاید زیدی تھا لیکن اُن کو گیدی ہی کہا جاتا تھا۔ اُن کا قد بہت چھوٹا تھا اور بقول شیطان وہ سطح سمندر سے ساڑھے چار فیٹ بلند تھے۔ اُن کے ساتھ ہر وقت اُن کے دو مشیر ہوتے۔ جو کافی دراز قد تھے۔ گیدی صاحب اُن کے درمیان میں چلتے شیطان

نے ان تینوں کا نام ایک سو ایک ـــــ ۱۰۱ ـــــ رکھا ہوا تھا۔ ـــ اُن کے مطابق ٹیم کی انتخابی کمیٹی بھی بتی بانسوں پر مشتمل تھی ـــ گیدی صاحب اور سمتھ۔ سمتھ کا اصل نام بلدیو سنگھ تھا۔ وہ بولر تھے۔ اور اُن کا خیال تھا کہ اُن کا سٹائل مشہور آسٹریلین بولر فلیٹ وڈ سمتھ سے بہت ملتا ہے۔ ہر وقت وہ یہی الاپتے رہتے۔ چنانچہ اُن کا نام بلدیو سنگھ سمتھ رکھا گیا۔ جو بعد میں سمتھ رہ گیا۔ اخبار میں بھی یہی چھپتا۔ بڈی بھی ہمارے کلب کا ممبر تھا۔ وہ اس ٹورنمنٹ کے تینوں میچ کھیل چکا تھا۔ امریکہ میں وہ بیس بال کھیلتا رہا تھا اور اچھا کھلاڑی تھا۔ کرکٹ بھی وہ بیس بال کھیلتا رہا تھا اور اچھا کھلاڑی تھا۔ کرکٹ بھی وہ بیس سال کی طرح کھیلتا، بلا ترچھا رکھتا۔ اور ہر وقت ہلتا رہتا۔ منہ میں چیونگ گم ہے منہ ہل رہا ہے۔ ہاتھوں میں ترچھا بلا ہے۔ ہاتھ ہل رہے ہیں۔ بلا ہل رہا ہے۔ خود ہل رہا ہے۔ جیسی بھی گیند آتی وہ ضرور بلا گھما دیتا۔ بعض اوقات سکور بھی کر لیتا تھا کیچ بہت اچھا کرتا تھا۔ اسی لئے اُسے سلپس میں کھڑا کرتے۔ ہر میچ میں دو تین کیچ اُس کے ہوتے۔ ہماری ٹیم میں دو تین اچھے کھلاڑی بھی تھے۔

پہلی مرتبہ ہم لگاتار تین میچ جیت کر فائنل کھیلنے والے تھے۔ دو روز کے بعد میچ تھا۔ ایک نہایت اچھے کلب کے ساتھ مقابلہ تھا۔ جیتنے والی ٹیم کے لئے ایک وزنی سا چیلنج کپ اور گیارہ چھوٹے چھوٹے کپ منتظر تھے۔

سہ پہر کو ساری ٹیم پریکٹس کے لئے آئی۔ گیدی صاحب بیٹنگ کی ترتیب مرتب کرنے لگے۔ شروع میں وہ اور مقصود گھوڑا تھے۔ بڈی ساتویں وکٹ پر۔ آٹھویں وکٹ پر میں اور نویں پر شیطان۔ شیطان نے بڑا حساب لگایا۔ جب اُنہیں پتہ چلا کہ وہ گیارہویں کھلاڑی ہیں تو مچل گئے۔ گیدی صاحب سے بولے

ـــــ مجھے گیارہواں کیوں بھیجا جا رہا ہے؟

بڈی نے جواب دیا ـــــ اس لئے کہ کوئی بارہواں نہیں ہوتا۔ گیدی بولے

ـــــ "کپتان صحیح اندازہ لگا سکتا ہے اور اُس کا نظریہ ہمیشہ درست ہوتا ہے"

شیطان بولے ـــ "ہر شخص کے دو نظریئے ہوتے ہیں ـ۔ اُس کا ذاتی نظریہ اور غلط نظریہ"

مصیبت یہ تھی کہ شیطان نہ بولر تھے : نہ بیٹسمین، نہ وکٹ کیپر۔ اور ان کا دعویٰ تھا کہ ایک اعلیٰ درجہ کی ٹیم میں پانچ اعلیٰ درجہ کے بیٹسمین ہونے چاہئیں۔ چار بہترین بولر۔ ایک وکٹ کیپر اور ایک وہ خود ـــ۔

ہر میچ میں شیطان کا سکور یا تو صفر ہوتا یا دو یا تین۔ ہر میچ کے بعد وہ یہی کہتے کہ اگر زندگی نے مہلت دی تو دکھا دوں گا۔ کرکٹ میں کیسے ہاتھ دکھاتے ہیں۔ بڈی نے کئی مرتبہ پوچھا بھی کہ کل کے میچ تک کیا تمہارا ارادہ اتنا بلند ہونے کا ہے۔ لیکن یہ شیطان کا محبوب فقرہ تھا۔

ہر روز جب مشرق سے سورج نکلتا ہے تو کلیاں کھل کر پھول بن جاتی ہیں تتلیاں جاگ اُٹھتی ہیں۔ پرندے چہچہانے لگتے ہیں۔ کائنات میں ہل چل مچ جاتی ہے۔ ہر روز سورج ڈوبتے وقت ایسی شفق پھولتی ہے کہ سب کچھ جگمگا اُٹھتا ہے چاندنی رات میں ایک عجیب سا فسوں آسمان سے زمین تک چھا جاتا ہے۔

ـــــ لیکن حکومت آپا کو اس کا علم تک نہ تھا۔

جس وقت ہم جج صاحب کی کوٹھی میں پہنچے تو عجب سہانا سماں تھا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری شعاعیں ٹہنیوں اور پتوں پر رقصاں تھیں۔ باغیچے میں ایک فوارہ چل رہا تھا۔ چند رنگ برنگے پرندے سیٹیاں بجا رہے تھے۔ گلاب کے پھولوں نے جیسے آگ سی لگا رکھی تھی ـــــ لیکن یہ سب کچھ بیکار تھا۔ کیونکہ بالکل نزدیک ہی حکومت آپا ایک کرسی پر بیٹھی تھیں۔

ہم دیر سے اُن کے ہاں نہیں گئے تھے۔ اور ہماری غیر حاضری میں وہ اپنے محبوب ترین مشغلے یعنی فضول کی بحث اور لڑائی جھگڑے سے لطف اندوز نہ ہو سکی تھیں۔ کیونکہ اس کے لئے کم از کم دو کی ضرورت ہے۔

حکومت آپا مجھ سے اس لئے بھی خفا تھیں کہ جب وہ موٹی ہو گئی تھیں۔ تو میں نے اُن کو دُبلا ہونے کا مناسب نسخہ نہیں بتلایا۔ میں نے فاقہ کشی کیلئے کہا وہ بولیں ـــ "نہیں کوئی کھانے کی ایسی چیز بتاؤ جس سے میں دُبلی ہو جاؤں۔" بڑی مصیبتوں کے بعد میں نے اُن کا لنچ چھڑایا۔ ایک روز جا کر دیکھا تو وہ اپنے پر پلاؤ کھا رہی تھیں تو میں نے اُن کا لنچ پھر شروع کرا دیا۔

شیطان کا خیال تھا کہ وہ صبح صبح شام کلیاں کھایا کرتی ہیں ـــــ ہمیں دیکھ کر وہ مسکرائیں اور سورج غروب ہو گیا۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ ہم اندر گئے سب ملے۔ رضیہ بھی ملی۔ اسی طرح منہ بنا رکھا تھا۔ جتنی دیر بیٹھی رہی۔ منہ موڑ کر اور چپ چاپ کچھ دیر کے بعد اُٹھ کر چلی گئی۔ ہمیں کھانے پر ٹھہرا لیا گیا۔ میں اکیلا بیٹھا ریڈیو سن رہا تھا۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ شیطان اور حکومت آپا کہاں چلے گئے۔ دیسے غائب ہیں۔ باہر نکل کر دیکھتا ہوں تو چاند نکلا ہوا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ ضرور یہ دونوں باغ میں ہوں گے اور وہاں گفتگو ہو رہی ہو گی۔ میں دبے پاؤں گیا۔ واقعی وہ دونوں فوارے کے پاس بیٹھے تھے۔ اور رومان انگیز باتیں ہو رہی تھیں۔ میں چھپ کر سننے لگا۔

شیطان بولے — "سچی مچ تم بہت پیاری معلوم ہو رہی ہو۔"

حکومت بولیں۔ "سچ مچ میرے پاس اس وقت روپے نہیں ہیں ورنہ ضرور قرض دے دیتی۔"

شیطان بولے — "یقیناً ان چند مہینوں میں تمہاری رنگت نکھر آئی ہے۔ جب تم جون میں آئیں تو تمہاری جون بدلی ہوئی تھی۔"

حکومت بولیں: "یقیناً میرے پاس روپے نہیں ہیں۔"

شیطان بولے — "روپے، ٹکا کون بے تم سے۔ بھلا ایسی رومان انگیز فضا میں جہاں باغ کا ایک گوشہ ہو۔ فوارہ چل رہا ہو۔ چاندنی چھٹکی ہوئی ہو اور تم سامنے ہو تو وہاں روپوں کا کیسے خیال آسکتا ہے۔ وہاں تو ایک معصوم سی آرزو دل میں کروٹیں لینے لگتی ہے —"

"سچ مچ —؟" حکومت آپا شرما گئیں۔

"ہاں سچ مچ!"

"بھلا اس وقت آپ کو کس چیز کی آرزو ہے؟"

"کلوروفارم کی —! — جانتی ہو حکومت! انسان کا سب سے بڑا دشمن کون ہے؟"

"کون ہے —؟"

"آئینہ! — اور کئی انسان آئینے کو بھی دھوکا دے جاتے ہیں۔ آئینہ کچھ کہے وہ ایک نہیں سنتے۔ اُن میں سے ایک تم بھی ہو۔"

اب حکومت آپا کچھ بگڑنے لگیں۔ شیطان جلدی سے بولے — "نہیں یہ بات نہیں ہے۔ وہ تو یونہی منہ سے نکل گیا تھا۔"

اب پھر رومانی باتیں ہونے لگیں۔ حکومت آپا بولیں — "رومانی ادب میں تمہاری محبوب کتاب کونسی ہے؟"

شیطان بولے — "ڈکشنری!"

حکومت شیطان کے چہرے کو غور سے دیکھتی رہیں پھر بولیں — "تمہاری ناک اتنی لمبی کیوں ہے؟"

شیطان نے ایک آہ بھری اور بولے — "کیا بتاؤں ناک لمبی کیوں ہے یہ فطرت کے راز ہیں۔ تم ہی بتاؤ کہ تمہارا ماتھا باہر کو کیوں نکلا ہوا ہے۔ تمہارے کان مڑے ہوئے کیوں ہیں۔ تمہارے دانت خرگوش کے دانتوں سے کیوں ملتے ہیں۔ حکومت تم اُن ہستیوں میں سے ہو جن سے اگر وقت پوچھا جائے تو گھڑی بنانے کا طریقہ بتا دیں۔ تم اُن ہمالیہ والوں کی طرح ہو جو آج یہاں ہیں — اور کل — کل بھی یہیں ہیں۔ آج سے پانچ سال پہلے سب کہتے تھے کہ اس لڑکی کا مستقبل نہایت لاجواب ہے۔ احباب سب یہی کہتے ہیں کہ اس لڑکی کا ماضی آج شاندار ہوگا۔"

اب تو باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی۔ اور سب مجھے بھی شامل ہونا پڑا۔ کھانے پر رضیہ کہیں دکھائی نہ دی۔ حکومت آپا شیطان سے دور اور مجھ سے نزدیک تھیں۔ سب فضول سا وقت گزرا۔ واپسی پر میں نے رضیہ کی بے رخی کا ذکر کیا۔ روٹھنے کی وجہ بتائی اور یہ بھی بتایا کہ اسی لئے میں نے مرلا سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے۔

شیطان بولے — "اگر میں تمہاری جگہ ہوں تو مرلا کو ہر وقت سائیکل پر بٹھائے پھروں۔ اور رضیہ کے گھر کے سامنے سے ہر روز دو مرتبہ گزارا کروں تاکہ وہ اچھی طرح دیکھ لے۔ یہ روٹھنا وٹھنا سب درست ہو جائے۔ میری مانو تو آج سے تم بھی رضیہ سے روٹھ جاؤ۔ مکمل طور پر روٹھو۔ پرسوں پکنک پر مرلا کو ضرور بلاؤ اور اُس کے ساتھ خوب کھیلیں کرو۔ اور پھر قدرت کا تماشہ دیکھو۔"

میں نے ان کو اپنا خواب سنایا جو رات کو میں نے دیکھا تھا — "میں نے دیکھا کہ رضیہ نے آسمانی اوڑھنی اوڑھ رکھی ہے۔ جس میں سنہرے تلے ہیں اور روپہلی گوٹا۔ رضیہ کے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ دمکتے ہوئے چہرے پر کالی کالی لٹیں بکھری ہوئی ہیں۔ اُس کے بیچ سے دانتوں —"

"تو جناب آج کل خواب بھی ٹیکنی کلر میں دیکھتے ہیں — سب سے اچھا خواب جانتے ہو کیا ہے؟"

"کیا ہے؟"

"یہی کہ کوئی خواب نہ آئے۔"

میں نے اپنی بیزاری کا اظہار کیا کہ جب سے رضیہ روٹھی ہے میں جیسے ہر وقت تنہا سا رہتا ہوں۔ شیطان بولے — "اگر تنہا رہتے ہو یا تنہائی سے ڈرتے ہو۔ تو کبھی شادی نہ کرنا۔" میں نے ایک رومان شروع کیا ہے۔ وہ بولے "تمہیں محبت کی ایک بہترین کہانی میں تمہیں سناتا ہوں — سنو — وہ بولا کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟ — وہ بولی نہیں — اور اس کے بعد وہ دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ کہو کیسی کہانی ہے۔ ہاں ایک اور یاد آگئی — یہ بھی سن لو — وہ بولی۔ ہم دونوں شادی کیوں نہ کر لیں — وہ بولا۔ لیکن ہم دونوں سے شادی کون کرے گا؟"

تیسرے روز ہمارا میچ شروع ہوا۔ کچھ چھٹیاں تھیں اور کچھ مینا بازار کا قرب۔ ویسے بھی وہاں چاروں طرف لاتعداد ریٹائرڈ بزرگ رہتے تھے۔ وہ سب کے سب آئے۔ ان کے ساتھ لڑکیاں آئیں۔ ہماری مخالف ٹیم کے ساتھ بھی اچھے لمبے چوڑے کنبے آئے ہوئے تھے۔ ہمارے کپتان نے حسب معمول ٹاس ہارا اور ہم فیلڈنگ کرنے چلے۔ لڑکیوں کی تعداد کا اندازہ ہمیں میدان میں پہنچ کر ہوا۔ جدھر نظر اُٹھاؤ رنگ برنگے ملبوس دکھائی دیتے تھے۔ بڈی بولا ——— ہرائے او ہرائے آج مجھے امریکہ یاد آرہا ہے۔ ہمارے کپتان گیدی صاحب بولے ——— دوستو اگر یہ میچ نہ جیتا تو آئندہ کھیلنا چھوڑ دیں۔ "آئندہ کھیلنا چھوڑ دیں گے" والا فقرہ وہ ہر میچ میں کئی مرتبہ کہتے۔ شیطان بولے اگر زندگی نے وفا کی تو دیکھنا تماشہ۔

بولنگ سمتھ اور میں شروع کیا کرتے تھے۔ گیدی صاحب نے چمکتی ہوئی نئی گیند میرے ہاتھ میں دی۔ اور میں فیلڈ جمانے لگا۔ شیطان کا اصرار تھا کہ اُن کو شامیانے کی طرف باؤنڈری لائن پر بھیج دیا جائے۔ غالباً اس لئے کہ وہاں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ بڈی سلپس میں تھا۔ تالیاں بجیں اور بیٹسمین شامیانے سے روانہ ہوئے۔ ایک صاحب بےحد موٹے تھے اور دوسرے بالکل ذرا سے تھے کم عمر بھی تھے۔ کسی نے بتایا کہ یہ کسی یار جنگ بہادر کے لڑکے ہیں۔ شیطان چونک کر بولے ——— "اچھا؟ ——— اتنا کم عمر اور ابھی سے ایک یار جنگ بہادر کا لڑکا کمال ہے۔"

جب وہ موٹے تازے حضرت امپائر سے پوچھ کر نشان لگا رہے تھے۔ تو شیطان نے پھر وہی رٹ لگا دی۔ آخر میں نے ان کو شامیانے کی طرف بھیج دیا۔ اُن موٹے تازے حضرت کا نام قلندر صاحب تھا ——— شاید قلندر بیگ یا قلندر حسین ہوں گے۔ یہ نام ہمیں یوں معلوم ہوا۔ کہ جب میری تیسری گیند اُن کی توند سے چھو کر وکٹ کیپر کے برابر سے گزر گئی تو یار جنگ بہادر کے صاحبزادے ادھر سے چلّائے ——— قلندر صاحب وہیں ٹھیریئے۔ سمتھ کے اوور میں پتہ چلا کہ چھوٹے صاحب کا نام چُنّو میاں تھا۔ سمتھ کی گیند پر اُنہوں نے ہٹ لگائی۔ اُدھر سے قلندر صاحب چلّائے ——— چُنّو میاں وہیں ٹھیریئے۔ دیر تک یہی ہوتا رہا۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کو وہیں ٹھیرنے کے لئے کہتے رہے۔

چُنّو میاں میرے سامنے آئے۔ میں خوب تیز گیندیں پھینک رہا تھا سب کی سب اُن کے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ ایک گیند پر اُنہوں نے کٹ مارنے کی کوشش کی اور گیند بڈی کے سامنے سے گزری لیکن اُس نے ہاتھ تک نہیں ہلایا۔ معلوم ہوا کہ آپ لڑکیوں کو دیکھ رہے تھے۔ مفت کی باؤنڈری ہو گئی۔ قلندر صاحب نے ایک گیند ہوا میں اُٹھا دی۔ گیند شیطان کی طرف جا رہی تھی۔ سب کو اُمید تھی کہ وہ کیچ کر لیں گے۔ لیکن اُنہوں نے گیند کی طرف دیکھا تک نہیں وہ کسی اور طرف دیکھ رہے تھے۔ گیند اُن کے پاس ہی گری۔ جب شور مچا تو شیطان چونکے۔ جتنی دیر میں گیند واپس آئی تین رنز ہو چکی تھیں۔ اب معلوم ہوا کہ سوائے بولر اور بیٹسمین کے ہر ایک رنگین لباسوں اور حسین چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب قلندر صاحب نے وکٹ کے سامنے ٹانگ اڑا دی۔ اور میں نے چلّا کر اپیل کی تو امپائر چونک پڑے ——— جیسے جاگ کر بولے ——— ایں؟ پھر آہستہ سے کہنے لگے۔ بھئی معاف کرنا میرا دھیان کسی اور طرف تھا۔ یہ امپائر اچھے خاصے قبر رسیدہ بزرگ تھے۔ وکٹ کیپر نے بھی کئی آسان سے کیچ چھوڑے سمتھ بولے ——— یار یہ لڑکیاں ہمیں ہرائیں گی۔ قلندر صاحب اور چُنّوں میاں تیس تیس سکور کر چکے تھے۔ شیطان نہ تو کیچ کرتے اور نہ گیند روکتے۔ تنگ آکر میں نے اُن کو نزدیک بلایا۔ گیدی بولے ——— بھئی اب ایک آدھ کو ضرور آؤٹ ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ معلوم ہوتا تھا کہ میں اور سمتھ ساری عمر بولنگ کرتے رہیں گے اور قلندر صاحب اور چُنّوں میاں ساری عمر کھیلتے رہیں گے۔ دفعتاً قلندر صاحب نے ایک گیند آسمان میں چڑھا دی ——— یہ کیچ میرا تھا۔ گیند اُوپر چڑھتی گئی۔ میں ہاتھ پھیلائے گیند کا منتظر تھا اور گیند نیچے آتی ہی نہ تھی۔ اس وقفے میں جیسے ساری زندگی میری آنکھوں کے سامنے آگئی۔ بچپن، لڑکپن ——— ساری شرارتیں ——— سب کچھ نگاہوں کے سامنے پھر گیا اور جب خدا خدا کر کے گیند نیچے آئی تو اتنی ذرا سی معلوم ہوئی جیسے زیرے کا دانہ ہو۔ میں نے اُچھل کر دونوں ہاتھوں میں گیند کو یُوں دبوچ لیا جیسے کوئی چھین لے گا۔

قلندر صاحب آؤٹ ہو گئے۔ جب وہ جا رہے تھے تو شیطان بولے ——— قبلہ اب آپ کے بغیر یہ میدان خالی خالی سا معلوم ہوگا ——— واقعی قلندر صاحب نہایت موٹے تھے۔ اب جو نئے صاحب آئے۔ اُنہوں نے شیطان کو دیکھا اور ان سے لپٹ گئے۔ شیطان نے اب تک کوئی اشتیاق ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ بولے ——— آپ مجھے پہچانتے ہیں میں وہی غلام فقیر ہوں۔ شیطان نے بغور دیکھا اور بولے ——— ممکن ہے کہ آپ وہی غلام ہوں لیکن فقیر وہ ہرگز نہیں ہیں جو پہلے تھے۔ وہ بولے ——— میں سچ مچ وہی ہوں، ذرا بدل گیا ہوں۔ پہلے سے میرا قد چھوٹا ہو گیا ہے۔"

لب وہ دونوں باتیں کر رہے ہیں۔ اور ہم سب انتظار کر رہے ہیں۔ آخر امپائر نے ڈلا تب غلام فقیر صاحب نے کھیلنا شروع کیا۔ میری پہلی ہی گیند کو اُنہوں نے لیگ کی طرف اُٹھا دیا۔ اور ایک صاحب کے پاس گیند آ گری۔ اُنہوں نے مڑ کر دیکھا تک نہیں۔ جب میں نے اُن کا نام پکارا تب چونک کر اُنہوں نے گیند اُٹھائی اور انداز کرم میری طرف پھینک دی۔ کچھ دیر میں لڑکیوں کی تعداد اور بھی بڑھ گئی اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ جس فیلڈر کی طرف گیند جاتی۔ فوراً اُس کا نام لے کر اسے مطلع کیا جاتا۔ تب گیند واپس آتی۔

چھنو میاں نے گھوم کر لیگ کی طرف ہٹ لگائی۔ آگے مقصود گھوڑا دنیا و مافیہا سے غافل مراقبے میں کھڑا تھا۔ دھم سے گیند اُس کے پیٹ میں لگی۔ اُس نے نعرہ لگا کر وہیں وہاں چھنو میاں آؤٹ ہوئے۔ اور اُن کو جاتے دیکھ کر سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایک کبھرو جیسے لیے حضرت تشریف لائے۔ آتے ہی انہوں نے ایک چھکا لگا دیا۔ گیند کی چمک ختم ہو چکی تھی۔ اور میری گیندیں بالکل سیدھی جا رہی تھیں۔ نہ کوئی بریک ہوتی تھی نہ کچھ۔ میں نے گیدی صاحب سے کہا کہ اب سلو بولر کو بلائیے۔ وہ بولے لنچ تک ٹھیر جاؤ۔ اتنے میں شیطان لپک کر آئے اور میرے کان میں بولے —— وہ جو دو لڑکیاں دیکھ رہے ہو۔ سفید شلوار اور نیلی ساری وہ چھنو میاں کی رشتہ دار معلوم ہوتی ہیں۔ اُن کے پاس ہی بیٹھی ہیں۔ دو وکٹیں سمجھو نے لیں۔ جب ہم لنچ کے لئے گئے۔ تو چار وکٹوں پر ایک سو پچیس سکور تھا۔ شیطان کے غلام فقیر چالیس ناٹ آؤٹ تھے اور اس میں اُنہوں نے کوئی بیس چالیس لئے ہوں گے۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ لنچ کے وقت کو کس طرح گزاروں۔ کیونکہ میں لنچ سے بے نیاز ہوں۔ ہجوم میں سے کسی نے ہلو کر دی)۔ میں نے دیکھا۔ سرلا کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ہلو کر کے میں بھی اُس کے پاس چلا گیا۔ نزدیک ہی رضیہ منہ بنائے بیٹھی تھی۔ میں جج صاحب اور حکومت آپا سے ملا۔ رضیہ کی طرف میں نے دیکھا تک نہیں۔ بلکہ اُس کے پاس ہی بیٹھ کر سرلا سے باتیں کرنے لگا۔

سرلا رضیہ جیسی حسین تو نہ تھی لیکن نہایت ہی ہنس مکھ اور مسخری لڑکی تھی جب دیکھو مسکرا رہی ہے۔ چہرہ کھلا ہوا ہے۔ اتنے میں چھنو میاں اُن دونوں لڑکیوں کو لئے ہوئے آئے۔ میرا تعارف کرایا گیا۔ شیطان کا کہنا درست تھا۔ وہ اُن کی بہنیں تھیں ہمارے ایک بوڑھے پروفیسر جو نزدیک ہی رہتے تھے۔ اپنی لڑکیوں سمیت آئے ہوئے تھے۔ وہ لڑکیاں بھی میرے پاس آ بیٹھیں۔ ایک ہم جماعت بھی مل گئی۔ خوب مزے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کہیں سے سو ڈیڑھ سو واقف لڑکیاں اور بھی آ جائیں۔ تاکہ آج رضیہ کے سامنے اُن سب سے باتیں ہوں۔ شیطان نے جب مجھے دیکھا تو فوراً لپک کر آئے لیکن میں نے جلدی سے حکومت آپا کو بُلا کر حکومت آپا کو بُلا کر شیطان کو اُن کے حوالے کر دیا۔ شیطان بولے —— یہ ہجوم کافی بدمذاق معلوم ہوتا ہے اب تک کسی نے ہمارا آٹوگراف نہیں لیا۔

لنچ کے بعد دونوں سلو بولرز آ گئے۔ میں اور شیطان شامیانے کے سامنے باؤنڈری لائن پکڑے ہوئے تھے۔ میں سرلا سے باتیں کر رہا تھا اور حکومت آپا شیطان سے باتیں کر رہی تھیں۔ شیطان کہیں اور دیکھ رہے تھے۔ سرلا نے مجھے ٹافیاں دیں جنہیں میں بڑی بے تکلفی سے وہیں کھانے لگا۔ گیدی صاحب پہلے ہی ہمیں ڈگ چکے تھے۔ اُن سے نہ رہا گیا۔ اُنہوں نے ہم دونوں کو سلپس میں بُلا لیا اور بڈھی کو ہماری جگہ بھیج دیا۔ کیونکہ بڈھی کا ہجوم میں کوئی واقف نہ تھا۔ اب شیطان بہت گھبرائے کیونکہ سلپس میں بہت سنجیدگی سے فیلڈ کرنا پڑتا ہے۔ کچھ دیر وہ سہمے ہوئے رہے اور یہی دعائیں مانگتے رہے۔ کہ کوئی کیچ نہ آ جائے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے باتیں شروع کر دیں۔ کچھ دیر کے بعد ہم خوب باتیں کر رہے تھے۔ ہمیں کچھ پتہ نہ تھا کہ آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ شیطان نے شکایت کی کہ میں نے چھنو صاحب والی دونوں لڑکیوں سے اُن کا تعارف کیوں نہ کرایا۔ میں نے بتایا کہ مجھے اُن سے قطعی دلچسپی نہیں ہے۔ کل تعارف کرا دیا جائے گا۔ اور میں شیطان کے بتائے ہوئے نسخے پر عمل کر رہا ہوں۔" بہت خوب —— اُنہوں نے مسکرا کر میری طرف ہاتھ بڑھایا۔" ملاؤ ہاتھ اسی بات پہ"—— شُوں سے ایک چیز آئی اور شپ سے شیطان کے ہاتھ سے چپک گئی —— لاحول ولاقوۃ، یہ تو گیند تھی۔ ایک صاحب بلا سنبھالے واپس جا رہے تھے۔ میدان تالیوں سے گونج اُٹھا۔ شیطان نے ایک نہایت لاجواب کیچ کیا تھا۔ اب ہم کھیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ پانچ وکٹوں پہ سکور ایک سو اٹھانوے تھا اور وہ غلام فقیر بیاسی ناٹ آؤٹ تھے۔ ارے! —— یہ تو سنچری پر تلا ہوا ہے۔ نئے صاحب آئے۔ شروع میں معلوم ہو رہا تھا کہ یہ اب آؤٹ ہوئے اب آؤٹ ہوئے۔ لیکن ذرا سی دیر میں وہ بھی جم گئے۔ چائے پر دو سو سکور تھا۔ پہلے میچوں میں چائے نہیں ہوتی تھی۔ لیکن یہ فائنل تھا۔ ایک اچھے خاصے ٹورنمنٹ کا —— ہم نے دیکھا کہ چاروں طرف بے رونقی تھی۔ بزرگ حضرات جا چکے تھے۔ اور لڑکیاں بھی اِدھر اُدھر ہو گئی تھیں۔

چائے کے بعد دو سو ایک پر گیدی صاحب نے نئی گیند لی۔ مجھے بلایا گیا۔ میں نے

بڑی تیز پھینکیں بریک کراتے۔ لیکن اُن فقیر صاحب پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تین گیندیں تو وہ اور بھی محتاط ہو گئے تھے۔ اُدھر پُرانے 'سپاٹ' صاحب جو سارا دن کھڑے رہ کر تھک آ چکے تھے۔ اپنے پُرانے قصے سُنا رہے تھے۔ جب میں چھوٹا تھا تو یہ کیا کرتا تھا۔ جب میں چھوٹا تھا تو یہ بات ہوا تھی۔ شیطان بولے — چھوڑو بھی آپ سچ مچ کبھی چھوٹے بھی تھے۔ اور وہ ناراض ہو گئے — فقیر صاحب نے بیہودگی کے آگے ٹانگ اڑا دی۔ دھپ سے گیند لگی اور میں نے اپیل کی۔ اُنہوں نے اُسی خفگی میں سر ہلا کر انکار کر دیا۔ شیطان کی اس حرکت سے اُن فقیر صاحب کی جان بچ گئی ورنہ اس مرتبہ تو وہ سچ مچ آؤٹ تھے —— غضب خدا کا — اب اُن کا سکور نوّے تھا۔ بڈی نے مجھے مشورہ دیا کہ دوسرے کھلاڑی کو پار کر دو۔ میں نے ایک یارکر پھینکا اور بڈی کا مشورہ نہایت کارآمد ثابت ہوا۔ سمتھ نے دوسری طرف سے کئی یارکر پھینکے۔ لیکن فقیر صاحب بڑے مزے سے کھیلتے رہے۔ شام کو سات وکٹوں پر سکور دو سو چالیس تھا۔ اور فقیر صاحب ننانوے ناٹ آؤٹ تھے۔

ہم لوگ بیحد بیزار تھے۔ ایک بڈی غریب تھا جو سب کو ہنسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اُس کے لطیفوں پر کوئی ہنستا ہی نہ تھا۔ سب یہی کہتے کہ بھئی یہ تو ہم نے پہلے سے سُن رکھا ہے۔ حالانکہ بڈی کے لطیفے ہمیشہ نئے ہوا کرتے تھے۔ بڈی کہیں سے موٹر لایا ہوا تھا۔ ہم تینوں روانہ ہوئے۔ شیطان بولے —— یار بڈی ذرا آہستہ چلاؤ تم موٹر ہمیشہ اسی طرح چلاتے ہو جیسے کسی حادثے کا ریہرسل کر رہے ہو۔

اگلے روز صبح صبح اخبار جو پڑھتے ہیں۔ تو اُس میں شیطان کی خوب تعریفیں تھیں۔ شیطان کے ایک کیچ کا ذکر نصف کالم میں تھا۔ اُدھر فقیر صاحب کی خوب بُرائیاں کی ہوئی تھیں۔ میں نے شیطان سے پوچھا بھی، وہ بولے اخبار کا رپورٹر وہاں موجود تھا۔ یہ اُس کی بے لاگ رائے ہے۔ شیطان ایک کیمرہ لائے ہوئے تھے، بولے۔ آج چنو میاں اور اُن کی دونوں بہنوں کی تصویریں اُتاروں گا اور سرلا کی بھی۔ شیطان نے سرلا کی تعریفیں شروع کر دیں۔ غالباً اُن کا ارادہ اُس پر عاشق ہونے کا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اُن کو روکا۔ وہ اس شرط پر مانے کہ میں اُن دونوں لڑکیوں سے اُن کا تعارف آج ضرور کرا دوں۔

میں نے رضیہ کا ذکر کیا کہ ڈھونڈ کر بھی دیکھ لیا۔ وہ بدستور خاموش ہے شیطان بولے۔ تم دیکھتے جاؤ۔ اگر خود آکر سلام نہ کرے تو سہی۔ تم آج دن بھر سرلا کے ساتھ رہنا۔ ہم سائیکلوں پر روانہ ہوئے۔ راستے میں سرلا ہی شیطان آہستہ سے بولے —— میں چلتا ہوں اتم اسے سائیکل پر بٹھا لو۔ اور یہ خیال رہے کہ رضیہ تم دونوں کو ضرور دیکھ لے۔

مسکراتی ہوئی سرلا مجھے دیکھ کر اور بھی مسکرانے لگی۔ میں نے اُسے آگے بٹھا کر لڑکیوں میں آتا یہاں رضیہ نے بخوبی دیکھ لیا۔ سرلا نے مجھے ایک رنگین ربن کا ٹکڑا دیا —— بولی۔ — یہ لیجئے —— گڈ لک کے لئے۔ ٹینس کے میچ سے پہلے وہ ہمیشہ مجھے ربن کا ایک ٹکڑا دیا کرتی تھی۔ جج صاحب ملے، بولے اور کچھ بھی ہو جائے۔ لیکن اُس لڑکے کی سنچری نہیں ہونی چاہیئے۔ وہ نہایت بری طرح کھیلا ہے۔ اگر وہ ایک اور رن بنا گیا تو مجھے سخت افسوس ہوگا۔ تم لوگوں کی فیلڈنگ بہت بری ہے۔ تم نے سکور بہت زیادہ کرا دیا ہے کہیں ہار نہ جاؤ۔ کھیل شروع ہوا۔ ہم بالکل بیزار تھے۔ میرے اوور میں فقیر صاحب نے کچھ نہیں کیا۔ وہ ہر گیند کو روک لیتے تھے۔ ہجوم خاموش تھا۔ سب اُن کی سنچری کے منتظر تھے۔ شیطان پھر شامیانے کے سامنے باؤنڈری لائن پر کھڑے تھے۔ اُن دونوں لڑکیوں کے بالکل قریب۔ ایک اوور وہ وہاں ہوتے اور دوسرے اوور میں میدان عبور کر کے دوسری طرف جانا پڑتا۔ سمتھ کا اوور آیا لیکن شیطان وہیں کھڑے رہے۔ چند گیندوں کے بعد دفعتاً اُنہیں خیال آیا کہ وہ غلط جگہ کھڑے ہیں۔ وہ سرپٹ بھاگے۔ جب وہ میدان عبور کر رہے تھے تو ایک گیند اُن کے قریب سے گذری اور اُنہوں نے یُونہی پکڑ لی —— کیچ ہو گیا۔ کھلاڑی نے بڑی اچھی ہٹ لگائی تھی اور جہاں شیطان نے کیچ کیا۔ وہاں آس پاس کوئی فیلڈر نہ تھا۔ شیطان نے پھر ایک حیرت انگیز کیچ کیا تھا۔ تالیاں بجنے لگیں، سب نے یہی سمجھا کہ شیطان گیند کو اچھی طرح سمجھ کر خود بھاگے تھے۔ سکور وہی تھا۔ لیکن فقیر صاحب ابھی تک ننانوے ناٹ آؤٹ تھے۔ اور ہم سب کے سینوں پر مونگ دل رہے تھے۔

یکایک ہجوم میں سے کسی بزرگ نے چلا کر کہا —— کہ اُس سے بولنگ کراؤ جس نے ابھی کیچ کیا ہے۔ گیدی صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی۔ شیطان کو بلا کر گیند ہاتھ میں دے دی۔ شیطان بڑے گھبرائے کیونکہ آج تک اُنہوں نے کبھی میچ میں بولنگ نہیں کی تھی۔ دوسرے یہ کہ اُن کے سامنے اُن کے غلام فقیر کھڑے تھے۔ جن کا سکور ننانوے ہو چکا تھا۔ فیلڈ جمائی گئی تھی۔ اس لئے

صاحب نے پوچھا ــــ تم تیز گیند پھینکتے ہو یا آہستہ؟ شیطان بولے: مجھے کیا پتہ؟ ابھی پھینک کر دیکھوں گا۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگے کہ کتنے فاصلے سے دوڑ کر آتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہر بولر کا دوڑنے کا فاصلہ مختلف ہوتا ہے۔ انہوں نے کئی مرتبہ قدم گنے اور مختلف جگہوں پر نشان لگائے۔ گیدی صاحب نے فیلڈ کھڑی کی۔ نیا کھلاڑی آچکا تھا۔ اب جو کچھ ہوا وہ شیطان اور کرکٹ دونوں کے لئے ایک معجزہ تھا۔ اور بقول شیطان کرکٹ کی تاریخ میں سنہری الفاظ سے لکھے جانے کے قابل تھا۔ شیطان نے گیند رومال سے خوب صاف کی۔ اِدھر اُدھر دیکھا، اور عجب بے ڈھنگے طریق سے بھاگنا شروع کیا۔ وکٹوں کے پاس آکر ان کے قدم غلط ہو گئے۔ اور ایک نہایت ہی بیہودہ گیند انہوں نے پھینکی۔ فقیر صاحب نے آگے بڑھ کر بلا گھمایا اور ایک غدر مچ گیا۔ چیخیں سنائی دینے لگیں۔ میدان تالیوں سے گونج اُٹھا ــــ فقیر صاحب کی سنچری پر نہیں بلکہ اُن کے آؤٹ ہونے پر۔ شیطان نے اُن کی وکٹیں اڑا دیں ــــ سنچری نہیں ہوئی۔ وہ ننانوے پر آؤٹ ہو گئے۔ ــــ شیطان نے سچ مچ کمال کر دیا۔ اسکور وہی دو سو چالیس تھا۔ شیطان بولے ــــ بس اب کسی اور سے بولنگ کراؤ۔ میں گھبرا رہا ہوں۔ گیدی بولے بھئی اوور تو ختم کر دو۔ شیطان کی تیسری گیند پر کھلاڑی نے ہٹ لگائی اور بھاگا۔ بڈی نے نہایت پھرتی سے گیند روکی اور وکٹ میں نشانہ لگایا ــــ اُسے رن آؤٹ کر دیا۔ شیطان بولے یہ بھی میری ہی وکٹ رہی۔ یہ خاص رن آؤٹ کرانے والی گیند تھی۔

شیطان کی خوب تعریفیں ہوئیں۔ شاباش دینے کے بہانے سے انہیں پیٹ کر رکھ دیا گیا۔ اسکور وہی دو سو چالیس تھا اور ساری ٹیم آؤٹ ہو چکی تھی۔

اب ہماری اننگز شروع ہوئی۔ میں اور سرلا رضیہ کے قریب بیٹھے تھے۔ اور وہ دزدیدہ نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ رضیہ نہایت پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ آج اُس نے میرا پسندیدہ لباس پہن رکھا تھا۔ بال بھی میری پسند کے مطابق بنائے ہوئے تھے۔ گلے میں وہ سادہ سا ہار تھا جو میں نے اسے دیا تھا۔

مخالف ٹیم فیلڈ کرنے چلی۔ اور شیطان کیمرہ لے کر پہلے اُن کی تصویریں اُتاریں۔ باقاعدہ پوز کرا کے ــــ پھر گیدی صاحب اور مقصود گھوڑا لیے کر شامیانے سے پہلے ــــ شیطان نے اُن کی تصویریں اُتاریں۔ میں نے اُن دونوں لڑکیوں سے شیطان کا تعارف کرا دیا۔ . . . . . .

اور اب خوب باتیں ہو رہی تھیں۔ شیطان کی ہدایت کے مطابق ہم نے [illegible]

ٹافیاں اور چوسنے کی گولیاں تقسیم کیں۔ رضیہ ہماری طرف [illegible] دیکھ رہی تھی۔ لیکن ہم دیر تک شامیانے میں نہ بیٹھ سکے۔ یا ہمارے [illegible] نہایت ہی اچھے تھے یا ہمارے بیٹسمین شامیانے کی طرف دیکھتے رہے۔ [illegible] جاتا وکٹوں کے ہاتھ لگا کر واپس آ جاتا۔ جب ساتویں وکٹ پر بڈی [illegible] کر گیا تو اسکور پچیس تھا۔ بڈی کے منہ میں چیونگم تھا۔ اور [illegible] جاتے ہی اُس نے ترچھے بلے سے ایک چوکا لگا دیا۔ اگلی گیند پر چوکا۔ پھر چھکا، پھر چوکا۔ غرضیکہ بولروں کے چھکے چھڑا دیئے۔ اُدھر [illegible] بڑی چلتا اور [illegible] گیند زمین پر پڑتی وہیں ہٹ لگتی۔ وہ تیز [illegible] قسم کی بولنگ کرا کے [illegible] گیا۔ میں نے کوشش کی کہ بڈی کی مدد کروں [illegible] میں آؤٹ ہو گیا۔ شیطان گئے اور حسب معمول پہلی گیند پر واپس آ گئے۔ ــــ ساری ٹیم ننانوے پر آؤٹ ہو گئی۔ اُسی ننانوے پر [illegible] کا اسکور تھا۔ غضب ہو گیا۔ اور ہماری ٹیم کی ننانوے میں بڈی کا [illegible] کا اسکور جو کرکٹ [illegible] بال کی طرح کھیلتا تھا۔ [illegible] کا کھلاڑی نہیں ہوتا تھا۔ جج صاحب نے فیصلہ صادر فرما دیا کہ ہم [illegible] گیدی صاحب ہمت ہار بیٹھے تھے۔ سب لنچ کے لئے چلے گئے اور میں [illegible] کے پاس آ بیٹھا۔ وہ بولی چلئے باہر گھاس پر بیٹھ کر چلغوزے [illegible] کھائیں۔ ہم باہر چلے گئے۔ سرلا اپنی کسی سہیلی حمیدہ کا ذکر کر رہی تھی [illegible] کہ وہ بہت پسند کرتی تھی۔ اتنے میں شیطان آ گئے۔ بولے ــــ حمیدہ وہ تو نہیں جو لباس بہت اچھا پہنتی ہے؟

سرلا بولی ــــ ہاں

"اور جیسے لباس لگتا بھی اچھا ہے؟"

"ہاں!"

"اور جو بلا کی حسین ہے۔"

"ہاں!"

"اور جو گاتی بھی خوب ہے۔"

"ہاں! ـــــ کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

"نہیں، ابھی تک تو نہیں جانتا لیکن جاننا چاہتا ہوں، کیا آپ کبھی اُس سے میرا تعارف کرا دیں گی؟"

سرلا بولی ـــــ ضرور

شیطان حمیدہ کو بالکل نہیں جانتے تھے۔ ہم دونوں نے اُس لڑکی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر حمیدہ کی باتیں ہونے لگیں۔ شیطان بڑا اشتیاق ظاہر کر رہے تھے۔ دفعتاً ہمیں ایک ایسی ہستی نظر آئی کہ شیطان کے دیوتا کوچ کر گئے یہ مس ریچھ تھیں، مس ریچھ پر شیطان چند ماہ پہلے بُری طرح عاشق تھے۔ عاشق کیا بالکل دیوانے بنے ہوئے تھے۔ اُدھر مس موصوفہ میں کوئی بات ایسی نہیں تھی جس پر کوئی عاشق ہوتا ہوا اچھا لگے۔ یہ نام اُن کو بہت زیب دیتا تھا۔ وہ خوب طویل، عریض تھیں۔ اُن کی دائرہ شیطان کو کبھی پسند کرتی تھیں کبھی ناپسند۔ وہ بھی اُسی سانچے کی بنی ہوئی تھیں۔ بس ذرا پُرانا ماڈل تھیں۔ بعض اوقات تو وہ اپنی بیٹی سے قدرے حسین معلوم ہوتی تھیں۔ شیطان کا خوب مذاق اُڑتا ـــــ ریچھوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں ـــــ سو نعمتیں کھا کھا کے پلا ریچھ کا بچہ ـــــ تو ہی اداس چند ریچھوں پر قناعت کر گیا ـــــ مانا کہ تیرے ریچھ کے قابل نہیں ہوں میں، تو اپنا ریچھ دیکھ میرا انتظار دیکھ ـــــ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن شیطان باز نہ آئے اور اس وقت تک عاشق رہے جب تک اُن کا مُوڈ عاشقانہ رہا۔ پھر خود بخود راہِ راست پر آ گئے۔ بابی کا خیال تھا کہ شیطان مس ریچھ پر اس لئے عاشق ہوئے ہیں کہ اس وقت اور کوئی عاشق ہونے کے لئے نہیں ہے۔ اُن سے تعارف نہایت ہی پُرلطف طریقے سے ہوا یوں کہ میں اور شیطان چھٹیوں میں کہیں سے آ رہے تھے۔ شیطان مارے غصے کے ہم سیکنڈ میں سفر کر رہے تھے۔ ایک جنکشن پر گاڑی بدلی۔ دوسری گاڑی چلنے والی تھی۔ بھاگا دوڑی میں سامان رکھوا رہے تھے۔ کہ ہجوم میں ہمیں ایک سفید ریش نشتر، فقیر دکھائی دیا جو ایک بچے کی انگلی پکڑے جا رہا تھا۔ فقیر کافی بڑھا تھا اور قدرے

گھبرا بھی تھا۔ شیطان کو ایسے موقعوں پر فوراً ترس آ جاتا ہے۔ اپنا چپس ٹٹول کر بولے ـــــ میرے پاس نوٹ ہیں۔ تمہارے پاس کچھ ٹوٹا ہوا ہو تو اس بیچارے بوڑھے کو دے دو۔ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔ گھبراہٹ میں کچھ بھی نہیں۔ بڑی مشکل سے وہ آنے لے جلدی سے اُس فقیر کو دیئے۔ اور قلیوں کے پیچھے بھاگے۔

سیکنڈ میں کافی جگہ تھی۔ گاڑی چلنے سے ذرا پہلے کسی کا بہت سا سامان آ گیا۔ اس کے بعد ایک سالم کنبہ۔ اور اس کے بعد وہی فقیر اُسی بچے کے ساتھ سیکنڈ میں آ بیٹھا۔ سارا کنبہ اُسے ابا جان کہہ رہا تھا ـــــ لاحول ولا قوۃ! ـــــ ہم بڑے شرمندہ ہوئے وہ بزرگ جو ہمیں اُس وقت فقیر معلوم ہوئے نہایت معزز قسم کے حضرت نکلے۔ دراصل کچھ تو اُن کا لباس سادہ تھا۔ کچھ ہم گھبرائے ہوئے تھے۔ اور کچھ شیطان کو ترس زیادہ آ گیا تھا۔ اُنہوں نے ہمارے دو آنے واپس کئے اور بڑے مزے کی باتیں ہوئیں۔ اُسی کنبے میں مس ریچھ بھی تھیں۔ اب شیطان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً عاشق ہو گئے۔ واپسی میں بدی کو بتایا گیا وہ بولا۔ شاید یہ پانچویں لڑکی ہے جس پر تم اس سال عاشق ہوئے ہو۔

شیطان بولے ـــــ نہیں چوتھی ہے، ایک لڑکی پر میں دو بار عاشق ہوا تھا۔

جب شیطان رُو بہ صحت ہوئے تو مس ریچھ سے میلوں پرے بھاگنے لگے۔ کیا تو اُن کے درشن کے لئے بیتاب رہتے تھے۔ اور کیا اب اُن کے درشن سے بیزار ہونے لگے۔ اور اکثر کہا کرتے کہ جن جن باتوں پر پہلے شرم آتے ہوئے فخر محسوس ہوتا تھا اُن ہی باتوں پر اب فخر محسوس کرتے ہوئے شرم آتی تھی۔

وہ تو شیطان کی خوش قسمتی سے مس ریچھ نے ہمیں دیکھا نہیں ورنہ وہ سیدھی ہماری طرف آتیں۔

ـــــــــــــــ

جب ہم فیلڈ کرنے بار رہے تھے تو ننھی آئی بولی ـــــ آپ اس طرح گیند کیوں نہیں پھینکتے۔ پوچھا۔ کس طرح؟ بولی اسی طرح جیسے اُس روز پھینکی تھیں۔ پوچھا۔ کس روز؟ بولی ـــــ میں بھول گئی ٹھہریئے ابھی پوچھ کر آتی ہوں اور سیدھی رضیہ کے پاس گئی۔ اچھا تو یہ سب رضیہ صاحبہ ہمیں ہدایت دے رہی تھیں۔ ننھی نے مجھے ایک کاغذ کا پرزہ لا کر دیا جس پر لکھا تھا۔ "بیگ تھیوری

خیال تو اچھا تھا لیکن مصیبت وہی کیچ کرنے کی تھی۔

ان کی دوسری اننگز شروع ہوئی۔ گیدی صاحب نے بڑی غلطیاں کیں۔ ایک تو یہ کہ ستھو کو بہت جلد ہٹا لیا۔ اُس کی جگہ شیطان سے بولنگ کرائی۔ سب نے کہا کہ سچ جو کچھ ہوا اتفاقاً ہو گیا، لیکن گیدی نہ مانے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شیطان کی خوب پٹائی ہوئی۔ پھر گیدی صاحب کو جوش آیا۔ تو اُنہوں نے خود بولنگ کی۔ اور وہ گیندیں پھینکنی شروع کیں جن کے متعلق اُن کا خیال تھا کہ گگلی ہیں لیکن کچھ نہ بنا۔ شیطان بار بار مجھ سے شرط بدتے "لگتے ہو دس روپے —— یہ کھلاڑی پچاس سے اوپر سکور کرے گا۔" میں انکار کرتا تو فوراً کہتے —— "اچھا چلو لگاتے ہو دس روپے —— یہ کھلاڑی پچاس سے نیچے سکور کرے گا۔" میں برابر انکار کرتا رہا کیونکہ میرے روپے ختم ہو چکے تھے۔ شیطان نے کہا کہ حکومت آپا سے اُدھار لے لو۔

جب ہم چائے پینے لگے تو سکور ڈیڑھ سو تھا اور صرف چار کھلاڑی آؤٹ ہوئے تھے وہ بھی ابھی کہیں رہے تھے اس پر تو انہوں نے شیطان سے بالکل بات نہیں کی شاید خفا ہو گئے گیدی صاحب تک ناامید ہو چکے تھے جج صاحب نے بھی بیزاری کا اظہار کیا یعنی میچ کا نتیجہ صاف نظر آ رہا ہے لیکن سرلا نے بڑی ہمت بندھائی، بولی۔ آپ ضرور اچھا کھیلیں گے۔ میں نے وہ ربن جو دیا تھا۔ نیچی پھر آئی بولی آپا کہہ رہی ہیں کہ آپ نے ہمارا کہنا نہیں مانا۔ بیس [illegible] سے کہو کہ ابھی جاتا ہوں۔ میں نے گیدی صاحب سے لیگ تھیوری کے لئے کہا۔ وہ بہت گھبرائے۔ بمشکل رضامند ہوئے۔ دن بھر کے کھیل سے وکٹ کافی خراب ہو چکی تھی۔ پہلی گیند ایسی تیز بریک ہوئی کہ میں حیران رہ گیا۔ خود بخود لیگ بریک ہو رہے تھے۔ اتنی تیز گیندوں پر۔ گیدی صاحب بولے یہ اتنے تیز لیگ بریک تم نے کب سے شروع کئے؟ —— میں نے کہا —— آج سے۔ بلکہ ابھی سے۔ تیسری گیند پر بڈی نے لیگ پر ایک نہایت خوبصورت کیچ کیا اور فقیر صاحب شامیانے کی طرف چل دیئے۔ فقیر صاحب کے آؤٹ ہونے پر سب خوش ہوئے —— سوائے فقیر صاحب کے اگلی گیند پر کھلاڑی نے گلانس کیا اور بڈی نے زمین پر لیٹ کر گیند دبوچ لی اب تو شور مچ گیا۔ دو گیندوں پر دو کھلاڑی آؤٹ۔ آوازیں آ رہی تھیں کہ ہیٹ ٹرک کرو ہیٹ ٹرک کا خیال ہی ایسا ہے کہ مجھے پسینہ آ گیا۔ لوگ طرح طرح کے مشورے مجھے دے رہے تھے۔ میں نے انتہائی گھبراہٹ میں گیند پھینکی۔ گیند بالکل معمولی سی تھی۔ کھلاڑی نے گھوم کر لیگ کی طرف —— لگانے کی کوشش کی۔ گیدی صاحب نے اُچھل کر ہوا میں کیچ کرنے کی کوشش کی۔ اُن کا ہاتھ پہنچا بھی، گیند ہاتھ سے چھوئی بھی لیکن کیچ نہ ہوا گیند کا رُخ بدل گیا۔ دوسرے فیلڈر نے پھرتی سے ہاتھ پھیلایا لیکن کیچ پھر بھی نہ ہوا میں ناامید ہو گیا کہ اب کوئی نہیں کیچ کر سکتا۔ فیلڈر کے ہاتھ سے گیند چھوٹی اور رخ کچھ بدل گیا اتنے میں بڈی بجلی کی طرح تڑپا اور گرتی ہوئی گیند دبوچ لی —— ہیٹ ٹرک ہو گیا۔ سچ مچ کا ہیٹ ٹرک —— جس کے خواب دیکھے جاتے ہیں —— جس کی بڑی ڈینگیں مارتے ہیں۔ گیدی صاحب نے اپنا چھوٹا سا ہیٹ میرے سر پر رکھ دیا۔ میں نے وہی ہیٹ بڈی کے سر پر رکھ دیا تالیوں کے شور میں مجھے رضیہ کی تالیاں بالکل علیحدہ سنائی دے رہی تھیں۔ یہ ہیٹ ٹرک اُسی کا تھا۔ میرے گلے اور میں بڈی نے پھر ایک لاجواب کیچ کیا ایک کیچ ستھو نے بہت دور باؤنڈری لائن پر کیا۔ آخری کھلاڑی کو میں نے [illegible] سے واپس بھیج دیا۔ ایک سو اٹھاون پہ ساری ٹیم آؤٹ۔ میں نے لگاتار چھ وکٹیں لی تھیں، محض لیگ تھیوری کی بدولت اور یہ مشورہ رضیہ کا تھا۔ ہماری ٹیم اب چست ہو گئی تھی۔ سب کے چہروں پر اُمید کی جھلک تھی۔ سرلا نے دوڑ کر میرا استقبال کیا اور بولی —— دیکھا میں کہتی نہ تھی۔ شیطان میرے کان میں بولے۔ اگر تم مجھے کسی طرح ریچھ سے محفوظ رکھو تو کل کے اخبار میں تمہاری تعریفیں ہی تعریفیں ہوں گی۔ پوچھا —— کیونکر؟ بولے —— رپورٹر میرا دوست ہے اور وہ سب کچھ میرے کمرے میں بیٹھ کر لکھتا ہے۔ میں اُن کو بڑی حفاظت میں حکومت آپا کے پاس لے گیا۔ وہاں ریچھ تو کیا بھوت پریت بھی شیطان کے پاس نہیں پھٹک سکتے تھے۔

ننھی نے مجھے ایک چاکلیٹ دیا۔ پوچھا کس نے دیا ہے؟ بولی —— آپا نے۔ پوچھا —— کونسی آپا نے؟ بولی —— نہیں بتاتے۔ میں نے سر ہلا دیا —— ہم نہیں لیتے۔ بولی —— رضو آپا نے۔ میں نے ایک پرزے پر "شکریہ" لکھ دیا —— یہ رضو کو دے دینا۔ وہ بولی —— آپ ادب نہیں کرتے ہماری آپا کا، صرف رضو کہتے ہیں —— رضو آپا نہیں کہتے۔ میں نے کہا —— آپا ہوں گی تمہاری، ہماری تو وہ صرف رضو ہیں۔ بولی۔ میں ابھی جا کر کہتی ہوں۔

اب ہمیں جیتنے کے لئے صرف تین سو رنز درکار تھیں۔ برابر ہونے کے لئے دو سو ننانوے اور ہارنے کے لئے دو سو اٹھانوے، ڈھائی سو یا دو سو۔ مقصود گھوڑا منہ بنا کر بولا —— "قسم ہے رانجی کی میں اس اننگز میں ایسا کھیلوں گا کہ سب عش عش کر اٹھیں گے۔ ستھو نے سُکا ہوا میں ہلا کر کہا —— "اور قسم ہے

بیٹسمین کی ہیں پاس اننگز میں ضرور سکور کروں گا۔ شیطان بولے— قسم ہے ٹماٹو کی کہ— کسی نے فوراً ٹوک دیا کہ ٹماٹو تو ٹینس کا کھلاڑی ہے۔ شیطان بولے— "اچھا تو قسم ہے گاما پہلوان کی میں سنچری ضرور کروں گا۔"

بڈی چیونگ گم چباتا ہوا بولا— "قسم ہے مکی ماؤس کی میں بھی کچھ نہ کچھ کر کے رہوں گا۔"

شام ہو چکی تھی، کل تیس پینتیس منٹ باقی تھے۔ وکٹ خراب ہو چکی تھی اور روشنی بھی کم تھی۔ گیدی صاحب اور اُن کے لمبے لمبے مشیروں نے کچھ کانفرنس سی کی اور بولے— اگر شروع کے اچھے کھلاڑی اس وقت گئے تو کہیں آؤٹ نہ ہو جائیں۔ بہتر یہی ہوگا کہ آخری کھلاڑیوں میں سے دو کو بھیج دیں۔ اگر وہ آؤٹ بھی ہو گئے تو کوئی نقصان نہ ہوگا۔ ممکن ہے یہ وقت نکال جائیں۔ پھر کل اصلی کھیل ہوگا۔ مجھے اور بڈی کو چُنا گیا۔ ہمیں بے شمار ہدایتیں دی گئیں کیونکہ آج تک ہم دونوں میں سے کوئی شروع میں نہیں گیا تھا۔ بڈی کی بڑی منتیں کی گئیں کہ بس گیند روک لینا ہٹ وغیرہ ابھی مت لگانا۔ ویسے بیٹسمین تو میں بھی ایسا ویسا ہی تھا لیکن اُن دنوں کرکٹ کی کتابوں سے مشہور کھلاڑیوں کے سٹائیل نقل کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ میں اور بڈی میدان میں گئے تو چاروں طرف تالیاں بج رہی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بہت مشہور بیٹسمین ہوں اور ابھی کچھ کا کچھ کر کے رکھ دوں گا۔ کھیل شروع ہوا، چمکتی ہوئی گیند بجلی کی طرح آتی تھی اور جھلک دکھا کر نہ جانے کہاں غائب ہو جاتی۔ میں بلا لئے دیکھتا رہ جاتا۔ پہلے دو اوورز میں ایک گیند بھی نہ چھو سکا ایک گیند بولر کے ہاتھ سے نکلی۔ خیال آیا کہ کٹ کروں، ابھی دہنا پاؤں اٹھایا ہی تھا کہ گیند کا رخ بدل گیا۔ سوچا کہ ڈرائیو کروں گا۔ گیند کا رُخ اور بھی بدل گیا میں ہُک کی تیاری کر رہا تھا کہ روکنے میں مصلحت سمجھی اور لیگ پر خواہ مخواہ گلانس ہو گیا۔ گیند نہایت تیز تھی باؤنڈری ہو گئی۔ اب کچھ ہمت بندھی۔ جہاں گیند زمین پر پڑتی اچھل کر وہیں اُسے روک لیتا لیکن میں بالکل کتاب کی نقل کر رہا تھا سیدھے بلے سے جب گیند کو آئینہ دکھاتا تو نعرے لگتے۔ "بہت اچھے" "شاباش"۔ بڈی کو گیند روکنا مصیبت ہو گئی۔ ہر گیند پر وہ ہٹ لگانے کے لئے بلا اُٹھاتا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر صرف روک دیتا [illegible] کرتا بالکل ایسے عجیب طریقے سے روکتا کہ کچھ دیر میں گیند کی [illegible] سب [illegible] خدا خدا کر کے وقت ختم ہوا جب ہم تالیوں کے شور میں شامیانے کی طرف لوٹے تو میں گیارہ ناٹ آؤٹ تھا اور بڈی بارہ ناٹ آؤٹ۔ کپتان صاحب نے بڑی شاباش دی بولے— اب تم کل اچھی طرح کھیلنا تین سو سکور ہے تو زیادہ۔ لیکن کرکٹ میں کچھ [illegible] جاؤ۔

رات کو میں نے شیطان سے تصویروں کے متعلق پوچھا کہ فلم کب دھلواؤ گے بولے— کونسی فلم؟— میں نے کہا کہ آج جو تصویریں کھینچی تھیں وہ فلم۔ بولے— کیمرہ تو خالی تھا۔ آج کل فلمیں ملتی کہاں ہیں۔ پوچھا— تو پھر تصویریں اتارنے میں کیا مسخرا پن تھا؟ بولے— ویسے ہی ذرا لطف رہتا ہے۔ ہاتھ میں کیمرہ ہو تو انسان ذرا سمارٹ معلوم ہوتا ہے۔ اگلے روز اخبار میں میری بہت تعریفیں تھیں۔ حتیٰ کہ یہ کہ بولنگ کا اتنا ذکر نہیں تھا جتنا فیلڈنگ کا— یہ سب شیطان کی کرامات تھی۔

میدان میں پہنچ کر دیکھتے ہیں تو رضیہ اور سرلا اکٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ خود بخود دوستی ہو گئی خوب گھُل مل کر باتیں ہو رہی تھیں۔ شیطان نے پھر وہی رٹ لگا دی۔ حمیدہ سے تعارف کراؤ۔ آخر شیطان کی مراد بر آئی۔ واقعی حمیدہ بہت اچھی لڑکی تھی۔

گیدی صاحب نے ہمیں پھر نصیحتیں کیں، بولے ابھی وقت بہت ہے پورے دو دن باقی ہیں۔ بس گیندیں روکتے رہو۔ اور سکور خود بخود ہوتا رہے گا۔ کھیل شروع ہوا اور ہم نے گیندیں روکنی شروع کر دیں۔ کوئی نہایت ہی فضول گیند ہوتی جو وکٹ سے میلوں پرے ہوتی۔ اُس پر ہٹ لگاتا وہ بھی دبی ہوئی۔ ادھر بڈی بالکل میری نقل کر رہا تھا۔ واقعی رنز خود بخود ہو رہی تھیں۔ ہم دونوں نے سکور سو تک پہنچا دیا۔ اب تو ہمارے بیٹسمین ہونے میں کوئی کسر نہ رہی تھی۔ بڈی آہستہ آہستہ اپنی اصلیت پر آ رہا تھا۔ اُس نے ہٹیں لگانی شروع کر دیں۔ اور پھر سلپ سے کسی نے بڈی کا کیچ کر لیا۔ بیالیس پر وہ آؤٹ ہو گیا۔ گیدی صاحب آئے لیکن وہ بہت ڈرے ہوئے تھے۔ ایک آسان سی گیند پر وہ آؤٹ ہو گئے اور بولے میں گگلی پر آؤٹ ہوا ہوں۔ مقصود گھوڑا آیا اُس نے کھیل خدا جانے کیا، سکور ڈیڑھ سو ہو گیا۔ مجھے اب گیند فٹ بال جتنی دکھائی دے رہی تھی اور میں پچاس ناٹ آؤٹ تھا۔ ایک گیند پر مقصود گھوڑے نے ہٹ لگائی اور مجھے بلایا۔ ہم ایک رن کر چکے تو مقصود گھوڑے نے ایک اور کے لئے کہا۔ میں بھاگا دو کچھ دور چلا آیا پھر چلا کر کہا— واپس چلو گیند فیلڈر کے ہاتھ میں آ چکی تھی میں اور مقصود گھوڑا دونوں وکٹوں سے گز دور تھے میں [illegible] بھاگا کریز پر پہنچ تو گیا لیکن بُری طرح گرا کہنیاں چھل گئیں دیکھتا ہوں تو مقصود گھوڑا واپس جا رہا تھا رن آؤٹ ہم لنچ کے لئے گئے [illegible] کھانے چلا گیا۔ بالکل [illegible]

تھے گولی میں جا چکیا۔ لنچ تک تین وکٹوں پر سکور ایک سو اسی تھا۔ میں حمید صاحب صاحب کے پاس گیا جہاں مرزا، رضیہ، حمیدہ اور شیطان بیٹھے تھے۔ آج خوش قسمتی آپا اور ممی غائب تھیں ورنہ غالباً شیطان حمیدہ کی طرف دیکھ بھی نہ سکتے۔ شیطان نے کیمرے سے چند تصویریں اتاریں ——— یا یوں ظاہر کیا کہ تصویریں اتار رہے ہیں ——— لنچ کے بعد ایک ہی اوور میں ہمارے دو کھلاڑی نکل گئے۔ کچھ دیر میں بادل صاف ہو گئے اور سورج چمکنے لگا۔ دو سو پر نئی گیند آئی اور مجھے ایک مرتبہ پھر قیامت کا سامنا کرنا پڑا۔ آہستہ آہستہ میں تھکتا جا رہا تھا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ بیٹنگ بہت مشکل چیز ہے۔ آج تک کبھی اتنی دیر وکٹوں پر ٹھہرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ بھاگنے کو اب بالکل جی نہیں چاہتا تھا۔ چار پر ہمارا سکور ڈھائی سو تھا۔ میرا سکور ستر تھا۔ میری ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ کمر بری طرح دکھ رہی تھی۔ ستر رنز ——— کافی سکور تھا۔ سب کہہ رہے تھے کہ سنچری کرو۔ شیطان اور حمیدہ باتیں کر رہے تھے۔ حمیدہ بولی ——— مجھے بائیں ہاتھ سے کھیلنے والے زیادہ پسند ہیں ——— "لیفٹ ہینڈڈ" کھیلتا ہوا الٹا بھی اچھا ہے۔ شیطان بولے ——— میں آج بائیں ہاتھ سے کھیلوں گا۔ اگرچہ میں نے بولنگ دہنے ہاتھ سے کی ہے۔ لیکن بیٹنگ بائیں ہاتھ سے کروں گا۔ اور پھر یہ کرکٹ تو ہے بھی میرے بائیں ہاتھ کا کھیل۔ مجھے ایک طرف لے جا کر شیطان نے کہا ——— اس لڑکی نے مجھ میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ آج تم دیکھنا میں کیسا کھیلتا ہوں ——— اور ہاں آج رضیہ دن بھر اداس رہی ہے۔ روٹھنا وٹھنا سب ختم ہو چکا ہے۔ آج وہ تمہیں ضرور بلائے گی۔ اب تم بھی روٹھنا ملتوی کر دو۔ جب وہ بلائے چلے جانا اور مہربان ہو کے بلاؤ مجھے چاہو جس وقت ——— والا برتاؤ کرنا۔ اس شکر رنجی کا ذکر تک نہ کرنا۔

چار کے بعد پہلی گیند پر ایک وکٹ اور نکل گئی۔ سمتھ آیا۔ اب ایک ایک گیند پر تالیاں بجتی تھیں۔ سکور کرو نہ کرو۔ ہٹ لگاؤ نہ لگاؤ۔ چاہے روکتے رہو یا باہر کی گیند کو صاف چھوڑ دو ——— شور ضرور مچتا تھا۔ سمتھ مجھے موقع دے رہا تھا۔ وعدے کے مطابق وہ گیندیں روک رہا تھا۔ آخر ایک گیند پر اپیل ہوا ——— "ہاؤ از اٹ؟" امپائر کی انگلی آسمان کی طرف اٹھ گئی اور سمتھ واپس چلا گیا۔ اب آخری کھلاڑی آ رہا تھا ——— شیطان اپنی عینک سنبھالتے ، بلا گھماتے ایک عجب شان سے تشریف لا رہے تھے۔ ہجوم خاموش ہو گیا۔

جیسے ناگہاں بجلی چمک گئی ہو ——— مجھے بھی یقین ہو گیا کہ اب نہ سنچری ہو گی اور نہ سکور پیدا ہو گا۔ میں نے شیطان سے التجا کی کہ دہنے ہاتھ سے ہی کھیلو۔ یہ بائیں ہاتھ کا شوق کبھی پھر پیدا کر لینا۔ بولے ——— ہرگز نہیں، حمیدہ دیکھ رہی ہے ——— اور تم دیکھنا تو سہی اگر زندگی نے وفا کی تو سکور پورا کر کے دکھاؤں گا ——— جب میں جیتنے کی ہٹ لگاؤں گا تو حمیدہ کا چہرہ فخر سے اونچا ہو جائے گا۔

شیطان کے محبوب سٹروک دو ہیں ——— لیگ بائی اور آف بائی۔ کبھی کبھی گیند پیڈوں سے بچ کر بلے میں بھی لگ جاتی ہے اور جب بلے سے نکل جائے تو پھر لازمی طور پر وکٹوں میں چلی جاتی ہے۔ انہوں نے لیفٹ ہینڈر کا سٹائل بنایا اور بولر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ پہلی گیند ان کے بازوؤں میں سے نکل گئی۔ دوسری ناک کے نیچے سے نکل گئی۔ تیسری کمر میں لگی۔ اوور کے بعد مجھ سے ملنے آئے۔ لوگوں نے سمجھا کہ کرکٹ کی باتیں ہو رہی ہیں۔ خوب شور مچا۔ شیطان بولے ——— وہ دیکھو حمیدہ عین سیدھ میں بیٹھی ہے ——— وہ رہی۔ میں نے بتایا کہ وہ تو کوئی اور ہے۔ شیطان نے عینک کے شیشے صاف کئے اور بولے ——— تو ہجوم میں کہیں ہو گی۔ کاش کہ اس وقت دوربین ہوتی اور یہ پوائنٹ پر جو فیلڈر کھڑا ہے، اس کی مونچھیں مجھے آؤٹ کرائیں گی۔

میرے اوور کے بعد پھر مجھ سے ملے، بولے ——— جانتے ہو یہ وکٹ کیپر حمیدہ کا کوئی عزیز ہے۔ جی چاہتا ہے اسے ایک کیچ کرا دوں۔ بیچارے نے آج ایک بھی کیچ نہیں کیا۔ میں نے پھر ان کی منتیں کیں۔ شیطان اتنی بری طرح کھیل رہے تھے کہ لوگوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ "یہ بیٹنگ کیسی ہو رہی ہے؟" مخالف بولر آہستہ سے بولا ——— اور یہ بولنگ کیسے ہو رہی ہے؟ شیطان نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اچھل کر ایک لیگ بائی سکور کی۔ اب وہ وکٹ کے چاروں طرف کھیل رہے تھے اور بائی پر بائی سکور ہو رہی تھی۔ سکور دو سو اسی ہو گیا۔ میں پچانوے ناٹ آؤٹ تھا۔ اور شیطان نے آٹھ بائی سکور کی تھیں۔ میں اس قدر تھک چکا تھا کہ مجھے نہ کسی سکور کا پتا رہا تھا نہ کسی میچ کا۔ بس ایسا جی چاہتا تھا کہ پیڈ وغیرہ اتار کر یہیں گھاس پر لیٹ جاؤں۔ ایک گیند پر بائی سکور کر کے شیطان نے مجھے بلایا۔ میں چلا۔ انہوں نے دفعتاً روک دیا گیند واپس آئی لیکن تیز تھی اس لئے دوسری طرف نکل گئی۔ شیطان نے پھر بلایا

میں چلا، گیند واپس آگئی وہ چلائے واپس جاؤ۔ میں بُری طرح بھاگا۔ وکٹوں تک پہنچا ہی تھا کہ شیطان نے پھر بلایا۔ ہم دونوں خوب بھاگے دو رن لیکن سکور کچھ نہ ہوا۔ اگلی گیند پر شیطان نے پھر یہی حرکت کی، اس دفعہ تو میں رن آؤٹ ہوتا ہوتا بچا۔ شیطان وکٹ کیپر سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھ سے بولے۔ میر تعارف حمیدہ جیسی لڑکی سے ہوگیا ہے اب جہنم میں جائیں، گیدی صاحب اور یہ میچ۔ اگر جیت گئے تو ایک چھوٹا سا لپ بن تو ہے گا شیطان نے وکٹ کیپر کو کھانے پر مدعو کیا۔ وہ دونوں خوب مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ آخری اوور آیا اور میں نے دل کڑا کر کے ایک چوکا لگا دیا۔ اب میں ننانوے ناٹ آؤٹ تھا۔ اگلی گیند کو گلانس کیا اور شیطان کو بلایا۔ وہ نہیں آئے۔ چوتھی گیند پر پھر بلایا وہ پھر بھی وہیں کھڑے رہے۔ وقت ختم ہوگیا۔ جب ہم واپس آئے تو سکور دو سو پچاسی تھا۔ میں وہی ننانوے ناٹ آؤٹ تھا۔ شیطان بولے ——— میاں یہ ننانوے کا پھیر بہت برا ہوتا ہے۔ یہ ہندسہ ہمارے لئے منحوس ہے۔ کہیں کل تمہارے ساتھ اُن کا بُرا وہی سلوک نہ کرے جو میں نے خود فقیر صاحب کے ساتھ کیا تھا جب وہ ننانوے ناٹ آؤٹ تھے میں نے اُن سے پوچھا کہ یہ آخر اوور میں کیا حرکت کی تھی، میرے بلانے پر کیوں نہیں آئے بولے ——— اس لئے کہ اب اس خاکسار کی دو آرزوئیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ تمہاری سنچری ہرگز نہ ہو۔ ورنہ تم ہم ناڑیوں کے زُمرے سے نکل کر اچھے آپ کو بہت بہت لگو گے اور ہمارا جینا دوبھر کر دو گے۔ دوسری یہ کہ جیتنے کی بہت میں لگانا چاہتا ہوں کیونکہ حمیدہ نے مجھے حکم دیا ہے۔ میں ابھی شیطان کو لعنت پیش کر رہا تھا کہ اتنے میں رضیہ آگئی بولی ——— ذرا سنئے میں اُس کے ساتھ سے باہر آگیا۔ ہم دونوں ایک طرف گھاس پر بیٹھ گئے۔ باتیں شروع ہوئیں۔ وہ بولی ——— اتنے دنوں سے میں پڑھائی میں مصروف رہی اور کچھ میرا جی اچھا نہیں تھا۔ میں نے کہا ——— میں بھی اتنے دنوں سے بہت مصروف رہا۔ کچھ امتحان کی تیاری میں اور کچھ یہ ٹورنمنٹ کا سلسلہ۔ میں نے ایک تصویر کا ذکر کیا کہ اسے یہ خیال کیونکر آیا۔ بولی میں نے کرکٹ کی کتاب میں پڑھا تھا۔ پوچھا ——— کرکٹ کی کتاب کیوں پڑھی تھی؟ ——— بولی ——— آپ کا میچ جو ہو رہا تھا۔ ہم دونوں بڑے شرما رہے تھے۔ وہ بولی ——— اب آپ سنچری ضرور کیجئے۔ میں نے اپنی سہیلیوں سے شرط لگائی ہے۔ میں نے پوچھا۔ کل کیا پروگرام ہے؟ بولی ——— کل چھٹی ہے۔ پوچھا ——— کل میرے ساتھ ایک پک نک پر چلو گی وہاں بہت سی لڑکیاں اور بھی ہوں گی۔ بولی ——— اجازت لینی ہوگی، امی سے اور حکومت آپا سے بھی۔ کہا ——— مرزا کا بہانہ کر دینا۔ ——— بولی "اچھا کوشش کروں گی"۔ کہا ——— "کوشش وشش کچھ نہیں، وعدہ کرو"۔ شرما شرما کر بولی ——— "اچھا"۔

میں شیطان کے ہوسٹل گیا، وہ وکٹ کیپر صاحب وہیں تھے، بڑی دیر تک حمیدہ کی باتیں ہوتی رہیں۔ کئی مرتبہ ننانوے ناٹ آؤٹ کا ذکر آیا۔ واپسی میں مجھے ہر دیوار پر جلی الفاظ میں ننانوے ناٹ آؤٹ لکھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے ہوسٹل میں پہنچا تو بہت سے لڑکے ملنے آئے ہر ایک نے ننانوے ناٹ آؤٹ دوہرایا۔ ٹائم پیس کی ٹک ٹک میں مجھے ننانوے ناٹ آؤٹ۔ ننانوے ناٹ آؤٹ سنائی دیتا رہا، رات بھر کوئی میرے کانوں میں چیخ چیخ کر یہی کہتا رہا ——— "ننانوے ناٹ آؤٹ۔ ننانوے ناٹ آؤٹ"۔

اگلے روز بہت زیادہ ہجوم تھا۔ میچ واقعی نہایت دلچسپ ہوگیا تھا۔ مینا بازار سالم کا سالم وہیں موجود تھا۔ رضیہ میرے لئے چاکلیٹ لائی تھی بولی ——— "جب آپ سنچری کریں گے تب آپ کو ملیں گے۔" سرلا اپنی آٹوگراف بک لائی تھی۔ بولی "جب آپ سنچری کرائیں گے تب آپ کے دستخط کرائیں گے۔" گیدی صاحب بولے ——— اگر تم نے سنچری کر لی تو آئندہ تمہیں شروع میں بھیجا کریں گے۔ بڈی بولا ——— مجھے یقین ہے کہ تم ضرور سنچری کرو گے۔ کل میں تمہارے لئے کینڈی اور چیونگ گم کے کئی ڈبے لاؤں گا۔

تالیوں کے شور اور نعروں کے غل میں شیطان اور میں بلّے لے کر نکلے۔ شیطان کی باری تھی۔ مخالف کپتان نے اپنے ایک فاسٹ بولر کو بلا لیا۔ اس کی پہلی گیند شیطان اور وکٹ کیپر دونوں کے اوپر سے گذر گئی، ——— بائی کی چار رنز ہو گئیں ——— اگلی گیند پر پھر یہی ہوا ——— چار رنز اور ہوگئیں۔ اب انہوں نے فالتو فیلڈر لے لی۔ اور بقیہ گیندیں بھی شیطان کے اُوپر سے گذر گئیں لیکن مزید سکور نہ ہوا۔ دوسری طرف سے انہوں نے ایک نیا بولر لگایا۔ جس کو میں اب تک نہیں کھیلا تھا۔ وہ اوور یونہی گذر گیا۔ اگلے اوور میں شیطان نے قلابازی سی کھائی اور ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا کٹ لگایا۔ ویسے اُن کا ارادہ لیگ کی طرف کھیلنے کا تھا لیکن کٹ زبردستی لگ گیا۔ اب سکور دو سو ستانوے ہوگیا۔ اور وہیں اٹک کر رہ گیا۔ چند اوور پھر ویسے ہی گذر گئے۔ ہجوم کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر گیند کے ساتھ

مصروف تھا کہ خدا کی پناہ — مجھے یہ ڈر تھا کہ اگر اس مرتبہ گیند شیطان کے سر کے اوپر سے نکل گئی تو میں وہی ننانوے ناٹ آؤٹ رہ جاؤں گا۔ وہ شیطان نے کٹ کرنے کی کوشش کی اور گیند لیگ کی طرف نکل گئی۔ ہم نے دوڑ کر دو رنز بنائیں، سکور دو سو ننانوے ہو گیا ہم نے سکور برابر کر دیا تھا۔ اب ہمیں جیتنے کے لئے صرف ایک رن کی ضرورت تھی اور مجھے بھی سنچری کے لئے ایک رن کی ضرورت تھی۔

اُس اوور کی ابھی تین گیندیں باقی تھیں۔ ہر گیند پر شیطان نے بے تحاشہ بلا گھمایا لیکن گیند اور بلے کی ملاقات نہ ہوئی۔ اُدھر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ ننانوے ناٹ آؤٹ ایک سیاہ ٹیکا ہے جو میرے ماتھے پر لگا ہوا ہے۔ جیسے یہ ایک طوق ہے جو میرے گلے میں لٹک رہا ہے۔ جیسے یہ ایک سینگ ہے جو میرے سر میں اُگا ہوا ہے جیسے میں اس سے ہرگز پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔

اوور ختم ہوا اور میری باری آئی۔ وہی نیا بولر گیند پھینک رہا تھا۔ گز گز بھر کی ایک بریک کراتا تھا۔ پہلی گیند روکی، دوسری روکی، تیسری، چوتھی، پانچویں — میں کسی پر سکور نہ کر سکا۔ اب آخری گیند تھی۔ اُدھر گیند آئی اِدھر میں نے آنکھیں بند کر کے بلا گھما دیا۔ خدا جانے بلے کے کس حصے سے لگی، لیکن لگی ضرور۔ گیند مڈ آن سے نکل گئی۔ دو فیلڈر پیچھے بھاگے۔ اُدھر میں بھاگا۔ دوسری طرف پہنچا تو شیطان وہیں کھڑے تھے۔ میں نے گیند کی طرف دیکھا۔ فیلڈر بدستور بھاگے جا رہے تھے۔ میں نے شیطان کو دوسری طرف جانے کو کہا لیکن وہ وہیں کھڑے رہے۔ میں نے اُن کو بازو سے پکڑ کر ہلایا لیکن وہ نہیں ہلے۔ آخر میں اُن کو زبردستی گھسیٹتا ہوا اپنی وکٹ پر چھوڑ کر آیا اور تابڑ توڑ واپس بھاگا۔ بس رن آؤٹ ہوتے ہوتے بچا — اور پھر غدر مچ گیا، زلزلہ آ گیا۔ زمین کی جگہ آسمان نے لے لی۔ آسمان زمین کی جگہ آ گیا — سنچری ہو گئی — ہم جیت گئے۔ ملّی بھاگا بھاگا آیا اور مجھے کندھے پر اُٹھا کر شامیانے تک لے گیا — بار بار وہ یہی کہہ رہا تھا — ہزائے او ہزائے — میں اب چیمپین ہوں۔ میں ایک کپ جیت گیا ہوں۔

شیطان وکٹ کیپر اور حمید کے ساتھ ایسے غائب ہوئے جیسے کبھی یہاں تھے ہی نہیں۔ رضیہ نے مجھے چاکلیٹ دیئے۔ سرلا نے میرے دستخط کرائے۔ جج صاحب نے خوب شاباش دی اور بہت سے بزرگوں نے تعریفیں کیں۔ سرلا آہستہ سے بولی — میں رضیہ کے گھر جا رہی ہوں۔ آدھ گھنٹے تک آپ میرے گھر سے رضیہ کو لے جائیے۔

میں جلدی سے ہوسٹل گیا، سائیکل کے پیچھے پک نک کی ٹوکری باندھی اور واپس آیا، رضیہ اور سرلا دونوں ملیں۔ سرلا نے مسکرا کر ہمیں رخصت کیا ہم پیدل چل رہے تھے۔ رضیہ نے نہایت خوشنما کوٹ پہن رکھا تھا بولی — یہ نیا کوٹ ابا نے سالگرہ پر دیا تھا۔ میں اسے آج پہلی مرتبہ پہن رہی ہوں۔ میں نے پوچھا — اور اب تک کیوں نہ پہنا۔ بولی — میں نے سوچا کسی خاص دن پہنوں گی۔

میں نے اُسے سائیکل پر بیٹھنے کو کہا، بولی کیریر پر تو ٹوکری بندھی ہوئی ہے میں نے کہا — آگے بیٹھ جاؤ۔ بولی — جو کسی نے دیکھ لیا تو؟ میں نے کہا۔ کسی نے دیکھ لیا تو میری خوش نصیبی پر رشک کرے گا وہ شرما کر آگے بیٹھ گئی میرا چہرہ بالکل اُس کے بالوں سے چھو رہا تھا — "یہ تم نے حکومت آپا کی خوشبو آج پھر چرائی ہے" میں بولا — "آپ نے بھی تو سر میں حکومت آپا کا تیل لگا رکھا ہے" وہ بولی۔ ہم دونوں درست تھے۔

جب ہم دو تین میل نکل گئے تو رضیہ پوچھنے لگی کہ پک نک کہاں ہو رہا ہے۔ میں نے بتایا کہ یہاں سے کچھ دور ایک باغ ہے وہاں ہو رہا ہے۔ اس نے پوچھا کہ پک نک میں کون کون ہونگے۔ میں نے بتایا کہ پک نک میں صرف دو ہیں — میں اور رضیہ۔ وہ بولی — مجھے پہلے ہی سے پتہ تھا۔ میں نے بتایا کہ اس باغ میں میں کئی سال سے تنہا آیا کرتا تھا۔ اس کے نظارے اور سنگ مرمر کی عمارتیں مجھے بہت پسند ہیں۔ عرصے سے میرا یہی جی چاہتا تھا کہ تم بھی کبھی میرے ساتھ یہاں آؤ۔ ہم دونوں اکٹھے سیر کریں۔ ایک اونچی برجی پر چڑھ کر غروب آفتاب دیکھیں۔ حوض کے کنارے سنگ مرمر کی محرابوں میں تمہیں چاندنی میں دیکھوں گا۔ ہم باغ میں پہنچ گئے، رضیہ بولی — واپسی میں دیر تو نہیں ہو جائے گی۔ میں نے پوچھا — تم کب تک کی اجازت لے کر آئی ہو۔ بولی — سرلا نے امی سے کہا تھا کہ رات کے کھانے تک پہنچ جائیں گے۔

میں بولا — سرلا بہت اچھی ہے۔ وہ مُنہ بنا کر بولی — جی ہاں، بہت ہی اچھی ہے بیچاری، آپ کی بھی بہت تعریفیں کرتی ہے۔ میں نے مُنہ بنا کر اُس کی نقل اُتاری۔ ہم دونوں ہنس دیئے۔

ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھاس کے قطعوں اور پھولوں کے تختوں میں پھرتے رہے، درختوں میں ہم نے آنکھ مچولی کھیلی، حوض کے کنارے

بیٹھ کر پینے اُٹھائے۔ سیڑھیوں پر شرطیں لگا لگا کر چڑھے۔ جب دھوپ پیلی پڑ گئی اور درختوں کے سائے لمبے ہو گئے تو ہم سب سے اونچی برجی پر چڑھ گئے۔ وہاں سے ہم نے غروبِ آفتاب دیکھا۔ جو آج بیحد حسین معلوم ہوا۔ بادلوں نے آسمان میں رنگ بکھیر دیا، چمکیلے محل، سنہری سیڑھیاں اور اودے اودے پہاڑ تیار کیے تھے۔ رنگوں کا یہ کھیل دیر تک رہا۔ آفتاب غروب ہو چکا۔ ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بڑا سا گول چاند چمک رہا تھا۔ چاندنی کھلی۔ اور ہم حوض کے کنارے جا بیٹھے۔ حوض میں مچھلیاں مچل رہی تھیں اور ہزاروں فوارے ناچ رہے تھے۔ آج چاندنی میں بلا کی جاذبیت اور نرالی دلآویزی تھی۔ سنگ مرمر کی محرابوں تلے میں نے رضیہ کو دیکھا اور یہ تمیز کرنا مشکل ہو گیا کہ چاندنی زیادہ حسین ہے یا رضیہ کے چہرے کی وہ جھلک جس نے چاندنی کو حسن بخشا ہے۔ تب یوں معلوم ہوا جیسے رضیہ کا حسن اور چاندنی ایک ہی نور کے حصے ہیں۔

جب ہم دونوں سائیکل پر واپس آ رہے تھے تو میرا دل مسرت سے رقص کر رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اس چاندنی رات میں دنیا کا مسرور ترین انسان ہوں۔

رضیہ بولی — "یہ میچ تو صرف آپ کا میچ تھا، وہ ہیٹ ٹرک خوب ہوا — آپ گیند پھینکتے ہوئے بہت اچھے لگ رہے تھے۔"

میں نے کہا — "وہ ہیٹ ٹرک تو تمہارا تھا۔"

وہ بولی — "اور وہ ننانوے ناٹ آؤٹ؟"

میں نے مچل کر کہا — "نہیں سو ناٹ آؤٹ۔"

بولی — "ہم تو ننانوے ناٹ آؤٹ ہی کہیں گے، وہ آخری رن تو آپ نے زبردستی بنالی۔ بھلا کرکٹ میں کبھی اس طرح بھی ہوتا ہے کہ کوئی اپنے ساتھی کو گھسیٹ گھسیٹ کر بھی سکور کرتا ہے۔ اور یہ سب سرلا کے رِبن کی برکت ہے۔"

میں نے کہا — "ذرا میری طرف دیکھو۔" اس نے میری طرف دیکھا کہا — "اب ذرا مسکراؤ بھی۔" وہ مسکرانے لگی۔ کہا — "اب ذرا منہ بنا کر دکھاؤ جیسے روٹھتے میں بناتے ہیں۔" اس نے منہ بنایا۔ میں نے کہا — "تم مسکراتی ہوئی کہیں اچھی معلوم ہوتی ہو۔ ہلکی سی مسکراہٹ سے تمہارا چہرہ دمکنے لگتا ہے۔ یہ منہ بنانا یا روٹھنا تمہیں ذرا اچھا نہیں لگتا۔ اگر یقین نہ ہو تو آج آئینے میں دیکھنا۔"

اس نے اپنی انگلیوں سے آہستہ سے میرا چہرہ موڑ دیا — "آپ آگے دیکھئے — بالکل سیدھے میں — اور سائیکل سیدھی چلائیے۔ کہیں کسی درخت یا کھمبے سے ٹکر نہ ہو جائے۔"

سرلا کے ہاں پہنچے۔ اس نے مسکراتے ہوئے ہمارا استقبال کیا۔ رضیہ کو چھوڑ کر میں نے شیطان کے ہوسٹل کا رُخ کیا۔ راستے میں وہی [illegible] کا رپورٹر مل گیا، بولا — "مبارک ہو آپ لوگ میچ جیت گئے ہیں، آپ ننانوے ناٹ آؤٹ رہے۔" میں نے پوچھا — "آپ کو کس نے بتایا؟" بولا — "[illegible] صاحب نے، اور میں نے اخبار میں آپ کی بڑی تعریف کی ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ آپ ذرا اور خوش قسمت ہوتے تو ایک اور سکور کر کے سنچری بنا جاتے۔" میں نے پوچھا — "ابھی چھپا تو نہیں؟" بولا — "نہیں آدھی رات کے بعد چھپے گا۔" میں نے اُسے ساتھ لیا، راستے میں سٹینڈرڈ آتا تھا جہاں بڈی اکثر پایا جاتا تھا۔ وہاں سے بڈی کو پکڑا، شیطان کے کمرے میں پہنچے۔ دیکھا ایک [illegible] سے پلنگ پہ رضائیاں اوڑھے چند حضرات کھانا کھا رہے ہیں۔ رضائیاں منگائی گئیں اور ہمیں بھی ساتھ بٹھایا گیا۔ "تم بھی کھانا کھاؤ گے؟" شیطان نے بڈی سے پوچھا۔

"نہیں! — میں ابھی کھا کر آیا ہوں۔"

"اچھا — تو ان کے لئے بھی کھانا لاؤ۔" شیطان نے [illegible]

"تم انڈے کھاؤ گے یا کباب؟"

"کباب!" بڈی بولا۔

"اچھا تو اِن کے لئے انڈے لاؤ۔ بھلا! [illegible] کھاؤ گے یا تلے ہوئے؟"

"آملیٹ!" بڈی بولا۔

"تو پھر تلے ہوئے انڈے لے آؤ۔"

رپورٹر بولا میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ شیطان نے اصرار کیا کہ چائے کافی ہی پی لو۔ وہ بولا — "شکریہ میں فقط چائے پیوں گا۔"

شیطان نوکر سے بولے — "کافی بنا لاؤ۔"

کھانے کے بعد میں نے وہ ننانوے ناٹ آؤٹ والا قصہ سنایا شیطان بولے — "یار عجب بیہودہ شخص ہو تم بھی [illegible] پریشان ہو رہے تھے۔ اچھا یار تمہاری [illegible]

۱۲ بارہ کتابوں کا نیا سِٹ

[illegible]

ہر کتاب دیدہ زیب گرد پوش سے مزین اور مجلد ہے

حقائق و معارف
مولینا ظفر علی خاں

حقائق و معارف [illegible] قیمت [illegible]

سیرِ ظلمات
مولینا ظفر علی خاں

[illegible]

حرف و حکایت
شیخ جی کا کام

[illegible]

نئی منزلیں
[illegible]

جنگل میں منگل
مولانا ظفر علی خان

[illegible]

بانکی بیگم
مولینا ظفر علی خان

[illegible]

لاوا
میرزا ادیب

[illegible]

نئی راہیں
[illegible]

[illegible]

انگڑائی
[illegible]

چنگیز خاں
[illegible]

ملنے کا پتہ:

عالمگیر بک ڈپو - بازار سید مٹھا - لاہور

فہرست

طابع — محمد طفیل

مضامین

نظمیں، غزلیں

دل شاہجہانپوری کا غیر مطبوعہ کلام

حامد عزیز مدنی

افسانے

انتظاریہ

محمد طفیل ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو، ایبک روڈ لاہور سے شائع کیا

طلوع

ذاتی جھگڑوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ بعض کا منشا یہی ہے۔ میں نے انتخابی پرچوں کے بارے میں اصولی باتوں کو چھیڑا تو کراچی کا ایک پرچہ بپھر گیا۔ میں نے اس ضمن میں جو کچھ لکھا تھا۔ اس کا مخاطب کوئی ایک رسالہ نہ تھا۔ بلکہ وہ سارے ہی رسالے تھے جو صرف انتخاب چھاپا کرتے ہیں۔ مگر موصوف نے بے قابو ہو کر (واضح اشاروں کے ساتھ) غریب نقوش کو بُرا بھلا کہہ ڈالا۔ دیکھیے بات زوری ہی ... ملی ہمیں سے میاؤں، یعنی ایک تو ہمارے بلا اجازت نے مضامین چھاپیں۔ الٹا ڈانٹیں بھی — ہم تو کسی سے بھی الجھنا نہیں چاہتے۔ نہ ہمیں کسی ایک رسالے سے کوئی سروکار ہے۔ نہ ہم اس بحث کو ذاتی بحث بنانا چاہتے ہیں۔

یاروں نے کہا (مدیران رسائل نے) کہ کسی طرح انتخابی پرچوں کی وبا کو روکا جائے۔ ورنہ ایک دن ایسا آئے گا کہ ہمارے پرچے بند ہو جائیں گے (اس لیے کہ ہم نئے مضامین حاصل کرنے کے لیے ان تھک محنت کرتے ہیں) اور انتخابی پرچے نکلا کریں گے (اس لیے کہ انھوں نے دو روپے کی قینچی خرید لی ہے)

اسی ضمن میں، میں نے ایک آدھ بار پہلے بھی لکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں اپنے ساتھ چند دوستوں کو بھی لایا ہوں۔ پہلے آپ اُن کی باتیں سُن لیں۔ میں تو گھر کا آدمی ہوں۔ میری باتیں تو آپ روز سنتے ہیں :-

برادرم۔ سلامِ مسنون۔ آپ کا ایک خط دس بارہ دن پہلے آیا تھا اور میں عجب چکر میں پڑ گیا کہ کیا جواب دوں؟ اس سے چھوٹنے نہ پایا تھا کہ ایک اور خط آ گیا اور اب پھر دو دن جواب سوچنے میں گزر گئے۔

برادرِ عزیز! مجھے اپنی دونوں آنکھیں پیاری ہیں۔ آپ بھی مجھے عزیز ہیں اور شمس صاحب بھی۔ آپ کی شکایت کو رفع کرنے کے لیے میں نے شمس صاحب سے کہدیا تھا کہ جو مضمون نقل کریں اس کی اجازت پہلے مضمون نگار سے حاصل کریں۔ دوسری بات یہ کہ نقوش کے تازہ پرچہ سے کوئی مضمون فوراً نقل نہ کریں۔ تیسرے یہ کہ جس مضمون کا کاپی رائٹ صاحبِ رسالہ کے پاس ہو اُسے یا تو نقل نہ کریں یا صاحبِ رسالہ سے اجازت لے کر نقل کریں۔ میری اور آپ کی گفتگو میں یہی باتیں طے ہوئی تھیں۔ شمس صاحب نے ان تمام شرائط کو منظور کر لیا اور ان پر عمل بھی کرنے لگے۔ اب میں اُن سے کیا کہوں؟ میرے خیال میں تو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ "نقوش" کا قدر دان تو نقوش ہی خریدے گا۔ وہ اس کا انتظار نہیں کرے گا کہ نقوش کے اچھے افسانے جب

نقش میں چھپ کر آ جائے تو پڑھ لے گا۔ نقوش بن جانے پر ایک بڑی قدر ہے جو پا لیتے جسے رد نہیں جا سکتا۔ لہٰذا آپ
مشہوری سے کام لیجئے — باقی دونوں تو کسٹولوں کی ہی جگہ پاتی ہیں۔

خاکسار شاہد احمد

طفیل صاحب! اس وقت یہی اشعار ذہن میں ہیں جو بھیجتا ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے غالباً کہیں تک شائع نہیں ہوئے
انتخابی پرچوں کا مسئلہ خاصا ہے۔ دیانت کا مسئلہ ہے۔ میں کاروباری طرف سے انھیں یقیناً غیر مستحسن سمجھتا ہوں لیکن اس بارے میں
آپ کی رائے زیادہ وقیع ہے۔ فقط

نقش محمود

انتخابی رسائل میں ادبی تخلیقات کی بے دریغ اشاعت ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ ہر مہینے مختلف معیاری ادبی رسائل کے مضامین نظم و نثر کا انتخاب چھاپنے والے اصحاب سے پوچھا جائے کہ اس فعل کا کوئی جواز ہے تو صرف یہ کہ ہر دوں بکار کتاب نہ پڑھ سکنے والے طبقے کا ادبی اور جمالیاتی ذوق نکھرتا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے اور ان کے قارئین کا حلقہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انتخاب کے سہارے چلنے والے رسالے اپنے فعل کا جواز پیش کرنے در پردہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم تو ایسا کر کے ادیبوں اور شاعروں پر احسان کرتے ہیں اور انھیں ہمارا ممنون ہونا چاہئے اور ہرگز انھیں حرف شکایت زبان پر نہیں لانا چاہئے۔ ان اصحاب میں سے کسی نے بھی یہ سوچنے کی تکلیف گوارا نہیں کی (اور اگر سوچا ہے تو اس کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھتے) کہ اگر پاکستانی فن کاروں کے افسانے اور اشعار "پہلی اشاعت" اور "اشاعت ثانی" کے مستحق ہیں تو اشاعت کے معقول معاوضے[2] کے بھی تو مستحق ہیں۔ دوسروں کو بزعم خود ان کی جیبوں کے بوجھ سے چھٹکارا دلوا دینے والے ماسٹے میں خیانت کرنے والے چاہے بھول کر شرم نہ کریں۔ مگر ہمیشہ حیب نہ رہنے ہی کا دھرم ہے۔ اگر بعض حضرات کو "ڈائجسٹ" قسم کے رسالے چھاپنے کا شوق ہے تو انھیں اس حقیقت کو بھی تو "ڈائجسٹ" کرنا چاہیئے کہ ادیب اپنی تخلیق صرف ایک رسالے کو اشاعت کے لیے دیتا ہے اور اس کے بعد سب تخلیقات کو اس توقع کے ساتھ مجموعوں میں جمع کر دیتا ہے کہ ادب کے قارئین انھیں جوق در جوق خریدیں گے۔ اگر "انتخابی" رسالے چھاپنے والے اصحاب کو لوگوں کا ادبی ذوق نکھارنے، ادیبوں اور شاعروں کی مقبولیت میں اضافہ کرنے اور ان کے قارئین کا حلقہ وسیع تر کرنے کے مقاصد ایسے ہی عزیز ہیں (اور یقیناً یہ بڑے مبارک مقاصد ہیں) تو وہ جدوجہد کریں کہ معیاری ادبی کتابوں کی بیش از بیش خریداری کی ملک گیر تحریک چلائیں۔ اس کام کے لیے وہ رسائل میں سے مضامین چپکے سے اُچک لینے کے بجائے ہر مہینے نئی ادبی مطبوعات کی ایک جامع اور خوبصورت فہرست شائع کیا کریں۔ یوں وہ ادب اور ادیب کی بے مثال خدمت کریں گے۔ مگر کیا وہ ایسا کریں گے جبکہ اس ماہانہ فہرست کتب کو بہت ہی کم لوگ خریدیں گے اور انھیں

---

[1] بھائی شاہد کا ماہنامہ نقش سے عملاً کوئی تعلق نہیں۔ صرف مدیر نقش سے دوستی ہے۔ جس کا اظہار اس خط سے بھی ہوتا ہے۔

[2] سنا ہے کہ یہ حضرات دس روپے فی غزل اور بیس روپے فی افسانہ کے حساب سے ادیبوں کو دے رہے ہیں۔

بہت ہی کم آمدنی ہو گی۔ ثابت ہوا کہ اصل مقصد نہ ادب کی خدمت ہے اور نہ ادیب کی (اخلاقی) امداد۔ اصل مقصد حصولِ زر ہے۔ اس صورت میں پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اس ہمہ گیر استحصال کو متحد ہو کر روکیں۔ جن ادیبوں اور شاعروں نے ان "انتخابی" رسائل کو اپنی تخلیقات مفت میں چھاپنے کے "دوامی" اجازت نامے دے دیئے ہیں وہ یہ اجازت نامے واپس لے لیں اور صرف اس صورت میں اجازت دیں جب یہ رسالے انہیں معقول اور مناسب بلکہ پہلی اشاعت سے دگنا معاوضہ دینے کو تیار ہوں۔ آخر ادیبوں اور شاعروں کو اپنی کتابوں کے پانچ دس ہزار مستقل قارئین سے ہاتھ دھونے کی اجرت تو ملنی چاہیے۔

احمد ندیم قاسمی

کیا ہمارے ہاں کوئی صحیح قسم کا ادبی ڈائجسٹ چھپ رہا ہے؟ صحیح قسم کا میں نے اس لیے کہا ہے کہ کوئی بھی شریفانہ کام ہو اس کے چند آداب ہوتے ہیں۔ اگر یہ آداب ملحوظ نہ رکھے جائیں تو بلیک مارکیٹ، تجارت اور سرقہ بھی فن کہلائے گا۔

ہمارے اکثر انتخابی پرچے انتخاب کے کسی معقول معیار سے محروم ہیں۔ مگر یہ تو ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ ممکن ہے ان کے نزدیک انتخاب کا یہی معیار معقول اور مقبول ہو۔

انتخاب کے معاملے میں نہ تو ادیب کی رائے لی جاتی ہے، نہ اجازت اور نہ معاوضے کی ادائیگی کا معاوضہ شکن معاملہ سامنے رکھا جاتا ہے۔ ادیب کو تو صرف اس اعلیٰ قسم کی بات سے خوش کر دیا جاتا ہے کہ اس کی تخلیق انتخاب میں آگئی ہے۔ بھلا خوشی سے بڑا معاوضہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ — انتخابی جرائد ادھر ادیب کو خوشیوں کے معاوضے سے مالا مال کرتے ہیں، ادھر ان ادبی رسائل کا شکریہ بھی ادا کر دیتے ہیں جن کی چیزوں سے اپنے پرچے کو مالا مال کرتے ہیں۔ شکایت کا کسی کو بھی موقعہ نہیں دیا جاتا۔ مگر مشکل یہ ہے شکریہ اور خوشیوں کا معاوضہ دونوں بڑے مہنگے پڑ رہے ہیں۔ انتخابی رسائل ان پرچوں کا گلا گھونٹ رہے ہیں جو ہزاروں دقتوں کے بعد ادیب کو معاوضہ ادا کر کے اپنے آپ کو بناتے سنوارتے ہیں۔ مگر ان کا شمارہ ابھی اپنے قارئین تک ڈھنگ سے پہنچنے بھی نہیں پاتا کہ انتخابی جریدے ان کا نچوڑ حاصل کر کے اسٹال پر پہنچ جاتے ہیں۔ لکھا لکھایا سامان مل گیا، چھاپ کر سستے داموں بیچ ڈالا۔ ادھر قاری کا یہ رویہ کہ انتخاب کا انتظار ہو رہا ہے مہنگے ادبی رسائل کون خریدے۔ روپیہ بارہ آنے خرچ کر کے ملک کے تمام رسائل کے ادب کا نچوڑ پڑھ لیا گیا۔ اس سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا کہ اس انتخاب میں واقعی نچوڑ ہے یا نہیں۔

ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ادبی رسائل کے مالک سوچنے لگے ہیں کہ کیوں نہ وہ بھی آسان ترکیب استعمال کریں۔ مجھے ایک اچھے خاصے اشاعتی ادارے کے بارے میں معلوم ہے کہ پہلے اس نے ایک ادبی پرچہ چھاپنے کا ارادہ کیا تھا مگر بعد میں ادبی ڈائجسٹ شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ در اصل ہمارے ملک کا ماحول ابھی ادبی ڈائجسٹ کے لیے مناسب نہیں ہے۔ پڑھے لکھے با ذوق پاکستانیوں کی تعداد کم ہے۔ اچھے ادبی رسائل بھی دو چار ہی شائع ہوتے ہیں۔ معقول کتابوں کی منڈی بھی محدود ہے۔ اگر ادبی رسائل اور کتب کا حصہ انتخابی جریدے سنبھال لیں تو انجام ظاہر ہے۔

خدیجہ مستور

برادرم طفیل صاحب! اس وقت مسئلہ پیشِ نظر یہ ہے کہ یہ "..." اور "....." وغیرہ اردو کے موقت الشیوع رسائل و جرائد میں سے مستقلاً چیزیں لے کر شائع ہو رہے ہیں تو ان کے اس اقدام سے نتائج کیا برآمد ہوتے ہیں اور ہم اس سے کن صورتوں میں اور کہاں تک متاثر ہوتے ہیں! — میں یہاں دو حیثیتوں سے اظہارِ خیال کروں گا۔ میری پہلی حیثیت ایک مصنف کی ہے۔ ایک ایسے

مصنف کی جو کچھ تجارتی رموز بھی جانتا ہے ۔ یہ بات واضح ہے کہ ایک مصنف رسائل و جرائد میں جو کچھ لکھتا ہے اس نقطۂ نظر سے لکھتا ہے کہ ایک دن اس کی یہی ذہنی کاوشیں جمع ہو کر ایک مستقل صورت یعنی کتابی شکل اختیار کریں گی اور وہ ناشر سے اس کتاب کے عوض ایک معقول معاوضہ حاصل کرنے کا حقدار ہو جائے گا۔ اب اگر اس مصنف کی تخلیقات کتابی شکل پذیر ہونے سے پیشتر دو تین جگہ منظر عام پر آ چکی ہوں تو لازماً اس کے پڑھنے والوں کا حلقہ محدود ہو جائے گا اور نتیجۃً کتاب زیادہ فروخت نہیں ہو سکے گی جس کا اثر بالواسطہ مصنف کی ذات پر پڑے گا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ مذکورہ بالا پرچوں کی روش تجارتی اعتبار سے ہر مصنف کے لیے نقصان دہ ہے۔

میری دوسری حیثیت ایک ایڈیٹر کی ہے۔ ایک ایسے ایڈیٹر کی جس کی زندگی کے دو تین سترہ سال ایک ادبی ماہنامے کے ادارتی فرائض ادا کرتے ہوئے گزر گئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ادارت کتنی محنت شاقہ کی متقاضی ہے اور مدیر رسالہ کو اپنا رسالہ زندہ رکھنے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ پڑھنے والوں کے سامنے جو مضامین نظم و نثر آتے ہیں وہ عموماً اس انداز میں نہیں آتے جس انداز میں مضمون نے انھیں لکھا ہے۔ ایڈیٹر بسا اوقات مضمون محنت کر کے ان کی نوک پلک درست کرتا ہے۔ ان کے حصول کی خاطر اسے طویل مراسلت کرنی پڑتی ہے۔ بعض مضامین پر معاوضہ بھی دیتا ہے اور نہ جانے کیا کچھ کرتا ہے۔ جب کہیں جا کے رسالہ چھپ کر قارئین کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا ایک ایڈیٹر کے لیے یہ صریحاً ناانصافی نہیں کہ ہر طرح کی محنت تو وہ کرے لیکن فائدہ اس کے اپنے پرچے کی بجائے ان رسالوں کو پہنچ جائے جن کے مدیران کرام وقت کا بہت مختصر حصہ صرف کر کے مختلف رسالوں کے منتخب مضامین نظم و نثر پر محض نشان لگا کے کاتبوں کے حوالے کر دیں اور یوں ان کے رسالے اشاعت پذیر ہو کر مارکیٹ کے بیشتر حصے پر غاصبانہ قبضہ کر لیتے ہیں؟

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ جو پرچہ ہر ماہ ہمارے معیاری جرائد کی نمایاں چیزیں اپنے دامن میں سمیٹ کر چلے اس کا خیر مقدم ان پرچوں کے مقابلے میں زیادہ گرم جوشی سے کیا جاتا ہے جن سے وہ زندگی حاصل کرتا ہے۔ اور یہ اصل پرچوں پر ایک ناقابل برداشت ظلم ہے۔ ان زیادتی کرنے والے پرچوں کے خلاف متفقہ طور پر قدم اٹھانا نہایت ضروری ہے۔ اور اس ظلم کے خلاف جو آواز بھی بلند ہوگی اسے اہل علم اور مدیران رسائل و جرائد کی پرجوش تائید حاصل ہوگی۔

میرزا ادیب

اردو میں ڈائجسٹ طرز کے رسائل کا سوال اردو ادب میں ایک مسئلہ سا بن گیا ہے۔ سب سے اوّل ہمیں دیکھنا چاہیے کہ یہ بدعت جہاں سے آئی ہے وہاں اُن کا طرز عمل کیا ہے۔ یو۔ پی۔ اور امریکہ میں جو ڈائجسٹ رسائل شائع ہو رہے ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو صرف شائع شدہ کتب اور مضامین کا خلاصہ تیار کرا کر شائع کرتے ہیں۔ کسی بڑے ناول یا مضمون کا خلاصہ یعنی نفس مضمون کسی قابل اہل قلم سے چند صفحات میں تیار کرایا جاتا ہے اور مرتب کنندہ کو اس کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اس سے اصل کتاب یا مضمون یا افسانہ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچتا بلکہ جن لوگوں کو یہ پسند ہو یا اُن کے مذاق کی چیز معلوم ہو وہ اصل کتاب یا مضمون حاصل کر کے اُس کا مطالعہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس سے رسائل اور کتب کی اشاعت میں مدد ملتی ہے۔ دوسری قسم کے وہ ڈائجسٹ رسائل ہیں جو مدیران رسائل سے اجازت حاصل کر کے ان کے حوالے سے مضمون نقل کرتے ہیں۔ پاکستان کے اردو ڈائجسٹ رسائل کتابوں، افسانوں یا مضامین کا خلاصہ تو تیار نہیں کرتے کیونکہ یہ کام تو اصل سے زیادہ مشکل ہوتا ہے اور اس پر خرچ بھی زیادہ آتا ہے۔ بلکہ وہ دوسرے رسائل کے مضامین کو اکثر بلا اجازت نقل کر کے شائع کر دیتے ہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی، ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔

ہمارے ہاں یہ بدعت کوئی نئی نہیں ہے۔ اس سے قبل بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ میرے عزیز دوست اختر شیرانی مرحوم نے اسی قسم کا ایک رسالہ "انتخاب" کے نام سے جاری کیا تھا۔ جو چند مہینے شائع ہونے کے بعد بند ہو گیا۔ اس رسالہ کے تمام مضامین دوسرے رسائل سے نقل کیے جاتے تھے اور کتابت طباعت بہترین ہوتی تھی اور مضامین پر اختر صاحب کے لکھے ہوئے تعارفی نوٹ عالمانہ اور محققانہ ہوتے تھے اس کے باوجود پبلک نے اس رسالہ کو سخت ناپسند کیا تھا بلکہ بعض تو اٹھا کر پھینک دیتے اور کہتے کہ اوہ! اس میں تو تمام مضامین مطبوعہ ہوتے ہیں۔ اُس زمانہ میں مطبوعہ مضمون چھاپنا ایک گالی تھی اور کسی اخبار یا رسالہ کی بڑی ہتک کی بات تھی کہ وہ دوسری جگہ شائع شدہ مضمون نقل کرے۔

میں ۲۸ سال سے نیرنگِ خیال کو شائع کر رہا ہوں۔ کیونکر اور کیسے؟ اس کی واردات لکھوں تو خونِ جگر اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی پُردرد داستان ہوگی۔ ہم لوگ اچھا مضمون حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ کرتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں مضمون دس بیس سوالوں سے نہیں ملتے تھے۔ اہلِ قلم معاوضہ لینا گناہ اور ہتک سمجھتے تھے۔ وہ اگر لکھتے تھے تو شوق سے، اپنے نام کے لیے، خدمتِ فن کے لیے، ادب کے لیے۔ عوام کے افادہ کے لیے۔ اس کے لیے ایڈیٹر کو اہلِ قلم سے ذاتی دوستانہ تعلقات پیدا کرنے پڑتے تھے۔ اس سلسلہ میں خاکسار نے ہندوستان کے درجنوں سفر کیے۔ دہلی، علی گڑھ، آگرہ، لکھنؤ، کلکتہ، حیدرآباد اور بمبئی تک خاک چھانی۔ ہزاروں روپیہ صرف ہوتا تھا اور اس کا مقصد وحید صرف اہلِ قلم سے ذاتی تعارف و تعلق پیدا کرنا ہوتا تھا۔ اب آپ اندازہ کیجئے کہ آج کے معاوضہ سے جو بعض اصحاب حاصل کر رہے ہیں۔ ہمیں اس مد میں اس سے زیادہ رقم خرچ کرنی پڑتی تھی اور اس کے ساتھ زحمتِ سفر مستزاد۔

ایک واقعہ سن لیجیے۔ سید امتیاز علی تاج نیرنگِ خیال میں لکھا کرتے تھے۔ اُن سے ایک مضمون حاصل کرنے کے لیے مجھے کتنی پریشانی اور دقت ہوتی تھی۔ اس کا اندازہ قارئین کرام نہیں کر سکتے۔ ہر اہلِ قلم جداگانہ مزاج اور انفرادی ساخت رکھتا ہے۔ امتیاز صاحب سے مجھے ایک افسانہ تین مہینے کی تگ و دو کے بعد ملا۔ یقین کیجئے کہ یہ چیز اٹھائیسویں چکر میں مل گئی۔ ایک ایڈیٹر[1] ۲۸ بار کوشش کرنے کے بعد ایک مضمون حاصل کرتا ہے۔ آپ نے کتنا وقت اس کے لیے دیا؟ اور تانگہ (سواری) کے اخراجات کیا ہوئے۔ کیونکہ وہاں جب بھی جانا پڑتا، دوری مسافت کی وجہ سے بغیر سواری کے نہ جا سکتا تھا۔ یہ افسانہ نیرنگِ خیال میں شائع ہوا تو میرے دوست اختر صاحب نے اسے انتخاب میں نقل کر لیا۔ چند دن بعد وہ میرے ہاں تشریف لائے تو میں نے انھیں کہا کہ اختر صاحب دو سو روپیہ آپ کے ذمہ ہیں۔ وہ کہنے لگے کیسے؟ میں نے کہا آپ نے نیرنگِ خیال سے جناب تاج صاحب کا جو افسانہ نقل کر لیا ہے اس کا معاوضہ! اختر صاحب نے کہا۔ واہ حضرت! دیکھیے افسانہ نقل کیا اور ٹھاٹھ سے نقل کیا اور حوالہ بھی دیا اور نوٹ بھی لکھا۔ کیا آپ نے تاج صاحب کو کچھ معاوضہ دیا تھا؟ میں نے کہا معاوضہ تو نہیں دیا نہ وہ مجھ سے معاوضہ لیتے ہیں۔ لیکن تین ماہ کی کوشش کے بعد اٹھائیسویں پھیرے میں یہ افسانہ ملا تھا۔ اب آپ اندازہ کیجئے کہ آپ نے اُسے نقل کر کے نیرنگِ خیال کی انفرادیت، وقار اور شہرت کو نقصان پہنچایا۔

حقیقتِ حال کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد انھوں نے سر جھکا لیا اور کہنے لگے "حکیم صاحب میں نے اس بات کا تو اندازہ ہی نہیں کیا تھا۔ ہماری قینچی بے پناہ ظلم کر رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ پبلک بھی پرچے سے نفرت کرتی ہے اور کہتی ہے کہ اس میں تو چھاپہ شدہ (نقل شدہ) مضامین ہوتے ہیں۔ اس مقصد میں مجھے کامیابی نہیں ہوئی، یہ پرچہ تو خود بخود بند ہو جائے گا۔" اور آخر انتخاب بند ہو گیا

---

[1] اس شمارہ میں مجنوں گورکھپوری کا ایک طویل افسانہ "تنہائی" چھپ رہا ہے۔ خود موصوف کا خط پڑھ لیجئے اور دیکھ لیجئے کہ میں نے ایک افسانہ حاصل کرنے کے لیے کتنے برس صرف کر دیے ہیں۔ (مدیر)

[illegible] [illegible] نقوش میں شائع نہیں ہوتے [illegible] اور ضعیف ہو جانے کی وجہ سے [illegible] [illegible]
افسانہ اسکے اور بہت سے پرچے میں نہیں پاتا۔

وہ رسائل جو نقل شدہ مضامین کے بل بوتے پر تجارت کرتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مضامین کا حصول کتنا دشوار اور مشکل مسئلہ ہے اور نقد معاوضہ سے زیادہ، محبت تعلقات اور مضمون حاصل کرنے کی جد و جہد ہے۔ پھر کسی ایڈیٹر کی تعجیل یا اول اپیل کا نشان اُسے اپنے پرچے کی زینت بنائے تو کیا یہ ظلم نہیں ہوگا؟

عظیم یوسف حسن

میرا اندازہ یہ ہے کہ اب تک کسی نے بھی اس مسئلے کے مانند پہلوؤں پر سوچا ہی نہ تھا۔ بظاہر تو یہ سہانا خواب ہے۔ مگر اس کی تعبیر بے حد خوفناک۔

ارادہ نہ تھا کہ اس مسئلے میں احباب کو بھی زحمت دیتا جو ہو جانا تھا وہ ہے کی حد تک صحیح ہی کیا ہے۔ اطلاع دی تو وہ پہلے ہی جو سے بیٹھے تھے۔ ساتھ ہو لیے۔ اب میں اس سلسلے کو پوری معقولیت کے ساتھ اور آگے بڑھاؤں گا۔ پاک و ہند کے سارے ادیب میرے دوست ہیں، میرے بھائی ہیں۔ وہ میری بات سنیں گے اور ہماری جائز مشکلوں میں ہمارا ساتھ بھی دیں گے۔

سب سے پہلے تو انتخابی پرچوں پر یہ چوٹ پڑی کہ انہیں مصنفین کو بھی معاوضہ دینا پڑ گیا۔ ورنہ صاحب پہلے کون پوچھنے والا تھا۔ میں نے اس مسئلے کو اٹھایا۔ رائٹرز گلڈ نے غور کیا۔ نتیجہ معاوضے کی صورت مصنف کے حق میں نکلا۔

سوال یہ ہے کہ کیا معاوضہ مل جانے پر مصنف کے حقوق کی پوری پوری حفاظت ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ہاجرہ مسرور صاحبہ کا ایک انٹرویو قابلِ توجہ ہے۔ جو ہفت روزہ نصرت (۲۴ اپریل ۱۹۶۱ء) میں چھپا تھا۔

”دراصل افسانے کے تنزل کا پراپیگنڈا کرنے میں کسی حد تک ہمارے ناشروں کا بھی ہاتھ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ افسانوں کا مجموعہ اب بکتا ہی نہیں لہٰذا اسے شائع کرنا خسارے کا سودا ہے۔ وہ لوگ بھی ایک حد تک سچے ہیں۔ اگر آج ایک افسانہ کسی پرچے میں چھپتا ہے تو دوسرے رسالے اُسے نقل کر کے حسبِ توفیق استفادہ کر لیتے ہیں۔ پھر رہی سہی کسر ہمارے چند ایک ریڈرز ڈائجسٹ قسم کے پرچے نکال دیتے ہیں۔ میرا اپنا ایک افسانہ ”مول تول“ اب تک چھ دفعہ شائع ہو چکا ہے۔ اس طرح ایک افسانہ قاری کی ایک بڑی تعداد کی نظر سے گزر جاتا ہے۔ اور جب ایک مصنف کے ایسے ہی افسانے مجموعے کی شکل میں شائع ہوتے ہیں تو قاری انہیں پہلے ہی متعدد بار پڑھ چکا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ مجموعہ خریدنے میں پوری دلچسپی نہیں لیتا۔“

بعض دوست یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہمارا افسانہ پانچ دس پرچوں میں نقل ہو جائے گا تو اس سے ہماری پبلسٹی میں اضافہ ہوگا۔ یہ بات ایک مبتدی کے لیے تو شاید سود مند ہو۔ مگر جس ادیب کا ادب میں کوئی مقام ہے اور اس کی کتابیں بھی چھپتی ہوں۔ اس کے لیے یہ سودا قطعاً سود مند نہیں۔ اس ضمن میں ہاجرہ مسرور صاحبہ کا تجزیہ بہر صورت قابلِ غور ہے۔ اگر انتخابی پرچوں کی روش یہی رہی تو یہاں تک پہنچنے کا خطرہ ہے کہ ادیب کو اپنی ادبی زندگی برقرار رکھنے کے لیے خود اپنی گرہ سے اپنی کتابیں چھپوانا پڑیں گی۔

رسائل قاری اور مصنف کے درمیان ایک طرح کا رابطہ ہوتے ہیں۔ آج جتنے بھی بڑے بڑے ادیب نظر آتے ہیں۔ انھوں نے پہلے پہل

رسائل ہی میں لکھنا سیکھا۔ کسی نے نیرنگِ خیال میں، کسی نے ادبِ لطیف میں، کسی نے ساقی میں (وغیرہم)۔ رسائل ہی کے ذریعہ ادیب نامور ہوئے اگر نئے اور ذہین قلمکاروں کی ذہنی کاوشوں کو یہ رسالے منظرِ عام پر نہ لاتے تو آج کئی بڑے ادیبوں کا وجود ہی نہ ہوتا۔ وہ اپنی تمام تر قابلیتوں کے باوجود گوشۂ گمنامی میں پڑے رہ جاتے۔ ظاہر ہے کہ ادب کی بقا اور نشوونما کے لیے اچھے اچھے ادبی رسالوں کا وجود بے حد ضروری ہے جو، اچھے لکھنے والوں کے جوہروں کو، اور بھی بنا سنوار کے قارئین کے سامنے پیش کریں اور جو بالکل مبتدی ہوں۔ ان کی اس انداز میں تربیت کریں کہ وہ مستقبل کے ایسے ادیب بن سکیں۔ جن پر ادب فخر کرے۔ بے شک ہر نیا ادیب اپنی ہی صلاحیتوں سے چمکتا ہے۔ مگر اس میں مدیرانِ رسائل کی جانکنی بھی شامل ہوتی ہے۔ میرے نزدیک۔ تو اچھے رسائل نئے ادیبوں کے لیے ٹریننگ اسکول ہوتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ رسائل جو ادب کی ترویج و ترقی کی بنیاد ہیں۔ وہ آج انتخابی پرچوں کے ہاتھوں اپنی آبرو لٹوا رہے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے یہ دوست محض ذاتی تجارت کی خاطر ہر پرچے سے پانچ دس چیزیں اُڑا لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو پرچے صحیح معنوں میں ادب کی خدمت کر رہے ہیں وہ سخت پریشان ہیں۔ ان کی اشاعت پر یہ پرچے اثر انداز ہو رہے ہیں اور ایک وقت آئے گا کہ جن کے دم سے اُردو ادب کی ترویج و ترقی کی روایات وابستہ ہیں۔ وہ سب دم توڑ دیں گے۔ آج انتخابی پرچوں کی حوصلہ افزائی کا بالکل یہی مطلب ہے کہ ادب کی جڑوں کو کاٹ کر رکھ دیا جائے، اور شاخوں اور پتوں کی نشوونما ہی کو ادب کی ترویج و ترقی سمجھ لیا جائے۔

بعض دوست یہ کہتے ہیں کہ ادارۂ نقوش نے بھی تو تین چار نمبر صرف انتخابات پر مشتمل چھاپے ہیں۔ جی ہاں، یہ جرم سرزد ہو چکا ہے نقوش نے اپنی تیرہ سالہ زندگی میں، صرف چار نمبر (افسانہ نمبر، غزل نمبر، طنز و مزاح نمبر اور آخر میں خود نقوش ہی کا انتخاب ادبِ عالیہ نمبر) ایسے چھاپے ہیں۔ جو لوگ موجودہ انتخابی پرچوں سے اُن کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ بڑے بے درد ہیں۔ اس لیے کہ میں نے ایک ایک نمبر پر برسوں ہی محنت کی۔ اگر میں اور مجھ سے پہلے کچھ اور باہمت حضرات ایسا نہ کرتے تو آج نہ کوئی تذکرہ ملتا اور نہ اُردو ادب کی تاریخ ہی کا کوئی سراغ ملتا۔ دوسرے میں نے آج کے پرچوں کو اُٹھا کر لال پنسل سے نشان نہیں لگا دیئے تھے جو کسی پر زد پڑتی۔

آج انتخابی پرچے چھاپنے والے، کسی نہ کسی حیثیت میں پہلے نئی چیزیں ہی حاصل کر کے اپنے رسالے چھاپا کرتے تھے۔ وہ کام کٹھن تھا۔ محنت طلب تھا۔ سوجھ بوجھ چاہتا تھا۔ اس لیے یہ لوگ اس امتحان میں پورے نہ اُترے۔ مارکیٹ میں اُن کے پرچوں کو کوئی اہمیت حاصل نہ ہوئی۔ اس طرح جب نقصان ہوا تو انھوں نے تعمیری کام کرنے والے پرچوں پر ہلّہ بول دیا۔ اب اُن کی قینچی ہے اور ہم مدیرانِ رسائل کی محنتوں کا خون!

اس مہم میں مَیں اکیلا نہیں ہوں۔ مدیرانِ رسائل میرے ساتھ ہیں۔ ادیب میرے ساتھ ہیں۔ اس لیے ہم اپنے اُن دوستوں کو ضرور سمجھا سکیں گے۔ جو اس وقت اپنی ذاتی منفعت کی بنا پر علم و ادب کی خدمت کا دعویٰ کر رہے ہیں۔

محمد طفیل

مولانا ابوالکلام کی قدیم تحریریں

قاضی عبدالودود

ہندوستان میں ایک لیڈر ابوالکلام [illegible] سے [illegible] جلی [illegible] تحریریں معتبر [illegible] ہوئی ہیں۔ اس کے سب [illegible] جوانی کی [illegible] نظمیں [illegible] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم [illegible] اسباب [illegible] شائع [illegible] اعلان الحق [illegible] قدیم مضامین [illegible] فہرست [illegible] شامل [illegible] مرتب کرنے والے [illegible] ۱۹۰۳ء میں شائع [illegible] وکیل [illegible] ۱۹۰۶ء [illegible] علاوہ [illegible] ۱۹۰۹ء تک کسی [illegible] سے ہماری نظر سے نہیں گزری۔

ابتدا سے آزاد کا تعلق غالب رنجور بدایونی، خیر آبادی، نسیم لکھنوی کی بدولت قائم ہوا تھا اور عجب نہیں کہ ۱۹۰۰ء سے قبل بھی ان کی کوئی تحریر [illegible] شائع ہوئی ہو۔ اس سنہ کے بعد [illegible] ۱۹۰۹ء [illegible] اس تعلق کے باقی رہنے کا ثبوت موجود ہے۔ آزاد کا جو مضمون نقل ہوگا اس میں نہ استدلال کا زور ہے اور نہ اسلوب بیان کی خوبی۔

فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کا وکیل سے تعلق ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوا، لیکن جو مضمون وکیل سے نقل ہوگا، اس کے آخر میں مرقوم ہے "مضمون وکیل امرتسر [illegible]" [illegible] مستقل تعلق بعد کو قائم ہوا [illegible] اس مضمون کا اسلوب بیان [illegible] مگر اس میں کوئی خاص خوبی نہیں۔ یہ مضمون جس وقت قلمبند ہوا تھا آزاد سید احمد خاں کے بڑے مداح تھے۔ [illegible] صاحب نے اپنے مضمون (آزاد بحیثیت اردو ادیب) میں اس کا اعتراف کیا ہے مگر ساتھ ہی یہ لکھا ہے کہ ابتدائی زمانے میں بھی آزاد کو سید احمد خاں سے سیاسی اختلاف تھا۔ یہ ہرگز صحیح نہیں، خود آزاد کی بعض تحریروں سے کامل ہمنوائی ثابت ہے۔

"اک بتِ سیمیں بدن سے کرلیا لندن میں عقد"

"ہیں! یہ تم نے کیا کہا؟ اک بتِ سیمیں بدن سے کرلیا لندن میں عقد؟" "جی ہاں! [illegible]! کرلیا لندن میں عقد۔" "آخر کوئی وجہ؟ کیوں کرلیا لندن میں عقد؟" "بس یہ نہ پوچھیے۔" "کیوں، کس لیے؟ کیا آپ کو ہندوستان بھر میں کوئی پری تمثال ابھی نہیں ملی تھی کہ آپ کو معشوقانِ یورپ کی تلاش ہوئی؟ کیا آپ کو ہندوستان میں کوئی سیمیں بدن نہیں نظر آتی تھی کہ [illegible] (کذا) [illegible] یورپ کی طرف توجہ

کرتی ہیں؟ بھلا ایک مسلمان کے لیے یہ بات نازیبا نہیں ہے کہ وہ اپنی قوم اور اپنے خاندان کو چھوڑ کر غیر قوم، غیر مذہب، غیر خیال، غیر طبیعت سے تعلق پیدا کرے۔ کیوں جناب! فرمائیے نا، مغلس نہ بچائیے، ادھر دیکھیے۔ کیا آپ کے کانشنس نے آپ کو اس امر کی اجازت دی ہے کہ آپ بلا ضرورت اس قوم سے کوئی نیا تعلق پیدا کریں کیونکہ (کذا) ہیں آپ جن میں قدرت نے متضاد طبیعتیں رکھی ہوں؟"

"واہ حضرت واہ! آپ بھی اس پرانی لکیر کے فقیر نکلے۔ ابھی تک پرانے خیالات سے آپ کا دماغ خالی نہیں ہوا ہے یا نو (کذا) ابھی روشنی کی تیز شعاعوں سے محروم رہا ہے ورنہ اس قدر تاریکی اس میں نہ ہوتی۔ آجکل کی حالت سے آپ بالکل بے خبر ہیں اور ہی یا خواب دیکھ رہے ہیں۔ فی زمانہ اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ فاتح قوم سے ایسے چند قومی رابطے پیدا کریں اور ایسے تعلقات ہوں جن سے کہ ان میں ہمدردی پیدا ہو اور وہ وحشت نہ رہے جو ہماری ترقی میں، جو فاتح قوم کی توجہ پر موقوف ہے، حائل ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے انھیں اس امر کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنے شکوک کو جو مسلمانوں کی جانب مذہبی اور پولیٹکل امور میں ان کے دلوں میں جمے ہوئے ہیں رفع کریں اس لیے اگر یہ قومی تعلق پیدا ہو جائے تو بعض ان امور کا بہت اچھا موقع ہاتھ آئے گا۔ بس اسی خیال سے آپ کے خادم نے بھی ایک نسل سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد۔"

"کیا خوب! اے جناب! کیا فاتح قوم سے میل جول بڑھانے کے یہی معنی ہیں کہ ان سے یہ تعلق پیدا کیا جائے؟ کیا مواکلت، مشارکت اور مہادات وغیرہ باعث میل جول کے نہیں ہیں؟ ان الاسباب المحبة اربعة: اشیاء المجالسة والمکالمة والماکلة والمهادة (کذا) میں میل جول کے لیے یہ باتیں کچھ کم ہیں؟ اور آپ کا یہ کہنا کہ ان کی توجہ ہماری ترقی کا ذریعہ ہے محض غلط ہے۔ آپ کسی ترقی یافتہ قوم کی مثال نہیں پیش کر سکتے کہ گورنمنٹ یا فاتح قوم کی توجہ سے ترقی پائی ہو بلکہ جن قوموں میں سلف ہیلپ کا خیال قدرت نے پیدا کر دیا ہے انھوں نے خود ترقی کے اسباب پیدا کیے۔ خود مدارس جاری کیے، خود علوم و فنون کی تکمیل کے لیے دارالعلوم قائم کیے، خود آرٹ کے اسکول کھولے بلا امداد غیر اپنے خیال اور رائے اور مدد سے بے شک وہ ترقی کر گئے چنانچہ اس کی مثال کے لیے اہل یورپ کافی ہیں۔ ہاں ایسے موقعوں میں گورنمنٹ سہارا ضرور دیتی ہے اور یہ اس کا فرض ہے مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں۔"

جواب ندارد۔۔۔ (کچھ دیر بعد) "اچھا جانے دیجیے یہ وجہ نہ سہی لیکن فرمائیے جناب کہ اسلام نے تو اہل کتاب سے ہم کو اس تعلق کی اجازت دی تھی پھر جناب یہ گفتگو کیا ہے؟"

"ہاں! آئیے! اب آپ مذہب کے دامنگیر ہوئے ہیں۔ سنئے مذہب اسلام نے جس زمانے میں اس امر کی اجازت دی تھی بلا اس کے اس زمانے میں چارہ بھی نہ تھا۔ علاوہ اس کے مذہب اسلام کی آزادی بھی یہ معنی رکھتی ہے کہ مذہب اسلام انسانی ضرورتوں کے لیے ایک حد تک آزادی دینے والا ہے اور اس میں نہایت تسہیل ملحوظ رکھی گئی ہے جس سے اس کی جامعیت اور مانعیت متحقق ہو اور اکثر مواقع میں جب کہ اتفاقیہ اس تعلق کی ضرورت ہو تو اہل کتاب سے مذہب کی ممانعت بیچ میں حائل نہ ہو، نہ یہ کہ بلا کسی خیال مصلحت کے ہر زمانے میں اس پر زور دیا جائے۔ علاوہ اس کے اس زمانے میں آجکل کی قوم مسلم فاتح تھی، ہر طرف اسلامی سلطنت چھائی ہوئی تھی اس لیے اس تعلق سے مسلمانوں کو ہرگز ان عورتوں اور ان کے اثروں کا خوف نہ تھا جس قدر کہ آج برعکس حالت پیش ہو جانے سے درپیش ہے۔ جس طرح کہ ہم مفتوح اور یورپین قوم فاتح ہے اسی طرح اس تعلق میں بھی عورت فاتح اور مرد مفتوح رہے گا۔ اس حالت سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اولاد پر کس قدر عورت کے اخلاق و عادات اور مذہب کا برا اثر پڑے گا۔"

جیسی باتیں اب تک میں اسی جائز کی گئی ہیں وہ اکثر مواقع کے لحاظ سے مخصوص ہوتا ہے جس میں پیش ہیں اس سے اس کی بابت کوئی منفی پہلو سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

مولوی ۔ تو فرمائیے کہ اس فعل سے کیا برا اثر اولاد پر پڑ سکتا ہے؟ والد ۔ ہاں آپ کا فرمانا غور طلب ہے اور میرے نزدیک یہ بات مسلّم تو معلوم ہوتی ہے۔ اگر آپ کوئی ایسا واقعہ پیش کر دیں کہ جس سے اس امر کی تصدیق ہو تو پھر آپ کا فرمانا بجا قرار دیا جاتا ورنہ آپ نے کہا اور میں نے مانا۔

کیا آپ کو نہیں معلوم؟ آپ تو پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ یورپی مورخ مسٹر ... نے اس کے پیچھے غلط تاریخ، آپ نے دیکھی ہوگی۔ مجھے ہم ... کا ایک تاریخی واقعہ جو اسلامی سلطنت میں واقع ہوا ہے پیش کرتا ہوں۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے گا کہ آج کل یورپین سلطنت ہے اور اس زمانے میں اسلامی بادشاہت تھی ... یہ واقعہ پیش آیا۔ اس واقعے کو مسٹر ... کے ظورا ناول میں بھی آپ دیکھ سکتے ہیں۔ اندلس میں جب کہ عبدالرحمٰن ثانی کی سلطنت تھی اور اس نے عیسائیوں کو مذہبی آزادی دے رکھی تھی، ایک بھائی بہن واقعے کے لحاظ سے اغوا گزرے ہیں۔ ایک لڑکی تھی جس کا نام ظورا تھا اور اس کا بھائی زیاد نامی تھا۔ ظورا کا باپ ایک اندلسی عربی مسلمان تھا جس نے ایک عیسائی حسین عورت سے جائز عشق پیدا کر لیا تھا، اس سے ظورا پیدا ہوئی۔ باوجودیکہ باپ مسلمان نے اسلامی نام رکھ کر اپنا ... بھی کر دیا مگر اس عیسائی عورت نے اپنے طریقے کے موافق اپنی زبان میں اس کا نام ظورا رکھا۔ باپ ہر وقت گھر میں رہ نہیں سکتا تھا، ماں کا سایہ اس پر ہر وقت رہتا تھا اس لیے اس نے ظورا کے دل میں عیسائی مذہب کی بنیاد اچھی طرح جما دی۔ ماں مر گئی، باپ مر گیا، بھائی زیاد صرف باقی رہا۔ پادریوں نے ظورا کو حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ ایک مسلمان کے پنجے سے نکل جائے۔ ظورا کو زیاد نے ہر چند سمجھایا کہ مذہب اسلام برحق ہے مگر ... ایک نہ لگی۔ معاملے نے طول پکڑا، زیاد کے گھر عیسائنیں آنے لگیں اور اس کے نکالنے کی کوشش کرنے لگیں۔ زیاد نے بھی خوب انتظام کیا مگر بے سود۔ ظورا نکلی اور کہاں کہاں پہنچی۔ زیاد اس کی تلاش میں پریشان ہوا۔ کہاں کہاں کی خاک چھانی اور کدھر کدھر کی مٹی اڑائی۔ بالآخر بہت سخت سخت واقعے اس کی بدولت پیش آئے۔ سلطنت کو حیرانی ہوئی، رعایا کو پریشانی، زیاد اور ظورا دونوں برباد ہوئے اور دیکھنے والے افسوسناک نگاہ سے دیکھتے رہے۔

الغرض باوجودیکہ فاتح قوم مسلمان تھی لیکن پھر بھی اسی تعلق نے کیا کیا گل کھلائے، کتنے خاندان برباد ہوئے، کتنے جان سے گئے، تمام اسلامی اور عیسائی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ کس لیے ہوا؟ یہ سب اسی تعلق کی وجہ سے ہوا۔ اسی کمبخت تعلق نے یہ سب کچھ کیا جس کی یہ کچھ آپ تعریف کر رہے ہیں۔ اب غور فرمائیے کہ آج کل فاتح قوم کا اثر بالکل رعایا پر چھایا ہوا ہے، فاتح قوم سے یہ تعلق کیا ایسی نہیں پیدا کرتا؟ کر چکا ہے، اور ضرور کرے گا۔

جواب نمبر ..... (ادھر ادھر دیکھ کر) اچھا اب (کھانس کر) جانے دیجئے۔ ہم ..... (کھانس کر) مگر اس کا کیا جواب ہے کہ ہم ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کو تعلیم یافتہ عورتوں کی ضرورت ہے اور ایسی از ہندوستانیاں مفقود۔ پھر کیا کیا جائے؟ مجبوراً ہمیں دوسری تعلیم یافتہ معزز قوم (ذرا تبسم کے ساتھ) کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے۔ کیا ہم ایسے تعلیم یافتہ جاہلہ عورتوں کی زبان سے ننگی ننگی گالیاں بصورت ...

۱۔ اس ناول کا نام ظورا اظورندا ہے۔

کی جاہلانہ اور ہاسر پرستی کی آواز بن سکتی ہیں؟"

"واقعی یہ آپ کا ارشاد ایک پہلو سے بجا ہے، جیسا کہ جناب چودھری خوشی محمد صاحب ناظر نے اس پوکانفرنس کے کچھ ہی خطاب میں ظاہر کیا۔ تب اس جہالت نسواں سے یہ اچھا عذر آپ کے ہاتھ آگیا ہے اور جب تک تعلیم نسواں کا نہال ہندوستان میں نہ ہوگا اس مفت (کذا) کا آپ کو موقع ملتا رہے گا لیکن حضرت نہیں اگر آپ محب قوم ہیں تو آپ کو چاہیے کہ آپ تعلیم نسواں کو جاری کرنے کی کوشش کریں اور عورتوں کو اس قابل بنائیں ان سے عقد کریں تاکہ یہ ضرورت قوم کو تعلیم پر آمادہ کرے۔ نہ یہ کہ آپ یہ عذر پیش کر کے غیر قوم کی تعلیم یافتہ لیڈیوں کو جو پہلو میں بٹھا کے مزے میں زندگی بسر کریں اور اس سے مستغنی ہو جائیں سوا اس کے جو ہندوستانیوں نے یہ تعلق کیا ہے ان میں اکثر ایسے نکلیں گے جو اپنے اس کیے پر پشیمان ہو رہے ہیں اور اس خرچ اور آزادی سے تحمل نہیں ہو سکتے جو اس سبب سے کرنے پڑتے ہیں (کذا) کیا آپ کسی ایک موزوں شخص کے حالات سے بھی واقف نہیں جنھوں نے یہ تعلق پیدا کر کے تقریباً اپنی زندگی تلخ کر رکھی ہو؟ مگر افسوس ہے کہ اس پر بھی آپ ایسے (کذا) ناواقفوں کی آنکھیں نہیں کھلتیں اور یورپ کی سفید رو لیڈیوں کو دیکھ کر جیسے جو منہ ہو جاتی ہیں مگر ہاں! یہ ضرور ہے کہ آپ لوگ ایک حد تک معذور اور مجبور بھی ہیں۔ یہ سب کچھ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لندن میں تعلیمی خیال سے ایک جوشیلے نوجوان کا جانا اور وہاں چار طرف حسن ہی حسن کا نظر آنا ایک ایسا نظارہ ہے جسے دیکھ کر بے اختیار نہ ہونا مشکل امر ہے۔

ہمارے مکرم دوست سید اکبر حسین صاحب سشن جج سہارنپور نے تعلیم یافتہ گروہ پر سے اس اعتراض کو رفع کرنے کی نئی کوشش کی ہے اور ایک عجیب و غریب و دلچسپ نظم لکھی ہے۔ اس نظم نے ہم کو بہت ہی لطف حاصل کرنے کا موقع دیا ہے۔ ہم نہیں پسند کرتے کہ اس نعمت سے ناظرین "پنچ" محروم رہیں ایسی حالت میں کہ اس کا پہلا مصرع عنوان پر ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اس نظم میں انھوں نے یہ اعتراض رفع کیا ہے اس کی داد ناظرین پر چھوڑتا ہوں۔

قطعہ:

اک مس سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد ۔۔۔ اس خطا پر سن رہا ہوں طعنہ ہائے دل خراش
کوئی کہتا ہے کہ بس اس نے بگاڑی نسل قوم ۔۔۔ کوئی کہتا ہے کہ ہے یہ بدخصال و بدمعاش
دل میں کچھ انصاف کرتا ہی نہیں کوئی بزرگ ۔۔۔ ہو کے خود مجبور یہ کرتا ہوں اس پردے کو فاش
ہو چکی تھی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو ۔۔۔ قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی طرز معاش
جگمگاتے ہوٹلوں میں جا کے نظارے کرو ۔۔۔ سوپ و کاری کی طرف راغب ہو چھوڑو دال ماش
جب عمل اس پر کیا پریوں کا سایہ پڑ گیا ۔۔۔ جس سے تھا دل کی حرارت کو سراسر انتعاش
سامنے تھیں لیڈیاں زہرہ وش و جادو نظر ۔۔۔ یاں جوانی کی امنگ اور ان کو عاشق کی تلاش
دونوں جانب تھا دلوں میں جوشش خون فتنہ زا ۔۔۔ دل ہی تھا آخر نہیں تھی برف کی یہ کوئی قاش

۱؎ کذا ۲؎ یہاں پر کاغذ پھٹ گیا ہے۔ خون کا حرف ن موجود ہے۔

اس کی جو وہ تعریف آئین اکبری کی بابت پہ لکھا — جہاں اس کی صنعت حیرت اُس کی تمام پر حق باش
عجب بہ صورت تھی خوشی تھا کہ اک برق بلا ؛ — دست سپہر کہ بر حاجی دو رہیں کہ مادہ باش
بہ راہ آمدت آنکہ بہ سے بہاں میں جو بہ بیساں — حضرت سید سے جا کر وہ کر نہ کرو کوئی کام
درِ صاحبِ قبول یا نخوت میں صدر گردد — نہ پیچو نی کہ دامن مزکی ہشیار باش

مرزا غالب حضرت آپ نے جو تعریفیں بیان کی ہیں ان کی وہ اختصار سے تصدیق کر سکتے ہیں جو آپ کو پہچے ہیں خدا بند چکے ہیں کہ آپ میرے مرتی شناس جنہیں کر شبیب کالج (اقدام) لندن جانے والوں کے لئے بہت ہی مناسب حال ہے۔ راقم حضرت آپ کا اور نسیم۔
بقلم ابوالکلام محی الدین احمد دہلوی بکلکتہ۔

ممالک اسلامیہ اور سید احمد خانی خیالات

راز داعت اصل کچھ بھی باطن نہ تھا ظاہر ہوا!
اب تو ہے سب کی زبان پر جو ہمارے نالوں میں ہے

سید احمد خاں مرحوم کی بے نظیر فطری قابلیت بے مثل عالی دماغی اور ان کی اسلامی تحقیقات کی قدر اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ جو آواز اب سے تیس چالیس برس پہلے اس اسلامی دور کے آخری مجدد کی زبان سے سرزمین ہند میں بلند ہوئی تھی آج عام اسلامیہ اور خود ہندوستان کے ہر روشن خیال اور تعلیم یافتہ شخص کی زبان سے نکل رہی ہے۔ وہ راگ جو اس زمانے میں ہمارے کانوں کو نہایت ناگوار اور ناملائم جیسے ہم اپنے خیالات پیش کیے وقت کی رنگینی سمجھ رہے تھے آج ہمارے لفظ پسند کانوں کو نہایت سریلا معلوم ہو رہا ہے اور ہم ہیں کہ اس راگ پر مست ہوئے جاتے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص اسی راگ پر مٹا ہوا ہے۔ کھلی مخالفت خود ہم کو اب شرمناک معلوم ہوتی ہے اور تعجب ہے کہ ایسی صاف اور صحیح باتیں بادی النظر تعصب اور (کذا) جہالت کے سبب ہیں کیونکر ہمیں ناگوار معلوم ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں سید[1] کی مثال ایک ایسے روشن ضمیر مدبر کی سی ہے جو غفلت اور ناواقفی کے زمانے میں ایک اونچے پہاڑ کی بلند چوٹی پر چڑھ کر اپنی غافل قوم کو ایسی تعلیم دینا شروع کر دے جسے ان کی جہالت اور غفلت سے کوئی نسبت نہ ہو۔ ان کے کمزور خیالات ان کی حد سے بڑھی ہوئی غفلت اس تعلیم کے حاصل کرنے کی متحمل نہ ہو۔ وہ اس روشن ضمیر کے روشن خیالات پر ہنسیں اور اس کی عاقلانہ تعلیم کو دیوانگی سے تعبیر کریں۔ جہالت کا زور ان کی طبیعتوں پر یہاں تک غالب آئے کہ وہ اس محب قوم کو دشمنِ ملت سمجھ کر اس کی مخالفت پر آمادہ ہو جائیں۔ تعصب کا خوفناک دیو ان کی عقل پر یہاں تک مستولی ہو جائے کہ وہ اپنے جان و ایمان کے فدائی کی جان لینے اور اسے خدمت قومی کے جرم میں طرح طرح کی تکلیفیں دینے میں اپنی نجات سمجھیں مگر وہ روشن ضمیر مدبر اور محبِ قوم ان کی ان جاہلانہ حرکتوں کو بچوں کی نادان حرکات سے تشبیہ دے اور انھیں اپنی برائی اور بھلائی سے ناواقف سمجھ کر انھیں ایسی قابلِ سرزنش حرکتوں پر بھی معذور رکھے لیکن یہ پکار پکار کر کہے کہ اس زمانے کو دور نہ سمجھو جبکہ تم میں اپنی برائی بھلائی کی تمیز ہو جائے گی اور تم وہ سمجھو گے جو میں آج سمجھ رہا ہوں اور وہ جانو گے جو میں آج جان رہا ہوں۔

---

(۱) سید سے مراد سر سید احمد خان مرحوم

اس وقت نہ میری اس تعلیم کی قدر کرو گے اور نہ میری خدمتِ قومی اور محبتِ وطنی یاد آئے گی۔ سر سید نے ہی سب سے پہلے یہ دعویٰ کیا کہ اگر بائیبل پر صحیح اصول پر تفسیر کی جائے تو وہ اختلاف دور ہو جائے جو بائیبل کے مطالب اور قرآن مجید میں مدت سے مانا جاتا ہے اور ثابت ہو جائے کہ تثلیث کے مسئلے کو الہامی بائیبل سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ عیسائیوں کا ساختہ پرداختہ مضمون ہے۔ اسی دعوے کا عملی ثبوت تبیین الکلام کی تین جلدوں سے ملتا ہے جو سر سید نے اس زمانے میں لکھ کر شائع کی تھیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جس نے سر سید کو اس قسم کے مضامین لکھنے پر آمادہ کیا تھا۔ ایک مدت تک مصر میں ایک عیسائی عالم نے محسوس کی اور وحدتِ ادیان کے نام سے ایک اخبار جاری کیا جس کی اصل غرض یہ تھی کہ بہ مقصد اسلام، نصرانیت اور عیسائیت پر ظاہر کر کے انھیں ترجمہ فی الادیان پر آمادہ کیا جائے۔ سر سید ہی دنیائے اسلام میں وہ پہلا شخص ہے جس نے پہلے پہل یہ ضرورت محسوس کی کہ جدید فلسفے کے مقابلے میں جدید علم الکلام کی ضرورت ہے اور قدیم متکلمین کی تصنیفات موجودہ علوم کے لیے کافی نہیں ہیں۔ اگرچہ اس زمانے میں علمائے اسلام نے اس خیال کی بڑی مخالفت کی لیکن آگے چل کر زمانے نے یہ راز بھی اچھی طرح سمجھا دیا۔ خود علماء اس طرف متوجہ ہوئے اور علم کلام کا جدید اسلوب پر ترتیب دینا اسلام کی اصلی خدمت سمجھی۔ ندوۃ العلماء کے ابتدائی جلسوں کی رپورٹ سامنے رکھو اور شاہ سلیمان صاحب پھلواری اور مولوی محمد حسین صاحب الٰہ آبادی، مولوی محمد ابراہیم صاحب آروی مرحوم کی تقریریں دیکھو۔ اسی ضرورت کا رونا نظر آئے گا جس کے پیش کرنے پر انھیں ملامت ایک زمانے میں سر سید کی تکفیر کی تھی۔ ممالکِ اسلامیہ میں اس ضرورت پر ایک عرصے سے توجہ ہو رہی ہے۔ رسالۃ الحمیدیہ جو اسی موضوع پر ایک طرابلسی عالم کی تصنیف ہے ہندوستان میں اچھی طرح شائع ہو چکا ہے اس کے علاوہ الحق الصریح، الاسلام والمدنیۃ وغیرہ کئی کتابیں اسی ضرورت پر مصر و بغداد میں شائع ہوئی ہیں۔ مصر اور اسلامبول کے اسلامی رسالوں میں اکثر یہ بحث چھڑی رہتی ہے اور اس پر مبسوط تحریریں لکھی جاتی ہیں۔ المنار مصر کے جس نے قدیم و جدید فائل دیکھے ہیں وہ ہمارے قول کی تصدیق کر سکتا ہے۔ مصر کے مفتی اور جامع ازہر کے رکن شیخ محمد عبدہ مرحوم جو ایک بے بدل عالم و فاضل تسلیم کیے جاتے ہیں المنار میں آج کل آپ کے درسِ قرآن کا اقتباس تفسیر القرآن کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے جس میں اسی اصول پر قرآن شریف کی تفسیر کی جاتی ہے جو کبھی ہندوستان میں مستوجبِ تکفیر سمجھا گیا تھا۔ حال ہی میں مصر کے ایک روشن خیال عالم محمد فرید وجدی کی اسی موضوع پر ایک مبسوط کتاب ماہوار رسالے کی طرح مسلسل شائع ہو رہی ہے جس کا نام الاسلام فی عصر العلم ہے۔ غرض جو خیال اب سے ۳۰ برس پیشتر سر سید مرحوم نے ظاہر کیا تھا وہی خیال آجکل اسلامی دنیا کا عام ہو رہا ہے اور انسان فطرتاً آزاد ہے اور اس کی یہ آزادی کسی خارجی اثر سے زائل نہیں ہو سکتی۔ قدیم فلاسفر اس قدرتی آزادی کی تہ کو نہ پہنچ سکے اور دنیا میں غلامی کی خلافِ فطرت رسم پیدا ہو گئی۔ افلاطون الٰہی نے انسانی فطرت میں اختلاف تو قبول کیا اور صرف اہلِ یونان کو آزادی کا مستحق قرار دیا۔ اسی طرح یورپ بھی ایک عرصے تک غلامی کا حامی رہا لیکن جب علم کی روشنی جہالت کی تاریکی پر غالب آئی تو تمام یورپ نے انسان کو فطرۃً آزاد تسلیم کر لیا اور ایک یورپین کو جس آزادی کا مستحق سمجھا وہی استحقاق ایک حبشی اور سرکیشین کے لیے لازمی قرار دیا لیکن برخلاف اس کے اسلامی دنیا ایک عرصے سے غلامی کو جائز سمجھ رہی ہے اور عام طور پر وہاں اس کا رواج ترقی کر رہا ہے۔ سلطان المعظم کا تمام محل سرکیشین لونڈیوں سے آباد ہے اور وہیں [illegible] کی رونق غلاموں سے بھی جاری ہے۔ یورپ اسلام پر بڑے زور سے معترض ہے کہ اسلام انسان کو اس کی فطری آزادی سے محروم رکھتا ہے اور غلامی کی ناپاک رسم کا حامی ہے۔ اس اعتراض کے رفع کرنے کا سب سے پہلے اسلامی دنیا میں سر سید کو خیال ہوا اور مرحوم نے "ایسیز آن دی لائف آف محمد" میں عقلی و نقلی دلائل سے اسلام کو اس رسم کی اعانت سے بری ثابت کیا اور لکھا کہ مسلمانوں کے افعال کا بانیٔ مذہب

[illegible] روشن خیال [illegible]

غالب اور حادثۂ اسیری

(ایک معاصر شہادت اور قطعۂ تاریخ)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

غالب کے واقعۂ اسیری کے حالات ابھی پوری طرح سامنے نہیں آئے۔ اس زمانے میں ذاتی وجاہت اور وضعداری کے آداب ہی کچھ ایسے تھے کہ نفسی کمزوریوں کو زیادہ سے زیادہ زیرِ پردہ رکھا جاتا تھا۔ اور ہر بات میں ایک خاص رکھ رکھاؤ اور سلیقے سے رہنے کے انداز کو ترجیح دی جاتی تھی۔ فن کو دامنِ شرافت اور معصومیت سے کچھ اس طرح بندھا ہوا تھا کہ فن کار کی ذرا سی لغزش سے اس کی عظمت پر حرف آسکتا تھا۔ چنانچہ غالب بھی قید کے واقعہ کو اپنی بہت بڑی بے آبروئی تصور کرنے پر مجبور تھے۔ جہاں تک بن پڑا، انھوں نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔ غالب کے اولین سوانح نگار حالی نے بھی، چونکہ وہ تہذیبِ اخلاق و آداب کے دلدادہ تھے، غالب کی سیرت کے اس پہلو کو تحقیق کی روشنی میں لانا پسند نہیں کیا۔ بلکہ ان کی شخصیت کو زیادہ سے زیادہ مثالی بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی۔

عام شہرت کے برخلاف غالب قمار بازی کے الزام میں ایک دفعہ نہیں، دو دفعہ معتوب ہوئے تھے۔ پہلا واقعہ ۱۸۴۱ء کا اور دوسرا ۱۸۴۷ء کا ہے۔ مرزا حیرت دہلوی نے اپنی کتاب "چراغِ دہلی" میں غالب کے حادثۂ اسیری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "مرزا صاحب کے ساتھ بہت رعایت کی گئی۔ کسی قسم کی توہین نہیں ہوئی اور کسی نے ہتھکڑی تک نہیں لگایا بلکہ ضمانت پر رہا کر دیئے گئے۔"[1] اس روایت میں غالباً پہلے واقعۂ گرفتاری کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ دوسری بار تو باوجود کوششوں کے قید ہو ہی گئی۔ پہلے واقعۂ گرفتاری سے متعلق ہماری معلومات کا مستند ترین ماخذ "دہلی اردو اخبار" ہے۔ اس میں غالب کی گرفتاری کی خبر ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء کو چھپی تھی۔[2] یہاں سے اسے سب سے پہلے امداد صابری صاحب نے "تاریخ صحافتِ اردو" میں نقل کیا۔[3] لیکن انھوں نے غالب کی پہلی گرفتاری سے متعلق اس خبر کی اہمیت کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ اس کی طرف پہلی بار ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے توجہ دلائی۔[4] مالک رام صاحب نے "ذکرِ غالب" کے تیسرے اڈیشن

---

[1] چراغِ دہلی، حیرت دہلوی، ص ۲۲۷

[2] دہلی اردو اخبار، مورخہ ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء مخزونہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی

[3] تاریخ صحافتِ اردو، امداد صابری، دہلی، جنوری ۱۹۵۳ء ص ۱۴۰

[4] کلاسیکی ادب، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، دہلی، جولائی ۱۹۵۳ء، ص ۴

میں اس خبر کا ذکر امداد صابری صاحب نے سب سے پہلے اپنی [illegible] مالک رام صاحب نے دہلی اردو اخبار کی تاریخ وہ [illegible] ہے جو غلط ہے۔ غالب کی گرفتاری کی یہ خبر دہلی اردو اخبار [illegible] اگست ۱۸۴۱ء کے اردو اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ اس خبر سے جو نکتے نکلتے ہیں غالب کے حوالے سے ان سے بعض اہم نتائج اخذ کرتے ہیں [illegible] اس سے سب سے پہلے اسے ایک نظر دیکھ لینا ضروری ہے

"سنا گیا ہے کہ ان دنوں تھانہ گذر قاسم خان میں بہ تبدیل کوتوال کے عمل سے اکثر نامی قمار باز پکڑے
گئے مثلاً [illegible] خان وغیرہ کے ۔ ۔ ۔ لکھنے میں [illegible] لیکن بہ سبب رعب اور کثرت
مردم کے یا کسی طرح سے کوئی تھانہ دار دست انداز نہ ہوا۔ [illegible]
[illegible] جوئے کا [illegible]
[illegible] مدت کا ذکر ہے [illegible] کرتا رہا ہے [illegible]
[illegible] مرزا اسد اللہ خان غالب [illegible] نواب شمس الدین قاتل ولیم فریزر صاحب
سے قرابت قریبہ [illegible] جب [illegible] سعی و سفارش
[illegible] گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ علی قدر
مراتب ہوا۔ مرزا اسد اللہ خان پر سو روپیہ [illegible] چار مہینے قید [illegible]
[illegible] لیکن اس علاقہ میں بہت رشتہ دار معمول اس قسم
کے ہیں [illegible] بے وقت چوٹ چھوٹ کریں ورنہ [illegible] ان کی دہائی جان
پر حکام سے تھانہ دار کو چاہیے کہ بہت عزیز رکھیں ایسا آدمی کم یاب ہوتا ہے[3]۔"

حیرت ہے کہ اس واقعہ کا ذکر کسی دوسرے معاصر نے نہیں کیا۔ نہ ہی غالب نے اپنے اس طرح معتوب ہونے کی طرف کوئی اشارہ کیا ہے۔ یادگار غالب بھی اس واقعہ سے خالی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ خود غالب نے یا ان کے کسی بہی خواہ نے جرمانہ کی یہ رقم ادا کر دی اور اس طرح وہ قید کی آفت ناگہانی سے بچ گئے۔ دہلی اردو اخبار کے اس بیان پر مندرجہ ذیل تنقیحات قائم ہوتی ہیں:

۱۔ غالب کا مکان قمار بازی کا اڈا تھا۔
۲۔ اس میں بڑے بڑے نامی قمار باز شریک ہوتے تھے۔
۳۔ تھانیدار جو قوم سے سید تھا، بہت بے طمع اور جری تھا۔
۴۔ تمام قمار باز گرفتار ہوئے اور عدالت سے علی قدر مراتب جرمانہ ہوا۔
۵۔ مرزا غالب پر سو روپے جرمانہ اور عدم ادائیگی کی صورت میں چار ماہ قید کی سزا ہوئی۔
۶۔ اس خبر میں غالب کے قید ہونے کا کوئی ذکر نہیں۔

---

[1] ذکر غالب، مالک رام (اشاعت سوم) دہلی ۱۹۵۵ء ص ۸۲
[2] یہ جملہ غور طلب ہے۔ بظاہر بیان "قاتل ولیم فریزر کے قرابت قریبہ" کا کوئی محل نہ تھا۔ لیکن اس کے پس منظر میں جو مفہوم جھانک رہا ہے وہ خاصا اہم ہے۔
[3] دہلی اردو اخبار مورخہ ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء محفوظہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی۔

اس واقعہ کے چھ برس بعد غالب قمار بازی کی وجہ سے دوسری بار ۱۸۴۷ء میں معتوب ہوئے۔ اس دفعہ احباب اعزہ کی سعی و سفارش کے باوجود قید ہو ہی گئی۔ یہ واقعہ غالب پر بہت شاق گزرا۔ یہاں صرف اسی واقعۂ اسیری سے متعلق غالب کے ایک معاصر شاعر کا بیان، و قطعہ تاریخ پیش کرنا مقصود ہے۔ اس سے چونکہ بعض اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں، ان کا تجزیہ کرنے کے لیے اس واقعہ سے متعلق خود غالب نے اور ان کے معاصرین کے بیانات کو سامنے رکھنا نہایت ضروری ہے۔ سب سے پہلے ان خبروں کو پیش کیا جاتا ہے جو غالب کے معاصر اخبارات میں ان کی گرفتاری کے بارے میں شائع ہوئی تھیں۔

(ا) غالب کے واقعۂ اسیری سے متعلق سب سے پہلی خبر جو اس وقت ہماری اطلاع میں ہے، ماسٹر رام چندر کے ہفتہ وار "فوائد الناظرین" دہلی میں مورخہ ۳۱ مئی ۱۸۴۷ء کو شائع ہوئی۔

"خبر دہلی: ۲۵ مئی کو بیچ مکان جناب مرزا نوشہ اسد اللہ خاں صاحب کے قمار بازی ہو رہی تھی، چنانچہ کوتوال صاحب خبر پا کر وہاں گئے اور جناب مرزا صاحب کو مع چند اور قمار بازوں کے گرفتار کر کے کوتوالی میں لے آئے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ صاحب مجسٹریٹ ان کے متعلق کیا حکم دیتے ہیں۔"[1]

غالب کی گرفتاری کی تاریخ یعنی ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء اسی خبر سے معلوم ہوتی ہے۔ یہ خبر ان کی گرفتاری کے چھ روز بعد شائع ہوئی۔ مجسٹریٹ نے اپنا فیصلہ نہیں سنایا تھا۔ ظاہر ہے یہ زمانہ انھوں نے حوالات میں گزارا ہو گا۔

(ب) اس سلسلے کی دوسری خبر بمبئی کے احسن الاخبار کی ہے۔ اس اخبار میں دہلی اور دربار شاہی سے متعلق جو حالات چھپتے تھے ان کا ترجمہ خواجہ حسن نظامی نے "دہلی کا آخری سانس" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ اس کتاب میں غالب کی گرفتاری کا ذکر ۲۰ جون ۱۸۴۷ء کی خبروں میں، یعنی گرفتاری کے پورے ایک ماہ بعد یوں آیا ہے:

"مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں قید کیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی کہ ان کو رہا کر دیا جائے۔ یہ معززین شہر میں سے ہیں اور جو کچھ ہوا ہے، محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوجداری سے نواب صاحب فلاں بہادر نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے۔ ایسی حالت میں قانون سفارش کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔"[2]

۲ جولائی ۱۸۴۷ء کی خبروں میں پھر اس مقدمے کے فیصلے کا ذکر یوں آیا ہے:

"مرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا۔ اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے قید بامشقت اور دو سو روپے جرمانے کی سزا

---

[1] ص ۸۰، شمارہ ۱۰۔ بحوالہ "قدیم اخبارات کی کچھ جلدیں" امتیاز علی عرشی، نوائے ادب اپریل ۱۹۵۸ء

[2] دہلی کا آخری سانس، خواجہ حسن نظامی ص ۱۷۱

جوئے [illegible] دوسرے روپیہ [illegible] بازی کو جوا [illegible] ہیں اور [illegible] جوئے کا [illegible] کے علاوہ [illegible] روپیہ [illegible] اور [illegible] نوشت معاف ہو جائے گی۔ جب [illegible] بات [illegible] سمجھا جاتا ہے کہ مرزا صاحب [illegible] سے تعلیل [illegible] ہیں [illegible] یہ چیزی [illegible] قانونی چال ہے اور کوئی چیز [illegible] ہے [illegible] مرزا صاحب کی [illegible] سے باہر ہے۔ لیکن [illegible] ہے کہ اگر [illegible] جج کی عدالت میں [illegible] جائے اور [illegible] صرف [illegible] ہو جانے [illegible] عدالت [illegible] بالکل صاف ہے کہ [illegible] کی عزت و شہرت کا [illegible] لوگوں کے دلوں پر [illegible] ہو جائے۔ [illegible] جرم میں اتنی آزادی ہو جس سے [illegible] قانونی احتمال ہے۔[1]

(ج) مسٹر کریم الدین نے غالب کے واقعۂ اسیری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"ان ایام میں یعنی [illegible] ۱۸۴۶ [illegible] ان پر [illegible] سرکار سے [illegible] پیدا جس کے سبب ان کو بہت رنج لاحق حال ہوا ....."[2]

(د) حالی نے "یادگار غالب" میں غالب کی گرفتاری کے حالات پوری طرح بیان نہیں کئے۔ صرف ان الفاظ میں صفائی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

"مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی اور جو مرجب کبھی کھیلتے تھے برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔"[3]

(ہ) اس واقعہ سے متعلق کچھ اشارے سید ناصر نذیر فراق دہلوی کی کتاب "لال قلعہ کی ایک جھلک" میں بھی ملتے ہیں۔ جس میں قلعہ کے بعض حالات وہاں کی ایک قدیم ملازمہ نیمی خانم کی زبانی لکھے گئے ہیں۔ اس کے مطابق مرزا غالب کا مقدمہ کنور وزیر علی خاں کی عدالت میں پیش ہوا اور قبل از وقت رہائی لاٹ صاحب یا کسی اور بڑے افسر کے اختیارات خاص کی وجہ سے ہوئی۔ گرفتاری کی وجہ انھوں نے یوں بیان کی ہے:

"کان گنہگاروں میں نے سُنا کہ محبوب علی خاں خواجہ سرا اور شہر کے کئی اشراف آدمی مل کر راتوں کو جوا کھیلتے تھے اور لاکھ لاکھ روپے کی بازی لگائی جاتی تھی اور جو شخص جیتتا تھا، محبوب خاں اس کی جیت کا روپیہ پنکھیوں میں لدوا کر اس کے گھر

---

[1] دہلی کا آخری سانس، خواجہ حسن نظامی صفحہ ۱۷۴ اور ۱۷۵

[2] کریم الدین، تذکرہ طبقات شعرائے ہند ۱۸۴۸، صفحہ ۳۷۸

[3] یادگار غالب، حالی، طبع لاہور، صفحہ ۲۷

مجھو دیتا تھا۔ مرزا نوشہ (غالب) کی حیثیت تنی بھاری بازی لگانے کی نہ تھی۔ مگر کرتے تو کیا نہیں۔ ...... کسی نہ کسی طرح مرزا صاحب اس صحبت میں پہنچ گئے۔ کوتوال جواریوں کی گھات میں لگا ہوا تھا۔ آج اس کا داؤ لگ گیا۔ اس نے سب کو پکڑ دھر لیا۔[1]

(د) اس سلسلے میں مفصل بیان مہر اور عبدالمجید سالک کا ہے۔ جسے مولانا ابوالکلام آزاد نے غلام رسول مہر کو ایک نوٹ کی صورت میں لکھا تھا اور جو ان کی کتاب "غالب" میں شامل ہے۔ اس کے ضروری حصے یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

"غدر سے پہلے مرزا کی آمدنی کا وسیلہ صرف سرکاری وظیفہ اور قلعہ کے پچاس روپے تھے[2] چونکہ زندگی رئیسانہ بسر کرنا چاہتے تھے اس لیے ہمیشہ مقروض و پریشان حال رہتے تھے۔ اس زمانے میں دہلی کے بے فکر رئیس زادوں اور چاندنی چوک کے بعض جوہری بچوں نے گزرانِ وقت کے جو مشغلے اختیار کر رکھے تھے ان میں ایک قمار کا بھی مشغلہ تھا۔ گنجفہ عام طور پر کھیلا جاتا تھا اور شہر کے کئی دیوان خانوں کی مجلسیں اس باب میں شہرت رکھتی تھیں۔ مرزا بھی اس کے شائق تھے۔ رفتہ رفتہ ان کے یہاں چاندنی چوک کے بعض جوہری بچے آنے لگے اور باقاعدہ جوا بازی شروع ہو گئی۔ قمار کا عام قاعدہ یہ ہے کہ صاحبِ مجلس (یا یوں کہا جائے کہ مہتمم قمار خانہ) کا ایک خاص حصہ ہر بازی میں ہوا کرتا ہے۔ جو بھی جیتے، فی صدی اتنا صاحبِ مجلس کا ہوگا۔ مرزا صاحب کے دیوان خانے میں مجلسیں جمنے لگیں تو وہ صاحبِ مجلس ہو گئے اور ایک اچھی خاصی رقم بے محنت و مشقت وصول ہونے لگی۔ وہ خود بھی کھیلتے تھے اور چونکہ اچھے کھلاڑی تھے۔ اس لیے اس میں بھی کچھ نہ کچھ مار ہی لیتے تھے......"

"ایک مدت تک شہر کے کوتوال اور حکام ایسے لوگ رہے جن سے مرزا غالب کی رسم و راہ رہتی تھی۔ اس لیے ان کے خلاف نہ تو کسی طرح کا شبہ کیا جاتا تھا۔ نہ قانونی اقدام کا اندیشہ تھا۔ انھیں میں ایک کوتوال فتیل کا شاگرد مرزا خانی بھی تھے......"

"لیکن غالباً ۱۸۴۵ء میں آگرہ سے تبدیل ہو کر ایک نیا کوتوال آیا۔ یہ مرزا خانی کی طرح نہ تو شاعر تھا نہ شعر طراز کہ غالب کا قدر شناس ہوتا۔ نرا کوتوال تھا۔ اس نے آتے ہی سختی کے ساتھ دیکھ بھال شروع کر دی اور جاسوس لگا دیئے...... بالآخر ایک دن ایسے موقعہ پر، کہ مجلس قمار گرم اور روپیوں کی ڈھیریاں چُنی ہوئی تھیں، کوتوال پہنچا اور دستک

---

[1] لال قلعہ کی ایک جھلک، سید ناصر نذیر فراق دہلوی، طبع دہلی، صفحہ ۴۴، ۳۵

[2] مولانا آزاد کا یہ بیان غالب کے دوسرے واقعہ اسیری یعنی ۱۸۴۷ء سے متعلق ہے لیکن اس وقت قلعہ کے پچاس روپے کہاں تھے۔ مولانا سے تسامح ہوا ہے۔ غالب تو گرفتاری کے تین برس بعد ۱۸۵۰ء میں قلعہ کے ملازم ہوئے (ذکرِ غالب، مالک رام ص ۶۷)

دی۔ وہ اُن کو پھر اُس سے نکال باہر کرتے۔ صاحب معاملہ یعنی میرزا مرتضیٰ بیگ[1]

مقدمہ بہ عوض ... کے بجائے منشی گھنشام لال عاشق[2] یارہ نمبر ... کہا جاتا ہے جو ... میں ... پیش ہو گیا۔ عاشق پر ... غالب کے ہم عصر تھے اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ غالب کے اس قضیے سے متعلق ... اشعار ... حاصل ... اس قطعہ میں عاشق نے پانچ تاریخیں نکالی ہیں۔ پہلی اور دوسری ... سے ... تیسری اور چوتھی ... کو ظاہر کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

ہر ساعت سے فصل ... نصیب رہ طوفان ہے
۱۲۵۶ فصل ... ۱۲۶۰ھ

اور شاہ کو سولہ دن ... نصیب ... پیمان ہے
۱۲ھ ... ۶۲

نطق غالب کیونکہ ہو ... گر سرکے دل پر تو
۱۲۶۳ھ

دنیا میں گمنامی کا ان چہروں سے بدنامی ہے

رہائی روز بد سے میرزا نوشہ کی کیوں کر ہو

زیب غمخوار بن کر وہاں تک فیض الحسن حسان ہے
۹۰۴ ہجری

---

[1] غالب، غلام رسول مہر، ص ۱۸۶۔ [2] منشی گھنشام لال عاشق دہلی کے کائستھ ماتھر تھے۔ ان کے والد رائے چنی لال شاہ عالم ثانی اور اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں دیوانی کے عہدوں پر سرفراز تھے۔ بہادر شاہ کے میر منشی مکند لال انھی کے بھتیجے تھے۔ یہ خود اکبر شاہ ثانی کے عہد میں مرزا بابر، خلف اکبر شاہ کے ملازم رہے۔ خوشنویسی اور موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا۔ شاعری میں شاہ نصیر کے تربیت یافتہ تھے، اور انھیں کی طرح سنگلاخ زمینوں کو پانی کرنا شعر گوئی کی معراج سمجھتے تھے۔ صنائع بدائع پر جان چھڑکتے تھے اور ساری توجہ چست بندشوں، خوشنما ترکیبوں اور الفاظ کی شعبدہ بازی پر صرف کرتے تھے۔ طبیعت تیز و طرار پائی تھی۔ دو غزلے، سہ غزلے لکھ کر اپنی قادر الکلامی کا لوہا منوا لیتے تھے۔ تاریخ گوئی میں بھی طاق تھے۔ ان کا انتقال ۶۰ برس کی عمر میں ۱۸۶۵ء میں ہوا۔ ان کے دیوان کا قلمی نسخہ انکے پوتے منشی بنسی گوپال المتخلص بہ شاطر کے پاس محفوظ تھا، جسے انھوں نے موہن لال ماتھر دہلوی کے مقدمے کے ساتھ کایستھ سبھا دہلی سے شائع کر دیا ہے۔

عاشق کے نواسے منشی بہاری لال مشتاق غالب کے شاگرد تھے۔ اردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی گوری شنکر قیصر بھی صاحب دیوان تھے۔ ان دونوں کے انتخابات دہلی سے شائع ہو چکے ہیں۔

[مقدمہ کلام عاشق، تلامذۂ غالب صفحہ ۲۵۹، دیباچہ دیوان مشتاق، دیباچہ دیوان قیصر، تذکرہ بہار سخن صفحہ ۲۷۲ نیز سخن شعرا، نساخ ص ۳۲۱]

میر بازو کو ملا تعویذ بنت عاصی
اسد کو جو خوں سے گھس کر ڈالا بزنداں ہے[۱]

اس قطعۂ تاریخ کی وضاحت میں عاصی نے ایک عبارت بھی لکھی ہے جس سے بعض اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

"مرزا نوشہ نے شاعر بے بدل دہلی، رند مشرب، متخلص بہ اسد و غالب تھے۔ فیض الحسن کوتوال دہلی کو ناحق عداوت پیدا ہوگئی۔ اس نے بعلت قمار بازی ان کو قید کرا دیا جس کی مندرجہ ذیل تاریخ نکالی گئی ..... بوقت گرفتاری کوتوال مع بلوچ رفقا میں بیٹھ کر موقع پر گئے اور ظاہر کیا کہ سواریاں زنانی آتی ہیں۔ اس دھوکے سے اندر داخل ہو گئے اور اندر مکان کے ضربات جوتی باہم اس قدر ہوئیں کہ باہر تک آواز آتی تھی۔ مگر زینہ کے اندر بہت جمعیت تھی اور کئی امدادی برقنداز پہنچ گئے۔ گرفتار کر کے قید کرا دیا۔ بہت سے رئیس اور شرفا اس حرکت سے ناراض ہوئے۔ اور عدالت میں برأت کے حامی ہوئے مگر قید ہو ہی گئی۔

ایک روز مسٹر راس صاحب سول سرجن دہلی قیدیان جیل خانہ کو ملاحظہ کرنے کے لیے حضرت کے پاس تک پہنچ گئے اور حال دریافت کیا۔ آپ نے فی البدیہہ یہ فرمایا ؎

جس دن سے کہ ہم غم زدہ زنجیر بپا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

اس وقت ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کو چٹھی لکھ کر رہا کرا دیا۔"[۲]

غور طلب امور

مندرجہ بالا شہادتوں کی روشنی میں سب سے اہم مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی غالب قمار بازی کے جرم کے مرتکب نہیں ہوئے تھے؟ اس بارے میں پیش کردہ بیانات میں گہرا تضاد ہے۔ بیان "ج" میں گرفتاری کے اسباب کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس لیے اس مسئلے میں وہ خارج از بحث ہے۔ بیان "ب" (احسن الاخبار) اور "د" (یادگار غالب) سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب جوا نہیں کھیلتے تھے۔ اس کے برعکس بیان "الف"، "د" اور "ز" سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کا مکان قمار بازی کا اڈا بنا ہوا تھا اور وہ خود بھی جوا کھیلتے تھے۔ بیان "ہ" ان متضاد بیانوں میں سے کونسا قرین صحت ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کے لیے ان مختلف بیانات کی صحت اور استناد کا درجہ متعین کرنا ضروری ہے۔

---

[۱] کلام عاصی، ص ۲۶۳۔ اس قطعۂ تاریخ کے علاوہ عاصی کے دیوان میں "غدر دہلی" "قتل ولیم فریزر"، شادی حضرت بہادر شاہ ہمراہ زینت محل، وفات نرائن داس ضمیر (جد پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی) کی تاریخیں بھی ملتی ہیں۔

[۲] ایضاً ص ۲۶۳، ۲۶۴

[illegible] خبر جانے [illegible] لکھا ہے

سب سے پہلے قرض معافی نے بھی [illegible] لکھا [illegible] ہے۔ حالی کا بیان تاریخی حقائق [illegible] تذکرہ [illegible] نے [illegible] کی [illegible] سے بہن پہچان نہ ہو جائیو [illegible] حقیقت میں [illegible] کی بعد مدت [illegible] رہتی [illegible] بیان کی حقیقی حیثیت، وہ مولانا ابوالکلام آزاد [illegible] سے :

"[illegible] حالی مرحوم نے [illegible] لکھا ہے وہ [illegible] کے لطائف [illegible] ہے جو [illegible] مرحوم [illegible] سوانح نگاری [illegible] بھی سمجھتے تھے۔ [illegible] پسند نہیں کرتے [illegible] [illegible] [illegible] حیات جاوید میں بھی انھوں نے ہر جگہ [illegible] ہے۔ [illegible] جو [illegible] سے [illegible] معاملے [illegible] ظاہر کرتے ہے کہ گویا کوئی بات [illegible] بھی مجلس [illegible] شطرنج کا شوق تھا۔ اس شوق کی تکمیل کے لیے برائے نام کچھ [illegible] بدل لیا کرتے تھے۔ کوتوال جو [illegible] تھا، اس نے قماربازی کا مقدمہ بنا دیا حالانکہ [illegible] [illegible] کے خلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پورا قماربازی کا معاملہ تھا اور نواب [illegible] الدین مرحوم (والی لوہارو) نے لفظوں میں مرزا نے اپنے مکان کو جوا بازی کا اڈا بنا رکھا تھا۔"[2]

غالب کے سوانح نگار کی حیثیت سے حالی کی کوتاہیاں بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ [illegible] ہے کہ اس زمانے میں غالب سے متعلق جو معلومات حاصل ہو سکتی تھیں، حالی نے ان سے پورا فائدہ [illegible] کی کوشش نہیں کی [illegible] وجہ سے نہ صرف غالب کے حالاتِ زندگی میں بعض غلطیاں راہ پا گئی ہیں، بلکہ ان کی سیرت و شخصیت کے بعض اہم پہلو بھی تشنہ رہ گئے ہیں۔[3]

حالی کی طرح احسن الاخبار نے بھی غالب کی قماربازی کو تسلیم نہیں کیا۔ اس نے لکھا ہے کہ مرزا نوشہ کی غلط اطلاعات کے باعث گرفتار ہوئے اور جو کچھ ہوا محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کی وجہ سے ہوا۔ [illegible] الاخبار کی شہادت بھی تحقیق اور تاریخی دونوں اعتبار سے [illegible] ہے۔ یہ اخبار دہلی سے نہیں بمبئی سے نکلتا تھا۔ اس زمانے میں فاصلوں کی دوری اور سفر کی مشکلات کے باعث خبر رسانی واقعات کی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ چنانچہ یہ خبر بھی غالب کی گرفتاری کے تیس دن بعد شائع ہوئی۔ اس میں بادشاہ کے سفارشی خط کا بھی ذکر ہے جو ریذیڈنٹ کو لکھا گیا تھا۔ غالب کی گرفتاری احباب و اعزہ کی دوڑ دھوپ، بہادر شاہ کا خط لکھنا، ریذیڈنٹ کا کورا جواب دینا واقعات کا ایک سلسلہ ہے جس کا اثر دہلی کے عوام پر غالب سے ہمدردی کی صورت میں ظاہر ہوا ہوگا۔ اور احسن الاخبار کے نامہ نگار کا اس سے

---

[1] تذکرہ حالی از اسمٰعیل پانی پتی میں لکھا ہے کہ غالب سے حالی کے تعلقات کا آغاز ہنگامہ ستاون کے بعد شیفتہ کی ملازمت سے پہلے ہوا۔ نیز ملاحظہ ہو، راقم الحروف کا مضمون "یادگارِ غالب" سالنامہ پگڈنڈی، امرتسر، ۱۹۵۶ء

[2] نقشِ آزاد، مرتبہ غلام رسول مہر، طبع دہلی صفحہ ۲۷۹، ۲۸۰

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "یادگارِ غالب کا تحقیقی مطالعہ" ڈاکٹر وحید قریشی، سویرا لاہور، ۲۴۲

متاثر ہونا خلافِ قیاس نہیں۔ چنانچہ وہ غالب کو قطعاً بے قصور گردانتے ہوئے ان کی گرفتاری کا باعث "دشمنوں کی غلط اطلاعات" قرار دیتا ہے۔ احسن الاخبار میں اس واقعہ سے متعلق جو دوسری خبر شائع ہوئی ہے، اس میں بھی غالب سے گہری ہمدردی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اس کی آخری سطروں میں جو احتجاج کیا گیا ہے، ان میں "غالب کی طرفداری" کا رنگ نمایاں ہے۔ دوسری خبر میں احسن الاخبار نے غالب کے "جرم" کو قبول تو کر لیا ہے، لیکن وہ اسے "معمولی" قرار دیتا ہے۔ اور ان کی سزا میں رعایت فقط اس بنا پر طلب کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے "باکمال انسان ہیں، جن کی عزت اور حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے"۔ یہ دلیل سراسر جذبات پر مبنی ہے حالانکہ قانون کے سامنے باکمال اور بے کمال، اور رئیس و مفلس سب کا درجہ برابر ہے۔ غرض حالی کی طرح احسن الاخبار کے بیان میں بھی غالب سے عقیدت و محبت کا جذبہ پایا جاتا ہے اور اس میں غالب کے دامن کو قمار بازی سے پاک دکھانے کی جو کوشش کی گئی ہے، وہ جانبداری پر مبنی ہے۔

یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ حالی اور احسن الاخبار کے بیانات تحقیقی اعتبار سے قابلِ اعتنا نہیں، ہم گواہوں کے دوسرے فریق کی طرف آتے ہیں جس نے غالب کو قمار بازی کا مرتکب بتایا ہے۔ اس فریق میں فوائد الناظرین، سرامیر الدین[۱] اور [illegible] شامل ہیں۔ فوائد الناظرین وہ پہلا اخبار ہے جس نے غالب کی گرفتاری کی خبر شائع کی۔ گرفتاری کی تاریخ بھی نفسِ خبر سے معلوم ہوتی ہے۔ یہ خبر اس زمانے کے حالات کے مطابق تاخیر سے بھی شائع نہیں ہوئی۔ ایڈیٹر یا نامہ نگار نے اس پر کوئی تبصرہ بھی نہیں کیا۔ اس کی نوعیت محض اطلاعی ہے اور اس میں کسی رنگ آمیزی کو دخل نہیں۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر اس خبر کو صحیح تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے سرامیر الدین کی زبانی جو روایت نقل کی ہے، اس میں غالب پر صاف الفاظ میں قمار بازی کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ اس روایت کے قوی نہ ہونے کی تین وجوہ ہیں:

(۱) غالب کے واقعۂ اسیری کے وقت امیر الدین پیدا ہی نہیں ہوئے تھے[۲]۔ اس لیے یہ روایت ہم تک ایک سے زیادہ واسطوں سے پہنچی ہے۔

(۲) غالب کے قید ہونے کے بعد لوہارو خاندان کا طرزِ عمل نہایت افسوسناک تھا[۳]۔ ان حالات میں سرامیر الدین کا بیان غیر جانبدارانہ نہیں ہو سکتا۔

---

[۱] پورا نام: نواب سرامیر الدین احمد خان، فرخ مرزا۔ یہ بیٹے تھے نواب علاؤالدین احمد خاں علائی کے، جنھیں مرزا غالب نے اپنا خلیفۂ ثانی بنایا تھا۔ وہ نواب امین الدین احمد خاں رئیس لوہارو کے بڑے صاحبزادے تھے جن کے والد نواب احمد بخش خاں، غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کے بھائی تھے۔

[۲] "سرامیر الدین، غالب کی وفات کے وقت زیادہ سے زیادہ آٹھ برس کے ہوں گے"۔ ان کے نام غالب کا خط غالباً ۱۸۶۸ء کا واقعہ ہے (مہر: خطوطِ غالب صفحہ ۲، ۴۱۱)۔ غالب ابتدائے اسیری کے ۲۲ برس بعد تک زندہ رہے۔ اس طرح امیر الدین کی پیدائش تقریباً ۱۸۶۱ء یعنی واقعہ قید کے ۱۳ یا ۱۴ برس بعد ہوئی۔

[۳] غلام رسول مہر، غالب، صفحہ ۱۸۷، ۱۸۸

(۳) محمود آزاد کے بیان میں غالب کی تردید کا شدید جذبہ پایا جاتا ہے۔ جس کے باعث وہ انتہا پسندی کا شکار ہو سکتے ہیں۔

البتہ اس روایت کے حق میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عام شخصیتوں کی خوبیوں پر تو پردہ پڑ سکتا ہے۔ لیکن معائب اور کمزوریاں ضرور سامنے آ جاتی ہیں۔ جو مادہ کھاگیا ہے کہ ذاتی خامیوں اور کمزوریوں کا پردہ اسی وقت چاک ہوا جب کسی مخالف نے اپنے بے باک انداز سے ان کی تشہیر کا سامان کر دیا۔ اس واقعہ کا تعلق بھی چونکہ غالب کی ایک کمزوری سے ہے۔ اس سے متعلق نواب خاندان کے ایک فرد کا بیان مباحثے سے قطع نظر اصلیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ حضرت صاحب غالب کی قمار بازی کی تصدیق نواب مصطفیٰ خاں اور ایک دہلوی معاصر کے منشا سے عاصی کے بیان سے بھی ہو جاتی ہے۔

شیخ محمد اکرام نے "غالب نامہ" میں عاصی کی عبارت کو "قید" کے ذیل میں درج تو کیا ہے لیکن قطعۂ تاریخ پیش نہیں کیا۔ اس کے متعلق ان کی رائے یہ ہے:

"شاید عاصی، غالب کا دل سے قدر دان نہیں تھا چنانچہ جو قطعۂ تاریخ اس نے لکھا ہے اس سے غالب کی صریح توہین ہوتی ہے۔"[1]

یہاں مؤلف "غالب نامہ" غالب پرستی کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہ منطق خوب ہے کہ چونکہ عاصی کے قطعۂ تاریخ سے "غالب کی صریح توہین ہوتی ہے"، اس لیے ان کے بیان کو ناقابلِ اعتنا قرار دے دیا جائے۔ صداقت ہمیشہ تلخ ہوتی ہے اور اگر ایک شخص نے غالب کے واقعۂ قید سے متعلق بھی باتوں کو صاف صاف بیان کر دیا تو اسے غالب کے قدردانوں اور بہی خواہوں کے زمرے سے خارج کرتے ہوئے اس کے بیان کی اہمیت کو کم کرنا کہاں کا عدل و انصاف ہے؟ یہ قید بجائے خود توہین آمیز تھی، پھر غالب کے کسی قدردان اور بہی خواہ سے یہ توقع کتنی عجیب ہے کہ وہ حرفِ صداقت زبان پر لائے گا۔ واقعۂ قید سے متعلق حقیقتِ حال کا اظہار یا تو کوئی غیر جانبدار فریق کر سکتا ہے یا پھر مخالف، دوسری صورت میں مبالغے کا قوی احتمال ہے۔ ہمارے نزدیک عاصی کو غالب کا مخالف یا معاند قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ اپنے بیان میں غالب کو "شاعرِ بے بدل" کہتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دلی میں اس وقت قدر دانی کے اعتبار سے شاعروں کے دو خاص گروہ تھے۔ غالب ایک مخصوص حلقے میں پسند کیے جاتے تھے اور عوام زیادہ تر ذوق کے پرستار تھے۔ عاصی شاہ نصیر کے شاگرد تھے، اور جب شاہ نصیر سے ذوق کے تعلقات کشیدہ ہوئے تو عاصی بھی ذوق کے مخالف ہو گئے۔ چنانچہ تیلیوں والے معرکہ خیز مشاعرے میں جو قدیم دلی کالج میں منعقد ہوا تھا، عاصی نے ذوق اور ان کے ہواخواہوں کو نیچا دکھانے کی پوری کوشش کی تھی۔[2] ذوق سے عاصی کی کشیدگی کے پیش نظر

---

[1] غالب نامہ، شیخ محمد اکرام، طبع لکھنؤ، صفحہ ۱۰۵

[2] محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اس معرکے کا ذکر یوں کیا ہے: "جن دنوں شاہ صاحب سے (ذوق کے) معرکے ہو رہے تھے۔ منشی فیض پارسا دلی کالج میں مدرس حساب تھے...... انھوں نے مدرسہ میں بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ کیا...... ان دنوں میں مدرسہ اجمیری دروازہ کے باہر تھا۔ شہر کے دروازے ۹ بجے بند ہو جاتے تھے۔ گڈھ کپتان سے اجازت لی کہ مشاعرہ کے دن ۲ بجے (رات) تک اجمیری دروازہ کھلا رہا کرے۔ غرض مشاعرہ مذکور اس شان و شکوہ سے جاری ہوا کہ پھر کوئی ایسا مشاعرہ دلی میں نہیں ہوا۔ شہر کے رؤسا اور تمام نامی شاعر موجود ہوتے تھے۔ سب کی نگاہیں شاہ صاحب اور شیخ صاحب کی طرف ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک مشاعرہ میں شاہ صاحب نے غزل — قفس کی تیلیاں، جس کی تیلیاں پڑھی۔ دوسرے مشاعرے میں یہی طرح ہو گئی۔ سب غزلیں کہہ کر لائے۔ شیخ مرحوم نے دو غزلہ لکھا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

یہ ضروری تو نہیں کہ ان کے غالب سے اچھے تعلقات تھے۔ لیکن بغیر کسی ثبوت کے انھیں غالب کا بدخواہ یا مخالف قرار دینا بھی غلط ہوگا۔ ذوق سے ان کی ہنگامہ آرائی اور غالب سے متعلق قطعہ تاریخ میں ان کے لہجے کی حق گوئی سے یہ نتیجہ ضرور نکالا جا سکتا ہے کہ وہ اگر غالب کے قدر دان نہ تھے، تو ان کے مخالف بھی نہ تھے۔ ان حالات میں عاصی کا بیان قطعاً غیر جانبدارانہ قرار پاتا ہے اور ایسے بیان کی تاریخی اور تحقیقی حیثیت مسلم ہے۔ غرض عاصی اور فوائد الناظرین کے بیانات کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ غالب قمار بازی کے مرتکب ہوئے تھے۔ اس سے ان کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ بلکہ ان کی سیرت کا ایک پہلو سامنے آجاتا ہے۔ غالب اپنی ادبی عظمت کی وجہ سے ہمیں محبوب ہیں لیکن کسی محبوب شخصیت کا ہر لحاظ سے مثالی ہونا ضروری نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسی شخصیت کی انسانی کمزوریاں

(حاشیہ بقیہ)

اور اس پر کچھ تکرار ہوئی۔ اس پر جوش میں آکر فرمایا کہ برس دن تک جو مشاعرہ ہوا اس میں سوائے غزل طرحی کے ایک غزل اس زمین میں ہوا کرے چنانچہ دو مشاعروں میں ایسا ہوا۔ ایسے معرکوں میں عوام الناس بھی شامل ہوتے تھے۔ تیسرے جلسہ میں جب انھوں نے غزل پڑھی تو بعض شخصوں نے کچھ کچھ چوٹیں کیں۔ جنھیں شیخ صاحب کے طرف دار سمجھے کہ شاہ صاحب کے اشارے سے ہوئیں۔ زیادہ تر یہ کہ شاہ وجیہ الدین منیر یعنی شاہ صاحب کے صاحبزادے نے یہ شعر بھی پڑھ دیا:

گرچہ قندیلِ سخن کو منڈھ لیا تو کیا ہوا
ڈھانچ میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں

اس پر تکرار زیادہ ہوئی اور مشاعرہ بند کر دیا گیا کہ مبادا زیادہ بے لطفی ہو جائے" (آب حیات طبع پانزدہم صفحہ ۴۶۷)

آزاد نے جس شعر کا حوالہ دیا ہے، وہ منیر کا نہیں، بلکہ گھنشام لال عاصی کا ہے۔ ان کے کلیات میں مجملاً اس شعر کے پوری غزل موجود ہے۔ اس مشاعرے میں چونکہ ذوق کا پلہ نیچا رہا تھا۔ آزاد نے نہ صرف باقی روئداد کو حذف کر دیا بلکہ عاصی کے شعر کو بھی منیر کے نام سے لکھ دیا۔ جب لوگوں نے اس غلطی پر اعتراض کیا تو آزاد نے حاشیے میں فقط اتنا لکھا: "بعض بزرگوں سے سنا کہ لالہ گھنشام داس لال، عاصی نے پڑھا تھا۔ وہ بھی شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔" (آب حیات، صفحہ ۴۶۸) واقعہ یہ ہے کہ مشاعرہ میں شاہ نصیر کی غزل پر اعتراضاً ذوق نے اپنے تلمیذ بہادر شاہ ظفر کی غزل میں چند اشعار پڑھے تھے۔ مطلع یہ تھا:

قافیہ میں گر نہ تھیں حضرت کے بس کی تیلیاں
یار کی چلون میں بھر پائے مگس کی تیلیاں

اس پر آئندہ مشاعرہ معرکے کا قرار پایا۔ عاصی نے اس مشاعرے میں طرحی غزل سے پہلے "چھیڑ کی غزل پڑھی" اس کے آخری دو شعر یوں تھے:

کل شیخ جی ہرن کی طرح بھولے چوکڑی | سیدھی سڑک بھی چل کے نہ مترا پہنچ سکے
عاصی وہ تیلیوں کی غزل اب کرو رقم | جس کو نہ سالکِ تگِ ہر بیت پہنچ سکے

اس کے بعد عاصی نے ۲۴ اشعار کی بڑی سیر قوافی غزل پیش کی۔ جسے سن کر سامعین نے "ایسا نا کہا کہ عاصی کی غزل لاجواب اور قابلِ تحسین ہے اور ذوق پر فوقیت رکھتی ہے" یہ غزل عاصی کے کلیات میں موجود ہے، اور اس کے بعض قوافی یہ ہیں: عبس، جرس، کہ ہوس، انفاس، نفس، عاشق بے دسترس، بید قرس، مرس، ولس، ترس وغیرہ (کلام عاصی صفحہ ۱۴۴-۱۴۸)

کو سامنے رکھنے کے بعد ہی اس کی عظمت کو صحیح پس منظر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ غالب اپنے معاشرے کے بچے تھے۔ ان میں کم و بیش وہ تمام خوبیاں اور خامیاں تھیں جو اس زمانے کے سماج میں لازمی ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان کمزوریوں کے باوجود وہ فن کی ان بلندیوں تک پہنچ گئے جہاں اُن کا کلام ہر معنوں میں حلقۂ شام و سحر سے نکل کر جاوداں ہو چکا ہے۔ حالی کے بیان سے غالب کے واقعۂ اسیری سے متعلق جن امور پر روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہیں:

کوتوال سے دشمنی

واقعۂ اسیری کے بارے میں غالب کی تصانیف سے زیادہ مدد نہیں ملتی۔[1] انھوں نے جو اسی شعر کا ایک فارسی ترکیب بند، قید کی حالت میں لکھا تھا، جسے متفقہ طور پر ان کی بہترین نظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن ان کے احباب وغیرہ نے اس خیال سے "حبسیہ" کو کلیاتِ نظم میں شامل نہ کیا کہ اس سے غالب کی قید ہمیشہ کے لیے منظرِ عام پر آ جائے گی۔ مگر بعد میں یہ متفرق فارسی کلام کے مجموعہ "سبدِ چین" میں شائع کر دیا گیا۔[1] اس میں غالب نے اسیری کے حالات و جذبات تو بیان کئے ہیں، لیکن قید کے اسباب و علل کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ حبسیہ کو کلیاتِ نظم میں شامل نہ کرنے کے واقعہ سے شبہ ہوتا ہے کہ غالب کے ایسے خطوط کی اشاعت بھی روک لی گئی جن میں قید سے متعلق کوئی بات ہو گی۔ ایسے ہی ایک فارسی خط کے اقتباس کا ترجمہ حالی نے پیش کیا ہے۔ یہ خط اُن کے فارسی خطوط میں شامل نہیں۔ اس میں غالب نے اپنے قید ہونے کی وجہ کوتوال سے دشمنی کو قرار دیا ہے:

"کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف۔ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے، میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا۔ اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔"[2]

مولانا آزاد اس سے متعلق فرماتے ہیں:

"مدتوں تک شہر کے کوتوال اور حکام ایسے لوگ رہے جن سے مرزا غالب کی رسم و راہ رہتی تھی۔۔۔۔ انھیں میں ایک کوتوال تقی کے شاگرد مرزا خانی بھی تھے۔۔۔۔ لیکن غالباً ۴۴ء میں آگرہ سے تبدیل ہو کر ایک نیا کوتوال آیا۔ یہ مرزا خانی کی طرح نہ تو شاعر تھا نہ نثر طراز کہ غالب کا قدر شناس ہوتا۔ نرا کوتوال تھا۔۔۔"[3]

---

[1] منشی ہرگوپال تفتہ کے نام، ۱۰ر دسمبر ۱۸۵۳ء کے ایک خط میں فقط اتنا لکھا ہے: "سرکارِ انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا۔ رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبہ لگ گیا ہے۔"

(عودی، طبع لاہور، صفحہ ۸۲)

[1] سبدِ چین، صفحہ ۴۲-۲۰۔ نیز ملاحظہ ہو "یوسف ہندی قیدِ فرنگ میں" مطبوعہ حیدرآباد

[2] یادگارِ غالب، صفحہ ۲۷

[3] نقشِ آزاد، صفحہ ۲۸۱

یہ صحیح ہے کہ جب تک مرزا خانی دہلی میں تھے، غالب کو کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔ لیکن مولانا کا یہ بیان محل نظر ہے کہ نیا کوتوال ۱۸۴۵ء میں آگرے سے تبدیل ہو کر آیا۔ غالب اس واقعہ سے چھ برس پہلے ۱۸۴۱ء میں بھی قمار بازی کے الزام میں معتوب ہو چکے تھے اور دہلی اردو اخبار نے صاف الفاظ میں ان کی گرفتاری کو نئے تھانیدار کا کارنامہ قرار دیا تھا۔

"اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانیدار قوم سے سید اور بہت جری سنا جاتا ہے، مقرر ہوا ہے۔ یہ پہلے جمعدار تھا، بہت مدت کا نوکر ہے۔ جمعداری میں بھی یہ بہت گرفتاری مجرموں کی کرتا رہا ہے۔"... [1]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا خانی کے بعد نیا کوتوال بقول آزاد ۱۸۴۵ء میں نہیں بلکہ ۱۸۴۱ء یا اس سے کچھ پہلے مقرر ہوا۔ دوسرے یہ تھانیدار آگرہ سے تبدیل ہو کر نہیں آیا، بلکہ دہلی میں "مدت کا نوکر" تھا۔ اور "پہلے جمعدار تھا"۔ دہلی اردو اخبار نے اس کا نام درج نہیں کیا۔ فقط یہی لکھا ہے کہ یہ قوم کا سید ہے۔ گمنام لال عاصی نے کوتوال کا نام اپنے قطعہ تاریخ اور توضیحی عبارت میں "فیض الحسن خاں" بتایا ہے۔ احسن الاخبار مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۸۴۸ء کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے:

"گورنر جنرل نے دہلی میں ۲۸ کو دربار عام کیا تھا اور اس میں غالب کو خلعت ہفت پارچہ و سہ رقم جواہر اور فیض حسن کوتوال کو ایک شالی رومال عطا فرمایا۔" [2]

ظاہر ہے کہ یہ اعزاز فیض الحسن کو حسن خدمت کی بنا پر بخشا گیا اور دربار کے انعقاد (۱۸۴۵) سے قبل دہلی میں اپنی کارگزاریوں کا ثبوت پیش کر چکا ہوگا۔ قیاس ہے کہ غالب کی پہلی گرفتاری بھی اسی کوتوال کے ہاتھوں عمل میں آئی ہوگی اور وہ برسوں غالب کے درپے رہا ہوگا۔ عاصی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "غالب سے فیض الحسن خاں کوتوال دہلی کو ناحق عداوت پیدا ہو گئی۔" اس عداوت کا ذکر خود غالب کے مندرجہ بالا خط میں بھی ملتا ہے۔ لیکن مولانا آزاد اسے نظر انداز کرتے ہوئے گرفتاری کی تمام تر وجہ غالب کی قمار بازی کو قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ قمار بازی شہر کے دوسرے حصوں میں بھی ہوتی تھی اور بقول ان کے:

"شہر کی یہ رسم ٹھہر گئی تھی کہ رئیس زادوں کے دیوان خانے مستثنیٰ سمجھے جاتے تھے۔ گویا ان کی وہ نوعیت مان لی گئی تھی جو آج کل کے کلبوں میں برج کھیلنے کی ہے۔ انھیں از راہ تجاہل رئیسانہ تفریحوں میں تصور کیا جاتا تھا۔" [3]

ان حالات میں کوتوال کا فقط غالب کو نشانۂ عتاب بنانا، غالب سے ذاتی عداوت ہی کی بنا پر سمجھا جا سکتا ہے۔ اور عاصی کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

گرفتاری کے حالات

مولانا آزاد لکھتے ہیں:-

"ایک دن ایسے موقع پر کہ مجلس گرم اور روپیوں کی ڈھیریاں چنی ہوئی تھیں، کوتوال

---

[1] دہلی اردو اخبار، مورخہ ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء مخزونہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی۔ [2] حوالہ ماسبق، نوائے ادب اپریل ۱۹۵۸ء

[3] نقش آزاد، صفحہ ۲۸۱

چنانچہ اندر دروازہ پر دستک دی۔ اور لوگ تو پچھواڑے سے نکل بھاگے، صاحبِ مکان یعنی مرزا دھر لیے گئے۔"[1]

لیکن حالی نے گرفتاری کے جو حالات لکھے ہیں، وہ اس سے مختلف ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ گرفتاری کے وقت کوتوال صاحب دفعتہً بیٹھک میں موقع پر گئے اور ظاہر کیا کہ سواریاں زنانی آتی ہیں۔ اس طرح دھوکے سے اندر داخل ہو گئے۔ مولانا آزاد کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ "اور لوگ تو پچھواڑے سے نکل بھاگے صاحبِ مکان یعنی مرزا دھر لیے گئے۔" اس کے برعکس حالی لکھتے ہیں کہ "مرزا کے مکان کے قریب جو تھانہ تھا، اس قدر نزدیک تھا کہ باہر تک آواز آتی تھی۔ مگر ریمنڈ کے اندر بہت بھیڑ تھی اور کچھ بھاری پر قندا... پہنچ گئے۔" غرض غالب تنہا گرفتار نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کے ساتھ دوسرے قمار باز بھی دھر لیے گئے تھے۔ نواب اشرف الاخبار کی پیش کردہ خبر واقعہ میں بھی صاف الفاظ میں اس کا ذکر موجود ہے:

"جناب مرزا صاحب کو معہ چند اور قمار بازوں کے گرفتار کر کے کوتوالی میں لے آئے۔۔۔۔"

متنازعہ فیہ شعر

نظامی بدایونی نے شرح دیوانِ غالب میں لکھا ہے کہ قید خانے میں غالب کے کپڑوں میں جوئیں ہو گئی تھیں۔ ان کو چن رہے تھے کہ ایک امیر نے جا کر پرسشِ مزاج کی، غالب نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا:

جس دن سے کہ ہم خستہ گرفتارِ بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں[2]

اس شعر سے متعلق غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ یہ شعر غالب کا نہیں۔ اس سے قطع نظر شعر کی شانِ نزول قطعاً ناقابلِ قبول ہے۔۔۔۔۔ بے یاری اور درماندگی کی یہ حالت کیونکر قرینِ قیاس سمجھی جا سکتی ہے کہ غالب کے کپڑوں میں جوئیں ہو گئی تھیں اور ایک رئیس ملاقات کے لیے آیا تو وہ جوئیں نکال رہے تھے۔۔۔۔۔۔ لہٰذا جو صورت اس شعر میں پیش کی گئی ہے وہ بہر اعتبار مستبعد ہے۔"[3]

حالانکہ اس شعر میں جو صورت پیش کی گئی ہے۔ وہ حقیقت ہی پر مبنی ہے۔ بات دراصل غالب کی "بے یاری" اور "درماندگی" کی نہیں، جیل خانے کے کپڑوں کی ہے۔ غالب کو جیل خانے میں آتے ہی اپنا لباس اُتار کر جیل خانے کے کپڑے پہننے پڑے ہوں گے۔

---

[1] نقشِ آزاد، صفحہ ۲۸۲
[2] دیوانِ غالب مع شرحِ نظامی، طبع ششم، ص ۲۱۸
[3] مہر، غالب صفحہ ۱۸۴

اُس زمانے میں ہندوستانی جیل خانوں کے کپڑوں کی جو حالت ہوگی، بآسانی قیاس کی جا سکتی ہے۔ مختلف قیدیوں کے استعمال کی وجہ سے، جو ہیں اکثر غلیظ اور میلے کچیلے رہنے کے عادی ہوتے ہیں، ان کپڑوں میں جوئیں پڑ جاتی ہوں گی۔ مجبوراً وہی کپڑے غالب کو بھی پہننے پڑے ہوں گے۔ چنانچہ اپنے شعر میں غالب نے جو حالت بیان کی ہے، وہ ہرگز مستبعد نہیں اور مہر صاحب کا یہ خیال کہ "یہ شعر غالب کا نہیں" تحقیقی طور پر صحیح نہیں۔ حالی کے بیان سے بھی یہ شعر غالب ہی کا ثابت ہوتا ہے۔ انھوں نے بالتصریح لکھا ہے:

"ایک روز مسٹر راس صاحب سول سرجن دہلی قیدیان جیل خانہ کا ملاحظہ کرتے کرتے حضرت کے پاس تک پہنچ گئے اور حال دریافت کیا۔ آپ نے فی البدیہہ یہ فرمایا:

جس دن سے کہ ہم غمزدہ زنجیر بپا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

نظامی بدایونی کے ہاں اس شعر کا پہلا مصرع قدرے مختلف ہے۔ (یعنی "غمزدہ زنجیر بپا" کی جگہ "خستہ گرفتار بلا") لیکن نظامی کی روایت پر حالی کے بیان کو فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ ایک تو یہ قدیم تر ہے اور دوسرے یہ بیان غالب کی زندگی میں دہلی میں لکھا گیا۔

قبل از وقت رہائی

سید ناصر نذیر فراق دہلوی نے غالب کے مقدمے کے جو حالات بیان کئے ہیں، ان میں لکھا ہے کہ ان کی قبل از وقت رہائی لاٹ صاحب یا کسی اور بڑے افسر کے اختیاراتِ خاص کی وجہ سے ہوئی۔ اُن کے الفاظ ہیں: "مرزا صاحب کو قید میں پڑے چند روز ہوئے تھے جو ان کی خوش نصیبی سے لاٹ یا ان جیسا کوئی اور بڑا حاکم شاہجہان آباد میں آیا اور مرزا صاحب کے عزیزوں نے اُس سے جا کر مرزا صاحب کی بپتا کہی اور اس نے اپنے اختیار سے مرزا صاحب کو فوراً چھوڑ دیا۔"[1]

مگر غالب کا وہ بیان جو حالی نے نقل کیا ہے، اس کے برعکس ہے:

"سیشن جج، باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا۔ اس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا، مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی۔ تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آ گیا۔"[2]

غالب کے یہ الفاظ کہ "پھر معلوم نہیں، کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا" غور طلب ہیں۔ گویا خود غالب کو اپنی قبل از وقت رہائی کے اسباب کا صحیح علم نہ تھا۔ مجسٹریٹ کو "رحم" آنا بھی معنی خیز ہے۔ حالانکہ مجسٹریٹ کے رحم و کرم کو پوری طرح آزمایا جا چکا تھا۔ اور بادشاہ سے سفارش کروانے اور صدر میں اپیل کے باوجود قید کی سزا برقرار رہی تھی۔ ایسے حالات میں ملزم کی رہائی محض مجسٹریٹ کے رحم

[1] لال قلعہ کی ایک جھلک، صفحہ ۳۵

[2] یادگار غالب، صفحہ ۲۷

کی بنا پر عمل میں نہیں آ سکتی۔ مجسٹریٹ سے اگر احکام صادر کروانے کی درخواست کی ہوگی تو وہ جیسا کہ قانونی پیچیدگیوں کے نہ ہوگی۔ یہ دلیل کیا ہو سکتی ہے' اس سلسلے میں حالی کا بیان ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ حالی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب غالب نے مسٹر راس کے پوچھنے پر اپنی شکستہ حالت کا ذکر گستاخانہ اظہار کیا تو "اسی وقت ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کو چٹھی لکھ کر رہا کروا دیا۔" غرض مسٹر راس نے غالب کی رہائی کی سفارش کر کے اپنا فرض بطریق احسن انجام دیا۔ لیکن اس نیک نہاد شخص نے اپنا احسان جتانے کی کوئی کوشش نہیں کی' ورنہ غالب اپنی رہائی کو مجسٹریٹ کے رحم پر محمول نہ کرتے۔

واقعہ قید کے ایام میں غالب کی تندرستی خراب رہنے کا ذکر احسن الاخبار میں بھی ملتا ہے:

> "مرزا صاحب بوجہ سے علیل رہتے ہیں۔ سوائے پیہیری غذا طبیہ پانی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے...... اس قدر مشقت اور مصیبت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔"[2]

ان بیانات کے مدنظر غالب کی قبل از وقت رہائی کا مسئلہ پوری طرح حل ہو جاتا ہے یعنی گرفتاری کے وقت ان کی صحت اچھی نہ تھی۔ تقریباً نصف سزا کاٹ چکنے کے بعد ان کی تندرستی مزید خراب ہو گئی اور جب مسٹر راس سول سرجن نے ان کی ناگفتہ بہ حالت دیکھی تو وہ رہائی کی رپورٹ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ غرض غالب خرابی صحت کی وجہ سے قبل از وقت رہا کر دیے گئے اور اس میں مجسٹریٹ کے رحم و کرم کو مطلق کوئی دخل نہ تھا۔

---

[1] احسن الاخبار کے ایک پرچے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر راس جولائی ۱۸۴۷ء میں دہلی میں تھا۔ (نوائے ادب، اپریل ۱۹۵۰ء)

[2] دہلی کا آخری سانس، صفحہ ۱۷۴

آنکھوں کے مرثیے

محمد علم الدین سالک

انسانی کردار میں بعض اخلاقی خوبیوں کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ان میں استقلال اور تحمل اتنی نمایاں اہمیت رکھتی ہیں کہ ان کی بدولت انسان نڈر ہو کر بڑے سے بڑے خطرے میں کود پڑتا ہے۔ کسی بلند مقصد کے لیے جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ مصائب و آلام کی پروا نہیں کرتا، بڑی سے بڑی شکست کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کرتا ہے۔ اور تحمل کا سر رشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتا

تیمور اور اس کی اولاد اس لحاظ سے شاہانِ عالم کی صف میں بہت ممتاز ہے۔ موت سے کھیل جانا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ وصف ان میں آخری دم تک قائم رہا۔

تیموریوں کی زندگی کے اس روشن پہلو کے ساتھ ساتھ ایک اور وصف بھی نظر آتا ہے جس نے ان کی زندگی کو بڑا دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہ ان کی شعر و ادب سے وابستگی ہے۔ وہ بڑے ادب نواز تھے۔ شعراء کے مربی اور ادیبوں کے محسن ہونے کے علاوہ خود شعر کا صحیح ذوق اور ادب کا ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ یہ چیز انھیں میراث میں ملی تھی۔ گویا یہ ان کے گوشت پوست کا ایک حصہ تھا۔ وہ شعر کہتے، شعر سنتے اور شعر کا مزا لیتے مگر کیا مجال کہ ان کے شاہانہ مشاغل میں کسی قسم کا فرق آئے۔ ان کا ایک روزمرہ پروگرام تھا جس پر وہ بڑی سختی سے کاربند ہوتے تھے۔

ادب اور شعر دربار کی زندگی کے لیے ضروری تھے اس لیے بھی انھیں شعر سے لگاؤ پیدا کرنا لازمی تھا۔ بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک ہر بادشاہ دل کھول کر ادب نوازی کرتا، اچھے شعر کی داد دیتا، شعر کی خامیوں پر شعراء کو ٹوکتا اور وقت بے وقت خود بھی شعر کہتا۔ ان کی زندگی میں بعض نہایت خطرناک مواقع پیدا ہوئے جہاں انھیں جان سے کھیلنا پڑا مگر انھوں نے ایسے موقعوں پر بھی شعر و ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور زندگی کی ان تلخیوں کو شعر و ادب میں سمو کر ایسا گلدستہ تیار کیا جس سے شعر و ادب کی دنیا اب تک مہک رہی ہے۔

ہندوستان میں آلِ تیمور کا سلسلہ بابر سے شروع ہوتا اور بہادر شاہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ہر شہزادہ اور ہر بادشاہ اس خوبی سے آراستہ نظر آتا ہے۔ بابر دنیا کی عظیم المرتبت شخصیتوں میں سے ہے۔ پروفیسر لین پول کے قول کے مطابق "وہ اپنے زمانے میں مشرق و مغرب کی وہ شخصیت ہے جو بذاتِ خود سب سے زیادہ شائستہ، مہذب اور متمدن تھی۔ بلکہ اس کا دربار اور اس کی ذات ثقافت کا زبردست مرکز تھی اور اس کی بدولت ثقافت اور فنونِ لطیفہ کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔"

بابر دلیر اور جری سپاہی، تجربہ کار جرنیل اور اولوالعزم سردار تھا جس پر ادنیٰ سپاہی سے لے کر اعلیٰ سردار تک جان چھڑکتا اور اس کے ساتھ مرنا اور جینا فخر سمجھتا تھا۔ اس کی زندگی کا ایک ایک واقعہ اولوالعزمی، استقلال اور تحمل کا شاہکار ہے۔ اس کی زندگی کی یہ داستان بڑی دلکش

سچ یہ ہے اس کا ایک ایک واقعہ نہ صرف عبرت و بصیرت کا مرقع ہے بلکہ بڑا دلکش و ولولہ انگیز بھی ہے۔ اس نے ہوش سنبھالتے ہی جلاوطنی اور قید جیسی مصیبتوں سے سامنا کیا۔ آپ گرا، سنبھلا اور ایک متحرک شخصیت ثابت کیا۔ بڑے سے بڑے ہلاکت انگیز لمحات بھی اس نے خوش خوئی کا دامن نہ چھوڑا اور خوش مزاجی کو قائم رکھا۔ مایوسی اور یاس کا سایہ تک نہ پڑنے دیا۔ وہ عظیم الشان سلطنت کا مالک ہے تب بھی وہ انتہائی ہشاش بشاش ہے اور اگر وہ دشمنوں سے شکست کھا کر سر چھپانے کے لیے جگہ تلاش کرتا ہے۔ تب بھی اس کا چہرہ دلی مسرت کی غمازی کرتا ہے ۔۔ جہاں موقع ملتا ہے دوستوں کے ساتھ مل کر جشن مناتا، کسی چشمے کے پاس سبزہ زار پر بیٹھ کر شعر خوانی کرتا، موسیقی کی محفلیں سجاتا اور دوستوں سے خوش گپیاں کرتا۔ لطیف مزاح سے خود بھی لطف اندوز ہوتا اور دوسروں کو بھی اس روحانی خوشی میں شامل کرتا ہے۔ فرصت پاتے ہی ان واقعات کو بڑے چٹپٹے انداز میں قلمبند کر کے آنے والی نسلوں کے لیے ایک ایسا مرقع چھوڑ جاتا ہے جو آج بھی اتنا ہی دلچسپ اور دلکش ہے جتنا آج سے صدیوں پہلے تھا۔

کامران

بابر کی زندگی کا یہ پہلو علیحدہ تفصیل چاہتا ہے۔ ہم اس کی اولاد میں سے اس کے بیٹے کامران کی زندگی سے اسی قسم کا ایک پہلو پیش کرنے میں جس میں بابر کے کردار کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ کامران بابر کا دوسرا بیٹا اور ہمایوں کا چھوٹا بھائی تھا۔ بابر نے اپنی سرپرستی میں اسے تعلیم و تربیت دی۔ وہ بڑا زیرک، ہوشیار اور موزوں طبیعت کا مالک تھا۔ بدقسمتی سے اس نے اپنے ارادوں کی تکمیل کے لیے ہمایوں کے راستے میں طرح طرح کی مشکلات پیدا کیں۔ وہ ایک مدت تک ہمایوں کے خلاف برسر پیکار رہا حتیٰ کہ آخر وہ اپنے بھائی سے شکست کھا کر سلیم شاہ سوری کے ہاں چلا گیا۔ اسے امید تھی کہ اسلام شاہ ہمایوں کے خلاف اس کی مدد کرے گا اور وہ کابل کا علاقہ دوبارہ ہمایوں سے چھین لے گا مگر واقعات نے بہت جلد اس پر ثابت کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے۔ اسلام شاہ اس کی مدد کرنا تو درکنار اس کی زندگی کے درپے ہے چنانچہ وہ اس کے ہاں سے بھاگا اور آدم خاں گکھڑ کے ہاں پناہ گزیں ہوا۔

اب کامران نے گکھڑ سردار کو ہمایوں کے خلاف اکسایا مگر وہ اس پر آمادہ نہ ہوا۔ اس کے بعد اس نے ہمایوں کے خلاف لڑنے کے لیے اس سے مدد چاہی مگر اس کی یہ امید بھی بر نہ آئی۔ آدم خاں اسے طبلائف الحیل ٹالتا رہا۔ اور در پردہ وہ ہمایوں سے صلح صفائی کے بارے میں خط و کتابت کرتا رہا۔ چنانچہ دونوں کا آپس میں معاہدہ ہو گیا۔ کامران کو بھی اس کا علم ہوا۔ اس نے بھاگنے کا ارادہ کیا لیکن آدم خاں کے سپاہی اور دوسرے نوکر سائے کی طرح اس پر مسلط رہتے تھے۔ گویا وہ ان کی حراست میں تھا جہاں سے بھاگنا ناممکن تھا۔ ناچار اس نے ان کے ساتھ بسر اوقات کرنی شروع کی۔

ہمایوں سارے حالات سے باخبر تھا۔ وہ کامران کی طرف توجہ دینے سے پہلے کابل کا نظم و نسق درست کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد وہ ہندوستان کی مہم کے لیے تیار ہونا چاہتا تھا۔ جب وہ ان حالات سے عہدہ برآ ہو گیا اور مہم کے لیے تیاری کر لی تو اس نے لشکر کے قاضی اور قاضی چاند کو سلطان آدم گکھڑ کے پاس روانہ کیا کہ وہ مرزا کامران کو ان کے حوالے کر دے تاکہ وہ میرزا کامران کو سمجھا بجھا کر راہ راست پر لائیں مگر ان کی یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ اور میرزا کامران نے ہمایوں کی اطاعت قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

کامران کو چند سرداروں کی حراست میں ہمایوں کے کیمپ میں لایا گیا۔ ہمایوں کی دلی خواہش تھی کہ وہ کامران پر کسی قسم کی سختی نہ

کرے اور اگر میرزا اطاعت قبول کرے تو اسے ایک بہت بڑی جاگیر بخش دے۔ لیکن امیروں کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ بہت برافروختہ ہوئے۔ وہ وفد کی صورت میں ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے ہمایوں سے کہا کہ کامران نے بڑے بڑے جرم کیے ہیں اسے بڑی سے بڑی سزا ملنی چاہیے۔ وہ اس کا مستحق ہے۔ حق اور انصاف اسی بات کا تقاضا کرتا ہے۔ بادشاہ نے ان کی باتیں سنیں اور حقیقی طور پر انھیں ٹال دیا۔ وہ بار بار کامران کے بارے میں مراحم خسروانہ سے کام لیتا رہا۔ اس کی حرکات سے چشم پوشی کرتا رہا اور ہر موقع پہ لطف و کرم سے پیش آتا رہا۔ امرا نے جب یہ حالت دیکھی تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ انھوں نے سمجھا کہ اگر حالات ایسے ہی رہے تو دوبارہ فتنہ و فساد کا دروازہ کھل جائے گا۔ شور و شر پیدا ہوگا۔ جنگ و جدل کی آگ بھڑک اٹھے گی۔

اب وہ ایک عمرہ امارے کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض داشت پیش کرتے ہوئے کہا کہ رافت و عاطفت پادشاہی فطرت عالی اور عطوفت والا کا تقاضا یہی ہے کہ بڑے سے بڑے گناہوں کو معاف کر دیا جائے۔ مگر دور اندیشی اور عاقبت بینی کا تقاضا ہے کہ ستیزہ کار مردم آزار بد عہد اور قاتل کو اس کے اعمال کی سزا ضرور دی جائے تاکہ اس کی طبعی شر پسندی سے خلق خدا محفوظ رہے اور ان کی عافیت پر کسی قسم کی آفت نہ آئے۔ دور اندیشی اور دور رسی یہ ہے کہ ایک آدمی کی آسائش کو خلق خدا کی آسائش پر ترجیح نہ دی جائے۔ شکستہ دل اور آزردہ حال لوگوں کے اطمینان کے لیے ایک ظالم کو مٹا دینا ہی عدالت ہے۔ خاص کر جب ایسا کرنے سے ہزاروں کام خود بخود درجہ بہ اصلاح ہو جائیں گے۔ اس صورت حال میں رحم سے کام لینا عین بے انصافی ہوگی۔ میرزا کامران نے کیا کچھ نہیں کیا۔ اس نے بھائی چارے کو بالائے طاق رکھا۔ قدم قدم پر کفران نعمت کیا اور ہر موقع پر فتنہ و فساد برپا کیا۔ اس کے کردہ گناہوں کو اب ناکردہ خیال نہیں کیا جا سکتا۔ معاملہ اب رحم کی حد سے گزر چکا ہے۔ اس کو ملک عدم کا مسافر بنائیں تاکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہزار ہا قسم کی بلاؤں سے نجات پائے اور اس کا نامہ اعمال بھی زیادہ سیاہ نہ ہو۔ ایک مدت مدید گزر چکی ہے کہ اس شریر اور فتنہ سرشت کے اثر سے رعایا کا مال و اسباب غارت ہوا۔ جانیں تلف ہوئیں۔ عزت و ناموس لٹا۔ اس لیے اب وقت ہے کہ اس موذی کے ہاتھوں سے خلق کو نجات دلائی جائے۔

ہمایوں بڑا عالی فطرت تھا۔ اس نے بڑے تحمل سے ان سے امیروں کی معروضات سنیں۔ وہ ابھی اس معاملے میں کسی قسم کا اقدام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر ایسے بشر کو اللہ تعالیٰ نے باقی رکھا ہے تو کسی خاص غرض اور مصلحت کے لیے ہوگا۔ اس کے علاوہ اسے اپنے باپ کی وصیت اچھی طرح یاد تھی اس لیے وہ کامران کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ امرا نے یہ دیکھ کر پھر جرأت سے کام لیا اور کہا کہ اس سفاک اور بے باک کی وجہ سے طرح طرح کے فتنے پیدا ہوئے۔ ناحق خون ریزی ہوئی۔ ہمیں بڑے بڑے صدمے اٹھانے پڑے۔ چنانچہ امرا اور علما کی ایک جماعت نے اس بارے میں ایک محضر تیار کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے یہی محضر میرزا کامران کے پاس بھیج دیا۔ جب اس نے اسے مطالعہ کیا تو یہ لکھا کہ جن لوگوں نے میرے قتل پر فتویٰ دیا ہے انھیں لوگوں کی بدولت مجھے آج یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔

ہمایوں عجب کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ کافی غور و خوض کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ کامران کو ظاہری بصارت سے محروم کر دیا جائے۔ اس طرح ایک اٹھتا ہوا فتنہ دب گیا۔ امیروں کی تسلی ہو گئی۔ علما اس کامیابی پر بڑے نازاں تھے کہ اب فتنہ و فساد کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔

کامران کی بصارت زائل کرنے سے ہمایوں کی غرض و غایت یہ تھی کہ بادشاہت کے لیے اس کی ساری سرگرمیاں ختم ہو جائیں کیونکہ اندھا بادشاہ نہیں ہو سکتا اور اگر وہ کبھی تخت و تاج کا دعویٰ بھی کرے تو اسے عوام کی تائید حاصل نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام میں اکثر شہزادوں کو

ملنے کے واقعات بکثرت ملتے ہیں۔

اس فیصلے کا اعلان ہوا۔ بادشاہ نے پانچ آدمی اس کام کے لیے نامزد کیے۔ ان میں ایک جوہر آفتابچی بھی تھا۔ جوہر آفتابچی نے ہمایوں کے زمانہ حکومت کی یادداشتیں تذکرۃ الواقعات کی صورت میں مرتب کی ہیں۔ چونکہ وہ اس مہم میں خود بھی شریک تھا۔ اس واسطے اس نے یہ واقعہ زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ہم اسی سے کر اس واقعہ کو یہاں درج کرتے ہیں۔

رمضان ۹۶۰ھ کا واقعہ ہے۔ عصر کی نماز کا وقت تھا جو ہم کامران کے خیمے میں آیا۔ میرزا کامران نے اس سے غسل طلب کیا۔ جوہر نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ میرزا نے اسی غسل پر مغرب کی نماز بھی پڑھی، نماز سے فارغ ہو کر اس نے جوہر سے پوچھا۔ تمہارا نام کیا ہے۔ تم کتنے عرصے سے بادشاہ کی خدمت میں ہو؟ اس نے جواب دیا۔ میرا نام جوہر ہے اور میں انیس برس سے بادشاہ کا نوکر ہوں۔ کامران نے کہا تم تو پرانے نوکر ہو۔ کبھی تم نے مرزا عسکری کی نوکری بھی کی ہے؟ جوہر نے نفی میں جواب دیا۔ اس کے بعد میرزا نے کہا کہ مجھ سے رمضان کے چھ روزے قضا ہو گئے ہیں۔ کیا تو میرے عوض روزے رکھے گا؟ جوہر نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا کہ آپ کو خود قضا روزے رکھنے کا بہت وقت مل جائے گا۔ آپ ایسی بے دلی کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ دل کو مضبوط رکھیں، حوصلہ نہ ہاریں۔ پھر کامران نے پوچھا۔ کیا تم جانتے ہو کہ میری گردن ماریں گے؟ جوہر نے جواب دیا:

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

البتہ میں اپنی عقل سے یہ جانتا ہوں کہ کوئی شخص اپنے بازو کو اپنے ہاتھ سے نہیں توڑتا۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں ہمایوں بادشاہ بڑا بامروت ہے۔

یہ رات اسی قسم کی باتوں میں بسر ہو گئی۔ دوسرے دن بادشاہ نے حکم دیا کہ میرزا کی آنکھوں میں نشتر لگایا جائے۔ جب نوکروں کے پاس یہ حکم پہنچا تو سوال پیدا ہوا کہ یہ دردناک خدمت کون انجام دے۔ کوئی بھی یہ کام کرنے کے لیے آمادہ نہ تھا۔ سلطان علی بخشی نے علی دوست ایشک آغاسی سے کہا کہ تو نشتر لگا۔ علی دوست نے اسے جواب دیا کہ تیری احتیاط کی حالت تو یہ ہے کہ تو اگر کسی کو ایک شاہرخی دے سکتا، بھی دیتا ہے تو پہلے بادشاہ سے پوچھ لیتا ہے۔ میں تیرے کہنے سے یہ کام کیوں کروں، بادشاہ نے اگر پوچھا کہ تم نے میرے بھائی کو کس کے حکم سے اندھا کیا تو میں اسے کیا جواب دوں گا۔ سلطان علی بخشی نے بھی جوہر سے کہا کہ یہ کام مجھ سے نہ ہوگا۔

جوہر نے یہ دیکھ کر کہا۔ آؤ۔ بادشاہ کے پاس چلیں اس سے پوچھ آئیں۔ چنانچہ جوہر، علی دوست، سلطان علی بخشی، غلام علی شش انگشت بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علی دوست نے ترکی میں کہا۔ کوئی آدمی نشتر لگانا نہیں چاہتا۔ بادشاہ بہت برافروختہ ہوا۔ اسے ترکی میں جواب دیا۔ اگر کوئی اور یہ کام نہیں کرتا تو تجھے کیا ہوا ہے۔ تو خود کیوں نہیں کرتا۔

بادشاہ کا یہ حکم سن کر علی دوست میرزا کامران کے پاس آیا اور معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔ اگر میں یہ بات اپنی طرف سے بنا کر کہوں تو اللہ تعالیٰ میری زبان گدی سے کھینچ لے۔ یہ بادشاہ کا حکم ہے ہم مجبور ہیں کہ اسے مانیں اور تمہاری آنکھوں میں نشتر لگائیں۔

میرزا کامران نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ مجھے مار ہی کیوں نہیں ڈالتے۔ علی دوست نے کہا کہ بادشاہ کے حکم کے بغیر آپ کو کون مار سکتا ہے۔ اس کے بعد میرزا کامران بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ نشتر لگوانے کے لیے تیار ہوا۔ اس کی چال میں بڑا وقار تھا۔ اس کی نقل و حرکت میں طمانیت پائی جاتی تھی، وہ خیمے کے باہر آیا۔ علی دوست کے ہاتھ میں رومال تھا۔ اس نے اس کا گیند بنایا۔ میرزا زمین پر لیٹ گیا۔ گیند اس کے گلے میں ٹھونس دیا گیا۔ چار آدمیوں نے میرزا کے بازو اور ٹانگیں سنبھالیں اور آدمیوں نے آنکھوں میں نشتر لگانا شروع کیا۔ اس کی آنکھ

میں کم و بیش پچاس نشتر لگائے گئے۔ مرزا نے اس تکلیف کو بڑے تحمل سے برداشت کیا۔ اس کی زبان سے اُف تک نہ نکلی۔ البتہ جو شخص جراحی کے لیے مقرر ہوا تھا اس نے جب اس کے گھٹنے کو زور زور سے دبایا تو مرزا نے فقط اتنا کہا: میں یہ جانتا ہوں کہ جو کچھ تمھارا کام ہو رہا ہے، ہو جائے گا۔ تم بے چین ہو رہے ہو، پھر ایک مجبور انسان پر یہ دباؤ اور تشدد کیوں؟ اس سارے عرصے میں اس نے اس بات کے سوا کوئی لفظ زبان سے نہ نکالا۔ مگر جب اس کی آنکھوں میں لیموں نچوڑ کر نمک چھڑکا گیا تو وہ شدت درد سے تڑپ اٹھا اور بے اختیار ہو کر بولا:

"یا الٰہی۔ یا الٰہی۔ میں نے اس دنیا میں جتنے بُرے کام کئے تھے۔ ان کا خمیازہ میں نے
اسی دنیا میں بھگت لیا ہے۔ اب عاقبت میں مجھ پر رحم کرنا۔"

متاخرین میں سے بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ اس موقع پر کامران نے ایک شعر بھی کہا جس کے لفظ «میلتہ» سے اس کے اندھا ہونے کی تاریخ سنہ ۹۶۰ھ نکلتی ہے۔ یہ شعر تو ملا نہیں مگر البتہ ایک اور شاعر نے اس واقعہ کی تاریخ «چشم پوشید ز بیداد سپہر» سے نکالی ہے۔

جب یہ سب کچھ ہو چکا تو مرزا کو گھوڑے پر سوار کیا گیا۔ وہ شاہی لشکر کے عقب میں روانہ ہوا۔ تھوڑی دور جا کر لشکر نے پڑاؤ کیا۔ میرزا کامران کے لیے جو جگہ مقرر کی گئی تھی وہ ذرا زیادہ گرم تھی۔ چنانچہ وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور لشکرگاہ کی طرف روانہ ہوا۔ اسے میرزا قاسم کے خیمے میں اتار دیا گیا۔ اس وقت کامران بہت بے چین تھا۔ ہوا بھی گرم تھی اور ویسے بھی مرزا کے زخم تازہ تھے۔ جوہر میرزا کی بے کلی نہ دیکھ سکا۔ وہ اپنے ڈیرے پر آیا اور وہاں مغموم ہو کر بیٹھ گیا۔ بادشاہ کی نظر اس پر پڑی۔ اس سے سارا ماجرا دریافت کیا جسے سن کر ہمایوں پر رقت طاری ہو گئی۔

میرزا کامران نے اسی روز منعم خاں کے پاس آدمی بھیجا کہ وہ کسی طرح بیگ ملوک کو اس کی خدمت کے لیے بھیج دے۔ یہ خوش خلق میرزا کامران کا خاص آدمی تھا اور اس پر میرزا کی خاص توجہ تھی۔ جب وہ آیا تو میرزا نے بیگ ملوک کا ہاتھ اپنی اندھی آنکھوں پر رکھ کر کہا ؎

ہر چند کہ چشم بر رخت پردہ کشیدہ است
بیناست چشمے کہ بہ روئے تو دیدہ است

(گو میری ظاہری آنکھیں جاتی رہی ہیں مگر اہلِ بصیرت کی وہ آنکھ باقی ہے جس نے بارہا تیرا چہرہ دیکھا ہے)

دریائے اٹک کے کنارے تک کامران بادشاہ کے ساتھ رہا اور جب وہ وہاں سے کابل کے لیے واپس ہوا تو میرزا نے منعم خاں کو بلا کر کہا: تم جانتے ہو کہ میں کابل میں کس شان و شوکت کے ساتھ رہا ہوں۔ میں نے وہاں بادشاہی کی ہے اور وہاں کے لوگوں کو میرا جاہ و جلال یاد ہے۔ اب میں کن آنکھوں کو لے کر وہاں جاؤں اور وہاں کے لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں۔ مجھے مکہ مکرمہ جانے کی اجازت دلوا دو۔

منعم خاں نے ہمایوں سے سارا ماجرا بیان کیا اور میرزا کامران کی درخواست دہرائی۔ ہمایوں اپنے بھائی کی حالت سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ آنکھوں کی بینائی سے محروم ہے۔ حجاز میں اس کا گزر کیسے ہوگا۔ اس لیے وہ اجازت دینے میں متامل تھا۔ وہ دن بھر اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ آخر امیروں کی سفارش پر اس نے میرزا کو اجازت دے دی۔

کامران نے بادشاہ کا شکریہ ادا کیا اور اس سے ملنے کی درخواست کی۔ ہمایوں اس سے ملنے سے گھبراتا تھا۔ آخر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ خود میرزا کے پاس آئے گا بشرطیکہ وہ اس ملاقات کے موقع پر جزع فزع نہ کرے۔ میرزا نے یہ شرط مان لی۔ ہمایوں اسے ملنے کے لیے اس کے خیمے میں آیا۔ میرزا مراسم تعظیم و تکریم بجا لایا اور یہ شعر پڑھے ؎

ز قدر و شوکت سلطان نگشت چیزی کم
ز التفات بہ مہمان سرائے دہقانی
کلاہ گوشۂ دہقان بہ آفتاب رسید
کہ سایہ بر سرش انداخت چو تو سلطانی

ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد میرزا نے پھر عرض کیا ؎

بر جانم از تو ہر چہ رسد جائے منت است　　گر ناوک جفاست و گر خنجر ستم

یہ اشعار کچھ ایسے وقت پڑھے گئے تھے کہ تمام حاضرین کے دل بھر آئے۔ وہ میرزا کے چہرے کو دیکھتے ہی رہ گئے۔ آخر جب اسے سکون حاصل ہوا تو اس نے اتنا کہا۔ میں اگرچہ بہت خوشی سے یہ کام نہیں کیا مگر بہت شرمندہ ہوں کاش مجھ سے پہلے تم میرا یہ حال کرتے۔

میرزا کامران نے جواب تک نہ دیا۔ مستقل خاموشی کی نیاز مندی سے بولا۔ یہ لوگ کون کون آدمی ہیں؟ سب حاضرین نے نام بتائے۔ اس نے کہا۔ دوستو! تم سب گواہ رہو اگر میں اپنے آپ کو بے گناہ خیال کرتا تو اس وقت جب کہ جہاں پناہ یہاں تشریف فرما ہیں۔ پھر وہ اس بات کا اعلان کرتا ہوں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں ہلاک ہونے کے قابل تھا مگر بادشاہ نے میری جان بخشی کی اور اس کے سبب حجاز مقدس جانے کی اجازت بھی دی۔ اس احسان کے شکریے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ اس نے میری بدی اور بدعہدی پر قلم عفو پھیر دیا۔

اس کے بعد کامران نے اپنے بیٹے اور بیویوں کی سفارش کی۔ بادشاہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ وہ میرے اپنے بچے ہیں میں ان کے ساتھ ہمیشہ نیک سلوک کروں گا۔

اس کے بعد میرزا کو رخصت کیا اور اس کے نوکروں میں سے جو اس کے ساتھ جانا چاہتے تھے انھیں بھی اجازت دی مگر خود غرض دنیا میں جنس وفا نایاب ہے۔ اس کے بیشتر ساتھیوں اور نوکروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ البتہ اس کی بیوی ماہ چوچک نے آخر دم تک اس کا پورا پورا ساتھ دیا۔ اسے روکنے کی کوشش کی گئی مگر وہ اپنے ارادے پر قائم رہی۔ اور جب وہ جہاز پر سوار ہوئی تو اس کا باپ حسین ارغون اسے روکنے کے لیے وہاں پہنچا مگر وفا پرست ماہ چوچک نے باپ کو جواب دیا کہ تم نے مجھے خاوند کے سپرد اس وقت کیا جب وہ بادشاہ تھا۔ اب تم مجھے اس سے اس لیے جدا کرنا چاہتے ہو کہ وہ تباہ حال اور شکستہ دل ہے۔ ادبار اور نکبت کی گھٹائیں اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ پہلے شاید اسے میری ضرورت نہ ہو۔ لیکن اب اسے قدم قدم پر میری ضرورت ہے۔ اس حالت میں میں اس کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ باپ اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ اس کی شوہر پرستی اور وفا کی بڑی تعریف کی اور اسے رخصت کیا۔

کامران تین حج کرنے کے بعد ۱۱۔ ذی الحجہ ۹۶۴ھ کو فوت ہوا۔ ملا قاسم کاہی نے تاریخ وفات کے متعلق مندرجہ ذیل قطعہ کہا ؎

کامران آں کہ بادشاہی را　　کس نہ بود است ہمچو او در خورد
شد ز کابل بہ مکہ و آنجا　　جاں بحق داد و تن بخاک سپرد
گفت تاریخ او چنیں کاہی
بادشاہ کامران بہ مکہ بمرد

وثیقی نامی شاعر نے بھی کامران کی تاریخ وفات کہی ہے ؎

شدہ کامران خسرو نامدار ‌ ‌ ‌ ‌ کہ از سلطنت سر بہ کیواں رساند
مجاور شد اندر حرم چار سال ‌ ‌ ‌ ‌ بکلی و از قید عالم رہاند
ز بعد وقوف بیچ چپ زمین ‌ ‌ ‌ ‌ باحرام حج جاں بجاناں نشاند
چو در خواب وحشی در آمد شبے ‌ ‌ ‌ ‌ حکایت بمژدہ وصئے خویش خواند
بگفت او بہ پرسندہ از فوت ما
بگو شاہ مرحوم در مکہ ماند
۹۶۴ھ

(بدایونی ص ۱۲۳)

ابوالقاسم شوکتی

کامران کا بیٹا ابوالقاسم شوکتی بھی شاعر، ادیب اور استقلال کا پیکر تھا۔ اکبر نے جب آگرہ خیل کے نرغے میں پھنس کر بیرم خاں کے ہاتھ سے اقتدار چھیننے چاہے اور آگرہ سے دہلی کی جانب روانہ ہوا تو ماہم انگہ نے اس خوف سے کہ کہیں بیرم خاں اسے اکبر کے خلاف تخت پر نہ بٹھا دے۔ ابوالقاسم کو گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا اور ۹۷۲ھ میں جب خان زمان علی قلی خاں سیستانی اور اس کے بھائی بہادر خاں سیستانی نے جون پور میں علم بغاوت بلند کیا اور اس کے اگلے ہی سال اکبر کے سوتیلے بھائی میرزا حکیم نے بھی سرکشی شروع کی تو اکبر کو ابوالقاسم کی طرف سے پھر خطرہ پیدا ہوا۔ اس نے امیروں کے مشورہ سے اس خار کو ہمیشہ کے لیے راستہ سے دور کرنے کا حکم دیا۔ امیر کے کچھ ایسے راجپوتوں ہی سے خالباً راجہ جگناتھ نے گوالیار جا کر اسے ٹھکانے لگایا۔ جب جلاد اس کا سر قلم کرنے لگا تو اس نے فی البدیہہ یہ شعر کہا ؎

فلک بہ کشتن من ایں قدر شتاب مکن
چو خواہم از ستمت مُرد اضطراب مکن

ایک خانہ زاد شاعر نے اس کی بڑی عجیب غریب تاریخ کہی ہے۔

نہال بوستان کامرانی ‌ ‌ ‌ ‌ فتاد از صرصر غم ناگہانی
ابوالقاسم کہ گشت از کشتن او ‌ ‌ ‌ ‌ بسان غنچہ خون جان جہانی
رقم زد وحشی تاریخ قتلش ‌ ‌ ‌ ‌ نماند از کامراں نام و نشانی
۹۷۲ھ

ایک اور شاعر نے اس کی تاریخ یوں کہی ہے ؎

خسرو گلرخاں ابوالقاسم ‌ ‌ ‌ ‌ آنکہ مہ از رخش منور شد
رفت و از رفتنش دل خلقاں ‌ ‌ ‌ ‌ پارہ پارہ چو ذرہ احمر شد
سال تاریخش از خرد جستم ‌ ‌ ‌ ‌ خردم سوئے باغ رہبر شد
بلبل ناگہاں بافغاں گفت
آہ کہ آں مہ شہید اکبر شد

شہریار

جہانگیر کے آخری ایام حکومت تھے۔ اس کی صحت روز بروز خراب ہو رہی تھی۔ جانشینی کے لیے کوئی خاص نامزد مقرر نہ تھا اس لیے سلطنت کے خیر خواہوں کو تشویش لاحق تھی۔ جہانگیر کا سب سے بڑا بیٹا خسرو مر چکا تھا۔ پرویز بھی اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ میدان میں دو امیدوار موجود تھے۔ شاہ جہان اور شہریار ——— شہریار اہل دربار میں چنداں ہر دلعزیز نہ تھا مگر نور جہاں کی بیٹی لاڈلی بیگم جو شیر افگن سے تھی اس سے بیاہی ہوئی تھی۔ اس لیے نور جہاں کی دلی خواہش تھی کہ ہندوستان کا تاج اس کے سر پر رکھا جائے۔ شاہ جہان آصف خان کی لڑکی ارجمند بانو سے بیاہا ہوا تھا اور اپنے اندر وہ تمام صلاحیتیں رکھتا تھا جو ایک اچھے بادشاہ میں ہونی چاہئیں۔ وہ مدبر، جفاکش، رعیت نواز اور عادت سے بادشاہ ہونے کے علاوہ ایک اچھا سپاہی اور بڑے اونچے درجے کا سپہ سالار بھی تھا۔ وہ درباریوں میں ہر دلعزیز تھا۔ نور جہاں نے ہر چند کوشش کی کہ وہ اہل دربار اور رعایا کی نظروں سے گر جائے مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ نور جہاں کی دراز دستیوں سے تنگ آ کر بغاوت پر آمادہ ہوا اور کھلے بندوں شاہی افواج سے لڑتا رہا۔ بعض امیروں نے بادشاہ کے حکم سے اس کا مقابلہ بھی کیا مگر شاہجہان سے جو عقیدت انھیں تھی وہ بدستور قائم رہی۔ اس میں کسی قسم کا فرق نہ آیا۔ وہ اب بھی رعایا اور دربار کی آنکھوں کا تارا بنا رہا۔

شہریار نہ تو رعایا میں ہر دلعزیز تھا نہ درباری طبقہ اسے پسند کرتا تھا۔ وہ ناشدنی کے لقب سے مشہور تھا اور بعض اوقات ایسی حرکتیں بھی کر جاتا تھا جو شاہی وقار کے منافی ہوتی تھیں۔ امرا کا ایک طبقہ محض نور جہاں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کی وفاداری کا زبانی زبانی دم بھرتا تھا۔

۱۰۳۶ھ کی بہار کا موسم تھا کہ جہانگیر عازم کشمیر ہوا۔ اس کے ساتھ نور جہاں، آصف خان، شہریار اور مرحوم شہزادہ خسرو کا بیٹا داور بخش عرف میرزا بلاقی بھی تھا۔ شاہجہان دکن میں تھا۔ جہانگیر کھوئی ہوئی صحت کی تلاش میں کشمیر پہنچا مگر جنت ارضی کی آب و ہوا اس کی صحت کی بحالی میں کسی طرح بھی مفید ثابت نہ ہوئی۔ وہ دمہ کا مریض تھا۔ مرض نے یہاں پہنچ کر شدت اختیار کر لی۔ نقاہت بڑھتی گئی۔ جسمانی کمزوری نے ڈیرے ڈال دیئے۔ بھوک ختم ہو گئی اور خیر خواہان سلطنت کو بادشاہ کا انجام سامنے نظر آنے لگا۔ اب بادشاہ گھوڑے کی بجائے پالکی میں سوار ہو کر باہر نکلتا۔

انہی ایام میں شہریار پر داء الثعلب کا شدید حملہ ہوا۔ اس کے سر، داڑھی، مونچھوں، بھوؤں اور پلکوں کے بال گر گئے۔ اطبا نے اس کا علاج بڑی احتیاط سے کیا مگر اسے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ آخر انھوں نے مشورہ دیا کہ وہ کشمیر جیسے سرد مقام کو چھوڑ کر میدانی علاقے میں چلا جائے چنانچہ وہ لاہور چلا آیا۔

شہریار کے کشمیر سے چلے آنے کے کچھ عرصہ بعد بادشاہ بھی لاہور کے ارادے سے چل کھڑا ہوا۔ جب وہ بہرام گلہ کے مقام پر پہنچا تو اسے شکار کی سوجھی۔ یہ اس کی پرانی شکارگاہ تھی اور وہ کشمیر سے آتے جاتے یہاں شکار کھیلا کرتا تھا۔ یہاں ایک حادثہ کی بنا پر اس کی صحت اور بھی بگڑ گئی۔ اس نے اس مقام کو خیر باد کہا اور دوسرے دن تھنہ پہنچا۔ یہاں سے چل کر وہ راجوری آیا جہاں سے وہ چنگس میں خیمہ زن ہوا۔ یہاں اس کی حالت بے حد نازک ہو گئی۔ رات بڑی بے قراری سے گزری۔ ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ مطابق ۲۸ اکتوبر ۱۶۲۷ء کو اس نے اپنی جان

جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

بادشاہ کی وفات نے ایک دفعہ پھر جانشینی کے جھگڑے کو تازہ کر دیا۔ اب ہر جانب سے کوشش شروع ہوئی۔ نورجہاں نے شہریار کو طلب کیا۔ انھیں اس حادثے کی اطلاع دی۔ مگر آصف خاں نے اندر ہی اندر کچھ ایسی چال چلی کہ بہت کم بااثر امیر نورجہاں تک پہنچے۔ اس نے اس کے ساتھ یہ کوشش بھی کی کہ نورجہاں کی حیثیت ایک نظربندی سی ہو کر رہ گئی۔ آصف خاں نے اپنے ایک وفادار ہرکارے بنارسی نامی کو اپنی انگوٹھی دے کر شاہجہاں کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ فوراً آگرہ پہنچ کر ہندوستان کے تخت پر قبضہ کرے۔ درمیانی وقفے کے لیے اس نے خسرو کے بیٹے داور بخش کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

داور بخش کو یقین نہ آتا تھا کہ آصف خاں شاہجہاں کو چھوڑ کر اس کا ساتھ دے گا۔ مگر جہاں دیدہ آصف خاں نے اسے اس طرح سبز باغ دکھائے اور قسمیں کھا کھا کر اپنی وفا کا یقین دلایا کہ داور بخش قربانی کا بکرا بننے پر راضی ہو گیا۔ ارادت خاں نے بھی آصف خاں کے ساتھ مل کر نئے شہنشاہ کو مبارک باد دی۔ چنانچہ جمعہ کے دن اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اس طرح داور بخش پورے طور پر آصف خاں کے پنجہ میں آگیا۔

شاہجہاں کے چاروں بیٹے نورجہاں کی حراست میں تھے۔ کیونکہ جب شاہجہاں اور جہانگیر کے درمیان صلح صفائی ہوئی تھی تو اسے اپنی وفا کا یقین دلانے کے لیے اپنے چاروں بیٹے یرغمال کے طور پر بادشاہ کے پاس چھوڑنے پڑے تھے۔ آصف خاں جانتا تھا کہ اگر یہ شہزادے اسی طرح نورجہاں کے پاس رہے تو وہ انھیں کسی وقت ختم کر سکتی ہے۔ اس لیے انھیں اس کے پنجے سے نکالنا بڑا ضروری ہے۔ چنانچہ امرا کو توڑنے کے ساتھ ساتھ اس نے چاروں شہزادوں کو نورجہاں کے پنجے سے چھڑا لیا۔

یہ سب کچھ ایک ہی دن میں ہوا۔ ان حالات سے نپٹنے کے بعد دوسرے دن آصف خاں بھمبر پہنچا۔ جہاں بادشاہ کی تجہیز و تکفین کی رسوم ادا ہوئیں۔ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ نعش تابوت میں رکھ کر لاہور روانہ کی گئی تاکہ اسے باغ دلکشا میں دفن کیا جائے۔ یہ باغ نورجہاں کا تھا۔ بادشاہ کی خواہش تھی کہ اسے وہاں دفن کیا جائے چنانچہ اس کی یہ خواہش پوری کی گئی۔

شہریار لاہور میں تھا۔ نورجہاں نے کسی نہ کسی طرح اسے سب واقعات کی اطلاع پہنچائی۔ حالانکہ آصف خاں نے یہ بندوبست کر رکھا تھا کہ نورجہاں کا تعلق بیرونی دنیا سے ٹوٹ جائے تاکہ جو کچھ یہاں ہو رہا ہے۔ اس سے شہریار اور اس کے ساتھی بالکل بے خبر رہیں اور وہ چپ چاپ لاہور پر قبضہ کرلے۔ مگر نورجہاں نے اس معاملے میں اسے شکست دی۔ اس نے نہ صرف شہریار کو ساری اطلاعات بہم پہنچائیں بلکہ اسے حکم دیا کہ وہ جس قدر فوج اکٹھی کر سکے کرے۔ فوراً راوی پار کر کے اس تک پہنچے۔ شاہی فوج کم ہے وہ بڑی آسانی سے اس پر قابو پا سکتا ہے۔

شہریار اس پیغام سے گھبرا سا گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مگر لاڈلی بیگم نے اس کی ڈھارس بندھائی اور اسے جرأت دلا کر مجبور کیا کہ وہ اپنی بادشاہت کا اعلان کرے۔ اس نے شاہی خزانہ اور قلعہ لاہور پر قبضہ کیا۔ اور ایک ہفتہ کے اندر اندر ستر لاکھ روپیہ سپاہیوں اور سرداروں میں بانٹ دیا۔ اس طرح اپنے گرد بہت بڑی فوج جمع کر لی۔ دولت کی اس بے پناہ بارش نے شاہی خاندان کے بعض افراد کو بھی شہریار کے جھنڈے تلے لا کھڑا کیا۔ ان میں شہزادہ دانیال کا بیٹا بایسنغر بھی تھا۔

شہریار اپنا لاؤ لشکر لے کر لاہور سے باہر نکلا۔ دریائے راوی عبور کیا اور مورچے سنبھال لیے۔ اس وقت اس کے ساتھ دو تین

[illegible] میں سے نفر [illegible] کے سپرد کی گرد اُسکے بعد کرامت خان [illegible] تھا کو اس کے
آصف خان کو ایک [illegible] کی خبر ملی تھی۔ [illegible] شہنشاہ کو [illegible] لاہور کی جانب [illegible]
[illegible] جہاں اس کی فوج سے ایک دن کے فاصلے پر پہنچ رہے
[illegible] کے ساتھ [illegible] آصف خان کے ایک [illegible] تک پہنچا [illegible]
کو [illegible] میں قلعہ بند ہو گیا۔ آصف خان نے قلعہ کا محاصرہ کیا ——— [illegible]
[illegible] ایک [illegible] میں حالات بگڑ گئے۔

آصف خان لاہور میں داخل ہوا شہریار اپنے ساتھیوں کی بے وفائی سے اتنا سراسیمہ اور پریشان ہوا کہ محل سے بھاگنے کی بجائے زنان خانہ میں جا چھپا جہاں سے اسے گرفتار کر لیا گیا اور چند دن کے بعد اس کی آنکھیں نکال دی گئیں۔ سبحان رائے بھنڈاری کا بیان ہے کہ جب اس کی آنکھوں کی پتلیاں کاڑھی جا رہی تھیں اور وہ درد سے تڑپ رہا تھا۔ اس نے اپنے اندھا ہونے کی تاریخ یوں نظم کی ہے

ز نرگس گلاب بہار چون کشید	کشیدند از نرگس من گلاب
اگر از تو پرسند تاریخ من	بگو کور شد دیدۂ آفتاب

۱۰۳۷ھ

استقلال کی یہ عظیم الشان مثال ہے۔ شہریار کو مورخ ناشدنی کہتے ہیں یعنی وہ نالائق اور نکما تھا مگر جب اس پر مصیبت پڑی تو اس نے اپنے حواس کو اوسان کو قائم رکھا اور خندہ پیشانی سے اس کا مقابلہ کرتے ہوئے اس واقعہ کو منظوم کر کے ہمیشہ کے لیے جریدۂ روزگار پر ثبت کر دیا ہے اس قسم کی مصیبتوں سے انسانیت نکھرتی ہے اور دوسروں کے لیے عبرت اندوزی کا سرمایہ بن جاتی ہے۔

شاہ عالم ثانی

خاندان تیموریہ میں آنکھیں نکالنے اور اس مصیبت کے وقت استقلال اور تحمل کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوڑنے کی چوتھی زبردست مثال شاہ عالم کی ہے۔

شہزادہ عالی گہر جو بعد میں شاہ عالم کے لقب سے تیموری شوکت و جلال کے مزار کا مجاور رہا۔ تاریخ ہندوستان میں کچھ بھی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کی بادشاہت کے بارے میں کسی ظریف کا مقولہ ہے کہ "بادشاہی شاہ عالم از دلی تا پالم"۔ وہ رحم دل، متحمل مزاج اور صاحب مروت تھا۔ مصیبت کے وقت خاص طور پر استقلال کا مظاہرہ کرتا۔ مگر جواں مردی اور شجاعت سے عاری تھا۔ جن کی ان حالات میں ضرورت تھی۔ رحم اور مروت کی یہ حالت تھی کہ کوئی شخص خواہ کتنی ہی بے وفائی اور دغا کا اظہار کرتا۔ جب وہ اس کے سامنے آتا تو اس کی آنکھیں خود بخود جھک جاتیں اور وہ اس کے تمام گناہوں پر خط تنسیخ کھینچ دیتا۔ اس کے بعد وہ اس کے بارے میں سب کچھ بھول جاتا۔ جس کی وجہ سے سلطنت کا نظم و نسق بگڑتا ہی چلا گیا۔ شاہ عالم بڑا شاکر و صابر تھا۔ ہر حال میں [illegible] رہتا۔ مصائب و آلام کے طوفانوں میں وہ کبھی حوصلہ نہ ہارتا۔ ہمیشہ ہمت بلند رکھتا۔

شاہ عالم اپنے باپ عالمگیر ثانی کے قتل کے بعد ہندوستان کے تخت پر بیٹھا۔ وہ دلی سے دور بہار میں قسمت آزمائی کر رہا تھا۔ جہاں اس کی بادشاہت کا اعلان ہوا۔ آخر بکسر کی جنگ کے بعد اس کا مستقل قیام الہ آباد میں ہو گیا۔ وہ شجاع الدولہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی دونوں کے درمیان

گھرا ہوا تھا۔ وہ اسے جس طرح چاہتے استعمال کرتے۔ دہلی میں نجیب الدولہ امیر الامرا اور شہزادہ جواں بخت بادشاہ کے نائب تھے۔ نجیب الدولہ نے سلطنت کی گرتی ہوئی عمارت کو سہارا دینے کی کوشش کی مگر حالات ایسے بگڑ چکے تھے کہ ان کا سنبھلنا ناممکن تھا۔ مرہٹے پانی پت کی تیسری لڑائی کے بعد شمال کا رُخ کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ روہیلے، گوجر اور سکھ گرد و نواح میں لوٹ کھسوٹ مچا رہے تھے۔ شجاع الدولہ اپنی سلطنت کی وسعت میں ہمہ تن مصروف تھا۔ اس کا لقب نواب وزیر تھا۔ مگر اسے دہلی سے کسی قسم کا کوئی لگاؤ نہ تھا۔ وہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ دہلی کی سلطنت مٹ جائے پھر وہ صوبہ اودھ کو ایک سلطنت کی صورت دے کر رہے گا۔

ان حوصلہ شکن حالات میں نجیب الدولہ نے آٹھ برس تک بڑی بیدار مغزی، دلیری اور شجاعت سے شمالی ہندوستان میں امن و امان قائم رکھا۔ اس کی زندگی ہی میں مرہٹوں نے اپنے آپ کو درست کر لیا۔ اور ایک مرتبہ پھر وہ ہندوستان گیری کا خواب دیکھنے لگے۔ دکن کی تاخت و تاراج کے بعد انھوں نے شمالی ہندوستان کا رخ کیا۔ نجیب الدولہ نے یہ دیکھ کر کہ دہلی کے حالات خراب ہیں، مسلمان امیر اور دربار کے بڑے بڑے سردار خود غرضی کا شکار ہو کر ایک دوسرے کی گردن کاٹنے پر تلے ہوئے ہیں، ان ناسازگار حالات میں مرہٹوں کا مقابلہ تو کیا ہو سکے گا، مغلیہ سلطنت کا بچانا بھی مشکل ہے، اس نے مرہٹوں کے ساتھ صلح کر لی۔ حکومت دہلی نے پیشوا کو اقلیم ہند میں وسیع اختیارات سونپ دیئے اور یہ بھی فیصلہ کیا کہ شاہ عالم، جو الہ آباد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظر بند کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہا ہے، دہلی لایا جائے اور اس کی سرپرستی میں ملک کے امن و امان کے لیے کوشش کی جائے۔ چنانچہ مرہٹے اس پر متفق ہو گئے۔

شاہ عالم سے اس سلسلے میں گفت و شنید شروع ہوئی۔ وہ بھی دہلی آنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ مرہٹہ سرداروں کے قول و قسم سے مطمئن ہو کر عازم دہلی ہوا اور بارہ سال کی جلاوطنی کے بعد ۱۷۷۱ء کے آخر میں دہلی پہنچا۔ بڑے زور شور سے اس کا استقبال ہوا۔ اب نجیب الدولہ مر چکا تھا۔ نجف خاں دہلی کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ ضابطہ خاں اپنے باپ نجیب الدولہ کا عہدہ لینا چاہتا تھا۔ تکوجی ہلکر والئے اندور اس کا بڑا سرپرست تھا۔ ہلکر کا اثر دربار میں بھی تھا۔ اس نے بڑی کوشش کی مگر حالات نے ضابطہ خاں کا ساتھ نہ دیا۔ وہ کبھی تو امیر الامرا ہوتا کبھی فقط ایک معمولی سردار بن کر رہ جاتا۔

دہلی کی حالت دن بدن ابتر ہو رہی تھی، بڑی بڑی مہمات کے لیے روپیہ درکار تھا مگر یہاں خزانہ خالی تھا۔ بادشاہ بالکل کنگال تھا یہاں تک کہ جب ۱۷۸۱ء میں اس کی ماں لعل کنور فوت ہوئی تو شاہ عالم کے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی کہ وہ اس کا مقبرہ بنوا سکے۔ ان حالات میں نجف خاں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ وہ سلطنت کے ہر حریف سے لڑا۔ مگر جہاں گھر کے اندر دشمن موجود ہوں وہاں ایک آدمی کی کوشش سے کیا ہوتا ہے۔ شاہ عالم ان حالات کو خوب سمجھتا تھا مگر کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ نجف خاں کے مرنے کے بعد حالات نے پھر پلٹا کھایا۔ مرہٹوں کا اثر و رسوخ بہت زیادہ بڑھ گیا، جسے ہر صاحب بصیرت بڑے خوف و ہراس سے دیکھتا تھا۔ سب سے زیادہ خطرہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو تھا۔ مگر وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔

یہ دیکھ کر غلام قادر روہیلہ جو ضابطہ خاں کا بیٹا تھا، منصور علی خاں خواجہ سرا کی وساطت سے بادشاہ کے حضور میں پیش ہوا۔ اس کے ساتھ مغل فوج کا سردار اسماعیل بیگ بھی تھا۔ یہ دونوں مادھوجی سندھیا کے خلاف ہاتھ پاؤں مار رہے تھے، سندھیا کا تسلط دربار پر چھایا ہوا تھا۔ بادشاہ ایک طرف سندھیا سے امداد طلب کر رہا تھا، دوسری طرف وہ غلام قادر روہیلہ اور اسمٰعیل بیگ کو بھی ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ سندھیا کی فوجیں ادھر ادھر منتشر تھیں۔ بیگم سمرو جو اس وقت دہلی میں تھی اور جس کے ہوتے ہوئے خطرات لال قلعہ سے دور ہی دور رہتے تھے، حالات سے مایوس ہو کر اپنی ریاست سردھنا میں چلی گئی، اس نے یہ بھی کہا کہ مادھوجی سندھیا متھرا میں ہوتے ہوئے دہلی کی مہم میں کیوں شریک نہیں ہوتا اور بادشاہ کی امداد کے لیے خود کیوں نہیں آتا۔ دال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے۔

بگڑ شہر کے جانے کے بعد فقط ہمت بہادر گوساعیں بادشاہ کے ساتھ رہ گیا تھا۔ وہ پہلے ہی بہت اور جرأت سے بادشاہ کے خلاف کو متغافل کر رہا تھا۔ مگر مرہٹہ سرداروں نے اسے دھمکیاں دے دے کر بادشاہ سے علیحدہ کر دیا۔ اس میں سب سے زیادہ کام منصور علی خاں خواجہ سرا نے کیا۔

جب اسمٰعیل بیگ اور غلام قادر بادشاہ کے حضور پیش ہوئے تو کورنش و تسلیمات کے بعد دونوں نے عرض کیا کہ ہم دونوں جو کام کر رہے ہیں وہ جہاں پناہ کی خیر خواہی کے لیے ہے۔ بادشاہ سب کچھ سمجھتا تھا اور اپنی مجبوری اور معذوری سے بھی واقف تھا۔ مگر اس نے دونوں کو خلعت عطا کئے۔ غلام قادر کی امیر الامرائی کا اعلان کیا۔ مادھو جی سندھیا اپنے عہدے سے موقوف کیا گیا اور اسمٰعیل بیگ تمام افواج کا سپہ سالار مقرر ہوا۔

غلام قادر روہیلہ نے کچھ دنوں بعد بادشاہ سے کہا کہ ہماری سپاہ کا ارادہ ہے کہ وہ متھرا پر حملہ کر کے مرہٹوں کو شمالی ہندوستان سے بھگا دے۔ جتنے امیر وہاں موجود تھے سب نے تائید کی۔ مگر شیل داس خزانچی نے یہ عذر پیش کیا کہ خزانہ خالی ہے فوج کے مصارف کون برداشت کرے گا۔ غلام قادر نے خزانچی کو بُرا بھلا کہا۔ وہ مارے غصے کے غائب ہو گیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ شاہ عالم نے ایک خط مادھو جی سندھیا کو لکھا تھا کہ وہ اس کی امداد کے لیے آ جائے۔ یہ خط غلام قادر کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس نے خط نکال کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے انکار کیا۔ غلام قادر نے اسی وقت حکم دیا کہ شاہی گارد فوراً ہتھیار ڈال دے۔ اس نے شاہ عالم کو حراست میں لے لیا اور اسے قید کر کے سلیم گڑھ بھجوا دیا۔

اس سے فارغ ہو کر اس نے ایک تیموری شہزادے کو قید سے نکالا اور اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ سب امیروں اور سرداروں کو حکم دیا کہ وہ اس کی بادشاہت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے ہاتھ پر بیعت کریں۔

غلام قادر نے تین دن تک بادشاہ کو بے آب و دانہ رکھا۔ اور باقاعدہ قلعہ لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ مگر اسمٰعیل بیگ بھی برابر کا شریک تھا۔ اس واسطے پہلے اسے ٹالا اور کہا کہ حالات کو قابو میں رکھنے کے لیے تمہارا فوج میں ہونا ضروری ہے۔ وہ اس چکمے میں آ گیا مگر لشکر میں پہنچ کر اپنی اس حماقت پر بہت پچھتایا۔ اس نے اتنا ضرور کیا کہ شہر کے دولت مند اہل کاروں کو بلا کر کہہ دیا کہ تم ہوشیار رہنا۔ اپنی حفاظت کا بندوبست رکھنا۔ ساتھ ہی اپنے سپاہیوں اور نائبوں کو یہ حکم بھی دیا کہ اگر روہیلے شہر کو لوٹیں تو تم بھی خوب لوٹو۔

غلام قادر نے سب سے اوّل نئے بادشاہ کو حکم دیا کہ اپنی تمام بیگمات سے زیورات، جواہرات اور قیمتی سامان لے لو۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ جب یہ سامان جمع ہو گیا تو روہیلے نے اس پر قبضہ کر لیا۔

یہاں سے فارغ ہو کر اس نے شاہ عالم پر دباؤ ڈالا کہ وہ بتلائے اس نے دولت کہاں چھپا رکھی ہے اور کہاں کہاں دفینے موجود ہیں۔ شاہ عالم نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اب اس پر سختی شروع ہوئی۔ کوئی ایسا ظلم و ستم نہ تھا جو اس بوڑھے بادشاہ اور اس کی اولاد پر نہ توڑا گیا ہو۔ شروع شروع میں اس نے نئے بادشاہ بیدار بخت سے اسے خوب پٹوایا، ۳۰ جولائی ۱۷۸۸ء کو شاہی خاندان کی بیگمات کو پٹوانا شروع کیا۔ ان کے جسم پر نیل پڑ گئے۔ ان کے گال تھپڑوں سے لال ہو گئے۔ جب ان کو پیٹا جاتا تو سارا محل ان کی دردناک چیخوں سے گونج اٹھتا۔

اس دوران میں کبھی کبھی روہیلے کو خیال آتا کہ کہیں اسمٰعیل ان کی مدد کے لیے نہ آ دھمکے۔ اس لیے اس کا منہ بند کرنے اور اسے روکنے کے لیے ۳۱ جولائی کو پانچ لاکھ روپے اس کے پاس بھیج دیئے۔ جس پر اس نے احتجاج کیا۔ چند روز بعد اس نے مزید سات لاکھ روپیہ بھیجا۔

یکم اگست کو پھر بادشاہ پر سختی شروع ہوئی کہ وہ دفینے اور خزانے بتلائے۔ مگر اسے پتہ ہوتا تو وہ بتاتا۔ جب سختی حد سے بڑھ گئی تو

بڈھے بادشاہ نے کہا: "ظالم! خزانہ کہاں ہے؟ کیا میرے پیٹ میں رکھا ہے۔ اگر وہاں ہے تو اسے چیر کر نکال لے۔" غلام قادر نے کہا: "وقت آنے گا تو ایسا بھی کیا جائے گا۔"

شاہ عالم سے مایوس ہو کر اس نے بڑی بوڑھی بیگمات پر تشدد کرنا شروع کیا۔ ان سب میں ملکہ زمانی اور ممتاز محل امتیازی حیثیت رکھتی تھیں۔ وہ شہر میں رہتی تھیں۔ جو کچھ ان کے پاس تھا وہ لوٹ لیا گیا۔ مزید مال و دولت بتانے کے لیے ان پر سختیاں کی گئیں۔

جب وہ حیلہ سب طرف سے مایوس ہو گیا تو اس نے تخت کو آگ لگا کر سارا سونا اور چاندی اس میں سے نکال لیا۔ محلات کے فرش اکھاڑے۔ اس خیال سے کہ شاید خزانہ ان کے نیچے دفن ہو۔ تین دن تک قلعہ میں یہی کام ہوتا رہا۔

۱۰ اگست ۱۷۸۸ء کو دوبارہ بادشاہ طلب کیا گیا۔ غلام قادر دیوان خاص میں بیٹھا ہوا تھا۔ بادشاہ اس کے حضور میں پیش ہوا۔ غلام قادر روہیلے کے ساتھ یعقوب علی خاں اور چار پانچ روہیلے پٹھان اور بھی تھے۔ اس نے بادشاہ سے خزانہ دریافت کیا۔ شاہ عالم نے بڑے تحمل سے جواب دیا کہ اگر مجھے دفینوں کا علم ہوتا تو میں چاندی اور سونے کے ظروف بیچ کر اپنے نوکروں کو تنخواہ کیوں دیتا؟ اگر میرے آباؤ اجداد میں سے کسی نے یہاں کوئی خزانہ دفن کیا ہے تو مجھے اس کا علم کیونکر ہو سکتا ہے۔

غلام قادر نے جھلا کر کہا۔ تو بیکار محض ہے۔ اس دنیا میں تیرا کیا کام۔ تیری آنکھیں نکال لینی چاہئیں۔ شاہ عالم نے کہا اے کمبخت یہ آنکھیں وہ ہیں جو ساٹھ برس تک کلام اللہ پڑھتی رہی ہیں۔ انھوں نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔ انھیں نکال کر تجھے کیا ملے گا؟

یہ سن کر روہیلے نے منہ پھیر لیا اور حکم دیا کہ بادشاہ کے بیٹوں اور پوتوں کو خوب پیٹا جائے چنانچہ نوکروں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ یہ دیکھ کر بوڑھے شاہ عالم نے کہا: "میں نے یہ عذاب اور مصیبت دیکھنے کے لیے ان آنکھوں کو باقی رکھنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ انھیں فوراً نکال ڈال۔ اب ان کا کیا فائدہ ہے۔"

غلام قادر غصے سے بے قابو ہو کر تخت سے کود پڑا۔ بادشاہ کو فرش پر لٹایا۔ چھاتی پر چڑھا اور اپنے خنجر سے بادشاہ کی ایک آنکھ نکال ڈالی۔ دوسری آنکھ نکالنے کا حکم یعقوب علی خاں کو دیا۔ اس نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔ روہیلے نے تلوار سے اس کا سر قلم کر دیا۔ اس کے دوسرے ساتھی یہ دیکھ کر دہل گئے۔ انھوں نے فوراً بادشاہ کی دوسری آنکھ نکال دی۔

اس کے بعد شاہ عالم کو سلیم گڑھ بھیج دیا گیا۔ اس وقت تمام قلعے کے رہنے والے تصویر غم بنے ہوئے تھے۔ بیگمات اور شہزادیاں ہائے ظالم، وائے ظالم کہہ کر سر پیٹ رہی تھیں۔ کوئی یہ دردناک واقعہ دیکھ کر بیہوش پڑی ہوئی تھی۔ کسی پر سکتے کا عالم طاری تھا۔ کوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔ غرضیکہ سب پر غم و الم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔

جب شاہ عالم کی آنکھیں نکالی جا چکیں تو غلام قادر کو پھر اسمٰعیل بیگ کا خیال آیا۔ چنانچہ اس واقعہ کے دو دن بعد اسے ایک بہت بڑی رقم اور بھیجی۔

شہر والوں کو کچھ خبر نہ تھی کہ لال قلعہ کی چار دیواری میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ چند روز کے بعد انھیں علم ہوا تو وہ خوف کے مارے شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ ۱۴ اگست کو مرہٹوں کی فوج پہنچ گئی۔ انھوں نے لوگوں کو تسلی و تشفی دی اور یقین دلایا کہ ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ ہو گی۔ اب شہر کا کاروبار پھر سے جاری ہوا۔ مرہٹوں نے قلعہ کی ناکہ بندی کی۔ اور غوث گڑھ کو جانے والا راستہ بالکل روک لیا۔

اسمٰعیل بیگ یہ دیکھ کر کہ اب مرہٹے آ گئے ہیں ان کے سردار رانا خاں کے پاس پہنچا اور معذرت پیش کرنے کے بہانے سے مل گیا۔ قلعے کے اندر پھر حالات بگڑے۔ روہیلہ سپاہیوں نے لوٹ کھسوٹ سے اپنا حصہ مانگا۔ اس کے ساتھ ہی سامانِ رسد بھی ختم ہو گیا۔ غلام قادر گھبرایا۔ اس نے بارود کو آگ لگائی اور خود میرٹھ بھاگ گیا۔

شاہ عالم نے ان حالات میں جس قدر صبر و استقلال کا ثبوت دیا، اس کا عشر عشیر بھی اگر میدانِ جنگ میں دکھاتا تو اسے یہ بربادی دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اس نے اس واقعہ کے بارے میں ایک بڑی دردناک نظم لکھی جس کا ایک ایک لفظ درد میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھا شاہ عالم اپنے انصار و اعوان کی طرف فریاد کا ہاتھ بڑھا بڑھا کر انھیں پکارتا ہے اور اپنی مدد کے لیے بلاتا ہے۔ اس کی یہ درد انگیز شاعری زندہ جاوید ثابت ہوئی۔ مرہٹے سب سے پہلے اس کی مدد کو پہنچے اور اسے کنجِ قفس سے نکال کر تختِ شاہی پر بٹھایا۔ یہ نظم بڑی مؤثر اور شاہ عالم کی زبوں حالی کا بہترین نمونہ ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

صرصرِ حادثہ برخاست پئے خواریِ ما — داد بر باد سر و برگِ جہانداریِ ما

آفتابِ فلکِ رفعتِ شاہی بودم — بود در شامِ زوال آہ سیہ کاریِ ما

چشمِ ما کندہ شد از جورِ فلک بہتر شد — کہ نہ بینیم کہ کند غیر جہانداریِ ما

داد افغان بچہ شوکتِ شاہی بر باد — کیست جز ذاتِ خدائے کہ کند یاریِ ما

کردہ بودیم گناہے کہ سزایش این بود — ہست امید کہ بخشند گنہگاریِ ما

کرد سی سال نظارت کہ مرا داد بباد — زود تر یافت تلافیِ ستمگاریِ ما

نازنینان پری چہرہ کہ ہمدم بودند — نیست جز عزلِ مبارک بہ پرستاریِ ما

حقِ طفلان کہ ز سی سال فراہم کردند — کردہ تاراج نمودند سبکساریِ ما

عہد و پیمان بمیان دادہ نمودند دغا — مغلیان خوب نمودند نمک خواریِ ما

شیر دادیم بہ افعی بچہ و پروردیم — عاقبت گشت بجز بہرِ خونخواریِ ما

قومِ افغان و مغلیہ ہمہ بازی دادند — بسکہ گشتند بجز بہ گرفتاریِ ما

آن گدا زادۂ نہدان کہ بدوزخ برود — با سنۂ جور و ستم شد بدل افگاریِ ما

گل محمد کہ ز مردان بشرارت کم نیست — چہ قدر کرد وکالت بہ گرفتاریِ ما

ہم الہیار و سلیمان و بدل بیگ لعین — ہر سہ بستند کمر بر دل آزاریِ ما

شاہِ تیمور کہ دارد سرِ نسبت با من — زندہ باشد کہ بیاید بہ مددگاریِ ما

مادھو جی سیندھیا فرزندِ جگر بندِ من — ہست مصروفِ تلافیِ ستمگاریِ ما

راجہ و راو زمیندار امیر و چہ فقیر — حیف باشد کہ نسازند بہ غمخواریِ ما

حالِ ما گشتہ بتر ہمچو امامان زیزید — کرد تقدیرِ ازل روزیِ ما خواریِ ما

بود جانکاہ ز ردِ مال جہان ہمچو مرض — دفع از فضلِ الٰہی شدہ بیماریِ ما

آصف الدولہ اگرچہ کہ در سپردن ماند — چہ عجب گر بنماید مددگاری ما

آفتاب از فلک امروز شب ہی زدی

باز فردو بدر آید و سرو مہر داری ما

شاہ عالم شاعر تھا۔ فارسی، اردو، اور ہندی میں شعر کہتا تھا۔ اس کے ہندی کلام کا مجموعہ نادرات شاہی کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اردو اور فارسی کا کلام ابھی تک گوشۂ گمنامی میں پڑا ہے۔ اگر وہ چھپ جائے تو اس زمانے کے واقعات، رسوم و رواج اور ثقافت و معاشرت کے بعض گوشوں کو بے نقاب کرنے کے علاوہ تیموریوں کی ادبی تاریخ میں ایک بہت بڑا اضافہ ہوگا جس سے اس خاندان کی ادبی روایات میں ایک تسلسل قائم ہو جائے گا۔

شاہ عالم نے جس طرح زندگی کے دن گزارے شہزادگی سے لے کر بادشاہت تک اس نے بڑے بڑے انقلاب دیکھے۔ اپنوں کی بے وفائیاں، اغیار کی فریب کاریاں، جلاوطنی کی مصیبت اور قلعہ میں شاہ عالم کی حیثیت سے قدم قدم پر انسانی فطرت کے تماشوں کا منکشف ہونا، مصائب و آلام کا ہجوم کر کے آنا، ایسے واقعات ہیں جو شاعر کو حقیقی معنوں میں شاعر بنا دیتے ہیں۔ اس کے کلام میں سوز و گداز اور خلوص پیدا کرتے ہیں اور شعر حقیقی معنوں میں شعر بن جاتا ہے جو زبان سے نکلتے ہی دل میں اتر جاتا ہے۔

شاہ عالم کی آنکھوں کا مرثیہ بھی اسی کی ایک کڑی ہے جو بڑا موثر ہے۔ جس نے اسے پڑھا وہ اس سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اگر شاہ عالم کا اور کوئی کلام باقی نہ رہتا تو فقط یہی نظم اس کے نام کو ہمیشہ کے لیے زندہ رکھ سکتی تھی۔ جدید ادب میں جس قسم کی شاعری پر زور دیا جاتا ہے شاہ عالم کی نظم اس کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ اس میں نہ مبالغہ ہے نہ جھوٹ۔ سیدھے سادے واقعات سیدھے سادے انداز میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ لفظ لفظ میں جو درد بھرا ہوا ہے جو ہر حال میں پڑھنے اور سننے والوں کے دل و دماغ کو مسخر کر لیتا ہے۔

مورخوں نے اس دردناک واقعہ کو خوب بڑھا چڑھا کر لکھا ہے۔ حالانکہ یہ بھی اسی قسم کا واقعہ ہے جس قسم کے کئی واقعات پہلے ہو چکے ہیں، البتہ ایک بات جو اسے دوسروں سے مختلف بناتی ہے، وہ مغل بیگمات کی بے حرمتی اور بے پردہ رسانی ہے۔ اس سے پہلے تاریخ میں بیگمات کی بے حرمتی کا کوئی واقعہ نہیں ملتا۔ تیموریوں نے اپنی رعایا نوازی اور عدل گستری کے باعث لوگوں کے دلوں میں خاص عزت و وقار پیدا کر لیا تھا۔ رعایا انھیں بہ منزلہ سرپرست اور ماں باپ کے سمجھتی تھی اور وہ رعایا کو بہ منزلہ اولاد خیال کرتے تھے۔ بادشاہ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے اور ان کی خوشی میں خوش ہوتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ان کی حکومت دلوں پر تھی، لوگ انھیں اپنے سے الگ نہ سمجھتے تھے، وحشی سے وحشی اور مہذب سے مہذب انسان مغل حرم کی دل سے عزت کرتا اور کوئی ایسی حرکت نہ کرتا جس سے ان کے وقار میں فرق آئے یا عزت و آبرو پر حرف آئے۔ چنانچہ ہم ذیل میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک سول افسر کے سفرنامے سے ایک واقعہ نقل کرتے ہیں جس سے اس خیال کی پورے طور پر تائید ہو جاتی ہے۔ اس افسر کا نام تھامس ٹوئننگ (THOMAS TWINING.) تھا۔ اس نے اس دلدوز واقعہ کے چھ برس بعد دہلی کا سفر اختیار کیا۔ یہ سفر اس نے نجی طور پر کیا تھا۔ جب وہ دہلی سے واپس ہوا تو اس کے ساتھ بیس کے قریب سپاہی تھے جو اس کی حفاظت اور رہنمائی کر رہے تھے۔ دوران سفر میں جب وہ بلند شہر پہنچا تو اسے بتلایا گیا کہ گوجر ڈاکوؤں کی ایک بہت بڑی جماعت جس میں دو سو کے قریب آدمی ہیں اس پر چھاپہ مارنے والی ہے۔ تھامس کے قول کے بموجب گوجر بڑے بہادر، خونخوار اور دلیر ڈاکو

گئے۔ یہ خبر سن کر اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ پالکی سے نیچے اتار دیے جائیں اور جب ڈاکو نزدیک پہنچیں تو بلند آواز سے کہیں کہ بادشاہ کے حرم کی بی بی ہے۔ اس نعرے نے جادو کا اثر کیا۔ ان میں سے ہر ایک نے جھک کر پالکی کو سلام کیا اور چپ چاپ واپس چلے گئے۔

(TRAVEL IN INDIA . PAGE 269)

جب وحشی، خونخوار اور سفاک ڈاکوؤں کے دل میں شاہی خاندان کی یہ عزت تھی تو مہذب اور متمدن لوگوں کا اندازہ آپ خود ہی کر سکتے ہیں۔ ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ حضرت محل پر شاہ عالم پر سختیاں ہوتی رہیں۔ اس کی زبان پر بات کا نام نہ تھا مگر شہامت اس نے کسی موقع پر بھی شکوہ و شکایت آہ و زاری اور فریاد نہیں کی۔ یہ صبر اور تحمل کی بڑی اچھی صورت ہے۔ مگر اس نے صاف تو اگر اس میں عزت اور شجاعت کے جوہر بھی ہوتے تو شاید بیویوں کے جھگڑے ہوتے مگر ... پھر بہار آجاتی اور اس کا خاتمہ اس کی بدبدی نہ ہوتا۔

اردو کا ایک اچھوتا ناول "نشتر"

سید مبارز الدین رفعت

ہمارے ایسے بزرگ جنھوں نے اپنی جوانی کے دنوں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، حکیم محمد علی اور منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ کے ناول مزے لے لے کر پڑھے تھے اب آہستہ آہستہ اللہ کو پیارے ہوتے جا رہے ہیں۔ اس نسل کے کسی بزرگ کی موجودگی میں کبھی ناول کا ذکر چھڑ جائے تو بے اختیار ہو کر آپ سے پوچھ بیٹھیں گے "میاں! ناول نشتر بھی پڑھا ہے؟" آپ جواب دیں گے کہ اس نام کا کوئی ناول آپ کی نظر سے نہیں گزرا۔ اس پر وہ بزرگ حیرت اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمائیں گے کہ ناول نشتر نہیں پڑھا تو آپ نے کچھ بھی نہیں پڑھا۔ ایسے ہی بزرگوں میں ایک ہمارے ادیب شہیر حضرت نیاز فتح پوری بھی ہیں۔ مثنوی زہر عشق کا جو خوبصورت اڈیشن مجنوں گورکھپوری نے شائع کیا تھا اس کے دیباچہ "عذر لنگ" میں فرماتے ہیں: "یوں تو اپنی زندگی میں خدا معلوم کتنی بار رو چکا ہوں لیکن تین اشک باریاں ایسی ہیں جن کی تفصیل مجھے اب بھی یاد ہے اور شاید ہمیشہ یاد رہے۔ سب سے آخر میں اس وقت جب میں نے ایک نظم "مجرم وفا" کے عنوان سے لکھی تھی...... اس سے قبل جب ناول نشتر میری نگاہ سے گزرا اور اس سے بھی پہلے بعنوان شباب میں اس وقت جب اول اول مثنوی زہر عشق کا مطالعہ میں نے کیا۔"

میں نے آج سے کوئی دس پندرہ سال پہلے یہ ناول پڑھا تھا۔ اب گلبرگہ میں جہاں یہ کتاب لکھی گئی تھی، پھر ایک بار یہ کتاب مجھے پڑھنے کے لیے مل گئی۔ اس وقت میرے سامنے نشتر کا وہ اڈیشن ہے جو مطبع نولکشور لکھنؤ سے آٹھویں بار سنہ ۱۹۲ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون اس کتاب کی "دوسری خواندگی" کا نتیجہ ہے۔

ناول نشتر کے مصنف منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی کے ساتھ تاریخ ادب اردو نے بڑی ناانصافی سے کام لیا ہے۔ وہ نشتر کے سوا کئی اور کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کی ایک کتاب "کائنات"[1] ہے جو اس وقت بہت کمیاب ہے۔ ان کی دوسری تصنیف "بگلا بھگت"

---

[1] مولانا عبدالماجد دریابادی کے قول کے مطابق اس کتاب کا پہلا اڈیشن مطبع آفتاب ہند محلہ کچہری گھاٹ آگرہ سے سنہ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔ راقم الحروف کی نظر سے اس کا دوسرا اڈیشن گزرا ہے جو محمد شمس الدین خاں اکبرآبادی کے اہتمام سے ان کے مطبع شمس المطابع افضل گنج حیدرآباد دکن سے ۱۳۴۲ھ (م ۱۹۲۳ء) میں شائع ہوا تھا۔ کتاب کے عنوان سے دھوکا ہوتا ہے شاید یہ کتاب فلکیات کے موضوع پر لکھی گئی ہے لیکن اصل میں یہ انسانی زندگی کی رمزی یا تمثیلی داستان ہے۔ اس کو پڑھ کر مشہور انگریز مصنف بن ین کی کتاب "پلگرمس پروگرس"

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

گلاب بھی نہیں غالباً نایاب ہے اور اس کے بارے میں تفصیلات کا علم نہیں ہو سکا۔ ان کی سب سے مشہور تصنیف "حیاتِ شیخ چلی" ہے
ہمارے ادب کے ابتدائی دور کے اتنے اچھے ناول "نشتر" اور "حیاتِ شیخ چلی" جیسی زعفران زار کتاب کے مصنف ہونے کے باوجود بھی ان کو
کے مصنف کو اردو ادب کی تاریخ میں جگہ نہ مل سکی۔ مرزا محمد عسکری نے تاریخ ادب اردو میں، عبدالباری آسی نے تذکرہ مصنفین میں اور
آغا محمد باقر نے اپنی تاریخ نظم و نثر اردو میں ان کی کتاب "حیاتِ شیخ چلی" کا ذکر کیا ہے لیکن اسے ان کے ہمنام اور ہم عصر اڈیٹر
اودھ پنچ منشی سجاد حسین سے منسوب کر دیا ہے حالانکہ اودھ پنچ کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین نہ تو انجم تخلص کرتے تھے اور نہ وہ کسمنڈوی
تھے۔ منشی سجاد حسین نے بھی [illegible]، حاجی بغلول اور طرحدار لونڈی جیسے ناول لکھے ہیں۔ غالباً ناول نگاری اور پھر ہمنامی کی وجہ سے
سجاد حسین کسمنڈوی کی یہ تصنیف ان کے مشہور ہم عصر سے منسوب ہو گئی۔

ناول نشتر سے صاحبِ نشتر کے سوانح حیات پر کچھ بھی روشنی نہیں پڑتی۔ اس کتاب سے بس اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسمنڈہ (اتر پردیش) کے رہنے والے تھے۔ پھر کسی طرح انھیں ریاست حیدرآباد میں سرکاری ملازمت مل گئی تھی۔ دفتر مال میں پیشی کی خدمت پر مامور رہے اور عرصہ دراز تک گلبرگہ میں تعینات رہے۔ گلبرگہ ہی میں وہ ۵ رمضان ۱۳۱۱ھ کو نشتر کی تالیف سے فارغ ہوئے۔ اس کتاب کو انھوں نے اپنے محکمہ کے ایک افسر اعلیٰ محمد اکرام الدین خاں کے نام معنون کیا ہے جو پہلے گلبرگہ کے اول تعلقدار تھے اور نشتر کی تالیف کے وقت ایل گندل کی تعلقداری پر چلے گئے تھے۔ گلبرگہ کی مشہور "اکرام [illegible]" آج بھی اس علم دوست اور فیض رساں عہدہ دار کی یاد تازہ کر رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اکرام الدین خاں صاحبِ ذوق عہدہ دار تھے۔ منشی سجاد حسین نے یہ کتاب ان کے صاحبِ ذوق ہونے کی وجہ سے ہی ان کے نام معنون کی ہے۔ افسری اور ماتحتی کے تعلق سے ہٹ کر "پیش کش" کے عنوان کے تحت لکھے گئے ہیں: "یہ حقیر ترجمہ عالی جناب مولوی محمد اکرام الدین خاں صاحب بہادر اول تعلقدار ایل گندل ریاست حضور نظام دکن دام اقبالہ کے نام نامی کے ساتھ معنون کیا جاتا ہے۔ صرف جناب کی خالص عنایت اور محبت کے صلے میں ورنہ خوشامد کے واسطے بلند ہی اور بچے اپنے نام مجھ کو یاد ہیں۔"

رسالہ آج کل (دہلی) بابت ۱۵ جون ۱۹۴۹ء میں جناب بشیر علی صدیقی نے "اردو کا ایک گم نام مصنف ——— منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی" کے عنوان کے تحت صاحبِ نشتر پر ایک فاضلانہ مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے مگر اس کی ادبی قدر و قیمت سے متعلق

(حاشیہ صفحہ سابق) یاد آ جاتی ہے۔ یہ کتاب ادبی خوبیوں کے ساتھ ساتھ بڑے گہرے مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کا رنگ مصنف کی دوسری کتابوں سے بالکل ہی الگ ہے۔ اس کتاب میں خالق و مخلوق، خدا اور بندے کے آپس کے تعلقات کی نوعیت، زندگی کی مختلف منزلوں کی کیفیت اور آخر میں روزِ حساب کا نقشہ نیم شاعرانہ، نیم فلسفیانہ اور نیم صوفیانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱؎ اس کتاب کا دوسرا اڈیشن راقم نے دیکھا تھا۔ ۱۹۲۴ء کا چھپا ہوا تھا۔ اس کی ابتدا میں ایک مزاحیہ دیباچہ ہے اور آخر میں خود مصنف کا یہ قطعۂ تاریخ درج ہے:

پھیلے ہیں قہقہے جو شوخیاں ہیں ہر طرف — ہے جو ہے سو فی المثل فرخندگی خندہ گی
سالِ تاریخش جو ہے گا ہاتفِ غیبی بگفت — شیخ چلی آ گئے دنیا میں باسنجیدگی

ناانصافی سے کام لیا۔ منشی سجاد حسین کے حالاتِ زندگی کے لیے صدیقی صاحب نے مجھ اور لوگوں کے ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی سے بھی استفسار کیا تھا۔ منشی صاحب سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے۔ جواب میں ڈاکٹر صاحب نے انھیں لکھا تھا۔

> "منشی سجاد حسین انجم ۱۹۰۲ء یا ۱۹۰۳ء میں بیمار پڑے۔ ملازمت سے رخصت لے کر لکھنؤ آئے اور کچھ مہینے بعد انتقال کر گئے۔ سنتالیس چھیالیس کے قریب عمر پائی۔ دبلے پتلے معمولی قد و قامت کے آدمی تھے۔ سانولی رنگت، استواں ناک، ہونٹ پتلے، داڑھی خشخشی، بشرے سے ذکاوت نمایاں، مزاج میں تمکنت تھی۔ مرزایانہ بسر کرنے اور مالی مشکلوں کو سامنے [illegible] کرنا۔ بدصورت مالداروں کو دیکھ کر بہت خفا ہوتے تھے۔ صورت یا وضع قطع سے مذہبیت نہ ظاہر ہوتی تھی مگر تھے مذہبی آدمی۔ نماز روزے کے بہت سختی سے پابند تھے۔ مولانا عبدالوہاب لکھنوی (یعنی علی برادران مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی کے مشہور پیر مولوی عبدالباری فرنگی محلی کے والد ماجد) سے بیعت تھی اور مرشد سے والہانہ اور گہری عقیدت۔ خدا بخشے۔"

منشی سجاد حسین اودھ پنچ لکھنؤ کے ابتدائی دور کے نامہ نگار بھی رہے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ انجم تخلص کرتے تھے۔ ان کی ایک نیچرل نظم اخبار اودھ پنچ میں شائع ہوئی تھی۔ لوگوں کو اپنے اشعار بہت کم سناتے تھے۔ ناول فتنہ میں بھی انھوں نے دو ایک جگہ حسبِ حال اپنے اشعار نقل کر دیے ہیں۔ جرأت اور رنگین کے رنگ کی وہی جوبن اور انگیا والی شاعری ہے۔ ایک جگہ پوری ایک غزل نقل کر دی ہے، اس سے ان کی شاعری کا ایک سرسری اندازہ لگایا جا سکتا ہے ؎

بہاروں پہ ہے حسنِ زیبا کسی کا — اٹھانوں پہ ہے جوبن آیا کسی کا
جو سینے سے ڈھلکا دوپٹہ کسی کا — مسل ڈالا ظالم کلیجہ کسی کا
اسے چھپا پامال اس کو کب — مچاتے ہے اندھیر [illegible] کسی کا
غضب دختِ رز آج نکھری ہے ساقی — تماشہ ہے ٹوٹے جو تقوی کسی کا
دوپٹہ کی تقدیر ہیکل کی قسمت — کہ ہاتھ آگیا جوبن ابھرا کسی کا
سرِ طور کیا خاک باقی ہے موسیٰ — ادھر آؤ دکھلائیں جلوہ کسی کا
چلو ہم بھی پوچھیں مزاجِ مبارک — سرِ طور انجم ہے جلوہ کسی کا

اپنی غزل نقل کرنے کے بعد خود ہی حاشیے میں یہ لکھ گئے ہیں: "ناظرین ہنس پڑیں گے کہ یہ بے وقت کی راگنی کیسی۔ مگر اپنے لختِ جگر سب کو اچھے معلوم ہوتے ہیں، ٹھسکنے کی بات نہیں!"

فتنہ منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی کی پہلی تصنیف ہے۔ اصل میں یہ سید حسن شاہ نامی لکھنؤ کے کسی صاحب کی خود نوشت داستانِ معاشقہ کا فارسی سے اردو میں ترجمہ ہے۔ سید حسن شاہ کی اس فارسی تصنیف کا اب کہیں پتہ نہیں چلتا۔ معلوم نہیں اس فارسی داستان کا قلمی نسخہ کہاں سے منشی صاحب کے ہاتھ لگا تھا۔ اب چونکہ اصل فارسی کتاب ہماری دسترس میں نہیں ہے، اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ منشی صاحب نے

کس حد تک اس میں اپنی طرف سے حک و اضافہ کیا ہے۔ اتنا تو یقینی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اکثر اردو اشعار منشی صاحب نے اپنی طرف سے بڑھائے ہیں۔ ناول میں جگہ جگہ منشی صاحب نے مترجم کی حیثیت سے حاشیے بھی لکھے ہیں۔ کہیں لکھا ہے "یہیں سے اصل فارسی عبارت ہی نقل کر دی ہے، ترجمے میں اس کا لطف کہاں" کہیں لکھا ہے "یہاں حسن شاہ نے بہت سے فارسی شعر لکھے تھے، وہ سب میں نے حذف کر دیے ہیں" کہیں ہیروئن نے حسن لطیف انداز میں ہیرو کو بنایا ہے اس کی داد دی ہے کہیں ہیرو کی حماقت پر طنز کیا ہے۔ ایک حاشیے میں تو یہاں تک لکھا ہے "زمان از زمان کو میں نے بہت سنبھالا ہے ورنہ مصنف نے اس زمانے کی تہذیب کا کچھ خیال نہ کیا تھا۔" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ داستان کا ڈھانچہ تو منشی صاحب نے سید حسن شاہ سے لیا ہے لیکن اس کو اپنے دلکش انداز میں ڈھال کر بیان کیا ہے، نرا ترجمہ ہی نہیں کیا ہے۔

منشی صاحب نے کتاب کی ابتدا میں "التماس مترجم" کے عنوان سے چار سطروں کا ایک مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں: "...... ایک فارسی قصے کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ اس کتاب کے مصنف کے حالات کے واسطے ایک مستقل دیباچہ درکار تھا مگر نہ میں بالتفصیل لکھ سکتا ہوں اور نہ امید ہے کہ ہر ایک کے مدِ نظر ان تعلیمات کو رائج جائے گی ...... مختصر یہ ہے کہ اصل کتاب سیدھی سادی فارسی ہندی آمیز زبان میں قلمی میرے پاس موجود ہے۔ سال تصنیف ۱۲۰۵ھ اور سال کتابت ۱۲۱۵ھ۔ شریف مصنف نے اپنے عشق و محبت کا واقعہ نہایت سادہ الفاظ و عبارت میں لکھا ہے۔ بناوٹ اور تصنع غالباً بہت ہی کم اور سچا واقعہ ہے اس لیے دیکھنے والے واقعی کلیجہ تھام لیتے ہیں ......"

اٹھارویں صدی کے آخری دن ہیں اور یہی آپ کا ملک ہندوستان جنت نشان ہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے لگ بھگ ایک سو سال کی مسلسل خانہ جنگی، افراتفری، مرہٹوں کی لوٹ، نادر گردی اور ابدالی کی مار سے مرکزی حکومت مغلیہ چور چور اور نڈھال ہو کر سسکتی ہوئی اپنی آخری گھڑیوں کا انتظار کر رہی ہے۔ ملک میں سات سمندر پار سے آئے ہوئے بدیسی صاحبوں کے اقبال کا آفتاب طلوع ہو چکا ہے۔ شمال میں، جنوب میں، مشرق میں، مغرب میں ہر سمت انہی کا بول بالا ہے۔ کیا مدراس، کیا بنگال، کیا گجرات اور کیا پنجاب، ملک کے سبھی حصے ان کے حلقۂ اقتدار میں آتے چلے جا رہے ہیں۔ ملک میں جگہ جگہ ان کی فوجی چھاؤنیاں قائم اور ہر جگہ ان کے انتظامی افسر متعین ہوتے جا رہے ہیں۔ ادھر ہم آپس کے بغض و عناد، رشک و حسد، کینہ اور بغض میں مبتلا ایک دوسرے کے سر پھٹول میں مشغول ہیں۔ سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے سلسلے ہیں کہ جاری ہیں۔ صدیوں کی عیاشی نے محنت کوشی کی جگہ سہل جوئی کا راستہ سجھا دیا ہے۔ نوواردوں کے ہاتھ میں شمشیر و سناں چھن گئی تو طاؤس و رباب ہی کے دامن میں پناہ ڈھونڈھی جا رہی ہے۔ ہندوستان میں مشرقی تمدن کا چراغ بجھنے سے پہلے اپنی پوری تابناکی کے ساتھ بھڑک رہا ہے۔ کام و دہن کی حلاوتوں، گوش و بصر کی گھلاوٹوں اور ہر طرح کی حسی لذتوں کے وہ وہ سامان ہو رہے ہیں کہ بس فکر و عمل کی ساری صلاحیتیں ان ہی کے لیے وقف ہو کر رہ گئی ہیں۔ بدیسی نے فکرِ سیاست سے فراغت دے دی تو ساری سوجھ بوجھ، ساری دانائی، ذہانت صرف ہونے لگی بناؤ سنگھار میں، آداب میں، اطوار میں، اٹھنے میں، بیٹھنے میں، کھانے میں، پینے میں، اوڑھنے میں، بچھونے میں، غرض زندگی کے ہر فعل و عمل میں تکلف ہی تکلف برتتے ہیں۔ ارباب نشاط کے طائفے کو پروان چڑھنے کے لیے اس سے اچھے مواقع کہاں ملتے ہیں۔ ان دنوں ہندوستان میں اس نے اپنا کاروبار خوب ہی پھیلایا

اور یہ خوب ہی پھلا پھولا۔

کہتے ہیں جب کسی قوم پر سیاسی حیثیت سے زوال آنے لگتا ہے تو اس کے تمدن میں اتنی ہی نفاست اور شائستگی آنے لگتی ہے۔ تمدن کے انتہائی عروج کے دنوں میں فحاشی بھی ایک آرٹ بن جاتی ہے۔ طوائف ایک تہذیبی ادارہ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ یہی حال فراعنہ کے مصر، فلسطینیوں اور دلیلاؤں کے یونانِ قدیم اور قیصروں کے رومۃ الکبریٰ کے تمدنی عروج کے دنوں کا تھا۔ یونان کے رئیس تھینس اور ہرکلز جیسے نامور فرزند میس اور اسپاسا نام کی طوائفوں کی محبت پر نازاں تھے۔ روم کے حماموں میں سب ہی ننگے ہوتے تھے اور ان سے مستقل طور پر قحبہ خانوں کا کام لیا جاتا تھا۔ ان حماموں میں جانا اور دادِ عیش دینا، تہذیب و شائستگی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے دوران میں ہندوستانی طوائفوں نے بھی ناچ گانے، شعر و شاعری، مجلسی آداب، لباس کی تراش خراش اور رفتار و گفتار میں وہ کمال دکھایا کہ ہندوستانی امرا انھیں اپنی سرکار سے وابستہ کرنے لگے اور شرفا اپنے بچوں کو تہذیب و شائستگی، محفل کے اطوار اور گفتگو کے آداب سکھانے کے لیے ان کے پاس بھیجنے لگے۔ ایسی عورتوں کے ڈیرے اور کوٹھے ایک طرح کے کلب تھے جہاں گھڑی دو گھڑی کے لیے بیٹھنا خلافِ وضع نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ایک طرح باوضع، صاحبِ ذوق اور صاحبِ مرتبہ ہونے کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ یہ جگہیں بڑی نفیس، شائستہ اور دلچسپ ہوتی تھیں۔ آج کل کی طوائفوں کے کوٹھوں کا ان سے مقابلہ کرنا ان کی توہین ہے۔

مشرقی تہذیب کی اس آخری لہر کی میں برائیوں کے ساتھ ساتھ اچھائی کے پہلو بھی آپ کو کافی مل جائیں گے۔ ان ڈیرے دار طوائفوں کا آج کے بازارِ حسن سے مقابلہ کیجیے تو کتنا زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ آج کے بازارِ حسن میں عشوہ طرازی اور ناز آفرینی کی کمی نہیں لیکن اس بازار میں جو جنس نایاب ہو گئی ہے وہ انسانیت اور شرافت ہے۔ کل کے گناہ کے کوچے اور آج کے گناہ کے کوچے میں بس فرق اسی کا دکھائی پڑتا ہے کہ کل کے گناہ کے کوچے کی دکانیں سجانے والیاں لاکھ ہرجائی ہوتے ہوئے بھی وفادار اور جاں نثار تھیں۔ آج جس آسانی کے ساتھ انھیں حاصل کیا جا سکتا ہے اس وقت ان کا حصول اتنا آسان نہ تھا۔ ایک عرصے کے میل جول کے بعد وہ کسی سے تعلق پیدا کرتی تھیں اور اس تعلق کو نباہ بھی دیتی تھیں اور کسی نیک بخت کو توبہ کی توفیق میسر ہو جاتی تو یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کے بعد اس کی پوری زندگی عصمت و پاکبازی کی زندگی ہوتی تھی۔

عصرِ حاضر کے ایک فاضل مؤرخ نے بالکل سچ کہا ہے کہ "۱۸۵۷ء ہندوستان کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ قدیم و جدید کے درمیان یہی وہ منزل ہے جہاں سے ماضی کے نقوش بھی پڑھے جا سکتے ہیں اور مستقبل کے امکانات کا جائزہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ مغلیہ سلطنت جس کے دامن میں ایک ایسی تہذیب نے پرورش پائی تھی جو رنگ و نسل اور مذہب و ملت کے سارے امتیازات سے بالاتر ہو کر ایک عرصے تک ہندوستان کی سیاسی وحدت کی ضامن رہی تھی، یہاں پہنچ کر دم توڑ دیتی ہے اور اس کے ساتھ تاریخ کا ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔ پرانا سماجی نظام اور پرانے نظریات وقت کے نئے تقاضوں کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں اور نئی سماجی قوتیں صرف فکر و نظر کے سانچے ہی توڑنے پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ زندگی کے سارے محور بدل ڈالتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ۵۷ء میں صرف ایک سیاسی نظام ہی کا جنازہ نہیں نکلتا بلکہ ہندی قرونِ وسطیٰ کا سارا تہذیبی سرمایہ بھی نیست و نابود ہو جاتا ہے۔"

ہندی قرونِ وسطیٰ کے سارے تہذیبی سرمایے کا جنازہ نکلنے میں تقریب بہ تقریب نصف صدی کا فرق ہے کمپنی بہادر کے جو بھی

ملازم انگلستان سے ہندوستان بھیجے جا رہے ہیں ان میں ابھی تک اپنی تہذیب کی برتری کا احساس نہیں جاگا اور ہندوستانی تہذیب کے ساتھ اس مفاہمت کا برتاؤ شروع نہیں ہوا جو بعد میں سوچی سمجھی پالیسی کے طور پر شروع ہوا۔ اس وقت ہندوستان کے ساحل پر قدم رکھتے ہی ان کی آنکھیں مشرقی تمدن کی آخری بھڑک سے کچھ ایسی چکا چوند ہو گئیں کہ انھوں نے اپنی تہذیب، اپنے رہن سہن اور ٹھاٹ باٹ کو یہاں کے طور طریق سے فروتر جانا۔ وہ بتدریج ہندوستان کے حاکم اور اونچے طبقے کی جگہ لیتے جا رہے تھے اس لیے لازمی طور پر انھوں نے مکر رکھاؤ اور رہن سہن میں اسی طبقے کی ریس کی اور اسی کو اپنا نمونہ قرار دیا۔ عیش و عشرت کے جو جو ڈھنگ اس زوال پذیر طبقے نے ایجاد کر رکھے تھے ان سب کو ان نئے حاکموں نے اپنایا اور انھی کے انداز میں داد عیش دینے میں ان سے کسی طرح پیچھے نہ رہے۔ ہمارے اس دور میں جب کہ ہر طرف مغربی تہذیب کی نقالی کا دور دورہ ہے اور علم و ہنر اور اخلاق کے ساتھ ساتھ حسن و عشق اور عیش و عشرت کے معیار ہی بدل گئے ہیں اور ہم اپنی رنگینیوں اور عیش پسندیوں میں روز بروز مغربی معیار کے پابند ہوتے جا رہے ہیں یہ بات کچھ عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کسی زمانے میں اسی مغربی تہذیب کے نمائندے اپنی تہذیب کو حقیر اور فروتر جان کر اسی مشرقی تہذیب کی پیروی پر فخر کرتے تھے جسے بعد میں ذلیل تر اور پست تر قرار دیا گیا۔

ناول "نشتر" کا قصہ کچھ ایسی ہی فضا میں شروع ہوتا ہے۔ اس کے ہیرو سید حسن شاہ جو خود اس داستان کے راوی ہیں اپنے آپ کو صحیح النسب سادات سے بتلاتے ہیں۔ ۱۱۷۱ھ میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں یتیمی کا داغ اٹھایا۔ نانا نے ان کی پرورش کی اور تعلیم و تربیت دی۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں اپنے نانا کے توسط سے جنرل کوٹ کے بھانجے مسٹر سنگ ممبر کونسل کیپ ٹانبر کے خانگی منشی کی حیثیت سے نوکر ہو گئے۔ مسٹر سنگ ایک خوش مزاج، عیش پسند اور خوش گزران فوجی افسر تھے۔ میر صاحب کی مستعدی، کارگزاری اور دیانت داری سے وہ بہت خوش ہوئے۔ رفتہ رفتہ ان کے سارے خانگی کاروبار میر صاحب کی نگرانی میں آگئے اور وہ انھیں بہت چاہنے لگے۔

میر صاحب کو سنگ صاحب کے پاس ملازم ہوئے کوئی تین چار سال ہوئے ہوں گے، ایک دن سر راہ ان کی ملاقات کشمیری زنانہ طائفے کے ڈھاڑی محمد اعظم سے ہو گئی۔ یہ شخص میر صاحب کے نانا کا شناسا تھا۔ میر صاحب کے نانا کی مزاج پرسی اور ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے میر صاحب سے درخواست کی کہ میں نے ایک گویے سے سُن کر کچھ فارسی غزلیں کھرلی ہیں، ممنون ہوں گا اگر آپ میرے خیمہ پر چل کر ان کو درست فرما دیں۔ میر صاحب محمد اعظم کے خیمے پر پہنچے تو یہاں پورے طائفے کے اراکین سے ان کا تعارف ہوا۔ ان میں نیرہ چودہ سال کی ایک نہایت درجہ حسین لڑکی بھی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں میر صاحب اپنا نقد دل اسے نذر کر بیٹھے۔ طائفے اور خاص کر اس لڑکی کے حالات کی جستجو ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس طائفے کا سربراہ کشمیری اعظم جی ہے۔ پہلے تجارت کا پیشہ کرتا تھا اس میں زبردست نقصان ہوا اور دیوالہ نکل گیا تو اس کی داشتہ چنبل جان نے جو قوم کی کسبی تھی ایک طائفہ قائم کر کے ہندوستان کا رُخ کیا۔ اس طائفے میں میرزائی نامی ایک عورت ہے جس کی حیثیت نائکہ کی سی ہے۔ ایک عورت گلبدن ہے اور ایک عورت بنی جان ہے، ان ہی کی کمائی پر طائفے کا گزر ہے۔ کانپور میں مقیم فوج کے کمانڈنگ آفیسر گلی صاحب کی سرکار میں یہ کشمیری طائفہ ملازم ہے اور وہ جو چودہ سال کی لڑکی ہے اس کی داستانِ حیات بھی دلچسپ ہے۔ چنبل جان کی ایک بیٹی صاحب جان اس کے کسی پہلے شوہر سے تھی، صاحب جان کو ایک پٹھان سوار نے نوکر رکھ لیا اور اس کی مرضی کے خلاف اس سے نکاح کر لیا۔ اس سے یہ لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کا نام خانم جان رکھا گیا۔ چند روز بعد پٹھان سوار مر گیا اور صاحب جان اپنی بچی کو لے کر اپنی ماں کے پاس بھاگ آئی اور کچھ دنوں بعد مر گئی۔ اعظم جی کی خود کی

اولاد نہ تھی۔ اس لڑکی کو اس نے اپنی بچی بنا لیا اور اس کی تعلیم و تربیت کا بڑا اہتمام کیا۔ مرزائی کو بھی اس لڑکی سے بہت محبت ہے۔ وہ بھی اسے اپنی بچی کی طرح چاہتی ہے۔ اعظم جی کو اس کا ناچنا گانا پسند نہ تھا لیکن اس کی نانی بھی نائکہ تھی، اس نے اعظم جی کی بات نہ مانی اور اس کو رقص و سرود کی تعلیم دلائی، اس کے باوجود اعظم جی کا خیال ہے کہ کسی شریف آدمی سے اس لڑکی کی شادی کر دی جائے۔ کئی انگریزوں نے اس کی خواہش کی لیکن اعظم جی اور مرزائی نے قبول نہ کیا، ابھی تک وہ پاک دامن اور عفت مآب ہی ہے۔

میر صاحب پہلی ہی ملاقات میں اپنا نقدِ دل ہار چکے تھے، کچھ ایسے گم سم سے کھوئے کھوئے اور بے کل سے رہتے کہ طائفے کے اور لوگوں نے سمجھا کہ میر صاحب پہلے ہی سے دل باختہ ہیں لیکن دل را بہ دل راہ است۔ خانم جان کم عمر سہی لیکن طوائف زادی تھی۔ اس کے اطراف ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ تیوروں سے اندازہ لگا سکتی تھی کہ حضرت کا کیا حال ہے۔ سید حسن شاہ خود بھی خوش رو تھے، نوجوان تھے، بیس اکیس سال سے زیادہ ان کی عمر نہ تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں خانم جان نے بھی میر صاحب کے لیے اپنے دل میں جگہ پائی اور یک گونہ کشش اس نے بھی میر صاحب کی طرف محسوس کی۔

اب میر صاحب کسی نہ کسی بہانے اعظم جی کے یہاں آنے جانے لگے۔ خانم جان سے ان کی دوسری مڈبھیڑ اس وقت ہوئی جب کہ اعظم جی کے یہاں خانم جان کی سالگرہ کا جشن ہو رہا تھا۔ میر صاحب کو بھی اس جشن میں شرکت پر مجبور کیا گیا۔ کھانے کے بعد میر صاحب نے گانے کی فرمائش کی تو پڑھی لکھی، فارسی ادب میں طاق، خانم جان نے کچھ برمحل شعر گائے، ان میں سے ایک غزل تھی ؎

آنچہ دم از دل برد از نالۂ فریاد من است　　وانکہ نسیاں آورد خاصیت یاد من است
آں شکارم من کہ ہم لائق بہ کشتن نیستم　　شرم می آید مرا زانکس کہ صیاد من است

یہ اشعار سن کر میر صاحب حیران رہ گئے کہ پروردگار کس نے اس کے کان میں کہہ دیا کہ میں تم پر مرتا ہوں۔ اس کے بعد پھر گانے کا رنگ جما تو میر صاحب کا دل بھر آیا اور کلیجہ امڈنے لگا۔ بے اختیار آنکھوں میں آنسو جاری ہو گئے اور ہچکیاں بندھ گئیں۔ اس کے بعد اس سخن سنج اور سخن فہم نے خواجہ حافظ کی یہ غزل چھیڑ دی ؎

یارب آں شمع شب افروز ز کاشانۂ کیست　　جانِ ما سوخت نہ پرسید کہ جانانۂ کیست
حالیا خانہ بر انداز دل و دینِ من است　　تا ہم آغوش کہ می باشد و ہم خانۂ کیست

اس شعر کو مکرر سہ کرر گایا ؎

یارب ایں شاہ وش و ماہ رخ و زہرہ جبیں
دُرِ یکتائے کہ و گوہرِ یک دانۂ کیست

اس غزل سے عالم ہی اور ہو گیا، سب کی حالت متغیر تھی اور وہ ستمگر سر جھکائے جس طرح گا رہی تھی ہرگز نہیں اٹھائی تھی اور چند غزلیں گانے کے بعد اس نے یہ شعر گائے ؎

درونِ سینۂ من زخمِ بے نشاں زدۂ　　بہ حیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدۂ
کجا روم بہ کہ گویم و چہ چارہ کنم　　کہ تیرِ عشق مرا در درونِ جاں زدۂ

یہ شعر گاتے گاتے کنکھیوں سے میر صاحب کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور زیرِ لب کچھ کہا اور میر صاحب تڑپ کر رہ گئے۔

اس دوسری ملاقات کے بعد میر صاحب کو یقین ہو گیا کہ جس پر وہ فدا ہیں اس کے دل میں بھی ان کے لیے جگہ موجود ہے۔ میر صاحب کی اس گرفتاری پر ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ محمد اعظم نے راستے میں مل کر میر صاحب کو یہ خبر وحشت اثر سنائی کہ جس انگریز کمانڈنگ آفیسر کی سرکار میں یہ طائفہ ملازم تھا اس کی بدلی کلکتے ہو گئی۔ اس نے طائفے کو جواب دے دیا۔ اب ہم تلاشِ روزگار میں ہیں، میر صاحب کے پاس جا کر گزرہ جاتے ہیں۔ یہ سنتے ہی میر صاحب کے ہوش اڑ گئے۔ کہیں پڑھتے تھے کہ ابنِ اللہ مرحوم کی ایک بیاض میں انھیں "عمل عقد الطریق" نظر آیا۔ حساب کیا تو وہی دن عمل کے واسطے معین تھا اس کو نیک شگون سمجھ کر عمل پڑھا۔ چار روز اسی ہیجان میں گزرے۔ چوتھے دن اپنے خدمت گار کو خبر لانے کے لیے محمد اعظم کے پاس بھیجا تو وہ خود ہی سراسیمہ پریشان چلا آیا۔ اب اسے عمل عقد الطریق کی برکت سمجھیے یا بخت و اتفاق، معلوم ہوا کہ اسی رات گلبدن خانہ خراب کسی انگریز کے ساتھ بھاگ گئی۔ ہر چند تلاش کیا پتہ نہیں چلا۔ اتنے بڑے کارخانے کا دار و مدار اسی کی کمائی پر تھا۔ اب کہاں کا سفر اور کہاں کا قیام۔ اس کے بعد میر صاحب نے کچھ ایسی چال چلی اور کچھ ایسی ترکیبیں کیں کہ منگ صاحب جن کے پاس وہ خود منشی تھے، اس طائفے کو ملازم رکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ امتحان کے طور پر پہلا مجرا ہوا تو آپ بھی اس میں موجود تھے۔ خانم جان سے حافظ کی یہ غزل گانے کی فرمائش کی ؎

حالِ دل با تو گفتنم ہوس است — خبرِ دل شنفتنم ہوس است
طمعِ خام بیں کہ قصہ فاش — از رقیباں نہفتنم ہوس است
شبِ قدرے چنیں عزیز و شریف — با تو تا روز خفتنم ہوس است
آں کہ دُردانۂ چنیں نازک — در شبِ تار سفتنم ہوس است

خانم جان نے میر صاحب کی فرمائش پر یہ غزل تو گا دی لیکن اس کے بعد حافظ ہی کی ایک غزل جواباً گا دی ؎

رسید مژدہ کہ ایامِ غم نخواہد ماند — چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند
غنیمتے شمر اے شمع وصلِ پروانہ — کہ ایں معاملہ تا صبح دم نخواہد ماند
سحر ز ہاتفِ غیبم رسید مژدہ بگوش — کہ کس ہمیشہ گرفتارِ غم نخواہد ماند

صاحب کو اس طائفے کے مردوں کا گانا اور عورتوں کا رقص و سرود بہت پسند آیا اور وہ ان کی سرکار میں ملازم رکھ لیا گیا۔ جب تک گلبدن اس طائفے میں رہی، اعظم جی اور مرزائی نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ خانم جان سے پیشہ کرائیں گے۔ وہ بھاگ گئی تو مجبوراً اس کے لیے راضی ہو گئے۔ میر صاحب نے نوکر رکھانے کو اس طائفے کو منگ صاحب کے پاس نوکر رکھا دیا لیکن دل ہی پیچ و تاب کھاتے رہے کہ اب خانم جان صاحب سے کیسے بچی رہے گی۔ جس دن یہ طائفہ نوکر ہوا اسی رات کو ان حرام خوروں نے معمول کے مطابق خانم جان کو بنا سنوار کر صاحب کے پاس پہنچا دیا۔ وہ چلی تو گئی لیکن جب صاحب نے اس کا قصد کیا تو اس نے شور و بیداد مچائی اور زار و قطار رونا شروع کیا جس سے صاحب کے آنے کے حواس غائب ہو گئے۔ آدھی رات تک یہی حالت رہی۔ آخر مرزائی کو بلا کر کہا کہ جب یہ بی بی راضی نہ تھی تو کیوں تم نے بھیجا۔ ہم کو زبردستی کے ساتھ ضرورت نہیں اور اس وقت بی جان کو بھیج دو۔ خانم جان کی جگہ بی جان بھیج دی گئی اور خانم جان کی ناموس محفوظ رہی۔

اب یہ طائفہ مستقل طور پر صاحب کے بنگلے کے احاطے ہی میں میر صاحب کی قیام گاہ کے سامنے خیمہ لگا کر رہنے لگا۔ پی جان تو مستقل طور پر صاحب کی داشتہ بن گئیں اور خانم جان بھی گانا سنانے، ناچ دکھانے اور اپنی شوخ و شنگ اداؤں سے صاحب کا دل بہلانے کے لیے نوکر رکھ لی گئیں۔

میر صاحب اور خانم جان دونوں برابر کی آگ میں جل رہے تھے۔ اس قرب مکانی نے طائفے کے باورچی کے مکرم بن لڈے رحم اللہ کے ذریعے پہلے زبانی پیام و سلام اور بعد میں باقاعدہ مکاتبت کی صورت پیدا کر دی۔ خیمہ کی قنات میں ایک سوراخ کر کے تاک جھانک اور حسب حال برمحل اور پرسوز اشعار سنانے کا موقع بھی فراہم کر دیا گیا۔ جس قسم کے حالات تھے ان میں اس تعلق کا چھپانا ضروری تھا۔ صاحب آقا تھے اور یہ دونوں ان کی سرکار کے ملازم، طائفے والے حرام خور تھے اور بے درد۔ خانم جان نے انتہائی دانائی اور فراست سے یہ ڈھونگ رچایا کہ وہ میر صاحب کو ناپسند کرتی ہے اور ان سے اسے بغض للّٰہی ہے۔ صاحب کی موجودگی میں وہ میر صاحب پر ایسی ایسی چوٹیں کرتی کہ خود صاحب بہادر کو میر صاحب کی طرفداری کرنی پڑتی اور وہ خانم جان سے کہتے کہ ہمارے منشی صاحب بہت نیک آدمی ہیں، پارسا ہیں، ایماندار ہیں، لائق ہیں، قابل ہیں، ان کے ایسے ہی صفات کی وجہ سے میں ان کا ادب ہی نہیں کرتا بلکہ ان سے ڈرتا ہوں لیکن مجروں میں معاملہ ہی کچھ اور ہوتا۔ میر صاحب کسی دردانگیز غزل کی فرمائش کرتے، وہ خانم جان گا دیتی اور پھر اس کے جواب میں آپ ہی کوئی برمحل غزل چھیڑ دیتی۔ یہ راز و نیاز دونوں میں ہوتے اور اس کی کراماً کاتبین کو بھی خبر نہ ہوتی۔ کبھی کبھار چوٹ کرنے میں رنجش کی نوبت بھی آ جاتی، نامہ و پیام اور قنات کے پاس کھڑے ہو کر تاک جھانک سب بند ہو جاتی لیکن بھرے کی محفلوں میں پھر ایک بار ترجمان غیب کی بہترین غزلیں دونوں کے دلوں کی ترجمانی بنتیں اور پھر دل صاف ہو جاتے۔

ادھر خط و کتابت بھی جاری تھی۔ سید حسن شاہ کے خطوں میں سب سے زیادہ اظہار عاشقی اور "تمنائے وصال" کے سوا اور کچھ نہ ہوتا۔ خانم جان کے خط جو بڑے سلیقے سے لکھے ہوتے ان میں یہی جواب ہوتا ہے کہ چند سے اور صبر کرو میں تمہاری ہو چکی لیکن مجھ پر اسی وقت تصرف کر سکو گے جب کہ قانونی طور پر بھی تم مجھے اپنا لو۔ حرام کاری میری فطرت سے دور ہے۔ اگر یہی مقصود ہوتا تو میں کب کی اپنے جسم کا سودا کر چکی ہوتی۔ اسی درمیان میں خانم جان نے سید حسن شاہ کی محبت کا ایک امتحان بھی لے لیا۔ اس کی نانی کی ہم جولی ہم پیشہ ایک ڈیرے دار رنڈی کی اکلوتی حسین و جمیل بیٹی تھی۔ یہ عورت جو بے حساب روپیہ کما چکی تھی چاہتی تھی کہ اپنی بیٹی کسی مرد شریف سے بیاہ دے۔ خانم جان نے ایک بہانے سے یہ لڑکی میر صاحب کو دکھا دی اور پھر انھیں لکھا کہ چاہو تو اس لڑکی سے تمہارا نکاح کرا دوں۔ میر صاحب نے جب اس سلسلے میں صاف جواب دے دیا تو تب کہیں جا کر ان کی محبت پر اسے بھروسہ ہوا۔

اتفاق دیکھئے چند ہی دنوں بعد اس لڑکی کی مسّی کی رسم ٹھہر گئی۔ اس تقریب میں شریک ہونے کے لیے پورا طائفہ تیاری کرنے لگا۔ عین تقریب کے دن خانم جان نے میر صاحب سے کہا کہ آج اپنا بنگلہ خالی رکھو اور چار شخص مل سکیں تو بہتر ورنہ دو ہی آدمی تجویز کر رکھو۔ دن بھر وہ جو بن بناؤ سنگھار اور کنگھی چوٹی میں مصروف رہی لیکن جب چلنے کا وقت آیا تو انگڑائی لے، لحاف اوڑھ پلنگ پر لیٹ گئی۔ مرزائی نے پوچھا تو کہا ابھی میرے سر میں شدت کا درد ہونے لگا اور اعضا شکنی سی معلوم ہوتی ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے تھم گئے۔ ادھر صاحب تقریب کے پاس سے آدمی پر آدمی آنے لگے۔ مرزائی نے سب کو بھیج دیا۔ آپ رہ گئی لیکن خانم جان نے چار گھڑی رات گئے ہم قومی کا واسطہ دے کر اسے بھی بھیج دیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ میر صاحب کے بنگلے میں آ گئی۔ میر صاحب نے پہلے ہی چار اجنبی

غریب مسلمانوں کو بلوایا تھا اور انھیں کھانا کھلا کر کہلوا لیا تھا کہ یہاں آج ایک شخص کا نکاح ہے اس سے فراغت کرکے آپ کو رخصت کر دوں گا۔ خانم جان آگئی تو ان چار آدمیوں کے سامنے تعین مہر کے بعد میر صاحب نے ایجاب و قبول کے الفاظ کہے اور انھیں کچھ دے دلا کر رخصت کر دیا۔

شب وصل جس لطف سے گزری اس کا احوال تو شیخ حسن شاہ کی زبانی سننا اور قدم بہ قدم جزئیات کے چلتے جو بے غرضی سے پُر عاشقی کی صورت میں ہیں، اصل کتاب ہی میں پڑھنا مناسب ہوگا۔ مختصر یہ کہ میر صاحب کی ہوس رانی نے تو کی نازک اندام خانم جان کو شدت کے بخار میں مبتلا کر دیا اور جو دو ہفتے بیماری کا رہا گیا تھا وہ اسہال کی صورت اختیار کر گیا۔ کسی کو شبہ ہوا نہ کسی کے کانوں کان خبر ہوئی میر صاحب اور خانم جان باقاعدہ میاں بیوی بن گئے۔

عشق است و ہزار بدگمانی تو یہ کہاں محبت کا تقاضا یہ ہوا کہ تھوڑی بہت شکر رنجیاں بھی آپس میں شروع ہو گئیں۔ ہر بار رنجش غیب کی غزلوں ہی کو ترجمانِ دل بنایا گیا۔ ادھر سے ایک غزل کی فرمائش، ادھر اس غزل کا جواب بھی سنا دیا جاتا۔ غرض ترے حریفانہ راز و نیاز کے بعد دل صاف ہوتے۔

پوشیدہ رشتۂ ازدواج کے باوجود خانم جان کو میر صاحب کے پاس پہنچنے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ میر صاحب تو تھوڑی بہت آہ و زاری کے بعد جوانی کی نیند کے مزے لیتے لیکن خانم جان اکثر رات کے پاس کھڑی ہو جاتی اور میر صاحب کو بنگلے کے برآمدے میں سوتا ہوا تکا کرتی۔ ایک بار بارش ہونے لگی۔ میر صاحب جاگے۔ قنات کی طرف نظر کی تو ایسا معلوم ہوا وہاں کوئی کھڑا ہے۔ آپ کی جو حد کا کیا کہنا، پہلا خیال یہی آیا کہ شاید چور ہے۔ طپنچہ تکیے کے نیچے سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ پھر خیال آیا شاید خانم جان ہوں گی، آہستہ سے ایک شعر پڑھا، اُدھر سے جواب آیا ؎

واقف نئی ز دردِ دلِ ناتوانِ من!
اینک بہ لب رسید ز درد تو جانِ من

یہ ٹیک کر دوڑے، خانم جان کو گود میں اٹھا لائے، دیکھا سر سے پیر تک بارش میں بھیگ چکی ہے۔ دانت سے دانت بج رہے ہیں۔ جب ذرا بات کرنے کے قابل ہوئی تو اپنا درد دل رو رو کر سنایا، مستقبل کے اندیشوں کا ذکر ہوا۔ میر صاحب نے بھی کچھ آہ و زاری کی لیکن آخر میں کچھ اور ہی مطالبہ کر بیٹھے۔ یہ سنتے ہی وہ نہایت بدمزہ ہو کر بولی اس قدر بے حیائی کیا ضرور ہے، معلوم ہوتا ہے کہ تم اسی بات کے طالب ہو۔ اگر ایسا ہے تو یہ میری کاہشِ جاں اور سوہانِ روح کا باعث ہے۔ میر صاحب نے جواب دیا اے میری جان! ایں امر خلاصۂ معاملات است۔ اس نے کہا شاید ہو لیکن اس طرح اس کے سبب گریہ اور خندۂ ہوس پیشگان صاحبانِ لطافت مزاج و خوش طبعاں بر ذائقش نہایت ناپسند و ناگوار است۔ میر صاحب نے جواب دیا کہ اپنا تو یہ عقیدہ ہے کہ ؎

گذشتہ خواب و آئندہ خیال است
غنیمت دان ہمیں دم را کہ حال است

جواب دیا کہ ہاں ؏

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

سو گردشِ فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا۔ قریب قریب ایک سال اس طائفے کو منگ صاحب کی خدمت میں بسر ہو چکا تھا۔ خانم جان اور میر صاحب کے ذہنوں میں ابھی اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی خاکہ پوری طرح سمجھنے نہ پایا تھا کہ یک بیک خبر آئی کہ منگ صاحب کی بدلی کانپور سے کلکتہ ہو گئی۔ منگ صاحب نے طائفے کا حساب کتاب کر کے بی جان، خانم جان وغیرہ سب کو انعام اکرام دے دلا کر طائفے کو موقوف کر دیا اور کلکتے جانے کی تیاری کرنے لگے۔ ان دنوں میر صاحب اور خانم جان پر جو کچھ گزری ہے اس کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جن پر ایسی واردات گزری ہو۔ رو رو کر دونوں کا برا حال تھا اور کوئی تدبیر سوجھتی ہی نہ تھی۔ آخر بی جان نے پھر یہی کیا کہ ہوبلر صاحب کے پاس چنار گڑھ چلنا چاہئے کہ اس سے پہلے بھی بی جان انہی صاحب سے وابستہ رہ چکی تھی۔ خانم جان کا یہ اندیشہ درست تھا کہ یہاں تو وہ منگ صاحب کی شرافت کی وجہ سے بچ گئی، ہر شخص منگ صاحب نہیں ہوتا۔ یہ جام خود اسے کسب پہ مجبور کر دیں تو کیا ہوگا۔ میر صاحب نے خانم جان کو لے بھاگنے کا ارادہ کیا۔ وقت پر گھوڑے سے منشا اور اس کی عملی صورت بھی نکلی۔ ادھر طائفہ نے چنار گڑھ جانے کے لیے کشتی تلاش کرنی شروع کر دی۔ اب میر صاحب نے یہ تدبیر سوچی کہ طائفہ کی بڑی کشتی کے روانہ ہونے کے کچھ دیر بعد یہ اس کے پیچھے ایک چھوٹی سی تیز رفتار کشتی لے کر روانہ ہو جائیں، جیسے ہی موقع ملے، خانم جان بڑی کشتی سے میر صاحب کی کشتی میں منتقل ہو جائیں۔ دریائی سفر میں طائفہ کو پیچھا کرنے میں بہت دشواری پیش آئے گی۔ یہ تجویز پکی ہو گئی اور میر صاحب نے ایک کشتی بھی کرایہ پر لے لی۔ آخری بار جو مجرا ہوا اس میں خانم جان نے ایسی ایسی پرسوز غزلیں گائیں کہ مجلس کی حالت متغیر ہو گئی۔ ؎

ما برفتیم تو دانی و دلِ غمخورِ ما — بخت بد تا بہ کجا می برد آبشخورِ ما
بدعا آمدہ ام ہم بدعا دست برآر — کہ وفا با تو قرین باد و خدا یاورِ ما
بسرت گر ہمہ عالم بسرم جمع شوند — نتواں برد ہوائے تو بروں از سرِ ما
فلک آوارہ بہر سو کندم می دانی — رشک می آیدش از صحبتِ جاں پرورِ ما

گر بپرسد کہ کجا رفت ازیں جا حافظ
گو بزاری سفرے کرد و برفت از برِ ما

سب کی حالت قابلِ بیان نہیں، حد یہ کہ ہر موقع پر ضبط و تحمل سے کام لینے والی خانم جان بھی بھی کھول کر زار زار روئی اور پھر یہ غزل شروع کی ؎

فاش می گویم و از گفتۂ خود دلشادم — بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم
طائرِ گلشنِ قدسم چہ دہم شرحِ فراق — کہ دریں دامگہ حادثہ چوں افتادم
من ملک بودم و فردوسِ بریں جایم بود — آدم آورد دریں دیرِ خراب آبادم
کوکبِ بختِ مرا ہیچ منجم نشناخت — یا رب از مادرِ گیتی بچہ طالع زادم

اس شعر پر سب بے قرار ہو گئے اور بار بار گاتی تھی اور اگلا شعر بھی تکرار کیا ؎

می خورد خونِ دلم مردمکِ چشم سزاست — کہ چرا دل بہ جگر گوشۂ مردم دادم

پھر ایک آہ سرد کھینچی اور کہا، ہائے میری مٹی خراب ہوتی، کاش میں پیدا ہی نہ ہوتی!

اِدھر قسمت کی گردش دیکھیے، منگ صاحب نے میر صاحب کو بلا کر کہا کہ پانچ مہینے سے حساب نہیں ہوا ہے، بعد کو منتقلی درپیش ہے اس لیے مہاجنوں کا چکوتہ جلد کر دینا چاہیے۔ حکم حاکم مرگِ مفاجات۔ میر صاحب نے دن رات بیٹھ کر حساب کتاب درست کیا اور کاغذات صاحب کے ملاحظے میں پیش کر دیے۔ جس دن طائفہ چارگڑھ کے لیے رخصت ہونے والا تھا اس دن صاحب کو کسی وجہ سے فرصت نہ تھی، انھوں نے کاغذات نہ دیکھے اور کہا کل دیکھیں گے۔ یعنی کہ میر صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ پھر سوچا ایک دو روز میں طائفے کی کشتی زیادہ سے زیادہ تیس پینتیس میل جا سکے گی۔ میری کشتی چھوٹی ہے، بڑی کشتی سے چارگڑھ پہنچتے پہنچتے میں اس کو جا لوں گا۔ مختصر اسی روز طائفہ رخصت ہوا، رخصتی کا منظر روزِ حشر سے کم نہ تھا۔ طائفہ کا کوئی آدمی ایسا نہ تھا جو دھاڑیں مار کر نہ روتا تھا۔ میر صاحب بھی روتے روتے نڈھال تھے لیکن خانم جان کا عجیب حال تھا۔ ایک سکوت کے عالم میں تھی۔ نہ آنکھوں میں آنسو تھا نہ لب پر کلام مگر چہرے پر ہوائیاں اڑی تھیں۔ ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا مگر وہ رے ضبط اگر ہونٹ ہل جائیں تو ہونٹ کاٹ کر پھینک دے۔ اگر زبان سے اُف نکلے تو زبان کھینچ ڈالے۔ پیشانی پر شکن نہیں، چہرہ بے رونق ہے۔ سب اٹھ کر چلنے لگے تو میر صاحب نے بھی تھوڑی دور مشایعت کی۔ آخر مرزائی نے میر صاحب کے ہاتھ چومے، ہر شخص انتہائی رنج و ملال کے ساتھ میر صاحب سے رخصت ہونے لگا۔ روتے روتے ہر ایک کی ہچکیاں بندھی تھیں۔ کوئی اپنے ہوش میں نہ تھا مگر وہ متحمل مزاج، وہ مستقل طبع، وہ دل کے مرض کو روک لینے والی خانم جان اسی طرح مبہوت، چپ، خود فراموشی کے عالم میں نہ روتی تھی نہ کوئی لفظ کہتی تھی، ہاں جب سلام کر کے آگے بڑھی تو میر صاحب کے نزدیک سے ہو کے نکلی اور یہ مصرع آہستہ سے پڑھا گئی

ما برفتیم تو دانی و دلِ غم خورِ ما!

اعظم جی کا طائفہ تو کشتی میں سوار ہو کر روانہ ہو گیا، لیکن اس کے روانہ ہونے کے چار روز بعد تک بھی حساب فہمی سے میر صاحب کو چھٹکارا نصیب نہ ہوا۔ مجبوراً صاحب سے آٹھ دن کی مہلت لے کر ان سے چھوٹتے ہوئے تیز رفتاری سے کشتی میں بیٹھ کر چارگڑھ کی طرف روانہ ہو گئے۔ کڑا مانک پور کے آگے انھیں دورا ملا۔ یہ سیدھے آگے بڑھ گئے اور نہایت تیز رفتاری سے الہ آباد پہنچ گئے لیکن کہیں بھی اس بڑی کشتی کا پتہ نہ چلا۔ ملاحوں نے کہا کہ چاہے کوئی کشتی کتنی ہی تیز رفتار ہو، اتنی مدت میں ہم سے آگے الہ آباد نہیں پہنچ سکتی۔ معلوم ہوتا ہے وہ کشتی دورا سے دوسرے راستے پر چلی گئی۔ میر صاحب مایوس اور نامراد لوٹ آئے۔

کانپور آ کر میر صاحب نے باقی حساب تیار کرنا شروع کیا۔ آگے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ چارگڑھ سے ہولیر صاحب کی چٹھی منگ صاحب کے نام آئی کہ اعظم جی کا طائفہ یہاں پہنچ گیا اور میں نے بی جان کو نوکر رکھ لیا لیکن اعظم جی کی بیٹی خانم جان کو یہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی۔ وہ یہاں آتے ہی بیمار پڑ گئی، اس کے علاج کے لیے یہ لوگ اسے لکھنؤ لے گئے ہیں۔ یہ اطلاع پا کر میر صاحب ایک ہرکارے کو لکھنؤ بھیجنا ہی چاہتے تھے کہ صاحب کے نام ایک عرضی اور میر صاحب کے نام ایک خط مرزائی کا پہنچا کہ کانپور سے نکلتے ہی راستے میں خانم جان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ چنار گڑھ پہنچ کر حالت بگڑ گئی، علاج کے لیے اسے ہم لکھنؤ لے جا رہے ہیں۔ اس سے پہلے میر صاحب کے نانا نے اس کا علاج کیا تھا اس سے اسے صحت ہوئی تھی۔ اب بھی بار بار وہ یہی کہتی ہے کہ بڑے حکیم صاحب کے علاج سے مجھے صحت ہو جائے گی، اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ بڑے حکیم صاحب کو کسی طرح میر صاحب کے ہمراہ لکھنؤ روانہ فرمانے کا انتظام فرمائیں۔ میر صاحب نے اپنے نانا کو لے کر لکھنؤ جانے کا

تیاری شروع کی تو صاحب نے، حذنت تو دے دی لیکن حساب فہمی کے بغیر جانے سے منع کیا۔ ادھر وہ معاملات حساب صاف کرنے میں کھو گئے اور ادھر یہ دن نکلتے رہے۔ حساب فہمی سے فراغت ہوئی تو نانا صاحب نے احرام سفر باندھتے ہیں اور کہیں دن نکالے مختصر یہ کہ جب وہ لکھنؤ پہنچے ہیں، حد درجہ حساس اور ضابطہ خانم جان فراق کے جان گداز صدمے اٹھا کر اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر چکی تھی۔ یہاں بار رچی کے لڑکے نے میر صاحب کو خانم جان کا وہ خط دیا جو اس نے مرنے سے ایک روز پہلے لکھ کر اسے دیا تھا۔ اس میں شرح فراق کے بعد وصیت کی تھی کہ میری امیدیں تو بر آتی نظر نہیں آتی، میرے بعد تم میرا غم نہ کرنا اور میرے غم میں اپنے آپ کو ہلاک نہ کرنا۔ پھر اپنی محبت کی سوگند دی تھی کہ اپنی صحت کا خیال رکھنا کہ اسی میں میری خوشی ہے۔ میر صاحب بہت روئے پیٹے، چیخے چلائے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، ناچار کلیجے پر صبر کا پتھر رکھ کر اپنی محبوبہ کی وصیت کی تعمیل کرتے ہوئے اپنی زندگی کے باقی دن گزارنے لگے۔

خلاصہ پھر خلاصہ ہی ہے۔ اس میں اصل کا لطف کہاں؟ اس پر کج مج بیانی اپنی! اندیشہ ہی نہیں یقین ہے کہ اس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ہوگی۔ لیکن اردو ادب کے اس شہ پارے کو متعارف کرانے کی اور کوئی صورت بھی تو اس کج مج بیاں کو نظر نہیں آئی۔

اس ناول میں یوں تو کئی کردار ہیں لیکن اہم کردار تین ہی ہیں، منگ صاحب، میر صاحب اور خانم جان اور ان ہی کے گرد یہ پورا قصہ گھوم رہا ہے۔

سب سے پہلے منگ صاحب ہی کو لیجئے۔ آدمی عیاش بھی، اوباش بھی لیکن اس کے شریف ہونے میں کیا کلام ہے اور یہ بھی تو دیکھئے کہ اس وقت کی ہماری اونچی سوسائٹی میں یہ عیب عیب کب سمجھا جاتا تھا، یہ تو عین صاحب امارت، مہذب اور شائستہ ہونے کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ ہمارے چھوٹے بڑے سب امیر اسی قسم کے مشغلوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ بیچارہ تو ان ہی لوگوں کی نقالی کر رہا تھا لیکن اس کی یہ شرافت تو کسی طرح بھلائے نہیں بھولتی کہ خانم جان کے ہر طرح اس کے قبضہ و اختیار میں ہونے پر بھی اس نے زور اور زبردستی کا سلوک اس سے روا نہ رکھا بلکہ اس کے جذبات اور احساسات کا پورا پورا احترام کیا۔ اسے بھی دوسری عورت کے برابر تنخواہ دے کر صرف اس کی شوخ و شنگ اداؤں اور بے نظیر ذہانت و ذکاوت ہی سے جی بہلانے پر اکتفا کیا۔ بعض بدگمان طبائع کی طرح شاید آپ بھی اس واقعہ پر شبہ کا اظہار کریں، اسی لیے منشی سجاد حسین نے بحیثیت مترجم اس واقعہ پر نوٹ لکھنا ضروری سمجھا کہ:۔

"ایک صاحب نے مجھ سے یہ کتاب لے کے دیکھی، بہت محظوظ ہوئے اور خانم جان
کی بہت تعریف کی۔ اس کے بعد تعجب سے فرمانے لگے، منگ صاحب نے خانم جان
کو چھوڑ دیا ہوگا اور وہ عاصمہ رہی ہوگی؟ میں نے کہا، وہم کا علاج تو لقمان کے پاس بھی نہیں۔"

پھر اسی واقعہ کا مقابلہ ہمارے حاکموں، رئیسوں، فاتحوں اور مہاجنوں کی ہوس رانیوں کی ہولناک داستانوں سے کیجئے۔

دیکھیں جاتے، قریب قریب اسی عہد کی ایک سوانحی "مجاہد" اور "رحمۃ اللہ علیہ" اور "انار اقدس" پڑھ سکتے۔ حاشیہ نگاروں کے ساتھ یاد کی جانے والی ایک تاریخی شخصیت کے طرزِ عمل سے سمجھیے اور اس پر بھی اپنے "مشرقی" اخلاق اور کردار کے مدح خواں بنیے۔
محمد شاہ رنگیلے کی ایک لڑکی تھی حضرت بیگم، حسن و جمال میں ڈھونڈے سے اس کا ثانی نظر نہ آتا تھا۔ اس کی سولہ سال کی عمر تھی کہ عالمگیر ثانی نے ساٹھ سال کی عمر میں اس سے زبردستی شادی کرنی چاہی لیکن اس نے صاف انکار کیا اور زیادہ دق کرنے پر زہر کھا لینے کی دھمکی دی۔ اس پر خفا ہو کر عالمگیر ثانی نے اسے قید تنہائی میں ڈلوا دیا۔ ابھی وہ قید تنہائی کی سزا بھگت ہی رہی تھی کہ احمد شاہ ابدالی قہر خداوندی کی صورت میں دلی پر نازل ہوا۔ امرا اور رعایا کو طرح طرح کی اذیتیں دے دے کر ان کا مال و منال ان سے چھیننے کے سوا ان مجاہد اور غازی صاحب نے ڈھونڈھ کر ان کی حسین بہو بیٹیاں بھی ان سے چھینیں۔ ان میں حضرت بیگم بھی پکڑی ہوئی آئی۔ ساٹھ سالہ عالمگیر ثانی میں انسانیت کی اتنی خو بو باقی تھی کہ اس نے حضرت بیگم کے انکار پر اسے قید میں ڈلوا دیا لیکن ۶۵ سالہ مجاہد صاحب پر اس کی آہ و زاری کا ذرا بھی اثر نہ ہوا اور آپ نے حضرت بیگم سے نکاح پڑھوا ہی لیا!

اپنے ملازموں سے ٹنگ صاحب کا سلوک بھی مثالی ہے۔ میر صاحب اس کے خانگی تنخواہ یاب ملازم ہیں لیکن وہ ان سے برابری کا سلوک کرتا ہے۔ عیش و طرب کی محفل ہو کہ کاروبار کی مجلس انھیں ہمیشہ اپنے برابر کرسی دیتا ہے۔ وہ میر صاحب کی شرافت، ایمان داری اور سلیقہ مندی کا معترف اور دل سے ان کا قدر دان ہے۔ وہ بڑے ظرف کا آدمی ہے اسے اپنی داشتہ اور ملازم عورتوں کے سامنے یہ کہتے بھی باک نہیں کہ میر منشی صاحب میرے سچے خیر خواہ ہیں۔ وہ بہت زیادہ لائق ہیں اور صد درجہ پاکباز ہیں۔ میں ان کی ان ہی صفات کی بنا پر ان سے ڈرتا ہوں۔ حالانکہ عام طور پر کم ظرف آدمی اس قسم کی عورتوں کی موجودگی میں پھیل کر ایسے پھیلتے اور پیر پھیلاتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ خوش طبعی اور ظرافت ٹنگ صاحب کی طبیعت کا ایک بڑا وصف ہے۔ وہ اپنے ملازمین سے برابری کی چوہلیں اور چہلیں کرتا ہے۔ ٹنگ صاحب کے بعد آنے والے انگریزوں سے اس شریف انگریز کے برتاؤ کا مقابلہ کیجیے جو ہندوستانیوں کو منہ لگانا گوارا نہ کرتے تھے اور ان سے میل جول کو اپنے لیے عار سمجھتے تھے اسی لیے منشی سجاد حسین بحیثیت مترجم ایک فٹ نوٹ میں بے اختیار اس کو خراج تحسین ادا کر گئے ہیں:۔

> ”حسن شاہ اور خانم جان تو صاحب معاملہ تھے مگر صاحب بہادر بڑے مسخرے تھے۔ جہاں دیکھو ٹپکے پڑتے ہیں۔ افسوس اب ایسے انگریز نہیں آتے ورنہ ہم بھی بتا دیتے۔“

ٹنگ صاحب بڑے دل کا آدمی ہے شاہ خرچ ہے، فیاض ہے، وہ روپے پیسے کو جوڑ رکھنے والا حریص آدمی نہیں، انسان دوست اور انسانیت نواز آدمی ہے۔

ٹنگ صاحب اس وقت کی سب سے مقبول ہندوستانی زبان اردو میں نہایت روانی کے ساتھ گفتگو کرتا ہی تھا لیکن اس کے سوا اسے فارسی زبان اور فارسی ادب پر بھی اچھا خاصا عبور حاصل تھا۔

اب ناول کے ہیرو سید حسن شاہ کو لیجیے۔ سید زادے ہیں، میر صاحب کہلاتے ہیں، اپنے زمانے کے لحاظ سے اچھے خاصے تعلیم یافتہ ہیں۔ انھیں سچ مچ خانم جان سے محبت ہے لیکن ان کی محبت کے تصور میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ لاکھ پاکباز سہی پھر بھی

محبت کے بارے میں ان کا تصور جسمانی اتصال اور مادی وصال سے آگے نہیں بڑھتا۔ انھیں ہوس کار تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ہوش ان کی محبت، حال نہیں۔ محبت وہ بے شک کرتے ہیں لیکن بے محابا محبت اور اس راہ میں اپنی متاع عقل و دین لٹانے کی لذت سے وہ ناآشنا ہیں۔ بقول مرزا انیاز فتح پوری :-

"نشتر اور نہر عشق دونوں کے مطالعے کے بعد صرف یہی نہیں ہوا کہ میں اشک بار ہو کر رہ گیا ہوں بلکہ اس کے ساتھ غصہ کی بھی کیفیت مجھ پر طاری ہوئی اور ان کے مصنفوں کو میں نے بہت برا بھلا کہا کیونکہ ان دونوں کے ہیرو قریب قریب ایک ہی قسم کے کند جس رکھنے والے ہیں۔ . . . . ناول نشتر میں جب ہیروئن نے جان دی تو ہیرو بھی بہت متاثر ہوا۔ لیکن یہ تاثر اس سے زیادہ نہ تھا کہ جب حضرت قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے اور اتفاق سے ان کا جوتا گڑھے میں گر گیا تو ان کو سب سے پہلے یہ فکر لاحق ہوئی کہ یہاں سے ننگے پاؤں کیونکر جاؤں گا اور آخر کار ایک رستمانہ عزم کے ساتھ انھوں نے جوتا نکال کر اس مہم کو سر کر ہی لیا۔"

سید حسن شاہ معمولی سوجھ بوجھ کے آدمی ہیں۔ ذکاوت اور ذہانت میں وہ خانم جان کے پاؤں پاسنگ بھی نہیں۔ مرگ صاحب کی موجودگی میں خانم جان نے جیسی خوب صورت شوخیاں کی ہیں ان کے جواب میں میر صاحب کی بھونڈی حرکتیں دیکھ کر ان کی عقل و دانش پر رونے کو جی چاہتا ہے۔ کتاب میں انھوں نے اپنے وہ خط بھی درج کیے ہیں جو انھوں نے خانم جان کے نام لکھے تھے۔ غالب کی زبان میں یہ خط محمد شاہی رسم مکتوب نگاری کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔ وہی گز گز بھر کے پُرتکلف آداب و القاب اور وہی مقصد مکتوب سے دور پُرتصنع مضمون آرائی۔

سید حسن شاہ اور خانم جان کے کردار کا یہ فرق بھی بھلایا نہیں جا سکتا کہ سید حسن شاہ نے سید زادہ ہونے کے باوجود، لاکھ پس و پیش کے ساتھ سہی، اپنی محبوبہ کو صاحب کے نذر کرنے سے دریغ نہیں کیا اور خانم جان نے باوجود طوائف زادی ہونے کے اپنی عزت و آبرو اور اپنی عفت و عصمت کو بچانے میں اپنی حد تک کوئی کسر اٹھا نہ رکھی!

خانم جان طوائف زادی سہی لیکن عفت و عصمت کے معاملے میں پوری شریف زادی ہے۔ ہر جائی ہونا تو ایک طرف رہا، محبت کے بارے میں اس کا تصور نہایت درجہ اونچا اور پاکیزہ ہے۔ اس کی محبت میں گہرائی ہے، دردمندی ہے، سوز ہے، تڑپ ہے۔ اس کے نزدیک محبت صرف جسمانی اتصال اور مادی وصال کا نام نہیں، روحانی اتحاد اور دلی ملاپ کا نام ہے — سید حسن شاہ کی محبت اور اپنی محبت کے فرق کو وہ بھی محسوس کرتی ہے اور اس پر اپنا کلیجہ مسوس کر رہ جاتی ہے۔ وہ جتنی صورت شکل کی حسین و جمیل ہے، اتنی ہی ذکی اور ذہین بھی ہے۔ اسی ذکاوت اور ذہانت کا نتیجہ اس کی بے پناہ شوخی اور پر لطف شرارت ہے۔ وہ بے محابا محبت کرنا بھی جانتی ہے اور حد درجہ ضبط و تحمل سے کام لینا بھی اسے آتا ہے۔ وہ بے انتہا حساس بھی واقع ہوئی ہے، اور اسی زود حسی نے آخر کار اس کی جان پر بنا دی۔ طبیعت عشق کی خوددار بھی ہے، خانم جان محبت کی آگ میں سراپا جلنے کے باوجود بہت خوددار بھی ہے۔ اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوتی جس سے اس کی محبت کی رسوائی ہو۔ حد یہ ہے کہ اسے اپنے محسب اور محبوب

کی بھی کوئی ایسی حرکت گوارا نہیں ہوتی جس سے اس کی محبت کی توہین ہوتی ہو۔

خانم جان شعر و سخن کا بڑا اچھا مذاق رکھتی ہے۔ وہ برمحل اتنے اچھے شعر پڑھتی اور ایسی اچھی غزلیں گاتی ہے کہ اس کے اس پاکیزہ ادبی ذوق پر بھی رشک پیدا ہو جاتا ہے۔ دیوانِ حافظ کی تو وہ گویا حافظ ہے۔ بعض موقعوں پر اس نے اتنی برمحل غزلیں منتخب کی ہیں گویا وہ غزلیں اسی موقع کے لیے لکھی گئی تھیں۔ میر صاحب کے خطوط کے مقابلے میں اس کے خطوط رسمی تکلف سے عاری ہیں۔ ان خطوط کے القاب و آداب مختصر مگر بڑے جاندار ہیں۔ ان میں کسی رسمی تکلف اور ہیر پھیر کے بغیر راست حرفِ مطلب زبانِ قلم پر آتا ہے۔ خانم جان کے خطوں کے ایک ایک لفظ سے لکھنے والے کا خلوص، اس کے جذبے کی گہرائی اور اس کی دردمندی جھلک پڑتی ہے۔ القاب کے اختصار اور راست مطلب نگاری کے لحاظ سے غالب کے خطوط سے یہ خط بہت ملتے جلتے ہیں۔

مختصر یہ کہ خانم جان ہر طرح محبت کرنے اور جان چھڑکنے کے قابل کردار ہے۔ سید حسن شاہ خوش بخت تھے جو ایسی پیاری شخصیت کو چاہنے اور اس سے چاہے جانے کی سعادت سے سرفراز ہوئے۔

اس مضمون کی ابتدا میں صاحب "نشتر" پر جناب محمد علی صدیقی کے مضمون کا ذکر آ چکا ہے۔ اس میں اور سب باتیں تو ٹھیک ہیں لیکن نشتر کی ادبی قدر و قیمت کے تعین میں صدیقی صاحب نے سخت ناانصافی سے کام لیا ہے اور لکھ دیا ہے کہ "ناول کے موجودہ معیار پر ہمیں "نشتر" کو نہیں پرکھنا چاہیے بلکہ ایک عشقیہ قصہ سمجھ کر وقت گزاری کے لیے پڑھنا چاہیے۔" آپ اس ناول پر جناب نیاز فتح پوری کی اشک باری دیکھ چکے اب عزیز احمد کی رائے ملاحظہ فرمائیے جو بڑی حد تک اس ناانصافی کی تلافی کر دیتی ہے۔ عزیز احمد اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں لکھتے ہیں:-

> "...... نشتر ایک تماش بین کی سرگذشت ہے جو غالباً میر تقی میر کا ہم عصر تھا اور جس نے فارسی میں اپنی حیاتِ معاشقہ کے متعلق یہ بے مثل کتاب لکھی۔ سجاد حسین کسمنڈوی نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ معلوم نہیں اصل فارسی کتاب کہیں باقی بھی ہے یا نہیں لیکن اُردو ترجمہ اُردو کے چند بہترین ناولوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے اور اس صنف کے بہترین مغربی ناولوں کے مقابل پیش کیا جا سکتا ہے۔ نقطۂ نظر تماش بین کا ہے لیکن اپنی نفسیاتِ عشق، اپنے والہانہ جذبے کے بیان میں مصنف نے کمال کر دیا ہے۔ قصہ کی ٹریجڈی، ورتھر کی "داستانِ غم" سے کم پُر اثر نہیں۔ تفصیلات ایک ایسی زندگی پر سے پردہ اٹھاتی ہیں جو اگر ناول نہ لکھا جاتا تو شاید ہمیشہ فراموش اور نامعلوم رہتی۔ انگریزی قبضے کے ابتدائی زمانے میں شریف انگریزوں کی نوکر پیشہ دار طوائفوں دونوں طبقوں کا ادبی ذوق، حافظ کی غزلوں کا زندگی پر اثر، کوئی اور کتاب اس زمانے کی زندگی کے اس پہلو پر روشنی نہیں ڈالتی اور اس پس منظر سے مصنف اور خانم جان کے پوشیدہ اور والہانہ عشق کا جو قصہ اُبھرتا ہے، وہ دنیا کے افسانہ کے چند بہترین قصوں میں سے ہے۔"

حیدرآباد کے مزاح اور طنز نگار

نصیر الدین ہاشمی

اُردو زبان میں مزاح اور طنز نگاری کا آغاز نظیر اکبرآبادی اور غالب سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اخبار اودھ پنچ کے مضمون نگار اس شعبۂ ادب کے امام نظر آتے ہیں۔ اگرچہ اس سے پہلے بعض ہجوگو ایسے گزرے ہیں جن کو اس شعبہ میں منسلک کیا جاسکتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ عصر حاضر میں ادب کی اس شاخ نے ترقی کے جو مدارج طے کیے ہیں اس کو مغربی ادب کا رہین منت قرار دیا جاتا ہے۔

اُردو زبان کے مزاحیہ نگاروں پر تبصرہ کرنا آسان نہیں ہے۔ اُردو کی عمومی تاریخ سے قطع نظر جس طرح صوبہ وار تاریخیں دکن میں اُردو، پنجاب میں اُردو، مدراس میں اُردو، گجرات میں اُردو، بنگال میں اُردو، بہار میں اُردو زبان اور ادب کا ارتقاء وغیرہ لکھی گئی ہیں اسی طرح مزاحیہ نگاری کو بھی صوبہ کے لحاظ سے تقسیم کرنا چاہیے اس لیے یہاں ہم حیدرآباد (آندھرا) کے مزاحیہ نگاروں کا مختصر تذکرہ لکھتے ہیں۔

حیدرآباد میں مزاح اور طنز کا آغاز بھی ہجوگوئی سے ہوا ہے قطب شاہی دور سے قطع نظر آصفی دور میں کئی شاعر ہجوگوئی کے لیے مشہور ہیں مگر ہم ان کا تذکرہ نہیں کریں گے کیونکہ ان کا مقصد محض ہجوگوئی تھا طنز اور مزاح نہیں تھا۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد آئے اور مہاراجہ سرکشن پرشاد کے متوسل ہوئے۔ ماہوار رسالہ دبدبۂ آصفی کے ایڈیٹر بنے۔ حیدرآباد ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی چند تصانیف یہاں بھی   ہوئیں اس لیے سرشار کو اس شعبہ کا اولین معمار تسلیم کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

جدید دور کے پیش رو عظمت اللہ خاں مرحوم مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم ہیں ان کے ساتھ اور بعد کئی اصحاب اس زمرہ میں شامل ہیں۔ ہم یکے بعد دیگرے ان کا مختصر تعارف کراتے ہیں۔

(۱) عظمت اللہ خان

عظمت اللہ خاں پانچ سال کی عمر میں حیدرآباد آئے۔ یہاں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ علی گڈھ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری لی اور مددگار ناظم تعلیمات پر تقرر ہوا اور ۱۳۴۶ھ میں جوانی میں دنیا سے چل بسے۔ جس طرح عظمت اللہ خاں جوان تھے اسی طرح ان کے ادبی کارنامے بھی جوان ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ ادیب اور شاعر تھے۔ نثر اور نظم دونوں کی خدمت کی۔ مزاحیہ نگاری میں ان کو حیدرآباد کا اولین معمار قرار دینا چاہیے۔ انھوں نے سدا بہار پھول لگائے ہیں۔ انھوں نے اُردو شاعری کے لیے ہندی بحریں استعمال کرکے ایک جدت پیدا کر دی۔

نثر میں تنقیدی مضامین لکھے اور ادبی تحقیق فرمائی۔ اس کے ساتھ ہی مزاحیہ طرز پہ مضامین لکھے۔ عظمت اللہ خاں کے مضامین سنجیدہ ادب میں شامل ہیں۔ سنجیدہ حاشیے اس کے پڑھنے سے قہقہہ نہیں آتا بلکہ تبسم کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ انھوں نے سیاسی، معاشرتی اور سماجی و معاشی موضوعات کو اپنی مزاحیہ نگاری کا میدان بنایا تھا۔ سنجیدہ، دلکش، پرشگفتہ انداز میں خیال آرائی کی۔ خان صاحب نے اپنی نثر نگاری سے اردو نثر میں ایک نئی طرز کی بنیاد رکھی اور رواج بھی ڈالی۔ خان صاحب کی مزاحیہ نگاری کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

> "اچھا اب ہم الٹا اکٹھا کر لیتے ہیں میاں نتھا خان کی دلہن آئیں، میاں مسئلہ کی چوٹ بڑھ گئیں۔ کیا کریں مجبور تھے، مسہری کے بے حس و بے جان اٹھنے کرنے کے لیے بیٹھا دیا کر روند و بچھونا پڑا۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ ایسی بہو بیاہ لائیں جو بیٹے کی دلہن کہلانے کو مسہری کے پارلیمنٹ سے کوسوں رہے مگر یہ ناممکن۔ بھابھی بیٹے کی شادی کو شکر نہ کریں۔ اس کے گھر کا آباد ہونا، اس کا سہرا دیکھنا اور پوتے کو گود میں کھلانا ہی بے چاری بڑی بی بی کا اب رہا سہارا تھا۔ غرض صبر و شکر کرکے رات کاٹی اور ان ہی بیٹیوں اور صاحب جامع منطقی سے حملہ اور مدافعت کا مشورہ کیا۔ صبح ہی گھر پہ کشتی و نیز اقوال سے کارگر اصول پہ بیٹیر مہمی شروع کر دی جائے۔"

(۲) مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا صاحب کے خاندان کے افراد مدتوں سے حیدرآباد میں تھے۔ مرزا صاحب ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد آئے اور اولاً سررشتۂ تعلیمات میں مدرس مقرر ہوئے پھر سررشتۂ عدالت میں تبدیل ہو گئے۔ منصف (مجسٹریٹ)، ناظم عدالت، سیشن جج اور انسپکٹنگ افسری کی خدمات نیک نامی سے انجام دے کر وظیفہ حاصل کیا۔ ملازمت کے زمانہ میں کئی عدالتی کمیٹیوں پر مامور کیے گئے۔ ملازمت اور وظیفت کے بعد سینکڑوں مضامین لکھے جن کے سات مجموعے خود شائع کیے اور شاعری کی ایک پمفلٹ شائع کر دی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اولاً مرزا الم نشرح کے نام سے مضمون لکھتے رہے جو ایک تجارتی اور ادبی رسالہ میں شائع ہوتے تھے۔ یہ رسالہ ان کے قریبی عزیز حیدرآباد سے شائع کرتے تھے۔ اس کے بعد جب رسالہ اردو میں ان کا مضمون مولانا نذیر احمد کے متعلق شائع ہوا تو پھر ان کے مضامین کی دھوم مچ گئی۔ اردو کا ہر ایک رسالہ ان سے مضامین طلب کرنے لگا۔ مضامین بھی لکھے اور ان کے مجموعے بھی شائع کیے۔

بعض اصحاب مرزا فرحت اللہ بیگ کا مقابلہ رشید احمد صاحب اور پطرس اور عظیم بیگ چغتائی سے کرتے ہیں۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو واضح ہوگا کہ پطرس کی مزاحیہ نگاری میں ذہنیت تو بلند نظر آتی ہے مگر زبان کی سلاست، روانی، شادابی اور فنکاری کے لحاظ سے مرزا صاحب کو ترجیح دینا ناگزیر ہے۔ رشید احمد صاحب کے مضامین میں تصنع اور آورد نظر آتی ہے۔ مرزا صاحب کے تمام مضامین آمد کا پتہ دیتے ہیں۔ ان میں تصنع نہیں ہوتا۔ مرزا صاحب کے مضامین میں متانت، شائستگی اور خوش مذاقی پائی جاتی ہے ان سے انبساط اور ذہنی بشاشت حاصل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر مولانا عبدالحق صاحب نے مرزا فرحت اللہ بیگ کے متعلق جو خیالات ظاہر کیے ہیں اس میں وہ صراحت کرتے ہیں:۔

"مرزا فرحت اللہ بیگ کا طرزِ تحریر بھی ان کی طبیعت سے ملتا جلتا ہے۔ بیان سادہ ہے، تصنع نام کو نہیں، ٹھیٹھ دلی کی زبان لکھتے ہیں۔ تحریر میں شوخی بھی ہے اور ظرافت کی چاشنی بھی۔۔۔ مرزا صاحب کو فنِ مصوری میں بھی دخل ہے اس لیے ان کی نظر چیزوں کے مختلف پہلوؤں پر کھلے ہوں یا ڈھکے وہیں پڑتی ہے جہاں نکتے کی کوئی بات ہوتی ہے اور جس پر سے عام نظر سرسری طور سے گزر جاتی ہیں۔ ان کی اسی نظر کی بدولت مضمون میں جان پڑ جاتی ہے اور ان کا قلم خط و خال درست کر کے ایک اور ہی رنگینی پیدا کر دیتا ہے۔"

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اگرچہ اوّلاً مزاحیہ رنگ میں مضمون نویسی شروع کی مگر بعد میں ادب کا کوئی ایسا موضوع نہیں رہ جس پر انھوں نے اپنے نقش ثبت نہ کیے ہوں۔ سوانح حیات، سفر نامہ، مختصر افسانہ، سماجی اصلاح، سیاسی نظریے، و ادبی تنقید وغیرہ مختلف النوع مضامین پر انھوں نے اپنے خاص انداز میں خامہ فرسائی کی ہے اور بہترین نقش چھوڑے ہیں۔ یوں تو ان کے بیسیوں مضمون زندگی جاوید کی حیثیت رکھتے ہیں مگر مولانا نذیر احمد کی سوانح حیات اور دہلی کا مشاعرہ، دیوانِ یقین اور دیوانِ نظیر کے مقدمات، پھول والوں کی سیر ایسے مضامین ہیں جن کو اُردو ادب میں بلند سے بلند مرتبہ حاصل ہے۔

حیدرآباد میں مرزا فرحت اللہ نے اپنی زندگی کے پورے چالیس سال بسر کیے یعنی ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد آکر ملازم ہوئے اور ۱۹۴۷ء میں یہاں سے آخرت کا سفر اختیار کیا۔ تیس سال سے زیادہ انھوں نے سرکاری ملازمت میں بسر کیے اور وہ بھی عدلیہ ہی میں رہے۔ بیانات لکھتے رہے، وکیلوں کی بحث اور جرح سنتے رہے اور فیصلے کرتے رہے اور اس زمانہ میں ادب کی خدمت بھی کرتے رہے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے مرزا صاحب نہ صرف نثر کے میدان کے شہسوار تھے بلکہ نظم کی فضا میں بھی پرواز کی ہے اور اپنے دیوان کو "میری شاعری" کے عنوان سے شائع فرمایا ہے۔ مرنے سے چند سال پہلے حیدرآباد میں ایک ادبی ادارہ "اُردو مجلس" کے نام سے قائم کیا تھا ہر ماہ ایک مرتبہ اس مجلس کا جلاس ہوتا اور کوئی صاحب مضمون سناتے اور اس کے بعد شعرا اپنا کلام سناتے تھے۔ یہ مجلس حیدرآباد کے بلند پایہ کے ادیبوں اور شاعروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ مرحوم کے بعد بھی یہ ادارہ باقی ہے اور آج تک اُردو کی خدمت کر رہا ہے۔

مرزا صاحب کی نثر اور نظم کا نمونہ پیش ہے:۔

"مجھ کو مولوی صاحب کی طرزِ تحریر پر کوئی رائے ظاہر کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ اوّل تو میرے لیے ابتدا ہی میں خطائے بزرگاں گرفتن خطا است کی سب سے بڑی ٹھوکر ہے۔ دوسرے میری قابلیت محدود کی سرحد سے گزر کر مفقود کی سرحد میں آگئی ہے لیکن باوجود ان واقعات کے میں نے مولوی صاحب کے سامنے بھی کہا، اب بھی کہتا ہوں اور ہمیشہ کہوں گا کہ محاوروں کے استعمال کا شوق مولوی صاحب کو حد سے زیادہ تھا۔ تحریر میں ہو یا تقریر میں وہ محاوروں کی ٹھیم ٹھام سے عبارت کو بے لطف کر دیتے تھے اور بعض وقت ایسے محاورے استعمال کر جاتے تھے جو بے موقع ہی نہیں اکثر غلط ہوتے تھے خدا معلوم انھوں نے محاوروں کی کوئی فرہنگ تیار کر رکھی تھی یا کیا۔"

(ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی)

"بہر حال تاریخ پیشی آگئی اور میں کتابوں کا پشتارہ بغل میں مارے ڈپٹی صاحب کے اجلاس پر پہنچ گیا۔ پہلی پیشی پہرے ہی مقدمہ کی تھی۔ اندر جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ تیس چالیس کتے ایک رسی میں بندھے کھڑے ہیں، رسی کا سرا مولوی قطب صاحب کے ہاتھ میں ہے اور مولوی صاحب ہیڈ کرل ہیر مٹرا بیٹ لا سے کھڑے باتیں کر رہے ہیں ڈپٹی صاحب اس وقت تک اجلاس پر تشریف نہیں لائے تھے۔ میں نے کرل صاحب سے کہا کیا آپ ان ملزموں کے وکیل ہیں؟ انھوں نے کہا ہاں! میں نے کہا کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ان ناپاک ہستیوں کو عدالت کے کمرہ سے خارج کر دیا جائے؟ انھوں نے کہا نہیں ملزمین کے مواجہ میں تحقیقات ہوگی۔ بالکل قانون کے مطابق ہوا ہے۔"

مرزا صاحب کی مزاحیہ شاعری کا رنگ ملاحظہ ہو:۔

جناب شیخ تشریف لے چلے جب خاص جنت کو
زہے قسمت ملا ہے کیا دیکھیں عمارت کا

نمازِ جمعہ کا وقفہ ہوا ہے وعظ ہی زاہد
چلو پی آئیں ایسے میں کہ ہے یہ وقت فرصت کا

اگر اتنی کی خدمت کا ہے، حوری ہوسوں ہیں کو
جناب شیخ کو بھی شوق ہے حوروں کی خدمت کا

کبھی حور انے صاحب کو بلایا تھا کشنر نے
وہ یوں رکھی ہے چٹھی گویا پروانہ ہے جنت کا

کلکٹر ہو گئے لکھ پڑھ کے قسمت سے خلیفہ جی
مگر جب یاد ہے اب تک بھی ہو گھروں کی حجامت کا

چلو لیڈر ہی بن کر جیل میں تھوڑی بہت کاٹیں
کہ اب سب لیڈروں پر بند ہے دروازہ جنت کا

ابھی ڈاڑھی منڈی ہے ایک دو مونچھیں بھی غائب ہیں
غرض ہونے لگا ہے اب اثر قربت پہ صحبت کا

(۳) ناکارہ

محمد شفیع الدین صاحب نام اور ناکارہ لقب، حیدرآباد کے متوسل نظام کالج میں تعلیم پائی جبکہ اس کا تعلق مدراس یونیورسٹی سے تھا۔ خانگی مجبوریوں سے تعلیم کو مکمل نہ کر سکے۔ طالب علمی کے زمانہ سے مضمون نگاری کا شوق رہا۔ اخبار رہبر دکن سے بھی تعلق رہا۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "مہمانی" کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔

ناکارہ صاحب مزاحیہ افسانے، ڈرامے دونوں لکھتے ہیں۔ ان کے مضامین میں قہقہہ نہیں ہوتا۔ وہ سبق آموز ہوتے ہیں۔ کسی میں طنز ہوتا ہے، کسی کے خاکے میں ایسے واقعات کا تذکرہ ہوتا ہے جس سے ہم ہنسنے لگتے ہیں۔ کسی مضمون میں اپنے گرد و پیش کے واقعات اور تجربات کی باتیں اس طرح لکھتے ہیں کہ ہم ہنسنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کہیں وہ اپنی ذکاوت اور فراست سے انشا پردازی کو اتنا دلکش اور دلچسپ بنا دیتے ہیں کہ غیر دلچسپ مواد میں غیر معمولی شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے مضامین میں طنز اور ظرافت میں خوشگوار ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور کبھی طنز ناگوار اور تلخ ہونے نہیں پایا۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

*

سبک آپ اور سر کے مصنوعی بال لگا کے اور ساڑھی اور چھپر پہننے کے بعد میں کتنا حسین معلوم ہو رہا تھا۔ اپنے آپ پر عاشق ہو جانے کو بے اختیار جی چاہ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غلمان حور کے بھیس میں رستہ بھٹک کر خدا کی اس دنیا میں پہنچ گیا ہے بعد میں معلوم ہوا کہ تماشائیوں کی ایک کثیر تعداد میرے ٹکا کا عورت ہونے کے متعلق ہاتھ بلند کرتی ہے لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں کہ میں عورت ہوں نہ مرد۔ میں نے دل میں کہا کہ کاش میں ان تماشا بینوں کو میری جوتی کو کیا غرض پڑی ہے کہ ان سیاہ کاروں کی زنجیبانہ جھلک کی طرف توجہ کروں لیکن میں نے نسائیت کی کیسی ہو بہو نقل اتاری تھی۔"

(تماشے پر تماشا)

"شام کو وہ لوگ اطمینان کی سانسیں اور بریانی کی ڈکاریں لیتے ہوئے رخصت ہوئے —— آنجناب اس میں شک نہیں کنوارے آئے تھے اور شادی شدہ واپس گئے لیکن مجھ کو اس کا افسوس تھا اور ان کے ساتھ ہمدردی بھی کہ اکیلے آئے اور اکیلے ہی گئے ...... اور صمدانی نے ہمارے حق میں دعائے خیر کی۔ خدائے پاک دولھا دلہن کو ایک سال تک صبر جمیل عطا فرمائے.. ...." (مس شہاب ثاقب)

(۴) محمد حسین آزاد

مولانا محمد حسین آزاد دنیائے اردو میں ایسے مشہور ہوئے کہ کئی اصحاب نے ان کے تخلص کو اختیار کیا اور بعضوں کا نام بھی محمد حسین رہا۔ چنانچہ حیدر آباد کے مولوی محمد حسین آزاد تخلص، اپنی تمام عمر درس و تدریس میں بسر کی۔ سر رشتۂ تعلیمات میں ملازم رہے، بعد وظیفہ اسی تدریس کے مشغلہ میں اب تک مصروف ہیں۔ شاعری میں اکبر کا رنگ اختیار کیا۔ ۱۲۹۷ھ میں حیدر آباد میں تولد ہوئے، پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل میں کامیابی حاصل کی حضرت امجد نے آپ کی شاعری کے متعلق حسب ذیل صراحت کی ہے:

"اگر اکبر مرحوم کی شاعری عالم وجود میں نہ آتی تب بھی ہمارے آزاد صاحب اس طرح آزادانہ اور ظریفانہ شعر کہا کرتے۔ ان کی تمام نظمیں ظرافت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔"

حضرت امجد کی یہ صراحت حقیقت بر دار ہے۔ "خیالات آزاد" کے نام سے آزاد صاحب کی نظموں کے دو حصے شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ بالک لوریاں اور مسدس آزاد بھی آپ کی تصانیف میں شامل ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

سفارش

یہاں سے اپنی گاڑی ہم بچا کر کیسے لے جائیں
جدھر دیکھو اُدھر اٹکا ہے اک روڑا سفارش کا
لیاقت کا اگر چلتا نہیں ٹٹو تو اے حضرت
لگا دو زور سے تم اس کے اک کوڑا سفارش کا

سفارش کا اسے تو یوں کر میں نہیں کہتا — ہمارے یا نہیں اب کرنے لگا شکوہ سفارش کا
ترقی کا تشبیہ قابلیت سے نہ نکلے گا — لگاؤ گے نہ تا وقتیکہ تم جوڑا سفارش کا
سفارش نے تو اونچا او نچوں کو بیچا دکھایا ہے — بڑا ہی سورما ہے جس نے منہ موڑا سفارش کا
یہ دل گردہ ہمارا دیکھو پیش داور محشر — قیامت میں بھی ہم مانگ بیٹھے کب چھوڑا سفارش کا

ہوس

غضب کا ہے جو بن بلا کا ابھار — ہے جتنا زیادہ کے یہ سو بد ہوس
یہ سب کچھ ہوں اس سے حاصل ہوا — حبث بجھ کر اس کی ہوتی ہے ہوس
تو کس پہ ٹکے ہو جس کا عاشق ہوا — نہ ہو گی یہ عصمت کی فریاد رس
تو دیتا ہے دل اور وہ لیتی نہیں — نہ اس کی نظروں میں ہے خار و خس
وہ دلدار ہے یہ نہ ہے دل ربا — ہے زر دار ہے زور ہے یہ ہوس
یہ بس ہے نہ نکلے گی زر کے بغیر
یہ بس ہے نہ ہو گی کبھی ٹس سے مس

(۵) عصمت اللہ بیگ

عصمت اللہ بیگ، مرزا فرحت اللہ بیگ کے رشتہ دار تھے۔ ان کی ہی طرح نظم اور نثر میں مزاح کے گل کھلاتے رہے مگر فرق یہ ہے کہ عصمت اللہ بیگ نے زیادہ تر شاعری میں مزاحیہ نگاری کی ہے، نثر کا حصہ کم ہے اور فرحت اللہ بیگ صاحب نے نثر میں زیادہ مزاحیہ نویسی کی ہے۔

عصمت اللہ بیگ کی پیدائش تو دہلی میں ہوئی مگر کم سنی میں حیدرآباد آ گئے اور یہاں تعلیم پائی، ملازمت کی اور بالآخر وظیفہ حاصل کیا۔ اپنی مزاحیہ شاعری سے اُردو زبان کی خدمت کی۔ نظم کے ساتھ نثر میں بھی مزاحیہ پہلو نظر انداز نہیں کیا۔ انھوں نے سماجی مسائل کو مزاحیہ رنگ میں بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ "انوارِ تبسم" ان کے کلام کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے، اس کے دیباچہ نگار گوپال راؤ اکبوٹے نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ:۔

> "عصمت کا انداز بیان بہت ہی دلکش اور ان کا اسلوب کافی شگفتہ ہے۔ وہ انگریزی الفاظ کو بھی استعمال کرتے ہیں اور اس طرح کہ اشعار کا مزاحیہ رنگ اور زیادہ نکھر جائے۔ سیاسی موضوعات پر بھی ان کی نظمیں اور غزلیں اسی طنز و ظرافت اور اشاراتی رنگ کی حامل ہیں۔"

عصمت اللہ بیگ صاحب شاعری میں اکبر سے متاثر تھے۔ طنز اور ظرافت سے اصلاح کا کام لیتے تھے۔

تین چیزیں

دنیا میں اگر پوچھو تو ہیں سیکڑوں چیزیں
ہیں پیش بہا اور اہم ان میں مگر تین

ان تینوں میں پہلے تو بڑا سب سے ہے پٹرول
ظاہر ہے بس اس کے لیے آپس میں سلاطین

ڈرتے تھے مسولینی و ہٹلر بھی اسی سے
دبتا ہے کسی سے جو تو اس سے ہے شاہین

پٹرول کے بعد آتی ہے بارود کی باری
ابلیس نے جاری کیے ہیں جس کے فرامین

بچھ جائے سرنگ اس کی تو اڑ جاتے ہیں یک سے
ارضِ حبش و مصر و فلسطین و چین

ہے تیسری وہ دھات جسے کہتے ہیں لوہا
ملتے ہیں جو ان دونوں سے ہیں اس کے قرابین

بنتے ہیں اسی چیز سے ٹینک اور ہوا سے
شمشیر و سناں تیر و تفنگ اور خرابین

قبضے میں کسی کے اگر آجائیں یہ تینوں
ہے ملک تو کیا چیز وہ دنیا کو بھی لے چھین

صلح پسندی

دشمن کو بنا لیتے ہیں ہم دوست خوشی سے
ہم امن کے طالب ہیں زمانہ میں کبھی سے

اک ذرہ ہیں ہم صلح پسندی ہی میں عصمت
مذہب بھی ہمارا نہیں لڑنا ہے کسی سے

نثر کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"مشاعرہ کرنے میں حکیم جی ملک الشعرا تھے۔ ادھر کسی کی شادی ہوئی ادھر مشاعرہ۔ لڑکی کے بچہ ہوا اور مشاعرہ۔ کوئی بیمار ہوا مشاعرہ، کوئی مرا مشاعرہ۔ غرض کہ مشاعرہ کیا تھا ایک عید تھا۔ پھر خرچہ کچھ نہیں۔ تانگے والوں نے قندیلوں میں سے موم بتیاں نکال کر ڈھیر لگا دیں۔ بزاز نے چاندنی کے پاٹ لا بچھا دیے۔ خیمے والوں نے دوپہر سے ڈیرے ڈال دیے۔ پنواڑی نے گلوریوں کے ڈھیر لگا دیے۔ چائے خانہ والوں نے چائے نوشی کا انتظام کر دیا۔ گل فروش نے ہر موسم تازہ گجرے اور کلیاں فراہم کر دیں۔ حکیم جی نے غزلیں کہہ دیں اور بنا دیں۔ اوہ یار لوگ اکھاڑے میں جا کودے۔ چلو لینا ایک نہ دینا دو، مشاعرہ ہوا اور ہنسی خوشی ہوا۔"

(حکیم معشوق علی خان جوہر)

(۶) شمشاد

غلام پنجتن صاحب شمشاد تخلص سید سراج الحسن سراج یار جنگ جج ہائیکورٹ حیدر آباد کے بڑے فرزند تھے۔ علی گڑھ اور یورپ کی تعلیم کے بعد حیدر آباد آکر سررشتہ عدالت میں ملازم ہوئے اور سیشن جج تک ترقی پائی۔ وظیفہ حاصل کیا۔ حیدر آباد آنے

سے پہلے سیاسی میدان میں بہت حصہ لیا اور حیدرآباد میں اولاً سیاسی مضامین لکھے پھر ملازمت کے دائرہ میں آنے کی وجہ سے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ وظیفہ کے بعد پھر سیاسی، ادبی حیثیت سے میدانِ عمل میں گامزن ہیں۔ اپنے ہمعصروں کے جو حالات لکھے ہیں ان کو حیدرآباد کے بڑے لوگوں کے نام سے ادارۂ ادبیات اردو نے شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ کئی کتابیں آپ کے نوکِ قلم کی رہینِ منت ہیں۔ ان حالات کو بڑے دلکش انداز میں لکھا ہے، ورکردار کی نقاشی بیباکی سے کی ہے۔ غلام پنجتن صاحب جس طرح سیاسی میدان میں نڈر ہیں اسی طرح ادبی میدان میں وہ صحیح تنقید کرتے ہیں۔

آپ کی مزاحیہ شاعری خاص رنگ کی حامل ہے۔ اس میں طنز کے نشتر بھی ہیں۔ نمونہ پیش ہے ؂

نہ ہو جو دین فروشی سے تسلی نہ سہی
ضمان اور بھی باقی ہے وہ بھی نہ سہی

ہے جو یہ طوق گلے کا شالی وہی کیا کم ہے
نوحہ بھری سی نغمہ شادی نہ سہی

دل میں اب جاہِ سیاست سے اک ہیجان تو ہے
شوق گلچین گلستان تسلی نہ سہی

ہے یہ آئینہ حیوں حسنِ طلسگار ہے ووٹ
گر نہیں ہے یہ میرا اسمِ تمنا نہ سہی

———

کردار تھا ہرانہ انداز عاشقانہ
اظہار عاشقی کب با تیر محرمانہ

صیاد کا نہ کھٹکا گلچیں کا اب نہ ڈر ہے
کاندھوں پہ آندھیوں کے اپنا ہے آشیانہ

سوکھی زبان پر ہیں آزادیوں کے نغمے
اللہ رے فاقہ مستی گھر میں نہیں ہے دانہ

آقا نمان کی دلکش الفاظ ان سے بیٹھے
یہ سب درست ہے ولیکن مضمون عامیانہ

دورِ جدید آیا وہ دن ہوا ہوئے جب
لیلیٰ کے ماپ لے کر پھرتے تھے تازیانہ

———

چڑھی ہے بڑھاپے پہ ان کے جوانی
عمل بندری فلسفہ گاندھیانی

اڑا لائی کس کی زباں میری مینا
تلنگی مرہٹی نہ ہندوستانی

قفس ان کے ہاتھوں میں اور ہم قفس میں
بڑی شستہ روانی بڑی مہربانی

تباہی کے سامان سب ہیں مکمل
اناڑی سا مانجھی ہے نیا پرانی

جھکتے ہیں اپنوں سے آنکھیں ملاتے
رقیبوں سے چلتی نہیں لن ترانی

وہ ہنسنے لگے سن کے میرا فسانہ
کہی ان کہی ہوگئی سب کہانی

(۷) فضل الرحمٰن

فضل الرحمٰن صاحب حیدرآباد میں تولد ہوئے۔ یہیں تعلیم پائی اور ماسٹر کی تکمیل پونہ میں کی۔ بی۔ اے آنرز کی ڈگری بمبئی یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اولاً سٹی کالج میں معاشیات کے لکچرار مقرر ہوئے مگر سیاست میں حصہ لینے کے باعث ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر لی۔

ایک دور کے بعد اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں کے جبر سے پھر ملازمت میں شامل ہوئے۔ نائب ناظم دفتر معلومات مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ناظم نشر و اشاعت اور اس کے بعد ناظم تعلیمات مقرر ہوئے اور اسی خدمت سے قبل عمر ۵۵ سالہ وظیفہ حاصل کر لیا۔ فضل الرحمٰن صاحب کے ڈرامے بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ اب تک سات ڈرامے شائع ہوئے ہیں۔ ظاہر و باطن۔ نئی روشنی۔ حشرات الارض۔ آشفتہ زمانہ۔ کارخانہ۔ سقراط۔ چنگیز۔ کلام کے دو مجموعے "دھوپ چھاؤں" اور "نقش حیات" شائع ہو چکے ہیں بقول ڈاکٹر غلام یزدانی، فضل الرحمٰن کو دکن کا ہیوگو کہنا چاہیئے۔ فضل الرحمٰن کے مضامین میں طنز اور خوش مذاقی کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے:-

"بیگم : میں اس سے زیادہ ٹھاٹ باٹ کا سامان خریدتی مگر آپ نے روپے کے لیے ایسا ترسایا کہ میری ہمت نہ پڑ سکی۔

نواب : تمہاری ادنیٰ سے ادنیٰ خواہش کو پورا کرنے کے لیے میں اپنے بڑے سے بڑے عیش کو قربان کر دیتا ہوں۔ وہ کون سی ایسی فرمائش تھی جو میں نے پوری نہیں کی۔

بیگم : میں نے سونے کے پلنگ کی فرمائش کی تھی۔ سونے کے پلنگ پر کمخواب کا بچھونا اور ریشم کے تکیے۔ آپ آخر وقت تک مجھے دم دیتے رہے اور اس کے بعد خرید لائے تو ایک سڑا چاندی کا پلنگ۔

نواب : میں تمہارے حکم کے بموجب سونے کا پلنگ خریدنے کے لیے بازار گیا تھا لیکن کم بخت دکانداروں نے جب میری ضرورت اور تمہارا شوق دیکھا تو ایک کے چار مانگنے لگے۔ اس پر بھی مجھے کوئی عذر نہ ہوتا بشرطیکہ میرے پاس کافی روپیہ رہتا۔

بیگم : اسی لیے میں کہا کرتی تھی دو لاکھ نکال لو۔ ایک لاکھ سے کام نہیں چلے گا مگر آپ ہمیشہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔

نواب : ضد مجھے نہیں اس مہاجن کو تھی جس کے پاس جاگیر رہن ہے۔ وہ قرض دینے پر آمادہ ہوتا تو میں دیوانہ تھا جو مفت کی رقم لینے سے انکار کرتا۔ تمہیں معلوم ہے قرض میری آمدنی کا واحد ذریعہ ہے۔ میرے نزدیک زیادہ قرض کے معنی زیادہ آمدنی کے ہیں۔"

(آشفتہ زمانہ)

"میرے فاضل پیشرو اور قابل دوست علامہ احمد مدیر الاحسان نے ابھی ابھی جو تحریک صدارت آپ کی خدمت میں پیش فرمائی ہے مجھے اس کی تائید کا فخر حاصل ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے اگر کوئی با توقیر شخصیت اس غرض کو انجام دینے کی اہل ہے تو ہمارے مشفق و کرم فرما ہمارے ہر دلعزیز قومی کارکن عالی جناب ممتاز الالقاب اعزاز احمد صاحب کی ذات ستودہ صفات ہے (تالیاں) صاحب ممدوح کی شان میں اس ہیچ میرز نے چند ماہ قبل ایک قصیدہ کہا تھا۔ اگر آپ اجازت دیں تو اس نادر مرقع سے استفادہ کر کے بعض اشعار سے احباب کی ضیافت طبع کا سامان کروں ؎

زمین و آسماں میں شہرہ ہے اعزاز احمد کا
نہ کچھ حد ہے نہ کچھ اندازہ ان کے فیض بے حد کا
بزرگان سلف ہیں طفل ابجد خواں حضور ان کے
ہوا ہے ان سے روشن نام دنیا میں اب و جد کا"

(حشرات الارض)

(۸) جگن ناتھ پرشاد

حیدرآباد کے ایک معزز کایستھ حکیم اور صاحب قلم ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں ایک اخبار "دکن پنچ" ہفتہ وار شائع کرتے رہے جو گویا اودھ پنچ کا ایک چربہ تھا۔ نظم و نثر دونوں پر قدرت حاصل ہے اور ظرافت نگاری کا اچھا سلیقہ ہے۔ مزاح سنجی اور خوش طبعی میں مشہور ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

اے خداوند تو! بزرگ و برتر جانتا ہے کہ سال گزشتہ "وبائی سن" کا نزول حیدرآباد پر ہوا۔ ہزاروں مخلوق تباہ و برباد ہو گئی۔ کوئی ایسا گھر نہ ہوا جو ... کا نہ بنا ... ہو گئیں، ... ہو گئے۔ بکس ... واقعہ دانہ کے ... محتاج بن گئے۔ اے پیر و مرشد ... گزشتہ ... یا کم تھی ... اب اس سال اور ایک ... آفت ایف۔ اے۔ پی کے نام سے حیدرآباد میں نازل ہے۔
یا خداوندا! تجھ کو خوب روشن ہے کہ حیدرآباد کی مخلوق پہلے ہی بے حال ... مہربانی ... سے فنا ہو رہی ہے ... یہ ... اور بھی فنا کر رہی ہے۔"
(دکن پنچ جلد ...)

(۹) تمکین کاظمی

حیدرآباد کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ منشی فاضل ہیں۔ دفتر دیوانی و مال و ملکی اسٹیٹ ریکارڈ آفس میں مامور تھے۔ اب وظیفہ حاصل کر لیا ہے۔ تمکین صاحب کو تاریخی اور ادبی شعبہ میں دلچسپی ہے۔ انہوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ "غنچۂ تبسم" مزاحیہ مضامین کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ ان کے مزاحیہ مضامین میں دکنی الفاظ زیادہ ہوتے ہیں۔ حضرت نیاز فتح پوری نے اس مجموعہ کے متعلق حسب ذیل صراحت کی ہے:-

"تمکین مضامین کی سب سے بڑی خوبی محاکات اور تجزیہ جذبات کا ملاقی ہے سو ان دونوں کی اچھی اچھی مثالیں اس مجموعہ میں نظر آتی ہیں۔ زبان کے لحاظ سے البتہ مجھے اکثر جگہ اختلاف ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ اختلاف شمال اور جنوب کا اختلاف ہے جس کا دور ہونا ممکن نہیں۔"

نمونہ ملاحظہ ہو:-

"چوتھے طبقے کے لوگ فی زمانہ نوماکہ ہیں مگر قربان جائیے خالق کے کہ اس تماشاگاہ عالم میں طرح طرح کے پتلے نچاتا ہے۔ ایک مولوی صاحب جو نہایت کم سخن، متین، سنجیدہ ہیں، اس قدر مجبور ہیں کہ کوئی ان کے گھر پر ملنے جائے تو بازار سے منگوا کر پان کھلاتے ہیں، یہ محض اس سبب سے کہ بیوی صاحبہ پان کی فرمائش پر اس قدر خفا ہوتی ہیں کہ ان کو کم از کم

وہ روز تک پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا۔ ایک بزرگ جب تک باہر رہتے ہیں چار پانچ ڈبیاں سگریٹ کی خالی کر ڈالتے ہیں مگر گھر میں کھانا کھانے کے بعد بھی سگریٹ پینا محال نہیں اس لیے کہ بیگم صاحبہ کو اس سے نفرت ہے۔" (زنان مرید)

مرزا صاحب کے جھکی پن سے ہماری روح بھی فنا ہوتی ہے۔ ہم نے سوچا کہ مرزا صاحب سے نہ ملیں تو پھر قیامت آجائے گی۔ راستہ میں جہاں کہیں ملاقات ہوگی حضرت جھگڑے ڈالیں گے۔ وہ وہ بے نقط سنائیں گے کہ سنگ آمد و سخت آمد کہہ کر پہنچ ہی گئے مرزا صاحب دیوان خانہ میں بیٹھے ایک صاحب کو خوشامد کے کچھ زبانی گر بتا رہے تھے۔ ایک شخص کو موجود پا کر مسرت ہوئی کہ چلو اس غریب سے مرزا صاحب کو جھک جھک کرنے دو۔ ہم تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے آئیں گے مگر ہمارا جانا ہی تھا کہ مرزا صاحب نے پیالہ کچھ ختم کر دیا اور متوجہ ہو گئے۔" (مرزا صاحب)

(۱۰) جلال الدین اشک

مولوی وحید الدین المخاطب نواب وحید نواز جنگ کے فرزند جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی دور کے سپوت ہیں۔ بی۔ اے اور ایل۔ ایل بی میں کامیابی حاصل کی۔ اپنی سلجھی ہوئی خوش مذاقی کے باعث ادبی حلقوں میں مقبول تھے۔ حیدرآباد کے سررشتہ کروڑگیری کسٹم میں ملازم رہے۔ اس کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں وہاں انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی تصانیف "شیطان کا انتقام" اور "سلک گہر" شائع ہو چکی ہیں۔ سلک گہر ایک ڈرامہ ہے۔ "شیطان کا انتقام" میں انھوں نے اس امر کو واضح کیا ہے کہ ہماری تہذیب شیطان کا انتقام ہے جو انسان کے بچوں کے ساتھ لیا جا رہا ہے۔

نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"شیطان کا پہلا حکم یہ تھا کہ جاؤ دنیا میں شاعری کرو مگر دیکھو اپنی شاعری میں عورت اور شراب کے سوا کسی غیبی چیز کا ذکر نہ لانا۔ ہاں کبھی کبھی تنوع کی خاطر کچھ مرثیے بھی لکھ دینا اور بکھیڑ کبھی کبھی بہت کر چند قومی نظمیں بھی لکھ لیا کرو۔ تم جب اپنی شاعری میں عورت کی تعریف کرو گے اور رنڈی کا وش سے اس کا سراپا کھینچو گے تو اس کے نتائج خاطر خواہ نکلیں گے۔ بہت سارے نوخیز طالب علم بہت سارے نیم تعلیم اور نیم دماغ تمہاری شاعری سے متاثر ہو کر بہت جلد بلکہ بلوغ سے قبل ہی کسی نہ کسی فاحشہ کے دام میں گرفتار ہو جائیں گے اور چار چھ مہینے یا شاید سال دو سال تک بڑی مسرت اور پُرکیف لذت بخش زندگی گذاریں گے اس کے بعد تو اس کے بعد کیا ہوگا؟ ان کی صورتیں مسخ ہو جائیں گی، ان کے گال پچک

جاتیں گے، ان کے سینے سوکھ جائیں گے، دماغ ازکار رفتہ ہو جائیں گے۔ وہ زندہ رہیں گے
مگر اس طرح کہ دنیا ان کی نظروں میں تاریک ہو جائے گی۔"

(۱۱) یوسف ناظم

سابق حیدرآباد کے علاقہ مہاراشٹر کے باشندے۔ جالنہ اور اورنگ آباد میں تعلیم پائی تھی۔ حیدرآباد آکر جامعہ عثمانیہ سے بی۔اے کی ڈگری لی۔ کچہری کی خدمت پر مامور ہو گئے۔ مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کا اچھا سلیقہ حاصل ہے۔ طنز اور مزاح پر تحقیقی کام بھی کیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔ مرزا غالب کی جسمانی صحت کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس کا ایک اقتباس یہ ہے۔

"انہیں صرف بیٹھے رہنا غالب کے لیے کافی نہ تھا۔ ان کی فطری کاہلی کچھ اور چاہتی تھی۔ غالب
کرسی میں بیٹھے بیٹھے بھی تکلیف ہونے لگی اس لیے انھوں نے یہ فرمایا ؎

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

پڑے رہنے میں بھی غالب نے کئی نکتے نکالے ہیں اور یہی مقام ہے جہاں اعتراف کرنا
پڑتا ہے کہ غالب نے بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ قسم کی نفاست پسندی کی ہے۔ غالب صرف
پڑے رہنے کے ہی قائل نہ تھے بلکہ اس کارِ خیر میں انھیں نفاست اور آرام کا پورا پورا
خیال رہتا تھا اور ہمیشہ بچھونا بھی ساتھ رکھتے تھے تاکہ جب بھی لیٹنے کا موقع ملے
بستر بچھا لیں۔ فرماتے ہیں ؎

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

(۱۲) خواجہ یوسف الدین

حیدرآباد وطن، جامعہ عثمانیہ اور علی گڑھ سے بی۔اے، ایم۔اے، ڈپ ایڈ کی ڈگری لی۔ اس کے بعد انگلستان جاکر ایم۔ایڈ ہوئے۔ عثمانیہ ٹریننگ کالج کے لکچرار اور پھر اورنگ آباد کالج کے پرنسپل ہوئے۔ ۵۵ سال کی عمر میں وظیفہ حاصل کیا۔ اب انوار العلوم کالج میں اپنے اوقاتِ فرصت کو کام میں لاتے ہیں۔ کئی مزاحیہ مضمون لکھے ہیں۔ یورپین شعرائے اردو کے متعلق بہت کام کیا ہے۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے:۔

"شیخ صاحب نہ صرف اپنے گاؤں اور شہر میں بلکہ دور دور بھی ایک ہوشیار لڑنے والے
سمجھے جاتے تھے۔ لڑنے سے مراد یہاں لٹھ بازی یا کشتی یا شمشیر زنی نہیں اس لیے کہ
ان چیزوں سے ہمارے شیخ صاحب کو دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ وہ لڑتے تھے کاغذ کی

موضوعات پر اس انہماک اور جوش و خروش سے کہ گویا داستان گو ہوں مانتے تھے اور جب یہ مشہور قصیدہ داروں، چپڑاسیوں اور اہل محلہ کے مجمع میں بیٹھے ہوئے اپنے کارنامے کو نون مرچ لگا کر بیان کرتے تو کون تھا جو ان کی زبان و بلاغت کی داد نہ دیتا۔"

(۱۴) مرزا شکور بیگ

مرزا شکور بیگ مولوی عزیز مرزا کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ عزیز مرزا صاحب کا نام مسلم لیگ کی تاریخ میں ہمیشہ درخشاں رہے گا۔ حیدرآباد سے رخصت ہونے کے بعد انھوں نے مسلم لیگ کی سیکرٹری شپ کو سنبھالا تھا۔

مرزا شکور بیگ کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی۔ یہاں ابتدائی تعلیم ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے۔ ایل ایل بی میں کامیابی حاصل کی اور بعد کامیابی وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ اس وقت ورنگل کے مشہور ایڈووکیٹ ہیں اور آندھرا پردیش کی کانگریس کی جانب سے چنے گئے ہیں۔ شکور بیگ کی شاعری ان کی تعلیم کے زمانہ سے شروع ہوئی ہے۔ پہلا دور "شاد" اور "ندا" ان کی نظمیں زمانہ تعلیم میں شہرت رکھتی تھیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

ممکن نہ ہو تو آنے کا وعدہ نہ کیجئے | ہم ناتواں پہ رحم کبھی بے سبب نہ کیجئے!
کچھ دیر سن کے خون تمنا کی داستاں | یہ مشورہ دیا کہ تمنا نہ کیجئے!
دینی ہو جو سزا وہ دیا کیجئے مگر | پہلے سے سامنے یہ بہانہ نہ کیجئے!
ہم مر گئے تو آپ پہ آخر مرے گا کون | کہتے ہیں اس لیے ہمیں کوسا نہ کیجئے
بیزار ہو کے یار نے مرزا سے یہ کہا | یوں آنکھیں چار چار کے دیکھا نہ کیجئے

مجھے تیرے دل کو بہلانا پڑے گا | کیے پر اپنے پچھتانا پڑے گا
اگر مرزا کی آہوں میں ہے تاثیر | انھیں جھک مار کے آنا پڑے گا

کوٹھی ملے، مکان ملے، سیم و زر ملے | سب کچھ ملے خضر کی طرف سے مگر ملے
ہو جس کے دل میں درد وہ انسان نہیں ملا | لیڈر ملے، وکیل ملے، ڈاکٹر ملے

جو اسیران قفس قید پہ اتراتے ہیں | وہ رہا ہو کے بھی صیاد کے گن گاتے ہیں
بر سر عہدہ تو ان سا کوئی کج خلق نہ تھا | بعد پنشن کے یہ عالم کہ بچھے جاتے ہیں

کام کچھ کر کے دکھاتے نہیں مرزا لیکن
صرف تنقید بڑی شان سے فرماتے ہیں

(۱۴) ابراہیم جلیس

حکومت آصفیہ کے علاقہ کرناٹک (گلبرگہ) کے متوطن اور اب پاکستان کے باشندہ ہیں۔ میٹرک تک گلبرگہ میں تعلیم پائی اس کے بعد علی گڑھ گئے مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری لے کر حیدرآباد آئے اور کمرشیل کارپوریشن میں ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد یہ بمبئی فلم میں ساحر لدھیانوی کے ساتھ کام کرتے رہے مگر یہاں کی فضا ان کے لیے سازگار نہ ہوئی۔ پھر حیدرآباد واپس ہو گئے اور ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے گئے اور وہاں اخباری دنیا اور پھر فلمی دنیا سے متعلق ہیں۔ اپنی مزاحیہ نگاری کے باعث پاکستان میں اچھی شہرت حاصل کر لی ہے۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں۔ زرد چہرے۔ چور بازار۔ چالیس کروڑ بھکاری۔ نکتہ دیس۔ کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں۔ ووٹ ایک کری۔ پبلک سیفٹی ریزر۔ جو کا ہے ٹکا۔ وغیرہ

اس تفصیل کے بعد اب حیدرآباد کی مزاحیہ نگار خواتین کو پیش کیا جاتا ہے۔ اگرچہ بعض حیدرآباد سے پاکستان منتقل ہو چکی ہیں مگر چونکہ ان کے کارنامے ایک عرصے تک حیدرآباد میں وجود میں آئے ہیں ان کو حیدرآباد سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۵) آصف جہاں بیگم بلگرامی

ان کے والد عبدالمجید صاحب بلگرام کے مردم خیز قطعہ سے تعلق رکھتے تھے۔ عرصہ تک صدر مہتمم تعمیرات رہے حیدرآباد میں انتقال ہوا۔ آصف جہاں کی پیدائش ۱۹۲۴ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ اگرچہ مدرسہ میں صرف میٹرک تک تعلیم پائی مگر مطالعہ کی بدولت اچھی قابلیت پیدا کر لی۔ کم عمری سے لکھنے کا شوق تھا اور مزاحیہ رنگ اختیار کیا۔ مضامین کا ایک مجموعہ "گلِ خنداں" کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔ شادی کے بعد دوسری مصروفیتوں کے باعث لکھنا ترک کر دیا مگر جو کچھ لکھا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ مرحوم مرزا فرحت اللہ بیگ نے ان کی مزاحیہ نگاری کی داد دی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

> "یقین مانیئے کہ مضمون واہ واہ ہے۔ مضمون پڑھتا تھا اور دل میں سوچتا تھا کہ یا اللہ یہ کیا انقلاب ہونے والا ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ مزاحیہ مضامین لکھنا صرف مردوں ہی کا حصہ ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ صنفِ نازک بھی ہماری حصہ دار بن گئی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ہم مذاق سے مطلب کسی ہنسی کی بات پر ہنس دیتے تھے مگر یہاں ہر فقرہ میں چٹکیاں لی گئی ہیں اور مزا یہ ہے کہ ہر فقرے پر بجائے رونے کے ہنسی آتی ہے۔"

اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ آصف جہاں بیگم کا درجہ مزاحیہ نویسی میں کس قدر بلند ہے۔ اب وہ پاکستانی بن گئی ہیں اور وہاں ہی مقیم ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

> "آہا۔ اونہو! اس کا تو نام بھی نہ لیجئے۔ بہن بچے کی قسمت کی مالک ہوتی ہے۔ جتنی خود میلی رہتی ہے اس سے زیادہ میلا بچے کو رکھتی ہے۔ اگر خود کا بچہ بھی ساتھ ہی ہو تو بیگم کے سامنے اپنے بچے کو

مارتی ہے۔ بیگم کے بچے کو پیار کرتی ہے۔ جب بچے کو پیسے ہیے تھک جاتی ہے تو بیگم کے سامنے جاکر اس منافق کے ساتھ پھس پھس چغلی کھاتی ہے کہ بیگم تو بیگم ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی اور وہ سمجھتی ہیں کہ بچہ ان کے پاس آنے کے لیے رو رہا ہے۔

بچہ زیادہ دق کرتا ہے تو افیون کی گولیاں کھلاتی ہے۔ محلے بھر کی رپورٹر ہوتی ہے جس محلہ میں ایک دو انائیں ہوں تو سمجھ لیجئے کہ وہاں کسی ریڈیو سٹیشن کی قطعی ضرورت نہیں جہاں محلے میں کوئی ذرا غیر معمولی بات ہوئی اور اس کا پیٹ پھولنا شروع ہوا۔ یا اپھار اس وقت تک کم نہیں ہوتا جب تک کہ تمام محلے میں اس واقعہ کی خبر نہ ہو جائے۔ نکتی بھلاتی کرنے میں مشاق ہوتی ہے۔ محلے کے کس گھر میں کس نے کیا کھایا، کیا کہا، کہاں گیا، سب اس سے معلوم کیجئے۔“ (گل خنداں)

(۱۶) تاج یٰسین علی خان

حیدرآباد کے ایک صاحب علم اور عالی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ مولوی غیاث الدین المخاطب نواب اعظم جنگ کی دختر ہیں۔ محبوبیہ اسکول میں تعلیم پائی۔ سید یٰسین علی خان صاحب ریلوے انجینئر کی شریک زندگی ہیں۔ اپنے شوہر کے ساتھ یورپ، آسٹریلیا اور عراق کا سفر کر چکی ہیں۔ شادی سے پہلے بھی مزاحیہ مضامین لکھا کرتی تھیں۔ آسٹریلیا کے سفر کے بعد اپنا سفرنامہ ”آسٹریلیا کی جھلک“ کے نام سے شائع کیا ہے۔

ان کے مضامین میں تخیل کی بلندی، نظر کی گہرائی اور مزاحیہ نگاری کی پوری قدرت حاصل ہے۔ ڈاکٹر زور صاحب نے ان کے اس سفرنامہ کے متعلق جو صراحت اپنی تقریظ میں کی ہے وہ یہ ہے۔

”ان کے سفرنامے کے کچھ حصے ماہنامہ شہاب میں شائع ہو رہے تھے اور میں حیرت اور تعجب کے ساتھ ان کو پڑھتا تھا۔ اس کتابی صورت میں میں نے بڑے شوق سے اس کو پڑھا اور اعتراف کرتا ہوں کہ یہ خاتون ۔ ۔ ۔ کی بڑی اچھی قدرت رکھتی ہیں اور اپنے خیال کے اظہار پر خوب سے قادر ہیں۔ ان کی طبیعت میں ظرافت، شگفتگی اور انبساط کی کمی نہیں اور یہ سب خوبیاں ہی اس درجہ کو نہ پہنچ سکیں کہ خامیوں کی سرحد میں داخل ہوں۔“

اس صراحت سے تاج یٰسین علی خاں کی مزاحیہ نگاری کا حال منکشف ہو سکتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

”جب مجھے معلوم ہوا کہ یہاں بچے پیدا کرنے پر تنخواہیں دی جاتی ہیں تو اپنے یہاں کے بچے والوں کی بہت یاد آئی۔ دل میں حساب جوڑتی رہی کہ فلاں کو فی ہفتہ اتنے پونڈ ملنے لگتے اگر وہ آسٹریلیا میں ہوتے۔ بہرحال یہاں کی مائیں بھی بچے پیدا کرنے میں ہندوستان کی عورتوں سے پیچھے نہیں ہیں اور یہاں کی زمین تو ہندوستان کی زمین سے بہت زیادہ زرخیز ہے۔

اپنے خیالات میں علامہ صاحب کا ایک مصرع زور زور سے گنگنا رہی ہیں۔ جیسے انہیں کوئی بہت بڑی کامیابی ہوئی ہو کہ اس مصرعے سے ان باتوں کا کیا تعلق۔ اس کے کیا معنی ہیں۔ اس وقت یہاں کس مناسبت سے یہ مصرع گایا وغیرہ۔ میں نے کہا آپ اپنے دماغ کی قیمتی مشینری کو ان معمولی باتوں سے تکلیف نہ دیا۔ یہ چھوٹے چھوٹے لوگوں کی باتیں ہیں۔"

(آ سٹریلیا کی جھلک)

(۱۷) زینت ساجدہ

حیدر آباد کے ایک مشائخ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگرچہ اب پیری مریدی کا سلسلہ ان کے یہاں باقی نہیں رہا۔ قاضی محمود بحری اور شاہ نور رانچوری ان کے اجداد میں شامل ہیں۔ زینت ساجدہ نے زنانہ کالج میں جامعہ عثمانیہ کے تحت اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔ ایم اے ہو کر ملازمت اختیار کی۔ پی ایچ ڈی کا کورس بھی ختم کر لیا مگر ہنوز مقالہ پیش نہیں کیا۔

زنانہ کالج میں اُردو کی لکچرار ہیں اور اپنے علمی اور سوشل کاموں کے باعث مشہور ہیں۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں اور تنقیدی مضامین بھی۔ افسانوں کا مجموعہ "جلترنگ" شائع ہو چکا ہے۔ وہ ترقی پسند زمرہ میں شامل ہیں مگر ان کے افسانوں میں عریانی نہیں ہوتی۔ ان کے تنقیدی مضامین بلند معیار کے ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اعلیٰ نقش سے اُردو کے معیاری ادیبوں میں اپنا مقام بہت اونچا بنا لیا ہے۔ مزاحیہ نگاری کا بھی سلیقہ ہے۔ ان کی مزاحیہ نگاری کو خوش مذاقی میں شامل کرنا چاہیئے۔ اخبار سیاست میں ان کے کئی مزاحیہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

(۱۸) جیلانی بانو

علامہ حیرت بدایونی کی دوسری صاحبزادی ہیں۔ علامہ بدایوں سے حیدر آباد آ کر بس گئے۔ جیلانی بانو کی پیدائش حیدر آباد ہی میں ہوئی اور یہیں نشو و نما پائی۔ خانگی تعلیم ہوئی اور اس تعلیم سے آپ جامعہ عثمانیہ کے بی۔ اے کے امتحان میں شریک ہو رہی ہیں۔

اگرچہ جیلانی بانو کو علمی میدان میں آئے صرف چند سال کا عرصہ ہوا ہے مگر اس قلیل عرصہ میں انھوں نے اپنے زورِ قلم کے جو نقش ثبت کر دیے ہیں وہ حیرت انگیز ہیں۔

ان کے افسانوں کا مجموعہ "روشنی کے مینار" پاکستان کے بین الاقوامی ادب کے مقابلہ میں درجہ اول کا تمغہ حاصل کر چکا ہے۔ جیلانی بانو کے افسانے پاکستانی رسالوں میں کثرت سے شائع ہوتے ہیں۔ حیدر آباد کے رسالوں کے علاوہ اخبار سیاست میں بھی ان کے مزاحیہ مضامین شائع ہوتے اور پسند کیے جاتے ہیں۔ جیلانی بانو نے صرف چند سال میں اُردو کی جو خدمت کی ہے اور ادبی میدان میں اپنا جو مقام بنا لیا ہے وہ قابلِ ستائش ہی نہیں بلکہ تعجب خیز ہے۔ توقع ہے کہ اگر آپ اسی طرح اُردو کی خدمت کرتی رہیں تو دنیائے اُردو میں ان کے کارنامے زندگیٔ جاوید حاصل کریں گے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

"آپ انفلوئنزا میں مبتلا ہیں۔ خلاصی ہی پی۔ ایک ڈی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ بیوی سے سخت قسم کی ناچاقی رہتی ہے۔ عنقریب آپ آٹھویں لڑکی کے باپ بننے والے ہیں۔ آپ

جنگ کے حامیوں میں سے ہیں۔ آپ کی عمر ساٹھ اور ستر کے درمیان ہے پچھلی زندگی عشق میں گزارنے کے بجائے فکر کی نذر ہو گئی۔ ڈاکٹر اور دواؤں پر سے آپ کا عقیدہ اٹھ چکا ہے۔

اگر آپ ریڈیو سیلون کے نام پر مسکرا چکے ہیں تو پہلی بات یہ ہے کہ آپ "لتا" کی آواز پر مرتے ہیں۔ اس کے علاوہ محلے کی کئی لڑکیوں سے عشق کا کاروبار جاری ہے۔ آپ بیک وقت دس بارہ بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ بک آپ بے حد کرتے ہیں۔ دن بھر پلنگ پر بیٹھے معمے حل کرتے ہیں۔ آپ مارکس اور رباری کا فرق بتا سکتے ہیں۔ فلمی دنیا کی تاریخ پر آپ کو عبور حاصل ہے۔ شکیل، راحمد، کرشن اور غالب آپ کے پسندیدہ شاعر ہیں بلکہ غالب کی طرح داڑھی رکھنے کا آپ کو نیا نیا شوق ہوا ہے۔

وحیدہ نسیم

وحیدہ نام اور نسیم تخلص۔ ان کے اجداد شمالی ہند سے اورنگ آباد آ کر بس گئے۔ نسیم کی پیدائش اورنگ آباد میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی اس کے بعد حیدر آباد آ کر زنانہ کالج میں شریک ہوئیں اور ایم۔ ایس سی میں کامیابی حاصل کی۔ نسیم کے خاندان میں کئی صاحب شاعر تھے۔ بچپن سے شاعری کا ماحول تھا۔ کالج کی تعلیم کے زمانے ہی میں ان کی شاعری مشہور ہو گئی۔ ان کی شاعری کے کئی مجموعے تیار ہو چکے ہیں جن کو مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا ہے مثلاً ۱۔ نکہتِ نسیم (نظموں کا مجموعہ) ۲۔ ساغرِ صہبا (غزلوں کا مجموعہ) ۳۔ تبسمِ حیات (مزاحیہ کلام) ۴۔ طفلستان (بچوں کی نظمیں) ۵۔ دردِ لا دوا (سیاسی نظمیں)۔

اگرچہ یہ مجموعے ہنوز زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئے مگر ان میں کا ایک حصہ رسالوں اور اخباروں میں شائع ہو گیا ہے۔ ۱۹۴۸ء کے بعد نسیم پاکستان چلی گئیں اور اب کراچی کے سنٹرل زنانہ کالج میں لیکچرار ہیں۔

جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے وحیدہ نسیم کی شاعری کا مزاحیہ حصہ تبسمِ حیات سے موسوم ہے اس میں بیسیوں نظمیں شامل ہیں مزاحیہ کلام میں ایک حصہ وہ ہے جو کالج کی تعلیم اور بورڈنگ کے قیام کے زمانے میں لکھا گیا ہے۔ نسیم کا مزاحیہ کلام نہ صرف ہنسنے کا ذریعہ ہے بلکہ سبق آموز بھی ہوتا ہے اس میں طنز کے نشتر ہوتے ہیں۔ تخیل کی بلندی اور زبان کی سلاست بھی ہوتی ہے ؎

گھنٹی بجی گھنٹی بجی اسے لو قیامت آ گئی — چہرے پہ سب کے دیکھو کیسی متانت آ گئی
اب پیاس بھی لگتی نہیں وہ بھوک ساری مر گئی — سب لڑکیوں پر اک خموشی کام اپنا کر گئی
معراج کیوں خاموش ہے باتیں وہ ساری کیا ہوئیں — پھر شکوہ جانے کے یہ گھاتیں وہ ساری کیا ہوئیں
صفیہ سناتی کیوں نہیں سعیدہ بھی کیوں چہکتی نہیں — ڈرتی ہیں سب ایسا نہ ہو سب پر ہنسی آئے کہیں
گانے کی جو انجم بھی کیوں شمس ڈس مس ہو گئی — گویا کہ سب زندہ دلی خاموشیوں میں سو گئی
خاموش ہو بیٹھی کیوں بیگم سب کیا ہوئی وہ خوش بیاں — سنجیدگی کے کیوں بھلا آثار چہرے سے عیاں

دھوبن کی یاد

آتی نہیں ہے اب تک وہ مہرباں ہماری — لیتی ہے ... کو کسی زباں ہماری
جلدی سے لے کے وہ ... قسمت کہاں ہماری — ... آ کے خود دھوبن ... ہماری
جائیں گے ہم وہیں جو ... مکاں ہماری

چادر پھٹی ہے میلی بستر پہ کیا بچھائیں — میلے غلاف ہیں سب کس طرح سے بچھائیں
بستر کی دیکھ حالت ... — ... دھوبن کا ... پیسے جائیں
میلی پڑی ہوئی ہیں سب ... ہماری

غصے میں جو اب کے ہم سے بگڑے ہوئے ہیں — دھوبن کے پاس آ کے کپڑے ... ہیں
اور اس سے زیادہ جو کپڑے پھٹے ہوئے ہیں — باقی بچے ہیں جو کچھ تن پر جڑے ہوئے ہیں
خالی پڑی ہوئی ہیں ... ہماری

طویل نظم ہے۔

روٹی تم نے ہے پکائی بدرِ کامل کی طرح — داغ ڈالے ہیں ... کی طرح
لیکن اس پکوان پر ہے تم سے اک میرا سوال — آج کیوں روٹی پکانے کا تمہیں آیا خیال
بس حنا کے واسطے ناخن تمہارے وقف تھے — مجھ کو کب منظور تھا کہ ان پر آٹا جڑے
تھیں فقط پیسوں پکڑنے کو تمہاری انگلیاں — ہے تعجب ان سے کس طرح پکائیں روٹیاں
روٹیوں کو دستِ نازک وقف تم نے کر دیا — نرگسی آنکھوں کو کیوں تم نے دھوئیں سے بھر لیا
پھول سے رخسار جن پر شرم کی تھی اک لہر — آگ کی گرمی سے اب وہ بن گئے ہیں آفتاب ...
مسکراہٹ پھول برساتی تھی ہنس کر ہونٹ پہ — آگ میں ڈالو نہ ان پھولوں کو چولہا پھونک کر
بس تبسم ختم کر دے شاعری کا سلسلہ
ڈر رہی ہوں حسن کا بھی بڑھ نہ جائے حوصلہ

دی ہے جو تو نے میرے تنِ ناتواں کو کھجلی — دے دی ہے تو نے یارب سارے جہاں کو کھجلی
ناخنِ ہلال بن کر کھجلاتے ہے فلک کو — تارے بھی پھنسیاں سب ہیں آسماں کو کھجلی
پانی کی بھی سطح پر یہ آبلے سے کیسا ہیں — کیا ہو گئی خدایا آبِ رواں کو کھجلی
ٹکتی نہیں ہے اک جا دستِ زباں کبھی بھی — مطلب ہے یہ ہوتی ہے دورِ زماں کو کھجلی
اک پیڑ کہ جو ہر دم کھجلا رہے ہیں پتے — گل پر ہیں داغ لاکھوں ہے گلستاں کو کھجلی

ہنستا رہے ہر دم کھلا کے روئے گلشن   کہتا ہے سب سے مژدہ ہے بوستاں کو کھل
کھل سے ہو جو فرصت توڑے نہ پھول کوئی   ہے بد دعائے بلبل ہو باغباں کو کھل
کوئی اگر یہ پوچھے یہ ظلم کیوں کیا ہے   کہہ دو کہ ہو رہی ہے میری زباں کو کھل
تنہا کھیا کھیا کے ہاں فائدہ بھی کیا ہے
ہو فی نسیم سارے ہندوستاں کو کھل

صفحاتِ گزشتہ میں حیدرآباد کے مزاحیہ نگاروں کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے۔ ان کی نظم اور نثر کے نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حیدرآبادی مزاحیہ نگاروں نے مختلف نہج سے مزاحیہ اور طنزیہ ادب کی خدمت کی ہے۔ انھوں نے اپنے نقشِ قلم سے تنوع پیدا کیا ہے۔ اگر ایک طرف سماج کی دکھتی رگوں پر نشتر لگایا ہے تو دوسری طرف کونین کی کڑوی گولی پر شکر لگا کر اس کی تلخی کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہیں قہقہہ کا موقع پیدا کیا تو کہیں تبسم کی دنیا میں پہنچایا ہے۔ غرضکہ انھوں نے اپنے شعور کی قدروں کو کامیابی سے جولانی دی ہے۔ اُردو کے مزاحیہ اور طنزیہ ادب کو ترقی دینے میں ان کے کارنامے پسندیدہ اور بلند معیار کے حامل ہیں اور بعض تو اس صنف کے چوٹی کے ادیبوں میں شامل ہیں اور ان کے کارنامے زندگی جاوید کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

گوئٹے

(پیدائش، خاندان اور شخصیت)

اختر انصاری

[گوئٹے اور اس کی شخصیت کے متعلق یہ مختصر مضمون ٹامس مان کے ایک طویل مقالے کے ابتدائی حصے کا ترجمہ ہے۔ یہ مقالہ ٹامس مان نے گوئٹے کے انتخاباتِ نظم و نثر پر ایک مقدمے کے طور پر لکھا ہے۔ خود ٹامس مان کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ موجودہ دور میں جرمنی کا سب سے بڑا مصنف خیال کیا جاتا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں اس نے لٹریچر کا نوبل پرائز حاصل کیا اور ۱۹۵۵ء میں اس کا انتقال ہوا۔]

اگست ۱۷۴۹ء کی اٹھائیسویں تاریخ تھی اور دوپہر کا وقت، فرینکفرٹ کے ایک معزز گھرانے میں ایک اٹھارہ سال کی کم سن ماں کی کوکھ سے جاپے کی غیر معمولی تکلیف میں ایک بچے نے جنم لیا۔ اس کا بدن نیلا ہو رہا تھا اور وہ بظاہر مردہ تھا۔ گویا اس دنیا کی روشنی سے اس کو کوئی علاقہ نہیں تھا۔ گویا وہ زندگی کی اس شاہراہ پر گامزن ہونے کا قطعی کوئی ارادہ نہیں رکھتا جس کے لیے یہ مقدر ہو چکا تھا کہ وہ ایک وسیع و عریض، گل پوش، مسرت بھری جدوجہد سے لبریز، انسانی سعادتوں سے بھرپور اور رنگینی و شادمانی شاہراہ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ماں کے بطن کے بعد وہ براہِ راست زمین کے بطن میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ کئی منٹ گزر جانے کے بعد بچے کی دادی نے جو پٹی سے لگی بیٹھی تھی کراہتی ہوئی ماں سے کہا: "الزبتھ! بچہ زندہ ہے!" یہ ایک عورت کی آواز تھی جس کی مخاطب ایک دوسری عورت تھی اور بس! محض ایک انسانی آواز! محض ایک بشاشت آمیز گھریلو پیغام! تاہم ساری دنیا اور ساری انسانیت کو اس آواز کا مخاطب ہونا چاہیے تھا اور آج بھی پوری دو صدیوں کے بعد اس آواز کی بہجت آفرینی جوں کی توں قائم ہے جس طرح آئندہ صدیوں تک قائم رہے گی جب تک روئے زمین پر زندگی اور محبت کا وجود باقی ہے، جب تک زندگی خود اپنی چاہت میں غرق ہے، نہ اپنے حلاوت بھرے غم سے تھکتی ہے اور نہ اپنے وجود سے بیزار ہوتی ہے اس وقت تک ایک عورت کے منہ سے نکلنے والی یہ آواز، یہ سادہ و بے لوث پکار "وہ زندہ ہے" یونہی گونجتی رہے گی اور یونہی مسرتیاں برساتی رہے گی۔

وہ بچہ جس نے اس روز تاریکی سے بڑھ کر روشنی میں قدم رکھا، جس کا حلق آواز سے خالی تھا اور جس کا جسم جسدِ بے روح معلوم ہوتا تھا، بڑی لمبی عمر لے کر آیا تھا۔ قدرت کو یہ منظور تھا کہ وہ بے پایاں تحمل کا مالک ہو اور صحیح معنوں میں رشیوں اور پیغمبروں کی سی طویل زندگی بسر کرے، نشوونما اور تجدید و احیاء کی عظیم الشان صلاحیتوں کا ثبوت دے، اپنی انسانی تقدیر کو بدرجۂ اتم پورا کرے اور وجود کی اس

عالی مقامی پر قابض و متصرف ہو جو سلاطین و اقوام کو جھکنے پر مجبور کر دے اور جس کی خلقت و پیدائش کو خود اس نے ایک مرقع پر جلی سنگی کے سارے تخمین و تقسیم کا موضوع بنایا ہو۔ ہم فرما کی جس دوپہر کو وہ پیدا ہوا تھا اس کو ماضی کی آغوش میں سمٹے ہوئے تراسی برس ہو چکے تھے۔ تاریخ کے مہیب اور کوہ پیکر اجتماعات اس کی نظروں کے سامنے سے گزر چکے تھے اور اس کے دل و دماغ پر چھاپہ مار چکے تھے۔ ہفت سالہ جنگ، امریکہ کی جنگ آزادی، انقلاب فرانس، نپولین کا عروج و سقوط، مقدس رومانی سلطنت کا اضمحلال و انتزاع، نئی صدی کے آغاز کے ساتھ نئے زمانے اور دنیا کے ماحول کی تعمیر، رومانی عہد کی ابتدا، مشینی دور، اور ۱۸۳۰ء کا انقلاب جولائی اور یہ ہشتاد سالہ جو یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے آج اپنی میز پر بیٹھا ہے۔ سپید مو اور بے داغ، اس کی کنپٹیوں کے چاروں طرف بڑھاپے کے نقوش لکھے ہیں جس سے اس کی بھنویں اور ایک دوسرے سے قریب ہونے والی آنکھیں پرندوں کی آنکھوں کی مانند معلوم ہوتی ہیں۔ وائمر کا وہ مکان ہے جو بہت پہلے انسان کے پرستارانہ جذبات کے لیے ایک سجدہ گاہ بن چکا ہے۔ وہ اپنے دارالمطالعے میں جس کو دانستہ طور پر سامانِ تعیش سے بری رکھا گیا ہے اپنی میز پر بیٹھا ہے اور رنگین تفکر و تصور کے عالم میں اپنے قدیمی دوست ماہر سیاست و ماہر لسانیات ولہلم فان ہمبولٹ کے نام جو برلن میں ہے اپنا آخری خط لکھتا ہے۔

"... اعلیٰ ترین ذہانت کا وصف یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو جذب کر لیتی ہے اور پچا لیتی ہے اور اس کے باوجود اپنی ازلی تقدیر کو جسے ہم کردار کے نام سے موسوم کرتے ہیں خفیف سے خفیف صدمہ بھی نہیں پہنچنے دیتی بلکہ حتی الامکان اس کو پختہ تر اور عظیم تر بناتی ہے۔ انسان کے قوی اپنی آزاد جبلی معصومیت میں، بحیثیت تعمیر، تفکر، کامیابی، ناکامی، ترقی پذیری، ٹھہراؤ اور پھر مزید تفکر کے ذریعے اکتسابی خصوصیات اور وہبی اوصاف کو شیر و شکر کر کے ایک ایسی متوازن اور ہم آہنگ وحدت کو وجود میں لانے میں جو ساری دنیا کو سحر زدہ کر دیتی ہے۔

تمہارا مخلص دوست:

جے۔ ڈبلیو۔ فان گوئٹے"

کتنی پُر سطوت سادگی ہے! ذاتی قدر و قیمت کا یہ جائزہ کس درجہ سادہ و پُرکار ہے۔ اس میں بیک وقت ایک طفلانہ معصومیت بھی ہے اور ایک عبقریت بھی، فرحت انگیزی بھی اور ہیبت آفرینی بھی! اس سے ستر سال پیشتر چوبیس برس کی عمر میں اس نے اپنی زندگی کی ایک ایسی ہی جھلک اپنی ایک نظم میں پیش کی تھی جو پڑھنے والے کو "دنیا نے سحر زدہ" والے فقرے کی طرح متاثر بھی کرتی ہے اور چونکاتی بھی ہے۔ اس وقت وہ ایک نوجیہ خاتون ایک نئی نویلی دلہن مریان فان ولیمر کے ساتھ جو دیوانِ مشرق و مغرب میں زلیخا کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے ایک ایسے معاشقے میں مصروف تھا جو بے وقت کی راگنی ہونے کے باوجود بھی فنی اعتبار سے ایک مناسب وقت اور یقیناً نتیجہ خیز معاشقہ تھا اور یاد رہے کہ یہ اس کا آخری معاشقہ ہرگز نہیں تھا۔ اپنے آخری معاشقے کا شکار وہ چوہتر سال کی عمر میں ہوا جب کہ سیکس وائمر کی ریاست اعلیٰ کا یہ عالی مرتبت وزیر باتدبیر، یہ شہرۂ آفاق شاعر، ایک بار پھر ایک دفعہ پھر رقص گاہ کا کنہیا بن گیا اور تعشق، پیار، شیفتگی اور وارفتگی کے تمام ساز و سامان سے مسلح ہو کر ایک سترہ سال کی چھوکری کے ساتھ بیاہ رچانے پر کمر بستہ ہو گیا۔ نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا کیونکہ اول تو خود اس کے خاندان والوں نے اس کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا اور دوسرے وہ دوشیزہ بھی شادی کی کچھ بہت زیادہ آرزومند نہیں تھی۔ گو یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ اس نے پھر کسی دوسرے شخص کے ساتھ بھی شادی نہیں کی۔ بہرحال چھیاسٹھ برس کی عمر میں جب کہ وہ ایک والہانہ محبت میں گرفتار تھا اور مجبوراً بھی اپنے نرم مزاج شوہر کی آنکھوں کے سامنے

جوانا اسی جوش و خروش سے ماریانا کی دلدادہ نظر آتی تھی اس نے یہ اشعار منظوم کیے

کھول کھلنے کا سماں ہے روز و شب — جان محبت میں جواں ہے روز و شب
برف کے گالوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں — اٹھتا آتش فشاں ہے روز و شب

تو یہ رسائی ہو تو مثل سحر — اک نئے وہ کوہ کی چوٹی ستارہ ہے
اور اس حاتم میں یہ سحر الفت زلیخا — اک تب و تاب اک حال جنوں اگر

جذبۂ عشق کی آمیزش انسانی محض شاعرانہ مبالغہ ہے جہاں تک میں اسے جانتا ہوں اس کا دل کبھی کسی جوہر کے لیے ایک آتش فشاں کی مانند نہیں دہکا۔ وہ ہر قسم کی آتش فشانی کے خلاف تھا۔ مارچ ایک کرسا شخص کی دنیا میں بھی اس کی یہ روش تھی لیکن ایک فسردہ کوہ کی چوٹی ذاتی شرف و وقار کا یہ بیان یہ تعلق سے ہے اور یہ بے حد صداقت سے لبریز اپنے اندر حقیقی عظمت رکھتا ہے۔ کتنی بڑی بات ہے اپنے متعلق یہ کہنا ــــ یہ کہنے کا حق رکھنا: ــــ کہ میں ایک ایسے عظیم القدر اور رفیع الشان پہاڑ کی مانند ہوں جو اپنی حدت پر دور بزرگی میں منہ ہے اور بعید ہے اور اس کے باوجود ایک حلاوت بھرا حسن ہے جو اس پر رنگ و نور کی لطیف پھوار برساتا ہے جو اس کی مہیب عظمت سے خوف نہیں کھاتا بلکہ اسے چومتا ہے، اسے سنوارتا ہے، اسے تب و تاب بخشتا ہے ـــــ وہ حسن جو سحر کی مانند ہے!

علاوہ ازیں غیر جرمن قاری کی خاطر یہ بتانا ضروری ہے کہ نظم کی ہیئت کے پیش نظر دوسرے بند کے تیسرے مصرعے میں گوئٹے کا قافیہ ہونا چاہیے۔ یہ قافیہ جسے مصنف نے شرارتاً ایک مشرقی نام حاتم کے پردے میں چھپایا ہے، وہ جسے قاری کی منصب از مخطوط ساخت ترتیب کے مطابق خود بخود مہیا کر دیتی ہے: اصل نام یعنی گوئٹے ہے۔

یہ ایک شان دار انا پرستی ہے جس سے ہم یہاں دو چار ہوتے ہیں۔ ایک خود پرستی جو اتنی پُر وقار ہے جو اپنی تکمیل، اپنی بالیدگی اور اپنے مختلف عناصر و اجزا کی چھان پھٹک میں اس شدت اور تسلسل کے ساتھ منہمک رہتی ہے کہ اس کے لیے غرور پسندی جیسے ہلکے لفظ کا استعمال یقیناً نامناسب ہو گا۔ یہ در اصل ایک گہری انسانی کیفیت ہے جو انا اور اس کے تدریجی ارتقا میں ڈوبنے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ہم کو شاعری اور صداقت جیسی تصنیف ارزانی کی جو دنیا کی بہترین اور یقیناً دل فریب ترین خود نوشت سوانح عمری ہے۔ یہ صیغۂ واحد متکلم میں لکھا گیا ایک ناول ہے جو ایک عدیم المثال اور ناقابل تقلید دل پذیری کے ساتھ یہ بتاتا ہے کہ فطانت کس طرح وجود میں آتی ہے، کس طرح سے مرفہ الحالی اور جوہر اصلی کسی پُر اسرار مشیت کی تعمیل میں باہم شیر و شکر ہوتے ہیں اور شخصیت کی کلی کیونکر رحمت و رافت کی دھوپ میں کھلتی ہے۔ شخصیت! گوئٹے نے اس چیز کو فانی انسان کی سب سے بڑی خوش طالعی اور خوش توفیقی بتایا لیکن یہ حقیقت میں کیا چیز ہے، کن عناصر سے ترتیب پاتی ہے، اس کا بھید کیا راز ہے ـــــ اور راز یہ یقیناً ہے ـــــ یہ خود اس نے بھی واضح نہیں کیا۔ صحیح اور نپے تلے الفاظ کے استعمال سے اس کو خود کچھ لگتی تھی اس کے باوجود اس کا یہ خیال تھا کہ ہر بات گفتنی اور لائق تصریح نہیں ہوتی۔ بہر حال شخصیت کے لفظ اور مظہر کے ساتھ ہم خالص ذہنی، عقلی اور قابل تجزیہ امور کی دنیا سے رخصت ہوتے ہیں اور فطری، عنصری اور ما فوق الفطری حقیقت کے دائرے میں داخل ہوتے ہیں جو ساری دنیا کو سحر زدہ کر دیتی ہے، اور بحث و تجسس کا موضوع نہیں بن سکتی۔

گوئٹے کی موت کے چند روز بعد ولیم آن ہمبولٹ نے جو نہایت گہری نظر رکھتا تھا اس حیرت ناک امر کا اظہار خیال کیا کہ یہ شخص

بغیر کسی شعوری ارادے اور کوشش کے محض اپنے وجود کی بنا پر بے حد و قیاس اثرات پیدا کرنے کا باعث ہوا تھا اس نے لکھا یہ چیز اس تحقیقی کام سے بالکل علیحدہ ہے جو اس نے مفکر و مصنف کی حیثیت سے سرانجام کیا۔ یہ اس کی عظیم اور منفرد شخصیت کا کارنامہ ہے۔ اس جملے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شخصیت کا لفظ محض ایک لسانی پینترا ہے کسی ایسے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے جس کے اظہار میں ناطقہ سربگریباں ہے، کسی ایسی تخمین کو ظاہر کرنے کے لیے جس کے سوتے ذہنی نہیں بلکہ جیاتی ہیں۔ شخصیت جو ہمہ گیر جاذبیت اور اور عالمگیر کشش رکھتی ہے یقیناً ایک مخصوص و زبردست نیز کہ سادہ و ناتراشیدہ قوت حیات کی ساخت و پرداخت ہے۔ وہ مکارم و مفاسد اور محاسن و نقائص کا ایک آئینہ ہے ایک ایسے تناسب کے ساتھ اور ایک ایسے عمل کے ذریعے جو فطرت کے گہرے اور اتھاہ رازوں میں سے ایک راز ہے۔

صدیوں کی جرمن زندگی پر اگر نظر ڈالی جائے تو نسل و خون کے ایک دھارے کا پتا چلتا ہے جو غیر محسوس طور پر جاری ہے اور کوئی غیر معمولی چیز بھی نہیں ہے۔ یقیناً مادرِ فطرت کے سامنے کوئی نصب العین نہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ عملاً ایک نصب العین ہے ایک مخصوص نصب العین! چنانچہ گوئٹے اپنی ماں بیانا کی زبان سے یہ الفاظ ادا کرتا ہے :۔

"نا ممکن ہے کہ ایک تبلید غیر متوقع طور پر کسی دیوزاد کو جنم دے یا کسی عفریت کو وجود میں لائے
صرف اچھے اور برے انسانوں کی ایک نسل ہی پایانِ کار مسرت یا تباہی پیدا کرنے کا سبب
بنتی ہے "

دیوزاد اور عفریت یعنی فوق الفطرت مخلوق۔ اس کے ذہن میں دونوں کا خیال بیک وقت آتا ہے۔ وہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتا اور جانتا ہے کہ جس طرح ابتہاج و مسرت میں ہمیشہ وحشت کا بھی ایک پہلو ہوتا ہے اسی طرح دیوزاد میں بھی عفریتی انداز کا پایا جانا لازمی ہے صاف اور سیدھی نثر میں وہ اس بات کو یوں کہتا ہے "جب خانوادے ایک طویل مدت تک قائم رہتے ہیں تو بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ صفحۂ ہستی سے محو ہونے سے قبل وہ ایک ایسے شخص کو وجود میں لاتے ہیں جو ایک مجموعہ ہوتا ہے اور ایک مظہر ہوتا ہے اپنے اجداد کے تمام اوصاف کا، نیز ان کے ایسے میلانات کا جو مخفی رہے اور بروئے کار نہ آسکے"۔ یہ بات مختصر سے انداز میں کہی گئی ہے لیکن یہ مفصلانہ تلقین کا رنگ رکھتی ہے، انسان اور فطرت کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور اس کے اپنے فوق الفطرت وجود سے سوچ سمجھ کر استنباط کیا گیا ہے لیکن ایسا ہوتا کیونکر ہے؟ امتزاج و التیام کا عمل کیونکر آگے بڑھتا ہے؟ نہایت خاموشی کے ساتھ اور بہت ہی دھیمے انداز میں مختلف قبائل پھلتے پھولتے ہیں اور آپس میں شادیاں کرتے ہیں، کاریگروں، دہقانوں اور پیشہ ور طبقوں میں آمیزش و اختلاط کے سلسلے قائم ہوتے ہیں۔ قدیم رواج کی پیروی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے والا معمولی دستکار اپنے استاد یعنی مستری کی لڑکی سے شادی کرتا ہے۔ نوابی محل سرا کی کنیز سرکاری امین یا ناظم سے بیاہی جاتی ہے۔ پیدائش اور موت کی حدوں کے درمیان مجانست و مخالطت کا یہ بے ضرر عمل آگے بڑھتا رہتا ہے اور بظاہر کوئی اہمیت بھی نہیں رکھتا لیکن پھر بتدریج اس تعزز و توقیر کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے جو ملکیت، ثقافت، شائستگی اور نجابت سے وابستہ ہے۔ یہاں تک کہ انجام کار ایک سطحی شجرۂ نسب کو وجود میں لانے کا باعث بنتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ٹن ہاٹر خاندان نے ٹکسٹر خاندان کے ساتھ جو جرمنی کے جنوب سے آکر فرینکفرٹ میں بس گیا تھا، سلسلۂ ازدواج قائم کیا اور پھر اسی طرح ٹکسٹر خاندان نے گوئٹے خاندان کے ساتھ جس کا وطن اصلی شمالی میں تھرنگین فاریسٹ اور ہرز کے پہاڑوں کا درمیانی علاقہ تھا، شادی بیاہ کے ناتے جوڑے۔

میرا خیال ہے کہ اس عظیم شاعر کی فطرت کا بہترین صحت مندترین اور سب سے زیادہ فیصلہ کن عنصر ٹن ہاٹر خاندان کا وہ خون ہے

جو قدیم رومی ادب سے مغرب و حجاز سے آیا۔ جہاں بیسویں صدی اور وحشیانہ نسل پرستی کے معاصرے مقیم تھے سے محروم ہوتے چلے آرہے تھے۔ یہاں کی نانی کا وہ رشتہ تھا جو پیدائش کے لحاظ سے شدت آمیز خاندان سے اور رشتہ داری کے اعتبار سے شریف خاندانوں سے تعلق رکھتی تھی اور ایک صبر جمیل والی شریف النفس بوڑھے رنگ کی عورت تھی تصویروں اور شبیہوں سے پتہ چلتا ہے کہ اپنی پیشانی، مولائمت کی بناوٹ، اپنی حالمی آنکھیں اور اپنی ہمت اسی سے نہیں سے ورثے میں پائی اور ننھیالی خاندان دراصل تھا اس کے کلاسیکی رجحان کا، اس کی ہیئت پرستی اور وضاحت پسندی کا اس کی شخصیت کے ضبط اور دلکشی کا اور جرمن کردار سے اس کی عجیب ناخوشی کا جو کبھی تنقید کی شکل اختیار کرتی تھی اور کبھی بیزاری کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔

اس سب کے باوجود ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہی جرمن کردار اپنے خلوص اور کھرے پن کی وجہ سے اس کا ایک اہم جزو تھا جو اس نے محض اور خالص جرمن نسل سے ورثے میں پایا۔ چنانچہ یہ کہنا حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ شاید ہی کبھی کسی ایسے شخص نے المانویت پر ایسی بحث اور ظالمانہ تنقید کی ہو اور یہ کہ جرمنوں کی عزت نفس (یعنی خود پسندی) کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔

حیاتیاتی نقطہ نظر سے وہ خاندان جو اس عظیم اور بزرگ روح کی ولادت کا مرکز بنا، کچھ بہت جوہر نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا دادا فریڈرک آگسٹ لڈوگ ایک سنجیدہ طبع عالم تھا جس کی عمر کے ساتھ ساتھ جسمانی قوت کا انحطاط ہو گیا تھا۔ اس نے دو مرتبہ شادی کی اور گیارہ بچوں کا باپ بنا جن میں سے اکثر بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ صرف وہی ایسے تھے جو اس کے بعد تک زندہ رہے۔ ان میں سب سے بڑا بیٹا جو عام سا تھا، اور ۳۶ سال کی عمر میں شدید دماغی خلل کے عالم میں جاں بحق ہوا۔ شاعر کا باپ پادری تھا، جس کے گیارہ بہن بھائیوں میں دوسرا بھائی نیٹشے کا دوسرا بھائی اپنے عمر رسیدہ والدین کی بڑھاپے کی اولاد تھا اس کا وجود اس امر کی جیتی جاگتی شہادت تھی کہ ماہر قانون جس کے پاس سلطانی منصب تھا خود ایسا خطاب ہی تھا کچھ عجیب سا۔ وہ ایک ہنس مکھ اور چمکیلے مزاج کا انسان واقع ہوا تھا لیکن طرز زندگی ایسا کہ جو کبھی اپنے پیشہ وارانہ کے سلسلے میں کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ نوادرات کا جمع کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا جس میں وہ بڑے حوصلے کا کام لیتا۔ اس کی فضیلت، آبی اور مادی جائیداد ناقابل برداشت تھی۔ وہ ایک معاشرتی مزاج کا انسان تھا جس کے محبوب دستور اعمل میں ہر ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی بآسانی خلل انداز ہو سکتا تھا۔ البزبتھ نے جس کا باپ بٹلر اور مجسٹریٹ اور ماں لندن کے ایک معزز خاندان کی خاتون تھی اور جو ایک شگفتہ مزاج لڑکی تھی جب اس سے شادی کی تو اس کی عمر سترہ سال کی تھی۔ یعنی شوہر کی عمر سے مکمل نصف، اس نے ہرگز کسی دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا کیونکہ اسے اپنی زندگی کا بہترین حصہ ایک خود سر بیمار کی نرس کی حیثیت سے گزارنا پڑا۔ البزبتھ کا باپ یہاں دولف گانگ بھی تھا کہ اپنی جوانی میں عزو مایک ٹوٹے شعلوں کی طرح رہا ہوگا جیسا کہ گوئٹے اپنی ماں کو کہا کرتا تھا گویا وہ ایک شہد تھا جو بے رونق عورتوں کے پیچھے بھاگا پھرتا تھا اور کبھی کبھی بھلائے ہوئے شوہروں کے ہتھے بھی چڑھ جاتا تھا گویا وہ ایک مجموعہ اضداد تھا۔ ان حرکتوں کے باوجود اس میں کوئی کی صلاحیتیں تھیں۔ عجیب جنسی قوت تھی اور اپنی پیرانہ سالی میں ـــــ وہ اسی سال کی عمر میں مرا ـــــ اس نے سنجیدگی، متانت، بالغ پن اور عزو وقار کا ثبوت دے کر اپنے دور شباب کی بے عنوانیوں اور بیہودہ کاریوں کی پوری تلافی کر دی۔ اس نے اپنے آخری سال ایک پہیے دار کرسی پر ایک مسلوب الحواس مریض کی حیثیت سے گزارے۔

دو سال بعد نیٹشے کی بیوی البزبتھ کے یہاں چھ بچے ہوئے جن میں چار پیدائش کے دوران یا بچپن ہی میں عالم عدم کی جانب منہ موڑ گئے۔ صرف ایک یعنی کورنیلیا نے اپنے بھائی وولف گانگ کا بچپن کے بعد تک ساتھ دیا۔ یہ ایک بد قسمت آزردہ مزاج لڑکی تھی جو اعصابی اور جلدی امراض کی شکار تھی۔ وہ بد مزاج لو سا جنس تھی اور جیسا کہ اس کے بھائی نے کہا، بیوی بننے کی بجائے راہبہ بننے کے لیے پیدا ہوئی تھی تاہم اس نے شادی کی اور زچگی میں جس کے خیال سے وہ اس کو پہلے ہی سے متنفر کر رکھا تھا جاں بحق ہوئی۔ صرف وہی ایک تھا جو بچا اور اس بھرپور طریقے سے بچا گویا پچھلوں بہن بھائیوں کی زندگی اسی کے حصے میں آگئی۔ مگر چہ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ صحت و توانائی جس سے دوسرے محروم رہے تھے اور جس پر اس نے ایک غیر ارضی حرص و ہوس کے ساتھ متصرف ہونے کی کوشش کی اس کے حصے میں بھی نہیں آئی۔

کیا داستانِ حمزہ کی اصل فارسی ہے؟

راز یزدانی

کہتے ہیں کہ زبانِ خلق میں صداقت ہے یعنی جب کوئی بات متواتر کہی جائے تو وہ سچی ہوتی ہے حالانکہ یہ بات ہے کہ عوام تو عوام ہمارے خواص نے بھی یہ طے کر رکھا ہے کہ داستانِ امیر حمزہ صاحبقران فارسی سے ترجمہ ہو کر اردو میں منتقل ہوئی۔ یہ حقیقت اسی قسم کی غلط فہمیوں نے جو اردو کی داستانوں کے متعلق عام ہیں مجھے مجبور کیا کہ میں اپنی عمر کے بیس سال داستان پڑھنے اور داستان کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے میں صرف کروں۔ لیکن اس مدت میں مجھے جو کچھ حاصل ہوا اس کو دیکھتے ہوئے میں بڑی خوشی سے یہ کہہ دینے پر آمادہ ہوں کہ میری عمر کا یہ حصہ ضائع نہیں گیا ---- ان ہی حاصل شدہ معلومات میں ایک حقیقت یہ ہے کہ میں اس داستان کو فارسی سے ترجمہ شدہ داستان نہیں سمجھتا۔

اردو میں اس داستان کے فارسی سے ترجمہ ہونے کا ڈھنڈورا نول کشور پریس نے رچایا۔ کیا وجہ ہوئی یہ تو معلوم نہیں لیکن حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ اردو داں طبقہ نے بغیر کسی تحقیق کے پریس کے اس پروپیگنڈے کو قبول کر لیا ---- میں یہ مانتا ہوں کہ ہر کتاب کے سرورق پر پریس کا یہ پروپیگنڈہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے اور تقریباً ہر کتاب کے اندر جہاں جہاں موقع ملا۔ جا بجا پروپیگنڈے کو شدومد سے دہرایا گیا ہے۔ چنانچہ نو لکھنوی طلسم ہوشربا جلد … پر لکھتے ہیں:-

"ملا فیضی صاحب وغیرہ نے جو ہفت دفاتر نوشیرواں نامہ وغیرہ تحریر فرمائے"

یہ ہے وہ پروپیگنڈہ جسے دیکھتے دیکھتے انسان کی نگاہ عادی ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہی تو ہے کہ یہ ہفت دفاتر فارسی سے اردو میں منتقل ہوئے۔

صندلی نامہ کے مؤلف مولوی محمد اسمٰعیل اثر نے تو اس سلسلے میں وہ "تیرِ بے کمان" چلایا ہے کہ ----

درونِ سینۂ من زخمِ بے نشاں زدہ

فرماتے ہیں:

"جناب مرحوم و مغفور منشی نول کشور نے ایسے شوق ذوق سے ارشاد فرمایا۔ ہر چند داستانِ امیر حمزہ صاحبقران کے کئی دفتروں کا ترجمہ ہوا ہے اور جلدیں اس کی مطبوع ہو کر منظورِ نظر ناظرین والا تمکین ہوئی ہیں..... ایک دفتر کا ترجمہ مجھ سے متعلق کیا جاتا ہے۔ یہ دفتر صندلی نامہ احقر کے سپرد فرمایا اور شیخ تصدق حسین صاحب سے جن کے اہتمام سے نوشیرواں نامہ

کہ یہ سب باتیں بالآخر داستان امیر حمزہ جیسی ۱۹ ضخیم جلدوں کا سبب کیسے بن سکیں؟

(مشمولہ تحقیق نامہ)

ظاہر ہے کہ اس سے بڑی حماقت اور کیا ہو سکتی ہے ۔ ۔ معلوم نہیں کہ ان لکھنے والوں کی سب باتیں تسلیم کرنے سے اللہ کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ شاید ان دفتروں کے فارسی نسخے صرف ولایت ہی میں کہیں حاصل ہو گئے تھے تو یہ وہ قوت تخیل کی طرح آسمان سے پھیلی ہیں یا کثرت ملک کی طرح زمین کی سمت میں کسی ویرانے کی کھنڈروں میں سے ہو رہے ہیں لیکن اس صورت میں بے اختیار ذہن میں سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ ما حاصل اردو میں ترجمہ ہو جانے کے بعد اصل مسودات کو اگر ردی کی ٹوکری میں نہیں ڈال دیا گیا تو وہ پرانے کتب خانوں کی تاریکیوں میں محفوظ ہوں گے ۔ ۔ غور کیجئے ایسے فارسی مخطوطے جن سے دنیا بھر کی بڑی بڑی لائبریریاں خالی ہیں جو فرد واحد جن کے نام بتائے جاتے ہیں کسی کے نام "جاتے" تو وہ نہیں لکھ کر ذرا اعجاز ہی پر کام ان کو صرف زبان "کے محض ترجمہ کی بات تسلیم ہے۔ چھاپے نہ رکھے ۔ ۔ منشی نولکشور صاحب نظر اور صاحب علم اور روشن دماغ انسان تھے جس نے اپنی "قوت بازو سے" نولکشور پریس "جیسا ادارہ پیدا کیا اور تا جا نشینوں کے لیے چھوڑا جو آج بھی ان کے خاندان کے لیے معروف کا ان گھرانے کا باعث فخر ہے لیکن یہ فارسی مخطوطے "جو کہ انہیں کے طفیل ان کو حاصل ہو گئے تھے انھیں "کو سنبھال "بعض" کو یاد اور ان کو محفوظ رکھنے کی جگہ اصلوں سے رجوع کے بعد ۔ ۔ تو یہ "دیوانے کے خواب" کی طرح بکھر جانے کی بات نہیں۔

میری خوش قسمتی آج کل جو دراصل ایک قریب وارث نولکشور کے شیدا جناب احمد حسن صاحب نورانی ہیں جو سوسائٹی کی گھنٹہ گھر شعبہ ادب و اصلاح کے صدر بھی ہیں اور ماہنامہ عزوف بھی ادارہ آپ ہی کے اہتمام سے شائع ہوتا ہے میں نے انھیں لکھا اور تو وہ صاحب کے جھگڑ یا د دہانیاں کرائیں کہ پرانے ریکارڈ میں تو داستان حمزہ کے فارسی مخطوطے موجود ہوں تو مجھے بتائیں ۔۔۔۔ یوں تو اس سلسلے میں مسرت سے بڑی لمبی خط و کتابت ہوئی اور بہت سی کام کی باتیں ان سے معلوم ہوئیں لیکن داستان گویوں کے مفصل حالات اور ان مخطوطوں کے متعلق آخر میں انھوں نے جو کچھ مجھے لکھا وہ درج ذیل ہے:-

"مطلوبہ حالات کتابوں میں تو موجود نہیں پروفیسر مسعود حسن رضوی کے ذریعے سے لگا رہا ہوں ۔۔۔ اصل فارسی داستانوں کا کسی طرح کوئی سراغ نہیں لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ دو ایک بنیادی کتب ضرور تھیں لیکن یہ داستانیں خود مطبع کے حاضر داستان گو روز بروز سناتے تھے اور کاتب لکھتے جاتے تھے یہاں تک کہ ان کی کوئی اصل بھی محفوظ نہیں ہے یعنی جو کاتب لکھتے تھے وہ مسودات ۔ سامنے ایک چبوترہ پر جواب بھی ہے یہ لوگ بیٹھتے تھے سامنے کاتب بیٹھتے تھے وہ سنتے اور لکھتے جاتے تھے اس سے زیادہ ان کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔"

۲۲ اپریل ۵۹ء

داستان گویوں کے جن حالات کا میں خواستگار تھا وہ تو مجھے متعدد یاد دہانیوں کے باوجود آج تک نہیں ملے اور نہ اب کوئی توقع باقی ہے کیونکہ مل سکتے تو مل چکے ہوتے لیکن اس خط نے جو میرے نظریات کے مطابق تھا اور اب تک میرے پاس محفوظ ہے فارسی جلدوں کی موجودگی اور وہاں سے براہ راست ان داستانوں کے اردو میں ترجمہ ہونے کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ دو ایک بنیادی کتابوں کی موجودگی سے

مجھے انکار نہیں۔ سب سے بڑے علم ہی سے کہ سلطان محمود نے داستانِ حمزہ کو دو بڑی بڑی جلدوں میں لکھوایا تھا۔ قمر لکھنوی نے طلسم ہوش ربا جلد ششم کے آخر میں سلطان محمود کی لکھوائی ہوئی ان دونوں کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔

سب سے بڑی اور سب سے زیادہ افسوسناک بات جو غلطی سے ان دفتروں کے براہِ راست ترجمے کے خلاف کہی جا سکتی ہے یہ ہے کہ نوشیرواں نامہ جیسے دفتر سے ایرج نامہ تک جو چھ دفتر ہیں جو صاحب ان دفتروں کے مترجم کے جانے جاتے ہیں یعنی شیخ تصدق حسین وہ داستان گو تو ضرور تھے مگر تھے ناخواندہ یعنی لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے تو یا تو شیخ صاحب کے سامنے فارسی کا مادہ گھر کے دستور دے ماسکی وہ بات کو جو صفاتِ ہر کمال جس کے ہونے ہوئے نہ کہا جا سکے کہ داستان کسی کتاب کے لیے کس قابل بنائی جائے ملکہ کی ضرورت ہی کیا تھی۔ دوم یہ کہ ایک ناخواندہ شخص فارسی کے عام گھریلو محاورے تو شاید اس کام کر لیں سکتا لیکن اعلیٰ درجے کی ادبی کر سکے بہت بہتر ہوتا ہے ایک ناخواندہ شخص کے لیے تو اور زیادہ مشکل ہے کہ وہ فارسی سے ترجمہ کر سکے۔

طلسم ہوش ربا کے۔ دیکھنے والے ہیں قمر لکھنوی اور جاہ لکھنوی ان دونوں نے اپنے اپنے مقام پر تسلیم کیا ہے کہ داستانِ امیر حمزہ اور طلسم ہوش ربا دونوں میں خود لکھنؤ کے داستان گویوں نے اضافے کیے ہیں مثلاً جاہ لکھنوی لکھتے ہیں:۔

> یہ بھی واضح ہو کہ صاحب دفتر نے سوائے اصل مصنف سے ہوگی) حال جہانگیر نہیں
> لکھا ہے بلکہ یہ ٹکڑا سب سے ایک دوست شیخ تصدق حسین نامی ایک داستان گو میں
> لکھنوں نے بیان کیا تھا۔" (۹۳/۴)

گویا طلسم ہوش ربا میں جہانگیر بن صاحبقران کی داستان اور طلسم گوکب کے ٹوٹنے کا ماجرا خالص شیخ تصدق حسین کا بڑھایا ہوا ہے۔ قمر لکھنوی نے طلسم ہوش ربا کی چھٹی جلد صفحہ ۱۸ پر داستانِ حمزہ میں اپنی کمی و بیشی کے متعلق اور زیادہ واضح اعتراف کیا ہے۔

> بعض صاحبین نے داستانِ نو بہ نو جدید کو سماعت فرمایا ہے لیکن حقیقی آرزو بڑھاتے ہیں
> ارشاد فرماتے ہیں کہ جس طرح سے حقیقت میں دفاتر یعنی نوشیرواں نامہ وغیرہ و طلسم ہوش ربا
> تو نے بیان کیا یہ داستانِ مہمل دلچسپ کبھی نہ سماعت کی تھیں۔"

ابتدائی سطریں پڑھ کر ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ شاید قمر نے طریقہ بیان کی دلکشی کے متعلق کہا ہو لیکن یہ "داستانِ مہمل دلچسپ" جو قمر کی زبان کے علاوہ کبھی سماعت میں نہ آئیں ان سے تو یہی مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ قمر نے جہاں موقع پایا کچھ ٹکڑے اپنی طرف سے پیوند کر دیے۔

یہ کیفیت "داستانِ حمزہ" کی صرف اسی عہد سے ہمارے سامنے ہے جب سے اردو میں داستان گوئی کا رواج پڑا۔ اب ذرا ۹۸۰ھ اور ۱۰۲۲ھ سے تیرھویں صدی یعنی تقریباً ۱۲۲۵ھ تک کی اس کیفیت پر غور کیجیے جو فارسی قصہ خوانوں کے عہد میں اس داستان پر گزری ہوگی اس کا ایک اندازہ بوستانِ خیال سے ہوتا ہے۔ بوستانِ خیال ۱۱۵۵ھ سے ۱۱۷۰ھ تک لکھی گئی ہے یعنی داستانِ حمزہ کے ہندوستان میں آنے سے تقریباً سو اٹھ سو برس کے بعد میر تقی خیال رموزِ حمزہ کے ساتھ ساتھ کوچک باختر اور بالا باختر کا حوالہ دیتے ہیں۔۔۔ (مقدمہ سراج الابصار ۱/۶) گویا اس زمانہ تک نوشیرواں نامہ، کوچک باختر اور بالا باختر کے نام بھی مخصوص ہو چکے تھے حالانکہ ابتدائی رموزِ حمزہ میں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں صرف چند نام پائے جاتے ہیں ایرج نامہ اور صندلی نامہ اسی سے صاف ظاہر ہے کہ عراق اور ایران کی

منظوم حکایتیں اور داستانیں شامل ہیں جن پر [illegible] مقامی رنگ کی چھاپ [illegible] ہے۔

ان تحقیقی کا اندازہ مخطوطات کی فہرست [illegible] سے ہوتا ہے [illegible]

نمبر ۳۰۵۲ مجموعہ (نوشیرواں نامہ، کرچک باختر، بادا خترو [illegible]) [illegible] ترتیب ۱۲۹۵ھ،

تعداد صفحات ۱۰۵۲ [illegible] سب [illegible] کی ابتدا یوں ہے۔

[illegible]

[illegible]

اور خاتمہ اس طرح ہے:

[illegible]

کل چھتا گرمان:

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۰۲۲ یا ۹۹۸ صفحات [illegible] کے [illegible] ۱۲۰۸ صفحات [illegible] تفصیل ہے [illegible] ہیں۔ [illegible] نہیں کیے۔

نمبر ۳۰۵۳ نوشیرواں نامہ [illegible] تعداد صفحات ۱۰۸۴،

نمبر ۳۰۵۴ مجموعہ کرچک باختر و بادا خترہ [illegible] تعداد صفحات ۱۱۳۴

صاف ظاہر ہے کہ ۳۰۵۲ پر نوشیرواں نامہ، کرچک باختر، بادا خترو ایرج نامہ کا جو مجموعہ تھا اس کے صفحات کی تعداد کل ۱۰۵۲ تھی۔ نمبر ۳۰۵۳ پر صرف نوشیرواں نامہ آیا اور اس کے صفحات کی تعداد ۱۰۸۴ ہو گئی یعنی صرف نوشیرواں نامہ کے صفحات پورے مجموعہ سے بقدر ۳۲ صفحے کے بڑھ گئے۔ یہی حال کرچک باختر اور بادا خترو والے مجموعہ کا ہے کہ اس کے صفحات پورے مجموعہ سے بقدر ۸۲ کے بڑھے ہوئے ہیں۔

یہیں ۳۰۵۵ کے ایرج نامہ کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس پر کاتب کا نام درج نہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ یہ بارھویں صدی ہجری کی تحریر ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد ۸۵۰ ہے گویا صرف ایرج نامہ کی ضخامت۔

یہ مخطوطے زبان کے لحاظ سے [illegible] نہیں پہنچتے بلکہ ان میں ادبی چاشنی نہ ہونے کے برابر ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ترتیب دینے والے فارسی کے ادیب نہیں تھے۔ ان کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ فارسی سے [illegible] کوئی ایسا شخص فارسی لکھتا چلا جاتا ہے [illegible] اپنے زمانے کی عام شہرت کی لسانی سطح سے بلند نہیں بلکہ ۳۰۵۰ پر جو [illegible] کے نام سے ایک مخطوطہ ہے اس کے ترتیب دینے والے کی فارسی ایسی ہے کہ

(۱) صاحبقراں خواجہ عمرو سے اصرار کر رہے ہیں کہ تم بتاؤ زمرد شاہ [illegible] تھا کہاں بھاگ گیا اور اگر نہ بتاؤ گے تو [illegible] دیکھنا [illegible] (۸۰ سے ۱۰ تک کسی صفحہ کی پانچویں سطر)

(۲) صفحہ ۳۳۱ سطر ۱۱ دریں مکان کرشا ہانیہ ذکر شاہ کی جمع کرشاہا ؛

(۳) صفحہ ۳۴۱ سطر ۱۱ میں سے پیوست صفحہ ۳۴۴ ۔ صفحہ ۳۴۵ ۔ عمرو عیار کی کشتی بعنوان غائب شد صفحات ۳۶۱،

۳۶۴ پر فقط اردو لکھنا شروع کر دی ہے مثلاً گفتند اے عمرو صاحبقران ہر ایک صدر بن پر دین پرست ہو کر نام تب خدا نمنہد گل

چراغ گل کر دیا ہے وغیرہ نامہ سل لکھا ہے اس نے بھیجا ہے ۔

گویا اس مخطوطے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی تو اس دور کے عام دفتری لحاظ سے اختیار کی گئی ہے ورنہ کاتب فارسی سے زیادہ اردو پر قادر ہے اور جہاں وہ فارسی سے الجھتا ہے بے تکلف اردو شروع کر دیتا ہے لیکن جیسے ہی اسے محسوس ہوتا ہے کہ میں اردو لکھ رہا ہوں اور زمانہ فارسی کا ہے وہ فارسی شروع کر دیتا ہے ۔

بہرحال یہ مخطوطے خواہ ان کی ادبی حیثیت کچھ ہی کیوں نہ ہو ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ رموز حمزہ میں فارسی قصہ خوانوں نے بہت بڑا اضافے کیے ہیں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ چودھویں صدی کے شروع اور بارھویں صدی ہجری کے اواخر تک قصہ خوانی کا فن جب اردو میں منتقل ہو جانے کے بعد بجائے قصہ خوانی کے داستان گوئی کا فن کہا جانے لگا کتاب بہ کتاب نہیں بلکہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوا ہے یعنی ہر عہد کی کتابوں کا ریکارڈ ہمارے سامنے نہیں بلکہ ہوا یہ ہے کہ کسی عہد میں کوئی مشہور قصہ خوان پیدا ہوا، اس کے دس بیس شاگرد ہوئے ہر شاگرد اپنے جوہر ذاتی کے مطابق قصہ خواں ہو گیا۔ کچھ استاد نے اپنی طرف سے اصل داستان میں چند لگائے کچھ شاگرد صنے استاد ہو کر اپنی کتر بیونت کے جوہر دکھائے اور پھر شاگرد کے جانشینوں کے ؛ تو جب داستان آئی تو انھوں نے بھی کمی نہیں کی۔ اس عالم میں ذرا اس کا اندازہ بھی کیجیے کہ ہر دور میں صرف ایک ہی قصہ خواں نہ رہا ہوگا یا ایک ہی قصہ خواں کا ایک ہی شاگرد کامل الفن نہ ہوا ہوگا۔ سودو ہی کئی قصہ خواں ہوں گے : ایک ایک قصہ خواں کے کئی کئی شاگرد اپنے فن میں کامل ہو گئے ہوں گے۔ ہر استاد نے دوسرے سے آگے جانے کی کوشش کی ہوگی۔ ہر شاگرد نے اپنے پیر بھائی سے جداگانہ طرز بیان اختیار کرنے کی کوشش کی ہوگی اور داستان حمزہ ہر دور میں کچھ نہ کچھ آگے ہی بڑھتی رہی ہوگی۔

ان حالات میں منشی نولکشور کے اس زمانے تک جب انھیں اس داستان کو چھاپنے کا خیال پیدا ہوا اگر "رموز حمزہ" سے آگے بڑھ کر داستان حمزہ اپنی مطبوعہ حدود تک آگئی تھی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے اسے ضرور آگے بڑھنا چاہیے تھا۔ بہ چند کے مشہور قصہ خواں کے ہاتھوں ضرور آگے بڑھی لیکن قصہ خوانی کا فن چونکہ "علوم سینہ" میں شامل تھا اور ظاہر ہے کہ علم سینہ کے متعلق روایت یہی ہے کہ "گنجینہ در سفینہ" اس لیے اس کی کوئی تحریری یادگار کسی عہد میں قائم نہیں ہوئی نہ کبھی یہ موجودہ سلسلے کے ساتھ کتابی صورت میں لکھی گئی ——— اگر ایسا ہوتا اور یہ فارسی میں بھی سلسلہ وار لکھی جاتی تو اس کے مکمل مخطوطے خواہ بوڈلین لائبریری اور انڈیا آفس لائبریری میں ہوتے یا نہ ہوتے رضا لائبریری رام پور میں ضرور ہوتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے جب دہلی لکھنؤ بہ مدد آیلوں کی حکمرانی انگلستان سے محدود ہو کر صرف رام پور کی حدود تک رہ گئی اور "کیپٹن بہادر" کی حکومت کی "ناخواستہ سرپرستی" نے "حوصلہ مند اور مہم جو" روہیلوں کی تلواروں کو نیام کر کے گھر کی کھونٹیوں پر لٹکا دیا تو ان شیران نیستان شجاعت نے میدان جنگ کی خونریزی کے جذبے کو صحبت ہنشاد ... داستان جنگ و عشق کی صورت میں ڈھال دیا۔ "پٹھان شاعری کرنے لگے" اور دربار رام پور داستان گو صاحبقران سننے لگا۔ دہلی اور لکھنؤ کے منتخب داستان گو دربار رام پور میں جمع ہو گئے چنانچہ بوستان خیال کی ژولیدہ بیانی کو رفع کرنے

اور داستانِ حمزہ کو فارسی میں لکھنا [illegible] سے [illegible] جو کہ [illegible] کشمیر میں [illegible] چھپ کر [illegible]
واقعات حمزہ کا [illegible] یہ حقیقت ہے کہ آج [illegible] اردو داستانوں کے [illegible] فارسی مخطوطوں سے ثابت ہوتی ہے آخر
کیا بات ہے کہ رموزِ حمزہ کے بعد [illegible] بڑی بڑی [illegible] جیسا [illegible] اور [illegible]
کیسی داستانِ حمزہ کا کوئی فارسی سلسلہ [illegible] مستقل کتاب [illegible] پایا جاتا ہے۔ [illegible]
پایا جاتا ہے۔ اس کا مرکز کا سلسلہ [illegible] اور [illegible] ہیں [illegible] کہ اول [illegible] کہ [illegible] نے
اور پھر اس کا اردو میں ترجمہ کرنے کا کام [illegible] کے [illegible] تھا۔ [illegible] نے اجازت دی [illegible]
اور [illegible] اور [illegible] نولکشور پریس لکھنؤ نے [illegible] مکمل کر لیا۔

[illegible] کے [illegible] سے [illegible] کے [illegible]
[illegible] جانتے تھے کہ [illegible] کامیابی ہے [illegible]
اس کے بعد [illegible] کے [illegible] سلسلہ [illegible] سے [illegible]
یہ جس قصہ [illegible] کہیں [illegible] پایا جا [illegible] قصہ [illegible] مکمل [illegible] حمزہ کو [illegible]
کہیں نہ تھی۔ اگر کہیں ہوتی تو [illegible] کر [illegible] قیمت [illegible] کہیں نہیں پائی گئی [illegible] قیمت [illegible] کوشش سے [illegible] کر نہ
سکی۔ اس لیے کہ کہیں ہوتی تو آتی [illegible] داستان [illegible] مصنف [illegible]
دوسرے [illegible] لکھنؤ سے [illegible] گئے ——— بہرحال یہ کہیں کسی کہانی [illegible] ہوتی تو [illegible] سے [illegible]
تو [illegible] نے لکھنا چاہی [illegible] کی [illegible] کے ساتھ [illegible] صورت میں ——— [illegible] نواب [illegible] سعید [illegible] سے [illegible]
کے [illegible] نواب [illegible] محمد رضا علی خاں کے [illegible] داستان [illegible] بھی [illegible] ——— [illegible] کہ [illegible] آثار [illegible]
اور [illegible] میں لکھ چکا ہوں [illegible] سے پہلے داستانِ حمزہ کا فارسی میں اسی سلسلہ [illegible] تفصیل سے پایا جانا [illegible]
صورت میں پایا جانا ثابت نہیں ——— ثابت ہوتا ہے کہ داستانِ حمزہ [illegible] کے علاوہ اسی صورت [illegible] داستان [illegible]
[illegible] نولکشور پریس نے [illegible] داستان گویوں سے [illegible] اردو میں لکھوایا اور طبع کر کے شائع کر دیا۔

پہلے ۱۹۵۲ء میں

پھر ۱۹۵۵ء میں

نقوش

کے افسانہ نمبر منظرِ عام پر آئے تھے

اب ۱۹۶۰ء میں بھی

ایک غیر فانی افسانوی دستاویز

پیش کی جائے گی

دل شاہجہانپوری کا غیر مطبوعہ کلام

جو تحریر میں خاص [illegible] شاہجہانپوری کا [illegible] غیر مطبوعہ [illegible] انتقال کے بعد [illegible] [illegible] تحقیق [illegible] شاہجہانپوری کے [illegible] [illegible]۔

[illegible] قعدہ [illegible] صحت [illegible] [illegible] [illegible] ٹوٹ جاتے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] شاغل جاری رہ سکے۔

۲۲ [illegible] کی شب [illegible] فالج کا دورہ پڑا [illegible] صحت ختم [illegible] اور ایک شعر کہا ہے

بہت ہے [illegible] ہستی
ساقی کچھ کس سے [illegible] ہے

۲۵ [illegible] حالت میں [illegible] زبان [illegible] ہاتھ باہر نکالتے تھے [illegible] ایسا معلوم ہوتا تھا کہ [illegible] ہے۔ [illegible] میں دو مصرعے پڑھے

(۱) جیسی اب ہے مری حالت کبھی ایسی تو نہ تھی
(۲) اجل اتنی تو مہلت دے کہ اک سجدہ ادا کر لوں۔

۲۶ کو صبح کو پکارا تو کوئی جواب نہیں دیا۔ قوت گویائی ختم ہو چکی تھی۔ ناک سے کچھ خون بھی بہا۔ ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا کہ دماغ پر فالج کا شدید حملہ ہو گیا ہے موت و حیات کی اس کشمکش میں اسی دن کے نہایت سکون کے ساتھ روح پرواز کر گئی۔ ۵ بجے شام بعد نماز عصر سپرد خاک کر دیا گیا۔"

○

حسن نے مان لیا قابلِ تعزیر مجھے
نظر آئی ہے محبت کی یہ تقصیر مجھے

کیوں نہ ہو بادۂ سرجوش کی توقیر مجھے
مل گئی پیرِ خرابات سے تحریر مجھے

جلوۂ حسن کے مفہوم پہ جب غور کیا
ایک دھندلی سی نظر آئی ہے تصویر مجھے

اب مری وحشتِ رسوا کا عجب عالم ہے
کر دیا آپ نے وابستۂ زنجیر مجھے

بے تکلف رخِ زیبا سے اٹھائے وہ نقاب
حسن خود پائے گا اک پیکرِ تصویر مجھے

زندگی اک نئے عالم میں نظر آتی ہے
لے چلی آج کہاں گردشِ تقدیر مجھے

کھا گئی دلکشیٔ حسن مری نظروں میں
جی بہلنے کو ملی آپ کی تصویر مجھے

زلفِ شب گوں رخِ انور کی ستائش کے سوا
کوئی مضمون نہ ملا قابلِ تحریر مجھے

حسنِ دلکش کے تعلق پہ نظر جب پہنچی
نہ رہا پھر گلۂ گردشِ تقدیر مجھے

○

ہر سانس ہے شرحِ ناکامی پھر عشق کو رسوا کون کرے
تکمیلِ وفا ہے مٹ جانا، جینے کی تمنا کون کرے

جو غافل تھے ہشیار ہوئے جو سوتے تھے بیدار ہوئے
جس قوم کی فطرت مردہ ہو اس قوم کو زندہ کون کرے

ہر صبح کٹی، ہر شام کٹی، بیداد سہی، افتاد سہی
انجامِ محبت جب یہ ہے اس جنس کا سودا کون کرے

حیراں ہیں نگاہیں دل بے خود مجبور ہے حسن بے پروا
اب عرضِ تمنا کس سے ہو اب عرضِ تمنا کون کرے

فطرت ہے ازل سے پابندی کچھ قدر نہیں آزادی کی
نظروں میں ہیں دلکش زنجیریں رخ جانبِ صحرا کون کرے

○

جہاں تک عشق کی توفیق ہے رنگیں بناتے ہیں
وہ سنتے ہیں ہم ان کو سرگزشتِ دل سناتے ہیں

ادھر حق الیقیں ہے اب وہ آتے اب وہ آتے ہیں
اُدھر انجم مری اس ذہنیت پر مسکراتے ہیں

شبِ غم اور مجبوری، یہ عالم اور مجبوری
ٹپک پڑتے ہیں آنسو جب وہ ہم کو یاد آتے ہیں

وہیں سے دورِ حسن و عشق کا آغاز ہوتا ہے
جہاں سے واقعاتِ زندگی ہم بھول جاتے ہیں

ہمیں کچھ عشق کے مفہوم پر ہے تبصرہ کرنا
اک آہِ سرد کو عنوانِ شرحِ غم بناتے ہیں

بہا کر اشکِ خوں کھینچی تھیں جو آئینۂ دل میں
ہم ان موہوم تصویروں کو اب رنگیں بناتے ہیں

شبابِ زندگی، جلووں کا اک معصوم نظارہ
ہمیں اے دل وہ افسانے ابھی تک یاد آتے ہیں

بے سود ہے یہ جوشِ گریہ اے شمع سحر ہو جانے تک
چھینٹا ترے اشکِ پیہم کا پہنچا نہ کبھی پروانے تک

اے اہلِ نظر میری ہستی سب کچھ تھی کبھی اب کچھ بھی نہیں
زندہ ہوں مگر معیارِ بقا اک سانس کے آنے جانے تک

ہاں غور سے اک خوددار نظر اپنے ہی گریباں پہ ناصح
کیا جانے رہے گا کس حد میں دیوانہ تجھے سمجھانے تک

اے خاکِ پریشاں کے ذرّو، آغوش میں تم مجھ کو لے لو
تمکین و خودی کو ٹھکراتا آیا ہوں میں ویرانے تک

آشفتہ نظامِ ہستی ہے کچھ اور نہ برہم ہو جائے
مشاطۂ فطرت کے ہاتھوں گیسوئے بتاں سلجھانے تک

وعدہ ہے مگر کس عالم میں اک شوخ تغافل فطرت کا
جب لیلیٰ شب کے بل کھاتے گیسو اتر آئیں شانے تک

○

اب کوئی غم گسار ہمارا نہیں رہا
دنیا کو اعتبار ہمارا نہیں رہا

اس فرطِ غم میں خون کے آنسو ٹپک پڑے
اب دل بھی رازدار ہمارا نہیں رہا

اس کی حضورِ پیرِ مغاں میں ہے منزلت
جو عہد پائیدار ہمارا نہیں رہا

ہر داغ ابھر کے زخم بنا زخم رشکِ گل
دل مائلِ بہار ہمارا نہیں رہا

یہ ہے مآلِ صحبتِ زاہد جنابِ دل
رندوں میں اب شمار ہمارا نہیں رہا

حامد عزیز مدنی

اے عروسِ سخن

ہزار درد فسردہ ہیں میں نے دل کے لیے
ہزار شیونِ جاں ہے کہ ایک پردۂ ساز
ہزار کاوشِ سخن آشنا کے بعد بھی کچھ
لرز رہی ہے ترے نام سے مری آواز

تجھے خبر ہے مری لے ہے ایک مدت سے
ہجومِ کاوش میں مانندِ آتشِ چقماق
اسی خزاں میں جو موجِ نفس کے ساتھ گئی
ملیں گے صوت و صدا کے ہزار ہا اوراق

سکونِ ہجر میں بدلی تھی آرزوئے وصال
کہ دستِ شوق سے دامن تھا نارسیدہ بہت
تو ہی تو خلوتی دیر آشنا ——— نکلی
رسومِ پردہ کشائی سے سرکشیدہ بہت

کوئی محل یہ تری برقع افگنی کا نہ تھا
تجھے خبر ہے مرا کارواں ابھی راہ میں ہے
یہ نذرِ اوّل و آخر ہے اے عروسِ سخن
رگِ گلو کا لہو تیری بارگاہ میں ہے

معذرت

(معذرت کی بھی پشیمانی ہے) قزلی

ہم نے مانا نژاد نو ہے ابھی — شب تیرہ میں جگنوؤں کا جلوس
صنعت خامکار کے ہاتھوں — حرف کے آئینے میں سب معکوس
اب وجہ کی زباں ہے اس کے لیے — اجنبی ملک کا کوئی جاسوس
اس کی لکنت ہے آپ اک معترض — اس کی فرہنگ طاق پر محبوس
بدگمان محاورات سے ہے یہ — میوۂ خشک و تر سے مایوس
اس کے شرب مدام کی خاطر — ہر پیالے میں عکس چین و روس
اس کے ارژنگ میں نہیں ملتے — چشم آہو و کلغی طاؤس
یہ کہ محروم دانش پیشیں — یہ کہ ناآشنائے گبر و مجوس
لیکن اسے قبلۂ سخن گویاں — خام جبعان راہ کا یہ جلوس
کس سے کہیے کہ کس طرف ہے رواں — بات پر ہول راہ نامانوس
ہر نفس اک سکوت مرگ اثر — ہر نفس اک صدا ہے قرنا و کوس
ہر ہیولے میں ایک عالم جان — ہر تصور میں عالم محسوس
جن رصدگاہ کے پڑھاتے ہیں — ہندسہ و ہیئت کا نیا قابوس
ہر مساوات کیمیائی ہے — سر مجلس اشارۂ مانوس
آج جادوگروں کے منتر سے — کوزۂ گل میں بحر اقیانوس
فرصت یک نفس نہیں ملتی — ایک ہی رُت ہے کوئی ماگھ نہ پوس
دل میں اتری ہے موج زہر آگیں — سر پہ ٹھہری ہے ساعت منحوس
کیا حنا بندیٔ عروس خیال — کیا عروس خیال کا ملبوس
رشتہ ہائے نظر دھواں ہیں تمام — بجھ گئی شمع سو گئے فانوس

زخم سر سے بدل گئے یہ لوگ
تاب صد آبگینۂ ناموس

جُرم

کل صبح کی تازہ دم ہوا میں
بازو پہ مرے وہ سو گیا تھا

تالیفِ خیال کر رہی تھی
اسلوبِ بدن کی خوشگواری
کیا کیا تھی نزاکتوں کی ہمراز
چادر تھی کہ نافۂ تتاری
ساحل کے سکوں میں کھو گیا تھا
ٹھہرا ہوا رود ہم کناری
کہتے ہیں وصال کا یہ انداز
آئینِ وجود و ضربِ کاری
جو ہاتھ اُسے حریفِ تعزیر
اس ہاتھ کی ضرور پاسداری۔
اِنسان کے قدیم جرم ہی نے
رکھ دی تھی بنائے غمگساری

آبادی کے دائرے

اے برادر۔ بازداں مختار قاری۔ کچھ نہ پوچھ
یہ سرِ قرطاس آبادی کے دو کھوں۔ دائرے
کس کے یہ تابوت ہیں کس کی عماری کچھ نہ پوچھ

سرد تاریکی میں دھندلے دائرے کھوئے ہوئے
بے نکالی کھیتیاں تشکیک کی ہیں دُور تک
بیج چوب دوار کے الفاظ میں بوئے ہوئے

دائرے تاریک، خونیں، آتشیں ژولیدہ مو
آپ خود اپنا غیاب و آپ خود اپنا حضور
جنبش پرکار کا دوڑا نہیں جن میں لہو

نیشِ عقرب کی طرح حرص و ہوا کی بے کلی
دل زدوں کے دائرے تیرہ طلب کی بارگیں
رشک کے تاریک کوچے خوف کی اندھی گلی

ٹین کے ڈبے، پرانی بوتلیں، میراثِ جد
ظلم کی بے حس کمیں گا ہیں جی ایل اوٹ سے
کاٹ دی ہے دیمکوں نے زندگی کی تازہ حد

مہ وشانِ نیم رُخ کے دائرے حصیاں کے خواب
آسیا گرداں بتول و مریم تنہا نشیں!
آتشِ خوابِ زلیخا، رونقِ زنداں کے خواب

اک بدن رقاصِ حبشی، آبنوسی اک شجر
جلبل کی آواز سے جنتی درندوں کی جھان
مہ وشانِ نیم عریاں کی بلوتی ہے ——کمر

دائرے زرخیز، چٹیل آب و روغن کے حصار
بطنِ معدن آگ دریاؤں کے چہرے آئینے
حلقہ ہائے باد و باراں، کشت و خرمن کے حصار

مٹنک سے دبتے ہوئے بچوں میں فصلیں بے سبیل
رحم میں تاریخ افلاسِ جہاں، لب پر سوال
خشک سالی، خشک سالی سے زمیں کے رُخ پہ نیل

سخت تریاکی دھویں میں ضو فشاں محنت کی آنکھ
سوئیاں میتاب میٹر میں ہیں محوِ شمار،
پڑھ رہی ہیں ایک تحریرِ رواں محنت کی آنکھ

ساحلوں کا جن ہے خوابیدہ جہازوں کی قطار
پی رہے ہیں رات کی نیلی سیاہی میں لہو
دو رنگ پٹرول کے چشموں پہ گرگِ ریشہ دار

ہم شبِ جہل میں گم، ہم خود سیاروں سے کھیلیں
بازیٔ چوگاں، خداؤں کی بساطِ خاک — پر
خون منظر کر گیا ہے اپنے اوتاروں سے کھیل

وقت سے تفریح ہے ذوقِ جنوں کے راز میں
سر بریدہ جا رہی ہیں، زندگی پہلی ساعتوں کے ہم
زندگی کی دوڑ میں ایک نیزہ خوں کے ساز واں

اے برادر یوں نہ جا، ان دائروں سے درمیاں
تیرتا ہے اس فضا میں اک ہجومِ ارواح کا
اس طرف دوزخ کی آبادی کا آتش کے صحن

دائرے وہ زندگانی کے سفر کی راہ میں
راستہ کھویا ہوا، تاریک جنگل کا محیط
روشنی آتی نہیں ہے ہم سب بے آگاہ ہیں

کوئی شاخ آشنا

شہر پر نیلے دھوئیں کی سامری زنجیر ہے
جل رہا ہے سینۂ خورشید میں داغِ غروب
روشنی مجروح طائر کی طرح — دلگیر ہے

کچھ غلامانِ کہن پرچھائیاں حبشی نژاد
کھینچتے نکلے ہیں عصیاں کا سبک رفتار رتھ
وقت کی جنبش بدی کے چابک کو دیتی ہے داد

خواب و بیداری کے تیرہ فاصلوں کے درمیاں
کتنے اندیشوں کی بے حلقہ جرسیں کھول کر
ناپتا ہے اس خلا کو ایک وقتِ رائگاں

رات کے ہاتھوں چلے جانے کو ہیں نیلام میں
شہر، بندرگاہ، سیارے، سمندر روشنی
دور تک بکھری ہوئی اشیا ہیں اک گودام میں

جزر و مد کے بیچ میں ساحل کا ساکت پاؤں ہے
سو رہے ہیں آہنی جہازوں کے قطار اندر قطار
سینۂ قلزم میں گم ہوتی ہوئی اک چھاؤں ہے

روحِ قزاق و سکندر۔ لشکری بھر ہے
ان حریفوں کا طرے بھی سر ہوتا نہیں
قلزمِ چناب کس کی آمد میں مگر ہے

دور تک ہے اس فضا میں خوابِ بیداری کی جھلک
شہر سے گزری ہے آوارہ ہوا ترکش مدہوش
جانے کس سینے میں اُترے خلشِ تب ناز نگ

دور تاریکی کی چادر سے شرر اُڑتے ہوئے
رات کے جنگل کا جادو ریوڑے کی دُکشاب
اک دھویں میں آہنی فیلوں کے دل ہٹتے ہوئے

اس فضا میں وقت، درد، ہجر و آغوشِ وصال
اک شعورِ ضعف تازہ نصف گرم آلودہ ہے
طالبِ جاں قرب پر پھیلا ہوا ہلدی کا جال

تیز قندیلوں میں سعیِ زندگی کے زاویے
رہگزر پر سیکڑوں رنگوں کی اک پیکار ہے
خستگی کے زاویے۔ دلبستگی کے زاویے

چشمکِ ادراک کے خوابِ جنوں کے مرحلے
طعنۂ نایافت دیتی ایک موجِ ابر و باد
مرگ کی قوسیں، تغیر کے ہزاروں سلسلے

اس فضا میں وقت ۔۔ روحِ جنبش و جانِ جمود
تتلیوں کے بھولے روپوں کے نازک جسم میں
استخوانوں سے لپٹتی زندگی کی موجِ دُود

منعِ زندگانی ، اجتنابِ زندگی
کربِ تولید و فشارِ جانکنی کی ساعتیں
درد کے اعشاریوں میں اک حسابِ زندگی

اے دل اے پامالِ جاناں اے مری جتابِ صبح
ڈھونڈ تو بھی درد کے تنہا نشیمن کے لیے
کوئی شاخِ آشنا بے آشیاں بے خوابِ صبح

فراق گورکھپوری

○

یاد آتی ہیں تری رعنائیاں
دل میں پڑتی ہیں کئی پرچھائیاں

جلوے کی تکرار ممکن ہی نہیں
کتنی یکتا ہیں تری یکتائیاں

زندگی گھبرا اٹھوں میں کٹ گئی
پوچھتے ہو کیا مری تنہائیاں

آفتابوں پر کمندیں ڈال دیں
اُف مری تخئیل کی گیرائیاں

کیا سمجھتا تھا کوئی جانِ بہار
رنگ لائیں گی مری رسوائیاں

دونوں عالم لائیں گی زیرِ نگیں
بے نوائے عشق کی دارائیاں

خالقِ آفاق بھی دیکھا کیا
مُشت مُشتِ خاک کی پیمائیاں

زندگی کے راز مجھ سے جان لے
میری نادانی نہ کر دانائیاں

خار و خس بھی بن گئے شاخِ نبات
ان نگاہوں کی حیات افزائیاں

ہاں نہ تھا یہ دل جب اک اُجڑا نگر
یاد آتی ہیں وہ بزم آرائیاں

زندگی کو ان نگاہوں کے طفیل
موت کی آنے لگیں انگڑائیاں

عشق کو یارو بُرا کہتے تو ہو
اس میں پاؤ گے کہیں اچھائیاں

عشق کے کچھ جھوٹ ہم سُنتے گئے
ہاتھ کچھ آتی گئیں سچائیاں

نہ سُنی میری نہ دنیا کی سُنی
عشق کی اللہ رے خود رائیاں

زیرِ پا بھی دور بھی ہیں منزلیں
دیدنی ہیں عشق کی پسپائیاں

کھنچتی جاتی ہیں دلوں کی شہ رگیں
اُف تری اٹھتی ہوئی برنائیاں

دیکھ آئے آج یادوں کا نگر
ہر طرف پرچھائیاں پرچھائیاں

ذرّہ ذرّہ اس خرابے کا فراق
ہے دو عالم کی لیے پہنائیاں

احمد ندیم قاسمی

○

کتنے تارے تھے جو شرمندۂ تاثیر ہوئے
ریگِ زریں پہ کبھی قصر نہ تعمیر ہوئے

جن کو شاخوں سے اڑا لے گئیں امواجِ صبا
وہی گل خاکِ چمن کے لیے اکسیر ہوئے

شب کے پہلو میں کہیں پھوٹ رہی ہے پو بھی
کبھی دنیا میں اندھیرے نہ جہانگیر ہوئے

ہم اصولوں کے حصاروں میں چھپے لاکھ، مگر
اک نگاہِ غلط انداز سے تسخیر ہوئے

وہی آواز کی قوسیں، وہی تانوں کے خطوط
چند نغمے تھے جو ڈھل کر تری تصویر ہوئے

ایک انداز تو ہے بے سروسامانی کا
ہم تری دھن میں ترے غم سے بغلگیر ہوئے

ایک امیدِ ملاقات نے مرنے نہ دیا
زندگی بھر ترے پیماں ہی عناں گیر ہوئے

تجھ سے مل کر تجھے پا لینے کی حسرت جاگی
کچھ نئے خواب ترے خواب کی تعبیر ہوئے

اک خلا طے ہوئی اک اور خلا کی حد پر
اپنے شہپر نہ ہوئے، حلقۂ زنجیر ہوئے

ہم نے لفظوں میں لہو اپنا دمکتا پایا
لوگ وارفتۂ رنگینیٔ تحریر ہوئے

صوفی تبسم

O

جب اشک تری یاد میں آنکھوں سے ڈھلے ہیں
تاروں کے دیئے صورتِ پروانہ جلے ہیں

کیا جانیے یہ رند بُرے ہیں کہ بھلے ہیں
ساقی کی نگاہوں کے اشاروں پہ چلے ہیں

سو بار بسائی ہے شبِ وصل کی جنت
سو بار غمِ ہجر کے شعلوں میں جلے ہیں

ہر آن اُمنگوں کے بدلتے رہے تیور
ہر آن محبت میں نئی راہ چلے ہیں

مہتاب سے چہرے تھے ستاروں کی نگاہیں
ہم لوگ انہی چاند ستاروں میں پلے ہیں

نوچے ہیں کبھی ہم نے حوادث کے گریباں
ناکامیٔ کوشش پہ کبھی ہاتھ ملے ہیں

تاریک فضاؤں کے اُبھرتے رہے طوفاں
پھر بھی تری یادوں کے دیئے خوب جلے ہیں

محسوس یہ ہوتا ہے کہ دنیا کی بہاریں
اُس گلکدۂ ناز کے سایے کے تلے ہیں

یونہی تو دل آویز نہیں شعرِ تبسم
یہ نقش ترے حسن کے سانچے میں ڈھلے ہیں

کبھی بر طارمِ اعلیٰ نشینم

جگن ناتھ آزاد

برادرم، آداب!

بُرا نہ مانیں، میں اس قسم کی براہِ راست شاعری کے بڑا خلاف ہوں
ایک آدھ چیز پہلے بھی (بادلِ نخواستہ) چھاپ چکا ہوں۔ مزید نہ
چھپوائیں۔ آپ اس عمر میں زندہ ہیں۔ میں آج سے بھی پہلے مرچکا ہوں
بات یہ ہے کہ میں شاعری اُسے ہی سمجھتا ہوں۔ جو الفاظ
اور کنایوں میں ہو۔ میں اشتہار کو پسند نہیں کرتا۔ (مدیر)
(غالباً یہ میرے ہی خط کے جواب میں جنابِ آزاد نے نظم کہی ہے)

ایک خط کے جواب میں

اے آسمانِ صدق و صفا کے مہِ تمام — اے تیری یاد مرجعِ تکریم و احترام
ہر لفظ تیرا بادۂ اخلاص کا ہے جام — میرے سخن سے آج نہیں ہے تو شادکام
تیری طرف سے گرچہ شکایت کی بات ہے
لیکن مری نظر میں محبت کی بات ہے
ظاہر ہوا ہے یہ ترے تازہ پیام سے — مجھ کو ذرا سا شکوہ ہے میرے کلام سے
چھلکی ہے مے جو میرے تغزل کے جام سے — شاید کہ ہٹ گیا ہوں کچھ اپنے مقام سے
کل تھا جو ذکرِ عظمتِ انساں لیے ہوئے
وہ دل ہے آج کیوں غمِ جاناں لیے ہوئے

[illegible] مقامات　　　[illegible]
[illegible] زمانے کے [illegible]　　　[illegible] دل کی [illegible]

اک نظم ایک ملک کی تصویر بھی تو ہے
اک شعر ایک صبح کی تنویر بھی تو ہے

میرے کلام میں ہے بہاروں کا نور بھی　　　ساون کی تیرگی بھی، سحر کا ظہور بھی
طوفان رنج کا بھی، طرب کا وفور بھی　　　دل صبر و شکر بھی ہے ہوا کا سرور بھی

غم میں بھی ہوں خوشی کے بہانے لیے ہوئے
نغمے ہیں ہر دو لب پہ ترانے لیے ہوئے

مانند جامِ جم ہے مری شاعری کا جام　　　فکر کہیں جنوں کا، خرد کا کہیں پیام
اک زندگی ہے [illegible]　　　لیکن کہیں نہیں ہے تصنع کا اہتمام

خود نظم لفظ بن کے زباں سے نکل گیا
جو دل میں آگیا وہ غزل میں ڈھل گیا

میرے کلام میں ہے سیاست کا رنگ بھی　　　تصویرِ صلح بھی ہے تماشائے جنگ بھی
ہے دار بھی جوشِ جنوں بھی امنگ بھی　　　تیغ و تفنگ بھی ہے رباب اور چنگ بھی

اس میں ہے خامشی بھی ترنم بھی اس میں ہے
فریاد بھی ہے اس میں تبسم بھی اس میں ہے

گہرائی بحر کی بھی پہاڑوں کا اوج بھی　　　میرا سخن ہے ساحلِ دریا بھی موج بھی
اس میں دکھائی دے گی جوانوں کی فوج بھی　　　دراج و سارس و طوطی و بلبل کے زوج بھی

ساحل کا ہے سکوت بھی ندی کا شور بھی
لہروں کے زمزمے بھی بھنور کا ہے زور بھی

محمود کا بیاں بھی ہے ذکر ایاز بھی　　　گویا نیاز بھی ہے مرا شعر ناز بھی
اس میں ہیں زندگی کے مسائل بھی راز بھی　　　میرے سخن میں سوز بھی ہے اور ساز بھی

محبوب کا الم بھی زمانے کا غم بھی ہے
بے کیفیِ حیات بھی ہے کیف و کم بھی ہے

شاید کچھ اس میں فلسفۂ زندگی بھی ہو　　　علم و عمل کے ذکر کی تابندگی بھی ہو
ممکن ہے شمعِ فکر کی رخشندگی بھی ہو　　　کچھ زیست کی گداز سے پائندگی بھی ہو

شاید نہاں ہو اس میں خموشی بھی ذکر بھی
اقبال کا گداز بھی، غالب کی فکر بھی

مانا کہ اپنے دل کے سکوں سے ہوں دور بھی ‏ ‏ ہوں فیض یابِ لذتِ کیفِ حضور بھی
ہوں اپنے ہوش ہی کے نشے میں ہوں چور بھی ‏ ‏ ہوں صاحبِ جنوں بھی مگر باشعور بھی
ویسا ہی کچھ کہ دل میں جو پالے ہوئے ہوں میں
اس کو بہ فیضِ عقل سنبھالے ہوئے ہوں میں
شعر اس میں عشق کی تو خرد کا ہے نور بھی ‏ ‏ اس جام میں ہے علم کی مے کا سرور بھی
جس بزم میں ہے جوشِ جنوں کا وفور بھی ‏ ‏ اس میں ضیا طرازیِ شمعِ شعور بھی
دل سرنگوں ہے عقل کے دربار میں کبھی
آوارہ حسن و عشق کے بازار میں کبھی
اس میں ہے سازِ دیر تو سوزِ حرم بھی ہے ‏ ‏ یزداں کا ہے جلال، جمالِ صنم بھی ہے
شاہی کی اس میں عظمت و جاہ و حشم بھی ہے ‏ ‏ جمہور کا اسی میں پرافشاں علم بھی ہے
دل اپنا ذرّے ذرّے پہ قرباں کیے ہوئے
یہ کائنات کو ہے جلو میں لیے ہوئے
پیغمبروں کا ذکر مری شاعری کی جان ‏ ‏ قائم اسی کے دم سے ہے میرے سخن کی آن
کچھ منکروں نے بھی تو دکھائی ہے آن بان ‏ ‏ یہ بھی ہیں میری بزمِ تکلم کے میہمان
ذرّے بھی بزم میں ہیں ستاروں کی ضو بھی ہے
ظلمت کی مد بھی اور چراغوں کی لو بھی ہے
تمنائے حیات کے ساغر پیے ہوئے ‏ ‏ کیا جانے کتنے زخم ہوں دل پر لیے ہوئے
اک ہاتھ اپنا دستِ جنوں میں دیئے ہوئے ‏ ‏ اک ہاتھ سے ہوں چاک گریباں سیے ہوئے
ہیں پاؤں خار پر تو نظر پھول پر مری
گل ریز و خار بیز ہے یوں رہگزر مری
اس شاعری میں فکر کی پیدا جھلک بھی ہے ‏ ‏ کیفیتِ حیاتِ بشر کی لہک بھی ہے
درد و گدازِ عشق و جنوں کی کسک بھی ہے ‏ ‏ اک گلبدن کے ذکر کی اس میں مہک بھی ہے
حیرت میں ہوں میں اس کو فقط گلبدن کہوں
یا نو بہارِ نازِ فضائے حسیں کہوں
اُس نو بہارِ ناز سے اک دل کی بات تھی ‏ ‏ وہ نغمہ جس میں اک مری مشکل کی بات تھی
طوفاں میں گھر کے لذتِ ساحل کی بات تھی ‏ ‏ منزل سے دور راحتِ منزل کی بات تھی
میں بات کر رہا تھا بڑے احترام سے
اپنی نیازمندیٔ دل کے مقام سے

وحشی بجا ہے کل جو یہاں تھا مرا کلام　　　شاید تری نگاہ میں تھی وہ خراب نیم
در اصل ہے بہت دور سے لہجہ قلعہ جام　　　ہو یہاں بحث کی تھی مری شد کی تمام

میرا لہو تھا وہ جو مرے گلے کی شے نہ تھی
بس معذرت کہ وہ ترے پینے کی شے نہ تھی

اس پر بھی اپنے آپ کو کہہ بے خبر ہوں میں　　　کہتا نہیں ہے پھول ہر اک سنا خوشبو کی
قبضہ ہوں میں کہ شک ہو ہی یا مر بھی　　　جو ناز ہے اسد مرا نقش ہوا ہوں میں

• کیسے کہی ہے جو ہوش بھی کچھ نہ جان کی ہے
پھر راز نہیں ہوں میں کسی کمال کی ہے

فضل کریم فضلی

○

آرزوئے دل نہ بڑھنی تھی مگر بڑھتی گئی
مختصر سی بات، قصہ مختصر، بڑھتی گئی

ہم نے چاہا تھا انھیں حدِ نظر تک ڈھونڈ آئیں
جس قدر بڑھتے گئے حدِ نظر بڑھتی گئی

ویسے ویسے دل میں پیدا وسوسے ہوتے گئے
جیسے جیسے ان کے آنے کی خبر بڑھتی گئی

اور تو سب نقش دل سے خود بخود مٹتے گئے
ایک ان کی یاد تھی جو عمر بھر بڑھتی گئی

بڑھتے بڑھتے بڑھتے چشمِ گریاں بن گیا
کیجئے کیا وسعتِ دامانِ تر بڑھتی گئی

ہر دعائے بے اثر کا یہ اثر الٹا ہوا
ہر دعا کے ساتھ امید اثر بڑھتی گئی

راہ بھی پُر پیچ تھی، رہبر بھی ناواقف سا تھے
دُوریٔ منزل، درازیٔ سفر بڑھتی گئی

داخلِ زنداں اسیرانِ وفا ہوتے گئے
اور بھی کچھ رونقِ دیوار و در بڑھتی گئی

زیرِ لب فریاد پر بھی سرگراں صیاد ہے
اور نصیبِ دشمناں یہ لے اگر بڑھتی گئی!

جیسے جیسے اہلِ فن پر تند میں ہوتی گئیں
ویسے ویسے شوخیٔ خونِ جگر بڑھتی گئی

ہے تو فضلیؔ بے ہنر لیکن اب اس کا کیا علاج
اس کے دم سے دمبدم قدرِ ہنر بڑھتی گئی

عبدالحمید عدم

○

میکدے کا تیز پانی اور ہے
نشۂ عہدِ جوانی اور ہے

آپ کو نیند آتی ہے تو کل سہی
صرف تھوڑی سی کہانی اور ہے

مسکرانے پر بھی تم راضی نہیں
کیا ابھی کچھ بدگمانی اور ہے

جستۂ خیر اور کو کبھی جانے بھی دو
اس کی درپردہ کہانی اور ہے

کاٹ ہے تلوار کی بھی کچھ مگر
تیری پلکوں کی روانی اور ہے

توبہ کرتا ہوں تو آتا ہے خیال
ایک جامِ ارغوانی اور ہے

دشمنوں کے دل تو ٹھنڈے ہو گئے
دوستوں کی مہربانی اور ہے

○

نزاعِ دیر و کعبہ بڑھ گئی ہے
خدا کو مان اب پردہ اٹھا دے

اگر میں بھول سکتا ہوں تو ظالم
خدا کے واسطے مجھ کو بھلا دے

دعائیں دینے والے خیر تیری
مجھے آج ایک جھوٹی بد دعا دے

بُرا برتاؤ تو کر بے مروت
مجھے جرمِ محبت کی سزا دے

مری توبہ کی ساقی لاج رکھ لے
میں مانگوں یا نہ مانگوں تو پلا دے

یہ تنہائی کا عالم بھی عدم کیا
چراغِ زیست کو ہنس کر بجھا دے

عبدالمجید حیرت

○

دنیا میں جہاں بھی جائیے گا
دکھ، درد ضرور پائیے گا

راحت بھی ضرور پائیے گا
تکلیف اگر اٹھائیے گا

پھر کون کرے گا دلنوازی
جب آپ ہی دل دکھائیے گا

ممکن ہو تو غم سے چھوٹنے کی
تدبیر کوئی بتائیے گا

کانٹوں میں کہیں الجھ نہ جائے
دامن کو ذرا بچائیے گا

ہوتی ہے ہر ایک بات کی حد
حد سے نہ قدم بڑھائیے گا

دنیا ہی میں جب نہیں، تو آخر
کیا حشر میں کام آئیے گا

ہر پھول ہے خندہ زن چمن میں
کیا آپ نہ مسکرائیے گا

ہے آپ کا وہ بھی اک دعا گو
حیرت کو نہ بھول جائیے گا

معصوم گناہگار

(ایک باغِ حیوانات کو دیکھ کر)

پروفیسر شور

یہ وہ ہیں کہ ہے شہروں میں رسوا جن کی خودداری
نہ یہ "پاپا" نہ یہ "ملّا" نہ یہ "راہب" نہ یہ "صوفی"
نہ دامِ سبحہ و ہیکل، نہ فتراکِ کلیسائی
کسی گوشے میں یہ جھوٹی حدیثیں گھڑ نہیں سکتے
نہ عصمت کی کوئی منڈی نہ دلالوں سے پیسے ہیں
نہ "زرتشتی" نہ "زناری" نہ "بابی" نہ "نصرانی"
نہ چہروں کے نشانوں سے کوئی مغرور پیشانی
نہ ہونٹوں پر ہنسی جھوٹی، نہ زہرآلود دلداری
نہ سکّوں کی تلاوت ہے، نہ "کفر و دیں" کی ذلت
شمار ان کا نہیں زر کے تراشیدہ نگینوں میں
"کلاہِ یار جنگی" ہے، نہ "کفشِ آسماں جاہی"
ضمیر و قلب کو "سونے" کی لو پگھلا نہیں سکتی
کسی پوشاکِ زریں سے نظر دھوکا نہیں کھاتی

نہ ان کا "کفر" بے خودی، نہ ان کا "دین" بازاری
نہ یہ "آری" نہ یہ "تاتاری"، نہ یہ "مصری" نہ یہ "کلنی"
نہ زناروں کے پھندے ہیں، نہ تسبیحوں کی گیرائی
کسی منبر کے اوپر یہ درندے چڑھ نہیں سکتے
نہ شام ذکر و قوالی، نہ چلّوں کے اندھیرے ہیں
نہ سینہ ہے کوئی کالا، نہ ماتھا کوئی نورانی
نہ ہاتھوں پر کسی کے خون سے قشقوں کی تابانی
نہ اخلاقوں کی عیاری، نہ آدابوں کی پُرکاری
نہ یہ سونے کے پیغمبر، نہ یہ جاگیر کی اُمّت
نہ صبحیں ان کے ہونٹوں پر، نہ راتیں ان کے سینوں میں
نہ زنجیروں کی تاریکی، نہ قندیلِ شہنشاہی
ہوائے بام و در دشت و جبل تک جا نہیں سکتی
یہاں سورج کی تاریکی کہیں پائی نہیں جاتی

یہ حیواں جن کا تخت و تاج سے کوئی نہیں ناتا
انھیں خود اپنی فصلوں کو نگل جانا نہیں آتا!

اِس بار

سلام مچھلی شہری

مہک دلوں کے چمن زار
ہجوم ساز کے تار،
نظر چڑھے ہیں "جنونِ خرد" کے پُر آثار —— !

مجھے یقیں ہے ترے جواں شگوفوں پہ
مجھے یقیں ہے شگفتہ، جواں نغموں پہ
مجھے یقیں ہے چراغِ سکوں کے جلووں پہ
ترے نصیب میں ہے فتح دائمی اِس بار —— !!
عجب فضا ہے، نہ موجِ سکوں نہ طوفاں ہے
جہاں جہاں بھی ہے ملاحِ محنت حیراں ہے
اجل قریب ہے یا زندگی کا ساماں ہے ؟
یہ کیسی رواں ہیں فلک پر طیورِ آتش بار" ؟ !
سوال یہ ہے کہ پھولوں میں آگ ہے کہ نہیں
سوال یہ ہے کہ نغموں میں آگ ہے کہ نہیں
زمیں کی شمع کے جلووں میں آگ ہے کہ نہیں
اگر یہ ہے تو ہم اہلِ چمن بھی ہیں تیار
یونہی بڑھائے چلو کاروانِ صبحِ بہار —— ؟ !!

گڑیا رانی

نور بجنوری

تری مانگ میں سرخ چراغ جلے
کوئی دوری دور سے ہاتھ ملے
ترے شیش محل کا دھوکا سماں
کہیں اور سنگھار ہے شعلہ فشاں
کہیں پیار کا چاند سسکتا ہوا
کہیں لعل و گہر کی نشیلی شماں
کہیں دھوپ چڑھے کہیں رات ڈھلے
تری مانگ میں سرخ چراغ جلے

ترے در پہ ہجوم بہاروں کا ہے
تری راہ میں ڈھیر ستاروں کا ہے
ترے ہاتھوں کی مہندی سلگتی ہے کیوں
تری آنکھوں میں داغ چناروں کا ہے
تجھے کس نے لگا لیا بڑھ کے گلے
تری مانگ میں سرخ چراغ جلے

کوئی بیتے دنوں کی کتھا ر لیے
ترے ہونٹوں سے چاہ کا زہر پیے
یونہی تیرے گھروندوں میں آگ بھرے
یونہی روپ بدل کے نئے سے نئے
کبھی دور رہے کبھی ساتھ چلے
تری مانگ میں سرخ چراغ جلے

شفقت کاظمی

○

تیرے ہر جور پہ یاں شکرِ خدا ہے اے دوست
کہ یہی مسلکِ اربابِ وفا ہے اے دوست

ہم کو اُس عہدِ وفا سے تھیں امیدیں کتنی
تجھ کو جو عہدِ وفا بھول چکا ہے اے دوست

تیری جانب سے نہ لائی کوئی پیغام کبھی
میری فریاد بھی صحرا کی صدا ہے اے دوست

تیرے آنے کی دوبارہ جو کوئی آس نہیں
کتنی سنسان مرے دل کی فضا ہے اے دوست

تیری یادوں سے بھی تسکینِ تمنا نہ ہوئی
وقت ہم پر کبھی ایسا بھی پڑا ہے اے دوست

کیا عجب ہے کہ تری رنجشِ بیجا کے سبب
تیرے شفقت کو بھی ترکِ وفا ہے اے دوست

کوثر نیازی

○

باغباں کے طور یہ سمجھا گئے
فصلِ گل میں پھول کیوں مرجھا گئے

اب تو اے ظالم زمانے رحم کر
اُن کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے

اس لیے شاید نہ پوچھا حالِ دل
میری حالت دیکھ کر گھبرا گئے

شغلِ مے بے منتِ موسم رہا
جام کھنکائے تو بادل چھا گئے

ان خنک جلووں میں گرمی تو نہ تھی
کیوں نگاہوں کو پسینے آ گئے

شامِ غم سے پوچھ لیں گے ہم مزاج
آپ کے گیسو اگر لہرا گئے

دشمنوں سے بھی گِلہ جاتا رہا
دوست ہم پر وہ کرم فرما گئے

موت ہے اس جرم کی کوثرؔ سزا
ہم فریبِ زندگی کیوں کھا گئے

یوسف جمال انصاری

○

مےِ صہبا سے دل ہوا جو گداز
میں تھا اپنے سے محوِ ناز و نیاز

روح و دل میں ہیں جھگڑے کتنے
سوئے کعبہ نہیں مری پرواز

پہلے خود کو تلاش کرلوں میں
کھل ہی جائے گا کائنات کا راز

سفرِ زیست کی نہیں منزل
حدِ آخر بھی نقطۂ آغاز

موت اِک جھٹپٹے کا دریا ہے
زندگی ایک دُور کی آواز

یہ نظارے ہیں یا اشارے ہیں
گلشنِ دہر ہے کہ گلشنِ راز

اے حسیں! بے عمل نہ کہہ مجھ کو
اور اگر کھینچ لوں ردائے مجاز

کسریٰ منہاس

○

نیاز بے اثر کی ناز برداری پہ روتا ہوں
وہ برہم ہیں میں انجام پرستاری پہ روتا ہوں

تری خاطر سے واعظ! میں نے توبہ کر تو لی لیکن
درِ میخانہ تھک کر گنہ گاری پہ روتا ہوں

بھلا محشر میں رب کے سامنے پرسش گناہوں کی
نگاہِ منفعل میں رحمتِ باری پہ روتا ہوں

بہے ہیں خشک آنسو خستۂ سوزِ محبت سے
وفائے عشق میں آنکھوں کی ناداری پہ روتا ہوں

مجھے بربادیٔ دل کا گلہ تھا عشق سے پہلے
نگاہِ شوخ اب تیری نگوں ساری پہ روتا ہوں

ابھی اک جلوۂ دلکش نگاہوں کے مقابل تھا
کھلی جب آنکھ تو میں اپنی بیداری پہ روتا ہوں

ابھی تک احترامِ عشق سے بیگانہ ہے کوئی
دلِ حسرت زدہ تیری وفاداری پہ روتا ہوں

تغافل کے سامنے آ کر نظر سے یوں نہاں رہنا
مذاقِ حسن تیری آشنا داری پہ روتا ہوں

نہ وہ اگلی سی دھڑکن ہے نہ وہ اگلی سی بیتابی
مداوائے درد! دل کی سرد بازاری پہ روتا ہوں

نہ کہنے کی جو باتیں تھیں وہ لب تک آ گئیں کسریٰ!
پشیماں ہو کے اب انجام سے خواری پہ روتا ہوں

جمیل ملک

○

خوشبوئے پیرہن سے سلگتے رہے دماغ
آئی شبِ فراق تو گُل ہو گئے چراغ

دل کی گلی بھڑک کے نگاہوں تلک آگئی
پلکوں پہ شامِ وصل جلا سکے ہیں دل کے داغ

اس چشمِ مے فروش سے ہنگامِ بادہ نوش
پُھوٹا وہ سیلِ نور کہ ٹوٹے اُٹھے ایاغ

آخر کھلا کہ تو ہے مرے گھر کی روشنی
یوں تو ترے بغیر بھی جلتے رہے چراغ

وہ گُل کھلیں کہ جن کی مہک لازوال ہو
اس ایک دُھن میں ہم نے سجائے ہیں کتنے باغ

جب چشم و دل بجھے تو شبستانِ شوق میں
ہم نے ہتھیلیوں پہ جلائے ہیں شب چراغ

جو وادیٔ جمال میں گُم ہو گئے جمیل
اپنی طلب کے ساتھ ہی اُن کا بھی کچھ سراغ

مظہر امام

انکار میں اقرار کی بات آہی گئی ہے
باتوں میں غمِ یار کی بات آہی گئی ہے

آیا ہے کبھی ذکر اگر دار و رسن کا
گیسو و قدِ یار کی بات آہی گئی ہے

آرائشِ عالم پہ کبھی بحث جو ٹھہری
اس گیسوئے خمدار کی بات آہی گئی ہے

جب سرخیٔ گلشن کا کبھی ذکر ہوا ہے
تیرے لب و رخسار کی بات آہی گئی ہے

ڈھونڈا ہے اگر زخمِ تمنا نے مداوا
اک نرگسِ بیمار کی بات آہی گئی ہے

مل بیٹھے ہیں زنداں میں اگر شام کو احباب
تیرے در و دیوار کی بات آہی گئی ہے

بے مہریٔ احباب کا شکوہ جو کیا ہے
دلداریٔ اغیار کی بات آہی گئی ہے

چھیڑا ہے کوئی تلخ فسانہ جو کسی نے
شیرینیٔ گفتار کی بات آہی گئی ہے

جمیل حشمی

○

ہم زمانے میں محبت کے بھکاری ٹھہرے
دوست ہیں سب کے مگر دشمنِ جاں ہیں اپنے

آج کی رات کہیں شعلۂ گل ہی بھڑکے
جانے کل صبح کہاں ہوں گے ہم اڑتے پتے

جانِ من ! ب کے یہ آداب ہیں تیرے کیسے
بانکپن میری غزل کا تری محفل میں لٹے

وہ صبا ہے تو رہے کس لیے گلشن سے پرے
یہ شبِ گل ہے تو کیوں سیج پہ کانٹوں کی کٹے

کیوں پھرے دشت میں دیوانے ہوئے کس کے لیے
ہم کو معلوم نہیں پوچھئے ان آنکھوں سے

مر چکے شب کی تمنا میں سسک کر لیکن
دل کی دیوار سے راتوں کو کوئی سر پٹکے

کہیں منزل سے بھٹک جائے نہ دیوانہ دل
جادۂ شہرِ بہاراں میں بچھا دو کانٹے

ڈال دل کھول کے ان ٹوٹے ہوئے شیشوں میں
سنگ آئے ہیں بہت راہ میں ہم پہ پیارے

یہ تری یاد کا عالم شبِ تنہائی میں
جیسے لہرا کے کرن کالی گھٹا سے چھوٹے

ان بھری راہوں میں سب میرے ہیں میں کس کا ہوں؟
دوں صدا کس کو ــ لگے کون کلیجے سے مرے

کون اترے گا مرے دل کے گلستانوں میں
کون گزرے گا مرے چہرے کے صحراؤں سے

راکھ اس گھر میں وہ اڑتی ہے کہ جیسے حشمی
طاق میں شمع نہ تھی صحن میں مہتاب نہ تھے

احمد ظفر

○

احمد ظفر کسی پہ بھروسا نہ کیجیے
کانٹے ہیں تو گُل کی تمنا نہ کیجیے

تخلیق کی لگن ہے تو جاں تک لُٹائیے
محفل میں دل کی بات کا چرچا نہ کیجیے

اس حسنِ لازوال کو دیکھیں تو اس طرح
اس حسنِ لازوال کو رسوا نہ کیجیے

جلتے چراغ کس نے بجھائے ہیں برملا
یہ سحر ہے تو سحر کی پروا نہ کیجیے

کیا جسم دلنشیں تھا کہ اب مشتِ خاک ہے
سوچیں ضرور اس قدر سوچا نہ کیجیے

ہم اہلِ دل ہیں اہلِ نظر اہلِ آرزو
محرومیوں کا جال بچھایا نہ کیجیے

لتا منگیشکر

شاعر ندیم

فضا میں گونج رہے ہیں سہانے بولوں کے دیے
ہوا کے دوش پہ لرزاں ہیں نغمہ ہائے نوا
نفس نفس ہے ترنم کی سرخوشی کو فروغ
ترے لبوں سے چھلکتی ہوئی جواں کرنیں
یہ گنگ گنگ ابھرتے ہوئے گلِ نغمہ
ترے گلو کی ادا تیری نغمہ ریز آواز
بکھر رہے ہیں خلاؤں میں رازِ شوخیٔ ساز
روش روش ہے نئی کیفیت نیا اعجاز
یہ تیری لے یہ ترا سوز یہ تری پرواز
جہاں کو بخش رہے ہیں نئے نئے انداز

ہجومِ فتنۂ دوراں جمیلِ ماہ رخاں
امید و بیم سے پر داغ بیشمار دماغ
ہزار سلسلہ ہائے ستم جلو میں لیے
کوئی خروش پسِ پردۂ جفائے رسوم
چراغِ رہگزرِ باد بن گئی ہے حیات
کسی کے حسن کی لغزش کسی نظر کا خمار
فریبِ کشمکشِ دہر ہر قدم پہ آزار
زمانہ درد کے ماروں سے برسرِ پیکار
خیالِ تازہ کو سوزش میں شعلہ ہائے فشار
ہر ایک سمت اندھیرا ہر ایک سمت غبار

ہر ایک لمحہ بدلتی ہے کروٹیں گیتی
ہر ایک زلف پریشاں ہر اک کلی مایوس
کوئی نہیں ہے مسیحا کوئی نہیں غمخوار
تصوراتِ خوش آیند ایک خوابِ گراں
ہر ایک رخ نگہِ قہر ہر طرف شورش
ہر ایک لمحہ اجڑتے ہیں مفلسوں کے شباب
ہر ایک سینہ ہے صد چاک ہر جگر ہے کباب
ہر ایک ہاتھ میں نشتر ہر اک دعا زہراب
سرور و مستی و جوش و طرب ہوئے نایاب
ہر اک قدم پہ تلاطم ہر ایک گام سراب

کہاں کہاں نہ ہوئی پست عظمتِ آدم
کہاں کہاں نہ ستاروں نے ٹھوکریں کھائیں
کہاں کہاں نہ کیے رقص طوق سے لے کر
کہاں کہاں نہ رسن کو گلے لگایا ہے
کہاں کہاں نہ سزاوارِ دار ٹھہرے ہیں
کہاں کہاں نہ مٹی شوخ زندگی کی لکیر
کہاں کہاں نہ نگوں ہو گیا خطِ تقدیر
کہاں کہاں نہ بجائی ہے پاؤں کی زنجیر
کہاں کہاں نہ لکھی اپنے خون سے تحریر
کہاں کہاں نہ ہوئی ہم پہ کاوشِ تعزیر

کبھی کبھی اسی پُرہول تیرہ گلی پر
کبھی کبھی ترے آہنگِ سادہ کی تالیف
کبھی کبھی ترے نغموں کا بوجھ اٹھاتے ہوئے
کبھی کبھی تو سمجھتے ہیں غم کے بادل
کبھی کبھی تو دلِ افسردہ بھٹکتا ہے

ستم کشوں کی تمنا چھلک ہی جاتی ہے
زبانِ شعر میں کوئی وفا کا سوال ہو
خزاں کو چھیڑتی فصلِ بہار آتی ہے
کبھی کبھی تو فضا گنگناتی ہے
کبھی کبھی تو مسرت بھی بار پاتی ہے

یہ زندگی ہے تری بے کرانی تابانی
منشئ تری آتش نوائیوں کی قسم
اندھیری شب ہو ابھی تو غضب کے کیا
فسونِ زیست یہاں مٹا نہیں مسمار ابھی
تری صداؤں کے سیلاب میں غرور کے دیں

تمام کفر کو دیتے ہیں ایک شکلِ جمیل
خام فکر ترا صبحِ آشتی کی دلیل
ہر اک ہے تیرا شعلۂ نوا قندیل
جنونِ عشق کی ہوتی نہیں کبھی تکمیل
بس ایک نادری ہے جس کی یہی ہے سبیل

گلوں پہ گرتے ہیں جس طرح قطرۂ شبنم
چمک کے جیسے کوئی مہرِ صبح جگمگائے
زمانۂ شب میں کبھی دامنِ سحر میں کبھی
تری عطا کا یہ صدقہ ترے کرم کا طفیل
عنایتوں کا تصادم لطافتوں کا خروش

شرابِ ناب چھلک جائے جیسے در جام
رباب چھیڑ دے کوئی جیسے چاند کے بام
فسردہ ذہن پہ ہوتی ہے بارشِ الہام
جلائے بیٹھا ہوں افکارِ گردشِ ایام
سلام لکھتا ہے شاعر ترے خلوص کے نام

سکوتِ رنج و الم کی اداس راہوں میں
تھکی ہوئی مری نظریں تھکی رہیں لیکن
ابھی حیاتِ گریزاں کے کام آئے جا
ابھی رُکا تو نہیں ہے سفینۂ غمِ دل
یہ آسرا ابھی بڑا آسرا ہے جینے کو

جہاں جہاں بھی حوادث سے دل ہوا دو نیم
"فسادِ سامعہ در صحنِ کوثر و تسنیم"
ابھی تو سخت ہیں اوقات مرحلے ہیں عظیم
ابھی ہوئی تو نہیں ہے سکون کی تنظیم
"چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا"

بیوی کی بغاوت

راجہ مہدی علی خاں

وہ اک آہ بھر کر چھپا آفتاب
تپائی پہ بندی نے رکھ دی شراب
نہ میری نگاہوں سے شرمائیے
تبسّم بہ لب نوش فرمائیے
خیال آ رہے ہیں مجھے پے بہ پے
بہت ہی مزیدار ہوگی یہ شے
یہ دو گھونٹ کیا میں بھی پی لوں جناب؟
چکھی لوں نہیں کھائیے پیچ و تاب
ہوں اولاد میں بھی بڑے باپ کی
کروں کیوں نہ تقلید میں آپ کی
کسی دن ابھی میں بھی تو پی کے آؤں
ذرا میں بھی گھر بھر میں آفت اٹھاؤں
جو پی آئی گھر بھر کو پیٹوں گی میں
کبھی آپ کو بھی گھسیٹوں گی میں
کسی بات پر ہو گئی گر میں تیز
تو پھینکوں گی کھانا الٹ دونگی میز
میں توڑوں گی چینی کی سب تھالیاں
لغت میں نہ ہوں۔ وہ دونگی وہ گالیاں
پیوں گی میں ہر روز اتنی شراب
کہ اک روز ہوگا یہ خانہ خراب
جب اس گھر پہ ہوگا فلاکت کا راج
نہ پھر بھی اتاروں گی مستی کا تاج
یہ گھر سارا نیلام کر دوں گی میں
شرابی کا ہر کام کر دونگی میں
بہت کچھ کرے گی کنیز آپ کی
کہ لڑکی ہے یہ بھی بڑے باپ کی

(۲)

ابھی میں بھی کھڑکی سے دیکھا کروں
ابھی میں بھی آنکھوں کو سینکا کروں!

رہے چپک منہ پہ حیا کی نقاب ؟
چھپوں میں بھی کیوں کھلی سی کتاب!

میں سائیکل پہ روز گھوما کروں ؟
نگاہوں سے چہروں کو چوما کروں

کروں میں بھی سڑکوں پہ آوارگی!
حسیں مہ وشوں سے کروں دل لگی ؟

میں مردوں کو آنکھوں پہ آنکھیں نچا!
کبھی جب وہ ہنسے تو ٹھینگا دکھا!

کروں اُن پہ بیہودہ فقرے میں چُست!
جو پوچھیں وفا بھی؟ میں بولوں بخدا مستعد!

میں بس میں رکھوں اُن کے پیروں پہ پیر
وہ جانے لگیں تو کہوں "شب بخیر!"

جو سینما میں بیٹھے کوئی پاس مرد
چکھاؤں اُسے اپنی چٹکی کا درد

میں سڑکوں پہ پھیروں اُنھیں کھانس کر
ملے جو بھی لے جاؤں میں پھانس کر

نہ ہو کالے پیلے کی کچھ بھی تمیز
کہوں "واہ کیا گبرو ہے کیا چیز"

چھپیں مجھ سے ڈر کر نقابوں میں مرد
اگر دیکھیں مجھ کو ہو جائیں زرد

ہر اک گھر میں جاتے ہوں پردے پڑے
سبھی مردوں میں ہوں چرچے مرے

میں نام اپنے والد کا روشن کروں ؟
میں کچھ سات سو عشق کر کے مروں ؟

کہ لڑکی ہوں میں بھی بڑے باپ کی
کروں کیوں نہ تقلید میں آپ کی

۲

میں مردوں کے کوٹھوں پہ جایا کروں!
میں باہر بھی دل کو لگایا کروں؟

میں لے جاؤں اس گھر کو تنہائیاں!
مرے ساتھ ہوں میری ہمسائیاں

لپ اسٹک سے گلنار کر کے یہ لب
چلیں چُہلیں کرتی ہوئی سب کی سب

پھریری ہر اک حلقہ کی، کان میں
ہر اک جھُرجھُری سی دل و جان میں

ہو سگرٹ کا ٹن ایک ماچس کے ساتھ
چلیں جھومتی دے کے ہاتھوں میں ہاتھ

دُھواں اپنے منہ سے اُڑاتی ہوئی
بڑھیں آگے اودھم مچاتی ہوئی

جہاں آسکے آوازِ چنگ و رباب — چلیں دیکھ کر بزمِ رقص و شراب

کلاہوں کی اُن سیڑھیوں پر چڑھیں — ذرا ہچکچائیں پھر آگے بڑھیں

وہ بیٹھے ہوں سُرمہ لگائے ہوئے — ہوں گالوں پہ پاؤڈر رچائے ہوئے

وہ ہوں مچھروں کو چھپائے ہوئے — گر حلق میں ہوں ستائے ہوئے

کہیں اُٹھ کے وہ ہم سے آداب عرض! — بجا لائیں رنڈی کا ہے ایک فرض.

ادا سے گلوری کریں پیش وہ — کہیں ہم سے ملے پھر کم و بیش وہ

چھڑیں جب ستار اور سارنگیاں — پئیں وسکی ہم، کھائیں نارنگیاں

ہر اک سانس اپنی نشے میں ہو غرق — نہ آئے نظر رات اور دن میں فرق

کہیں ہم "ارے مردود گاؤ گاؤ" — کوئی تان اچھا سا ہم کو دکھاؤ

حسیں رت میں جب چھیڑیں ٹھمریاں — قطاروں میں بیٹھی ہوں ہم "قمریاں"

ہر اک ہاتھ سینے پہ ساتھ آہِ سرد — دکھائیں انہیں اپنی "الفت کا درد"

وہ گھونگھٹ سے پھینکیں نگاہوں کی چوٹ — تو ہم پھینک دیں اُن پہ سو سو کے نوٹ

وہ ناچیں کمر کو ہلاتے ہوئے — قدم ہوں وہ گھنگھرو بجاتے ہوئے

وہ دیکھیں ہمیں مسکراتے ہوئے — نگاہوں سے الفت جتاتے ہوئے

پکاریں یہ ہم واہ کیا تان لی — ہماری تو اللہ قسم جان لی۔

مچل کر کہیں اُن سے بے تاب سب — "یہ حرکت، یہ مُرکی، یہ توڑے، غضب!"

اسی طرح ہم داد دیتے رہیں — حسینوں کی "بیداد" سہتے رہیں

بجیں رات کے دو تو ہم لوٹ آئیں — محبت کے ہم لے کے غم لوٹ آئیں

کہیں آکے سب اپنے شوہر سے ہم — ابھی بستروں سے اٹھو ایک دم

لگی بھوک ہے گرم کھانا کھلاؤ

اپنی "تھک گئے" پیر اٹھ کر دباؤ"

موجِ خوں

احمد ندیم قاسمی

شادی کے تیسرے دن بعد راحت علی کو لگا کہ ایک حسرت ہے کہ اس نے ساجدہ کو اپنی بیوی بنا کر جلد بازی سے کام لیا ہے۔ یکایک اس کی پلک
ابھی تک جو پہلے ساجدہ اس کے ذہن پر بجلی کی طرح چھائی ہوئی تھی۔

کچھ دیر پہلے جب گاڑی جہلم کے پل پر سے گزر رہی تھی تو ساجدہ نے سلسلۂ بات روک دیا تھا اور بچوں کی طرح کھڑکی سے لگ کر دریا کے بہاؤ میں دیکھنے لگی تھی۔ اور اسے ایسا لگتا ہے کہ پل "جھڑ جھڑ جھڑ" پکار رہا ہے۔" اس پر راحت علی نے کہا تھا: "تمہیں اپنے میکے جانے کا کتنا شوق ہے بیگم۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان دنوں میں بھی تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔ پر عجیب لگتا ہے کہ تمہارے ماں باپ وہ تمہیں ان کے لیے تمہیں بڑے پیچھے رہ رہے ہیں۔ مجھے کیا معلوم کہ تمہیں بھی مڑ کر دیکھا ہی نہیں۔ تمہیں کیا پتہ کہ میرے ہاتھوں کی چوڑیاں تمہارے کنگنوں کی چھوٹی چھوٹی کھانے کے لیے کتنی مدت سے بے تاب ہیں۔ مگر میں تمہارے انتظار میں اتنی مدت تک جاگتے رہنے کے بعد بھی آنکھیں بچھا رہا تھا کہ تمہارا اصلی تمہیں لیے آگیا۔ بہت سنو۔ یوں کریں کہ جہلم میں اتریں ہی نہیں۔ پنڈی کی طرف بھاگ جائیں۔"

اس پر ساجدہ جس طرح مسکرائی تھی وہ ایک عجیب مسکراہٹ تھی۔ اس مسکراہٹ میں حیا بھی تھی، غرور بھی تھا اور اس شکاری کی سی خود آسودگی بھی، جو ہرن کو جال میں پھنسا دیکھ کر اسے جال میں سے نکالنے اور ذبح کرنے سے پہلے ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور آنکھیں بند کر کے سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگانے لگتا ہے۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا: "بھاگ تو جائیں پر وہ پرلی طرف کھڑکی کے پاس بھائی جان جو بیٹھے ہیں۔"

راحت علی نے چند مہینے پہلے جب ساجدہ کو پہلی بار دیکھا تھا۔ تو اسے پہلی بار یقین آیا تھا کہ جنت کے غلماں جیسی دیویاں آج بھی زندہ ہیں۔ ایسا چلبلا چمکتا رنگ کہ اسے دیکھنے کے بعد آدمی کچھ دیکھ ہی نہ سکے۔ سیاہ بھوؤں کے نیچے اتنی بڑی بڑی آنکھیں کہ بچوں کے چہروں پر بھی بڑی معلوم ہوں۔ اتنی لمبی پلکیں کہ اگر تبسم اس کے سر پر چمک رہا ہو تو پلکوں کے سائے اس کے سارے چہرے پر چلمن سی کا اثر دیں۔ پتلی ذرا سی جھکی ہوئی ناک اور اتنے باریک ہونٹ جیسے سرخ ریشم کے ایک تار پر سرخ ریشم کا ایک تار رکھا ہو۔ ننھی سی گول سی ٹھوڑی اور ایسی شفاف گردن کہ پانی کا گھونٹ بھی اترتا دکھائی دے جائے۔ اس کے جسم کی ساری قوسیں اور تمام زاویے ان دیویوں کے سے تھے۔ راحت علی نے جب بھی ان دیویوں کی تصویریں دیکھی تھیں تو صحت اور جوانی سے لبالب بھرے ہوئے ان کے جسموں نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کیا تھا کہ ان مورتیوں کے خالقوں نے ذرا سا مبالغہ ضرور کیا ہے۔ سنگ تراش، مصور اور

شاعر، سیدھی سادی صاف نظر آنے والی حقیقت میں فنی حسن صرف یوں پیدا کر سکتے ہیں کہ چلتے چلتے یا ان جیسے معاملوں میں وہ اسے بالائے طاق رکھ جائیں۔ مگر ساجدہ کو دیکھ کر ایک پل کے لیے راحت علی کو خیال آیا تھا کہ کیا کبھی کبھی حقیقت بھی مبالغہ کرتی ہے؟ پھر جب اس نے دیکھا تھا کہ وہ اتنی ہی حسین ہے اور چہرے پر اترتی ہوئی لٹوں کو جھٹکتی رہی ہے۔ تو اس نے سوچا تھا کہ بعض حقیقتیں بھی مبالغے کی حد تک حسین ہو سکتی ہیں۔

راحت علی اپنے ایک دوست عبدالمنان کا شہ بالا بن کر برات کے ساتھ گیا اور اسے جلتا یاد ہے کہ جب دلہن کی سہیلیاں عبدالمنان کو کانوں سے پکڑ کر لے جانے لگیں تو ظاہر ہے کہ راحت علی شہ بالا بھی دولہا کے غمخوار کے بیچ اس کے ساتھ ہو لیا۔ دلہن کی حویلی کے صدر دروازے کے قریب پہنچ کر ایک لڑکی چیخ اٹھی "بہنو! ہمارے ساتھ تو یہ کوئی غیر مرد بھی آ رہا ہے" سب لڑکیاں بھاگ کر دروازے کی طرف جا گئیں تو آگے جاتا ہوا عبدالمنان ان کے ریلے میں گر پڑا۔ ایک لڑکی اس کے اوپر سے کود گئی اور پھر سب لڑکیاں اس پر سے پھلانگتی بھاگ گئیں۔ راحت علی نے لپک کر عبدالمنان کو اٹھایا تو سامنے سے لڑکیوں نے دونا چیزوں کی روشنی اس کے چہرے پر جانوں کی طرح مسلط کی اور پھر چیخ چیخ کر ہنستی، کھلکھلاتی، تالیاں بجاتی ہوئی اندر بھاگ گئیں۔ اوپر ڈیوڑھی کی چھت پر بھی ہنگامہ سا ہو گیا اور راحت علی نے عبدالمنان کو مشورہ دیا کہ سہری کا موقع ہے، بھاگ نکلیں۔ عبدالمنان لڑکیوں کی اس بدتمیزی کی وجہ سے غصے میں تھا۔ کہنے لگا "بغیر چہرہ تو سامنے سے اس کے منہ پر ایک اور تارے کا چھاپا پڑا۔ اور دونوں دم بخود کھڑے رہ گئے پھر ایک لڑکی یوں چیخ چیخ کر ہنسنے لگی جیسے دولہا شہ بالے کو بیل سمجھ کر اندر حویلی میں ہنکا رہی ہے۔ مجبوراً دونوں حویلی میں آئے تو وہاں تیز روشنی نے رات کو دن بنا رکھا تھا۔ راحت علی نے پلٹ کر جب اس لڑکی کی طرف دیکھا جو دونوں کو اندر ہنکا لائی تھی۔ تو ایک دم اس کا جی چاہا کہ وہ ڈر کر کہنے لگے "معاف کیجئے کیا دیکھ رہی ہو؟" لڑکی رعب سے بولی "آگے چلو"۔ راحت علی نے لڑکی کی آواز پہچان لی۔ یہی تھی جس نے ایک غیر مرد کی موجودگی کا نعرہ مار کر شور مچایا تھا، جس نے منہ کے بل گرتے ہوئے دولہا سے چھاڑنے کی ابتدا کی تھی۔ یہی ساجدہ تھی۔

عورتوں اور لڑکیوں سے ٹھنسے ہوئے ایک کمرے میں جب عبدالمنان اور راحت علی کے سامنے "بیڑی گھوڑی" لا کر رکھی گئی تو ساجدہ آئی اور ان کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور "بیڑی گھوڑی" میں سجے ہوئے ایک طشت میں سے عجیب عجیب بت اٹھا کر دولہا سے ان کا تعارف کرانے لگی "یہ آپ کے ابا جان ہیں۔ مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی توند سے پہچانئے" ساری عورتوں کے قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے اور کسی نے کہا "یہ ساجدہ کم بخت تو شیطان کی خالہ نکلی!" ساجدہ دولہا سے مخاطب تھی "یہ آپ کی امی جان ہیں۔ دھجیوں کی طرح لٹکتی ہوئی جھریوں سے پہچانئے۔ یہ آپ کے ماموں جان ہیں ہتھیلی پر رکھی ہوئی بیر برابر افیون کی گولی سے پہچانئے۔ اور یہ آپ کے شہ بالا جان ہیں۔ الّو کی سی صورت سے پہچانئے" عورتیں یوں چلا چلا کر ہنس رہی تھیں جیسے رو رہی ہوں۔ اور ساجدہ آخری بت کو راحت علی کے اتنا قریب لے آئی جیسے اس کے منہ میں ٹھونس دے گی۔ بولی "یہ آپ ہیں۔ وہی کچھ ذرا سی ناک ہے کہ نہیں؟ وہی چھوٹے چھوٹے برابر آنکھیں ہیں کہ نہیں؟ وہی چھاج کے سے کان ہیں کہ نہیں؟ وہی خار سا دل ہے، جھکا نہیں؟" پھر وہ عورتوں کے مجنونانہ قہقہوں کے درمیان اس بت کو راحت علی کے سامنے نچانے لگی "ہے کہ نہیں! ہے کہ نہیں! ہے کہ نہیں!" اور راحت علی ہکا بکا بظاہر اس بت کو دیکھتا رہا مگر دراصل وہ ساجدہ کو دیکھتا رہا جو مسلسل گنگناتی دھندلکوں سے نکل کر یہاں چلی آئی تھی اور اپنے ساتھ اتنا بے پناہ اتنا ناقابل برداشت اور قدموں تلے سے زمین کو نکال دینے والا حسن سمیٹ لائی تھی کہ حقیقت اور مبالغے کی حدیں آپس میں خلط ملط ہو گئی تھیں۔

راحت علی کو عبدالمنان پہلے سے بتا چکا تھا کہ دلہن کی خاص سہیلی کی طرح برسوں کی پرانی رسم کے مطابق دولہا کے شہ بالے کو بھی

[illegible]

[illegible]

[illegible] ساجدہ کی کلائی پر [illegible] چوڑیاں [illegible] راحت علی کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ آ گیا تھا۔ ایک ایسا رنگ جس کو کوئی نام [illegible] ساجدہ کی کلائی [illegible] اچانک ساجدہ کی آنکھیں بھر آئیں [illegible]

[illegible] اور خوب صورت لڑکی ہے [illegible] پھر ساجدہ کی طرف بڑھی مگر یوں رک گئی جیسے کوئی ضروری بات کہنا بھول گئی ہو۔ بیگم اور راحت علی کی آنکھوں میں [illegible] کہنے لگیں:

"ہائے نصیبہ! کوئی بڑی بی بی ہو لی۔ کمال مت کرو۔"

برات جب واپس لاہور پہنچی تو راحت علی ہاتھ دھو کر عبدالمنان کے پیچھے پڑ گیا کہ وہ اپنی بیوی سے کہہ کر ساجدہ کے رشتے کی بات کرنے میں اس کی مدد کرے۔

ایک دن عبدالمنان نے راحت علی کی موجودگی میں مذاق مذاق میں یہ ذکر چھیڑا تو زہرہ نے ساجدہ کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ بولی یہ زمانے کو اس روز سے کیا ہو گیا تھا۔ ویسے تو وہ ہنسی ہنسی میں رہنے والی لڑکی ہے کہ جو بھی پرانی اور نئی سہیلی نے بھی اس کی زبان سے کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں سنی۔ بس یہ لگتا ہے کہ سنا ہے اس روز پہلے تو راحت بھائی چپ چاپ بیٹھے کھانا کھاتے رہے مگر اچانک اس کی کلائی پر ہاتھ مارا تو چوڑیوں کی کرچیاں اس کی جلد میں اتر گئیں۔ میں جب ملنے گئی تو اس نے بتایا کہ ڈاکٹر تک نوبت پہنچی تھی۔ [illegible] روزانہ پٹیاں [illegible] کے لیے [illegible] ہے۔ ساجدہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ رشتہ اسی چوڑی توڑ کی طرف سے آیا ہے

ذہن سے نکلے نہیں۔ دو دن بعد راحت جانی ویسے بہت بھلے آدمی ہیں۔
"میں بیچارہ شہری آدمی" راحت علی نے اپنی صفائی پیش کی۔ "مجھے کیا معلوم کہ یہ بڑی عمر کی لڑکی بس ہاتھ کا نام ہے۔ مجھے کیا معلوم کب
کیسے آئے جا سکتے ہیں۔ حنان نے مجھے ذرا سا بتایا تو تھا مگر مجھے اس انتہا کی خبر نہ تھی۔ اس نے تو بس یہ بتایا کہ بازوؤں پر بھی کچھ داغ ہیں
سے اب تک ہاتھ پیدا نہیں ہوا۔ خدا کی قسم میں اس خیال سے چپ چاپ بیٹھا ہوا رہتا کہ شاید مجھے اجازت مل کر کرے رحم آ جائے پھر
جب محسوس کیا کہ اب تھوڑا ... تو میں نے بالکل اندھوں کی طرح اس کی کلائی پکڑ لی۔ آپ ہی بتائیے جانی میں کیا کرتا۔ اس میں میرا
کیا قصور ہے۔"
"جانے بھی دیجئے بھائی جان۔" عرشی نے عبدالحنان کو بتایا تھا "میرا تو خیال ہے کہ ساجدہ کی کلائی
پر ہاتھ پڑنے سے ... چوڑیاں ٹوٹیں تو میری آنکھیں کھلیں۔ اگر چوڑیاں نہ ٹوٹتیں تو قسم کھا کر کہتا ہوں۔ خدا جانے میں کیا کر بیٹھتا۔ مگر چہرے
ہاتھ پڑا رہتی تھی۔ ... پر ترس آتی تھی۔ اور پھر یہ بھی شکر کرو کہ میں نے اسے پکڑ لیا۔ میں ایسے ذکر کرتا تو خدا کی قسم بچوں کی طرح رونے
بیٹھ جاتا۔ ساجدہ کی وجہ سے نہیں۔ جانے کس وجہ سے۔ بس مجھے رونا آ جاتا۔ عورتوں کے سامنے رونا آ جاتا۔"
عبدالحنان اور اس کی بیوی جب بھی جہلم گئے۔ ساجدہ کے والدین سے ضرور ملے۔ راحت علی کے خاندان کی بے حد تعریف
کا تفصیلہ بھی کیا کرتے رہے۔ رضیہ نے حنان کو یہ بھی بتایا کہ جب ایک بار اس نے ساجدہ سے یوں ذرا چھیڑا تو وہ بولی "کلائی پر کوئی بھی
کچھ پروا نہیں ... مجھے بھی تو وہ کچھ ایسے بُرے نہیں لگتے تھے۔" راحت علی کے ماں باپ مر چکے تھے اور وہ اپنے خاندان کا واحد
فرد تھا۔ اس لیے آخر میں یہ طے کرنے پر اس نے کہیں سے دور دراز کی ایک خالہ کا بھی سراغ لگا لیا جو عبدالحنان اور رضیہ کے ہمراہ جہلم جا کر
بات پکی کر آئی اور تین مہینے بعد کی بات تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔
شادی کے دن لڑکیوں نے راحت علی کو خوب بنایا مگر وہ احمقوں کی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا۔ جلد ہی سے اس کے لیے
ایک شہ بالا ڈھونڈ نکالا گیا۔ جس نے ساجدہ کی خاص سہیلی زرینہ کے ہاتھوں چاندی کے ٹھوس کنگن کی قیمتی چار چوڑیں کھانے کے بعد لو فرار
اختیار کر لی۔ اور سہیلیوں کو قدرتی ہوا ایک کھڑکی میں سے کود کر ایک انگلی زخمی ہوئی۔ جیسا کہ راحت چیرتے پکڑ کر لا بٹھایا گیا اور اس کے زخم پر
نمک مرچ لگا کر اس پر پٹی باندھ دی گئی۔ اس پر وہ کا بیعل پر اترا۔ مگر راحت علی مسکراتا رہا اور ننگی ڈالیوں جیسے گیت سنتا رہا اور سوچتا
رہا کہ جب وہ پہلی بار ساجدہ سے تنہائی میں ملے گا تو اس کی کلائی پر سے ٹھوس سونے کے کنگن ... جو اس نے ساجدہ کے لیے بڑے
شوق سے بنوائے تھے۔ اپنے ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دے گا۔ ساجدہ کا یہ جو تم نے لہو کر دی میں بھی لگا کو ڈرا اُٹھنے لگا ہوں۔ مگر ساجدہ جاں
کے سامنے بار بار زخمی کلائی کو باہر دھوتیں سے کرتے چھپتی ہوئی ابھرتی رہی اور وہ سوچتا رہا کہ وہ اس کی کلائی پر کہاں کہاں پیار کرے گا
اور اگر کلائی پر چوڑیاں ہوئیں تو انھیں کتنی نرمی سے اِدھر اُدھر ہٹا کر اپنے ہونٹوں کے لیے جگہ بنائے گا۔
شادی کے بعد راحت علی کو ساجدہ کے ساتھ صرف دو دن گزارنے کا موقع ملا مگر ان دو دنوں میں اس کی کیفیت ایسی رہی
جیسے وہ اعصاب زدگی کا پرانا مریض ہے۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور ہتھیلیاں اور تلوے ہر وقت پسیجے رہتے تھے۔ عبدالحنان نے
اسے سمجھایا بھی کہ دولہاؤں کے یہ تیور نہیں ہوتے مگر راحت علی بولا "میں کیا کروں حنان۔ میں ابھی تک یہ فیصلہ ہی نہیں کر پایا کہ میں
اس لڑکی سے پیار کروں یا اس کی پوجا کروں یا اس سے نفرت کروں۔ وہ جس نے میرے ہاتھ کی ہڈیاں توڑ ڈالی تھیں اب انھوں کا

[illegible] سے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

عبدالحلیم صاحب باتیں ہو رہی تھیں [illegible] ساجدہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] راحت علی ساجدہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

اس پر ساجدہ جس طرح مسکرائی تھی وہ [illegible] عجیب مسکراہٹ تھی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سگریٹ کے [illegible] [illegible]

جب دو دن کے قیام کے بعد ساجدہ میکے [illegible] راحت علی سے تنہائی میں ملی [illegible] وقت [illegible] دروازے کو تکتے رہ گئے [illegible] سگریٹ پی [illegible] ساجدہ [illegible] اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تو [illegible] چونکا [illegible] اور بولا "کیا بات ہے؟"

ساجدہ کی مسکراہٹ اس کے چہرے پر [illegible] بکھر گئی۔ اب راحت علی نے [illegible] [illegible] بولی "جی کیوں کیا بات ہے؟"

راحت علی نے جیسے [illegible] اپنے آپ کو سنبھال لینے کے [illegible] کھڑا ہو [illegible] اور ٹہلنے لگا۔ ساجدہ [illegible] حیران [illegible] کھڑی رہ گئی جیسے وہ دودھ کا ایک پیالہ [illegible] [illegible] پھر [illegible] دور سے آنے والی آواز میں بولی "میں آپ کو یہ بتانے آئی تھی کہ امی [illegible] نے اجازت دے دی ہے اور ہم آج شام کی گاڑی سے لاہور جا رہے ہیں۔"

راحت علی نے اسی طرح ٹہلتے ہوئے اور ساجدہ کی طرف دیکھے بغیر کہا "کیا چاہو تو دو چار دن اور رک جاؤ۔ میری طرف سے اجازت ہے۔"

یہ کہہ کر وہ پلنگ پر بیٹھ گیا اور ساجدہ پر [illegible] جیسے اس کی سمجھ میں [illegible] [illegible] بے ہوش ہو کر [illegible] جائے [illegible] وہ ایک لمحہ [illegible] کھڑی راحت علی کو دیکھتی رہی جیسے اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ پھر اسے [illegible] پلنگ [illegible] گئی اور راحت علی کے سینے پر سر رکھ کر اور بازوؤں کو اس کے شانوں پر [illegible]

گویا وہ سیں راحت آ وہی چلیں گے مستقیم ہی کی گاڑی سے چلی گئے۔

"بہت اچھا۔ چلو۔" راحت علی صاحب کے دروازے کا تالا توڑ کر گھر سے بہت ... گھر ... ہو کر مر جاتا۔

وہ اسی روز ہم سے پہلے آ گئے۔ پھر لڑکی ایک مہینہ بعد جب علم ہی ساجدہ کی ماں اور باہر وہ سب گھر والے اس موقع پر باتیں کر رہے تھے کہ لڑکیاں سب بیاہے جانے کے بعد یکایک بہت برسوں کے بعد جدا ہو کر آئے یکایک ... تو یکایک ساجدہ تنہا رہ گئی اور بیٹی ماں سے بہت بچوں کی طرح چمٹ گئی۔ سب تھک ہار کر باتیں کرنے بیٹھے۔ پھر صاحب نے کر راحت علی کو بھی اندر بلایا۔ نہیں مگر وہاں راحت علی کے بجائے اس کا ملازم ایک شخص ہے کہ وہ اس نے سلام کر کے کچھ ہی کے حوالے کیا اور زیادہ بات چیت کی طرح دے دیا۔

"صاحب سلام ہو رہے اور بوڑھے گھر والے سب اپنی منہ مانگ ... اور جب ... آدمی کیسے کر سکتے ہیں؟"

ایک دن ساجدہ کی رشتہ داروں اور سہیلیوں سے بھرا ہوا اور الٹا آیا۔ ... ٹھیک بات بات پر ہاتھوں پر انگلیاں رکھی جاتی رہیں۔ آنکھیں ... اور دیکھیں اچکا اچکا کر خندہ ... بھری جاتی رہیں۔ آخر کار ساجدہ کی امی سے سیدہ بیگم ... پورے ہجوم میں یوں عام ہوا کہ راحت علی تھوڑا سا پاگل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم خوبصورت تو ہو مگر صرف خوبصورت ہو۔ تمہاری خوبصورتی دوسرے سے خالی ہے۔

"یہ وجہ کیا ہو سکتی ہیں؟" بتانے والی سے کسی نے پوچھا۔

"اور وجہ کوئی ... ہوتا ہے۔ یہ یہاں نہیں ہوتا۔ ادھر بڑے بڑے شہروں میں ہوتا ہے۔" پھر اس نے راحت علی کے پاگل پن کی وضاحت جاری رکھی۔ "وہ کہنے لگا ساجدہ بی بی سے کہ میں تمہیں دور سے دیکھ کر دھوکا کھا گیا تھا۔ میں سمجھا تھا تم جیتی جاگتی سانپ ہو۔ پر تم مورتی نکلیں۔"

"ہائے یہ کہا اس نے؟ پر کیا ہوا اس نے؟" کسی نے پوچھا۔

بتانے والی بولی "ارے بھئی کوئی پاگل ہوں کہ پاگلوں کی باتوں کا مطلب بتاتی پھروں۔ ہاں تو پھر بہن صبر بھی کر ... کل ہی تو غضب ہو گیا۔ کل جب ساجدہ نے سوتے ہوئے راحت علی کو یونہی ذرا سا چھو لیا تو اس نے ساجدہ کے منہ پر ... تھپڑ مارا اور چیخنے لگا کہ تم صرف خوبصورت ہو۔ تم صرف ایک عام سی عورت ہو۔ شادی سے پہلے میں نے تمہارے حسن کے ہاتھوں میں جو آگ دیکھی تھی۔ وہ کہاں ہے؟ جاؤ۔ اپنے آپ کو میری نفرت سے بچالے جاؤ۔"

"پاگل ہے۔ صاف پاگل ہے۔" کسی نے کہا۔

"بدتمیز ہے وحشی ہے درندہ ہے۔" ندیم دیں ساجدہ کے گھٹنے کے پاس بیٹھی ہوئی چلا اٹھی "ہائے مجھ قسم پروردگار کی میں تمہاری جگہ ہوتی تو اسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتی۔ ساری میں پوچھتی ہوں اس نے تمہارے منہ پر تھپڑ مارا تو کیا تمہارے ہاتھ پر فالج گر گیا تھا؟ جواب میں تم اسے تھپڑ مارنے کے بجائے رونے لگیں اور پھر بیٹھے بھاگ آئیں۔ میں ہوتی تو قسم پروردگار کی۔ اسے دونوں کانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتی اور پوچھتی کہ کہیں میاں۔ اب بتاؤ۔ ... دوڑ کتنے ہوتے ہیں۔" پھر ذرا سا رک کر بولی "کمینہ۔"

[illegible] ساجدہ [illegible] اتفاق سے [illegible] بات چیت [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بہت [illegible] [illegible] [illegible] بھاگ گئی۔

کرم [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ساجدہ [illegible] ساجدہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] راحت علی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سہیلیاں اب راحت علی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ساجدہ [illegible] [illegible] [illegible] تو وہ ہاتھوں کو دونوں [illegible] [illegible] [illegible] جاتے ہیں۔

پھر ایک روز جب رات کے گیارہ بجے تک [illegible] تاش کھیلنے کے بعد سب لوگ [illegible] [illegible] ساجدہ کی سہیلیاں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئی تھیں تو ایک بجے کے قریب [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اپنے ملازم کے ساتھ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سب لوگ [illegible] [illegible] دونوں ہاتھوں میں چھپا کر [illegible] دروازے پر [illegible] سارے گھر میں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] راحت [illegible] اپنے کمرے میں نہیں ہے اور اس کے کمرے کا [illegible] دروازہ [illegible] کھلا ہے۔ ایک سے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] پھر سب یکدم راحت علی کے کمرے کی طرف بھاگے۔ وہاں پہنچ کر وہ پھر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے مگر [illegible] ساجدہ [illegible] [illegible] [illegible] معمہ حل کر دیا۔

فوراً [illegible] کے نوجوان رشتہ دار ایک کار میں [illegible] [illegible] لاہور کی طرف روانہ ہو گئے اور ساجدہ کے ابا نے عبدالمنان کو تار بھجوا کر فوراً بلوایا۔ مگر جب تک یہ معمہ حل ہوتا، راولپنڈی سے [illegible] کے نام [illegible] کا خط آ چکا تھا کہ ہم بخیریت ہیں اور آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ صورت احوال یہ ہے کہ ہمیں معاف کر دیجئے۔ چھوٹے غلطیاں کرتے رہتے ہیں اور بڑے معاف کرتے رہتے ہیں۔ اور آپ ہمیں معافی کی چٹھی لکھ دیں تو ہم دونوں آپ کی قدم بوسی کے لیے فوراً حاضر ہو جائیں گے۔

راحت علی جب ساجدہ کو ملکوال سے بیاہ کر لایا تھا۔ اور سسرال میں اپنی بہت سی نئی رشتہ داروں اور ساجدہ کی سہیلیوں میں گھر

بھا صوفے پر جاکر بیٹھا تھا، اور سامنے دیکھا تھا تو یکایک اسے محسوس ہوا تھا کہ اس نے ساجدہ سے شادی کر کے غلطی کی ہے۔

"یہ کون ہے؟" اس نے سوچا تھا۔ یہ تو ساجدہ کے بالکل اُلٹ ہے لیکن پھر بھی خوبصورت ہے۔ جس کی نسائیت میں مردانہ وجاہت ہے اور جس کا رنگ اتنا صاف ہے کہ زبان تک کر اس کا ذائقہ محسوس ہوتا ہے۔ جس کی آنکھیں صرف اتنی بڑی ہیں کہ اس سے بھی بڑی ہوں تو مصنوعی معلوم ہوں۔ ہر پلک بال کی طرح خمیدہ ہے۔ خوب لمبی اور جڑی ہوئی بھویں ہیں۔ یہ بھویں ہی کی گولائی تک ہے لیکن اگر اس چہرے پر ساجدہ کی سی ناک ہوتی تو پورے چہرے کا ناس مار دیتی۔ ہرے ہرے ہونٹ ہیں جن کا رنگ ہمیشہ ہی یا نئی شوخی سا ہے جیسے مست سا زہر آلود خون پڑے پڑے جم گیا ہو۔ سامنے سے ابھری ہوئی ٹھوڑی ہے۔ گردن میں پتلی پتلی رگیں ہیں اور جسم کے خطوط میں رعنائی بھی ہے اور توانائی بھی۔ یعنی ایک ایسا بھرپور بدن جس کی وجہ سے سارا جسم گداز سا نظر آتا ہے۔ راحت علی نے سوچا تھا کہ اگر وہ مصور ہوتا تو اس لڑکی کی تصویر کھینچ کر اس کے نیچے "عورت" لکھ دیتا۔

ایک ساتھ سب نے اس لڑکی کی طرف دیکھا جس کی طرف راحت علی مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ پھر وہ بولی تھی "یہ لیجئے دولہا بھائی تو مجھے بالکل نرے دولہوں کی طرح دیکھے جا رہے ہیں۔"

"ہائے زرینہ" کوئی بڑی بی بولی۔ "گالی مت بکو۔"

"گالی مت بکو زری" راحت علی نے راولپنڈی کے ایک ہوٹل میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو تمہیں اپنا ایک خیال بتا رہا تھا۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ دنیا کی ساری عورتیں چاہے وہ ساجدائیں ہوں، چاہے زرینائیں، جب بیوی بن کر مرد کے قریب آتی ہیں تو اپنی شخصیت کے خول میں سے نکل آتی ہیں اور سیدھی سادی عام عورتیں بن جاتی ہیں۔ میں تو تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ ساری دنیا میں صرف ایک عورت بستی ہے۔ البتہ ہر گھر میں اس کا نام مختلف ہے!"

"پھر وہی بک بک!" زرینہ اچک کر بولی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ زرینہ کے نام اس کی امی کا خط آیا تھا۔ دنیا کی تمام ماؤں کی طرح انھوں نے بھی یہ کڑوی گولی آنکھیں بند کر کے نگل لی تھی۔ انھیں فوراً بلا بھیجا تھا اور یہ فرمائش بھی کی تھی کہ آتے ہوئے جہلم سے مری کی تین چار پیالیاں بھی لیتی آنا۔

"اس کا مطلب تو یہ ہے" راحت علی نے کہا۔ "کہ تمہاری امی ہم سے نہ صرف خفا نہیں ہیں بلکہ خوش ہیں۔"

"خوش کیوں نہ ہوں" زرینہ بولی۔ "میں نے انھیں باقاعدہ شادی کے دس ہزار کے خرچے سے بچایا ہے کہ نہیں؟"

دوسرے دن دوپہر کو دونوں جہلم پہنچے تو زرینہ کی ماں دس منٹ تک زرینہ کو سینے سے لگائے روتی رہیں۔ وہاں سے فارغ ہو کر انھوں نے راحت علی کے سر اور پیٹھ پر تین چار بار ہاتھ پھیرا اور اس کا کندھا چوما۔ پلٹ کر وہ زرینہ سے لپٹ گئیں ـــ اور راحت علی نے ایک کرسی پر بیٹھ کر اپنی سامنے کی جیب میں سے کنگھی نکالی اور بال سنوارنے لگا۔

ایک دم اتنی بہت سی پڑوسنیں قطار اندر قطار صحن میں اُمڈ پڑیں۔ اور زرینہ، اس کی امی اور راحت علی ان میں گھر کے رہ گئے۔ بیشتر عورتیں انھیں یوں حسرت سے دیکھے جا رہی تھیں جیسے وہ کوئی بہت بڑا معرکہ سر کر کے لوٹے ہیں۔ اکا دکا نوجوان لڑکیوں نے راحت علی سے چھیڑ چھاڑ کی بھی کوشش کی اور بعضوں نے اپنی چوڑیوں بھری کلائیاں بھی اس کے سامنے یہ کہہ کر پھیلا

[illegible] کے [illegible] جب [illegible] جیسے اس کے سامنے [illegible] لاری ہیں [illegible] ہی ہے۔

ادھر زرینہ کی امی [illegible] سب ہی [illegible] جب [illegible] ساجدہ [illegible] وقت اس کے ہاتھ میں [illegible]

راحت علی کے چہرے پر [illegible] ایسا [illegible] جیسے [illegible] سب سے [illegible] طرف دیکھا اور سب کے [illegible] سب سے [illegible] تھیں ادھر ادھر [illegible] راحت علی نے ساجدہ [illegible]

ساجدہ کے [illegible] چہرہ [illegible] بہت [illegible] جیسے [illegible] جاتا ہے۔

وہ آنکھیں پھیلائے ادھر ادھر دیکھ رہی [illegible] راحت علی کی طرف آئی۔ اس کے قریب آ کر رک گئی۔ اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھنے لگی [illegible] جیسے [illegible] راحت علی کے منہ پر تھپڑوں کی بوچھاڑ کر دی۔ راحت علی بازو [illegible] جیسے ساجدہ کی چوڑیوں نے [illegible] ہے۔ پھر اچانک اس نے [illegible] ساجدہ کی چوڑیوں بھری کلائی [illegible] لال لال چوڑیاں [illegible] اور ہر طرف [illegible] راحت علی کی انگلیاں [illegible] ساجدہ [illegible] راحت علی [illegible] کے ہاتھ سے [illegible] ساجدہ کو کندھے سے جھٹک کر پیچھے [illegible] کیا بکواس ہے؟"

ساجدہ نے راحت علی کے ہاتھ پر سے ہونٹ ہٹا کر ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی ٹھوڑی چھڑا لی اور [illegible] دانتوں پر پھیلا ہوا راحت علی کا خون زرینہ کے منہ پر تھوک دیا۔ زرینہ دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر روتی ہوئی وہیں جھک گئی اور ساجدہ واپس جانے کے لیے پلٹی ہی تھی کہ اندر کمرے میں سے زرینہ کی امی سو سو کے نوٹ ہاتھ میں لیے ہوئے چیختی چلاتی باہر نکلیں اور پکاریں "یہ لے اپنا دس ہزار کا حق مہر جس کی خاطر تو میری بیٹی کی گود اجاڑ رہی ہے۔ میں تجھ جیسے ہزاروں [illegible] قربان کر ڈالوں اس جوڑے پہ سے!"

ساجدہ نے جس کے ہونٹ راحت علی کے خون سے سرخ ہو رہے تھے، ذرا سا رک کر زرینہ کی امی کی طرف بے پناہ نفرت سے دیکھا اور پھر رستہ بناتی ہوئی عورتوں کے ہجوم میں سے گزر کر باہر چلی گئی۔

"لائیے اپنے بچے اسے دیجئے" عاصمہ نے زرینہ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

"یہ لے منا" ہاتھوں سے نوٹوں کا لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"یہ پیسے آپ نے کسے دیئے ہیں نا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ہاں منا" وہ بولیں۔

"وہ حسنی سے یہ لفافہ" روتی ہوئی زرینہ کے سامنے جھکتے ہوئے کہا "تو میں نے آپ کی بچی کو دے دیا"

یہ کہہ کر وہ یوں باہر لپکا جیسے ذرا سا بھی رک گیا تو اسے بہت دیر ہو جائے گی۔ زرینہ نے یہ دیکھا تو کھڑی ہو گئی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے جاتا دیکھنے لگی اور اس کی ماں دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر روتی ہوئی وہیں بیٹھ گئیں۔ مگر وہ جلد ہی پتا چلا گیا۔ وہ باہر سڑک پر آگیا اور بھاگنے لگا۔ ٹھیک ناکے پر ساجدہ کے ابا، ان کا بھائی اور عبدالمنان اس کی طرف آ رہے تھے۔ مگر وہ انہیں نہ دیکھ سکا۔ وہ تو صرف ساجدہ کو دیکھ رہا تھا جس سے اب وہ صرف چند ہی قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔

سنترے

خواجہ احمد عباس

بات شروع ہوئی ہندوستان سے، بمبئی سے۔

وہ تھا ایک ستارہ [illegible] کی [illegible] میں [illegible] ٹوٹ گیا۔

ہمالیہ کی کھڑکی سے [illegible] اس نے سوچا۔ ستارہ ٹوٹ کر [illegible] ہے۔ [illegible]

ایک نامعلوم خوف سے وہ کانپ اٹھی۔ مگر پھر اس نے سوچا یہ سب [illegible] ہے اگر ہر بار ستارہ ٹوٹنے پر ہوائی جہاز کریش (CRASH) ہو جایا کرے تو لوگ ہوائی جہاز میں سفر کرنا ہی چھوڑ دیں اور پھر اس وقت تو اس سے زیادہ خوش قسمت لڑکی ساری دنیا میں نہ ہوگی [illegible] ہنی مون [illegible] ہے۔ جلدیو [illegible] جن کے ساتھ وہ کل بمبئی سے ہوائی جہاز میں ساری دنیا کی سیر کو روانہ ہونے والی ہے۔ [illegible] کا اکلوتا بیٹا ہے اور [illegible] بڑے بڑے ہوٹلوں کا [illegible] جو سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دہلی میں [illegible] بمبئی میں [illegible] مسوری میں ہمالیہ [illegible] نینی تال میں [illegible] کلکتہ میں [illegible] میں [illegible] یہ فہرست [illegible] آپ ہی آپ مسکرا دی [illegible] یہ نام اتنی بار [illegible] کہ زبانی حفظ ہو گئے تھے۔

جلدیو کو اپنے باپ کی اس ہوٹل ایمپائر پر بڑا ناز تھا اور اس نے آشا سے وعدہ کیا تھا کہ جب یہ سلطنت اس کے قبضے میں آئے گی تو وہ دلی میں ہندوستان کا سب سے بڑا، سب سے خوبصورت اور سب سے عالیشان ہوٹل تعمیر کرائے گا اور اس کا نام ہوگا آشا پیلس۔ اور یہ وعدہ یاد کر کے آشا نے بڑی محبت اور تشکر سے جلدیو کا ہاتھ دبا دیا۔ جلدیو کا ہاتھ جو [illegible] اور ہینڈ کریم کے استعمال سے نرم رہتا تھا۔ جس پر محنت نے کوئی گٹھا نہیں ڈالا تھا جس کی انگلیوں کے ناخن [illegible] ہوٹل کی حسین منی کیورسٹ لڑکیاں بڑے اہتمام سے تراشتی تھیں ان کو نوکیلا بنا کر ان پر نیل پالش لگاتی تھیں۔

جلدیو کے ہاتھ کی نرمی اور گرمی میں کتنے ہی خوش آئند وعدے تھے۔ بمبئی سے وہ ہوائی جہاز میں قاہرہ جائیں گے وہاں نیل کے کنارے دنیا کے مشہور ہوٹل نائل ہلٹن (NILE HILTON) کے [illegible] سویٹ میں ٹھہریں گے۔ اونٹ پر بیٹھ کر اہرام مصر کے سامنے تصویر کھنچوائیں گے۔ کیبرے میں نیم برہنہ مصری لڑکیوں کا ناچ دیکھیں گے۔ پھر لندن جائیں گے۔ وہاں کے سب سے بڑے ہوٹل [illegible] میں ٹھہریں گے۔ بکنگھم پیلس کے سامنے [illegible] کے گارڈز کے ساتھ تصویر کھنچوائیں گے پھر پیرس میں فرانس کے سب سے مہنگے ہوٹل جارج پنجم میں ٹھہریں گے

اور پھر نیویارک میں والڈ روف اسٹوریا اور پھر شکاگو۔ اور پھر لاس اینجلز (LOS ANGILES) جہاں آشا فلم اسٹوڈیوز دیکھنے جائے گی اور گریگری پیک (GREGORY PECK) کے ساتھ تصویر کھنچوائے گی جو "السٹریٹڈ ویکلی" اور "ماڈرن وومن" میں شائع ہوگی اور جسے دیکھ کر اس کی ساری سہیلیاں رشک سے جل مریں گی اور پھر وہ ٹوکیو جائیں گے اور وہاں کے امپیریل ہوٹل میں قیام کریں گے اور پھر ہانگ کانگ اور سنگاپور کے مشہور ریستورانوں کا معائنہ کرتے ہوئے واپس آجائیں گے۔ "بٹ دیز ڈارلنگ" یہ پہلے خود ہی نوٹ کر سمجھا رہا تھا۔ "ڈیڈی اس سفر پر مجھے صرف یہ بتانا چاہتے ہیں تاکہ میں دنیا کے سب بڑے بڑے ہوٹلوں کے انتظام اچھی طرح سے معلوم کرسکوں اور طور طریقوں کو اپنے ذہن میں رائج کرسکوں ان سب ہوٹلوں کے مالک میرے ڈیڈی کے دوست ہیں ہندوستان میں ہوٹل کھول رہے ہیں چکے ہیں اس لیے ان میں سے ہر ایک نے بڑے اصرار سے ہمیں مدعو کیا ہے اور چونکہ ہر جگہ میرے ڈیڈی کا ہوٹل بنانے والے ہیں اس لیے ڈیڈی نے یہ ضروری سمجھا ہے کہ اپنے ساتھ اپنی کسی ذہین تجربہ کار سو ڈارلنگ ہندوستان واپس آکر ہماری شادی ہوگی یعنی پہلے ساری دنیا کا دورہ کرکے ہنی مون منا لیا جائے اور پھر شادی کی رسم ادا کی جائے۔ بس اس نے کہا تھا۔

AINT THAT GONNA BE WONDERFUL, SWEETIE – PIE ?

اور جدید کا وہ یگانہ جملہ یاد کرکے آشا مسکرا دی۔

ہوائی جہاز میں تقریباً مکمل اندھیرا تھا۔ زیادہ تر مسافر سو رہے تھے سامنے کی سیٹ پر ایک مرشد نام کے سیٹھ صاحب بڑے زور سے خراٹے لے رہے تھے جن کی آواز ہوائی جہاز کی گھڑگھڑاہٹ پر بھی بھاری تھی ان کے برابر میں سیٹھانی بچے کو گود میں لیے سو رہی تھی۔ راستے کی دوسری طرف ایک اینگلو انڈین جوڑا ایک ہی کمبل تانے سو رہا تھا۔ ان سے اگلی سیٹ پر ایک کھدر پوش منسٹر اپنی سیٹ کے اوپر لگی ہوئی ننھی سی ریڈنگ لائٹ جلائے ایک امریکن جاسوسی ناول پڑھ رہے تھے۔ ان کے برابر میں شارک اسکن کا سوٹ پہنے ایک سندھی بیوپاری تھا جو منسٹر صاحب سے باتیں کرتے کرتے سو گیا تھا۔

آشا نے سوچا یہ نائٹ ایئر سروس کا سفر بھی کتنا دلچسپ اور کتنا عجیب ہوتا ہے اور اس اندھیرے ہوائی جہاز میں جو اپنی مستقل رفتار سے اندھیرے کے سمندر میں تیرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس کو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ وہ صرف تین گھنٹے پہلے دہلی کے پالم ایئرپورٹ سے نہیں روانہ ہوئی بلکہ ہمیشہ سے اسی نائٹ ایئر سروس میں سفر کر رہی ہے اور یہ زندگی کا ہوائی جہاز ہمیشہ یونہی اسی لامتناہی فضا میں اڑتا رہے گا۔ بہتا رہے گا کیونکہ وقت سے اس سمندر کا کوئی کنارہ نہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ اور یہ تمام مسافر یہ ساری دنیا ایک گہرے سناٹے میں ڈوب جائیں گے اور کائنات کے نظام میں اتنا فرق بھی نہیں پڑے گا جتنا کروڑوں ستاروں میں سے ایک ستارہ ٹوٹ جانے سے پڑتا ہے۔

اور اسی لمحے میں یکایک ہوائی جہاز کی ساری روشنیاں جل اٹھیں اور کچھ لوگ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے مگر وہ اینگلو انڈین جوڑا اسی طرح کمبل میں لپٹا لپٹایا رہا اور سیٹھ جی بدستور خراٹے لیتے رہے آشا نے دیکھا کہ سیٹھانی بچے کو دودھ پلاتے پلاتے سو گئی تھیں اور بچہ ابھی تک ماں کی چھاتی سے چپٹا ہوا تھا اس نے یہ بھی دیکھا کہ کھدر پوش منسٹر صاحب نے روشنی ہوتے ہی وہ امریکن جاسوسی ناول جس کے اوپر ایک نقاب پوش پستول باز اور ایک نیم برہنہ مرد و عورت کی تصویر بنی ہوئی تھی، بند کرکے جلدی سے اپنے کھدر کے تھیلے میں ڈال دیا جس کے دونوں طرف مہاتما گاندھی کی تصویر چھپی ہوئی تھی اور اس میں سے پنج سالہ پلان کے بارے میں ایک موٹی سی رپورٹ نکال کر ہاتھ میں سنبھال

[illegible] بہت حد تک ... [illegible] ... جب ... [illegible] ... آنکھیں ... [illegible] ... وقت [illegible]
[illegible] ... [illegible] ... کی [illegible]
کی [illegible] ... [illegible] ... [illegible] کر دیا۔

[illegible] ... [illegible] ... جہاز [illegible]
[illegible] ... [illegible] ... ناگپور کے ہوائی اڈے پر [illegible]

ناگپور!

ناگپور!!

ناگپور!!!

[illegible] ... [illegible] ... ناگپور، ناگپور ... [illegible]
[illegible] ... [illegible] ... [illegible]
[illegible] ... [illegible] ... [illegible]
ایک آہنگ ... [illegible] ——— ناگپور، ناگپور، ناگپور۔

... وہ ہوائی جہاز ... [illegible] ... کی طرف جا رہا تھا۔

وہ اب بھی ہوائی جہاز میں بیٹھی ہوئی تھی

وہ ہوائی جہاز اب بھی ناگپور ہی کے ہوائی اڈے پر اترا تھا۔

مگر وقت اور تھا، دنیا اور تھی، وہ خود اس وقت کچھ اور تھی۔

وہ اس دن کتنی خوش تھی۔ جب لڑکی کی اطلاع ... [illegible] ... اور پھر خوبصورت بھی ہو تو بلا وجہ بھی خوش ہو سکتی ہے مگر [illegible] خوش ہونے کی کتنی ہی وجوہات تھیں۔ اس دن اس کا بی۔ اے کا نتیجہ بھی نکلا تھا اور وہ پاس ہو گئی تھی۔ اس [illegible] مشرق وسطیٰ [illegible] کا خط ملا تھا۔ [illegible] سے [illegible] ... [illegible] ... کے لیے وہ پہلے [illegible] گئی ہے۔ [illegible] کے لیے وہی [illegible] ہے۔ سرکاری خط حسب معمول ... [illegible] ... اگلے دن صبح کے گیارہ بجے تھا اور وقت پر پہنچنے کی صرف ایک صورت تھی کہ نائٹ ایکسپریس سے روانہ ہو جائے۔ [illegible] اسے چھوڑنے ایئرپورٹ تک آئے تھے چلتے چلتے ماں نے ہدایت کی تھی کہ دیکھو راستے میں کوئی انجان آدمی بات چیت کرنے کی کوشش کرے تو اسے جواب نہ دینا ایسے آدمی بڑے خطرناک ہوتے ہیں اور دیکھو میں نے [illegible] کو تار دے دیا ہے۔ وہ تمہیں لینے پلیٹ فارم آ جائیں گی یا اپنے کسی نوکر کو بھیجیں گی۔ جب نائٹ ایکسپریس کے سب مسافر اکٹھے ہو گئے تو آشا کی ماں نے ایک معمر خاتون سے بیٹی کا تعارف کرا کے کہا "بہن یہ میری بچی پہلی بار ہوائی جہاز میں بیٹھ رہی ہے کرپا کر کے اس کا خیال رکھئے گا۔" آشا کو جھنجھلاہٹ بھی ہوئی کہ ماں مجھے کیا بالکل دودھ پیتی بچی سمجھتی ہیں۔ مگر پھر سفر کے خوش آئند خیال سے وہ مسکرا دی اور بولی "ماں تم بالکل

نہ گھبراؤ میں ایک سیکنڈ کے لیے بھی مسز نارائن کا پلو نہیں چھوڑوں گی۔"

مسز نارائن کافی مشہور سوشل ورکر تھیں، وہ مختلف کانفرنسوں میں شرکت کے لیے اکثر ہوائی جہاز سے سفر کیا کرتی تھیں۔ انہوں نے آشا کو ہدایت کی کہ سیٹ بیلٹ بیچے کسا کرو۔ اسی طرح کمر سیدھی کر کے لیٹ رہے اور چند ہی منٹ میں اکثر مسافروں کی طرح وہ تو سو گئیں مگر آشا یہی سوچتی رہی کہ کرسی اگر گدے دار آرام دہ نہ ہو تو اس پر کیسے سویا جا سکتا ہے۔ اپنے بدن کو بے حد ڈھیلا چھوڑ کر اس نے سونے کی کوشش کی لیکن جب کامیاب نہیں ہوئی تو وہ بیٹھی بیٹھی ایئر ہوسٹس کو کام کرتے دیکھتی رہی جو مسافروں کو سنگترے کی گولیاں، کان بند کرنے کے لیے روئی، سر کے نیچے رکھنے کے لیے تکیے، اور پڑھنے کے لیے ناول اور رسالے اور اطمینان بھری پیشہ ورانہ مسکراہٹیں تقسیم کر رہی تھی۔ پھر روشنیاں گل کر دی گئیں اور نہ جانے کتنی دیر آشا وہیں اور وہ کھڑکی سے مستقبل کے اندھیرے میں جھانکتی رہی جس کے آسمان پر دور بہت دور ستارے جگمگا رہے تھے لیکن ابھی تک اسے یہ معلوم نہ تھا کہ ان میں اس کی قسمت کا ستارہ کون سا ہے۔

اور پھر ہوائی جہاز نیچے اترنا شروع ہوا اور روشنیاں جل اٹھیں، ایئر ہوسٹس نے اعلان کیا کہ یہاں ایک گھنٹے کے لیے ناگپور کے ہوائی اڈے پر رکے گا۔

اس نے مسز نارائن سے کہا "مگر میں تو سمجھتی تھی کہ یہ ہوائی جہاز سیدھا دلی جائے گا؟"

"جائے گا مگر ایک گھنٹے کے بعد۔"

"اور ایک گھنٹے تک ہم کیا کریں گے؟"

"تم ایئر پورٹ کے ریستوران میں جاؤ وہاں ایئر لائنس کی طرف سے کچھ ناشتہ اور کھانے پینے کو ملے گا۔"

"جی اور آپ؟"

"جی میں تو ناگپور ہی تک آئی ہوں ہماری کانفرنس یہیں ہو رہی ہے۔"

جب تقریباً سب مسافر اتر گئے تو آشا نے ایئر ہوسٹس سے کہا "اگر کوئی حرج نہ ہو تو میں یہیں ٹھہری رہوں؟"

"نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ ہوائی جہاز دلی نہیں جائے گا کلکتے جائے گا۔ اور سب مسافروں اور سامان کا ادلا بدلی ہوتا ہے۔ تم کو نہیں معلوم؟"

اور پھر اس نے آشا کو بتایا کہ پانچ پانچ منٹ کے وقفے سے چار ہوائی جہاز ناگپور پہنچتے ہیں ایک دلی سے، ایک بمبئی سے، ایک کلکتہ اور ایک مدراس سے اور سب جگہ کے مسافر یہاں جمع ہوتے ہیں اور پھر جس کو جہاں جہاں جانا ہوتا ہے وہاں جانے والے ہوائی جہاز میں چلا جاتا ہے۔

"مگر یہ سب ناگپور میں کیوں ہوتا ہے؟"

"اس لیے کہ ناگپور ہندستان کے بیچ میں ہے۔" ایئر ہوسٹس نے ہنس کر آشا کو باہر نکالتے ہوئے کہا "اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ناگپور کے سنگترے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ جاؤ ریستوران میں آرنج جوس پیو فری۔"

"[illegible] مالٹے کا جوس؟" [illegible] ادب سے پوچھا.

"مالٹے کا جوس" [illegible] کی جانب دیکھ کے کہا.

"دو صاحب؟"

"[illegible] کے لیے وہی [illegible] ہے۔ مالٹے کا جوس"

"[illegible] سے [illegible] ایک [illegible] میز [illegible] پر [illegible] کی [illegible] چھت [illegible] بہت [illegible] کرسی پر بیٹھ [illegible] کر [illegible] دیا [illegible] کی گود [illegible] اور [illegible] کو [illegible] کرسی پر رکھ دیا۔

[illegible] اس نے [illegible] بیٹھے [illegible] بات [illegible] ہے [illegible] سے [illegible] کی [illegible] کسی [illegible] صاحب [illegible] بھی [illegible] کی [illegible] ہے [illegible] جوس [illegible] بال [illegible] میں [illegible] بات میں [illegible] نے بوچھا۔

[illegible] آپ [illegible] سے [illegible] صاحب [illegible] کرکے آئے [illegible] میں [illegible] پاس [illegible] بیچے

پیچھے [illegible] اور جب [illegible] کر [illegible] سے [illegible] ہوا [illegible] سے [illegible] یاس سے [illegible] میں۔

[illegible] سے [illegible] کے سوا [illegible] ہے۔ اب [illegible] جاروں میں کوئی [illegible]

[illegible] سے [illegible] سکے ہے [illegible] تھا اور اب [illegible]

[illegible] سے [illegible] پر [illegible] بھی [illegible]

آشا نے سوچا [illegible] بھی تو نہیں ہوتا [illegible] میں [illegible] احساس نے [illegible]

اور دو گلاس سنگترے کے رس سے [illegible]

[illegible] نوجوان نے آشا کی طرف ایک گلاس بڑھایا۔ "ذرا دیکھیے ناگپور کے سنگتروں کا مزہ کیسا ہے۔"

آشا نے ایک گھونٹ لیا اور کہا "کھٹا ہے۔"

نوجوان نے بھی ایک گھونٹ لیا اور کہا "ہوں۔ کھٹا ہے۔"

آشا نے دوسرا گھونٹ لیا اور کہا "اتنا کھٹا بھی نہیں ہے۔"

نوجوان نے دوسرا گھونٹ لیا اور کہا "کھٹ میٹھا کہہ سکتے ہیں"

آشا نے تیسرا گھونٹ لے کر کہا "بلکہ خاصا میٹھا ہے"

نوجوان نے تیسرا گھونٹ اتنا لمبا لیا کہ گلاس خالی ہو گیا۔ پھر وہ بولا۔ "[illegible] کی تاریخ [illegible] میں یہ مزہ کہاں۔ [illegible] ایک گلاس اسی جوس کا لاؤ۔ کہو آپ بھی پئیں گی نا!"

"ٹھیک ہے۔ بیرا مجھے بھی ایک گلاس اور دو۔"

جب بیرا نئے گلاس لایا تو نوجوان نے آشا کی طرف اپنا گلاس بڑھا کر کہا۔

"چیرز"

"جی!" آشا نے پوچھا۔

"انگلستان میں جب دو دوست شراب پینے بیٹھتے ہیں تو اس طرح ایک دوسرے کا جام صحت پیتے ہیں۔"

آشا نے ڈر کر پوچھا "آپ شراب بھی پیتے ہیں؟"

"کبھی کبھی!" نوجوان نے جواب دیا۔ "اگر دوست مجبور کریں۔ لیکن آپ فکر نہ کریں۔ اس وقت یہ وہسکی نہیں ہے۔ دوستوں کا جام صحت اورنج جوس سے بھی پیا جا سکتا ہے۔ سو چیرز۔"

"درست!" آشا نے اپنا گلاس حیرت سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ ماں کی ہدایت کے خلاف کیوں اس نوجوان سے بلا تکلف ایسی باتیں کر رہی ہے کہ وہ اتنا بے تکلف ہوا جا رہا ہے۔

"چیرز!"

"چیرز!"

نوجوان نے اپنا جوس کا گلاس آشا کے گلاس سے ٹکرانے کے بعد ہونٹوں سے لگایا اور غٹ غٹ کر کے ایک سانس میں پی گیا پھر اس نے خالی گلاس کو میز پر الٹا رکھ دیا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کی صحت اور مسرت کا خواہش مند ہوں۔"

آشا کو ایسا لگا جیسے اسے چیلنج کیا جا رہا ہے۔ اس نے بھی گلاس اٹھایا اور ہمت کر کے ایک سانس میں پینے لگی۔ لیکن سنگتروں کا ٹھنڈا کھٹ میٹھا رس اس کے گلے کو گدگداتا ہوا اس کی رگوں کے جوان خون میں سرایت کر گیا اور گلاس کو میز پر الٹا رکھتے رکھتے نہ جانے کیوں اس کے منہ سے نکلا "ایسے ایسے تو میں ایک سو ماٹ گلاس پی سکتی ہوں۔"

سب مسافروں کے ساتھ اندھیرے لاؤنج میں بیٹھے وہ دونوں بھی کشمیر کی بہار دیکھ رہے تھے۔ یہ رنگین ڈاکومنٹری فلم بہت ہی حسین تھی اور ان حسین مناظر کو دیکھ کر آشا سوچ رہی تھی کہ کاش وہ بھی ایک دن کشمیر پہنچ جائے گا۔ . . . . .

"دہلی جانے والا ہوائی جہاز تیار ہے کرپا کر کے دہلی جانے والے یاتری . . . ."

ایئرپورٹ لاؤڈ سپیکر کی آواز لاؤڈ سپیکر پر گونجی نوجوان نے نہ صرف اپنے دو ایئر بیگ اور موٹا اوور کوٹ اپنے شانوں پر اور کیمرہ بلکہ آشا کا ایئر بیگ اور مٹھائی کی ٹوکری جو وہ منزل ماسی کے لیے لے جا رہی تھی۔ سب سامان اپنے کاندھے پر لادا اور دوسرے سب مسافروں کے ساتھ وہ دہلی والے جہاز کی طرف چل پڑے۔

راستے میں آشا نے کہا "لائیے یہ ٹوکری میں لے لوں آپ کے پاس پہلے ہی بہت بوجھ ہے۔ میرا سامان آپ کیوں ڈھوتے ہیں؟"

اور نوجوان نے جواب دیا "اس لیے کہ مجھے بوجھ اٹھانے کی عادت ہے۔ اور اس کے علاوہ مجھے بعض لوگوں کا سامان ڈھونے میں مزا بھی آتا ہے۔"

سکڑ کر کونے میں بیٹھ گئیں۔

مہوش نے اطمینان سے پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا۔

آفتاب نے نوجوان سے کہا۔ "آپ ذرا ادھر سرک جائیں تو یہ بی بی بھی آرام سے بیٹھ جائیں۔"

اور سامنے والے برتھ پر سرکتے ہوئے جب ریل گاڑی چلنے لگی وہ اس سے پوچھا۔

"کہاں جا رہی ہیں؟"

"کہیں دور۔" آفتاب نے جواب دیا۔۔

"آپ تو مدراسی ہو کر بھی ہندوستانی بولتی ہیں"

"میں مدراسی نہیں ہوں لیکن اس وقت مدراس سے آ رہی ہوں۔ ہم لوگ شمال کے رہنے والے ہیں، ہندوستانی زبان بولتے ہیں۔"

"تو ہندوستانی کہاں سیکھی؟"

"میرے بابا ملٹری کی نوکری میں پہلے لکھنؤ دہلی میں رہتے تھے۔ بس وہیں سیکھ گئی تھی۔"

"اور اس کے بعد؟"

"بی۔ اے میں نے مدراس یونیورسٹی سے کیا ہے۔ میرے بابا اب وہاں رہتے ہیں۔ میری ماں سکول میں پڑھاتی ہے جس سے گزارہ ہو جاتا ہے۔"

اب ہوا تیز چل رہی تھی۔ نوجوان نے دونوں کو کمبل دیئے جو وہ دوسرے مسافروں کو چائے والے کی طرف سے دیے گئے تھے۔

زمانے بھر کی باتیں اس نوجوان سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے بی اے انگریزی سے کر کے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے۔ اس کے بابا اسے آگے پڑھنے کے لیے ولایت بھیجنا چاہتے ہیں لیکن ان کی اور ماں کی تنخواہ میں ہی گھر کا خرچ بھی مشکل سے پورا ہوتا ہے۔ ہاں اگر اسکالرشپ مل جائے تو وہ جا سکتی ہے۔

"اسکالرشپ تو آپ کو نہیں ملے گا۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ ہم نہیں چاہتے۔"

"آپ نہیں چاہتے کہ میں آگے پڑھوں، گورنمنٹ کے خرچ پر انگلستان ہو آؤں۔ مگر وجہ؟"

"ہے ایک وجہ۔ مگر پرائیویٹ۔"

"آپ بہت مذاق کرتے ہیں۔ آپ کو تو انجینئر کے بجائے ایکٹر ہونا چاہیے تھا۔"

"سچ؟"

"ہاں اور کیا؟" اب وہ بھی مذاق پر اتر آئی تھی۔ "صورت شکل بھی خاصی ہے آپ کی۔"

وہ ہنسنے لگا۔

آشا بولی: "آپ رہنے والے کہاں کے ہیں؟"

"پیدا ہوا تھا میں وہ بہار میں مگر اب ہم لوگ دہلی میں رہتے ہیں۔"

"اب آپ کو جانا وہیں جانا پڑے گا۔ کیوں؟"

"ہاں اور کیا۔ وہاں کام کرنے کے لیے ہی تو گورنمنٹ نے دو برس ولایت میں ٹریننگ دلوائی ہے۔ ڈیم کے ساتھ جو بجلی گھر بن رہا ہے اس میں کام کروں گا۔"

"وہاں جنگل میں آپ رہیں گے۔ آپ کا جی نہیں گھبرائے گا؟"

"شاید گھبرائے گا۔ پھر ضرورت پڑی تو دل بہلانے کا کوئی انتظام کیا جائے گا۔"

"آپ کی مسز بھی آپ کے ساتھ جائیں گی؟"

"میری شادی نہیں ہوئی۔"

"اوہ!" — اور دفعتاً آشا یہ سوال کر کے جھینپ گئی۔ اور چپ ہو گئی۔ اتنے میں ایئر ہوسٹس نے روشنیاں گل کرنا شروع کر دیں اور نوجوان نے کہا: "اچھا جی اب سونا چاہیے گڈ نائٹ۔" یہ کہہ کر اس نے سیٹ نیچے سرکائی اور کمبل اوڑھ کر دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر ہی میں سارے ہوائی جہاز میں سناٹا چھا گیا۔ خراٹوں کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔

آشا نے اندھیرے میں اپنے برابر کی سیٹ سے کہا: "یہ تو بتائیے کہ آپ کا نام کیا ہے؟"

مگر نوجوان نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سو چکا تھا۔ اور آرام سے لیٹا سوتا رہا جب تک ایئر ہوسٹس نے دہلی پہنچنے کا اعلان نہ کر دیا۔

"دیکھیے آپ یہاں ٹھہریے۔" بالآخر نوجوان نے آشا کی چیزیں اسے دیتے ہوئے کہا: "میں گھر ٹیلیفون کروں کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔"

لیکن دہ ہ ہ کا دروازے کی طرف چلا ہی تھا کہ دفعتاً اس کے پورے خاندان نے اسے گھیر لیا اور دور سے اس طرف کو دیکھتے ہوئے آشا کو اندازہ ہوا کہ جس نوجوان کی ہمراہی میں وہ اتنی دور سے یہاں آئی تھی وہ کس قسم کے خاندان سے تھا۔ اس کی ماں ادھیڑ عمر بہنیں جو جیتا جیتا گھیر کر اس سے لپٹ رہی تھیں شلواریں پہنے ہوئے تھیں باپ کے سر پر سفید پگڑی تھی۔ شریف سیدھے سادے متوسط درجے کے لوگ معلوم ہوتے تھے۔ وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ نوجوان ضرور اپنے گھر والوں سے اس کا تعارف کرائے گا کہ اسے خود مسز راما سوامی کے گلے کا مقابلہ کرنا پڑا۔

"تم آشا ہو۔ آشا شاستری۔" ایک موٹی بوڑھی سفید بالوں والی خاتون نے اپنے موٹے موٹے شیشے کی عینک میں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا اور جیسے ہی آشا نے سر ہلا کر کہا "ہاں"، تو کر بڑی بی نے اسے گلے سے لپٹا لیا۔ "جیتی رہو بیٹی۔ میں تمہاری ماں کی بچپن کی سہیلی ہوں۔ ہم لوگ بنگلور میں ساتھ اسکول جاتے تھے کیا دن تھے وہ بھی! مگر اب یہاں کھڑی کس کا انتظار کر رہی ہو؟ چلو موٹر باہر کھڑی ہے۔ ڈرائیور تمہارا سامان لے لے گا۔ ارے واہ تم تو اتنی لمبی ہو گئی ہو جیسے بانس۔ میں نے تو جب دیکھا تھا تو تم اتنی سی تھیں

...... [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

میں ہوائی جہازوں میں پیٹرول بھرنے کے منظر کو [illegible]
اور انساکھڑی کھڑی سوچتی رہی [illegible] مجھے دیکھ کر کتنے بلانے کے

دہلی پہنچ کر ایک ہفتہ ٹھہری۔ ہر شام کو کناٹ پلیس کے چکر لگائے۔ ہر روز [illegible] (A L P S) میں آئس کریم (C R E A M) [illegible] کھائی۔ ریفیوجی مارکیٹ سے [illegible] خرید ڈالیں۔ اتوار کے دن پکنک کرنے قطب تک گئی۔ ہر جگہ یہ امید لے کر گئی کہ شاید کہیں وہ کمبخت نظر آ جائے۔ وہ جس کے سانولے چہرے پر مسکراتے ہوئے دانت ایسے کھلتے ہیں جیسے پھول۔ مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔

آخرکار ہماری فلائٹ کی اناؤنسمنٹ ہو گئی۔ جہاز یہاں بس چند منٹ رکتا ہے ...... شاداب دوسرے مسافروں کے پیچھے اپنا ایئر بیگ لئے آہستہ آہستہ چلتی رہی اور ہوائی جہاز کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے من ہی من میں دعا کرتی رہی کہ میں اب کہیں نا کہیں کے ہوائی اڈے پر چھوڑ جاؤں گی جہاں اسے پایا تھا میں اسے بھول جاؤں گی پھر اسے بھول جاؤں گی پھر ملے ......"

اور سب مسافر اپنی اپنی جگہ بیٹھ چکے تھے صرف ایک سیٹ خالی تھی۔ ایئر ہوسٹس نے اس کی طرف اشارہ کیا اور شاداب وہاں جا کر بیٹھ گئی تب اس نے دیکھا کہ برابر والی سیٹ پر کوئی بیٹھا ہے۔ وہ اسے غور سے دیکھ رہا ہے۔ ... وہ اس کی طرف ... تو بات کر رہا ہو۔ مگر اس نے دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر کا گورا چٹا اور خاصا تندرست آدمی ہے۔ جو گہرے نیلے رنگ کے سوٹ پر ہلکے نیلے رنگ کی چوڑی چکلی ٹائی لگائے ہوئے ہے جس پر ایک ننگی عورت کی تصویر بنی ہوئی ہے جسے دیکھ کر شادابہ کو ایسی ہنسی آئی جیسے پہلے ایئرپورٹ ریسٹورنٹ میں سنگتروں کا رس پی کر آئی تھی "آپ چاہیں تو ادھر کھڑکی والی سیٹ پر آ جائیے۔" اس شخص نے اپنے ہاتھ میں ہیرے کی انگوٹھیوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ شادابہ نے دیکھا۔ اس کے دانت سگریٹ اور شاید شراب کی کثرت سے پیلے اور گندے ہیں۔ اور گو اس نے تیز خوشبو والا سینٹ لگایا ہوا ہے پھر بھی اس کے منہ سے سڑے ہوئے سنگتروں کی بو چھوٹ رہی تھی۔

شادابہ نے کہا "جی نہیں شکریہ میں ٹھیک ہوں"۔ اور شارک اسکن سوٹ والے نے ایک انگریزی رسالہ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ شادابہ نے دیکھا کہ میگزین کا نام ہے GAY NIGHTS اور سرورق پر جو تصویر چھپی تھی اسے دیکھ کر اسے پھر ہنسی آ گئی۔

مدراس سے ہوائی جہاز پرواز کر رہا تھا کہ شادابہ نے سوچا کہ آنکھیں بند کئے پڑی رہے اور پھر سو گئی۔ جب تک وہ سوتی رہی لیکن ایئر ہوسٹس کے اعلان کے بعد وہ انگریزی ... اور اپنے پورٹ فولیو میں سے اس نے یوڈی کولون (EAU DE COLOGNE) کی بوتل نکالی تھی اور تقریباً چلو بھر خوشبودار لوشن اپنے چہرے پر چھڑک لیا تھا اور پھر اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اس نے شادابہ سے کہا "اس سے میں بالکل فریش ہو جاتا ہوں۔ لیجئے آپ بھی؟"

"جی نہیں شکریہ"۔ شادابہ اس قسم کے آدمی سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔

"آپ مدراس ہی میں رہتی ہیں کیا؟"

"جی ہاں"

"تو وہاں کیا سیر کرنے گئی تھیں؟"

"جی نہیں ایک اسکالرشپ کے لیے انٹرویو تھا۔"

"خوب تو اسکالرشپ مل گیا؟"

"جی نہیں ملا"

[illegible] ——————— [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ... زندگی میں ... [illegible]

[illegible] ... تبدیل ہو جاتی ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس نے ... [illegible] ... جرم ... [illegible]

گھر میں ... [illegible] ... تجھے نوکری ... [illegible]

ہوٹل میں ریسپشنسٹ ([illegible]) کی نوکری ... [illegible] ... کا اشتہار دیا ... [illegible]

... تیرے کام سے خوش ہو کر ... [illegible]

[illegible] ... سے مجبور ہو کر دوسری شادی کرنے کی کوشش کی ... [illegible]

سے کیا ہوتا ہے جتنے بھی ... اور ... ہوتے ہیں ... نوجوان لڑکیاں کام کرتی ہیں ... [illegible] ... کوشش

کرتی ہی ہیں۔ اب یہ لڑکی کے کردار پر منحصر ہے کہ وہ اپنے آپ کو بیچ دیتی ہے یا اپنی عزت کو برقرار رکھتی ہے۔ تو نے کبھی اپنے آپ

کو نہیں بیچا۔ اور کیونکہ تو نے دوسری چھچھوری اور ... لڑکیوں کی طرح ... اور چند ٹکوں کے عوض اپنے بدن کو فروخت

نہیں کیا ... جو ہر لڑکی کو ... سمجھتا تھا۔ وہ بھی تیری عزت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ متاثر ہو کر اس نے تیرا تبادلہ دہلی میں اپنے ہیڈ آفس

میں کر دیا۔ [illegible] سے تو پرسنل سکریٹری ہو گئی۔ تجھے آج کل جیسے عالیشان ہوٹل میں رہنے کو کمرہ ملا۔ اپنے بزنس کے

معاملات کے لیے بلدیو سارے ملک کا دورہ کرتا اور ہر جگہ تو ساتھ ہوتی۔ چاہے ہوائی جہاز ہو یا ایئر کنڈیشنڈ ٹرین ... [illegible]

پورے چار سو تو گھر بھیجتی رہی۔ تب ہی تو تیرے ماں باپ نے بھی اس نوکری کی مخالفت نہیں کی۔ تو نے اپنے میں بھی تو تبدیلی محسوس کی ہوگی۔

وہ دبلی پتلی سانولی سی سیدھی سادی ... لڑکی کہاں ہے جو دو برس پہلے ہوائی جہاز میں اکیلے سفر کرتے گھبراتی تھی۔ آج تو ایک اسمارٹ فیشن ایبل

نوجوان کیریئر وومن ہے۔ تیری تصویریں "السٹریٹڈ ویکلی" اور "کرنٹ" میں چھپتی ہیں۔ بلدیو کے ساتھ بڑے بڑے گھروں میں تجھے ڈنر اور

پارٹیوں میں عزت دی جاتی ہے۔ مانا کہ لوگ تیرے اور بلدیو کے بارے میں سکینڈل کی باتیں بھی کرتے ہیں۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔

تجھے معلوم ہے کہ تو نے کوئی پاپ نہیں کیا ہے .... بلکہ

اپنے اثر سے بلدیو کو بہت سی پرانی عادتوں سے بچایا ہے۔ اب اس نے شراب پینی کم کر دی ہے۔ پچاس سگریٹوں کے بجائے صرف

ہیں سگرٹ وغیرہ پینا چھوڑ چکا ہے۔ اب ہر مجبوری کے سبب وہ نہیں جاگا۔ جو کھیلنا بھی کم کر دیا ہے۔ تب بھی انو خود اسے شرابی اور شکار کہتا ہے
کہتے ہیں۔ جب سے مجھے ہی سکتے ہیں۔" صبح آشا نے تو بدھو کی زندگی ہی بدل دی ہے۔ اور اب کہ جب بیس آشا کو اپنے ساتھ سارے ہندوستان
کے سفر پر چلنے کو کہا ہے تو ظاہر ہے کہ ماں نے سارے سفر کے بعد شادی کی اجازت بھی دے دی ہو گی۔

ایک بار پھر وہی ناگپور ایئرپورٹ۔ مگر اب وہ پہلے سے زیادہ شاندار بن گئی تھی۔ مگر ابھی صرف ایک ہی ہوائی جہاز آیا تھا اس
لیے زیادہ گہما گہمی نہیں تھی۔

پھر وہی ایئرپورٹ ریستوراں۔

پھر وہی بوڑھا بیرا۔

پھر وہی سوال "میڈم چائے یا آرنج جوس؟"

بدھو نے کہا "آرنج جوس دونوں کے لیے۔"

آشا نے کہا "نہیں میں چائے پیوں گی۔"

بدھو نے اصرار کیا "یہ بھی کوئی وقت ہے چائے پینے کا۔ سنگترے کا رس پیو۔ تمہیں نہیں معلوم ناگپور کے سنگترے سارے
ہندوستان میں مشہور ہیں"

"معلوم ہے" آشا نے کہا۔ اور اس نے سوچا اب میں تمہیں کیسے بتاؤں بدھو کہ سنگترے کے رس میں میرے لیے کتنی یادوں
کا زہر گھلا ہوا ہے۔

اتنے میں بیرے نے دو بھرے ہوئے گلاس سامنے لا کر رکھ دیئے۔

بدھو نے گلاس اٹھایا اور ایک گھونٹ لے کر کہا۔ "واہ واہ کتنا میٹھا ہے۔ میں سوچتا ہوں اپنے ہر ہوٹل کے لیے ہوائی جہاز سے
ناگپور کے سنگترے منگوایا کروں تاکہ یہ فریش آرنج جوس ہمارے ہر کسٹمر (CUSTOMER) کو صبح ناشتے پر مل سکے۔ اسے پی کیا — پیو
تو آشا۔"

آشا نے گلاس اٹھایا اور ایک گھونٹ لیا۔ رس نہ صرف کھٹا تھا بلکہ اس میں ایک عجیب قسم کی کڑواہٹ تھی۔ جیسے نیم کے
پتوں کا عرق گھلا ہوا ہو۔ اور اک کسیلا پن تھا جیسا سڑی ہوئی ترکاری میں ہوتا ہے اور ایک عجیب قسم کی بدبو تھی جیسے پھوڑے میں سے
رستی ہوئی پیپ میں ہوتی ہے۔ اسے ابکائی آئی اور اسے متلی ہونے لگی۔

اس نے بیرے سے کہا "اسے لے جاؤ، مجھے نہیں چاہیے۔"

"تو چائے لاؤں" بیرے نے پوچھا۔

"نہیں۔ صرف سادہ پانی"

اتنے میں کسی دوسرے جہاز کے مسافر آنے شروع ہو گئے اور ریستوران میں بھیڑ ہو گئی۔

"چلو آشا" بدھو نے کہا "پورا ہفتہ گزارنا ہے اور وہاں تو بھیڑ بڑھتی ہی جائے گی۔ سینما بھی دیکھیں۔ وہ بہانا ترگیتی ملاکو منڈی

ملکہ — کشمیری بہہ

کشمیری بہار — کشمیری بہہ

زندگی کے ملاح میں جیسے بڑا دن کا رستہ سر پر آ رہا تھا۔ وہ من من کی کہانیاں جن میں ... لفظ ... کہتے تھے

رہے تھے۔

"پھر تو تم ابھی یہیں ہو"

بوڑھی بابا ... نے ... چپ چاپ ہوئے جواب دیا۔

"اب تم کہاں ہو!"

وہ ہیں ... جب سے ... میں ... سے ... وہ سب ... تک ...

میں ... سے ... ہوں ... وہ ... کی ہے ... سے ...

... ہیں ... تک ...

وہ ... کی ... ہو رہے ... سے ... میری ... بھی

"وہی ... مسٹری!"

وہ ... کر اس نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ آشا نے ... کا ہاتھ ... کی ... کے پیچھے ... ہوئے

... کے پیچھے چپکے سے ہاتھ ... کرتا رہا۔

"آپ تو آشا ہیں ... جن سے ... سے ... کہاں چل ... "

ایک منٹ تو آشا وہیں بیٹھی رہی۔ ... ہوائی ... تھا ... کے ... ہو رہے تھے۔ وہ ساتھ ہی ایک

لمبا قد۔ ایک سانولا چہرہ۔ ... ہونٹ ... کوٹ ... بال۔ ... چہرہ

وہی!

وہی!

وہی!

مگر نہیں آشا نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے اب ... کا خیال چھوڑ دو ... سے اب

... میں ... جانا ہوگا۔ ... پیرس جا رہی ہے۔ پیرس اور لندن اور ... کے ساتھ تصویر ... نے تیرا اس سے

کیا واسطہ جس کا تو نام بھی نہیں جانتی۔ تیری جگہ اس وقت ... کے پاس ہے۔ جس نے تیرا ... ہوائی جہاز کا ٹکٹ خریدا ہے۔

اور ... میں آخر کار اس نے ... اور ... کو ڈھونڈ ہی نکالا۔ ان کے پیچھے ایک ... کرسی خالی تھی وہ چپکے سے وہاں

بیٹھ گئی۔

سینما کے پردے پر چنار کے سرخ پتے جھڑ رہے تھے اور کشمیری عورتوں کا ایک درد بھرا لوک گیت سنائی دے رہا تھا۔

... اور ... کھانا ختم کر رہے تھے۔

"کیوں یار برہمونڈیا تو نے اچھی کمائی ہے؟ پہلی دفعہ جب ملاقات ہوئی تو وہ بنگالن تھی تیرے پاس۔ مگر سنا ہے تو اس سے دامن چھڑا گیا ہے؟"

"نہیں یار۔ نہیں اسے چلڈ دیکھا کی خبر ہی ہوں یا۔ مگر یہ زندہ رکھتی ہے۔ سو اسے دنیا دکھانے لے جا رہا ہوں۔"

"مگر لوگ کہتے ہیں تو اس سے شادی کر رہا ہے۔"

"بالکل ہو سکتا ہے۔ تو تو جانتا ہی ہے اپنی زندگی کا اصول۔ گانے گاؤ، دھن پیو۔ کلنے گھر میں برباد ہو۔ ایسی باتیں تو نہ جانے کتنی آئیں اور گئیں۔"

اور آمنہ نے محسوس کیا کہ تعجب ہوا کہ یہ سن کر اس کے دل پر کوئی چوٹ نہیں پڑی۔ بلکہ ایسا معلوم ہوا جیسے دفعتاً بہت سی زنجیریں جو اسے جکڑے ہوئے تھیں چھن سے زمین پر گر پڑی ہیں۔

سنگ کے پردے پر وفضا نگار گلابی پھول کھل آئے تھے۔ شالیمار کے فوارے بند ہو رہے تھے۔ ڈل جھیل کی سطح پر شکاروں میں نوجوان جوڑے شکست سے بے خبر لطف اٹھاتے سیر کر رہے تھے۔ ایک کشتی والے کی بچی مسکرا رہی تھی۔ تو بستر کا پانی بند ہو رہا تھا۔ کشمیر میں بہار آ گئی تھی۔

"...لاسٹ کال فار مس شاستری..... لاسٹ کال فار مس شاستری......؟"

"بمبئی جانے والا ہوائی جہاز اب اڑنے کے لیے بالکل تیار ہے۔" لاؤڈ سپیکر کی آواز ایئرپورٹ کی سنسان بلڈنگ میں گونجتی رہی کیونکہ سب مسافر اپنے اپنے ہوائی جہازوں میں جا چکے تھے اور پھر ایک ایک کر کے وہ سب اڑ گئے۔

دلی جانے والا ہوائی جہاز۔

مدراس جانے والا ہوائی جہاز۔

کلکتے جانے والا ہوائی جہاز۔

بمبئی جانے والا ہوائی جہاز جس میں ایک سیٹ خالی تھی۔

اور جب سب جہاز اڑ گئے اور ایئرپورٹ کے وسیع میدان میں صرف سرخ اور پیلی اور سبز روشنیاں ٹمٹماتی رہ گئیں۔ تو......

میدان کے ایک اندھیرے کونے میں دو مسافر کھڑے رہ گئے جو کہیں نہیں جا رہے تھے۔ جن کی منزل آ گئی تھی۔

"آج رات میں تمہیں بھیلائی لے جاؤں گا۔ پہلے تم دیکھ لو کس ماحول میں مجھے رہنا اور کام کرنا ہے۔ وہاں بڑے شہروں کی چہل پہل نہیں ہے۔ بس فولاد کا کارخانہ ہے اور اس میں کام کرنے والے ہیں......"

"اور تم ہو؟"

"ہاں میں ہوں مگر ساتھ میں گڑبڑ ہی ہے۔ کارخانے میں کام کرنے والے انجینئروں اور مزدوروں کے لیے خطرہ ہے۔ تنخواہ صرف چار سو روپیہ ماہوار ہے۔ دو کمروں کا مکان ہے۔"

"اور تم ہو۔"

[illegible]

[illegible] سامنے [illegible] سمجھیں:

"اور تم؟ ... [illegible] نام بتاؤ؟"

"میرا نام نرمل ہے۔ [illegible]

[illegible]

"میرے شوہر کو زمین پسند تھی [illegible]

[illegible]"

"تو پھر اب؟"

"اب ہم پیئیں گے۔"

"میرے [illegible]

[illegible]"

"اورنج جوس" نرمل نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب کو تو اورنج جوس پسند ہے۔ [illegible] تھا"

"تم لاؤ تو" نرمل نے اصرار کیا۔ اور پھر دو گلاس بھر لیے تھا۔

نرمل نے گلاس دیا۔

آشا نے گلاس اٹھایا۔

نرمل نے آشا کی آنکھوں میں دیکھا اور وہاں اسے اپنی صورت نظر آئی۔

آشا نے نرمل کی آنکھوں میں دیکھا اور وہاں اسے اپنی صورت نظر آئی۔

نرمل نے اپنا گلاس آشا کے گلاس سے ٹکرایا۔

"چیئرز"

"چیئرز"

"پیو آشا"

نرمل نے گلاس منہ سے لگایا، ایک گھونٹ لیا اور ہونٹ چاٹنے لگا۔

آشا نے گلاس منہ سے لگایا اور ایک لمحے کے لیے اس کی خوشبو سونگھتی رہ گئی۔ تازہ رس بھرے ناگپور کے سنگترے کی خوشبو جو کسی سینٹ سے کم نہیں ہوتی۔ پھر اس نے بھی ایک گھونٹ لیا اور حیران رہ گئی۔

سنگترے کا ذوق ٹھنڈا تھا۔ کھٹ مٹھا تھا۔ کھٹا جیسے بچپن میں توڑی ہوئی کچی کیریاں۔ جیسے چرائی ہوئی جامنیں، جیسے پہلی ملاقات۔ ایک عجیب و گداز کھٹاس جو مدتوں چٹخارہ دیتی رہتی ہے اور ساتھ میں میٹھا بھی۔ رس بھری مٹھاس۔ جیسے کیوڑے میں بسی ہوئی گنڈیریوں میں

مٹھاس ہوتی ہے۔ جیسے دودھ پیتے بچوں کے ہونٹوں میں مٹھاس ہوتی ہے۔ جیسے جنت کے کستورا میں مٹھاس ہوتی ہے۔

نرمل نے ایک لمبا گھونٹ لیا اور گلاس ختم کر دیا۔

آشا نے ایک لمبا گھونٹ لیا اور گلاس ختم کر دیا۔

بیرے نے کہا: "اور پئیں گے سرکار؟"

"ضرور۔" آشا نے کہا: "مجھے تو ایک گلاس اور چاہئے۔"

بیرے نے جگ سے انڈیل کر دودھ اور گلاس بھر کر ان کے سامنے رکھ دیئے اور اپنی بوڑھی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے سوچتا رہا کہ یہ نیا موسم ہے۔ ذرا سی سنگتروں کا رس جیسے پی کر یہ لڑکی چند منٹ پہلے تک جل رہی تھی اب کتنی ٹھنڈی لگ رہی ہے۔

اور نرمل نے آشا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"ایک نہیں۔ ابھی تو تمہیں پورے ایک سو ایک گلاس پینے پڑیں گے۔"

تنہائی

مجنوں گورکھپوری

مکتبہ: سول لائنز، گورکھپور

۱۹۵۰/۷/۴

۵ جون ۱۹۵۰ء

محبی سلام مسنون

آپ کے خط برابر ملتے رہے [illegible] سے واقف ہوں۔ میری
حالات و واقعات ایسے ہو گئے ہیں [illegible] بعض اوقات
کی پروا نہیں۔ پھر بھی مجھ کو نقوش کی [illegible] آپ [illegible] نے کی
اب کس منہ سے کچھ کہوں۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ گزشتہ دو برس کے دوران میں مجھ پر کیسے
کیسے حالات اور کیسی کیسی واقعات گزر چکے ہیں۔ اس وقت بھی جس حالت سے گزر رہا
ہوں بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا بیان نہیں ہو سکتا۔ [illegible] بیان نہ کرنا ہی بہتر ہوگا۔
لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مدت میں ایک روز بھی ایسا نہیں گزرا کہ آپ اور نقوش یاد
نہ آئے ہوں اور میں دونوں سے شرمندہ نہ ہوتا رہا ہوں۔ اب معذرت کا وقت گزر گیا۔
میں آپ سے یہ نہ کہوں گا کہ مجھے معاف کر دیجیے۔ صرف اپنے مطلب پر اکتفا کروں گا۔

ادھر تنہائی کے کچھ صفحات لکھ ڈالے ہیں جن کی نقل [illegible] بھیج رہا ہوں جس کو اگلے
ہی اشاعت میں چھپا دیجیے۔ یہ دو قسطوں میں تھا [illegible] اور لکھا جا رہا ہے۔ امید
ہے آئندہ دو ماہ کے اندر ہی آپ کو بھیج دوں گا۔ آپ مجھ سے جس قدر بھی مایوس یا بدظن ہوں
کم ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں بہت جلد [illegible] تو تنہائی کو پورا کر کے نقوش ہی کی
خدمت میں پیش کروں گا۔ [illegible] کا سوال البتہ ہے۔ اس مسودہ کی رسید سے مطلع کیجیے۔

آپ کا مخلص: مجنوں گورکھپوری

ٹ مسودے کے پہلے دو صفحے [illegible] نقوش [illegible] بابت فروری ۱۹۵۲ء

(۴۱)

شاہدہ ہفتے میں ایک دو مرتبہ مجھ سے ملنے ضرور آتی تھی۔ وہ جس طرح اپنا وقت گزار رہی تھی اس کی میں دل سے قائل تھی۔ اس کی طبیعت اور کردار پر حیرت بھی تھی اور رشک بھی۔ میں کبھی کبھی سوچتی رہ جاتی تھی کہ شاہدہ جیسی لڑکی کو قدرت نے بالکل ہی بے حس بنا دیا ہے۔ وہ قامت موزوں، رنگ روپ پر ناز کرنے والی عورتیں اس کے سامنے اپنے جسمانی حسن کا احساس دلاتے ہوئے شرماتی تھیں۔ شاہدہ دراصل بہت کم لوگ اس کا شمار کرتے تھے۔ جو نہیں جانتے تھے وہ اسے ایک طرف الگ کر دیتے۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی اور متانت تھی جو بہت نمایاں تھی۔ اور کچھ وہ ان میں ایسی سحر کرنے والی کشش پاتی تھی کہ دل اس سے اور اس کی گفتگو سے بہک سے جاتے۔ جس محفل میں وہ پہنچتی تھی چھا جاتی تھی۔ مرد اور عورتیں اس کے گرد جمع ہو جاتے، اور پہلوؤں کے سامنے کا مرتبہ نہیں ملتا وہ جیسے اس کو ایک خوش باش، شگفتہ مزاج اور ہنس مکھ زندگی بسر کرتی تھی۔ عورت بھی اس کے مرتبے سے پوچھتے کہ شاہدہ دراصل کیا تھی۔ ایک طرف تو اسے انتہائی مخلص اور دوسری زندگی کے تقاضوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں اور دوسری طرف وہ بچوں کی اندرونی باتوں میں دلچسپی اور دلسوزی کی غایت وسیع صلاحیت چھپائے ہوئے تھی جو کہ وہ علاوہ ازیں رائیگاں نہ جانے دیتی تھی بلکہ جو اس کا حقدار تھا اسی پر صرف کرتی تھی۔ مجھ سے زیادہ شاہدہ کے اس پہلو سے شاید ہی کسی دوسرے نے دیکھا ہو۔

شاہدہ سے مجھے پرویز کے حرکات و سکنات اور اس کے حالات کی مختصر خبر ملتی رہتی تھی۔ مگر وہ پرویز سے دور رہ کر ملنا اور برداشت سے خوش تھی۔ میرے دل میں شبہ پیدا ہو چلا تھا کہ اس نے اپنے دل سے بات نہیں نکالی یا شاید کسی وجہ سے ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے اور یہ مجھ سے چھپا رہی ہے۔ مجھے یہ بات بری لگی کہ میری زندگی کی مشکلات کا حل ہو۔ اور یہ کہ وہ اپنے شوہر کا پاس رکھتی ہے اس لئے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتی ہے۔ ایک ملاقات میں نے شاہدہ سے کہا: "شاہدہ! مجھے پر اب محسوس ہو رہا ہے کہ پرویز سے کسی مصلحت سے مجھے دور رکھا جا رہا ہے یا اس میں ہے جو ایک نفرت پیدا کی تھی وہ روز اول ہی سے ہے اور وہ اس کی یاد دل میں اس پر اعتبار نہ کرنا چاہتی تھی۔

"نہیں نہیں۔" شاہدہ نے ایک تڑپ کے ساتھ جواب دیا۔ "تم نے شاید اپنی ناتجربہ کاری کے باوجود ٹھیک ہی کہا ہے۔ وہ عارضی اور وقتی جذبات اور خواہشات کے آدمی نہیں ہیں۔ ان کی زندگی عارضی مشاغل کے لیے نہیں ہے۔ ہاں یہ ہے کہ وہ ذاتی خوشی اور مسرت کو تمام بندگان خدا کی زندگی کے تقاضوں کے مقابلے میں کچھ نہیں سمجھتے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی کی ہر راحت اور ہر خوشی کو عامۃ الناس کی فلاح اور بہبود پر قربان کر دینے میں راحت اور خوشی کو سب سے بڑی خوشی کا سامان سمجھتے ہیں۔۔۔"

"مگر شاہدہ تم کو معلوم نہیں کہ وہ میرے ساتھ کیسی بے پروائی سے محبت کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ مجھے کہنا نہ چاہیے مگر میں واقعی یہ سمجھنے لگی تھی کہ ان کی زندگی میں ایک خلا ہے جس کو میں نے محسوس کیا اور اسی لیے شدت سے مجھے یہ امید ہو گئی تھی کہ وہ بھی مجھے چاہنے لگے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی کہ اپنی زندگی میں کوئی اہم اور مستقل جگہ دے گئے لیکن شاید مجھے دھوکا ہوا۔ میں محبت کی ترسی ہوئی تھی اس لیے پرویز کو محبت کا دیوتا سمجھ کر ان کی پہلی جنبش تمنا پیدا کی جو کر رہ گئی تھی۔ میں ان کی محبت کو ایک آسمانی برکت سمجھے ہوئے تھی اور خیال تھا کہ یہ برکت ہم دونوں کو ان تمام روحانی اذیتوں سے بچا لے گی جن کے ہم شکار رہے مگر اب تو یہ سب ایک خواب بے تعبیر ہے۔ جہاں تک تصور کر پاتی ہوں مجھے اپنی ساری زندگی خالی اور ویران معلوم ہوتی ہے۔ اب میں سوچتی ہوں کہ خیر آئندہ جو ہو گا سو ہو گا فی الحال میں رخصت لے کر بستی سے چلی جاؤں اور پھر یہاں واپس نہ آؤں۔ تم پرویز کی خیر خواہ کی حیثیت سے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

حافظہ [illegible]

[illegible] خود ثابت ہو سکتی ہے۔ بہر حال ان باتوں کو ذہن میں رکھو [illegible] کی کوشش کرو۔

شاہدہ ایک عورت کے ساتھ [illegible] کی سیرت بیان کر رہی تھی اور میں [illegible] تمام حسن بیان

کسی کو [illegible] نہیں دیا جا سکتا۔ میں نے کہا: شاہدہ [illegible] سے زیادہ [illegible] مجھے رشک کے ساتھ [illegible] ان کو دیکھا ہے اور ان کو پہچاننے کی کوشش کی ہے [illegible] مجھے تمہاری ماں سے حرف بحرف اتفاق ہے [illegible] سمجھانے کا شبہ ہے۔ اب یہ محبت کا [illegible] ہے کہ سمجھنے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ میں نے [illegible] مشکل کے حل کرنے میں مدد مانگی تھی [illegible] رکھ دیا مگر خدا کے لیے مجھے یہ بتاؤ کہ میں کروں کیا۔

شاہدہ نے بڑے پیار اور بڑی [illegible] کے ساتھ کہا: [illegible] اس وقت [illegible] پھر کب تم سے ملیں گے۔ آج کل [illegible] مشکل سے [illegible]

لیکن آج میں فیصلہ کر کے جا رہی ہوں کہ پہلی ہی ملاقات میں ان کا دامن پکڑ لوں گی اور کہوں گی: جو حال ہے وہ نہ جو کچھ سچ ہے اور اس میں کچھ قیمتی ہو گا واضح اشاروں میں ہی ہو۔ سب بیان کر دوں گی مگر پہلے جیسے ایک بار پھر مجھ کو منظور بھائی ذہن کے پردے پہ چھائے ہوئے ہیں۔

(۱۵)

تین مہینے گزر گئے۔ جو لوگ شاہدہ کے خلاف عمل پیرا تھے وہ سب جیسے جیسے ہم سے دور ہوتے جا رہے تھے اور ہم لگ گئے کہ میرا کام اور شاہدہ کی جان ہمارے ساتھ رہے گی۔

میں اس کھیل کا جو سے مطالعہ کرنے لگی لیکن اس کے نتیجے سے کچھ بھی کر بیٹھ نہ آیا۔ جب جاسوس ہم تک خاموش ہو چکے تو میں نے کپکپاتے لہجے میں پوچھا: کہو شاہدہ! تمہاری ملازمت کا جو حصہ کر کے گئی تھیں اس کا کیا ہوا؟

شاہدہ نے ایک حسرت ناک نال کے ساتھ جواب دیا: میں جو وکالت نامے کر گئی تھی اس پہ مجھے اعتبار تھا کہ اگر یہ لوگ لیکن اس دوران میں شاید نامناسب ہو۔ ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا ہے جو مجھے تو یقین نہیں مگر ہو۔ اس کا تمہارے اور پرویز کے تعلقات کے لیے بہت نازک اور تکلیف دہ بن سکتا ہے۔

"وہ کیا؟" میں نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

شاہدہ نے کہا: کیا کہوں غضب ہوا۔ ایسے غضب روز ہی ہوا کرتے ہیں لیکن اس میں کنٹرول پرویز اور شاہدہ ہی تھے۔ تم کو یاد ہوگا کہ عبدالرزاق نے رپورٹ کے بارے میں کتنے غلط لوگ سے شکایت کی لیکن سب سے بڑا شبہ ان لوگوں نے یہ کیا کہ رپورٹ کیا پہلے ایک مہینہ ایک رات اپنے گھر میں بند کر کے اور جس بات کا پتہ چلا اس کو لے دبا رکھا۔ لوگوں کی زبانوں پر یہی ہے لیکن مقدمے کے دوران میں معلوم ہوا کہ تم نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ رپورٹ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی گئی۔ منظور بھائی! اس کے لیے تم کو مشکل ہی سے معاف کر سکے جس لہجے میں آج وہ تعجب سے اس معاملے کا تذکرہ کر رہے تھے اس سے پایا جاتا تھا کہ وہ بہت آزردہ اور دلگیر ہیں۔

میرے پیروں کے نیچے سے زمین سرکتی معلوم ہوئی لیکن دھیرے دھیرے جب ساری روداد پر غور کیا تو پرویز اور اس کی جماعت کے خلاف جس کی وہ نمائندگی کر رہے تھے بلکہ ایک شخص کا ایسا منظور سے ... مجھ سے کہ اشخاص کی ذہن میں مجھے توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ میں تلملا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور شاہدہ کو تندی کے ساتھ جواب دیا: آج اپنے منظور بھائی سے کہہ دینا کہ میں اب اپنے گمان سے بہت اونچی ہستی پا رہی ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ عبدالرزاق کی بیوی میرے پاس آئی تھیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ ان کی بیوی نے ایک مرتبہ ڈاکٹری معائنے سے پہلے اس طرف اشارہ کیا تھا لیکن میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ میرا منصبی ضمیر گوارا نہیں کرتا کہ کسی کو بلاوجہ رسوا کر دوں یا واقعے کو توڑ مروڑ کر کسی عورت کی بابت کوئی غلط رپورٹ لکھ دوں ——— اور میں نے وہی کیا جو عبدالرزاق کی بیوی سے کہا تھا اور پھر پرویز کس منہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے صحیح رپورٹ کیوں لکھی یا غلط ان کو کیا معلوم! انھوں نے تو ایک مرتبہ بھی اگر اس کا ذکر مجھ سے نہیں کیا ورنہ ممکن تھا کہ میرا ایمان ان کے چلتے قدموں پر ڈگمگا جاتا اور میں غلط رپورٹ لکھ دیتی۔ اب ان سے جا کر میرے پیغام کے طور پر کہہ دو کہ رپورٹ کے ساتھ جس قسم کی زیادتی وہ کہتے ہیں نہیں ہوئی ہے اور اگر میرے معائنے اور اس وقت تک کے وقفے کے اندر کسی دوسرے موقعے پر اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے تو میری رپورٹ صحیح ثابت ہوگی۔ وہ جس سے چاہیں اس کا معائنہ کرا لیں۔ آخر میں ان سے یہ بھی کہہ دینا کہ جس نادار، مفلس اور پامال طبقے کی وہ نمائندگی کر رہے ہیں اس کا جزو

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(۱۶)

بندرہ روز سے کچھ اوپر ہو گئے اور پرویز کی رفتار و حالت سے میں بالکل بے خبر رہی۔ اس دوران میں شاید ہی کبھی نیند آئی ہو۔ میں ایک شدید کرب و اذیت میں زندگی کی گھڑیاں گزار رہی تھی۔ ہر گھڑی ایسی طویل معلوم ہوتی تھی جیسے کہ روزِ حشر۔ ہر سمت [illegible] لگا کہ باوجود اس کے کہ میں نے [illegible] کہ گزشتہ ملاقات میں بڑے خلوص اور محبت کے ساتھ رخصت کیا تھا شاید وہ بھی میری طرف سے دل میں کچھ کدورت لیے ہوئے ہے۔ میرا جی بے اختیار چاہتا تھا کہ تمام قاعدے قانون سے بے پرواہ ہو کر گھر کی چار دیواری کے حصار سے نکل کر کہیں چلی جاؤں جہاں ان دماغی کلفتوں سے لمحہ بھر کے لیے پناہ مل جائے۔

عشق و محبت کی داستانوں سے دنیا کی تواریخ اور افسانے بھرے پڑے ہیں۔ میں جب کبھی کوئی کہانی، ناول عشق پر لکھی تو مجھے اس کے اندر رومانوی کنایات جو کچھ بھی ہوتے ہیں لیکن یہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اگر کسی ایک فریق سے محبت کی بازیافت نصیب نہ ہو تو ساری زندگی عذاب کیسے ہو جاتی ہے اور محبت کا انجام خودکشی اور موت پر کیوں ہوتا ہے۔ میں محبت کو زندگی کی ایک کھیل سمجھتی تھی اور اس نعمت کی قائل نہ تھی جو عمر [illegible] اس سے کہ محبوب پاس ہے یا دور انسان کے اندر نئی امید کی نہر پیدا کرے۔ مگر اب میرا اپنا تجربہ ہو رہا تھا کہ محبت اک روگ بھی ہو سکتی ہے۔ محبت کو کوئی مرتبہ نہ ملے اور ساری زندگی محبت سے خالی رہ جائے تو یہ محرومی ضرور ہے لیکن کوئی اذیت نہیں ہے مگر محبوب کو پا کر نہ پانا ایک ایسی مصیبت ہے جس سے بڑا عقوبت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہے "دیا پیار" میں رہ کر "یار" رہے اس طرح

جدا رہنا ایک ناقابلِ برداشت آزمائش تھی۔ شاہدہ نے بھی اب سکوت اختیار کر لیا تھا جو مجھے بخوبی معلوم ہو رہا تھا اور اب تو حبیب بھی بے مجبوری اور رنجیدگی کی حالت میں تھا۔ حبیب کے برابر رہنا جیسے میرے مقدر سے باہر معلوم ہوتا تھا۔

آخر کار مجھ سے زیادہ صبر نہ ہو سکا۔ ایک سنیچر کے دن میں اپنی وضع خود ساری کر اتار کے دینے کے لیے مجبور ہو گئی۔ شاہدہ صاحبہ تو پہلے سے الگ ہو کر بھی بیری بسا لی تھی۔ مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ زندگی میں شاہدہ کے سوا کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں جو مجھ کو مدد دے اور میرے ساتھ پوری ہمدردی کر سکے۔ میں اس کے خوف اور اس کی کشش وہ دل کی مالک ہو چکی تھی۔ اسی احساس اور اسی احساس کی بنا پر میں نے اس کو ایک خط لکھا اور اس کے ساتھ پرویز کے نام بھی ایک مختصر سا خط معذرت کا دیا جس کو میری محبت کا لحاظ کرنا چاہئے۔

"پیاری شاہدہ!

دل تو نہ چاہتا تھا کہ زیادہ مدت نہیں گزرنے دوں گی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تم سے جو اور پرویز کی بیوی بنتے ہوئے ایک زمانہ گزر چکا۔ معلوم نہیں تم اس کو کیا سمجھو گی۔ مہ جانے کیوں مجھے ہول سا ہو رہا ہے۔ یہ بھی بیٹی عقل و ہوش۔ بالکل شہزادی تھی مگر اب کس منہ سے یہ جرأت کروں۔ اب تو یہ کس قدر مجھ سے زیادہ دل جوش معلوم ہوتا ہے اور پھر تم تو ہوشمندی اور سفر اس کی دیوی ہو۔ مجھے تو یہ شکایت کرنے کا حق نہیں ہے کہ اتنے دن ہو گئے تم نے میری خبر لی اور نہ پرویز کی خبر لی۔ بیان واقعہ اور اظہارِ حال کا حق تم شاہدہ سے کسی طرح زیادہ مگر حاصل ہے اور حال یہ ہے کہ زمین و آسمان اجنبی ہو رہے ہیں اور زندگی کی ایک ایک گھڑی قیامت کی طرح بیکار معلوم ہو رہی ہے۔ اگر مصلحت اجازت دے اور وقت نکال سکو تو کچھ دیر کے لیے آ جاؤ تاکہ اپنی مجبوریوں کی تفصیل سے آگاہ کر دوں تاکہ مجھے کسی کو تمہاری طرف سے کوئی بدگمانی نہ رہے۔ ایک رقعہ اسی خط کے ساتھ پرویز کے نام بھی بھیج رہی ہوں ان سے حسب اور جہاں ملاقات ہو دے دینا اور یاد رکھوں۔

تمہاری

کشور!"

اور پرویز کے نام رقعہ یہ تھا:۔

"پرویز صاحب!

کسی قسم کی شکایت کرنے کا مجھے حق ہے کہ نہیں؟ اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتی ہوں لیکن حسرت کا ایک اردو شعر اور کسی فارسی شاعر کا ایک فارسی شعر سنائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اردو شعر یہ ہے ؎

سو طرح الفت نے مجبور اگر ہونا ‏ ‏ نہ کچھو: تجھے کتنے تو دور اگر ہونا

اور غالب کا شعر شاید زیادہ برمحل ہے ؎

اگرچہ دولتِ وصلت بھی ملے نہ بسے
ندیں امید ہم گر دو حسن ما شست

آپ کی [illegible]
کشور!

خط میں نے سرسری پڑھا تھا۔ شاہدہ نے زبانی کہلا دیا تھا کہ جب چاہو گے [illegible]
سے امید نہ رکھنا۔ [illegible] شاہدہ کے [illegible] سچ ہی [illegible] معلوم ہو۔ [illegible] اس کا کوئی
جواب نہیں آیا۔ [illegible] رات [illegible] کروٹیں بدلتی رہی۔ [illegible] کے آنسو بہتے رہے۔ [illegible]
تھا۔ [illegible] زندگی [illegible]
کا رنگ [illegible]
آہستہ سے [illegible] سامنے سے آؤں؟

میں نے لحاف میں منہ چھپاتے ہوئے کہا: "اس سے کہو!"

[illegible] کے [illegible] گذشتہ [illegible]
ہے جو اس طرح [illegible] ہوں۔ پہلے بھی میری زندگی [illegible]
زندگی خالی تھی اور اب [illegible] ایک جھلک [illegible] لگ گئی ہے کہ [illegible] میری تحصیل [illegible] تھا اور
وہ ایک جھلک دکھا کر میری زندگی کے [illegible]
سوچ رہی تھی کہ اگر بستی چھوڑ کر چلی جاؤں تو میں اپنی زندگی کے ساتھی کے [illegible]
کچھ دنوں سے یہ خیال مجھے بری طرح ستا رہا تھا کہ میرا ہستی پر رہنا [illegible]
اور آج یہ خیال یقین کی طرح مجھ پر چھایا ہوا تھا۔

سوچنے کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ ماما میرے کمرے میں چلی آئی اور مجھے ایک لفافہ دے کر کہا کہ "بیگم! یہ جواب کا لفافہ آیا ہوا ہے اور جواب مانگ رہا ہے۔"

میں نے کہا: "تم جاؤ میں جواب لکھ رہی ہوں۔"

جلدی جلدی میں نے لفافہ کھولا تو اس میں دو رقعے تھے۔ پہلا رقعہ شاہدہ کا تھا:۔

اچھی کشور!

مجھے تمہارے ساتھ اتنی محبت اور ایسی شدید ہمدردی ہے کہ میں تمہاری ہر بات
اور ہر حرکت کو نہ صرف معاف کر سکتی ہوں بلکہ ان کی قدر کرتی ہوں۔ تمہارا سرد جواب بھی کاغذ
کا ایک پرزہ تھا جس میں شائستگی اور ضبط کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ ایسی ہی شائستگی اور ضبط کو

تمھارے "سفینے" کیا ہے جس کے بغیر جینا نباہ نہیں ہو سکتا۔ جب تم سے ملنے کے لیے خود بھی آنے سے بے چین نہیں رہی ہوں۔ لیکن وہ سے راستے میں بڑی رکاوٹ تھی۔ تمھیں ہفتے سے وہ بیمار ہو گئے کہ مستقل رہائی نہیں۔ اپنے مکان ہی بیکر و تنہا پڑے ہوئے ہیں۔ ایک ہفتے اور میں نے بہت چاہا کہ تمھارے پاس آ جاؤں مگر انھوں نے قبول نہیں کیا۔ ڈاکٹر سیتا پتی لال جو ان کے ڈاکٹر بھی ہیں اور ان کے پرانے دوست ہیں اور جن کو میں کیا پورا شہر "گھر کا سنت" سمجھتا ہے ان کا علاج کر رہے ہیں۔ صبح سے شام تک شدید بخار رہتا ہے کسی وقت اترتا نہیں۔ ٹائیفائیڈ کے قسم کا مرض ہے لیکن کمال کیا ہے وہ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ بے انتہا زار اور نحیف ہو گئے ہیں۔ میں نے تم کو اطلاع بھیجنا چاہی تو انھوں نے منع کر دیا۔ آج تمھارا رقعہ پاکر مجھے اجازت دی ہے کہ میں تم کو حقیقتِ حال سے آگاہ کر دوں۔ ان کا بھی ایک پرزہ جو ایک پوری داستان ہے ملفوف کر رہی ہوں۔ اگر تم کسی وقت آج میرے پاس آ سکو تو میں تم کو تمھارے پرویز کے پاس لے چلوں ......

باقی ملاقات کے وقت ......

تمھاری معترف

شاہدہ!"

پرویز کا رقعہ یہ تھا:-

" ڈیر کشور!

تم نے دو اشعار میں اپنا حال بیان کیا ہے اور خوب بیان کیا ہے۔ میں بھی صرف دو اشعار تم کو سنانا چاہتا ہوں اور پھر فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں کہ مجھے کیا سمجھو اور کیا نہ سمجھو اور کیا کرو اور کیا نہ کرو۔

عجب دردیست دور از یار بودن
صبوری کردن و ناچار بودن

یہ شعر نامی کا ہے اور دوسرا شعر جو میری حالت کی نہایت اچھی ترجمانی کرتا ہے۔ یہ شعر خواجہ حسن دہلوی کا ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ امیر خسرو کے منظورِ نظر تھے۔

گفتی کہ چرا جدائی از من
ایں از فلک است از من نیست

[illegible]

[illegible]

رات، چور اور چاند

بلونت سنگھ

(مسلسل)

چاند جوبن پر تھا۔

خاموش سردی پڑنے لگی تھی اس لیے لوگ آگ جلدی کھانے پینے سے فراغت کر لیتے ہیں۔ [illegible] جو [illegible] کو بھی کھیتوں میں کام کرنا ہوتا ہو تو اپنے کھیتوں اور ڈیروں پر جا کے پہلے ہی [illegible] رہتے تھے۔

[illegible] چاندنی رات [illegible] ہوا میں [illegible] تھا۔ [illegible] راستہ [illegible] وہ کھیتوں [illegible] جو [illegible] جا [illegible] کہ [illegible] چھوٹی چھوٹی [illegible] سے زیادہ واقف نہیں تھا۔ [illegible] اس سے [illegible] سیدھے [illegible] راستے کو ترجیح دی۔

کچھ دور تک [illegible] کنارے کنارے چلنے کے بعد وہ [illegible] راستے [illegible] جب [illegible] لوگ [illegible] کہتے ہیں۔ اس کے دونوں کنارے راستے [illegible] اور [illegible] گرد [illegible] جب [illegible] گزرنے [illegible] نکل جاتا تھا۔ پیدل اور گھوڑ سوار [illegible] کے راستے کنارے [illegible] کرتے تھے۔

[illegible] پال سنگھ نے [illegible] کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ چاندنی رات [illegible] دور دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ [illegible] دور دور [illegible] دکھائی دے رہے تھے۔ [illegible] کھیتوں میں کام کرتا ہوا کوئی آدمی یا کوئی ساڈنی سوار [illegible] دکھائی دے جاتا تھا جو [illegible] خاموشی کا راج تھا۔ چاندنی راتوں کے کیا کہنے۔ بہت دور [illegible] اڑتی ہوئی صدائیں سنائی دے جاتی تھیں۔ سب سے نمایاں منظر [illegible] راستے کا تھا جس کے دونوں کناروں پر ایک دوسرے کے [illegible] ببول اور [illegible] کے اونچے اونچے درخت [illegible] دور تک چلے گئے تھے [illegible] دیکھنے والے کو معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی [illegible] کا سینہ [illegible] کی دھندلاہٹ میں گم ہو گیا ہو۔

[illegible] پال سنگھ [illegible] رنگ [illegible] بدن [illegible] سا افسانہ [illegible] اس کی [illegible] بہت [illegible] اس کے بدن میں وہ قوت اور کس بل نہیں تھا جس کی توقع کسی دیہاتی نوجوان سے کی جا سکتی ہے۔

[illegible] چند لمحوں کے لیے اس کی نگاہ کے سامنے رہا اور پھر اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بجے تھے۔ وقت کچھ زیادہ

[illegible] ہر طرف ہو جاتا ہے [illegible] شام ہو جاتی ہے [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] ہوتے تھے۔

وہ [illegible] سا ہو کر رہ گیا۔

[illegible] سکڑ کر بیٹھ گیا [illegible] ۔۔۔ لیکن [illegible] ۔۔۔ [illegible]
[illegible] ۔۔۔ [illegible] اور پھر [illegible] کر دیکھا [illegible]
جانب دیکھا [illegible] [illegible]
تھے [illegible] ہوتے تھے۔

[illegible] جیسے کوئی شخص اس کا پیچھا کر رہا ہو [illegible]
[illegible] ۔۔۔
[illegible] ۔۔۔ پھر بھی ۔۔۔ [illegible] اور اس ۔۔۔ وہ پھر [illegible] [illegible]
[illegible] کیا [illegible] کیا وہاں [illegible]
وہ [illegible] ہے اسی وقت سے [illegible] اس نے [illegible] کی جانب دیکھا
[illegible] ۔۔۔ اس خیال کے آتے ہی [illegible] ۔۔۔ لیکن [illegible]
ہو سکتا۔ وہ [illegible] تھا وہ اس قسم کے [illegible] نہیں کر سکتا تھا۔ یہ [illegible] تھی۔

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ آخر کون ہو سکتا ہے۔ جو یوں چھپ رہا ہے ۔۔۔ لیکن اس وقت اس کی جیب میں تھا ہی
کیا وہ زیور ہی گھر سے لیا تھا [illegible] وہ ایک [illegible] کام بھی کرنے لگے۔ تو وہ [illegible] روپیہ [illegible] نہیں تھا۔ [illegible]
[illegible] اس کے پیچھے پیچھے چلنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ [illegible] اس سے
[illegible] اس کی سمجھ میں نہیں آتی یہ بات۔ اب وہ [illegible] لیکن [illegible] نہیں [illegible] ۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔
... ہو سکتا ہے اس کے کان بج رہے ہوں۔ کتنی دیر سے خاموشی طاری تھی ...

ایک دم پھر وہ چل دیا لیکن پھر وہی بات۔ لیکن وہ رکا نہیں ..... پھر اجنبی آواز ...... اب پھر اجنبی آواز ..... معاملہ پھر رک
گیا اور اس نے گھوم کر دیکھا۔ ایک دبلا پتلا سایہ [illegible] کے پیچھے چھپتا سا دکھائی دیا۔ یقیناً یہ اس کا وہم نہیں تھا۔ وہ کوئی لڑکی یا [illegible] نہیں
تھا۔ یہ تو اس کی آنکھوں دیکھی بات تھی۔ ہر نہ ہر اس میں ضرور کوئی بھید ہے [illegible] اس معاملے کو اس قدر [illegible]
ہی کیا تھی اور وہ بھوت بھی نہیں تھا۔ اس میں ضرور کوئی بھید ہے۔

تاریکی میں سایے دکھائی دینا بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ وہ عجیب ذہنی کشمکش میں گرفتار ہو گیا۔ کئی قسم کے شکوک دل میں
پیدا ہوئے۔ اس نے اس سوال کے ہر پہلو پر غور کیا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا شاید وہ سایہ دوبارہ دکھائی دے
جائے۔ نہیں اب کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا تھا لیکن کیسا عجیب قسم کا احساس تھا۔ ایک اجنبی جاندار چند قدم کے فاصلے پر کھڑا سانس لے رہا تھا۔

شاید وہ پچھلی نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ شاید اس کی بے وقتی کے سبب پر نظر پڑی کچھ رک رہی تھی کہ کسی کے پاس ابھی بہت سے انسانوں کا ابھی ہجوم نہیں گزرا۔ آن گزرا . . .

... وہ یہیں رہ جاتا ... سب کچھ اس کے رخ پر بات کی صدا دراصل حقیقت کچھ بھی نہ ہو۔ اس کے ایک مرتبہ پھر لپکے اس کو پیچھے رہ جانا کرے۔ مصنف وہاں اس کے وہم کے سوا کوئی شے نہیں ہے۔

اس طرح سال گزر جانے کے بعد وہ آہستہ آہستہ قدم بقدم آگے بڑھنے لگا۔ لیکن اس نے مڑ کر سنا و مت قریب سے ایک ہی جانب سے ... قدموں کی چاپ ... جانب سنائی دینے لگی۔ اس نے مڑ کر دیکھنے کی بجائے آواز ادھر ہی بہاں رہ جانے سننے کی کوشش کی اور اب ... اس نے صاف طور سے سنائی دینے لگی جیسے اس کا پیچھا کر رہے اسے تو ... کچھ دیر بعد وہ آواز اور بھی قریب سے سنائی دینے لگی۔ رفتہ رفتہ آواز اس کے زیادہ قریب ہونے لگا۔ اس کا دل ... دھک دھک کرنے لگا۔ وہ حیران تھا کہ ... کون کیا ہے۔ ایک کون شخص ہو سکتا ہے جو اس کا پیچھا کر رہا ہے یا وہم کوئی جو ... جانے پہ ... کرنے پر مجبور ... عجیب بات تھی ... اس نے ... اور بھی تیز کر دی ... نتیجہ سے پاؤں کی جانب کی آواز بھی تیز ہو گئی۔ اب گھوم کر دیکھنا فضول تھا۔ ... اس کا پیچھا کرنے والا بہت قریب پہنچ گیا ...... اس نے ایک دم ... آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ راستے کے ... سے جڑا ہوا ... کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ جیسے اس کے پاؤں تلے کچلے جا رہے تھے اور ان کی آواز اسی کے قدموں کی آواز میں گھل مل کر عجیب قسم کے ادبیت و شور میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ... سنسنی کا ... رہا تھا۔ ... اس طرح آگے بڑھ رہا تھا جیسے کوئی جن اس کی گردن دبوچے کر چلا آ رہا ہو۔ ... اس کا پیچھا کر رہا ...

تب اس نے ... خیال آیا کہ ... سب لوگوں سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ اس کو یاد آیا کہ کہاں ... جہاں تک وہ صبح کے وقت سیر کرنے چلے آیا کرتے تھے۔

تب وہ ... اس کی جانب کو دوڑا۔ پیچھے سے پیچھا کرنے کی آواز آئی لیکن اس نے پیچھے کی جانب گھوم کر نہیں دیکھا۔ پھر جب وہ ... کر دوسرے کنارے پر پہنچا تو پیچھے سے بھی اسی قسم کی آواز سنائی دی۔ سامنے کھال کا چھوٹا سا پل دکھائی دینے لگا۔ وہ پوری قوت سے اس کی جانب دوڑ پڑا۔ اس قدر تیزی کہ ... پیچھا ... کر نیچے پل کے نیچے پانی کے ... کی ... سکون حاصل ہوئی۔ اس نے زور زور سے سانس لیتے ہوئے ... نظروں سے پیچھے کی جانب دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ ... کوئی نہیں تھا ...... لیکن اب وہ اپنے دل کو ... نہیں دے سکتا تھا کہ یہ سب کچھ اس کا وہم تھا بلکہ یہ حقیقت تھی کہ اس کا ... تیزی اور ... سے تعاقب کیا گیا تھا لیکن وہ بال بال بچ گیا تھا۔ پیچھا کرنے والا کون شخص تھا؟ اس کا پیچھا کرنے سے اس کی غرض کیا تھی۔ کیا وہ اسے جان سے مار دینا چاہتا تھا یا اس وہم میں تھا کہ اس کی بغل میں نوٹوں کا پلندہ دبا ہوا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اب ... کے سایوں کی تاریکی نہیں تھی بلکہ کھلی فضا اور دور دور تک پھیلے ہوئے کھیت اور ان میں ساکن کھڑے ہوئے پودے تاحد نگاہ دکھائی دے رہے تھے۔ اب خوف کی بھی کوئی بات نہیں تھی۔ بدنام علاقہ تو تھا ہی ممکن ہے کسی نے شرارتاً کرنے کے خیال سے اس کا پیچھا کیا ہو لیکن اس پر حملہ کرنے کی جرات نہ ہو سکی ہو۔

[illegible]

[illegible] ساگر کی جانب لے چلوں گا۔

[illegible] کہ اس کی نظر اٹھی اور اس نے [illegible]

وہاں کوئی اجنبی کھڑا تھا۔

دھنا پتی پال سنگھ کے قدم رک گئے اور چند لمحوں کے لیے [illegible] ہو کر رہ گیا۔

گھٹنوں سے کچھ اوپر تک بندھا ہوا [illegible] وہ بالکل [illegible] تھا [illegible] اس کی آنکھیں [illegible]

پرتھی پال سنگھ [illegible] وہ بزدل نہیں تھا لیکن [illegible] واقعے کے [illegible] تھے۔

اس وقت پرتھی پال سنگھ نے پہلے تو یہ سوچا کہ پہلو بچا کر چپکے سے نکل جاؤں لیکن پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے اجنبی کہہ رہا ہو میاں! اتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں اب آنکھ بچا کر کہاں کو چلے۔

وہ آہستہ آہستہ اجنبی کی جانب بڑھا۔ کھلے میدان اور چاندنی رات میں وہ اتنی جرأت کر سکتا تھا کہ [illegible] اجنبی کا رویہ بہت مشکوک اور عجیب تھا۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ آخر اس [illegible] خاموشی سے کھڑا رہنے [illegible] باوجود اس کے [illegible] اجنبی کی خاموشی اور بھی تعجب خیز تھی۔ [illegible] اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے اسے کہیں دیکھا ہو [illegible]

یہ نئی الجھن پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ پڑیں۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ہکلا کر کہا میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟

اجنبی چپ رہا۔

پرتھی پال سنگھ [illegible] کنارے پر پہنچ گیا۔ وہ حیرت سے اجنبی کے منہ کو تک رہا تھا۔ آخر وہ جواب کیوں نہیں دیتا اور جب وہ اس سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا تو دفعتاً اجنبی نے حرکت کی۔ اس کے دانت چمکے اور [illegible] کی آواز کے ساتھ [illegible]

وہ اس کے قدموں پر آن گری ۔۔۔۔ اور اس کے بعد پھر خاموشی۔

تھوڑی دیر کے بعد پرتھی پال سنگھ اور آگے بڑھا کہ شاید وہ اس کی صورت پہچان سکے۔ وہ تو ہمیشہ سے ٹھگ کی صورت سے واقف تھا لیکن وہ اسے اب بھی نہیں پہچان سکا۔

"میں پالا سنگھ ہوں۔"

پرتھی پال سنگھ کو بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ابھی تک سے یہ بات یاد رہی تھی کہ اس نے صاف کہاں دیکھا ہے لیکن نام پالا سنگھ تو اس نے سن رکھا تھا۔ وہ اس نام کے شخص کے اوصاف سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ شخص اچھے کیریکٹر کا آدمی نہیں ہے اور بدمعاش ہے لیکن وہ اس کا پیچھا کیوں کر رہا تھا۔ آخر اسے اس کا کیا حق تھا لیکن شاید اس کو پیچھا کرنے والا کوئی اور وجہ کیوں نہ وہ اس سے دریافت ہی کرے۔

"کیا تم ہی میرا پیچھا کر رہے تھے؟"

"ہاں۔" برملا جواب ملا۔

پرتھی پال سنگھ کو کچھ غصہ بھی آیا اور کچھ تعجب بھی ہوا۔ اس نے پیشانی پر بل ڈال کر پوچھا "کیوں؟"

اس پر پالا سنگھ کا بھاری بھرکم ہاتھ ہوا میں اٹھا اور اتنا اٹھ کر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پڑا اور پھر جب پرتھی پال ڈگمگا کر گرا تو اسے احساس ہوا کہ اس کی گردن اور رخسار کی رگیں جل اٹھی ہیں اور ایک کان میں بھائیں بھائیں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ایک تو ساری دنیا اس کی آنکھوں تلے سے چکر کھا گئی۔ اس کی کس کر بندھی ہوئی سنہری داڑھی بل کھاتی ہوئی بکھرنے لگی۔

پرتھی پال سنگھ کو بے حد طیش آیا۔ آنکھیں لال ہو گئیں۔ مٹھی بھینچتے ہی رہتے ہوئے اٹھا اور چیتے کی سی تیزی کے ساتھ حملہ آور کی جانب بڑھا اور بڑی تندی سے جھپٹ پڑا۔

ان معاملات میں پالا سنگھ کا ہاتھ بہت صاف تھا۔ اس نے اندھا دھند آگے بڑھتے ہوئے دشمن کے پیٹ میں گھونسا رسید کیا۔ وہ حق کی صدا کے ساتھ آگے کو جھک گیا۔ پھرتی سے پیڑو سے گھٹنے کی جو جھانپڑ رسید کیا تو پرتھی پال سنگھ تیورا کر جو جڑ کے بل گرا اور دور تک گھسٹتا ہوا چلا گیا۔۔۔۔ پیشانی، ناک اور ہونٹ بری طرح چھل گئے۔

پالا سنگھ بھی جوش میں کود پڑا۔ شاید پرتھی پال سنگھ کے جسم میں اٹھنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی لیکن نہ معلوم کس جذبے کے تحت وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور سیدھا کھڑا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ پالا سنگھ نے اس کے جبڑوں تلے بڑے دھاکے سے گھونسا جڑ دیا۔ پرتھی پال سنگھ کو محسوس ہوا کہ اس کے مسوڑھوں پر گرم گرم نمکین خون نکل کر اس کے لعاب دہن میں مل رہا ہے اور اس کے ساتھ اس کے ذہن پر بادل سے چھا رہے ہیں۔

پالا سنگھ نے حضور صاحب (حیدرآباد دکن) کا بنا نیچی ایڑیوں والا بھاری بھرکم کھڑاؤں آگے بڑھا کر انتہائی نفرت سے ہتھیلی کے نچلے حصے کا ایک جھانپڑ اس کے رخسار پر رسید کیا اور گوشت کی ایک بوٹی کٹ کر علیحدہ ہو گئی۔ پرتھی پال سنگھ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے رخسار پر دہکتا ہوا انگارہ رکھ دیا گیا ہو۔

معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ٹانگ میں گہری چوٹ آئی ہے۔ اس کے حواس تو جب قریب مختل ہو چکے تھے اور وہ لڑکھڑا کر اور

اسے لگا [illegible] سے زیادہ ہے [illegible] کر اس پر [illegible] کے [illegible] سامنے ہی [illegible]

[illegible]:

پچھی پال سنگھ کا [illegible] بہت [illegible] تھی۔ [illegible] کے [illegible] اس [illegible]

وہ [illegible] سے [illegible] ہی [illegible] سے [illegible] ہی [illegible]

[illegible]

[illegible]

گھر کے [illegible] پچھی پال کے [illegible] ہے [illegible] سے [illegible]

[illegible] ہے۔

پچھی پال نے خاک سے جا لگا کہا اور [illegible] ہے [illegible] گیا ..... [illegible] .....

وہ لگے [illegible] جما کر [illegible] جب [illegible] تو [illegible]

عورتوں کے [illegible] کے [illegible] رکھ گئے۔

[illegible] پچھی پال [illegible] ہے [illegible] کے [illegible]

گاؤں کے [illegible] رہا تھا۔

جیسے ہی پچھی پال سنگھ کا باپ اور [illegible] سے [illegible] کے [illegible]

اندر کی طرف بڑھا پال سنگھ نے اسے بالوں سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔

گھمسان کا رن شروع ہو گیا۔

پال سنگھ کے سر پر تو خون سوار تھا۔ اس نے نہایت بے دردی سے پچھی پال کو دیوار میں [illegible] دیا اور [illegible]

[illegible] ہو گیا اور قریب تھا کہ وہ اس کا [illegible] اور گردن کی رگیں [illegible] کہ [illegible] آدمی اکٹھے ہو کر آن پہنچے [illegible]

[illegible] اور [illegible] نے بے رحمی سے مار مار کر پال سنگھ کا بھرکس نکال دیا [illegible] بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ [illegible]

بالوں سے گھسیٹ کر [illegible] کو ٹھڑی میں بند کر دیا گیا اور [illegible] رات بھر [illegible] پیاس کے [illegible] جائے۔

مردم شماری کمشنر کے نام

فکر تونسوی

عالی جناب مردم شماری کمشنر صاحب!

کل کی ڈاک میں آپ کا ارسال کردہ مردم شماری فارم موصول ہوا [illegible] آپ کے اعلان میں معلوم [illegible] آپ نے [illegible] آپ کا [illegible] مردم شماری کر کے [illegible] معاشرے کی کوئی [illegible] کرنا چاہتے [illegible] ہے کہ فارم کا ہر خانہ تفصیل کے ساتھ پُر کیا جاتے [illegible] تفصیل [illegible] جائے تاکہ معاشرے کی پوری تصویر [illegible] آ جائے۔ [illegible] نہیں چاہتے [illegible] جاسکتے ہیں۔

چونکہ آپ کا مقصد نیک ہے [illegible] نیک نیتی سے [illegible] کر رہا ہوں۔

تاریخ پیدائش

سب سے پہلے آپ نے تاریخ پیدائش پوچھی ہے۔ [illegible] تاریخ پیدائش کا کوئی ثبوت نہیں۔ والد صاحب کہہ گئے ہیں [illegible] سرٹیفکیٹ [illegible] اپنے عاشق کے [illegible] گئی اور [illegible] پیدائش [illegible] اس لیے مجھے [illegible] تاریخ پیدائش [illegible] کا مطلب تھا [illegible] زندگی [illegible] ایک [illegible] والد صاحب سے [illegible] پانی [illegible]

جس دن پیدا ہوا تھا اسی روز والد محترم [illegible] کے جرم میں گرفتار ہوئے تھے چنانچہ پولیس کے [illegible] سے [illegible] جا سکتی ہے (لیکن ایسا کرنا ایک قبیح حرکت ہوگی)

نام

آپ نے میرا نام پوچھا ہے۔ خاندانی [illegible] سے [illegible] نام رکھا [illegible] کے نواسا

ہمارا نام [illegible] مطلب [illegible] صاحب [illegible] [illegible] مجھے [illegible]
[illegible] سے [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] تخلص [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] کے [illegible]
معلوم نہیں ہوتا۔

کہتے ہیں [illegible] [illegible] [illegible] ۔۔۔

ولدیت

[illegible] صاحب [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] صاحب [illegible] [illegible] [illegible]
ان کے اصل نام کا انکشاف [illegible] [illegible]
آج کل [illegible] [illegible] صاحب [illegible] [illegible]
[illegible] کی خاطر [illegible] [illegible] صاحب [illegible] [illegible]

ذات

آپ نے ذات پوچھی ہے [illegible] [illegible]
سے بھاگ کر یہاں آن بسے تھے۔ [illegible] [illegible]
سے ملتا ہے۔ [illegible] [illegible] [illegible]
بھاٹیہ [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

ایک بزرگ کا خیال ہے کہ ہماری اصل [illegible] ہے [illegible] بھاٹیہ ہیں بلکہ [illegible] ہیں۔ کئی بزرگ ہیں بھاٹیوں [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
باوجود [illegible] [illegible] کے مقابلہ پر [illegible] [illegible] گمراہ کن ہے۔ [illegible]
کی خاطر کون اپنا مرتبہ گرا دیتا ہے۔

عمر

عمر کے سلسلہ میں کیا بتاؤں۔ تاریخ پیدائش میں [illegible] کے باعث صحیح پتا [illegible] نہیں۔ گزشتہ ہفتے ڈاکٹر نے بینائی ٹیسٹ

کرتے ہوئے کہا: "عینک کا برداشتہ ثبوت ہے کہ موصوف چالیس کے پیٹے میں جا چکے ہیں۔"

پامسٹری کے ایک ماہر نے کہا تھا کہ چالیسویں برس میں پہنچتے ہی تم اچانک مشہور ہو جاؤ گے۔ چنانچہ پرسوں جب فٹبال کے شغل میں مصروف ہو کر میں اتنا پھنسا کہ میری ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی اور اخباروں میں بڑی سرخیوں کے ساتھ میری تصویر چھپ گئی اور میں ملک بھر میں مشہور ہو گیا۔ لہٰذا اگر چالیس برس بھی ہو جائیں لیکن ذہنی طور پر بیس برس کا ہو چکا ہوں جب کے جوبن کی ستم ہیں۔

شادی شدہ یا کنوارہ

میری شادی کی کیفیت یہ ہے کہ مجھے شادی شدہ ہی سمجھئے کیونکہ بیوی کی موجودگی سے انکار ممکن نہیں۔ شادی شدگی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ میاں بیوی رفتار کی حالت میں مثلاً گذشتہ سال میں نے خیال کیا تھا کہ چونکہ اس سال مجھے ایک سینما کی بیگم کی طرح پیش کش ہو رہی تھی لیکن میرے ایک بچے نے کہا کہ میرے سلانہ امتحانات نزدیک ہیں، پہلے امتحان حل ہو جانے چاہئیں، سمجھانے کے بعد چپکے جا سکتے۔ چنانچہ بچے کے مستقبل کی خاطر میں نے اپنا مستقبل خراب کر لیا تھا، ورنہ آج دو بچوں کی بجائے ...

شادی کے بعد میرا خانہ آباد ہو گیا۔ نہ صرف بیوی سے بلکہ متعدد اور چیزوں سے بھی ——— مثلاً بچوں سے، چوہوں سے، کھٹملوں سے، چارپائیوں سے، مہمانوں سے، انگیٹھیوں سے، اسار جیوں اور جیبوں سے اور ان سب کی خاطر تنخواہ سے، خود سے سوچتا ہوں کہ اگر میری شادی نہ ہوتی تو یہ سب چیزیں کہاں جاتیں؟ کہاں ٹھکانہ کرتیں؟ شادی نے مجھے ہر حیثیت سے ہمدردی کرنا سکھا دیا ہے۔

لیکن کبھی کبھی جب رات گہری ہو جاتی ہے سارا کنبہ خواب استراحت میں محو ہوتا ہے تو میں ہنسی سے آوازیں لگا رہا ہوتا ہوں مگر وہ حسب معمول نہیں آتی چنانچہ مجھ پر ایک بار پھر کنوارہ بننے کی دھن سوار ہو جاتی ہے اور میں کرنے کی طرح سارے گھر پر ایک نظر ڈالتا ہوں، لیکن پھر خیال آتا ہے کہ بیوی کی آواز آتی ہے "جلدی نہیں آ رہی ناشتہ لگ رہا ہے ایسے بچوں کی کارستانی۔ اس بار آپ کے لیے ایک مچھر دانی ضرور لے آؤں گی۔"

میں اسے یہ نہیں بتاتا کہ مجھے تو گھر بھر کے مچھر کاٹ رہے ہیں بلکہ چپ چاپ چارپائی پر لیٹ جاتا ہوں اور سوچنے لگتا ہوں کہ جو بیوی مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے اسے چھوڑ دینے سے زیادہ بہتر ہے کہ ایک مچھر دانی خرید لائی جائے۔

آمدنی

میری آمدنی کیا ہے؟ ——— اس سلسلے میں پامسٹری کے ایک عالم کا قول دہرانا مناسب سمجھتا ہوں جس نے کہا تھا تمہاری ماہانہ آمدنی ایک ہزار روپیہ ہے لیکن معلوم ہوتا ہے جیوتشی نے کو رستے ہاتھ میں یاد کیا "آمدنی" کسی اور کی بتا دی ——— جس دن اس نے ایک ہزار ماہانہ آمدنی کی پیش گوئی کی تھی اس دن میں نے فرط مسرت سے سیونگز بینک میں سے ایک سو روپیہ نکلوا کر غریبوں اور محتاجوں کو کھانا کھلا دیا تھا۔ بس اس کے بعد تو جیوتشی اتنے آیا نہ ایک ہزار روپیہ، سیونگز بینک میں وہ ایک سو روپیہ دوبارہ کبھی جمع نہیں ہو سکا، البتہ گذشتہ سال ایک مہینہ ایسا آیا تھا جب مجھے ایک ہزار روپے کی آمدنی ہوئی تھی لیکن بعد میں سرکار نے وہ روپیہ مع سود واپس وصول کر لیا کیونکہ میں نے وہ روپیہ بطور قرض لیا تھا۔

[illegible] ہیں جو [illegible] لکھا ہے کہ
[illegible] ہو گئی ——— [illegible]
[illegible]
[illegible] گئی ——

[illegible] ہے [illegible]
[illegible] ہوتا ہے ——— [illegible]
[illegible] ہے ——— [illegible]۔

مکانیت

مکانیت کا یہ رشتہ ہے کہ [illegible] کے پاس ایک مکان تھا۔ [illegible] جب منتقل ہوا [illegible] کرائے لے [illegible]
[illegible] ایک مکان تھا [illegible] والد صاحب [illegible]
[illegible] والد صاحب کا [illegible] ——— [illegible] سال تک کسی [illegible]
سے بھاگ گیا اور [illegible] نہیں رکھا۔

[illegible] خیالات [illegible] برس سے سولہ برس کی عمر تک [illegible]
ہوئی تو ایک دوست نے [illegible]۔ ایک بار [illegible] نے [illegible]
[illegible] ایک [illegible] دوست بنا کر وہاں [illegible] انسانیت کی یہ [illegible]
[illegible] ایک دن [illegible]
دیا گیا۔ اس وقت سے کرایے کے مکانوں میں رہنا شروع کر دیا۔ چالیس برس کی عمر تک [illegible] کرایے کے [illegible]
مجھے [illegible] میں [illegible] رہے۔ اس دوران میں ایک مکان کرایہ پر لیا تھا جس میں پہلے بندر رہتے تھے۔ میرے آنے کے بعد بھی [illegible]
بندروں میں ہمیشہ بد سلوکی [illegible] رہی لیکن بالآخر فریقین میں [illegible] سمجھوتہ ہو گیا۔ یعنی یوں کہ بندر صبح شام کھانا ہمارے ہاں تناول فرمائیں گے اور
باقی وقت گھر سے باہر گزاریں گے ——— مگر ان میں سے ایک بندر انتہائی سرکش اور کینہ ور تھا۔ آخری وقت تک اس نے بد سلوکی
جاری رکھی۔ یعنی موقع پاتے ہی ہمارے اکلوتے کمرے میں گھس آتا اور ہمارے کھانے پینے کی چیزیں اٹھا کر بھاگ جاتا۔ رات کو ہمارے برآمدے میں
ہی سویا کرتا تھا ——— آخر ایک بار جب اس نے میرے ننھے بچے کو کاٹ کھایا تو میں نے وہ مکان چھوڑ دیا۔

آج کل میں جس مکان میں رہتا ہوں وہ میرا اپنا ہے [illegible] خیالات بالآخر تنگ آ کر مجھ سے بغاوت کر کے چلے گئے،
ایک کمرہ ہے ایک باورچی خانہ، ایک ننھا سا باتھ روم اور مختصر سی بالکونی۔ اس سے زیادہ کی نہ جگہ ہے نہ گنجائش۔ بڑی شان کی کوٹھیاں
اور بنگلے دیکھ کر اب غیرت بھی نہیں ہوتی کیونکہ اب قناعت پسند ہو گیا ہوں۔ ایک بار ایک دوست کے [illegible] بیٹھ کر ایک غزل لکھی تھی۔

احباب نے کہا: "موال گھٹیا ہے، اچھل بار انہوں نے جو سوال سنایا تھا وہ نہایت عمدہ تھی۔"
میری بیوی نے کہا: "وہ میں نے اپنے ہی مکان میں بیٹھ کر لکھی تھی۔"
مجھے خوف ہے کہ اگر نقاد بیٹھ کر پڑھ جائے کہ میرے مکان میں جو جو سوال بھی حال ہے وہ زیادہ بہتر ہوتا ہے، وہ مشہور ہوا
اور سب مجھے شعر سنا دیں۔

تعلیم

علم فضل میں یکتا ہوں۔ مثلاً مجھے یہ علم ہے کہ گزرتا کل میں کیوں گزرتا ہے اور زیادہ حسین لڑکیاں زیادہ جاہل کیوں ہوتی ہیں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر ایک روپیہ کا ایک پیسہ گرا آتے وہ ایک آنہ میں کچھ بھی نہیں آتے، گو کہ یہ ایک آنہ کا گولا چوسنے سے پہلے ہی ایک آنہ کا حساب یہ بنتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی سینکڑوں چیزوں کا علم رکھتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ دو آدمیوں میں لڑائی کروانے کا سب سے آسان طریقہ کون سا ہے۔ جھوٹ بولنے میں جتنی اداکاری کی اہمیت ہے اور یہ کہ بنیادی طور پر ہر انسان میں بے وقوفی کے جراثیم موجود رہتے ہیں، چاہے وہ مانے یا نہ مانے اس کی مرضی۔

بہت دیر بعد یہ علم بھی ہوا کہ علم کا بھی فائدہ ہے اگر اس پر عمل کیا جائے لیکن جب مجھے اس بات کا علم ہوا اس وقت تک میں کافی کاہل ہو چکا تھا، لہٰذا میں اس نظریہ پر بھی عمل نہ کر سکا۔ ارادہ ہے کہ اگلے جنم میں احتیاط برتوں گا اور علم کا فائدہ ضرور اٹھاؤں گا۔ مشورتاً کسی عمدہ کا مصنف بن جاؤں گا۔)

اولاد

اولاد میں میرے تین بچے ہیں اور ایک بلی۔ بلی کو بیٹی کا درجہ دیتا ہوں اور جلد ہی کوئی اچھا سا خاندانی بلا تلاش کر کے اس کے ہاتھ پیلے کر دوں گا۔

باقی تین بچوں میں دو لڑکیاں ہیں، ایک لڑکا۔ جب سے یہ تینوں بچے پیدا ہوئے ہیں میرے گھر میں ہی رہ رہے ہیں۔ اگر گھر سے باہر کبھی جائیں بھی تو شام کو پھر گھر لوٹ آتے ہیں۔ ان کے بوٹ پھٹ جائیں تو مجھ سے نئے بوٹ کا تقاضا کرتے ہیں اور اگر میں خرید کر نہ دوں تو بسور رکھتے ہیں ——— جاؤ! ہم تم سے نہیں بولیں گے۔"

اگر بچے اپنے باپ سے نہ بولیں تو محلہ برادری والے اعتراض کرتے ہیں۔ اس لیے میں انھیں بوٹ خرید کر لا دیتا ہوں اور یہ وہ بوٹ پہن کر محلہ بھر کو دکھاتے ہیں اور باپ کی ساکھ بناتے ہیں۔

میں اور میری بیوی دونوں ان کی تربیت میں جی جان سے جٹے رہتے اور وہ ان دو تربیت گاہوں میں دو الگ الگ راستوں پر بیک وقت تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ مثلاً اگر میں ایک بچے سے کہوں کہ محلے کے بچوں سے مت لڑا کرو تو بیوی اسے کہتی ہے کہ ضرور لڑا کرو ورنہ محلے کے لڑکے تمھیں سمجھیں گے بزدل ہے۔ ایک بار میں نے اپنی بیٹی سے کہا: "باسی روٹی مت کھایا کرو۔" لیکن شام کو جب لوٹا تو وہ باسی روٹی کھا رہی تھی۔ میں نے احتجاج کیا تو بیوی کہنے لگی: "کھانے دو، بچی ہے، آہستہ آہستہ سمجھ جائے گی۔ میں نے ہی اسے کھانے کے لیے کہا ہے۔"

اور ہمارے بچے اتنے زیرک ہیں کہ اس دوہری تربیت پر ذرا بھی نہیں گھبراتے۔ چپ چاپ اپنا کام کیے جاتے ہیں۔ سامد

[illegible]

مذہب

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سیاسی خیالات

آپ کے دوستوں کا [illegible] ہے کہ آپ کے سیاسی خیالات نہیں ہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میرے اندر سیاسی خیالات پیدا ہو گئے۔ جب [illegible] سیاسی خیالات [illegible] ایک بار [illegible] گلاب کا ایک پھول سونگھ رہا تھا کہ ایک صاحب آ گئے اور بولے

"آپ کے سیاسی خیالات [illegible] آپ گلاب کا پھول سونگھ رہے ہیں۔ لوگ اعتراض کریں گے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ آپ کے سیاسی خیالات کا تقاضا ہے کہ جب تک [illegible] سونگھنے کی عادت پیدا نہ ہو جائے اس وقت تک آپ بھی اس خوشبو سے پرہیز کریں اور قربانی کا ثبوت دیں۔"

"قربانی سے کیا ہوگا؟"

"آپ سیاسی رہنما بن جائیں گے۔"

— آج کل میرے گھر کوئی نہیں آتا اور میں بلا جھجک گلاب کی خوشبو سونگھتا ہوں۔ اسی خوشبو کم بخت نے مجھے سیاسی لیڈر نہیں بننے دیا لہٰذا میرے اندر سے سیاسی خیالات نکل گئے اور صرف گلاب کی خوشبو باقی رہ گئی۔

اب سوائے ضمیر [illegible] کے میرے سیاسی خیالات سے کوئی آگاہ نہیں، خود میں بھی نہیں۔"

مرمر کی ماں

احمد سعید

چینی کے سفید گلدان میں سفید گلاب کے پھول، وہ بھی اس طرح ترتیب دیے ہوئے جیسے کپڑے پر کاڑھے گئے ہوں یا ایک ہی ڈیزائن کے مطابق جگہ جگہ ٹانکے گئے ہوں۔ یہ تھا ذوقِ شیریں ریاض، اور شیریں کے شوہر ریاض احمد کو بھی وہ تنہائی میں اس سے بہت سے نگینوں کے خلاف اور سبز پوشش پر نکلے ہوئے زردی مائل گلاب، موتیا اور رات کی رانی کی طرح دکھائی دیتی تھی لیکن ریشمی دھاگے کے پھولوں اور اصل پھولوں میں کتنا فرق تھا۔ ایک میں خوشبو تھی، وہ ہواؤں میں مہک اٹھتے تھے، کھل اٹھتے تھے۔ دوسرے چپ چاپ بے جان، بے حرکت رہتے تھے۔ ریاض احمد ڈپٹی کمشنر کو سہاگ کی رات ہی اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ اس رات اس نے دلہن کا گھونگھٹ اٹھاتے وقت یوں محسوس کیا تھا جیسے وہ چینی کے بند سفید مرتبان کو ڈبے میں سے نکال کر انگیٹھی پر رکھ رہا ہو۔ اور اسے خدشہ ہو کہ وہ خفیف سی ٹھیس لگنے پر کہیں ٹوٹ نہ جائے...... ریاض احمد نے انگلستان میں ہی پر لگا کر گھر سے اڑنا سیکھا تھا۔ منچلی تتلیوں کو ایک پھول سے دوسرے کی طرف اڑتے اور رس کو رس چوس کر تیسرے پر جا بیٹھتے دیکھ کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ شادی کے معاملے میں دیسی عورت کا بھی دنیا میں کوئی جواب نہیں۔ چنانچہ جب وہ ملازمت کے سلسلے میں تربیت حاصل کرنے کے بعد وطن لوٹا تو اس نے کہانی وضع کی داستان ختم کرنے میں تین برس صرف کر دیے۔ ایک ایسی عورت جو پردہ نہ کرنے کے باوجود نماز روزہ کی پابند ہو، ایک ایسی لڑکی جو نہایت شگفتہ مزاج ہو اور انگریزی فرفر بولنے کے باوجود ان دیکھے سات پردوں میں بند ہو۔ ریاض احمد کے یار دوست تو اس کے دقیانوسی خیالات سن کر ہنسا کرتے اور اس کے گھر والے خاندان والوں کو بھی اس بات پہ پہلے بڑا اچنبھا ہوا کہ وہ ولایت سے ہو آنے کے باوجود دوسرے لڑکوں کے برعکس یوں معلوم ہوتا تھا جیسے حج کر کے آیا ہو۔

"...... بس فرق صرف اتنا ہے کہ اس کی داڑھی باہر نہیں اندر اگی ہوئی ہے"

"پڑھ لکھ کر گنوا لیا ہے۔" ریاض کے دوست اسے کہتے۔

"نہ معلوم اسے کیا ہو گیا ہے جو اپنی قیمت وصول نہیں کرتا؟" ریاض کے والدین کہتے۔

لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اسے بیوی اولاد پیدا کرنے کے لیے چاہیے تھی۔ بچے کے لیے ایک ماں اور اپنے لیے ایک رفیقہ حیات۔ غرض ڈھونڈنا نہ ہوتا ہے۔ جب ایسے دو مل جائیں تو سونے پہ سہاگہ! ریاض احمد کی نگاہِ انتخاب بھی آخر کہاں جا کر رکی۔ اس کے اپنے ہی ڈسٹرکٹ میں درگاہ والے شاہ شریف کے متولی حضرت پیر جمال کی دختر نیک اختر، شیریں جمال ایک، ایسی لڑکی نظر آئی جو

[illegible] پیر صاحب کے خاندان میں [illegible] تو نہ صرف [illegible] ایک [illegible] کیا تھا۔ تب [illegible] کے دل میں [illegible] [illegible] پیر صاحب [illegible] شیریں [illegible] [illegible] کے [illegible] ریاض احمد [illegible] [illegible] اور شیریں [illegible] [illegible] بنا [illegible] شیریں [illegible] ہو۔

شیریں کی وجاہت دیکھ کر [illegible] تھا اس نے [illegible] کبھی [illegible] نہیں کہا تھا۔ اگر یہ بات [illegible] [illegible] سے [illegible] [illegible] مگر [illegible] [illegible] کے [illegible] [illegible] کی ضرورت تھی۔ اس کے [illegible] بڑے بزرگ [illegible] ریاض احمد [illegible] پیر صاحب شیریں کے [illegible] [illegible] وہ [illegible] [illegible] [illegible] وقت [illegible] دیتے [illegible] کسی [illegible] کے [illegible] حرکت [illegible] [illegible] ریاض احمد کی [illegible] سے شادی بھی پیر صاحب کے مریدوں نے [illegible] کر لی۔

لیکن دس برس کی رفاقت کے بعد بھی [illegible] ریاض احمد کے ہاں کوئی بچہ نہ ہوا [illegible] کا اضافہ ہوتا چلا گیا اور بچے کے بغیر ریاض [illegible] محسوس کرتا جیسے شیریں اب تک کنواری ہو [illegible] کبھی کبھار شوہر کے اس احساس محرومی کے باعث [illegible] ملک بھر کے نامور ڈاکٹروں، حکیموں کا علاج بھی کروا کر دیکھ لیا تھا۔ [illegible] پیر صاحب نے گنڈے تعویذ، ٹونے ٹوٹکے کے ذریعے [illegible] کی گود ہری کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا لیکن یہ بھی بے سود [illegible] اور اپنی برادری کو چھوڑ کر ایک غیر شخص کے ساتھ اس کی شادی کرنے کی [illegible] بہرحال جب پیر صاحب کی اس بارے میں کوئی پیش نہ چلی تو انھوں نے شیریں اور ریاض دونوں کو اپنے خرچ پر علاج معالجے کے لیے یورپ اور امریکہ بھیج دیا۔

غیر ممالک کے ڈاکٹروں نے بھی دیسی معالجوں کی طرح جیسے بیک زبان ایک ہی رائے دینے کی سازش کر رکھی تھی۔ وہی جواب پایا جیسے [illegible] کہ جسمانی لحاظ سے تو وہ دونوں [illegible] انھوں نے ریاض کو البتہ یہ مشورہ ضرور دیا کہ بیوی کو مغرب کی دل کھول کر سیر کرائے۔ اس کے مطابق انھوں نے [illegible] میوزک ہال، حتیٰ کہ نائٹ کلبوں تک کی سیر کر ڈالی۔ وہاں کی بے حجابی اور بے شرمی دیکھ کر شیریں پر جھرجھری سی طاری ہو جاتی۔ شیریں نے کئی بار ریاض سے کہا کہ وہ کسی مغربی لڑکی سے شادی کر لے، شاید اس کے من کی مراد اس طرح پوری ہو جائے لیکن اگر اس کے باوجود ریاض کی خواہش پوری نہ ہوئی تو وہ سنگِ مرمر کی ایک اور دیوار اپنے گرد کھڑی کر لے گا۔ وہ جواب دیتا، اگر قسمت میں ہی اولاد نہیں تو پھر

شکوہ کیوں۔ شاید اس میں بھی کوئی مصلحت ہو۔" ریاض نے شیریں کو ایک طویل لیکچر دیتے ہوئے کہا لیکن شیریں کو معلوم تھا کہ ریاض اس وقت دماغ سے سوچ رہا تھا، دل سے نہیں۔

یورپ اور امریکہ سے واپسی پر ریاض تو پھر کام میں محو ہو گیا لیکن اس کی والدہ نے بہو کا علاج اپنے ڈھب سے کیا۔
"خدا بڑا رحیم و کریم ہے۔ اس سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ سنا ہے ٹھٹھہ میں ایک سائیں آیا ہے وہ ایسی عورتوں کا علاج کرتا ہے۔ چلو اس کو بھی دکھا لیں۔" اس نے کہا۔
"... وہ آئیں تو گاڑی میں چلیں گے۔" شیریں نے ساس کا دل رکھنے کے لیے جواب دیا۔ "جی! آپ ایسے کیوں خواہ مخواہ اتنا ہلکان ہوتی ہیں۔ میں نے تو انھیں کہہ دیا ہے کہ ... آپ دوسری شادی کر لیں۔"
"چل پگلی۔ ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ مجھے ریاض نے بتایا ہے کہ تم نے اسے اجازت دے دی ہے لیکن یاد رکھو نہ تو وہ ایسا کرے گا، نہ میں ہی اسے ایسا کرنے کی اجازت دوں گی۔"
"لیکن ..."
"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ جہاں اتنے علاج کیے یہ بھی آزما دیکھو۔ فکر نہ کرو ریاض کچھ نہیں کہے گا۔"
"انھیں بتا دینے میں کیا حرج ہے۔ ایسی جگہ پر کوئی مرد بھی تو ساتھ ہونا چاہیے۔"
"... تمھارے جیسے کیسوں میں سائیں عورت کے ساتھ مرد ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ میں جو تمھارے ساتھ ہوں۔ میں بھلا کوئی ایسی ویسی جگہ تمھیں تھوڑے لے جا رہی ہوں۔"

"آؤ آؤ۔ میں تمھارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" جب شیریں اور اس کی ساس سائیں دین شاہ کے ڈیرے پر پہنچیں تو اس نے انھیں دیکھ کر جواب دیا۔ "فکر نہ کرو۔ خدا تمھاری گود ہری کرے گا۔" نہ صرف اس کے الفاظ سن کر بلکہ اس کی شکل صورت دیکھ کر وہ بہت ٹھٹھک کر رہ گئیں۔ الفاظ پر اس لیے کہ سائیں کے متعلق لوگ کہتے تھے کہ اسے بنا پوچھے اپنے ملاقاتیوں کی آمد اور دل کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ باقی رہی شکل صورت، اس کے اعتبار سے بھی وہ نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ سرخ و سفید رنگ جس پر بڑھاپا نور بکھار رہا تھا اور جھریوں کا ثبوت بھی بمشکل ملتا تھا۔ کمان کی طرح سیدھا، چاق و چوبند۔ سر کے بال ضرور براق سفید تھے جو عمر کی غمازی کر رہے تھے۔ چہرے بشرے سے عجیب طمانیت اور ہمدردی ٹپکتی تھی۔ غلافی آنکھوں میں سرخ ڈورے ان میں ایک ناگفتہ بہ خمار، جب وہ جلال میں آتا تو ان میں سے انگارے سے نکلتے۔ سننے میں آیا تھا کہ اگر وہ کسی سے نظریں ملا کر بات کرتا یا نظر اٹھا کر دیکھ بھی لیتا تو اس کا بیڑہ ضرور پار ہو جاتا۔
جب شیریں اور اس کی ساس اس کے ہاں پہنچیں تو وہاں سائیں کے پاس اس کے سائلوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ مردانہ کیا زنانہ کیا دونوں کمرے بھرے ہوئے تھے۔ آدھ پون گھنٹے میں چند عورتوں کو فارغ کر کے وہ یک لخت اٹھ بیٹھا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو اور لپک کر اندرون خانہ سے تین چار ماہ کا ایک بچہ اٹھا لایا۔ یہ اس کی آخری نوجوان دلہن کے بطن سے تھا۔

"دیکھو خدا کی قدرت [illegible] بہت [illegible] جیسے [illegible] کر [illegible] اس کے [illegible] شے [illegible] دیکھیں [illegible] صورت [illegible] کے [illegible] اس کے [illegible] اس [illegible] ہاتھ [illegible] [illegible] ایک دوسرے [illegible] [illegible] پھیل گئے ایک دوسرے [illegible] [illegible] صاحب کے [illegible] [illegible] کر کے [illegible] کے [illegible] سے گئے۔

[illegible] نے [illegible] کہ اس [illegible] [illegible] ہوگا۔ اس [illegible] پہلے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] سے [illegible] ہوگا۔

[illegible] کے [illegible] چاند [illegible] [illegible] [illegible] کے [illegible] [illegible] [illegible] کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کے [illegible] کبوتر [illegible] تھے۔

عورت [illegible] کی [illegible] جیسے دو کبوتروں کی [illegible] اڑی۔ عورت نے [illegible] سے [illegible] بہت [illegible] جیسے ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہوں۔

چاندنی [illegible] کے [illegible] چمک [illegible]

دوسرے [illegible] کے سامنے [illegible] اس کے پاس رکھ دیں۔ [illegible] وہ [illegible] پانی [illegible] سے [illegible] عورت [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] نہیں [illegible] مگر عورت [illegible]

"آپ اس طرف نہ دیکھیں۔"

"بارہ [illegible] بیٹھے ہیں۔"

"لیکن یہاں کا منظر...... کتنا [illegible] ہوتا ہے۔"

"[illegible] کیا تم کہہ رہی ہو؟"

"نہیں [illegible]......"

جب عورت نے [illegible] کا [illegible] کے [illegible] سے پھسل گیا اور وہ کبوتر کی طرح [illegible] کرتے ہوئے

قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ اس سے یوں محسوس ہوا جیسے دریا کی لہروں پر جلترنگ بج اٹھا ہو۔ اب وہ مرد کے ہاتھوں سے کبوتر لے کر انھیں سینے سے چمٹائے ریت پر بیٹھ گئی۔

"شہزادے! سرکنڈوں کے پیچھے سے اس کی مدھم آواز آئی۔"

"گھبرائیے نہیں، تھوڑی دیر اور!"

فضا میں دن کے گالوں سے زیادہ نرم، چاندنی سے زیادہ سپید پرندے اُڑتے تھے۔ بار بار بستہ کھلی رہے۔ انھیں دیکھ کر عورت کا جی چاہا کہ کبوتروں کو یکلخت پھر سے ترتیب ہی جا چھوڑے جن سے گنبد اور مینار چمکتے رہ گئے تھے۔ عورت نے اب کبوتر ایک ٹوکری میں بند کر دیے جن میں وہ انھیں بند کر کے لائے تھے اور جو اس کے شوہر کے پاس پڑی تھی۔

چاندنی میں ایک سیماب وش شعلہ سا یکدم نمودار ہو گیا...... سنگ مرمر کی بت بے نقاب ہو گیا تھا۔ اپنے آپ کو سر سے پیر تک دیکھ کر عورت پہلے تو کچھ ڈری سی ہو گئی۔ مرد اسے سرکنڈوں کے پیچھے سے دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ سفید گلاب کی بند کلی جس پر سیاہ بھنورا سا بیٹھا تھا مکمل ہی کھلتا جا رہا تھا۔ عورت نے جلدی جلدی اپنے جسم پر ایک دو اوک پانی ڈالا، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے تیزی سے اس کے جسم کے اردگرد لپٹ لپٹ جانے لگے اور وہ اور چاندنی اس کے گرد اگرد بس گئیں۔ اس سے عورت کا جی چاہا کہ وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت سے لپٹ جائے، پانی اس کے اوپر بہہ جائے۔ اس نے یکدم اٹھ کر بے چاری ٹوکری میں سے کبوتر نکال کر اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ کبوتروں کو اس وقت یوں محسوس ہوا جیسے ان کے سامنے کبوتروں کا ایک جوڑا آ گیا ہو۔

جب عورت نے انھیں اپنے سینے سے لگا کر بھینچ کر پیار کیا تو اس کی آنکھیں اپنے آپ مُند گئیں۔ اس کے تصور میں سیکڑوں برس پہلے ممتاز محل اور مہرالنسا کی پہلی ملاقات کا منظر گھوم گیا...... جب شہزادے نے اس حسینہ کو کچھ دیر کے لیے اپنے دو کبوتر سنبھال کر رکھنے کو کہا اور واپسی پر اس کے ہاتھ خالی پا کر اس سے پوچھا کہ وہ کس طرح اڑ گئے تھے...... تو بیتے ہوئے سنگ مرمر کی عورت کے ہاتھوں سے دونوں کبوتر پھڑ پھڑا کر فضا میں اڑ گئے۔ وہ ان کے پروں سے نکلی ہوئی آواز سن کر چونک کر اٹھ بیٹھی اور کبوتروں کو ادھر ادھر دیکھنے لگی لیکن وہ نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ شاید۔ وہ اندر پیوست انھیں پکڑنے کے لیے جیسے ان کی طرف لپکی لیکن اس کا پاؤں ایک تنکے سے بیٹھے گڑھے میں جا پڑا اور وہ ریت پر گر پڑی۔ چاندنی اب سنگ مرمر کے بت کو پوری طرح اپنی آغوش میں لے رہی تھی۔

عورت نے یکدم اٹھ کر پانی کی دو دو بالٹیوں سے نہایا۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ اس کے روئیں روئیں میں سرایت کر گیا ہے۔ اس نے بے ضرر سے روپانی کے لہجے میں فرمائش کی اور قہقہہ لگا کر اپنا جسم ریت پر لڑھکا دیا۔ سرکنڈوں کے پیچھے سے ایک سانولی سی بجلی لہرائی اور سنگ مرمر کی مورت سے آ کر لپٹ گئی۔

چند ماہ بعد معلوم ہوا کہ سنگ مرمر کے رگ و ریشے میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

وقت کی کوکھ

نوید انجم

بھابی کے ۔ وہ تمام کر رہی تھی

اس کی آنکھیں ایک دم بکھر گئیں [illegible] سے جیسے وہ بہت پیچھے گئی [illegible] اس نے [illegible] دیکھا

بھابی سے نظر کر رہی [illegible] کی بات کے [illegible] کی کوئی بھی [illegible] بیٹے [illegible] تھے [illegible] کا

دکھلا کر کہہ رہی [illegible] جیسے [illegible] نہیں [illegible] کی کا [illegible]

تمہارا [illegible] سے [illegible] کے [illegible] سے [illegible]

آنکھوں سے بہک کی ادا کر رہی تھی

[illegible] ۔ اف [illegible] ۔ [illegible]

اس نے مڑ کر ایک بار بھابی کو دیکھا ۔ پھر دیکھا کہ [illegible] کی ہوئی ایک عورت پر اس کی بھی نگاہ جا ٹھہری

اس عورت کا بدن [illegible] تھا اور [illegible] کی جھلکتی تھی ۔ [illegible] سے وہ کوئی [illegible] ہی محنت

مشقت کی عادی ۔ اس کا قد لمبا اور ناک نقشہ گیرا تھا ۔ [illegible] نے اس کے چہرے کو بہت دیکھا [illegible] معلوم کہ چار [illegible]

مگر اس عورت کا چہرہ کسی ناز سے عاری تھا ۔ وہ ایک بے جان بت کی مانند آتے جاتے لوگوں پر ایک نظر ڈالتی ۔ وہ [illegible]

ریڑھی پر بچھے کے قریب پڑے ہوئے ایک کشکول میں [illegible] وہ آنے والے کو [illegible] زندگی کو [illegible] دل ہی دل میں توبہ توبہ کرنے لگی

۔ اور پھر وہ عورت کبھی کبھار بچوں کی طرف بھی دیکھ لیتی ۔ جن کی نگاہوں میں بے پناہ معصومیت اور بے بسی رچی ہوئی تھی ۔

ان [illegible] کی ظاہری شکل بڑی [illegible] نہیں ۔ [illegible] کی [illegible] نہ ہوتی کہ رہا ۔ وہ بچوں کی جانب دیکھ

پلٹ کر اس نے بھابی کی طرف دیکھا جو زیر لب توبہ توبہ کر رہی تھی ۔ "توبہ ہے بھابی ۔ کیا یہ اس عورت کے بچے ہیں؟"

بھابی نے منہ پھیر لیا ۔ "چلو ۔ چلو رعنا" ۔ وہ وہاں کھڑا ہونا نہ چاہتی تھی

رعنا نے اپنا ناک سا پرس کھولا ۔ ایک روپیہ نکال کشکول میں پھینکا اور بھابی کے ساتھ تیز قدموں سے تمام کرنے لگے بڑھ گئی ۔

گھر پہنچ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی ۔ کچھ دیر بغیر کسی مقصد کے وہ کھڑکی میں کھڑی باہر سڑک کی جانب دیکھتی رہی ۔ پھر پلٹ کر

وہ قدِ آدم آئینہ کی طرف آئی اور خود کو دیکھنے لگی ۔

اس کا چہرہ بے حد خوبصورت تھا، رنگ صاف۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ جو سہیل کو بہت پسند تھا ——— وہی سہیل جو اس کا محبوب تھا —— نہ صرف محبوب بلکہ منگیتر بھی اور اب صرف چند دنوں کے فاصلے پر ...... [illegible] جیسے کسی مصور نے شرارت سے کھینچا۔ اور وہ گلاب سے سرخ ہونٹ۔ جنھیں اس نے کئی بار اپنے ہونٹوں سے چھونا چاہا اور وہ ہمیشہ ایک دلفریب ادا کے ساتھ پیچھے ہو گئی کہ اس کے لمس سے بچاؤ کر لے ...... اور حیرانی کی وہ آہیں جو وہ شرارت کے طور پر بھرتی۔ [illegible] کی گھنی گھنیری زلفیں اور وہی گول گول خوشنما سراپا ——— آئینہ میں خود کو دیکھتے ہوئے وہ مسکرا دی ——— لیکن یہ فوراً ہی جیسے اس کی مسکراہٹ کافور ہو گئی۔ [illegible] چہرے پر سے غائب ہو گئی اور ہونٹوں کی جگہ ایک سرخ داغ ——— پھر اس ایک سرخ داغ کی بے بسی پر ہنسنے کے لیے بن گیا ——— آنکھیں، وہ حسین آنکھیں۔ جانے کہاں گم ہو گئیں اور بے نور سے دو گڑھے ——— جیسے سوکھے ہوئے دو بھنوروں کی مانند اس کا منہ چڑانے لگے ——— اور پھر سے ایسے لگا جیسے وہ اس کی بازار میں کھڑی ہوئی پڑھی لکھی ہیں اور اس کے ہمراہ بے بسی کی حالت میں ناچتے لوگوں کی ہمدردیاں سے لبریز نگاہوں کا نشانہ بن رہی ہو ——— سارے وحشت کے اس کے حلق سے ایک خوفناک چیخ نکل گئی ——— اسے احساس ہوا کہ ان لوگوں میں سہیل بھی ہو سکتا ہے اور وہ ...... وہ رضا نہیں ایک سسکتی ہوئی زندگی ہے ——— اس نے گھبرا کر اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور سسکتی ہوئی مسہری پر گر گئی۔

بھابی اس کی چیخ سن کر بھاگی آئی ——— اسے یوں روتا دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو وہ بھی حیران ہو گئی۔ پھر اس نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے بڑی شفقت سے پوچھا "کیا بات ہوئی رانی؟ ——— بولو رضا!"

رضا خاموش ہو گئی۔ "میں تمہیں بھی تو پرائی ہوئی ایسے رونا کیا کرتا ہے ...... رانی ——— رضا رانی ——— رانی!"

بھابی نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا "کیا بات ہوئی؟"

"کچھ ...... نہیں" ——— اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اس کی تیری بڑی بڑی آنکھیں ——— نم آلودہ ——— بھیگی بھیگی ——— کتنی پیاری لگ رہی تھیں! بھابی کو وہ بڑی پیاری نظر آئی اور اس کے بازوؤں کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے وہ بولی "اٹھو ...... اٹھو ———" پھر رازداری کے لہجے میں بولی "کہیں سہیل سے تو کوئی بات نہیں ہوئی ——— ؟"

وہ شرما گئی ——— حیا کی سرخی نے اس کے چہرے کو بہت زیادہ حسین بنا دیا۔ اس نے کہنا چاہا "کیسی بات کرتی ہو بھابی! بھلا میں اس بات پر یوں رو سکتی ہوں ———" مگر وہ کچھ نہ بول سکی۔ اس کے ذہن میں ایک خیال اُبھرا۔ کیا میں واقعی سہیل کی کسی بات پر ...... رو سکتی ——— اسے کوئی جواب نہ مل سکا اور گھبرا کر اس نے اپنے ذہن میں سے ایسے الٹ پلٹ سوال نکالنے کی کوشش میں ...... وہ [illegible] نہیں۔"

بھابی کچھ سمجھ نہ سکی۔ ہنس کر وہ پھر بولی "پگلی! ارے ابھی آ جائے گا۔ وہ بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

وہ بُری طرح شرمائی تو بھابی نے اسے چھیڑنا شروع کر دیا۔

شام ہوئی تو وہ آیا ——— ممی اور ڈیڈی بڑے آزاد خیال واقع ہوئے تھے ——— بس ذرا سی ضد کر کے رضا نے بھابی کی مدد سے باغِ جناح میں سیر کے لیے جانے کی اجازت لے لی اور سہیل کے ہمراہ باغ میں آ گئی۔ وہ دونوں گلستانِ فاطمہ کے ایک کونے میں جا کر

ہو گئے۔ وہاں بہت سی [illegible] بیٹھے تھے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ۔۔۔

وہ جب واپس گھر جانے لگے تو سہیل [illegible]
کی کتاب دے کر پڑھانے لگی۔ [illegible]

[illegible]

رضا مسکرا دی [illegible]

رضا عجیب سی [illegible]
یہ ہلکا سا مگر پیارا ہے ۔۔۔"

میرا جواب [illegible] مس رضا ۔۔۔ میں نے [illegible]
گیا ہے ۔۔۔"

سہیل نے پوچھا تو رضا نے ساری بات کہہ سنائی ۔۔۔ اور پھر بولی ۔ ان چیزوں کو دیکھ کر میرا تو دل دہل گیا اور بھابی کی طبیعت خراب ہو گئی ۔۔

سہیل نے کہا ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ یہ ابھی دور ہے ۔۔۔ جانے کتنے اور بھی اس دنیا میں ۔۔"

رضا کانپ گئی بات کاٹ کر بولی " سہیل کوئی اور بات کرو ۔۔۔"

نعیم نے کہا " مس رضا ! ایک بات اور سنئے گا ۔۔۔ یہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے اس میں نوجوان کا ایک افسانہ ہے جس میں ایک ایسا ہی کیرکٹر پیش کیا گیا ہے ۔۔ یہ پڑھ کر دیکھئے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں فریب ۔۔۔"

رضا کسی اور خیال میں کھو رہی تھی اس کے ذہن میں دوپہر کے واقعات ابھر رہے تھے ۔۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہے اور اس کی شکل بدل گئی ہے ۔۔ دفعتاً اس نے سہیل کا ہاتھ پکڑا اور وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ سہیل نے بڑے پیار سے اسے دلاسا دیا ۔ "تم نے خود ہی تو یہ ذکر چھیڑا اور اب خود ہی وہ کیوں ہو گئی ہو ۔۔۔؟"

نعیم کو احساس ہوا کہ اس سے کوئی غلطی ہو گئی تھی۔ معذرت کرتے ہوئے بولا " مجھے اجازت دیجئے ۔۔۔"

رضا کا دل چاہا کہ اس سے کتاب لے کر گھر جاتے ہی پڑھے مگر خاموش رہ گئی۔

سہیل اسے گھر تک چھوڑنے آیا ۔۔۔ وہ کچھ خاموش خاموش تھی۔ کچھ کھوئی کھوئی سی تھی مگر وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بھابی اس کے پیچھے پیچھے آئی ۔۔۔ دیکھا کہ مسہری پر بیٹھی ہوئی بکھرے ہوئے بالوں میں اپنی مخروطی انگلیاں یوں پھیر رہی ہے جیسے کنگھی کر رہی ہے ۔۔۔ دوپٹہ مسہری پر آدھا نیچے اور آدھا اوپر کی جانب پردے کی طرح لٹک رہا ہے اور گلے کے بٹن کچھ کھلے کچھ بند ہیں۔ وہ ٹھٹک کر رہ گئی ۔۔۔ "رضا ۔۔۔ رضا!" بھابی نے سرگوشی کی۔

اس نے بھی شاکر ٹیک کروٹ لی اور بھابی کی طرف دیکھنے لگی ۔۔۔ بھابی وہ عورت!"
بھابی نے جلدی سے کہا ۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے ۔۔ پھر اس عورت کے ذکر سے
وہ خاموش ہو گئی

سارا گھر اندھیرے نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ۔ سڑک کے دونوں کناروں پر بجلی کے کھمبے نظر آنے لگے جیسے ایک لمبی سی لکڑی کا سہارا لیے کھڑا ہو ۔ وہ لیٹے لیٹے کمرے کی کھڑکی سے باہر اندھیرے میں دیکھتی رہی ۔ جانے کتنی دیر دیکھتی رہی ۔ روشنی دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ ایک بم کا گولہ ہے جو بھڑک رہا ہے اور جب اس کی دھیمی دھیمی روشنی ۔۔۔ وہ آگ ہے جو کسی بھی وقت سارے عالم دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے کر بھسم کر سکتی ہے ۔۔۔ پھر یہ تمام دنیا ختم ہو جائے گی ۔ ان تمام خوبصورت بالوں اور داستانوں سے کرہ ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گی ۔۔۔ وہ اس خیال سے کانپ اٹھی ۔ لرز کر رہ گئی

پھر وہ جھٹ کر بھابی کے کمرے کی طرف آئی ۔ اسے محسوس ہوا جیسے یہ ماحول یہ خاموشی سب [illegible] ہے ۔ ماحول پر سناٹا مسلط ہو گیا اور تاریکی میں ہر چیز ڈوب گئی ہے ۔ [illegible] زندگی کی بڑھتی ہوئی کے لیے تیار ہے ۔

گھبرا کر اس نے دروازہ کھولا اور آہستگی کے ساتھ اندر داخل ہوئی ۔۔۔ دروازہ بند کیے بغیر وہ چوکھٹ کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی ۔ اس نے دیکھا بھابی اپنی چارپائی پر خاموش بیٹھی ہوئی ہے اور سرہانے میز پر رکھا ہوا ٹیبل لیمپ روشن ہے ۔ نیچے سے لیمپ کی ذرا سی روشنی کمرے کی تاریکی میں گھل کر ایک عجیب سی فضا پیدا کر رہی تھی ۔ بجلی کی روشنی اور گہری تاریکی جیسے سامنے اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ بھابی کے کمرے میں پھیلا آیا تھا ۔۔۔

رعنا کو ایسے لگا جیسے وہ ساکت رہ گئی ہو وہ پتھر کا ایک مجسمہ ہو گئی ۔۔۔ اس سے اپنا قدم آگے نہ بڑھایا گیا ۔ لغزش نے اس کے پیروں کو جوتیوں سمیت گویا دبوچ لیا ! اس کے سینے کے اندر ایک عجیب تبدیلی سی آ گئی اور دل کی دھڑکن کی آواز اتنی تیز ہو گئی کہ رعنا کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل اس کے بدن سے علیحدہ ہو کر گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح چلنے لگا ہو ۔ جلدی سے اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر اسے سنبھالا کہ کہیں وہ واقعی اس کے منہ کے راستے نکل کر باہر نہ آ جائے ۔۔۔ اور پھر متوحش نظروں سے بھابی کو گھورنے لگی ۔

بھابی کے بے حس و حرکت جسم میں حرکت ہوئی اور رعنا کو سسکیوں کی آواز سنائی دی ۔۔۔ بھابی بڑی آہستگی کے ساتھ اٹھی اور ٹیبل لیمپ کے پاس بیٹھ گئی ۔۔۔ بھابی کے چہرے پر جب روشنی پڑی تو رعنا نے دیکھا کہ وہ رو رہی تھی ۔ وہاں انگارہ سی آنکھوں میں آنسوؤں کے شبنمی قطرے گویا اس دہکتی ہوئی آگ کو بجھانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے جو بھابی کے سراپا میں بھڑک رہی تھی ۔

پھر بھابی نے اپنے چہرے سے اپنی آنکھوں کے ان قطروں کو پونچھا جو اگر کسی سیپ کے منہ میں گرتے تو موتی بن جاتے ۔ [illegible] میں پڑی ہوئی اپنے شوہر کی تصویر اپنے ہاتھوں میں لے کر دیکھنے لگی ۔۔۔

رعنا کو یوں محسوس ہوا جیسے دل ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہونے کے لیے جدوجہد کرنے لگا ہو ۔۔۔ اس کے بھیا کی تصویر تصور میں اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی ۔ [illegible] مسکراہٹ کی [illegible] اس کا خوبرو بھائی جمیل ۔ ہاں دیکھو نا جمیل اسے دیکھ کر ہنس رہا ہے ۔۔۔ پگلی ! پگلی ! تم مجھے دیکھ کر اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو ۔۔۔ ارے یہ آنسو کس لیے ؟

وہ بے اختیار چونک اٹھی ۔۔۔ سامنے سے [illegible] ہوا سے اس کھڑکی کے پردے [illegible]
پردہ [illegible] تصویر [illegible] ۔۔۔ [illegible]

اس کا دل چاہا کہ [illegible]
[illegible] ۔۔۔ [illegible]
[illegible] : بھابی [illegible] جلدی آ جائیے !

بھابی اس جملے کو [illegible] ۔۔۔ [illegible]
[illegible] ۔۔۔ ارے ۔ ارے ۔۔ وہ آ رہی ہے ۔۔ ۔

[illegible] بات [illegible] ۔۔۔ تو بھابی : یہ کوئی کتاب تو نہیں ۔۔۔ [illegible]
[illegible] کا احساس ہوتا ہے ۔۔۔ :

بھابی نے بے دلی سے کہا ۔ نہیں ۔ ہم تو نہیں سمجھے ۔

اور [illegible] کو یوں محسوس ہوا جیسے [illegible] ۔۔ وہ نہیں ہے ۔ نہیں تھے ۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کرے ۔۔۔ پھر وہ [illegible] کی طرف چل دی لیکن [illegible]
ذرا [illegible] ۔ ابھی [illegible] کا خیال [illegible] ۔۔۔
کوئی کتاب اس کے [illegible] نہیں ۔۔۔ اگر وہ سوچے گی کہ کیا کرے ۔۔۔ پھر اس نے [illegible]
کے [illegible] فون کر دیا ۔ اس نے سوچا کیوں نہ [illegible] فون کر کے [illegible]
کے [illegible] کوئی زیادہ [illegible] ۔۔۔ یہ سوچ کر اس نے [illegible] ۔۔۔
ایسے میں اسے سہیل کا خیال آیا ۔

”ہیلو !“ اس نے فون کیا ۔ ”بھابی [illegible] ۔۔۔ میں کون ہوں ؟“

”ارے بھابی ! ۔۔۔ اس ۔۔۔ میں ہی ہوں ۔۔۔ دراصل مجھے کوئی کتاب چاہیے ۔۔۔“ وہ بولی ۔

وہ ہنس رہا تھا ۔۔۔ اسے بھی ہنسی آ گئی ۔ ”بھلا اس میں [illegible] کیا بات ہے ؟“

”تم نے [illegible] وہ کتاب کیوں نہ [illegible] ؟“

وہ چونک گئی [illegible] کہ وہ [illegible] کی کتاب پڑھنا چاہتی تھی ۔۔۔ اور اس کتاب کا خیال آتے ہی اسے وہ عورت یاد آ گئی ۔۔۔ سیاہ [illegible] خوفناک [illegible] ۔۔۔ وہ سہم گئی ۔ کمرے میں کسی کی آہٹ آئی ، پھر جیسے کسی کے سانس لینے کی آواز گونجنے لگی ۔ اس کے کانوں کے پردوں سے آوازیں ٹکرانے لگیں ۔۔۔ کمرہ [illegible] سے بھر گیا ۔ وہ چیخ پڑی ۔۔۔ نہیں سہیل ۔۔۔ مجھے وہ کتاب نہیں چاہیے ۔۔۔“

”رضیہ ۔۔ !“ اسے بھابی کی آواز سنائی دی ۔۔۔ اس نے پلٹ کر دیکھا ، بھابی اس کے پیچھے کھڑی تھی
فون میں سہیل کی آواز آ رہی تھی : ”تم ڈر گئیں ! [illegible] بڑی ڈرپوک ہو ۔ بڑی بزدل ہو ۔۔۔“ وہ چھیڑنے لگا ۔

[illegible] گیا [illegible] مجھے [illegible] — سانی ماں [illegible] سے

[illegible] علیحدہ کر دیا

[illegible]

[illegible] جا رہی ہیں [illegible]

[illegible]

[illegible] وہ خود سے کہہ رہی تھی [illegible] بہت [illegible]

بھابی [illegible]

[illegible] — وہ [illegible] تک [illegible] — [illegible]

[illegible] وہ خوش ہو گئی — —

رضا نے سوچا کہ وہ [illegible] ہو گئی [illegible] — بس [illegible] رہی ہو جیسے

[illegible] رہی ہو —

[illegible] پھر وہی کی [illegible] — بہر — نہیں — [illegible] رضا ہوں —

[illegible] — [illegible] بہت نہیں — [illegible] لگے — بھابی — بابی

بھابی [illegible] دیکھو رضا — وہ مجھے [illegible] دور چلے گئے ——!

وہ بھابی کی طرف متوجہ ہوئی [illegible] — ابھی انھیں گئے [illegible] ہیں — بھابی!

بھابی نے رضا کی طرف دیکھا [illegible] — [illegible] انھیں [illegible] سے پاس ہی ہونا چاہیے

تھا — میں انھیں [illegible] ان کی خواہش [illegible] ہو — [illegible] وہ رک گئی۔

رضا کو کچھ [illegible] — سچ بھابی!

بھابی نے صوفے پر [illegible] اور سر جھکا لیا — ہاں! — میں ماں بننے والی ہوں مگر — کاش! میں انھیں بتاتی کہ

ان کی یہ خواہش پوری ہونے [illegible] کتنی خوش [illegible] ہوں — کتنی [illegible] ہوں میں —!"

رضا جیسے خوشی کے مارے دیوانی ہو گئی — "ارے بھابی! ابھی بتایا تک نہیں — ارے بھیا کتنے خوش ہوں گے —

وہ تو بس آنے ہی والے ہوں گے!"

"اوں! بھابی نے [illegible] — کاش یہ جنگی [illegible] ختم ہو سکتیں ——!"

رضا ایک دم جیسے بہت بڑا [illegible] کا روپ دھار چکی تھی "امن کے لیے یہ سب چیزیں ضروری ہیں —"

"امن — امن" بھابی نے اس کی طرف [illegible] نظروں سے گھورا — دنیا میں کون ہے جو سکون نہیں چاہتا امن نہیں

چاہتا اور پھر — پھر رضا تم کیا جانو جب میں سوچتی ہوں کہ وہ پائلٹ ہیں اور خدانہ کرے کسی روز یہ جنگی مشقیں —

بھابی! اس نے [illegible] بات کاٹی۔ ..

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اسے بڑی مسرت ہو رہی تھی

اخبار کا کالم ختم کیا [illegible] سارا کا سارا [illegible] چھوڑ دیا ـــ [illegible] کمرے میں [illegible]

[illegible] اخبار لیے اس کے کمرے میں آئی ـــ اے رانی ـــ [illegible]

"کیا؟"

"وہ جو [illegible] عورت [illegible] تھی نا ـــ"

وہ سمجھ گئی ـــ [illegible]

"ارے سنو تو ـــ اسے گرفتار کر لیا گیا ہے۔"

"نہیں؟" اس نے تعجب سے کہا۔ یہ جانی سے اخبار چھین لیا ـــ اور پڑھنے لگی ـــ مگر اخبار کے حروف جیسے اس کی نظروں کے سامنے پھیلنے لگے ـــ اور آنکھوں کے سامنے چھوٹے چھوٹے معصوم ننھے منے بچے پھرنے لگے ـــ

جانی کہہ رہی تھی ـــ "کہتے ہیں کہ کل شام [illegible] جب وہ سڑک پر بچے لیے بھیک مانگ رہی تھی کہ ایک شخص نے جو کہ بہت [illegible] اس کے بچوں پر ترس کھا کر اسے بھیک دی ـــ اور ـــ"

رضا نے اخبار ایک طرف پھینک دیا ـــ "اور ـــ اور؟"

"اس شخص کا ایک ہی بچہ تھا ـــ [illegible] سنانے میں کہاں حاصل تھا ـ اور وہ بچہ دو تین سال ہوئے بچپن ہی میں گم ہو چکا تھا ـــ اس شخص کو سڑک پر پڑے ہوئے ایک معذور بچے پر بار بار بے اختیار پیار آتا ـــ اور بچے کا نام اس کے بیٹے کا نام تھا ـــ مگر عورت بچے کو کسی اور نام سے بلاتی رہی ـــ مگر اس آدمی سے نہ رہا گیا اور اس نے اپنے بچے کا نام لے کر پکارا ـــ بس بچے نے جھٹ سے پلٹ کر اسے دیکھا ـــ [illegible] وہ بچہ بول نہیں سکتا تھا ـــ اس بیچارے کی زبان کٹی ہوئی تھی ـــ"

ہائیں ...؟ رضا مارے حیرت کے منہ کھول بیٹھی۔

بھابی بولی: تب پولیس کو بلا کر اس نے گھر سے اس عورت کو گرفتار کرا دیا —— اس عورت نے اپنے جرم کا اقرار بھی کر لیا۔ ہے ہے کتنی خطرناک عورت تھی —— لوگوں سے بھیک حاصل کرنے کی خاطر —— سنا ہے کہ کئی ہزار روپیہ اس کا بینک میں بھی جمع ہوا ہے۔

رضا نے حسب معمول "اللہ رے" ایسی عورت کو سخت ترین سزا ملے۔

بھابی بولی: اس کمبخت جیسی عورتیں بچوں کو معذور کر کے آگے بھیک دلواتی ہیں:

اس دن رضا کو دن بھر یاد ستاتا رہا —— اسے یوں محسوس ہوا جیسے ابھی ابھی آگ کی تپتی لہر گزری —— سارا دن وہ مرجھائی کلی کی مانند بے جان سی رہی۔ چہرہ سایہ ہو گیا اور آنکھیں دہشت زدہ۔ بعض اوقات جب اسے یہ خیال آتا کہ وہ بھی بننے والی ہے تو مسرت کی ایک لہر اس کے تن بدن میں دوڑ جاتی مگر وہ جیسے سہم کر رہ جاتی —— اللہ —— کہیں کوئی عورت آ کر ان کی خوشیاں لوٹ نہ لے ——

مجیب حسب معمول شام کے وقت آیا اور اس کی طبیعت خراب دیکھ کر بہت گھبرایا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ وہ اس عورت کے ذکر پر اتنا خوف زدہ ہے تو وہ ہنسا اور کہا اسے بچپنے ... اس کی ان باتوں پر وہ ذرا سنبھل گئی —— وہ کہنے لگا۔

"پگلی —— ایسا ہوتا ہی کیا ہے —— تم خواہ مخواہ ڈرتی ہو ——"

رضا بات کاٹ کر بولی: "پھر بھی مت ذکر کرو ——"

وہ بولا: بھئی کل ہی میں نے ایک افسانہ پڑھا ہے جس میں ایک عورت اپنی اولاد کو معذور کر کے لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ روپے کی مالک بن جاتی ہے —— فرق صرف یہ ہے کہ یہاں یہ عورت دوسروں کے بچوں کو اپنی بھیک کی خاطر ——

"پگلی —— اللہ —— نہیں نہیں بھلا کوئی اپنی اولاد کو بھی ضرر پہنچا سکتا ہے ——"

"پیسہ —— پیسہ سب کچھ ——"

رضا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا —— بس بس —— اور کچھ نہ کہو ——

آہستگی کے ساتھ اس نے اس کا نرم و نازک ہاتھ اپنے منہ پر سے ہٹایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا —— وہ شرما گئی ——

اور جب کچھ دیر کے بعد جب اس نے رضا کا گھونگھٹ اٹھایا اور آنکھوں میں جھانکنا چاہا تو وہ چھوئی موئی کی طرح سمٹ کر رہ گئی —— سرخ شرم کے جوڑے میں وہ ایک گٹھڑی کی طرح پڑی ہوئی تھی اور وہ سر جھکائے ایک ہاتھ سینے پر رکھے کہنے لگا —— ذرا آنکھیں کھولو —— میں ہوں تمہارا غلام!"

اور پھر بابل کے گھر میں مہندی رچاتے لمبا سا گھونگھٹ نکالے آنکھیں لاج کے مارے بند کیے رہی —— رخصتی کے وقت بھابی نے کیسی شرارت کی تھی —— اپنے بڑھے ہوئے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے بولی تھی: اے رضا رانی ذرا خیال رکھنا —— اتنی جلدی یہ روگ نہ لگے —— ویسے یہ روگ ہے بڑا پیارا —— وہ سرگوشی کر رہی تھی!

اور پھر میں نے اپنا چہرہ چھپا لیا [illegible] کے سامنے کر دیے تھے —— اور جیسے ایک شعلہ سا بھڑکا تھا [illegible]
[illegible] جوانی [illegible] ماں [illegible] ہوا [illegible] ہے —— [illegible]
جانتے ہیں پہلے کہ نہیں۔

وہ بولی [illegible] ہیں جیسے [illegible] اسے [illegible] رہی [illegible] کسی [illegible]
[illegible] وہ [illegible] کے جواب [illegible]۔

وہ [illegible] —— [illegible] ہے ——
وہ [illegible] ہے —— [illegible]

جانتی ہیں [illegible] —— [illegible] ہے [illegible] تھیں ——
[illegible]

[illegible] ہے [illegible] کرتی [illegible] عجیب [illegible] ہے [illegible] رہتا ہے [illegible]
وہ [illegible] کیا مطلب ہے؟
بھابی کہنے لگیں —— [illegible] بھی [illegible] سمجھا تھا
[illegible] تھی اور [illegible] کے [illegible] ہی تھی جیسے [illegible] ایک [illegible] ——
[illegible] بھابی پر [illegible] لگا —— [illegible] —— ایک —— [illegible] کیا حال ہوا ——
بھابی بولی تھیں ۔ سنا ہے جو اخبار کہاں نہیں ہوگی —— کہ بہا ہے وہ عورت پر [illegible] باتیں کی ——
بات کاٹ کر وہ بولی: بھابی جانے بھی دیجیے ——
جس [illegible] میں آیا ہے کہ وہ عورت [illegible] زندہ سلامت آزادی کے ساتھ [illegible] رہتی ہے [illegible] ایک ساتھی پھر رہی ہے
اخبار کے خاص نامہ نگار نے [illegible] سے ملاقات کی اور بچوں کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا کہ [illegible] ہی [illegible] ہیں اور اخباروں میں [illegible] خبریں چھپی
تھیں انھیں [illegible] ڈر گئی تھی اور [illegible] کے [illegible] روپوش ہو گئی تھی —— اور [illegible] اس عورت نے کہا ہے کہ وہ [illegible] کے
[illegible] کے بعد بچوں کو لے کر واپس آئے گی اور [illegible] ——
[illegible] ہو کر رہ گئی —— پھر بھابی نے کہا کہ اس نے کچھ سنا ہی نہیں [illegible] اس [illegible] نے [illegible] کی تھی کہ
یہ اتنی دور سے [illegible] کیا ایک عورت کے بھی [illegible] —— نہیں ، نہیں ۔ —
میکے سے وہ واپس آئی تو اداس اداس سی۔
پھر دن گزرنے لگے ۔ سپاٹ سے دن —— وہ زندگی کی ان راہوں پر آ پہنچی تھی جہاں چوراہے تھے —— زندگی میں
سے بہت سی نئی نئی پگڈنڈیاں جنم لیتی تھیں ۔ نئی راہیں نئے راستے —— اور وہ درمیان میں کھڑی دل ہی دل میں [illegible] کے [illegible] رہی تھی کہ
کہیں اس کے قدم سیدھی راہ پر چلنے کی بجائے غلط راستے پر نہ پڑ جائیں ۔ [illegible] کی بجائے پگڈنڈیاں [illegible] اپنی جانب نہ کھینچ لیں۔
پھر ماہ گزرنے لگے —— چاند ہر ماہ اپنی صورت بدلنے لگا —— اس کا روپ بھی [illegible] گرگٹ کی مانند رنگ بدلنے لگا

پریشان ہو گیا۔ وہ ان حسین منظروں سے اردگرد کے رنگوں کو دیکھتی رہی ہوں اور اپنی ہر رور کو دیکھ کر کٹ جاتا ہے ۔۔۔ سے ہی ہو تا ہے ہم کے وجود میں کسی سے سوں کو محسوس کیا ہے اور وہ ۔۔۔ کو کسی شئے کے قابل پایا نہیں کسی باپ نے جو کہ کسی وزن کا چو ماسے کے ٹکڑے اور گلے سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائیں ۔۔۔ عصا ۔۔۔ رہ گئے جیسے ۔۔۔ ہاتھوں میں پانی سے ٹوٹے ہوئے کچے گھڑے جیسے ہوئے ہیں ۔۔۔ ہیں لہروں کے ۔۔۔

صبح سویرے جب ۔۔۔ خدا کا نور لگانے ہوئے ۔۔۔ ہوتا ۔۔۔ صنف کر ۔۔۔ سوار کرتی کے سامنے ۔۔۔ سے نکل جاتا تو وہ محو سی ہو کر رہ جاتی۔ حیا کا کا غرور برگزنے ہی ایک ایسی آواز پیدا کرتا تھا ۔۔۔ سے جاذب ۔۔۔ رہتی۔

اور پھر وہ ۔۔۔ آنکھیں ۔۔۔ کے ساتھ رہا ۔۔۔ کر ۔۔۔ کی طرف دیکھتی اور ۔۔۔ کچھ ۔۔۔ جاتی۔

وہ اپنے ہاتھوں سے چہرہ ۔۔۔ سو ۔۔۔ اور سوچ ۔۔۔ گھٹ کر رہ گئی ہوتی اور پھر ۔۔۔ رہ جاتی۔

سہیل ایسے میں اسے ۔۔۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

اور وہ ۔۔۔ کے ساتھ اسے دیکھتی اور پھر اس کی نگاہیں اپنے ۔۔۔ ہاتھوں پر جا ٹھہرتیں اور وہ ۔۔۔ نس نس سے پوچھ ۔۔۔ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ اور ۔۔۔ کی سمجھ میں کچھ نہ آتا اور آنسو اس کی پریشانی اور جلتی آنکھوں میں سے نکل کر بہتے جیسے کی مانند ۔۔۔ گئے ۔۔۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اس کی پریشانی زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ ۔۔۔ کے ۔۔۔ والے روز بھابی ۔۔۔ پیٹ لیے آئی ہوئی تھی۔ جلو کی ۔۔۔؟

وہ کچھ نہ کہہ سکی بس خوف زدہ نگاہوں سے بھابی کے پیٹ کو گھور کر رہ گئی ۔۔۔

بھابی جیسے ۔۔۔ کے ساتھ بولی: وہاں اسے دیکھیں گے۔ ۔۔۔ کو ۔۔۔!

اس کا دل چاہا کہ زور سے چیخیں مارے اور بھابی کے بال نوچ کر رکھ دے۔ ۔۔۔ اس کے پیٹ کو چاک کر دے اور ۔۔۔ ایٹم کے ذرات بن کر فضا میں بکھرے اور تحلیل ہو جائے۔ ۔۔۔ مگر وہ کچھ نہ کر سکی۔ بڑی بے قراری ۔۔۔ اضطراری کیفیت کے ساتھ ۔۔۔ شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "نہیں بھابی ۔۔۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں!"

بھابی چلی گئی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

اور اس روز صبح سویرے اخبار پڑھتے ہوئے سہیل نے اسے خبر پڑھ کر سنائی: "ارے دیکھا تم نے ۔۔۔ فرانس نے ہائیڈروجن بم کا تجربہ کر دیا ۔۔۔ بڑا کامیاب تجربہ ۔۔۔"

وہ چیخ اٹھی ۔۔۔ "سہیل!"

وہ گھبرا کر اخبار چھوڑتے ہوئے اٹھا: "کیا ہوا، کیا ہوا ۔۔۔ تم ۔۔۔"

اس نے اپنے نچلے لب کو دانتوں سے کاٹ کاٹ لیا اور جواب میں کچھ نہ بولی ۔۔۔ اور اسی وقت بھابی کے ہاں سے نوکر نے یہ اطلاع آکر پہنچائی ۔۔۔ "بی بی کے ہاں لڑکا ہوا ہے۔"

اس نے مدہوشی کے سے عالم میں یہ خبر سنی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے میکے میں وہ عورت اپنا ایک بچہ چھوڑ کر ۔۔۔

[illegible] تک پہنچ ۔۔۔ وہ معذور بچہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ۔۔۔

اسے کچھ [illegible]

[illegible] ۔۔۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پھر کچھ دن اور گزر ۔۔۔ اور پھر [illegible]

پھر اس معذور بچے کو [illegible] اس کی نوکرانی [illegible] ۔۔۔ [illegible]

اسے [illegible] وہ سیٹ گئی۔

[illegible]

اور نہ نکل سکی ۔۔۔ گھبرا کر اس نے اٹھنا چاہا [illegible] جیسے جواب دے دیا ۔۔۔ جھنجھلا کر اس نے چاہا [illegible] ۔۔۔

وہ اکیلی ہی ۔۔۔ [illegible] ۔۔۔ [illegible]

وقت جانے سے پہلے [illegible] جلدی آ جاؤں گا۔ چھٹی لے لوں گا ۔۔۔ [illegible]

اس کی حالت [illegible] ۔۔۔

وہ چونک گئی۔ اس نے دیکھا باہر کسی کی آواز آتی ہے ۔ کوئی بھیک مانگ رہی ہے ۔۔۔ اس نے بیٹھ کر سامنے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی

ہیبت زدہ ہو کر وہ پلنگ پر جیسے ڈھے گئی ۔۔۔ وہی عورت ۔ رحمی سے بھیک مانگ رہی ہے ۔۔۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پیٹ میں کسی معذور بچے نے کروٹ لی ہے ۔ وہ خود بھی تو اپنے پیٹ کی ریڑھی میں اپنے معذور بچے کو لیے بیٹھی ہے

۔۔۔ اور ۔۔۔ اب ۔۔۔ اب؟

وہ بھی اپنے بچے کو لے کر بازاروں میں پھرے گی ۔۔۔ وہ بھیک مانگے گی ۔۔۔ نہیں اسے بھیک مانگنے کی ضرورت کیا ہے؟ وہ بھیک نہیں مانگے گی وہ تو صرف اپنے بچے کی نمائش کرے گی ۔۔۔ یہی دور جدید پیدا ہونے والا معذور بچہ ۔۔۔ ہاتھ پیر سے محروم ۔۔۔ ہلتا جلتا گوشت کا ایک جاندار لوتھڑا ۔۔۔ سائنس کی اولاد ۔۔۔ وہ اس کا بچہ نہیں!!

اسے شدت سے یہ محسوس ہونے لگا جیسے اس کے پیٹ میں اس کا بچہ نہیں! ایٹم بم کا ایک بگولا ہے جو ایک دم اس کے

پھٹ کر چلا کہ کے فضا میں تحلیل ہو کر ساری دنیا میں زہر پھیلا دے گا ——— زہر ——— زہر!!

اور پھر اسے ہر طرف [illegible] سیاہ، [illegible] فضا میں پھیل رہا ہے ——— [illegible] جا رہا۔

یہ تمام تجربہ اس کی نظر سے کیسے جا رہا ہے ——— وہ ایک منزل ہو گا جارہ کچھ نہیں ———!

در فضا میں شور مچ رہا ہے ——— دیکھو! [illegible] سفید فاختاؤں کو شکار کر رہے ہیں، یہ فاختائیں ہیں ——— انہیں بچاؤ ——— انہیں بچاؤ ——— دنیا کا امن تباہ ہو جائے گا ——— [illegible] جائے گا ——— جیسے اس کا شعور ختم ہو رہا ہے۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بچہ نہیں جن رہی بلکہ بستر پر [illegible] کر رہی ہے ——— [illegible] رگ رگ میں کھنچاؤ پیدا ہوتی اور آنکھیں پھیلنے لگیں ——— سفید فاختاؤں کے سینوں کی پھڑپھڑاہٹ پیدا ہونے لگی ——— یہ پروں کی پھڑپھڑاہٹ فاختاؤں کی نہیں، یہ تو رحمت کے فرشتوں کے پروں کی ہے۔ یہ سارا آسمان سفید سفید فرشتوں کے سفید پروں سے ڈھک گیا ہے ——— یہ باطل نہیں ——— یہ ان کی فاختائیں نہیں، یہ تو رحمت سفیدی کا روپ دھار کر آئی ہے۔

سسکتے ان کے سارے جسموں میں [illegible] کر لیا اور تکلیف کے مارے [illegible] دانت بھینچ لیے [illegible] نے جیسے آخری بار ایک لمبا سانس لیا اور خود کو سفید پروں والے فرشتے کے حوالے کر دیا ——— اور اس کا بدن خود بخود ڈھیلا ہو گیا

اس کی آنکھیں [illegible] دیکھنا چاہا [illegible] جیسے [illegible] کے تجربے کا احساس ابھی باقی تھا اس [illegible] کی چادر میں [illegible] اس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔

پھر سفید پروں والے فرشتے نے آہستہ سے جھک کر کہا "اپنے بچے کو دیکھئے۔"

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں ——— سفید ——— سفید ——— ہر چیز سفید ——— اور سامنے نرس کھڑی تھی وہ کہہ رہی تھی۔

"اپنے بچے کو دیکھو ......"

"نہیں ——— نہیں!" وہ درد بھری آواز میں چلائی "نہیں! میں اسے نہیں دیکھ سکتی ——— میں نہیں دیکھنا چاہتی!"

اور اس نے آنکھیں زور سے بند کر کے دیوانوں کی طرح رونا شروع کر دیا۔

پریت کیے دکھ ہوئے

صالحہ صدیقی

[illegible]

[illegible]

اب مجھ سے آنسو ضبط نہ ہو سکے [illegible] وہ تو شکر ہے [illegible] شہاب نے بتایا کہ وہ ایک ہفتہ ہمارے پاس [illegible] میں نے سوچا کچھ تو دل بہلے گا [illegible] اور پھر ملازمت کے چکر میں [illegible] وہ ایک ہفتہ اس کی رونق میں [illegible] گزر گیا۔ چلتے وقت اس نے مجھے ایک بڑے سے ڈبے میں طرح طرح کے پینسل اور PAINTS [illegible] اکیلی گھبراؤ گی۔ خالی وقت میں تصویریں بنایا کرو۔ تمہارے ہاتھ میں فن ہے بھابی۔"

اس کے جانے کے بعد گھر بڑا سنسان ہو گیا۔ اوپر کی منزل میں بھائی جان اور بھابی جان رہا کرتے تھے۔ بے بی سارا دن کالج میں رہتی۔ میرا کام تو بس یہ رہ گیا تھا کہ اس کے خطوں کا انتظار کرتی رہوں اور تصویریں بناتی رہوں۔ ایک دن شہاب کا خط آیا۔ لکھا تھا کہ کرسمس کی چھٹیوں میں کوئٹہ چلنا چاہیے تاکہ برفباری دیکھی جائے۔ ہمیں تو گھر میں پڑے پڑے اکتاہٹ ہو گئی تھی اس لیے سب سے زیادہ مجھے خوشی ہوئی۔ بھائی جان اور بھابی جان بھی فوراً رضامند ہو گئے اور دو دن بعد ہی ہم تینوں اور بے بی میل سے روانہ ہو گئے۔ [illegible] بھی سفر میں شریک ہو گیا۔ بڑا ہی خوبصورت موسم تھا۔ سفر بہت ہی اچھا گزرا۔ کوئٹہ کے پلیٹ فارم پر جبکہ ہمارا سامان اتر رہا تھا ایک صاحب [illegible]

اور سعادت جان سے لپٹ گئے۔ عدن پر چلا کر تڑپ کے شرم سے گھل رہے ہیں۔ ان کا سر گنجے کی طرح سفید تھا اور جسم ضرورت سے زیادہ موٹا۔ تعارف سے پتہ چلا کہ یہ بزرگ وہ رہے ہیں جن کے بارے میں ماموں کہتے ہیں اور برسوں سے جن سے ملوانے کا کہتے تھے کیسے تھکا دیتے کہ میرے بچے (ابھی بڑے) میرے ہوئے ہوتے ہوش ہی ہوش ہیں۔

عجیب تعلق تھا۔ بہت بحث کے بعد ماما جان کی ماننی پڑی اور ساتھ رہنے لگیں ان کا گھر دیکھ کر بڑی وضعداری اور بہت سلیقے سے سجا ہوا گھر تھا۔ میں بہت کام کر رہا۔ ایک چھوٹے سے ٹیلے کے سرے پر چھوٹا سا بنگلہ بنوا رکھا تھا جو پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ خاص طور پر اس نے غضب کا ایک کمرہ دیا جو ڈھلوان پر کھلتا تھا۔ اس کے آگے ننھا سا برآمدہ تھا۔ اس برآمدے سے ہم دور دور تک شاعرانہ انداز سے گھل رہے تھے۔ یہاں سے دور دور تک کا بڑا اچھا نظارہ ہوتا تھا میں نے سوچا یہاں سے برفباری کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

ماموں جان کی دو لڑکیاں تھیں۔ ماشاء اللہ حسن سے بہت... ان کے نام راشی اور نازش تھے لیکن انھیں پیار سے راشی اور نازی کہا جاتا تھا۔ راشی نازی سے دو سال بڑی تھی۔ سعادت جان اگرچہ عمر میں ماموں جان سے کہیں چھوٹے تھے لیکن ... کے دونوں ... بن گئے۔ وہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر سارا دن باغ کے کسی کونے میں بیٹھے گپ شپ میں محو رہتے۔ راشی اور نازی بڑی جلدی ہم سے گھل مل گئیں مگر مردوں کے سامنے خاص طور پر شہاب کی موجودگی میں وہ بہت کم بولتیں۔ مجھے ان کا یہ شرمیلا پن بڑا اچھا لگتا تھا۔ بھائی جان کے دل میں بھی دونوں کے ارمان جاگ رہے تھے۔ میں سوچتی تھی کہ کیسے افسانوی طریقے پر یہ ملاقات ہوئی ہے۔ اس کا وہم بھی نہ تھا کہ یوں بیٹھے بٹھائے مجھے دو بھابیاں ایسی پیاری سی مل سکتی ہیں مگر یہ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ ان میں سے کون سی اپنے شہاب کے لیے زیادہ مناسب رہے گی۔

ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ ہم رات کو شام کی چائے پی رہے تھے۔ باہر بوندا باندی ہو رہی تھی۔ کچھ ناموں کا ذکر تھا بھائی جان کو راشی نام زیادہ پسند تھا اور مجھے نازش۔ پتہ نہیں شہاب کو کیا سوجھی ایک دم بولا: "مجھے تو راشی پسند ہے۔" اس کا مطلب نام سے تھا مگر وہ اس بات کو محسوس کر کے خود ہی جھینپ گیا اور کہنے لگا: "وہ میں سمجھ رہا ... میرا مطلب ہے اس کے معنی بڑے اچھے ہیں...." یعنی مانگ ... بھائی جان نے بھی موضوع بدلنے کے لیے جھٹ اٹھ کے سیٹی میں گنگنانا شروع کر دیا مگر اتنی دیر میں راشی کا چہرہ پسینوں سے تر ہو چکا تھا۔ کسی لڑکی کا اتنا سرخ چہرہ میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ کسی بہانے اٹھ کر چلی گئی۔ شہاب کی آنکھیں شرمندگی کے مارے زمین میں گڑی جا رہی تھیں۔ بہت ہی بے تکا سا ماحول ہو گیا۔ اس کے بعد جتنی بار بھی میرا راشی سے سامنا ہوا مجھے یہی آواز گونجتی معلوم ہوتی کہ "مجھے تو راشی پسند ہے۔ مجھے تو راشی پسند ہے۔ مجھے تو راشی......"

ہماری واپسی کے دن قریب آ رہے تھے۔ برفباری زور شور سے ہو رہی تھی۔ دیکھ بھال ... گزشتہ سال کی خوشی میں ماموں جان نے بڑی شاندار پارٹی دی۔ بہت سے لوگ آئے۔ ان میں کئی نوجوان راشی اور نازی کے امیدوار بھی تھے۔ اس دن ان دونوں بہنوں نے خلاف عادت شوخ رنگ کی ساڑھیاں پہنی تھیں اور لپ اسٹک بھی لگائی ہوئی تھی۔ کسی بات پر راشی کو بے بی پر بے ساختہ پیار آ گیا۔ اس نے لپک کے گود میں اٹھا کر چوم لیا لیکن جونہی بے بی کو گود سے اتارا میں نے دیکھا کہ راشی کے ہونٹوں کے نقوش بے بی کی پیشانی پر بن گئے ہیں اس نے بھی دیکھا اور شرمندہ سی ہو کر بولی "اوہ معاف کیجئے گا۔ میں نے بے بی کا منہ گندا کر دیا۔ مجھے خیال نہیں رہا کہ......"

مگر باقی بات نسیم: میں نے جواب دیا۔

مجھے بہت تعجب ہوا۔ میں نے بہت کہا لیکن نسیم بالکل نسیم جانی پہلی اور وقت ویسا ہی مختلف سے ہو گیا تھا۔ جب سب MUSICAL CHAIRS کھیلنے لگے ایک بچیاں آکسے لے کر چلی گئی تھیں۔ سب ہی جیتا پیار دل رہا کہ کہیں بھی کرسیاں نہ ملنے۔ میں نے دیکھا شہاب کی باتوں سے کہ ان دونوں کے پاس شہاب اسکے ہی ہے کرسی سے ملی جا رہی تھی۔ جہاں کہیں ذرا شک سے گئی اور میرے پاؤں میں چپکے سے چلتے۔ میں نے غور کیا کہ شہاب سے الگ پیشانی پر پیار سے سب بچوں کا ملیں، کبھی حالات دوسروں کی گیلریوں میں ہوتی تھی۔ میں اٹھ کر وہاں سے لوٹ آئی۔ اس حاضرین دو مرتبہ بھی ہم لوگ واپس آ رہے تھے۔ پہلے سے دیکھتے رہنے لگے۔ سردی زیادہ ہونے سے پڑ رہی تھی۔ چلتے وقت نازی نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں اس کے گھر کی تصویر بنا کر بھیجوں اور وہ اس میں بعد اپنا منہ لگائے۔ میں نے وعدہ کر لیا کہ ضرور بنا دوں گی۔ وہ اس کا مطلب اچھا نہ سمجھا کر کہ یہ لگتا تھا جیسے شہاب اپنا تمام کچھ ہر رنگ کی تصویر میں چھپا آیا ہو۔ وہ بظاہر بڑا خوش تھا مگر اس کی ہنسی اس کے مذاق سب مصنوعی تھے۔ تب سے کوشش پر وہ ادھر کر چلا گیا۔ مجھے یقین ہے وہ وہ ایسے کرے جس کا کچھ ارادہ ہوگا۔ ہم گھر پہنچے تو دیکھا اس کا خط آیا۔ کہا ہے میں نے جلدی سے اس کا جواب لکھا۔ کہ ٹھیک ٹھاک کر دیا۔ سب کا انگریزی لکھنے وقت اس سے نظام تیار رکھا اور زندگی اپنے پرانے ڈھب پر چلنے لگی۔

ایک دن میں چھٹی کر کے پڑھ رہی تھی کہ بے بی گاتی ہوئی اندر گھسی۔

ڈولی ننھی دلہن کی

ممانی اچھی صورت کی

وہ ساتھ ساتھ تالیاں بجاتی جا رہی تھی۔ مجھے بڑا پیار آیا گئی۔ پاس جا کر پوچھا: تمہاری اچھی صورت والی ممانی اس وقت کیا کر رہی ہیں؟ میرا مطلب بھابی جان سے تھا۔

وہ بولی: یہاں تھوڑی ہیں!

میں نے کہا: اوپر ہوں گی نا۔ تم اوپر ہی سے تو آ رہی ہو آخر۔

بولی: واہ! وہ کراچی میں ہیں۔

میں اچھل پڑی۔ یا اللہ یہ چار سال کی بچی نے کیسے کہہ دیا۔ کیا قدرت نے اتنی سی بچی کے دل میں بھی یہ بات ڈال دی یا یہ شہاب صاحب خود کی شرارت ہے۔ ویسا بھی لگتا ہے مجھے کراچی میں گزارے ہوئے وہ سب دن یاد آ گئے خاص طور پر وہ پالتی والی شام۔ اس کے بعد مجھے نازی کی فرمائش یاد آئی۔ اس شام میں اس گھر کی تصویر بناتی رہی اور بیٹھی سوچتی رہی۔

دن گزرتے رہے۔ خزاں کے دن آ چلے تھے۔ بہت جلد شروع ہو چکی تھی۔ شہاب کا خط کبھی کبھی آ جاتا تھا البتہ ان کے خط بڑی پابندی سے مل رہے تھے۔ ستمبر ختم ہونے والا تھا۔ شاید ۲۹ تاریخ تھی۔ اس خزاں کے دن مجھے ایک خط ملا۔ یہ نازی کا تھا۔ شہاب کو میں نے جیتا ہی سے کہلا۔ کراچی سے ماموں جان نے لکھا تھا کہ رامی کی کسی کیپٹن سے منگنی ہو رہی ہے۔ ہم سب کو شرکت کی دعوت دی تھی۔ مجھ پر تو جیسے بجلی ہی آن گری۔ میں تو شب ہی رہ گئی۔ دوڑی دوڑی گئی۔ بھابی جان کو خط دکھایا۔ مسکرا کر بولیں: پہلو کیا ہوا۔ دوسری بہن کیا کم؟

"کچھ پہلے زیادہ ہی ہے۔" مجھے عمر میں پہلی دفعہ بھابی جان پر غصہ آگیا۔ مگر ان جیسی کچھ کہا نہیں۔۔۔ [illegible]
تھا۔ نہیں شہاب کے دل کی بات کی کسی کی شنوائی نہ ہوئی تھی اس لیے میں چپ رہی اور اپنے کمرے میں آگئی۔ دل چاہا دونوں [illegible]
کے بجائے اندر کہیں گھٹ کے رہ گئے۔ امی جان نے بھی کہا تھا کہ انہوں نے شگفتہ سے ایک دفعہ نام شہاب کا لیا ہے۔
اس کے بہت دنوں بعد تک شہاب کا کوئی خط نہیں آیا۔ میں انتظار ہی کرتی رہی۔ وہ [illegible] ہو گئے تو
کی چھٹیاں شروع ہو گئیں۔ میں نے شہاب کو لکھا کہ چھٹیاں ہمارے ساتھ گزارے۔ اس کا جواب آیا تو میں [illegible] اس نے
لکھا تھا کہ وہ اس سال بھی برفباری دیکھنا چاہتا ہے، کرسمس جائے گا۔ مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی مگر میرا بالکل ارادہ نہیں تھا۔ [illegible]
سے ملنا نہیں چاہتی تھی لیکن شہاب کہتے گئے کس کی منتی ہے۔ وہ خود مجھے لینے آگیا اور بہت اصرار کیا تو میں مان گئی۔ بھابی جان [illegible]
پہلے ہی ری صاحب آباد کا پروگرام بنا چکے تھے اس لیے وہ ہمارے ساتھ اس بار نہیں گئے۔

پھر سے ایک سال بعد انہی وادیوں میں ہم گھوم رہے تھے۔ امی جان نے بڑے جوش سے ہمارا استقبال کیا۔ بہت ہی خوش رہے
سٹیشن سے گھر تک کے راستہ میں ہی شہاب تذکرہ کرتے رہے کہ رانی کی منگنی ہو گئی ہے۔ مجھے رانی کو دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ مجھے
یقین سا تھا کہ صرف اپنے حجاب کی وجہ سے وہ شہاب کی محبت کا اعتراف نہ کر سکی ہوگی اور اب شہاب سے ملنے کی وجہ سے وہ چپ رہ جانے
کچھ اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی تھی۔ ہم جب وہاں پہنچے اور ٹیلے پر چڑھ رہے تھے تو شہاب کی گردن جھکی ہوئی تھی شاید وہ انہی خیالات میں ڈوبا
ہے۔ وہ سوچ رہا ہوگا کہ رانی اسے دیکھ کر کسی بہانے دوپٹہ کا پلّو آنکھوں پہ رکھ لے گی۔ اس کی مسکراہٹ پھیکی پھیکی ہوگی۔
اس کا لباس سادہ ہوگا۔ اس کی انگلی میں کوئی انگوٹھی نہ ہوگی ..... کوئی نہیں ..... خاص طور پر اس منگنی کی انگوٹھی تو قطعاً پہنی نہ ہوگی
لیکن جب چڑھائی ختم ہوئی اور ہم ان سنتروں کے پاس سے ہو کر برآمدے میں پہنچے تو وہاں سب لوگ بیٹھے گپیں ہانک رہی تھیں۔ مسکراہٹ [illegible]
جس سنترے سے رانی ٹیک لگائے بیٹھی تھی اس پر سرخ پھولوں کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ خود رانی نے سرخ رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ کاجل کی جگہ [illegible]
اس کی آنکھوں کی چمک کے سامنے ماند پڑی ہوئی تھیں۔ اس کی تیسری انگلی میں ایک بڑا سا ہیرا جگمگا رہا تھا۔ جس انداز سے اس نے وہ
ہاتھ اٹھایا اور مسکرا کر سلام کیا۔ کرنل صاحب کی چمک ہیرا انگوٹھی سے شعاعیں پھوٹیں۔ جب ہم اندر بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو پتہ چلا
کہ آج شام رانی کے منگیتر کی دعوت ہے۔ نازی نے کہا "چلئے آج ہم آپ کا ان سے بھی تعارف کرا دیں گے۔"

شام ہوئی تو شہاب چپکے سے کہیں نکل گیا۔ کیپٹن آیا۔ وہ بھی بڑا خوبصورت نوجوان تھا۔ بالکل سا [illegible] لیکن کسی بات میں
شہاب کا پاسنگ بھی نہیں یا شاید یہ صرف میرا خیال تھا۔ شاید کسی کو بھی آج میرے سینے میں [illegible] رانی ساڑھی کے پلّو سے
سر ڈھانپے شرمائی ہوئی بیٹھی تھی۔ کیپٹن کے مذاق پر چپکے چپکے ہنس رہی تھی۔ کتنی خوش نظر آ رہی تھی وہ۔ میرا دل چاہا اس کی آنکھوں میں جھانک کر
دیکھوں کیا اس کی روح بھی یونہی ہنس رہی ہے۔ کیا اسے واقعی کیپٹن بہت پسند آیا ہے یا یہ سب کو فریب دے رہی ہے۔ فریب دے رہی
اپنے آپ کو، اپنی بہن کو، کیپٹن کو، مجھ کو، شہاب کو، خود اپنے آپ کو! وہ جان بوجھ کر دھوکا کھا رہی ہے۔ اس کی روح [illegible]
کے اندر کوئی چیز ٹوٹے جا رہی ہے۔ وہ رونا چاہتی ہے مگر ہنس رہی ہے ۔۔۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ اب عقلمندی کا تقاضا یہی
ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکنا چاہا مگر وہ جھکی ہوئی تھیں۔ میرا دل چاہا میں اسے جھنجھوڑ کر پوچھوں "کیا تم واقعی خوش ہو" [illegible]
دیکھو تمہیں میری قسم سچ سچ بتا دو۔"

[illegible] برسوں کھیلی کے [illegible]
[illegible] ... [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ... [illegible]
پہلی ملاقات [illegible] گئے ——— [illegible] محبت نہیں شہر کی تلاش ہے۔

میں کھول کر اس روز [illegible] کوشش [illegible]
سامنے سرخ [illegible] کھیلی [illegible] پھر [illegible]
[illegible] سے باہر [illegible] ایک [illegible]
[illegible] کہاں [illegible] نازی [illegible] وہاں [illegible]
دیکھا تھا: کھیلی [illegible] نازی [illegible]
میں کیا ایک جھلک رہی۔ [illegible] وہاں کہ کیا کر رہا ہے؟" میں نے جلدی سے جواب دیا۔ "وقت ہی کچھ اتنا خوبصورت ہے۔"
یہ بات [illegible] نازی ڈوبتے ہوئے سورج اور سرخ آسمان کو دیکھ کر بس ذرا سا مسکرا دی۔ بیوقوف!

تھوڑی دیر بعد شہاب آگیا۔ اُف خدا! اس کا پیارا سا چہرہ کہیں سارا ساتھ ابھی نہ چھوڑ دے۔ میں تو ڈر ہی گئی۔ اس نے کھانا بھی ٹھیک سے نہ کھایا۔ وہ بہت ہی خاموش تھا۔ اتنی شدت کا احساس میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کوئی دھیرے سے اس کی پلکوں کو اگر چھو دے گا تو ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگیں گے۔ اس کی شکل بڑی کسیلی ہو رہی تھی۔

خدا خدا کر کے وہ وقت گزرا اور جب دوسری صبح طلوع ہوئی تو میں حیران ہی رہ گئی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آتا تھا۔ شہاب کی آنکھیں اگرچہ رات بھر جاگنے کی وجہ سے سُرخ ہو رہی تھیں مگر وہ اب رات والا شہاب نہ رہا تھا۔ وہ رات بھر میں بالکل بدل گیا تھا۔ وہ اپنی پرانی عادتوں پر لوٹ آیا تھا۔ بات بات پہ اس کی وہی چہلیں تھیں۔ گھر میں وہی اودھم بازی پھر سے شروع ہو گئی۔ کس قسم کا انسان ہے یہ؟ میں سوچتی رہی۔ رات بھر میں اس نے جانے کیا سوچا کیا سمجھا ——— اس کی باتوں میں وہ پہلے جیسی شوخی کہاں سے آگئی اس کے قہقہوں میں کس چیز کی جھنکار بسی آئی ہے۔ وہ کیوں اتنا خوش دکھائی دے رہا ہے۔ کیا وہ نہیں دیکھ رہا کہ اس کی نازی کسی سے منسوب ہو گئی ہے؟ کیا اسے اب اس کا دکھ نہیں؟ کیا پہلی محبت آخری نہیں ہوتی؟ آخر باتوں ہی باتوں میں میرے منہ سے نکل گیا۔ "شہاب آخر تمہیں آج ہو کیا گیا ہے؟ کیا رات کوئی خواب دیکھ لیا جس کے نتیجہ میں تمہارے چہرے پہ چمک لگ گئے؟"

بولا: "خواب؟ نہیں تو، خواب تو میں دکھاؤں گا اب۔"

"میرے منہ سے بے ساختہ نکلا: کس کو؟" اس نے پہلے نازی اور پھر نازی کو دیکھا، دونوں کی نظریں جھک گئیں۔ جانے کیوں؟ میں کچھ بھی کچھ نہیں سمجھی۔ بس اتنا ضرور دیکھا کہ نازی کی نگاہوں میں عین اسی وقت خلوص کی دھیمی دھیمی خوشبو پھوٹنے لگیں۔ وہ کچھ ایسی لڑکی تھی جو سب کو نہ جانتے ہوئے بھی عبادت کر کے خوش ہونا چاہتی ہو۔ شہاب نے میرے سوال کا مختصر سا جواب دیا۔ "دیکھتے جاؤ کیا ہوتا ہے۔"

کیا مطلب ہوا اس کا، یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکی۔

شہاب کا موڈ اس شام ایسا تھا کہ وہ بے بات کے ہی ہنسے جا رہا تھا۔ پاگلوں کی طرح بے اختیار ہنس رہا تھا۔ سب گانے کی فرمائش کر رہے تھے۔ بہت اصرار پر وہ مانا اور پھر اس نے ایک غزل شروع کی۔ یہ غزل میں شاید کبھی نہ بھول سکوں گی۔ بہت کچھ دکھ بھرے تھے۔ میں خود سمجھی نہ تھی کہ ایسے دکھ بھرے سوز میں وہ یہ غزل سنائے گا لیکن جب اس نے گانا شروع کیا تو ایسا لگا کہ دنیا جہان کا درد سمٹ کر اس کے گلے میں آ گیا ہے۔ سوز سے اس کی آواز بھاری ہوئی جاتی تھی۔ سب خاموش تھے۔ میرا دل چاہا میں اسے منع کر دوں کہ "یہ غزل مت گاؤ شہاب! خدا کے واسطے چپ ہو جاؤ۔ بس کرو شہاب اب چپ ہو جاؤ" مگر اس کو مست دیکھ کر میں خاموش رہی۔ وہ ڈوبا ہوا تھا اور گا رہا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ اگر یہ یونہی گاتا رہا تو اس کے دل کے تمام آبلے منظر عام پر آ جائیں گے۔ ان آبلوں کو چھپانے ہی کے لیے تو وہ ظاہرا اتنا خوش بنا ہوا تھا۔ اس نے ٹھان لیا تھا کہ ان آبلوں کو چھپائے چھپائے پھرے گا۔ کسی کو خبر نہیں ہونے دے گا کہ ان ہنستی ہوئی آنکھوں کے پیچھے کیسے کیسے طوفان اٹھ چکے ہیں اور اٹھا کرتے ہیں مگر اس وقت وہ خواہ مخواہ جذباتی ہونے لگا۔ وہ بہت ادرہا تھا۔ میرا دل چاہا اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دوں۔ سب کے کانوں میں انگلیاں دے دوں۔ اس کے ذہن سے غزل کے الفاظ چرا لوں۔ میں پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ آخر میں نے اس کے ساتھ گانا شروع کر دیا۔

لکڑی جلے بن کوئلہ ہوئے کوئلہ جلے بن راکھ
ہم پاپی کچھ ایسے جلے کوئلہ بنے نہ راکھ

اس شعر پہ وہ ایک دم رک گیا۔ شاید اسے احساس ہو گیا کہ وہ کوئی غلطی کر رہا ہے۔ جذبات کی رو میں جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ وہ نازی کی طرف دیکھنے لگا جو آتش دان میں جلتی ہوئی آگ کو گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ آگ کی تپش سے اس کے گال تمتما رہے تھے۔ شہاب اب سنبھل چکا تھا۔ بولا،

"آپا! تم نے نازی کی فرمائش ابھی پوری کی یا نہیں۔ وہ تصویر والی؟"

میں نے جواب دیا "ہاں بھئی بن گئی ہے مگر میں لانا بھول گئی۔"

شہاب بولا "کوئی بات نہیں نازی۔ میں اگلے ہفتے پھر کوئٹہ آؤں گا تب لے آؤں گا۔" اور نازی اسے مشکور نظروں سے دیکھنے لگی۔ جانے کن سے تاثرات چھپانے کے لیے رانی نے منہ پھیر لیا۔

دوسری شام بے وجہ ہی اداسی پھیلی جا رہی تھی۔ میں نے جب یہ بات کہی تو شہاب بولا "اس کی روک تھام یہی ہے چلئے سب پکچر دیکھنے چلتے ہیں۔"

میں نے جان کر بہانہ بنا دیا کیونکہ میں جانا نہیں چاہتی تھی۔ رانی نے کہا کہ اس کے سر میں شدت کا درد ہے ـــ کیا واقعی اس کے سر میں درد تھا؟ نازی اور شہاب پکچر دیکھنے چلے گئے۔ اس دن نازی نے آتشی رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔ میرا دل چاہا یہ اور بھی زیادہ پیارے لگیں اور میں شہاب سے کہوں "دیکھو شہاب نازی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھو ان میں کیا ہوتا جا رہا ہے۔"

دوسرے دن ہم لوگ تاش کھیل رہے تھے۔ میں نے جھٹ رانی کو پارٹنر بنا لیا۔ مجبوراً نازی اور شہاب پارٹنر بنے۔ وہ

دو دن عید سے پہلے مشغول رہے۔ دن بہت ہی جلدی سے گزر گئے۔ [illegible] میں نے بہت [illegible]
کیا شکوہ وہ دن بھی گزر گئے۔ آخر میں نے اسے شاپنگ شروع کروا دی۔ جو ایک [illegible] تھا [illegible] اور بھی وہ تھی۔

شہاب بولا: کیا آنسو بہا آسمان کا غم ہے یا کوئی چاند کا گل؟

میں نے چونک کر شہاب کی طرف دیکھا۔

تیسرے دن ہم لوگ ٹہلنے گئے ہوئے تھے ساتھ نازی شہاب اور میں۔ ایک دکان پر ایک کھلونا [illegible] دیکھ کر شہاب نے کہا: نازی یہ شال لے لو۔ اور وہ نازی نے بغیر جواب دیے ہی [illegible]۔ اگلی دکان سے اس نے ایک [illegible] خریدا اور نازی کو دے کر بولا: لو یہ تم پہن لو ——— نا! بابا میں احسان کسی کا نہیں لیتا۔

مجھے شہاب کی اس بھولی چالاکی پر بہت ہنسی آئی۔ پتا نہیں کہ وہ ورنہ [illegible] تو کیوں کرتی چھوڑ دینے کو۔ اس سے پوچھا وہ سمجھ رہا تھا ——— لیکن اس نے ساتھ اور میرے سامنے ایسا احسان کیوں کیا ——— ؟

پورے نو دن بعد ہم لوگ واپس آ رہے تھے۔ رخصت کے وقت نازی کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے اور جب ٹرین چلی تو میں نے دیکھا کہ شہاب رو رہا تھا۔ میں نے چاہا اس سے پوچھوں: کیوں رو رہے ہو شہاب؟ مگر وہ خود ہی بولا: "تم نے شیشہ چھاڑی کر دیکھا تھا آپا؟ اس نے میری ہی دی ہوئی ساڑھی پہن رکھی تھی آپا!"

"ہاں شہاب!" میں نے جواب دیا۔

"اور وہ چاندی کی بالیاں بھی پہنے ہوئے جو اسے دلوائی تھیں اور آپا وہ جھمکا بھی تو ......" اس کا گلا رندھا ہوا تھا۔

"ہاں ہاں شہاب میں نے دیکھا تھا ——— اس کے جوڑے میں تمہارے پسندیدہ پھولوں کا گجرا بھی تو تھا۔" خوشی سے میرا سانس پھولنے لگا۔ اب شہاب کا علاج آسان تھا مگر وہ رو کیوں رہا ہے شاید جدائی کا صدمہ ہو گا۔ خیر اب میں کچھ ایسا کروں گی کہ یہ کبھی جدا نہ ہوں۔ پھر میرا شہاب کبھی نہیں روئے گا۔ میں نے اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔ "ہاں شہاب اسے تمہارا بہت خیال ہے۔ وہ تمہارے تحفے بڑے سنبھال سنبھال کر رکھتی ہے۔ خاص خاص موقعوں پر پہنتی ہے۔ تمہارے ساتھ جانے پر کبھی انکار نہیں کرتی اور ...."

"بس بس آپا یہ سب نہ کہو۔"

"پھر رو کیوں رہے ہو پگلے؟"

"اس لیے نہیں کہ مجھے اس سے محبت ہے یا اس لیے نہیں کہ ہم جدا ہو رہے ہیں بلکہ اس لیے کہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے آپا ——— قسم خدا کی آپا۔ یہ سب تحفے میں نے فریب دینے کے لیے دیے تھے۔ میں سب کو فریب دے رہا تھا خاص کر آپ کو۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ایسا لگا جیسے کسی نے میرے منہ پر طمانچہ مار کر مجھے اونچائی سے دھکیل دیا ہو۔ "کیا بکتے ہو شہاب! کیا تمہیں نازی اچھی نہیں لگتی؟" میں زور سے چیخی۔

"نہیں بالکل نہیں۔" وہ دھیرے سے بولا۔

میرا دل چاہا میں اس کے بال نوچ لوں، اس کا چہرہ لہولہان کر دوں۔ ظالم رہا، مگر جب میں اس کے قریب پہنچی تو میں پگھل گئی اور صرف اتنا کہہ سکی۔

"شہاب! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ تم نے بہت برا کیا، بہت برا کیا۔ سوچو تو اتنی پیاری بچی کی [illegible] کو نہیں ناری کو بھی [illegible] کر رہا ہے۔ ناری بیچاری کا کیا قصور، وہ تو ایک [illegible] کی خدمت ہی کیا کرتی تھی شہاب۔ آخر کچھ تو سوچو۔۔۔؟

بولو تم نے یہ کیا کیا؟" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگی۔

ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ میں اسے بچوں کی طرح سینے سے لگا کر پیار کرنے لگی۔ واقعی ٹھیک ہی تو کہتا تھا، وہ تو بیچارہ کیا کرتا، اور پھر میں بولو کیا کرتا؟ "مجھے ایسا لگا تھا [illegible] کی گڑگڑاہٹ [illegible] گا رہا ہے۔" "بہت کیسے [illegible]؟" کیا شہاب گا رہا تھا، کیا یہ [illegible] گا رہی تھی، یا کیا یہ ناری گا رہی تھی؟

آپا

محمد طفیل

میں ابھی دفتر پہنچا ہی تھا کہ ایک تانگہ آ کر رکا۔ اس پر سے آواز دے کر پوچھا: "طفیل صاحب یہیں ہیں؟"

دفتر کے منشی نے جواب دیا: "جی ہیں"

ملازم نے جا کر تانگے میں بیٹھی ہوئی خواتین سے کہا: "ہیں"

ان میں سے ایک صاحبہ نے کہا: "بلاؤ"

ملازم نے آ کر کہا: "بی بی بلاتی ہیں"

میں نے کہا: "عرض کر دیجئے خود ہی تشریف لائیں"

چنانچہ تانگے پر سے دو مستورات اتریں۔ ایک برقعہ میں تھیں اور ایک بغیر برقعے کے۔ بے پردہ خاتون نے تعارف کرایا: "میں شکیلہ ہوں"

"آداب" ــــــ اور بڑی حیرت سے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا۔ حالانکہ پردہ دار خاتون سے مصافحہ کرنا عجیب تھا۔ مگر میں نہ جانے یوں کرنے پر کیوں مجبور ہوا۔

شکیلہ نے تعارف کرایا: "یہ شملہ کی سہیلی رضیہ ہیں۔"

شکیلہ کون ہیں۔ پہلے یہ بتا دوں۔ پھر آگے چلوں ــــــ شکیلہ میری منہ بولی بہن ہیں اور مشہور افسانہ نویس۔ برسوں سے ہم ملتے تھے مگر آمنا سامنا پہلی بار ہوا۔

اب شکوے! "آپ وقت مقررہ پر پاکستان کیوں نہیں پہنچیں جو تاریخ آپ نے لکھی تھی۔ اس دن میں اسٹیشن پر گیا تھا تاکہ کسٹم وسٹم کے چکر میں آپ کو زیادہ پریشان نہ ہونا پڑے۔ مگر آپ نہ آئیں۔ آج آئیں بھی تو بغیر اطلاع کے۔"

"میں چاہتی تھی کہ بغیر اطلاع کے پہنچوں۔"

"آخر کیوں؟"

"اچانک ملاقات پر زیادہ خوشی ہوتی ہے نا!"

"ہوتی ہو گی ــــــ" یہ تھا شکیلہ کی سادگی کا پہلا وار جو کھا گیا۔ میں نے سوچا اگر شکیلہ مجھے بتا کر آتیں، اسٹیشن پر ملتیں تو شاید بھائی بھی اپنی بہن سے ملنے کا حق ادا کر سکتا۔ مگر اس وقت میں چپ ہی رہ گیا۔

رضیہ کہنے لگیں "ہم آپ کا مکان ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک گئی ہیں۔ ہم سے ڈھونڈ ڈھونڈ رہی ہیں کہ آخر شاہد احمد ایک نے کونسا چھاپا مارا ہے۔"

"ٹیلیفون کر لیا ہوتا۔"

"وہ بھی کیا تھا۔ کوئی صاحب بولے کہ شاہد صاحب بھی آنے ہی والے ہیں۔ رہیے رہیے، جہاں سے آپ بول رہی ہیں۔ ——مجبوراً ادھر آئی ہیں۔"

"اچھا تو پھر چلیے گھر۔"

چنانچہ ہم اسی تانگہ پر گھر کی طرف چلے۔ راستے میں شکیلہ نے بتایا۔ رضیہ کہتی تھیں۔ تمہارا بھائی ڈھونڈے گھر کا جو پتہ بتایا وہاں تو وہ رہتے نہیں۔ اس لیے واپس چلو۔"

میں نے ہنس کر کہا "یہ رضیہ کا اندازہ غلط نہیں۔"

گھر کے پاس آکر میں نے تانگہ رکوایا تو رضیہ اور شکیلہ کے منہ سے مارے حیرت کے یک ساتھ نکلا "ارے!"

"کیا بات ہے؟"

"یہیں گھر ہے۔ ہم کو جس نے آپ کا پوچھا تھا۔ مگر کسی نے بتایا ہی نہیں۔ یہ جو آپ کے مکان کی بغل میں ڈاکٹر صاحب ہیں۔ یہ تو کہتے تھے یہ فضیل صاحب ہی دروازے میں رہتے ہیں۔"

"اچھا!"

"جی ہاں۔"

"قصہ یہ ہے۔ میں کسی سے بولتا نہیں ہوں۔ شام آیا، صبح چلا گیا۔ یہ سب لوگ مجھے صورتاً جانتے ہیں مگر کسی کو یہ معلوم نہیں۔ میں کون ہوں۔ کیا کرتا ہوں۔ کیا نام ہے۔"

شکیلہ نے کہا "آپ نے اپنے نام کی تختی ہی لگائی ہوتی۔"

"یہ سمجھ کے نہیں لگائی۔ اس سے ذرا شان ٹپکتی ہے اور میں اسے پسند نہیں کرتا۔"

"شان ٹپکتی ہے تو ٹپکے۔ ہم ایسے لوگوں کا تو برا حال نہ ہو۔"

سامان اوپر آیا۔ شکیلہ نے ایکدم گھوم کر سارے کمرے دیکھ ڈالے۔ بڑی اترا کر رضیہ سے کہہ رہی تھیں۔ میرے بھائی کے پاس دو دو ریڈیو سیٹ ہیں۔ دو صوفہ سیٹ ہیں۔ یہ دیکھو الماری کتنی خوبصورت ہے۔ تصویریں دیکھو کتنی شاندار ہیں۔ غالباً یہ چغتائی کی ہے۔ غرض شکیلہ رضیہ سے بڑی شان میں باتیں کر رہی تھیں کہ میرا بھائی یہ ہے اور میرا بھائی وہ ہے اور رضیہ ہیں نہ مانوں۔ میں نہ مانوں کی تفسیر بنی شکیلہ کو چھیڑ رہی تھیں۔

میں نے اندازہ لگایا۔ شکیلہ میں اتنی معصومیت ہے کہ بالکل بچی معلوم ہوتی ہے۔

شکیلہ بڑی گپ باز ہیں۔ اتنی کہ میں نے اپنی زندگی میں اتنی گپ باز خاتون کوئی نہیں دیکھی۔ مردوں میں بھی کوئی نہ دیکھا۔ گھنٹوں ہی بول سکتی ہیں۔ ایک بات ماننی پڑتی ہے کہ ان کی باتیں بور قسم کی نہیں ہوتیں۔ بلا کے ہی بھلاوے ہوتی ہیں۔ جس میں خلوص، معصومیت اور بیوقوفی سبھی کچھ شامل ہوتا ہے۔ اگر خلوص، معصومیت اور بیوقوفی (وہ آدمی شریف ہی نہیں جو بقدر ضرورت بیوقوف نہ ہو) میں سے ایک چیز

جو کچھ بھی تو شکیلہ کی باتوں میں تھی مل گئی تھی، وہ نئی چیز مجھ سے چھن جاتی۔

اب بھی جب کہ شکیلہ بڑی ہو گئی ہے اس کی باتوں میں صرف بہت، ... جب ملاقات کبھی ہو جاتی ہے تو بجا کر شکیلہ پوچھتی ہیں: "اچھی کیسی ہو؟"

"بس ہوں"

"میں جو کچھ کہوں، سچی؟"

"سب یہی کہو کہ ... یہی ضمیر"

"میری باتیں تم سے سنو، روز میرا تم سے پاس آنا ... میں نہیں دیکھنے کے لیے اتنی نفرت سے ... وقت گھر سے نکلنے سے پہلے پوچھتی ہیں: کیا میری باتیں تمہیں بری لگتی ہیں؟"

"نہیں تو، نہیں۔ بالکل نہیں۔"

ایک بار انھوں نے میری اس حرکت پر اپنی باتوں کا سلسلہ منقطع کر دیا اور میرے بازو پکڑ کر ... سے کچھ کہا۔ مجھے محسوس ہوا۔ جیسے دماغ کی کھڑکیاں ایک ساتھ دروازے بند ہو گئے ہوں۔

ایک دن میں نے ... کی باتیں سنیں۔ عجیب باتیں تھیں وہ، میری چوری سے کہہ رہی تھیں۔ چوری میں بڑا مزا ہے۔

"مگر میں اس مزے سے ناآشنا ہوں۔"

"ہائے ہائے بڑے مزے ہیں۔"

"اچھا"

"تو میں چوری کیا کرو"

"سب مجھے خود ہی سب کچھ مل جاتا ہے تو میں کیوں چوری کروں؟"

"مانا کہ ہزار روپیہ اپنے ہاتھ سے دے دے مگر اس کی ایک پائی چرانے میں ہزار روپوں سے زیادہ کا لطف ہے۔"

"یہ بات ہے تو میں بھی چرایا کروں گی۔"

"ہاں ہاں ضرور!"

"اختر صاحب کو میری چوریوں کا سب علم ہے۔ وہ مجھ سے چھپا چھپا کے روپے رکھتے ہیں۔ تنخواہ لا کر تو مجھی کو دیتے ہیں۔ البتہ کتابوں کی رائلٹی یا امتحانوں کے پرچوں سے جتنا روپیہ آتا ہے۔ وہ مجھ سے چھپا کر رکھتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوا۔ انھوں نے روپے رکھے ہم نے موقع پا کر چرا لیے۔ گھر میں شور مچ گیا۔ میرے روپے کس نے چرائے ہیں۔ میں انجان سی بن کر کہتی: پتہ نہیں کس کم بخت نے چرا لیے۔

ایک بار، اختر صاحب کو پرچوں کی جانچ کا روپیہ آیا۔ فوراً ہی ان کے باہر جانے کا پروگرام بن گیا۔ انھوں نے نوٹ گن کر لفافے میں رکھ دیے اور لفافے کے اوپر لکھ دیا کہ اتنے روپے رکھے ہیں اور تالا بند کر کے چابی ساتھ لے گئے۔

میں نے ان کے جانے کے بعد تالے کو چابی لگوائی۔ دس دس کے تین نوٹ نکال مزے کرتی رہی۔ اختر صاحب واپس آئے

تو پھر ضرور ہی گیا۔ وہ یہ کس نے چرائے ہیں۔ ہم نے سب عادت کر دیا۔ ہمیں یہ خبر آپ ہی بھول گئے ہوں گے۔"
کہنے لگے تو روز کر رہی ہے کہ میں بھول جاتا ہوں۔ اب سے تو میں نے اپنے پہ غصہ کر لیا تھا کہ اتنے سال ہو گئے۔ اب تک یہ بھول گیا۔"

شامت اعمال میری بھی بھانجی آ نکلی۔ اختر صاحب نے اس سے بھی پوچھا۔ میں سمجھتی تھی یہ ذرا سی بچی ہے۔ اسے کیا خبر مگر اُس نے توتلی زبان میں میری طرف اشارہ کر کے بتا ہی دیا ماموں نے چرائے ہیں:

اتنی ہی باتیں ہو پائی تھیں کہ میں شیو کر کے باتھ روم سے کمرے میں گیا اور پوچھا: کیا باتیں ہو رہی تھیں؟

دونوں ہنس پڑیں اور ہنستی ہی چلی گئیں۔

شکیلہ کا بیٹا کوئی بچہ نہیں۔ اولاد کے غم نے بیچاری کو نڈھال کر رکھا ہے۔ بات بات پر رو دیتی ہیں۔ شکیلہ اپنی ذات میں اگر ایک طرف دلچسپیوں کا مرقع ہیں تو دوسری طرف غموں کی پوٹ بھی۔ آنسو دو خاطری کی کوئی ذرا سی بھی بات ہو جائے تو پہروں گم ہی گم۔

شکیلہ اپنی زندگی سے بڑی بیزار ہیں اور ساتھ ہی اتنی بے احتیاط کہ مصیبتوں کو خود دعوت دیتی ہیں۔ دکھ بھی دکھ جو جیسے مالی نہیں، ذہنی دکھ۔ شادی کے فوراً بعد اختر صاحب بیمار ہو گئے تھے۔ بیماری بھی مہلک۔ اختر صاحب ہسپتال داخل ہوئے تو یہ بھی چوبیس گھنٹے وہاں موجود۔ ڈاکٹر منع کرتے تھے۔ مگر یہ نہ مانتی تھیں۔ کہتی تھیں شوہر کے بعد خود جی کر کیا کروں گی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی زندگی ختم کرنے کی ایک ترکیب سوچی وہ یہ کہ پاس کی وارڈ میں جو سب سے خطرناک مریضہ تھیں۔ ان کی تیمارداری میں دن رات جٹی رہتیں۔ اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیتیں، ساتھ لیٹ جاتیں۔ مریضہ حیران کہ لوگ مجھ سے دور بھاگتے ہیں۔ مگر یہ ہیں کہ یوں مجھ پہ قربان ہیں۔ بات ہی عجیب تھی۔ کہ موت کے کنارے کھڑے ہونے والے لوگ صحت کو ترس رہے تھے اور جو صحت مند تھے۔ وہ موت چاہتے تھے۔

شکیلہ کو پھولوں کا بے حد شوق ہے۔ انھوں نے گھر پہ طرح طرح کے پھول لگا رکھے ہیں۔ دن رات ان کی دیکھ بھال کرتی رہتی ہیں اور خوش رہتی ہیں۔ انھیں اس حد تک پھول خبط ہے کہ اختر صاحب سے بھی بھڑ جاتی ہیں۔ وہ ضرور سوچتے ہوں گے کہ کسی بھی چیز سے اتنا پیار اچھا نہیں ہو سکتا۔

ایک دن ہم لارنس گارڈن گئے۔ بہار کے دن، پھول اپنے جوبن پر۔ شکیلہ انھیں دیکھ کر کھل اٹھیں۔ باغ کی اور پھولوں کی بیحد تعریف کرتی رہیں، جھومے جا رہی تھیں۔ ایک جگہ رک کر پوچھنے لگیں "یہ طفیل اس پھول کا نام بتاؤ!"

"مجھے کیا معلوم"

"اس کا یہ نام ہے"

"بھلا اس کا؟"

"بھئی مجھے کچھ پتہ نہیں"

"اچھا تو جناب نرے ایڈیٹر ہی ہیں"

"جتنی دیر ہم باغ میں رہے۔ شکیلہ نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ یہ پھول فلاں ہے۔ یہ پھول فلاں ہے۔ یہ پھول ہمارے ہاں بھی ہیں۔ ان پھولوں کی خوشبو بڑی اچھی ہوتی ہے۔ یہ پھول بڑا نازک ہوتا ہے۔ یہ پھول بہت کم ہوتے ہیں ——— اخاہ یہ پھول کتنے خوبصورت

میں نے لکھا تھا:

[illegible]

میں نے پوچھا: "آپ لوگ کہیں چل رہے ہیں؟"

"ہے تو"

"کون سا؟"

"[illegible]"

میں اپنے انداز سے جھنجھلا کر سوال بے معنی ہو گئی۔

"بھئی پہنچے کیوں جا رہے ہو؟"

"مجھے آپ چال کہہ رہی ہیں۔ وہ تو تو کا بہانہ ہیں۔"

"اچھا"

اچھا سے ایک بات یاد آئی۔ شکیلہ آپا کی گفتگو میں "جی" اور "اچھا" ہے۔ بجائے اس کے "اچھا" کم یہ بات [illegible] کر بار بار کھینچ کے بولتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ شبہ ہوتا ہے جیسے یہ ترنم میں کچھ کر رہے ہوں۔

اب آپ ان کی گفتگو سنیں۔

"صبح جاگ کر کہا صبح اٹھی تو طبیعت خراب سی تھی۔ تھوڑی سی [illegible] ہم بچا۔ وہ پھر لوگ کا ناشتہ نہیں کھایا۔ تم بتا؟"

اب اس شعر کا دوسرا مصرعہ سنیے۔ جب یہ کسی کی گفتگو سنتی ہیں تو یوں سانس دیتی ہیں "اچھا" کے لفظ کو خوب کھینچ کے پڑھنے کا۔

"اچھا" صرف ان کا ہم قافیہ ہے۔ باقی سب مخاطب کا۔

"میں صبح دفتر گیا۔ اچھا ___ دیکھا تو فلاں دوست بیٹھا ہے۔ اچھا ___ میں نے کہا بھئی ہمارا یہ کام جلدی کرا دو۔ اچھا ___"

جب یہ خود بول رہی ہوں تو پھر کسی کی مجال نہیں کہ وہ بیچ میں بول سکے (کم از کم میری تو مجال نہیں) جب کوئی دوسرا بول رہا ہو۔ پھر بھی کسی کی مجال نہیں کہ وہ ہر فقرے کے بعد "اچھا" سنے بغیر آگے بڑھ سکے۔ انھیں باتیں سننے کا شوق ہے۔ باتیں کرنے کا شوق ہے۔ سنانے کا زیادہ، سننے کا کم، اور ہر میں ایسا ہو نہ سننے کا شوق، نہ سنانے کا۔ میرا خیال ہے شکیلہ مجھ سے مل کر قطعاً خوش نہ ہوئی ہوں گی۔

ایک رات میرے چھوٹے بھائی کو یہ سوجھی کہ کل شکیلہ آپا چلی جائیں گی۔ اس لیے آج کی رات جاگ کر کاٹی جائے۔ پہلے بھی رات کو گیارہ بارہ بجے تک باتوں کا سلسلہ رہتا تھا۔ اس لیے میں نے ناک چڑھا دی۔

بھائی نے کہا: "تاش کا پروگرام رہے۔"

شکیلہ بولیں "تو ہم جا! طفیل آج تماش ہوگی"

"مجھے نہیں آتی (مہر شکیلہ ہی کے انداز میں ہنسنے کے ساتھ) ہم بھی"

بہرحال دھر بیٹے گئے۔ بڑی سمجھ دار شکیلہ (مجھ سے سات برس بڑی ہیں) انکار نہ ہو سکا۔ بیٹھ گئے۔ میں اور میرا بھائی پارٹنر، شکیلہ اور میری بھابی پارٹنر، خوب خوب ہاتھ پھینے۔ شکیلہ کو یہ گھمنڈ تھا: میں عمدہ کھیلنے والی ہوں۔ اس لیے مجھ سے مقابلہ میں کوئی نہیں جیتے گا۔ ادھر اپنی قسمت میں کسی بھی معاملے میں ہارنا لکھا ہی نہیں۔ اس لیے مات ہوتی تو کیسے ہوتی۔

شکیلہ اور میری بھابی کا جیتے جیتے برا حال ہو گیا۔ بارہ بج گئے۔ ایک بج گیا۔ دو بج گئے۔ شکیلہ نے اپنی کارستانی دوسروں پر شروع کر دی۔ میں جمائیوں پر جمائیاں لے رہا تھا۔ مگر ان بیٹھنے والی اللہ کی بندیوں نے مجھ پر ترس نہ کھایا۔ ماہم، میں نے بیگم کو آواز دی۔

"اسے نیک بخت چائے بنا کر پلا دے"

"میں نہیں اٹھ سکتی"

"اری اٹھ جا جنت میں مکان ملے گا"

"مجھے نہیں چاہیے۔ جنت میں مکان!"

"یہ دیکھو سو روپیہ البطور انعام دے رہے ہیں اگر اس وقت اٹھ کر چائے بنا دے"

"مجھے نہیں چاہیے سو روپیہ"

شکیلہ بولیں۔ "اری کم بخت سو روپیہ مل رہا ہے۔ اٹھ کر جلدی سے چائے بنا دے۔ اگر طفیل مجھے دس روپے دینے کا وعدہ کریں تو ابھی اٹھ کر چائے بنا دوں"

خیر چائے دو دس روپے لینے والی نے بنائی، نہ سو روپیہ پانے والی نے۔ ہم کھیلتے رہے اور صبح تک کھیلتے رہے۔

شکیلہ کو کھانے پینے کی چیزوں سے قطعاً دلچسپی نہیں۔ چیزیں ان کے سامنے رکھ دیجئے، قطعاً لطف اندوز نہ ہوں گی۔ کھائیں گی تو وہ بھی اتنا، جتنا کہ ایک برس کا بچہ بغیر ڈکار لیے کھائے۔

ایک دن یہ مجھ سے کہنے لگیں: "طفیل آج بہت زیادہ کھا لیا ہے۔ کباب اچھے تھے۔ سالن بھی مزے دار تھا"

"چلو اچھا ہوا آج آپ نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا"

"بلکہ آج تو دو دن کا اکٹھا کھا لیا"

"آخر کتنا کھایا؟"

"بھئی ڈیڑھ چپاتی کھا گئے"

کھانے کا حال تو آپ نے سن لیا۔ اب ذرا چلنے پھرنے کا بھی حال سن لیں ۔۔۔ "آج ہم بہت پیدل چلے۔ بہت پیدل چلے۔ بس تھک گئے"

"آخر کے میل؟"

"بھئی ہم انارکلی کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پیدل ہی تو چلتے چلے گئے"

[illegible] کہیں اور لکھ جائے۔ [illegible] ہے۔ [illegible] [illegible] [illegible] کہ نقاد [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بات کہتا ہے [illegible] [illegible] تنقید کرتے اور [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بہت کم [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] جب بولتی ہے، بولتی ہے: صحت۔ (جمیلہ ہاشمی کی؟)

میں نے پوچھا: "آپ صحت بہ نام نہیں لیا؟"

"جی، بہ کیا ہیں؟"

"نہ غائب ہیں"

"ہاں وہ خواتین، وہ تو ہیں۔ مگر افسانہ نگار بھی ہیں؟"

"جس طرح آپ خاتون ہیں اور افسانہ نگار بھی ہیں۔ اسی طرح باقی افسانہ نگار خواتین ہیں۔ کچھ نقادوں نے کہہ دیا ہے کہ ہم عورت ہیں، افسانہ نگار نہیں ہیں۔ اس لیے ہمارا تذکرہ افسانہ نگار خواتین کے ساتھ نہ کیا جائے۔"

"یہ بات ہے تو کیا صحت، (ہاجرہ)، اور خدیجہ نے نقادوں سے کہا ہے کہ ہم افسانہ نگار ہیں؟"

"ہاں ہاں انھوں نے مزید کہا ہے کہ نقادوں کو پتہ رہے کہ خواتین بھی افسانہ نگار ہو سکتی ہیں۔ یہ لوگ کان سے کم بہرے ہیں، ذہن سے نہیں۔"

"اب دیکھیے جیلانی بانو کتنے اچھے افسانے لکھتی ہے۔ مگر نقاد چپ ہیں۔ بولیں گے تو اتنے کہ نئی لکھنے والی جیلانی بانو بھی ہے ——— بس بس!"

میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے۔ خواہ کوئی کتنا ہی باتونی کیوں نہ ہو۔ شکیلہ کو اس سے یہی شکوہ ہوگا کہ آپ بڑے چپ چپ رہتے ہیں ——— چنانچہ ایک دن مجھ سے ——— مجھے یہ پتہ نہ تھا کہ آپ بالکل چپ شاہ ہیں۔ آپ کی خاموشی نے تو مجھے بالکل بور کر کے رکھ دیا ہے۔ اب یوں کیجیے کہ ہم گھڑی سامنے رکھ کر باتیں کریں گے۔ ایک گھنٹہ تم بولو۔ ایک گھنٹہ میں بولوں گی۔

میں نے سراسیمہ ہو کر اس کے جواب میں کہا تھا: "آپا آپ ہی بولتی جائیں۔ مجھے حالات نے بولنا سکھایا ہی نہیں۔"

"اب تو آپ کے حالات بڑے اچھے ہیں۔"

"میں ماضی کی بات کرتا ہوں۔ بچپن ہی میں آدمی بولنا سیکھتا ہے۔"

"اب چھوڑو بھی ماضی کو۔"

"جس دن میں نے ماضی کو پیش نظر نہ رکھا۔ اس دن میری موت واقع ہو جائے گی۔"

"چلو ہٹو۔ بکواس نہ کرو۔"

"پھر یہ سب حالات بھی کل سے زیادہ اچھے ہیں؟"

"صرف یہ سب یہاں ہم تم؟"

اس طرح باتوں باتوں میں شکیلہ نے بتایا کہ اس سے یہاں تک کہ وہ قیمتی ملتے ہیں وہ سب اپنے بچوں کو جو اب بھی وہ شو ہوں اس لیے کہ ان میں بس گیا ہے۔ خلوص ہے۔ کوئی اور وجہ ہے کہ کر آ دیکھے میری غیرت کا کیا یہ حق نہیں بنتا۔

میں نے سنا تھا کہ شکیلہ نے اپنی شادی کے زمانے، اپنا سارا زیور بکا دو یتیم بچوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ یہ بات اپنی جگہ پسند کی ہے، اس لیے کہ آج کل ایسے لوگ کہاں، یہ بات تو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی تھی۔

میں نے باتوں باتوں میں شکیلہ سے پوچھا تھا آج کل آپ کے من بھاتے مشاغل کون کون سے ہیں جواب ملا۔ یوں تو کچھ نہیں ـــــ مگر گھر جا کر چندہ ضرور اکٹھا کرتی ہوں۔

"کس لیے؟"

اس لیے تاکہ اُردو کے چند ایک اسکول چلائے جا سکیں۔ اگر ادھر توجہ نہ دی گئی تو پھر پندرہ بیس برس کے بعد یہاں اُردو جاننے والا کوئی نہ ہو گا۔

یہ بھی باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ ان کے ہاں قیمتی چیز کوئی نہیں۔ اس لیے کہ ضرورت مند لوگ میاں بیوی کو گھیرے رہتے ہیں۔ نقد روپیہ ایسے معقول خرچ " لوگوں کے پاس رہتا کہاں ہے۔ جو ان کے پاس رہتا۔ اس لیے جتنا بھی قیمتی سامان تھا۔ وہ بھی سب کام آگیا۔

استاد دردمند دل، جو غریبوں اور محتاجوں کے لیے عملی ہمدردی رکھتا ہو کسی اور کو کاہے کو نصیب ہوا ہو گا ـــ ایک دن اخبار سامنے آیا تو میں نے جلی جلی سرخیاں دیکھ کر چھوڑ دیا۔ انھوں نے پڑھا تو مجھ سے کہا یہ بھی کچھ پڑھا؟"

"کیا؟"

"تو سنو :ـ

"ایک جوڈیشل مجسٹریٹ کے بارے میں خبر آئی ہے کہ انھوں نے شقاوت و بربریت کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ مجسٹریٹ صاحب ایک روز سو کر جو اٹھے تو ان کے ہاتھ کی گھڑی گم تھی۔ بہت تلاش کی گئی۔ لیکن گھڑی نہ ملی۔ مجسٹریٹ صاحب کو اپنے گھر کی ملازمہ پر چوری کا شبہ ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اس کو اتنی بے دردی سے مارا کہ وہ اپنی جان بچانے کی خاطر، اپنے تین چھوٹے چھوٹے بچوں کو گھر ہی میں چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ مجسٹریٹ صاحب نے نوکرانی کے بھاگ جانے پر اس کے تینوں بچوں کو تختۂ مشق بنانا شروع کیا اور اس اقبالِ جرم کی مہم میں ایک مقامی تھانیدار کی امداد بھی حاصل کر لی۔ ان بچوں کی پٹائی سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو ان کے اختراع پسند ذہن نے ایک انتہائی وحشیانہ سزا ایجاد کی کہ تینوں بچوں کے جسم میں کیلیں ٹھونکنی شروع کر دیں۔ بچوں کی عمریں علی الترتیب سات سال، پانچ سال اور تین سال تھیں۔ بچے اس سزا کی تاب نہ لا کر چیخیں مارتے مارتے

[illegible] گئے [illegible] کے [illegible] میں
[illegible] بھی [illegible] ایک [illegible]
[illegible] ہسپتال [illegible] ہسپتال [illegible]
[illegible] سات [illegible] کے [illegible] کے

[illegible] گزر [illegible]

[illegible] تو یہ [illegible] ہو گئی۔

[illegible] ہے۔

[illegible] سے [illegible] کے

سے [illegible] ہوئی۔

صبح ہوئی شکیلہ کو [illegible] جانا تھا۔ [illegible] صبح ہی صبح شور مچا شروع کر دیا۔ جلدی جلدی [illegible] اور پھر جلدی ہی [illegible] میں واپس جا رہی ہوں [illegible] جاؤں [illegible] جانے کے بعد [illegible] گیا۔ جانے کیوں نہیں!

مجھ پر [illegible] تھا کہ [illegible] آج نہ جاؤں [illegible] گھر کے [illegible] شکیلہ کی [illegible] جانے کیوں نہیں [illegible] دھوپ تیز ہو رہی ہے۔

مجبوراً [illegible] کیا۔

[illegible] کی گاڑی دو ڈھائی بجے چھوٹتی تھی۔ بارہ بجے گھر پہنچا تو [illegible] پوچھا آپ اس قدر خوش کیوں ہیں!"

"تم نہیں سنگدل ہو۔"

"وہ کیسے؟"

"تمہیں علم تھا کہ میں آج [illegible] جا رہی ہوں پھر بھی تم دفتر چلے گئے۔"

"میں کہاں جاتا تھا۔ آپ نے ہی تو دھکے مار کے نکالا تھا۔"

"میں تو بار بار اس لیے کہتی تھی تاکہ تم جلدی سے یہ کہہ دو کہ میں آج نہیں جاتا۔ مگر تم میرے دل کی بات سے بے خبر میری زبان پہ ہی اعتبار کر کے چلے گئے۔"

کھانا وانا کھانے کے بعد سامان تانگے میں رکھا جا رہا تھا۔ ہم سب حیران ہو رہے تھے کہ شکیلہ آپا کیوں جا رہی ہیں۔ [illegible] ایک سوٹ کیس میں نے بھی سیڑھیوں سے اتارا۔ یقین کیجئے وہ سوٹ کیس مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے میں اپنے کسی عزیز کی میت اٹھائے سیڑھیوں سے اتر رہا ہوں۔

شکیلہ ہمارے ہاں میری [illegible] اور میرے گھر والوں کی مہمان بن کر آئی تھیں مگر شکیلہ کی باتوں نے خلوص سے اور محبت سے سب کا

اپنا بنا لیا۔ اس میری بر انفرادیت ختم ہو گئی کہ شکیلہ صرف میری بہن ہے یا۔ اب جسے دیکھو وہ شکیلہ ہی کی باتیں کرتا ہے۔ شکیلہ ہی کو یاد کرتا ہے۔ شکیلہ ہی کے غم میں گھلا جا رہا ہے۔ عجیب جادوگرنی ہیں یہ، جس نے سب کے دلوں کو موہ لیا۔ جیت لیا۔

یہ تو میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ شکیلہ میری منہ بولی بہن ہیں۔ حالانکہ یہ جانتا ہوں کہ بہن تو بس بہن ہی ہوتی ہے۔ سگی، سوتیلی، منہ بولی، یہ سارے ہی اضافی اور فضول لفظ ہیں۔ جب کہ خون کے رشتے کی بات بھی، میرے نزدیک زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہو۔

یہ سید ہیں۔ وہ بھی اصلی براہ راست رسول صلعم کی چوبیسویں پشت میں ہیں۔ اس لیے قدر کرتا ہوں۔ توبہ استغفار کرتا ہوں۔

سمندر کی لہریں

جاویدہ اخلاق

اس کی پُرسکون زندگی سب سے بڑی باعث تعجب تھی [illegible] کے سامنے بڑا اسرار [illegible]
وہ ایک چھوٹے سے خوشنما بنگلے میں [illegible] خوبصورت بچوں اور ایک نوکر کے ساتھ رہتی تھی۔ کبھی کبھی صبح کے وقت وہ [illegible]
[illegible] ایک اب [illegible]
سے بھی ایک دن بھی [illegible] کے تمام لوگوں کے لیے وہ ایک معمہ تھی۔ ایک ایسی [illegible]
کراچی [illegible] پڑھی لکھی خاتون نہیں تھی۔ [illegible] اختیار کرے تو لوگوں کا تجسس ایک بیماری کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ وہ کون ہے
کہاں سے آئی ہے۔ اس کا ماضی زندگی کے پیچھے کون سا افسانہ ہے، تمام ان گنت کہانیاں اور [illegible] کے جواب میں
وہ خاموش رہتی۔ شاید وہ کسی زمانے میں بے حد حسین ہوگی مگر اب ایک اندرونی مستقل اذیت سے چہرے پر رنجیدگی کے آثار تھے اور آنکھیں
ہمیشہ اوپر کو اٹھی رہتی تھیں جیسے زندگی نے تھکا دیا ہو۔

اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایک مغرور خود پسند عورت ہے جو ازدواجی زندگی کی بندشوں کی قائل نہیں۔ وہ شاید ہمیشہ سے
ایک گھر بسانے کا وقار، کسی انسان کی محبت و الفت اور ایک بستے گھر کی خوشبوؤں کو نہ جان کر اس کے احساس سے بھی بیگانہ ہو چکی ہے۔ ایسا
احساس قابل نفرت تھا۔ سچ تھا یا غلط بظاہر وہ ایک پُرسکون زندگی گزار رہی تھی جس میں کوئی اضطراب نہ تھا کوئی ہلچل نہ تھی۔ شاید وہ صبر کی
حدود سے بھی آگے نکل چکی تھی جہاں پہنچ کر ہر احساس خود بخود سکون پذیر ہو جاتا ہے اور کوئی اذیت باقی نہیں رہتی مگر گزشتہ پانچ مہینوں کا
شاید یہ پہلا دن تھا کہ آج شام وہ باہر نہیں جا سکی تھی۔ ایک مانوس سی تحریر ایک جانے پہچانے خط نے یادوں کے کتنے چراغ روشن کر
دیے تھے کہ وہ محو ہو کر رہ گئی تھی۔

فضا شام ہی سے تیرہ و تار تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد دھند کا غبار سا پھیل کر تمام گھاٹی کو ڈھانپ لیتا اور بارش کی آواز
تیز تر ہو جاتی۔ دور پہاڑیوں پر چند لمحوں کے لیے روشنی کی قطاریں سی جگمگاتی نظر آتیں اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتیں۔ ان خیالات و
واقعات کی طرح جو ماضی کی تاریکیوں سے ابھرتے اور چند لمحوں کے لیے اس کے دماغ میں جھلملا کر پھر سے غائب ہو جاتے۔ کتنے عرصے
کی طویل خاموشی اور ڈس لینے والی بیگانگی کے بعد آج اسے اپنے خاوند کا خط موصول ہوا تھا۔ گزشتہ پانچ مہینوں میں یہ اس کا واحد خط تھا
جس کے ایک ایک لفظ نے اس کے دل و دماغ پر اتنے چرکے لگائے تھے کہ اس کی روح بھی شدت درد سے چلا اٹھی تھی۔ اور گزشتہ

چند لمحوں میں یہ سب کیا کیا عذاب سہتے رہتے تھے۔ کتنے تپتے ریگ زاروں اور کون کون سے جھروں میں سے اسے گزرنا پڑا تھا۔ اب سب کچھ گزر جانے کے بعد ایک عجیب سی ... نے اسے گھیر لیا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی پہلی گزشتہ زندگی کا پہلا پل بھر رہا تھا۔ اس وقت اس کو وہ باتیں یاد آ رہی تھیں جو کہ وہ قطعاً بھول چکی تھی اور سمجھی تھی کہ اب اس کی زندگی میں ان کا کوئی کام نہیں ۔ کھڑکی سے چند گز کے فاصلے پر ایک پہاڑی نالہ کف اڑاتا، پتھروں سے سر پٹختا تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سفید جھاگ سے ... ہو رہا ہے۔ گویا کسی بھالو کا تماشہ اور وہ اس میں محو ہے۔ اسی سے حالات و واقعات گھوم گھوم کر آتے اور جیتے جیتے پانی ... کے پردے پر رقص کرتے ہوئے رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔

آہستہ سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور وہ چونک کر پلٹی۔ کمرہ روشن ہو رہا تھا۔ ... پر چند مسافروں کے ... ایک کھلا کھڑکی سے آنے والی نرم آواز ہوا میں آہستہ آہستہ لرز رہا تھا۔ فضا خاموش تھی۔ سامنے کے کمرہ میں اس کے دونوں بچے ... نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر فرشتوں کی سی معصومیت اور مسکراہٹ تھی۔ دروازہ کے پاس اس کا پرانا ملازم ... اور ایک ہاتھ میں ... سے کھڑا تھا۔ ... یہ سب کچھ کسی خواب کے منظر کی طرح لگ رہا تھا۔

"وہ تیار ہے ـــ بیگم صاحب!" وہ اسے متوجہ پا کر بولا۔

"ٹھیک ہے۔ رکھ دو ..." وہ عجیب سی لگی۔

"بیگم صاحب ـ صبح ساڑھے سات بجے ٹیکسی آ جائے گی اور ہم دس بجے کی ٹرین پکڑ سکیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے بہت ہی مختصر سا جواب دیا۔

وہ چند لمحے اس نے مزید حکم کا انتظار کرتا رہا اور پھر خاموشی سے پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

بارش لگاتار ہو رہی تھی نالے کا پانی اور شور تیز ہو گیا تھا۔ پانی اب بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکراتا، شور مچاتا ہوا رواں دواں تھا۔ انسانی احساسات و جذبات، خوشیوں اور غموں سے بے نیاز۔ ایک دن اسی نالے کے کنارے اس کے پرانے ملازم نے ایک انگریزی پرانی تھی جس پر ... کی تصویر تھی۔ اسے ان سربلند چوٹیوں، چیڑ کے گھنے جنگلوں، پہاڑی نالوں سے شدید محبت تھی مگر ان سربلند چوٹیوں اور گنگناتے آبشاروں نے اسے کھوٹے سکوں، رنگین دھوکوں اور ناکامیوں کے سوا کچھ نہ دیا اور اب اسے ایسا معلوم ہوتا تھا اس کے چاروں طرف کھوٹے سکوں کے انبار لگے ہیں اور وہ ان کے بوجھ تلے پسی چلی جا رہی ہے۔ تمام احساسات، جذبات، یہ خوشی و غم، بے پایاں محبت اور ناقابل برداشت نفرت سب باتیں کھوکھلی، عارضی اور نقلی نظر آ رہی تھیں۔ کسی چیز پر اعتماد نہ رہا تھا۔ شاید تغیرات اور حوادث کا نام ہی زندگی ہے۔

کئی برس پیشتر جبکہ اس کا شعور بھی پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا اس کی منگنی کر دی گئی۔ وہ شرما سی گئی، کچھ کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی یا شاید اس نے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی۔ کہیں دور گہرائیوں میں تنہائی سی جاگ اٹھی اور اس کے خوابیدہ احساسات و جذبات جھنجھنا اٹھے۔ طبیعت میں یکایک سنجیدگی سی آ گئی۔ بچپن دور کھڑا اسے حیران نگاہوں سے تکتا رہتا۔ ایک نئی زندگی، ایک نیا تجربہ، خوشی اور خوف کے ملے جلے احساسات میں وہ گم سم سی رہتی جیسے پرندہ اپنی پہلی اڑان سے پہلے دبک سا جاتا ہے۔ شادی کا دن نزدیک آ تا گیا۔ ایک دن اسے اکیلا پا کر اس کا بھائی آہستہ سے آ کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"دیکھو منور! قریب ہیں وہ بہت سے لوگ جو کسی قسم کی شادی کا تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ گھر کے باقی افراد کی خواہش ہے کہ شادی کر دیا جائے۔ وہ لوگ بھی ہیں جن کا دل ہے۔ بعض لوگ اپنی شادی کی مشکلات یہاں بھی لاتے ہیں کہ ان کے ساتھ ایک کامیاب زندگی ممکن بھی ہو سکے۔ سب شادیوں سے انکار کر دو۔ دیا ہی بچے سے مسائل کی خوبی۔" وہ ذرا جذباتی ہو کر کہہ رہا تھا۔

وہ مسکرا دی: "میرا مطلب سمجھ گئی ہو گی نا۔"

"مرد اور عورت کی شادی: دو بچوں کا مستقبل" وہ ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد بولا۔ وہ دونوں ایک ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔

وہ ایک دن اچانک شرمسار ہو کر بولی: "اس سے بہتر ہے کہ ان کا فیصلہ کر لو گے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہاری بیوی اس سے خوش نہیں ہے؟" وہ کہتے ہوئے اس کے چہرے سے پردہ اٹھانے لگا۔ وہ اٹھا اور مسکرا کر ہنس پڑی۔

"تم بھی ویسی ہو۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور چپکے سے چل دیا۔

شادی کے بعد ایک سال کی زندگی ایک مہذب سرمائے اور ایک رنگین کام کا سامنا کیا۔ اس نے اپنے سامنے ایک خوبصورت دنیا کے بچوں کی پرورش کی جہاں نیلی جھیلیں تھیں اور سیب کے درخت تھے، چھوٹے چھوٹے سے پہاڑ تھے۔ اس نے ایک کمرہ کرایہ پر لیا جہاں سے محبت کے رشتے کا احساس ہوتا اور ایک دو قدم گھر کا راستہ۔ چاروں طرف سکون ہی سکون تھا اور یہی سکون اس کی فطرت میں بچا تھا۔ وہ یہ گھر کا راگ سنتا اور رات کی شفق کے سائے میں جیسے ہوئے نازک درخت، دور دور کی بستیاں اور رنگ برنگی کاروں کی قطار نظر آتی تھی۔ سمندر اور ہوائی جہازوں کا شور، جنگل نے سنبھال لیا، دن گزرتے اور جو کل تھے۔ چاروں طرف نگرانی اور قہقہے تھے۔

شروع شروع میں وہ گھبرا سی گئی مگر اس کے خاوند نے صرف اس سے محبت ہی نہیں کی بلکہ ایک مخصوص دوست کی طرح اس کا ساتھ دیا۔ اس کا دل ہمیشہ نرم اور شفقت بھرا رہا۔ رفتہ رفتہ اس کی توجہ اور کوشش سے وہ ان ہنگاموں، بازاروں اور جھگڑوں کی عادی ہو گئی جیسے زندگی کا حصہ تھی۔ وہ دونوں سوسائٹی میں ہر دل عزیز تھے۔ بعض اوقات آپس میں ناراض ہو جاتے اور اسی محبت میں ڈوب کر وہ اس کی کمزوریوں اور خامیوں کو بھی نظر انداز کر جاتی۔ کبھی کبھی اس کی بات خوشی اور غصے سے بھری ہوتی، معمولی سا جھگڑا بھی ہو جاتا مگر ہر بار وہ ایسے پیار سے منا کر وہ سب کچھ بھول جاتی۔ اکثر دونوں کو زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہوتا اور وہ اس وقت بہت آہستہ آہستہ کچھ سوچتی اور کہتی: "میرا خیال ہے اب گھر میں ایک تیسرا بھی ہونا چاہیے" اور وہ اس کی شکل و صورت بالکل ہماری طرح ہو۔" وہ زیر لب مسکراتا۔

"لڑکی کیوں؟ لڑکا ہونا چاہیے۔" وہ چڑ جاتی۔

"مگر میں پہلے لڑکی چاہتا ہوں۔" وہ اپنی ضد پر قائم رہتا۔

دن گزرتے رہے اور وہ بچے صرف ان کے تصور میں ہی جھانکتے رہے۔ کوئی خواب بھی حقیقت نہ بن سکا اور خلا وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ وہ حیرت انگیز طریقے سے بدل رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے شراب نوشی زیادہ کر دی۔ اب وہ زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتا۔ گو عیش و آرام اور تفریحات میں کوئی خاص فرق نہ آیا تھا مگر زندگی بکھری بکھری تھی۔ کچھ عجیب سی بے اطمینانی تھی جس کے اظہار سے دونوں کتراتے۔

شاید گار زورروں نے صحیح کہا ہے کہ انسان میں ایک جدت پسندی ہے جس کی وجہ سے وہ نت نئے عشق کی تلاش میں رہتا ہے لیکن اگر اس کو تسکین حاصل ہو جائے تو جہاں پہلے طبیعت میں ایک تشنگی تھی وہاں اب ایک بے دلی آجاتی ہے۔ طبیعت اکتا جاتی ہے، احساس مضمحل ہو جاتا ہے اور یہ مرض لا علاج ہے۔

وہ یہ سب کچھ تھی۔ اس تبدیلی اس بیگانگی کو شدت سے محسوس کرتی مگر خاموش رہتی۔ اور پھر اچانک اسے کچھ دنوں کے لیے اپنے وطن جانا پڑ گیا۔ جس دن وہ روانہ ہونے والی تھی وہ قدرے پریشان و متفکر سا نظر آتا تھا۔ ہوائی جہاز کے روانہ ہونے سے چند لمحے پیشتر اس نے اس کے چہرے پر ایک ایسی گہری اداسی کی جھلک دیکھی تھی کہ گھر پہنچنے تک اس کے دل سے تمام تشکیک اور بدگمانیاں زائل ہو چکی تھیں۔ وہ اس پرسکون ماحول میں واپس پہنچ کر پھر سے اس کے لیے مضطرب ہو گئی۔ اس نے کئی دفعہ جلد واپس جانے کا ارادہ کیا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ حائل ہو جاتی اور پھر اس دن اس کی چھوٹی بہن کی شادی تھی۔ وہ بالکل اسی طرح کا دن تھا جس دن اس کی شادی ہوئی تھی۔ تمام رات لڑکیاں ڈھولک کے ساتھ گاتی رہیں۔ صبح رخصتی کے ہنگامے میں کسی نے ایک خط لا کر دیا۔ وہی جانی پہچانی تحریر۔ اس نے بے ارادہ لفافہ چاک کیا مگر چند لمحوں تک اسے کچھ پتہ نہ چل سکا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ الفاظ بڑے بڑے دھبوں کی طرح آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے

"فرزانہ! میں نے مجبوراً دوسری شادی کر لی ہے۔ وہ ایک انگریز عورت ہے۔ میں اسے کہہ چکا ہوں کہ میں نے تمہیں طلاق دے دی ہے اس لیے اب تم واپس آنے کی کوشش نہ کرنا۔ مجھے افسوس ہے مگر میں مجبور تھا۔ امید ہے تم بھی مجھے جلد بھول جاؤ گی۔"

اور جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ سہیلیوں کے شگوفے اور رسا رامن کے ادھ جلے پھول جل کر خاکستر ہو چکے ہیں۔ نیلی جھیل پر لاوا اُبل رہا ہے۔ دنیا کے ساحلوں پر آگ لگ گئی ہے اور زندگی کا ایک کنارے کا مسافر دوسرے کنارے نہیں جا سکتا۔ زعفران کے کھیت جھلسے پڑے ہیں اور چشمے سرد ہو گئے ہیں۔ اسے یہ سب کچھ ایک خواب نظر آ رہا تھا۔

وہ گھر کے کسی فرد کو حقیقت سے آگاہ کیے بغیر اچانک تیاری کر کے روانہ ہو گئی۔ کار اور ریل کا سفر اس نے سوتے جاگتے کی سی حالت میں طے کیا اور پھر ہوائی جہاز اسے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں میں گم ہو گیا۔ تمام رات وہ جگمگاتے شہروں پر برستے بادلوں کے اوپر چاندنی کرنوں میں پرواز کرتی رہی۔ وہ خوفزدہ تھی۔ صبح اسے لینے کوئی نہیں آئے گا۔ کسی کی منتظر نظریں آسمان کو نہیں تکیں گی اور کوئی ہاتھ بڑھا کر اس کے لیے کار کا دروازہ نہیں کھولے گا۔ اس نے کسی کو اطلاع ہی نہیں دی تھی۔ اس کا کوئی نہیں تھا، وہ کہاں اور کس کے پاس جا رہی ہے؟ یہ وہ انسان نہیں تھا جس نے آسمانی صحیفوں کے درمیان انتہائی محبت اور فخر کے ساتھ اسے قبول کیا تھا جس نے اسے محبت کرنا سکھا دیا تھا۔ یہ کوئی اور تھا جسے وہ ہرگز نہیں جانتی تھی۔ وہ پہلا انسان نہ جانے کہاں کھو گیا؟ انھوں نے اکٹھے کتنے سہانے خواب دیکھے تھے۔ کتنی دلفریب شامیں، رنگین راتیں اور مسکراتی صبحیں تھیں۔ کتنی خوشیاں اور قہقہے تھے۔ وہ ان سب کا بوجھ اٹھائے اس وسیع دنیا میں اسے کہاں ڈھونڈتی پھرے گی۔ چند معمولی الفاظ تمام گذشتہ زندگی کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتے ہیں مگر وہ پہلی نظر، ایک لمس، ایک بوسہ۔ وہ ہلکی سی لرزش، ایک سسکی، چند آنسو، خشک چاندنی اور ادھ جلے پھول، دل کی گہرائیوں میں جا گزیں ہو کر غیر فانی ہو جاتے ہیں۔

اسے لینے کوئی نہیں آیا تھا مگر اسے اپنے گھر کا راستہ بخوبی معلوم تھا اور اب وہ اپنے خوشنما فلیٹ کے دروازے پر ایک اجنبی کی طرح کھڑی کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ کسی نئے نوکر نے اسے پہچانے بغیر دروازہ کھول کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ تمام ماحول اجنبی سا نظر آ رہا تھا۔ کارنس پر سے اس کی تصاویر اٹھا دی گئی تھیں۔ کمرے میں نقشہ بدلا ہوا تھا۔ وہ اپنے ہی گھر میں

کسی [illegible] کی طرح چاروں طرف حیرت اور [illegible] نگاہوں سے [illegible] دیکھ رہی تھی۔

— جی ، صاحب وہ [illegible] صاحب کی دونوں [illegible] [illegible] یہاں سے [illegible] تھی وہ [illegible] سے [illegible] دیکھ کر دوبارہ سوال کیا۔

وہ کچھ [illegible] — ہاں وہ مجھے [illegible] [illegible] تھا۔ صاحب [illegible] [illegible] [illegible] ہے [illegible] [illegible] کے سامنے [illegible] تھا۔ [illegible] [illegible] [illegible]

— میں [illegible] آئی ہوں۔ [illegible] [illegible] تھی۔

[illegible] سب کچھ [illegible] ہوں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سے [illegible] [illegible] [illegible] کر چکا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] حاصل ہوگا۔

— میں تم سے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] پوچھ رہا ہوں۔

— [illegible] چلی جاؤ۔ اس [illegible] سے پہلے چلی جاؤ۔ وہ [illegible]

— کہاں چلی جاؤں؟ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کے بعد [illegible] میں کہیں جگہ نہیں۔

— تو پھر ہم بھی یہیں چل جاؤ۔ وہاں کئی اچھے ہوٹل ہیں جن سے تمہارے بہت تعلقات ہیں۔ یہاں کسی ہوٹل کے پاس ٹھہر جاؤ۔ وہاں تفصیل گفتگو ہو سکے گی۔ ہم لباس تبدیل کر کے آتے ہیں۔ تم بھی اب جاؤ۔ جلدی جلدی چلی جاؤ۔

وہ خاموشی سے [illegible] [illegible] [illegible] کے بعد [illegible] قدموں سے آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگی اور وہ ریلنگ کے سہارے جھکا چپ چاپ اسے جاتے دیکھتا رہا۔ ایک موڑ — دوسرا موڑ — پھر وہ اس کی ساری کا کچھ حصہ نظر آتا رہا پھر وہ بھی غائب ہو جاتا۔ کتنی سیڑھیاں کتنے موڑ۔ ان گنت [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]۔ وقت اور حالات ساتھ دیتے اور وہ اسے اپنی یاد دلاتے رہتے۔ [illegible] لمحوں سے اوجھل ہو گئے۔ وہ نیچے اتر کر دنیا کے سیلاب میں ہمیشہ کے لیے کہیں کھو چکی تھی۔ گم ہو گیا تھا، نہ جانے کتنے لمحے جو ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گئے۔

اور پھر بہت عرصہ بعد اس نے اپنے ایک دوست سے [illegible] کے انداز میں آہستہ سے کہا تھا: میری دوسری شادی جلد ہی ناکام ثابت ہوئی اور پھر اسی طرح تیسری بھی۔ مگر مجھے قطعاً کوئی غم نہیں۔ میں اب ایک تنہا انسان ہوں۔ تمام احساسات و جذبات سے بے پروا۔ مگر ایک احساس باقی ہے۔ ایک صبح میرے ذہن میں مستقل اذیت بن کر رہ گئی ہے۔ وہ لمحہ جب وہ میرے اصرار پر آخری بار ملنے ہوٹل آئی تھی [illegible] قدموں سے اکیلی سیڑھیاں اترتی ہوئی سڑک کے بے پناہ ہجوم میں غائب ہو گئی تھی اسے فراموش نہیں کر سکتا۔ اکثر آرام سے بیٹھے بیٹھے [illegible] اچانک میرے ذہن میں جاگ اٹھتی ہے اور پھر کہیں سکون باقی نہیں رہتا۔ شاید وہ تمام عمر — زندگی بھر اسی طرح میرے ذہن میں سیڑھیاں اترتی رہے گی اور کبھی نہ اتر سکے گی — ایک لامتناہی سلسلہ — کتنی عجیب بات ہے — حالانکہ یہ سب کچھ سوچنا بے کار ہے کیونکہ اب وہ ایک دوسرے انسان کی بیوی ہے۔ مگر یہ سیڑھیاں! یہ مستقل اذیت — وہ آہستہ آہستہ عجب اذیت اور مایوسی کے لہجے میں بڑبڑا رہا تھا۔

اور وہ دوسرا آدمی — ایک پڑھا لکھا، خوبصورت اور معزز انسان — جس سے وہ اپنے خاوند کی موجودگی میں کئی دفعہ مل چکی

جیسے وہ اس سے تنہا ہو اور وہ سب سامنے آ۔ جو کچھ وہ اسے ہم سے ہو جائز تھا وہ ایک عزیز چاہ رہا ہے قتل رکھتا تھا اس کے چھوٹے کی جو کرتی تھی۔ مجھے ہوتے رہنے اور بہت مبارکباد حرف پڑھ اور خوش گفتار انسان جو ہر ہر ساتھی ہیں۔ ہے جو پسند کیا جاتا خصوصاً عورتوں میں اس سے کئی خوبصورت طرح پہلی نظر میں آئی تھی مگر آنے والے حالات کو کسے علم تھا۔

زندگی کی اس منزل پر چلتے چلتے ایک ہمدرد پر وہ اتفاقاً اسے مل گیا کسی دور دراز شہر میں جہاں ضرورت وہ حالات سے انھیں اچانک اکٹھا کر دیا تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے کو کچھ کرنے کی محسوس ہوئی۔ ایک گزرے ہوئے خوشگوار دنوں کی یاد کی وجہ سے دوسرے کی اپنی تنہائی ان دونوں کے لطیف رفاقت کے احساس سے یا شاید دونوں ہی مگر جیسے دونوں ایک دوسرے کے نزدیک آگئے۔ دونوں کی زندگیوں میں ایک خلا تھا جس کو عارضی طور پر ایک دوسرے کی موجودگی نے پر کر دیا۔ دل شکستہ اور ہم راہی اس کی زندگی جا رہے تھے بے شمار پاؤں مار رہی تھی اور وہ بھی سادہ زندگی کے سبب دور رہ کر جی رہا تھا۔ اگر وہ کوئی وقت کسی رومان کی زبان سے گزرا تھا تو کتنی بار دونوں کا دل دونوں تنہائی کا شکار بھی ہو چکا تھا۔ پر حسن محبت اور جب تک ہنگامہ رہی وہ راحت کے معنی جانتا تھا پھر زیست کی راہ پر دونوں کی اور جانے سے ٹکرا کر ساتھ ہی مجھ کو ساتھ چلنے کے لیے دل چاہنے لگا۔

جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ اسے پسند کرتا ہے یا شاید محبت کرتا ہے تو آخر ایک دن اس نے اس کو ہمدرد کر دیا۔ وہ خود بھی اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتی تھی اسے بے حد پسند کرتی۔ اس کا ہر جملہ ہی اسے سکون و راحت بخش دیتی تھی مگر پہلے بھی وہ خوف زدہ کبھی کبھی کئی روز تک سخت تذبذب کی حالت میں اس کے متعلق سوچتی رہی۔ اس کی نسبت ٹوٹ کر خیبر خانی ہو چکی تھی اس کی زندگی برباد تھی۔ وہ اب محبت کے بغیر زندہ نہ رہ سکتی تھی۔ وہ بہت بے پایاں محبت اس پر نچھاور کرنا چاہتی تھی تاکہ اس میں ڈوب کر گزشتہ تلخی کو ہمیشہ کے لیے بھول جائے لیکن اگر یہ بھی خواب ثابت ہوا۔ زندگی کے بازار میں اگر یہ محبت ہی دغا دے گیا تو وہ اس کے عذر کو دیکھتے ہوئے وہ اس سے کہیں نا بہت ساتھ ہی نہیں کر سکتی تھی بلکہ شاید وہ بے حقیقت تھا۔ عجیب و غریب تھا۔ ایک حسن پر قدیم تہذیب تبت تھیں اور کسی نا قابل فہم زبان میں عبارت کندہ تو کوئی انسان وہ عجیب و غریب زبان سیکھے بغیر اس کی ماہیت کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا شاید وہ پھر جیسے صدیوں کے کنارے عظیم نشان معبدوں میں پہنچ گیا تھا کسی حسین دیوی کے ماتھے پر جھلملا رہا تھا نیل کے کنارے قلوپطرہ کے دل کی دھڑکن بن چکا تھا شاید پیار نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور کسی سپہ گر کسی مارک انطنی نے اسے رشک سے دیکھا تھا۔ وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کئی آن جانے خوف سے لرز رہی تھی کانپ رہی تھی مگر اس کے مضبوط ہاتھوں کا سہارا پا کر سنبھل گئی اور شادی کے بعد تو تمام محبت و پرستش اس نے اس کے لیے وقف کر دی تھی۔ کتنے شیریں لمحات تھے وہ بھی اور اب ان کے دو بچے تھے۔ وہی بچے جو اس کی پہلی ناکام زندگی میں اکثر اس کے تصور میں جھانکا کرتے تھے۔

پھر زندگی بے حد پرسکون تھا مگر یہ سکون بھی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا اور کچھ عرصے کے بعد ہی وہ اس کی سطح کے نیچے ہر روز کا ہلکا ہلکا تلاطم محسوس کیا کرتی۔ رفتہ رفتہ وہ بھی بدل رہا تھا۔ بیزار اور چڑچڑا سا۔ وہی بے اطمینانی، وہی سکون کی آرزو، نت نئے جھگڑے زندگی کا وہی پرانا تماشہ، صرف وقت، مقام اور کردار بدل گئے تھے۔ خلا کوئی نہ تھا مگر تشنگی مٹ جانے پر وہ اکتا گیا تھا اور دن بدن اس کی بیزاری اور جھنجھلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اس کی بدلتی ہوئی عادات پر بھونچکا سی رہ جاتی۔ تمام خوش فہمیاں غلط ثابت ہوئی تھیں

بہت سے [illegible] کیسے [illegible] ایک [illegible] بنا کر [illegible] سے [illegible] کے [illegible] میں [illegible] کی [illegible] جب [illegible] کسی [illegible] کے [illegible] میں [illegible] سے [illegible] بات [illegible] میں [illegible] ہے [illegible] کے [illegible] تھا [illegible] میں گم ہو چکا ہو۔

وہ بیروں [illegible] کے متعلق سوچتی [illegible] حالانکہ محبت [illegible] سے بنا کر عقل کی تھی اور محبت کی ناکامی [illegible] شکست [illegible] کوئی نام نہ تھا [illegible] وہ سب کچھ [illegible] شاید وہ جا رہی تھا [illegible] احساسات و جذبات [illegible] کی تکمیل کرتی ہیں [illegible] میں جاری ہوتی ہیں [illegible] ہوتا ہے۔

گڑا سب سے زیادہ دکھ اس وقت ہوتا جب وہ اپنے [illegible] دماغ کی بغاوت اور اپنی کمزوری پر [illegible] کے بیچ جو شعوری طور پر اپنی تمام ناکامیوں، پریشانیوں اور تکلیفوں کا باعث اسے گردانتا۔ [illegible] ظاہر [illegible] خوفناک [illegible] صورت اختیار کر گیا اور ایک [illegible] بات پر [illegible] چپ چاپ [illegible] روانہ ہو گیا [illegible] کے لیے کوئی پیغام تک نہیں چھوڑا تھا۔ گھر واپس آکر جب اس نے اس کا خالی کمرہ دیکھا تو پھر اسے [illegible] اور ایک دفعہ پھر وہ بھرے بازار میں لاکھوں مسکراتی ہوئی نظروں کا نشانہ بنی ہنستا بتا کھڑی تھی۔ کیا اس کی تمام محبت و پرستش کا یہی صلہ تھا؟ حادثات کو کیوں اس کی زندگی سے اتنی دلچسپی ہے۔ اس کا کوئی بھی خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

زندگی کی یہ دوسری شکست سب کچھ جلا کر خاکستر کر گئی۔ کوئی احساس کوئی جذبہ باقی نہ رہا۔ خوشی نے سٹ کر غم کے احساس سے بھی بیگانہ کر دیا۔ نفرت نہ کر سکی مگر محبت کو بھی بھول گئی جیسے وہ کبھی اس کی زندگی میں آئی ہی نہ تھی۔ سب کچھ فراموش کر بیٹھی کوئی اذیت باقی نہ رہی۔ ممی جون کی بے پناہ گرمی سے گھبرا کر وہ چند دنوں کے لیے یہاں آئے تھے مگر وہ اسے سڑک کے کنارے [illegible] چھوڑ کر چل دیا جہاں وہ مجسمہ بن کر رہ گئی۔ سر سے پاؤں تک برف کی ایک سل۔ احساسات و جذبات سے عاری جیسے کسی کی طنز، کسی کی ہنسی، کسی کی پر تجسس مشکوک نظریں تکلیف نہیں پہنچا سکتی تھیں۔ لوگوں کی رائے زنی سے بالاتر وہ ایک ایسی عجیب زندگی گزار رہی تھی جو لوگوں کے نزدیک [illegible] قابل اعتراض تھی کہ آج اچانک چار مہینے بعد کاغذ کے ایک ٹکڑے نے تمام گذشتہ گھاؤ ہرے کر دیے تھے اور کتنی بھولی بسری یادیں سلگ اٹھی تھیں۔ ایک طویل خط میں اس نے حسب عادت اسے ختم کرتے ہوئے اس کے خلاف تمام زہر اگلنے کے بعد آخر میں اپنی

بلندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ان کو وہ اب بھی اسے اسی طرح چاہتا ہے اور اس کا منتظر ہے۔ خط ملتے ہی وہ فوراً اس کے پاس آنے کے لیے روانہ ہو جائے۔

اور خط ال چکا تھا۔ وہ اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ اس کی بیماری بھی ختم ہو چکی ہوگی۔ [illegible] لیکن اب وہ جا کر کیا کرے گی۔ کیا ہو سکتا ہے وہ زندگی کا دوبارہ محبت [illegible] واپس آسکتے ہیں؟ وہ احساسات [illegible] جو کبھی اس کے حصے میں آئے واپس نہ آ سکتا ہے۔ محبت تو ایسی چیز نہیں کہ جب دل چاہا [illegible] کر بیدار ہو جائے۔ وہ فوراً جلتی [illegible] گئیں پھولوں سے لدی [illegible] پیلے پتوں کے کنارے [illegible] آہستگی سے [illegible] کہ کس کو اس کا علم نہیں [illegible] اپنی محبت کو کسی کے سامنے کسی سبب کے درخت نے انہیں [illegible] ترو تازہ [illegible] کی طرف پرواز کر جاتی ہے۔ [illegible] جگہ کانٹے اُگ آتے ہیں۔ محل ویران [illegible] انسان تمام زندگی اس محبت کی تلاش [illegible] مگر وہ کبھی لوٹ کر نہیں آتی۔

[illegible] کا تصور [illegible] اس کے پاس [illegible] کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ وہ اب اسے کیا دے سکتی تھی۔ یہ خالی بے رنگ زندگی [illegible] احساسات و جذبات وہ اسے کسی وقت بھی تحفۃً پیش کر سکتی ہے۔ [illegible] کیا ہے اب!

وہ [illegible] پیر کے ساتھ آئی۔ خط کر کے [illegible] اور [illegible] کر جگا کر [illegible] نہیں چاہتی اس لیے وہ اسے جلدی نہ جگا سکے۔ اور پھر اسی پرانے اطمینان و دل جمعی کے ساتھ جو لوگوں کے لیے باعث حیرت و لعنت تھی، اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ [illegible] ہو گئی۔

فیض احمد فیض

○

یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجات دل کا عالم
ترا حسن دستِ عیسیٰ، تری یاد روئے مریم

دل و جاں فدائے راہے، کبھی آ کے دیکھ ہمدم
سرِ کوئے دلفگاراں شبِ آرزو کا عالم

تری دید سے سوا ہے تری یاد میں بہاراں
وہ چمن جہاں گری ہے ترے گیسوؤں کی شبنم

یہ عجب قیامتیں ہیں تری رہگزر میں گزراں
نہ ہُوا کہ مر مٹیں ہم، نہ ہُوا کہ جی اٹھیں ہم

لو سُنی گئی ہماری، یوں پھرے ہیں دن کہ پھر سے
وہی گوشۂ قفس ہے، وہی فصلِ گُل کا ماتم

حالی کی قطعہ نگاری

ڈاکٹر سید عبداللہ

فارسی قطعہ تعجب ہے کہ کس قدر مستقل صنف ہے۔ اس کا مقصد کسی حقیقت کا مختصر مگر مسلسل بیان ہے اور مسلسل بیان کی یہ کوشش ابتدا ہی سے فارسی شاعروں میں ظاہر ہو رہی ہے۔ اس کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعری کے متعلق بعض لوگوں کے خیالات بالکل غلط ہیں کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے کلاسیکی شاعر پورے طور پر تسلسل بیان پر قادر نہ تھے۔ دراصل یہ ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا جب غزل کے شکار اور اس کے مخالف ہو گئے تھے۔ ہم نے جن توجہات کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک مشکل یہ تھا کہ ہمارے کلاسیکی شاعر مضمون کے تسلسل کو نہ مانتے تھے اور نہ اس کو برقرار رکھ سکتے تھے۔ کلیم الدین احمد اس سلسلے میں اتنے نیک نام ہو چکے ہیں کہ اب ان کا ذکر کرتے ہوئے ہی پریشانی ہوتی ہے لہٰذا ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ وہ بچارے تو محض طور کے دامن میں گھر بننے کے جرم میں مارے گئے اور یہ قصور سب کا نہیں اصل غلطی تو اس ذہن کی ہے جس نے آج سے ایک سو سال پہلے اپنی مشرقی کو بے جرم مار پیٹنے کی رسم ڈال دی تھی۔

خیر یہ تو محض جملہ معترضہ تھا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ قطعہ کی صنف ذوقِ تسلسل کی تسکین کے لیے وضع ہوئی۔ اور آزادی (اپنی قصیدے کے عام رسوم و قیود سے آزادی) اس کی ایک بنیادی صفت قرار پائی چنانچہ مطلع کی قید سے آزاد قطعہ مسلسل مضمون کو ادا کرنے کے لیے وضع ہوا اور آج تک اس کی یہی صفت اس کی شناخت کی بنیادی علامت ہے۔ اس کے باقی اوصاف قطعی نہیں اور ان میں تغیر ہر دور میں رد و بدل ہوتا رہا۔

قطعہ (ق ط ع) لغوی معانی کے اعتبار سے ٹکڑے یا کٹے ہوئے کسی جز کو کہتے ہیں اور جب اس میں اصطلاح کا رنگ پیدا ہوا تو بھی یہ بنیادی معنی اس میں باقی رہا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ مضمون کا تسلسل اور ربط و مناسبت کی جزئیت اس کی بنیادی صفت ہے مگر یا قطعہ کسی وسیع تر اور طویل تر بیان کے لیے نہیں یہ تو حقیقت کی ایک جھلک دکھانے کے لیے وجود میں آیا تھا۔ یہ اصل میں قصیدے کا ایک کٹا ہوا ٹکڑا ہے جس میں بعض صفات قصیدے کی پائی جاتی ہیں اگرچہ اس میں مطلع نہیں ہوتا مگر اس کا یہ تصور نہایت ابتدائی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ بعد میں ارتقا یافتہ قطعے کی قصیدے سے بجز اس کے کچھ مشابہت نہ رہی کہ قصیدے کی طرح یہ بھی غزل سے مختلف چیز ہے اور یہ بھی کہ اس میں بھی قصیدے کی طرح ایک مرکزی مضمون موجود رہتا ہے۔

قطعہ کی ہیئت و ساخت کے متعلق مختلف زمانوں میں مختلف تجربے ہوئے —— اور یہاں ہیئت سے میری مراد تعداد اشعار بھی ہے جو کم از کم دو اشعار اور زیادہ سے زیادہ دس بارہ اشعار تک پہنچتی ہے۔ (بعض اوقات شاید اس سے بھی زیادہ) مگر متوازن قطعہ ہمیشہ مختصر

[illegible] قطعے کی [illegible] ہے [illegible]
[illegible] اور [illegible] سے [illegible] قطعے کی [illegible]
[illegible] قطعے [illegible] قصیدے [illegible]
مطلع [illegible] قطعے [illegible]
[illegible] قطعے [illegible]
[illegible] صنف [illegible] ہے۔

[illegible] قطعہ [illegible] قطعوں کے [illegible]
[illegible] قطعات [illegible] ہے [illegible]
[illegible] سے [illegible] قطعے [illegible]
[illegible] قطعے [illegible] بیان ہے [illegible] قطعے
[illegible] واقعے کی [illegible] مثلاً سعدی کا یہ قطعہ —

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

اسی طرح [illegible] قطعے میں [illegible] حکایت کو لانے کا [illegible] میر کا یہ قطعہ دیکھئے جو ایک غزل کے اندر ہے —

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسی کا سرِ پُر غرور تھا

اس قطعے کے پہلے مصرعے میں ایک واقعہ ہے۔ تیسرے مصرعے میں مکالمہ ہے اور آخر میں ایک حقیقت کا انکشاف ہے۔ انہی اجزا سے یہ قطعہ مکمل ہوا ہے۔ تیر کے ایک دوسرے قطعے میں محض ایک قول پر بنا رکھی گئی ہے اس میں کوئی مکمل واقعہ نہیں مگر واقعہ کا ابتدائی طلاش ضرور ہے —

بلبلیں پائیز میں کہتی تھیں ہوتا کاش کہ
یک مژہ رنگ فراری اس چمن کا آشنا
گو گل و لالہ کہاں سنبل سمن ہم نسترن
خاک سے یکساں ہوئے ہیں [illegible] آشنا

میر کا یہ قطعہ ایک غزل کے اندر ہے اور یہ بھی میر کی ترجیحات میں سے ہے کہ انہوں نے قطعے کے بہت سے قاعدوں کو بدل ڈالا یہاں تک کہ ان کے بعض قطعات میں قصیدے و رباعی کی طرح مطلع بھی ہے — بہرحال [illegible] — واقعہ کا بیان قطعے کی داخلی خصوصیت ہے اگرچہ بعض شاعروں کے یہاں محض بیانِ حقیقت ہی قطعے کا مقصد معلوم ہوتا ہے یعنی حقیقت کا کوئی رخ یا اخلاقی فلسفیانہ اور دنیوی زیرکی کا کوئی نکتہ واقعہ بنائے بغیر بھی قطعے کا موضوع بن جاتا رہا۔ مثلاً سعدی کا یہ قطعہ —

عمر گراں مایہ دریں صرف شد ... تا چہ خورم صیف و چہ پوشم شتا
اے شکم خیرہ بنانے بساز ... تا نکنی پشت بخدمت دوتا

بہرحال یہ سب اسلوبیات اور تجربات ہیں جس طرح جدید دور کے قطعہ نگاروں نے (مثلاً اختر انصاری اور ستیہ پال وغیرہ) نے قطعے میں ہیئت و معنی کے کئی تجربے کیے ہیں اور قطعے کو پرانے آداب و ضوابط کا اسیر نہیں رکھا۔

قطعے میں صاحب ... روح کے ساتھ خصائص سے مانوس ... قطعے کی روح ... اور آئی ... ہیئت سے ... اور تخیل کا امتزاج قطعے کی روح کے پیمانہ گراں ہے۔ قطعے میں اس سے معنی و برجستگی سے حرکت رہتی ہے۔ ... انداز بیان میں شستگی اور دل نشین ہو جاتی ہے۔ قطعے کو جو چیز سب سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہے وہ اس کا ... ہے ... بیان میں بھی برجستگی اور پختگی کی ضرورت ہے۔

ماحصل کلام یہ ہے کہ قطعے کے لیے چند چیزیں ضروری ہیں۔ اوّل بیان کا تسلسل، دوم مناسب الفاظ ... برجستگی ... سوم متانت ... چہارم کسی حقیقت یا فلسفے کا اظہار۔ ان صفات کے علاوہ واقعہ، حکایت ... بھی ... اس کا اظہار نہیں کیا۔ میری دانست میں دو اشعار والے قطعے ... رباعی ہی ہوتے ہیں ... پہلو دوسری ہی بات کہ رباعی میں حقیقت کو بیان حکایت کا رنگ اختیار نہیں کرتا مگر قطعے کی ایک مخصوص صفت یہ ہے کہ ... کے لیے حکایت یا واقعہ کا ڈھانچہ تیار کرنے سے بات زیادہ موثر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح رباعی کی روح نسبتاً سنجیدہ ہے ... کی ... یا حقیقت ... مناسب ہے البتہ قطعات میں برجستگی ادا اور لطیفہ ... کی گنجائش ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات بھی قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ جس چیز کو ہم قطعہ بند کہتے ہیں کیا وہ بھی قطعہ ہوتا ہے ... اس سے کوئی مختلف چیز ہے۔ غزل میں آنے والے قطعہ بندوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصول تسلسل کے لحاظ سے وہ قطعہ ہی ہوتا ہے مگر اس میں مکمل قطعے کی صفات نہیں پائی جاتیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ غزل میں قطعہ بند لانے کی ضرورت کیا ہے؟ بظاہر اس سے ... مقصود ہوتا ہے اور غزل کی پریشاں خیالی کے اندر مربوط مضمون کا پیوند لطف دیتا ہے۔ یہ قطعہ بند عموماً مختصر ہوتے ہیں مگر میر و غالب کی غزلیات میں قدرے طویل قطعے بھی ہیں بلکہ ایک غزل میں ایک سے زیادہ قطعے بھی ہیں مثلاً غالب کا مشہور قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل

یہ قطعہ کا سلسلہ کی یہ خاص کوشش اُردو میں میر و سودا کے یہاں کچھ زیادہ ہے جس کے سماجی و سیاسی اور نفسیاتی اسباب ہیں مگر ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

اس طویل تمہید کے بعد اب میں حالی کی قطعہ نگاری کا تجزیہ کرتا ہوں۔

حالی اور اکبر —— جدید زمانے کے دو ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں قطعہ نگاری کا فنی شعور خاص طور سے نمایاں ہے جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اکبر کو حالی کے مقابلے میں قطعے پر زیادہ قدرت ہے مگر حالی کے قطعے بھی بعض صفات کے مالک ہیں اور ان میں حالی کا رنگِ طبیعت جھلکتا ہے۔

حالی کے [illegible] ہے۔ [illegible] حالی کے [illegible] عرصے لطف [illegible]
[illegible] جیسی [illegible] ہے۔ [illegible] عمدہ [illegible] حالت [illegible] حصہ میں
[illegible] کے [illegible] کے سلسلے کی [illegible] جاتی [illegible]
[illegible] حالی [illegible]

حالی صاحب کے قطعات [illegible] سے [illegible] قطعات [illegible]
[illegible] کئے [illegible] حالات [illegible]
[illegible]
[illegible] کرتا ہے۔

[illegible] قطعہ [illegible] ہے [illegible]
[illegible] ہے کہ قطعہ کسی حقیقت [illegible]
فلسفیانہ نکتے کے [illegible] وقت تک پیدا نہیں ہو
سکتی جب تک [illegible] ہے۔ حالی کے قطعات میں
[illegible] ہے۔

حالی نے مضمون کو [illegible] کیجیے [illegible] مطالب اور مقبل کا
استعمال ——— ان سب کا مقصود [illegible] خلاق حقیقتوں کا اظہار ہے۔ جہاں تک [illegible] کر سکتا ہوں کہ حالی نے قطعہ کا ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ [illegible] کامیابیاں کی ہیں [illegible] طویل نظموں والے قطعات کا تجزیہ کر کے [illegible] مختصر نظموں کے جہان کو ترقی دی ہے ——— میری رائے میں [illegible] کوئی آسان کام نہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہر بے تعلق نظم قطعہ ہو سکتی ہے مگر ان کا یہ خیال غلط ہے کیونکہ قطعے میں جہاں آرائی کی گنجائش نہیں اس کے برعکس نظم کی بعض اقسام تخیل کے زور سے چلتی ہیں۔ اسی طرح رباعی بلکہ کر اس کو قطعہ کہہ دینا بھی بے اصول بات ہے۔ قطعہ چار مصرعوں میں سمیٹا جا سکتا ہے مگر قطعے کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ اس کا دامن رباعی سے وسیع ہو تاکہ بات قدرے تفصیل کر کہی جا سکے۔ قطعے کی دوسری سرحد اس سے بھی زیادہ صبر آزما ہے یعنی اگر تعداد اشعار میں [illegible] پیدا ہو جائے (یعنی شعر زیادہ ہو جائیں) تو مضمون پھیکا ہو جاتا ہے۔ ——— حالی ان صبر آزما مراحل میں کہیں کامیاب ہوئے ہیں اور کہیں پاؤں سنبھال نہیں سکے مگر ان حالات میں شاید کوئی اور بھی سنبھل نہ سکتا۔

مختصر یہ ہے کہ حالی روایتوں کے شناسا تھے اس لیے انہوں نے قطعے کی بنیادی شرائط سے اطلاع کا عمل ثبوت بہم پہنچایا ہے اور قطعے کی تکنیک کا خاص خیال رکھا ہے اور اس نقاد شاعر سے یہی توقع تھی۔

ان سب باتوں کے باوجود حالی کے قطعات میں کچھ کمزوریاں بھی ہیں جن کا تعلق ان کے علم اور شعور سے نہیں ان کی طبیعت سے ہے۔ حالی کا یہ طبعی خاصہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں بات کو پھیلا کر بیان کرنا چاہیں وہاں ایک طرح کی بے لطفی پیدا ہو جاتی ہے ——— اور اگر

نمک پیدا ہونا بھی ہے زہر پھیلا پھیلا ——

ان کمیوں میں سیاسی بات بہت ہے اور کمزوری حالی کی بھی ہوئی تاہم ان کے سب قطعات پر محیط نہیں۔ صاف زبانوں میں صاف صاف بات کہنے کی صورتیں پیدا ہوئی ہیں، بعض قطعے زور دار ان کے اپنے ہی قول کے مطابق اصل نے نمک ہی اور ان کے بعض قطعے ایسے ہیں جو جبر کے عدم تناسب کے سبب اپنا اثر کھو بیٹھے ہیں۔

قطعات حالی کی ایک اور کمزوری یہ ہے کہ ان کا رجحان طرز خطاب زیادہ صاف کھلا ہے۔ قطعہ کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ بات گفتگو کا نتیجہ شاعر کی زبان سے ادا نہ ہو بلکہ سامع از خود بخود اپنا نقش دل پر مرتسم کرتا جائے مگر حالی اکثر اپنی زبان سے نتیجہ یا اصلاحی سبق کہہ دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس انکشاف دلی بیان سے قطعے میں وہ بات نہیں پیدا ہو سکتی جو سامع پر اثر انداز ہو کر اس کو سوچنے پر مجبور کر سکے۔

ایک دوسری بات یہ کہ حالی اپنی عام عادت کے مطابق بیان میں اختصار کی جگہ بسط و درازی پھیلاؤ کے طالب رہے ہیں۔ اسی عادت کے زیر اثر انہوں نے چھوٹے قطعوں سے اکثر دامن بچایا ہے اور لمبے مکالموں یا حکایتوں کا سہارا ڈھونڈا ہے جو طویل بیان کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قطعے میں واقعہ کا ہونا ایک پسندیدہ بات ہے مگر قطعے کی حکایت اور عام حکایت میں شاذ فرق ہے۔ مثلاً عام حکایات میں اختصار ضروری نہیں سمجھا جاتا مگر قطعہ کی حکایت میں اختصار بنیادی چیز ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی کہ زمانے کے قطعات کی طرح قطعے کو تاریخی واقعہ نگاری کا وسیلہ بنانا مقصود ہو۔ جس قطعے میں واقعہ نگاری مقصود ہو اس میں واقعہ [illegible] کا محض اساس بنانا مقصود ہوتا ہے۔ حکایتی قطعات پڑھ کر معلوم ہوگا کہ ان میں واقعہ نگاری کی طرف رجحان ہے۔ ان کے یہاں واقعہ خاص اہم بنا ہے۔ بہر حال حکایت میں واقعہ پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا اور واقعہ مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ صرف واقعہ کی روح کا انکشاف تو مقصود ہوتا ہے اور یہی [illegible] نے کیا ہے۔

حالی کے یہاں طویل بیان و پھیلاؤ کا میلان کچھ زیادہ پایا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ بھی واقعات سے کسی حقیقت ہی کا انکشاف کرتے ہیں مثلاً قطعہ (چیونٹیوں کا بڑا بن جانا)، قطعہ (سب سے بڑا پسند امیر نامہ کی تضحیک)، قطعہ (رحم کر کے بیک مال کی توقع رکھنی)، قطعہ (نوکروں پر سخت گیری کرنے کا انجام)، قطعہ (معاشرہ و لوگوں کا رزق و ساتھ کے ساتھ) وغیرہ وغیرہ —— ان میں سے اکثر میں حالی نے زندگی یا کسی اخلاقی حقیقت ہی کا انکشاف کیا ہے مگر ان میں سے بعض قطعات بے ڈھنگے ہو گئے ہیں مثلاً "قوم کی پاسداری" اور "چیونٹیوں بازی کا انجام" بہت اچھی حکایتیں ہو سکتی تھیں مگر ان میں آخر تک پہنچتے پہنچتے حکایت کا زور کم ہو گیا ہے یوں ان نظموں کا ڈھانچہ قطعاتی ہی ہے لیکن بیان کا زور کم ہے اور آخر میں تو عبارت کی لہر بہت کمزور پڑ جاتی ہے۔

حالی کے زوردار قطعے وہ ہیں جن کے آخر میں تضمین ہے۔ ایسے قطعے جن میں تضمین کے ارد گرد شعر گئے ہیں۔ ہر ایک قطعہ آخری شعر کی تضمین کی طرف بڑھتا گیا ہے اور آخر میں مصرع تضمین پر پہنچ کر اثر کی انتہا ہو جاتی ہے مثلاً مشاعرہ کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر کہ پڑھیے، اس قطعے میں ایک وحدت یا تاثر سے جس کے [illegible] باقی اشعار لپیٹے گئے ہیں اور قطعے کی تفصیل یا تذکرہ ذکر کرنے کی بجائے اثر میں اضافہ کر رہی ہے۔ چیونٹیوں کا پر بن جانا بھی ایک تضمینی قطعہ ہے۔ اس میں واقعہ کی بات بھی ہے اور بیان بھی اور تضمین نے تو خاص زور پیدا کر دیا ہے۔

میں کہہ آیا ہوں کہ قطعے میں دو چیزیں اہم ہوتی ہیں۔ ایک چیز تو ہے کسی حقیقت کا اظہار۔ یہ واقعہ و مکالمہ کی صورت میں ہو تو بہتر ہے اور دوسری اس کا برجستہ انداز بیان جس میں طنز کی نیز بے ساختہ تاثیر کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ حالی بیانِ حقیقت اور واقعہ و مکالمہ کی حد تک تو ٹھیک

[illegible] ۔ ایک قطعہ ملاحظہ کیجئے ۔

[illegible]

یہ قطعہ کتنا سپاٹ، کتنا خشک، کتنا بے نمک ہے۔ ہر قطعے کے آخری مصرعے میں [illegible] [illegible] جاتا ہے [illegible] قطعہ ملاحظہ کیجئے ۔

[illegible]

اس قطعے میں ایک عادت [illegible] کی نشان دہی ہوتی ہے مگر [illegible] اس لیے کہ بات سپاٹ انداز میں کی گئی ہے اور سپاٹ انداز بیان اطلاع یا طنز کی حد تک ٹھیک ہے مشتعل کرنے یا چونکا دینے کا فریضہ انجام نہیں دے سکتا۔ [illegible] ظرافت کی [illegible] انشاء کے لوازم ہیں مثلاً تضاد، ناحقیقت یا حقیقت ناقصہ، PARADOX ہے یا ترکیب [illegible] تحریف ہے یا لفظی نکتہ آفرینی ہے یا دور کا قیاس ہے یا تمثیل ہے وغیرہ وغیرہ ——— جہاں تک کہ اکبر کی ادا کی WIT ہے جی کا رہا ہے۔ اگرچہ انھوں نے یہ انداز بہت کم اختیار کیا ہے اور یہ اچھا ہی کیا ہے کیونکہ [illegible] دراصل حالی اس میدان کے مرد نہ تھے یہ میدان اکبر ہی کے اشہب قلم کے لیے مخصوص تھا۔ حالی نے اکبر کے رنگ میں جو قطعہ کہا ہے وہ درج ذیل ہے ۔

جب تک نہ شاہزادہ اٹھارہ سال کا ہو — تخت پدر پہ اس کو مسند نشیں نہ ہونا
قانون ہے بنایا یہ ان مقننوں نے — عالم میں آج کل جو مانے ہوئے ہیں دانا
لیکن کریں نہ اس کی قبل از بلوغ شادی — کہتے ہیں وہ عبث ہے قانون یہ بنانا
نزدیک ان کے گویا عقل و دانش — ہے ملک سے آساں بیڈ کو بس میں لانا

اس قطعے کے آخری مصرعے میں لفظی مزاح موجود ہے مگر اکبر کے اسی قسم کے قطعات کو اس کے برابر رکھ کر دیکھئے تو فرق خودبخود واضح ہو جائے گا۔

سطور بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ میں حالی کے قطعات پر خواہ مخواہ اعتراض کر رہا ہوں۔

میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حالی کے قطعات پر ان کی طبیعت کا اثر ہے جس کی وجہ سے ان میں سے بعض کچھ خشک ہو گئے ہیں اور [illegible] کے پھیکے پھیکے سے جسم میں بعض اوقات جان نہیں ڈال سکے ورنہ یہ امر واقعہ ہے کہ شروع ہی میں حالی نے قطعہ نگاری کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا ہے ——— اور قطعے کی اس روایت کو زندہ کیا ہے جس کا سلسلہ سعدی سے جا ملتا ہے۔ انہوں نے قطعات کی صورت میں اشعار کے مابین [illegible] کر رکھا ہے اور اگر غور کیا جائے تو قطعے میں [illegible] اشعار کی جو آزادی ہے اس کے پیش نظر [illegible] اشعار موضوع [illegible] کی نوعیت کے مطابق [illegible] کی بنا پر ہی سے متعین ہو سکتی ہے۔ اس لیے کسی خاص وزن کی ضرورت نہیں۔

حالی کے دیوان میں کچھ ایسے قطعے بھی ہیں جو موزوں غزل سے کچھ زیادہ ہی لمبے ہیں اور دیوان میں بھی ان کو قصائد ہی کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ یہ قطعات بعض واقعات تاریخی یا موضوعات وقتی کے ساتھ وابستہ ہیں اور بعض کا رنگ [illegible] ہے۔ ان سب میں مضمون کا تسلسل پایا جاتا ہے مگر یہ نثری قسم کی نظمیں ہیں ان میں ایک آدھ کے سوا کسی میں کوئی خاص بات نہیں پائی جاتی۔ ان کے اصل اور معیاری قطعے وہی ہیں جن کے ذکر میں کہہ آیا ہوں کہ حالی نے غور کر جہاں بھی سمیٹنے کی کوشش کی ہے وہاں ہی ان کے یہاں ایجاز سے اعجاز پیدا ہو گیا ہے مثلاً حالی کی رباعیات اور غزل دونوں میں اختصار کی ضرورت نے بلاغت پیدا کیا ہے۔ حالی کی بعض رباعیوں میں بھی قطعات کا رنگ پایا جاتا ہے اور ان کی شوخی و برجستگی اور آخری مصرع کے زور نے ان میں بھی بڑی قوت پیدا کر دی ہے۔

ماحصل کلام یہ ہے کہ حالی کی رباعیات ان کے قطعات سے زیادہ موثر ہیں مگر قطعہ نگاری میں بھی وہ صاحب [illegible] ہیں ——— ان کے قطعات واضح و مکمل کی بنیاد پر کھڑے ہیں اور ان میں [illegible] لطیف رنگ بھی پایا جاتا ہے مگر ان کے طنز میں جو کہ عموماً طور پر ملائمت پائی جاتی ہے اس لیے طویل بیان کے بعد ملائم طنز بیان نرم پڑ جاتا ہے۔ جہاں ایسا نہیں ہوا اور طنز بیان میں [illegible] ہے (مثلاً "دلی کی شاعری کا تغزل" میں) وہاں قطعہ خوب چست بیٹھا ہے۔

بہر حال حالی کے قطعات ان مختصر نظموں کے پیش رو ہیں جن کی حسین ترین شکل شبلی، اقبال، اکبر اور ظفر علی خان کی واقعاتی اور تاریخی نظموں میں ملتی ہے جو یقیناً حالی کے قطعات (اور غیر شاعرانہ نظموں) سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہوں گی۔

اردو ادب اور تحقیق

مظفر علی سید

خیال اور تحقیق ہمارے زمانے کے بدنام ترین الفاظ ہیں۔ خیال یا الفاظ [illegible] کے طور پر [illegible] آدمی کے لیے استعمال [illegible] ہوتا ہے جو نہ نقاد کہلاتا ہو نہ محقق، حتیٰ کہ جنون کو کہا جاتا ہے۔ ہمارے معمولی خوش طبعوں سے لے کر سارے [illegible] پڑھے لکھوں تک کے لیے [illegible] لفظ [illegible] کی ایک ایسی فضا سے گزرتے ہیں کہ اس سے نفرت زیادہ ہوتی ہے [illegible] محسوس ہوتا ہے۔

یہ زمانہ تقسیم کار کا زمانہ ہے۔ ایک صاحب [illegible] کے [illegible] میں [illegible] ہیں [illegible] کی طرف اگر [illegible] کا [illegible] ہے تو کسی [illegible] ماہر خصوصی سے رجوع کرنا پڑے گا۔ [illegible] معرفت [illegible] تقسیم کار نے [illegible] اس طرح داخل ہو گئی ہے کہ ایک خرادیے [illegible] ہوتا تو کہہ [illegible] ہے ایک شاعر [illegible] غلط ہو تا کچھ [illegible] نہیں آتا۔

محمد حسین آزاد نے آب حیات لکھی تو اس بات پر غور کرنا پسند نہ کیا کہ یہ تنقید کی کتاب ہوگی یا تحقیق کا [illegible] مرقع۔ بعد کے لوگ اس الجھن میں پڑ گئے [illegible] کسی نے کہا تذکرہ ہے کسی نے کہا تنقید کی کتاب ہے [illegible] یہ بھی ماننا شروع کر دیا کہ اپنے وقت کا بہت بڑا تحقیقی کارنامہ بھی ہے۔ آزاد نے ایک موضوع انتخاب [illegible] کے لئے [illegible] ہو گیا۔ ذہانت، ذوقِ ادب اور تخیل سب کی ضرورت تھی اور چونکہ ان میں سے کوئی چیز ان پر حرام نہ ہوئی تھی انھوں نے سب کو ملا جلا کر ایک ایسی تحریر ہمارے سامنے پیش کی کہ اردو کا ایک عام پڑھنے والا اُسے [illegible] پڑھتا ہے اور ایک [illegible] طرح عالم اس میں نت نئی باتیں دریافت کرتا رہتا ہے۔

غالب نے آتش کے بارے میں کہا ہے کہ اچھے شاعر تھے مگر یک فنے تھے۔ اس [illegible] میں ایک جہان معنی مضمر ہے۔ آتش اردو کے ان چند شاعروں میں سے ہیں جو مجبور ہے غزل کے سوا کچھ نہ کہا اور اس کے باوجود غزل میں کسی نئے انداز یا اسلوب کے حامل نہ بن سکے۔ جو ادیب یا شاعر اپنے آپ کو ایک ہی صنف کلام تک محدود کر لیتا ہے وہ اس میں بھی کوئی مجتہدانہ شان پیدا نہیں کر سکتا۔ ہمارا زمانہ اس کے برعکس سوچتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ سوچتا نہیں کہتا ہے۔ فلاں صاحب غزل بہت اچھی کہتے ہیں، فلاں رباعی کے استاد ہیں، فلاں نے قطعات اچھے کہے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔ یہ بات جس طرح لوگ سمجھتے ہیں یا سمجھنا چاہتے ہیں کہ مختلف اصناف کلام، لفظوں کی مختلف ترتیب پیش کرتے ہیں اور ان میں سے کوئی ترتیب ایسی نہیں کہ ایک پر حرام ہو اور دوسرے پر حلال۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کا ذہن ہی ایسا ہو کہ ایک خاص ترتیبِ الفاظ سے باہر نہ نکل سکے مگر یہ کہ سب ذہن ایک سے ہو جائیں اور ایک ایسی

خواہش ہے جو ہماری جمہوریت بھی پوری نہیں کر سکتی۔

ہمارے ہم عصر جو خود کو تخلیقی فنکار کہتے ہیں، نقادوں سے گلہ رکھتے ہیں۔ اس شکوے شکایت کی وجہ یہ ہی ہو سکتی ہے کہ اگر ان کا نام کسی لمبی فہرست میں آ جائے تو خوش ہو جاتے ہیں مگر بعض حالات میں حدود سے بڑھ کر ہی صنف کلام سے ملتی ہے جسے تنقید کہا جاتا ہے۔ یہ بات اب عام طور سے مانی جاتی ہے کہ تنقید ایک جز صنف ادب ہے اور اس کے لکھنے والے بھی زیادہ صلاحیت کے مستحق نقاد لوگ اس صلاحیت کا اپنے تخلیقی ہم عصروں سے لیے کی کمانے ایک بیٹھے بٹھائے بن جاتے ہیں۔ وہ طبقہ جو محققین کرام کے نام نامی سے موسوم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تنقید حقیر ہے تو تحقیق حقیر تر۔ نقاد تو پھر بھی زندہ ادیبوں کے کسی کام آ سکتے ہیں، یہ محقق لوگ تو گڑے مردے اکھاڑتے رہتے ہیں اور ان کتابوں یا مصنفوں پر اپنی توجہ صرف کرتے ہیں جن کو کوئی نہیں جانتا اور کوئی نہیں جاننا چاہتا۔

تخلیق، تنقید اور تحقیق ہماری زبان میں باہم دست و گریباں ہیں۔ اگرچہ اس جنگ و جدل کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں انگریزی زبان کے چند ایک محقق حضرات نے سترھویں صدی کے شاعروں پر توجہ کی۔ ان کا کلام نئے سرے سے مرتب کیا، اس پر حواشی اور دیباچے لکھے جس سے تنقیدی پس منظر میں ان شاعروں نے جو گری کی تھی اسے واضح کیا۔ یہ کلام ان کے ذریعے سب سے نوجوانوں میں رائج ہوا اور وہ نوجوان جو نئے زمانے میں نئی شاعری کرنا چاہتے تھے ان کو اس پرانی شاعری میں کچھ ایسی چیزیں نظر آئیں جو انگریزی ادب میں فراموش کر دی گئی تھیں اور جن کو ایک نیا موڑ دیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ان محقق حضرات کے ذریعے انگریزی شاعری کا دور پہلی مرتبہ سامنے آیا۔ اس نے شاعری کے ایک نئے دور کو جنم دیا اور اس طرح روایت کا تجربے سے رشتہ بندھا۔

تجربہ اور روایت کی بحث ہمارے دور کی معمولی بحثوں میں سے ہے۔ اور ہم اپنے نقادوں کو اس بحث کی دونوں اطراف میں بڑی آسانی سے تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے ادب ہمیشہ روایت ہے۔ دوسرا کہتا ہے یہ چیز ہمیشہ تجربہ ہے۔ ایک کہتا ہے کہ حال، ماضی کی کوکھ سے پیدا ہوتا ہے اور چاہے نہ چاہے اسے پیدا ہونا ہی پڑتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو خود جنم دیتے ہیں اور تخلیق ادب کا ماضی سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ ایک گروہ غالب کا یہ شعر پڑھتے سنتا ہے ؎

ہرزہ مشتاب و پئے جادۂ شناساں بردار
اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

اور دوسرا یہ شعر ؎

تو اے کہ محو سخن گسترانِ پیشینی　　مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

دونوں گروہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ یہ شعر ایک ہی آدمی نے کہے تھے اور محقق حضرات خصوصاً اس بات پر توجہ نہیں کرتے کہ غالب نے پہلا شعر کب کہا اور دوسرا کب۔ وہ اس بات کو جان سکتے تھے کہ پہلا شعر اس نے اس وقت کہا جب وہ اپنے نکالے ہوئے راستے کو ماضی کی شاہراہ سے مربوط کرنا چاہتا تھا اور دوسرا شعر اس وقت کہا تھا جب اس کا واسطہ ماضی پرستوں سے پڑا تھا جو باندھی ہوئی لیک پر چلنے پر فخر کرتے تھے اور جو بھی کوئی نیا راستہ نکالنا چاہتا تھا اس کو گمراہ سمجھتے تھے۔

[illegible] ۱۹۰۰ ء [illegible] ۱۸۵۷ ء [illegible] کے بارے میں کہا ہے کہ [illegible] کے نزدیک
[illegible] حالی کی شاعری [illegible] شاعری [illegible] کی بنا پر [illegible]
[illegible] حاصل کرنے رہتے ہیں [illegible] نہیں کر پایا [illegible]
[illegible] کی دولت سے [illegible] اشاعت [illegible] کے [illegible]
[illegible] سرکاری [illegible] ہماری [illegible] کی کوشش ہی کرتے ہیں۔

آزادی کے فوراً بعد یہ محسوس کیا جانا چاہیے تھا کہ ہمیں اپنے ادبی ورثے کو محفوظ اور شائع کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ اُردو زبان کے بیشتر قلمی نسخوں کی صورت میں ہندوستان کے کتب خانوں میں رہ گئے تھے یا نادر کتابیں جن میں ہمیں بڑی قیمتی [illegible] کا ذخیرہ تھا [illegible] لکھنؤ، علی گڑھ، رامپور، دہلی اور حیدرآباد [illegible] کی لائبریریوں، نجی ملکیتوں سے بھی بڑی [illegible] پر توجہ کی ضرورت تھی۔ برٹش میوزیم، انڈیا آفس لائبریری اور یورپ کے عجائب گھروں اور کتب خانوں میں بے شمار قدیم تحریریں محفوظ تھیں۔ بقول اقبال ؂

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

ہماری وزارت تعلیم اور یونیورسٹیاں اس قومی امانت کو واپس لینے یا اس کی عکسی نقلیں حاصل کرنے کے لیے بہت کچھ کر سکتی تھیں۔ اس کام کی اہمیت کا احساس ہی نہ کیا گیا۔ نتیجہ یہ کہ اہل علم کے دل کی پارہ پارہ ہوتے رہے اور علم ہماری دسترس سے دور ہوتا گیا۔

ہماری نت نئی حکومتوں کو یہ اندازہ تو دیکھنا چاہیے کہ انھوں نے انڈیا آفس لائبریری کی تقسیم کے لیے کچھ نہ کیا مگر مختلف ادبی جو سرکاری امداد سے وجود میں آئے اس کی کسی حد تک تلافی کر سکتے تھے اگر وہ اہل علم، اسے کام کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر اور دیانت سے کام لیتے۔ ان کے مقابلے میں تو تجارتی اداروں نے ہی بہتر کام کرنے کی کوشش کی ہے۔ امداد یافتہ اداروں نے آج تک اردو کی کوئی ایسی بنیادی کتاب شائع نہیں کی جو پہلے اُن سے بہتر حالت میں نہ چھپ چکی ہو۔ فغان دہلی، دیوان شیفتہ اور حیات جاوید، ایک ادارے نے شائع کیں لیکن یہ تینوں کتابیں مطبوعہ ایڈیشنوں کی نقل ہیں، کتابت کی بے شمار غلطیوں کے اضافے کے ساتھ۔ نہ ان کتابوں کو نئے انداز سے مرتب کیا گیا نہ ان میں نیا مسالہ شامل ہو سکا، یہاں تک کہ ان کی ظاہری صورت بھی پہلے سے بہتر نہ بن سکی۔ معلوم نہیں اس انداز کے کام کے لیے سرکاری امداد کی کیا ضرورت تھی۔ بلکہ اس سے بہتر کام تو بغیر امداد کے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ یہی عالم کراچی کے ایک امدادی ادارے کا ہے جس نے بیش قرار امداد پانے کے بعد صرف 'باغ و بہار' کا ایک ایڈیشن شائع کیا اور وہ بھی ایک برطانوی ایڈیشن کی نقل۔ پاکستان کی کسی یونیورسٹی نے اردو ادب سے متعلق کوئی کتاب شائع نہ کی۔ حالانکہ آزادی سے پہلے پنجاب یونیورسٹی کبھی کبھار ایسی غلطی کر دیا کرتی تھی۔

بزم اقبال، اقبال اکیڈمی، مجلس ترقی ادب، ادارہ ثقافت اسلامیہ، اکادمی، اردو ٹرسٹ، اور انجمن ترقی اردو کی جدید مطبوعات میں اول تو صرف دس پانچ کتابیں ایسی نکلیں گی جو اردو ادب سے متعلق ہوں۔ پھر کئی برسوں کی امداد کے بعد بھی ہنوز روز اول کا سا معاملہ ہے ہمارا قومی ورثہ بدستور کیڑے مکوڑوں کی خوراک بن رہا ہے یا ان عجائب گھروں اور کتب خانوں کی زینت ہے جو ہماری دسترس سے باہر ہیں

ان اداروں کے مقابلے میں ہندوستان کے افراد، تجارتی فرموں اور ہم نے جن اداروں کا کام دیکھیں تو غیرت سے آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ مسلمان تو اداروں سے بغیر ہی ایسا کام کر گزریں اور ہم امداد کے باوجود کچھ نہ کر سکیں، اس سے شرمناک بات کیا ہوگی۔

قومی ورثے کو محفوظ کرنے والی فرم ملک کے امداد حاصل کرنا احساس کمتری کی دلیل سمجھتا، شاید اس سے بہتر کام ہمارے ادارے کے بس میں نہیں تھا۔ ایک صدی پہلے ایک ہندو تاجر نے تاجرانہ مصلحتوں سے کام لے کر اس قومی ورثے کو چھاپ کے بیچنے کا ارادہ کیا اور یوں نولکشور پریس وجود میں آیا۔ اس اکیلے آدمی نے اپنے محدود وسائل کی مدد سے وہ کام کیا کہ ہمارے امداد یافتہ ادارے اہل علم کی امداد سے بھی شاید ایک صدی تک نہ کر سکیں۔ منشی نولکشور تو خیر ایک لاجواب شخصیت تھے، ہمارے ادارے تو نظامی پریس کا بھی تک کا مقابلہ نہیں کر سکے جس نے اردو ادب کی کئی ایک کتابیں دیدہ زیب انداز میں چھاپ کے انھیں رواج دیا۔ اس ادارے کی پشت پر بھی اس زمانے کے دو ایک اہل علم تھے جو نام نمود اور بیش قرار معاوضوں کی بجائے علمی کام میں دلچسپی رکھتے تھے۔

یہاں یہ سوال کرنا بالکل ٹھیک ہوگا کہ آخر اس قومی ورثے میں ایسے کیا لعل جڑے ہیں کہ اسے محفوظ کیا جائے یا زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچایا جائے۔ کیا ہمارا عصر اور جدید ادب کافی نہیں ہوتا؟ کیا اس کام پر ضرورت سے زیادہ توجہ دینے سے مردہ پرستی کا رجحان پیدا نہیں ہوگا؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ماضی سے بے تعلقی ماضی پرستی کو جنم دیتی ہے، ہم اپنے قومی ورثے سے جتنی گہری واقفیت پیدا کریں گے اسی قدر نئے کام کی طرف راغب ہوں گے۔ ہمارے دور میں بدترین قسم کی مردہ پرستی کا رواج ہے اور اس کا اصل باعث یہ ہے کہ ہم اپنے ماضی کے کارناموں اور شخصیتوں سے اچھی طرح واقفیت نہیں رکھتے۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ان میں کون واقعی قابل احترام ہے اور کیوں! جب ہم یہ جان لیں گے تو عزت و احترام کی بنیادیں بھی مضبوط ہو جائیں گی۔ اور معیار نظر بھی بلند ہوگا۔

ہمارے تخلیقی فن کار اس قسم کے کام پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور اس حد تک وہ بالکل درست ہیں کہ جس انداز میں یہ کام ہمارے یہاں ہوتا ہے اس سے نہ ہونا ہی بہتر ہے مگر اس صورت حال سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ ماضی کا تمام ورثہ دریا برد کر دینا چاہیے۔ یہ غلط فہمی بھی عام ہے۔ یہ پائی جاتی ہے کہ تخلیقی فن کار کو ایسے کاموں سے دور رہنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم اگر سچا ہے تو تخلیق کے لیے زہر کا حکم نہیں رکھتا، اکسیر کا کام دیتا ہے۔ شبلی، حالی اور آزاد کی تخلیقی صلاحیتوں نے علم و فضل کی دولت سے جلا پائی تھی اور آج بھی یوں ہونا ممکن ہے۔ اس سے ذرا چھوٹے پیمانے پر حسرت موہانی کی شخصیت ہے۔ جنھوں نے ماضی کا ورثہ محفوظ کرنے کی انفرادی کوشش کی اور اس کوشش میں ان کی شاعری دبنے کی بجائے اور نمایاں ہوئی۔ "انتخاب سخن" کی گیارہ جلدوں میں اردو غزل کی روایت کا بہترین حصہ محفوظ ہو گیا ہے اور ان میں ایسا ذخیرہ بہت سا ہے کہ حسرت موہانی اس طرف توجہ نہ کرتے تو اب تک تلف ہو چکا ہوتا۔ تیس ایک سال پہلے کئے گئے اس کام پر ہمارا زمانہ اب تک کوئی خاص اضافہ نہ کر سکا۔ شاہ حاتم، قائم، مصحفی، جرأت وغیرہ سے ہماری جو واقفیت ہے۔ آب حیات کے بعد حسرت موہانی ہی کے ذریعے پیدا ہوئی ہے۔ ہمارے زمانے نے ان ناموں کی قدر کرنا تو سیکھ لیا مگر اس قدر دانی کا جو حق تھا اسے ادا نہ کیا۔

حسرت موہانی مرحوم کا یہ کام بحیثیت تحقیقی کام تو نہیں کہا جا سکتا مگر اُس قسم کے شاعروں کی فخریہ جہالت کے مقابلے میں یہ کام بھی علمی ہی کہلائے گا۔ تحقیقی کام اسے اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ترتیب و تدوین کے جدید علمی اصول یہاں استعمال نہیں کئے گئے۔ یہ جدید علمی اصول یورپ کی درسگاہوں اور کتب خانوں میں متعین کئے گئے۔ ان میں سے بعض ہماری کلاسیکی زبانوں کے علماء کی نظروں سے بھی اوجھل

میں ہے کہ مسلمانوں میں تحقیق کا کام یورپ کے علماء نے ہی شروع کیا [illegible] شاعروں کے [illegible]
میں ہوئے۔ جرمن عالم ڈاکٹر اشپرنگر نے [illegible] کیا۔ [illegible] بھی [illegible]
میں بھی ایشیاٹک سوسائٹی [illegible] سے شائع ہوئے۔ اگرچہ [illegible] مشہور [illegible] مگر [illegible]
کی اہمیت کا دخل یہاں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ گارساں دتاسی جن کا نام [illegible] خاندانوں کے [illegible] نہیں [illegible]
یہ فن تحقیق کے امام کی حیثیت کا مالک ہے۔ [illegible] فرانسیسی عالم [illegible] کی تصنیف [illegible]
ملک کے انقلابات کئے۔ اردو ادب کی تاریخ [illegible] مشرقی [illegible] حقیقت رکھتی ہے۔ [illegible]
کے [illegible] کا ابھی تک صحیح اندازہ نہیں کیا گیا۔ [illegible] تاریخ ادبیات ہندوستانی [illegible] اردو میں ترجمہ نہیں ہوا مگر
یہ بات بھی جانتے ہیں کہ [illegible] غلطیاں [illegible] رسالوں کے [illegible] اردو کے [illegible] شاعروں کی [illegible] ڈاکٹر [illegible]
نہیں [illegible] کے خطبات اردو میں [illegible] ہو کر [illegible] حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی انہوں نے اردو ادب پر [illegible] کام کیا۔
فرانسیسی زبان میں کئی ایک اردو تحریروں کے ترجمے کئے اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ اردو شاعروں کے چند ایک [illegible]
علمی اصولوں کی بنیاد پر مرتب کئے۔ چند ایک تصنیف کے علاوہ اس سلسلے میں ان کا سب سے بڑا معرکہ کلیات ولی کی ترتیب و تدوین تھا۔
جس سے ہمارے یہاں پورا فائدہ اٹھایا نہیں گیا اور اس کے طریق پر ہمارے ہاں [illegible] اردو میں [illegible] ہوا۔

دتاسی کے علاوہ دوسرا بڑا نام ڈاکٹر فیلن کا ہے جس نے ایک عمدہ ہندوستانی انگریزی لغت کے علاوہ "باغ و بہار" کا بہترین ایڈیشن بھی نئے سرے سے مرتب کر کے شائع کیا جس کی اہمیت کا یہاں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ [illegible] علماء [illegible] اس کی نقل کرتے چلے جاتے ہیں۔ افسوس کہ دتاسی اور فیلن کی طرح کے لوگ یورپ میں پیدا ہونے بند ہو گئے اور یہ کام [illegible] بہت تنگ جا سکتا تھا۔ مشرقیات سے دلچسپی رکھنے والے یورپی علماء نے عربی، فارسی اور ترکی پر اپنی توجہ مرکوز کر دی اور اردو زبان کی وسعت اور معنویت کو فراموش کر دیا۔ ای۔ جی۔ براؤن، نکلسن، روزن، اور ان کے بعد آربری نے اردو ادب کو کوئی خاص اہمیت نہ دی اور ان کے پڑھائے ہوئے ہندوستانی علماء نے بھی ان کی طرح فارسی عربی ادب پر ہی توجہ دینا پسند کی۔ مولوی محمد شفیع، پروفیسر اقبال مرحوم اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے خود اردو ادب پر کوئی خاص کام کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

جدید علمی بنیادوں پر اردو ادب کی دنیا میں تحقیق و تفتیش کا کام ہمارے علماء نے بڑی دیر میں شروع کیا اور اس [illegible] ایک پرانی قسم کے عالم نے کی۔ مشہور شاعر اختر شیرانی کے والد حافظ محمود شیرانی مرحوم مستشرقین کے شاگرد نہ تھے مگر برٹش میوزیم کی ملازمت کے دوران میں جدید علمی اصولوں سے انھوں نے ضرور آگاہی پیدا کی ہو گی۔ "پنجاب میں اردو" اور "تنقید شعر العجم" ان کے مشہور کارنامے سمجھے جاتے ہیں۔ دوسری کتاب فارسی شاعروں پر نئی تحقیق پیش کرتی ہے مگر ان کی ایک دوسری کتاب "فردوسی پر چار مقالے" کی طرح اردو میں لکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے پرتھوی راج راسو پر تاریخی کام کیا اور محمد حسین آزاد کی تحقیق میں غلطیاں نکالیں۔ "مقالات شیرانی" میں قصہ چہار درویش اور میر جعفر زٹلی پر ان کے مضامین کا بھی اسی سلسلے میں تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کا مرغوب انداز تحقیق خوردہ گیری اور نکتہ چینی کا ہے۔ ان کی توجہ اس بات پر زیادہ مرکوز رہتی ہے کہ پچھلے لوگوں نے کیا کیا غلطیاں کیں اور کیا کیا حماقتیں ان سے سرزد ہوئیں۔ ان کا علم و فضل اس قابل تھا کہ اس سے کوئی مثبت قسم کا کام لیا جاتا۔ "پنجاب میں اردو" اس قسم کا ایک کام تھا اور قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ

"مجموعۂ نغز" بھی انھوں نے ایڈٹ کر کے پنجاب یونیورسٹی سے شائع کیا۔ پنجاب میں ان کا طویل قیام اور شاگردوں کے حلقے پیدا ہونا اس بات کا متقاضی تھا کہ اردو ادب میں تحقیق کا ایک نیا دور شروع ہوتا مگر ان کی ذات سے خورده گیری اور تفاصیل پرستی کے رجحانات نے بعد ترجمانی اور تحقیقی کام میں مذہبی مناظرے کا سا انداز پیدا ہوا۔ ندوہ اور علیگڑھ سے ان کی لڑائیاں سالہا سال جاری رہیں اور بہت سا وقت اور کاغذ ان پر برباد ہوا۔ انجمن ترقی اردو نے بھی جو ان کی مزید اور بہتر امید تھی۔ ان سے کوئی اچھا کام نہ لیا۔ اور اس طرح ایک نہایت دقیق النظر عالم ذاتی اور گروہی منافشوں کا شکار ہو کے رہ گیا۔ شیرانی مرحوم نہ پوری طرح پرانی قسم کے عالم تھے نہ پوری طرح نئی قسم کے وہ درختوں کے پتوں اور ان کے رگ ریشوں پہ بے حد توجہ کرتے تھے اور درخت کو بھول جاتے تھے۔

اسی زمانے میں انجمن ترقی اردو نے منشی نولکشور کے انداز پر مگر خالص علمی دعووں کے ساتھ قومی ورثے کو محفوظ کرنے کا پروگرام شروع کیا۔ ان دو اداروں میں کوئی فرق تھا تو یہ کہ منشی نولکشور کی توجہ قومی سرمائے کے تخلیقی حصے کو محفوظ کرنے پر مرکوز تھی اور انجمن نے اس کے علمی حصے کو اپنا مخصوص میدان بنایا۔ شاعروں کے دیوان، مثنویاں اور قصے کہانی کی کتابیں انجمن کے زیر اہتمام بھی طبع ہوئیں۔ مگر ان میں کوئی ایسی نہ تھی کہ بنیادی اہمیت کی مالک ہوتی یا کوئی بڑا کام سمجھی جاتی۔ زیادہ تر توجہ شعراء کے تذکروں پہ کی گئی۔ مولوی عبدالحق معتمد انجمن نے بہت سے تذکرے مرتب کر کے انجمن کے زیر اہتمام طبع کروائے۔ میر، گردیزی اور قائم کے تذکرے، مصحفی کے تین تذکرے مخزن شعراء، گلشن ہند اور چمنستان شعراء انھوں نے ایڈٹ کر کے چھاپے۔ اس کے علاوہ ذکر میر، سب رس، قطب مشتری، من لگن، دیوان تاباں دیوان اثر، مثنوی خواب و خیال، باغ و بہار، آرائش محفل (افسوس) اور رانی کیتکی کی داستان بھی ان کے دیباچوں کے ساتھ طبع ہوئیں۔ ترتیب و تدوین کے ساتھ ساتھ انھوں نے چند ایک مضامین بھی لکھے اور بیجاپور کے ملک الشعراء 'نصرتی' پر ایک پوری کتاب تصنیف کی۔ ملک کے اہل علم نے ان کے ساتھ تعاون کیا اور انجمن کے لیے کتابیں مرتب اور تصنیف کیں۔ شیخ چاند مرحوم کی تصنیف "سودا"، احسن مارہروی اور ان کے بعد نورالحسن ہاشمی کی مرتبہ "کلیات ولی" مرزا فرحت اللہ بیگ کے مرتبہ "دیوان یقین" اور "دیوان نظیر" نواب حبیب الرحمن خاں شروانی کا مرتبہ "تذکرہ میر حسن" اور مسعود حسن رضوی کا مرتبہ "دیوان فائز" اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ آزادی کے بعد انجمن مہاجر ہوئی تو یہ کام جاری نہ رکھا جا سکا اور "دیوان فغاں" کے علاوہ کوئی نئی کتاب انجمن نے شائع نہ کی اور یہ دیوان بھی خود انجمن کے قائم کردہ معیار کو برقرار نہ رکھ سکا۔

ترجمہ اصطلاحات، انگریزی اردو لغت اور قواعد پر مولوی عبدالحق کے وقیع کام کا ان کتابوں میں اضافہ کیا جائے تو ایک بہت بڑی علمی شخصیت کی تصویر ابھرتی ہے مگر اس میں شک نہیں کہ انجمن کے وسائل بھی بہت وسیع تھے اور بہت سے اہل علم کا تعاون انھیں حاصل تھا۔ پھر بھی جدید علمی اصولوں پر مولوی عبدالحق کا انداز ترتیب اور ان کے دیباچے پورے نہیں اترتے۔ منشی نولکشور آنجہانی کی طرح ان کا مقصد بھی قومی ورثے کو محفوظ کرنا تھا، اور اس محدود مقصد کو سامنے رکھا جائے تو ان کے کام کی اہمیت نمودار ہوتی ہے۔ آزادی کے بعد یہ کام جاری نہ رہ سکا تو اس کی بڑی وجہ مولوی صاحب کا بڑھاپا ہے۔ اگرچہ بعض دوسرے اہم کاموں میں وہ اب بھی جوانوں کی طرح مستعد ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ اپنے طویل تجربے اور اقتدار سے کام لے کر نوجوان محققوں کی ایک جماعت تیار کر دیتے مگر شیخ چاند مرحوم کے بعد کوئی ایسا نوجوان انجمن نے پیش نہ کیا۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر مسعود حسن رضوی اپنے ذاتی کتب خانے اور انفرادی کام کے لیے معروف ہیں اور ایک متوازن طبیعت

[illegible] ادب اور نقاد کی حیثیت سے ہیں۔ [illegible] چند ایک تحقیقی مقالات بھی لکھے ہیں۔ انھوں نے [illegible] کی [illegible] [illegible] کے بعد [illegible] [illegible] [illegible] دلچسپی رکھنے والوں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہے۔ اس کے تحقیقی مزاج [illegible] اور [illegible] ان کی تصنیف "آب حیات کا تنقیدی مطالعہ" پیش کی جا سکتی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے صرف [illegible] اعتراضات کرنے والوں کو [illegible] جواب دیتے ہیں بلکہ آب حیات کے مصنف کو اردو تحقیق کی تاریخ میں پہلی مرتبہ وہ خراج تحسین ادا کیا ہے جو [illegible] سال سے قرض تھا۔ آب حیات [illegible] اردو زبان کی بہترین کتابوں میں سے نہیں بلکہ اس میں بڑی [illegible] سے بے شمار کتابوں کا [illegible] ہے۔ جو بے انصافی اس کام کے حق میں صفیر بلگرامی، مولوی عبدالحق، مصنف گل رعنا، مرزا فرحت اللہ بیگ، حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود کے ہاتھوں ہوئی تھی، اس کتاب نے بڑی حد تک اس کی تلافی کر دی۔

ایک اور قابلِ احترام شخصیت جو اردو ادب کی تحقیق سے وابستہ ہے مولوی امتیاز علی عرشی صاحب ہیں۔ وہ رضا لائبریری رامپور کے مہتمم ہیں اور ان کے کام کی پشت پر والی ریاست کی علم دوستی اور ہندوستان بھر میں رامپور کی [illegible] ہے۔ مگر انھوں نے اپنے بلند علمی معیار کی مدد سے ان ذرائع کو بہت اچھی طرح استعمال کیا ہے۔ شاہ عالم کی نادراتِ شاہی، انشاء اللہ خاں کی دونوں نثری کہانیاں اور مکاتیب غالب کے جو ایڈیشن انھوں نے شائع کئے ہیں وہ کئی لحاظ سے بے مثل ہیں۔ حال ہی میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے لیے انھوں نے جو "دیوانِ غالب" مرتب کیا ہے اُسے بڑی آسانی سے دیوانِ غالب کا بہترین علمی ایڈیشن کہا جا سکتا ہے! احمد علی یکتا کے تذکرہ "دستور الفصاحت" کو انھوں نے جس طرح ایڈٹ کیا ہے۔ وہ ان کے تحقیقی مزاج اور انداز کی بہترین مثال ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ جو اردو شعرا کے تذکروں کی تاریخ ہے۔ اپنی جگہ ایک الگ تصنیف کا درجہ رکھتا ہے۔ جس طرح "مکاتیب غالب" کا دیباچہ غالب کی زندگی کا ایک عمدہ خاکہ بھی ہے۔ مسعود حسن رضوی کی طرح وہ تنقیدی نظر بھی رکھتے ہیں جو اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ کونسا کام ان کی محنت کا مستحق ہے۔ اس کے بعد وہ دقتِ نظر اور وسعتِ مطالعہ دونوں سے کام لیتے ہیں اور اپنی تحقیق کے نتائج سنجیدگی آمیز سادگی کے ساتھ

واضح کر دیے ہیں اور اسی لیے ان کی تحقیق بھی فنی مناقشوں سے بہت دور ہے۔ ان کے کام کی رفتار بہت دھیمی اور تیز فہمی حصہ محدود۔ وہ ان کے کام کا انداز ہے مگر یہ محسوس ضرور ہوتا ہے کہ وہ اردو کی ان نئی کتابوں کو بھی نئے سرے سے مرتب کریں جو اب تک ان کی تحقیق نظر کی محتاج ہیں مثلاً کلیات میر، کلیات سودا وغیرہ۔ اب تک ان کی توجہ زیادہ غالب پر رہی ہے اور اس کام میں مولوی مہیش پرشاد، علامہ رسول مہر، مالک رام اور مختار الدین احمد نے ان سے پہلے اضافہ کیا ہے مگر انھوں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کو کوئی دوسرا آسانی سے انجام نہ دے سکے۔

ادبی تحقیق کے میدان میں ایک شخصیت ایسی بھی ہے جس کے سرقہ، تحریر سے، مادہ و قوت کے متعلق باتیں کی جاتی ہیں اور جو حافظ محمود شیرانی کے تحقیقی مزاج کو منطقی انتہا تک لے گئے ہیں۔ یہ ہیں قاضی عبدالودود۔ ناقد، عالم اور محقق جو پٹنہ کے ایک بیرسٹر ہیں اور ایک رسالہ "معاصر" نکالنے کے علاوہ بہت سے ادبی اور تحقیقی جرائد میں مضامین لکھتے ہیں۔ خردہ گیری اور تفحص پرستی کا جو رجحان شیرانی مرحوم کے یہاں نظر آتا ہے وہ قاضی صاحب کی ہر تحریر کی ہر ہر سطر میں ملے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک آدھ مختصر سی کتاب کے علاوہ ان کی کوئی تصنیف یا تالیف دیکھنے میں نہیں آتی۔ اردو زبان کا شاید ہی کوئی عالم اور محقق ایسا ہو جو ان کی زد سے بچا ہو۔ محمد حسین آزاد، نواب نصیر حسین خیال، شاد عظیم آبادی، گارسیں دتاسی اور مولوی عبدالحق تک ان کے محبوب شکار ہیں۔ ان کے تحقیقی مزاج کا بہترین نمونہ ان کا مضمون "غالب بطور محقق" ہے جس میں انھوں نے غالب کو جاہل محض ثابت کرنے اور اس کی وجہ سے اسے رد کرنے پر اپنی پوری علمی طاقت صرف کر دی ہے اور سینکڑوں کتابوں، مضامین اور قلمی تحریروں کا حوالہ دیا ہے۔ انھوں نے زیادہ زور اس بات پر صرف کیا کہ فارسی لغات نویسوں کے خلاف غالب کا جہاد کس پائے کا تھا۔ یہ سوچنا انھوں نے گوارا نہیں کیا کہ اس جہاد کا باعث کیا تھا اور یہ بھی کہ غالب کے خلاف جو پرچم انھوں نے بلند کیا ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ان کے اس طرح کے مضامین سے غالب کی شہرت کو تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ البتہ ان کا اپنا اور چند ایک نوجوان محققین کا مزاج اس سے مزید بگڑ گیا ہے۔ اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ اردو زبان کو قاضی صاحب جیسا وسیع المطالعہ عالم آج تک نہیں ملا۔ مگر یہ بات بھی اردو زبان و ادب اور اس کے مختلف اداروں کی بدقسمتی کی ایک دلیل ہے کہ ان سے آج تک کوئی ایسا کام نہیں لیا گیا جو اردو ادب کے شایانِ شان ہو اور ان کی علمی حیثیت سے بھی درخور نہ ہو۔ خود ان میں تنقیدی نظر کی اس حد تک کمی ہے کہ کام کرنے سے پہلے یہ غور نہیں کرتے کہ وہ ان کی توجہ کا مستحق بھی ہے یا نہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ ان کے علمی دبدبے کے سامنے بڑی آسانی سے ماند پڑ جاتے ہیں مگر ان اساتذہ کے پُراغلاط کام پر توجہ کر کے مثبت کام سے اپنے آپ کو محروم رکھنا قابلِ معافی گناہ نہیں۔ اس سے تو بزرگ خویش قسم کے علماء کو معاف کر دینا زیادہ آسان ہے، جو جتنا بڑا عہدہ رکھتا ہے اس سے اتنی ہی بڑی توقعات وابستہ ہو جاتی ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ اب ایک نقاد کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں مگر ان کی پرانی تحریریں زیادہ تر تحقیق و تفتیش سے متعلق ہیں اور ان کی تنقید سے زیادہ محنت اور گہرائی کی حامل ہیں۔ "اردو شعراء کے تذکرے" ان کا ایک طویل مضمون ہے جو کتابی شکل میں بھی چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ خان آرزو کی اردو فرہنگ "نوادر الالفاظ" کو انھوں نے عالمانہ انداز میں ایڈٹ کیا ہے۔ ان کی انگریزی تصنیف "اردو نثر۔ سرسید کے زیرِ اثر" تنقید سے زیادہ تحقیق کا کارنامہ ہے۔ ان کا تحقیقی مزاج بھی سنجیدگی اور متانت کا حامل ہے۔

[illegible] ابھی یہ تحقیق [illegible] ہے [illegible] تحقیق نگاری [illegible] ہو۔ [illegible] [illegible] ہیں [illegible] کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] تو [illegible] ہے [illegible] [illegible] [illegible] کے [illegible] [illegible] ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی کتاب لکھنؤ کا دبستان شاعری [illegible] شاعری [illegible] تنقید [illegible] کی کتاب میر تقی میر [illegible] حیات اور شاعری [illegible] تذکرہ [illegible] ہے [illegible] کی "صفات" [illegible] "آب حیات" اور [illegible] "تحقیق" [illegible] پیش کرتی ہیں۔ ان تالیفات میں [illegible] کے کام سے پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے اور شاید ہی کہیں [illegible] ہو۔ [illegible] کے سامنے [illegible] ہو گا۔ جب تمکین کاظمی [illegible] حال ہی میں [illegible] کا ایک [illegible] سوانح عمری تحریر کی ہے۔ [illegible] تحقیق سے کام لیا۔

معلمین اردو کی تحقیقات کا موضوع نقاد و ادیب اور شاعر ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی امتحان کے نصاب میں شامل ہیں۔ بدقسمتی سے جو اس دائرے میں نہیں آتے اُن کو ہاتھ لگانا ان کے نزدیک گناہ کبیرہ سمجھا جاتا ہے۔ امدادی کتب کو ہمارے نصاب میں علمی اور ادبی کارنامے بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں تک بھی خیریت تھی اگر ان کتابوں میں کوئی نئی بات یا کوئی وقیع کام ہو جاتا۔ ایسی تالیفات میں جلدبازی اور عبارت آرائی کے نمونے قدم قدم پر ملتے ہیں اور چونکہ مؤلفین کو اپنے موضوعات سے کوئی گہری واقفیت نہیں ہوتی اس لیے ان میں جا بجا ابہام رہ جاتے ہیں۔ ان مقالات نے محققین کے ایک نئے گروہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کی ہے اور نوجوانوں کی تحریروں کا موضوع وہ نوزائیدہ تالیفات ہیں جو معلمین اردو نے اپنے طلباء کی رہبری کے لیے مرتب کی ہیں۔ ان نوجوانوں کی تحریروں میں نا آسودہ ذہن کی کارفرمائیاں بھی ہیں اور ان کی عیب جوئیاں اکثر اوقات "طبقاتی نزاع" کی یاد دلاتی ہیں مگر ان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہی کام بہتر انداز میں بھی کیا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر ابواللیث کی تالیف "لکھنؤ کا دبستان شاعری" اور "مصحفی" پر ڈاکٹر وحید قریشی کے مفصل حاشیے کا یہی عالم ہے۔ وحید قریشی ہمارے جانے پہچانے نقاد ہیں اور یہ بات بڑی حیران کن ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ جیسے پرانے بزرگ تحقیق چھوڑ کے تنقید کی طرف راغب ہوتے ہیں اور نوجوان تنقید نگار تحقیق کی طرف لوٹتے ہیں۔ اصولاً اس میں کوئی خرابی نہیں اس لیے کہ مطالعہ رائے کو جنم دیتا ہے اور رائے کو صائب بنانے کے لیے مزید مطالعے کی ضرورت پڑتی ہے مگر ہمارے اکثر نوجوان اس چکر سے نکلتے ہی نہیں۔

حال ہی میں ہندوستان کے ذہین اور باخبر نقاد ڈاکٹر محمد حسن بھی تحقیق کی جانب مائل ہوئے ہیں اور مبتلا کا تذکرۂ شعراء مرتب کرنے میں مصروف ہیں۔ ہمارے نقاد جب تحقیق کی جانب لوٹتے ہیں تو اپنے تنقیدی پس منظر کو فراموش کر دیتے ہیں۔ پھر ان میں اور کسی پرانی طرز کے عالم میں

نظر نہیں آتا۔ وحید قریشی، ڈاکٹر مختار الدین احمد اور نثار احمد فاروقی پر قاضی عبدالودود کے تحقیقی مزاج کا اثر بھی ہے اور یہ حضرات بھی اور تفصیل پرستی کا وہ جہاں ہمارے زمانے کا عام رجحان پہنچ کے رہ گیا ہے۔

پھر بھی محققین کے اس گروہ میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو ہر سب رائے کو محنت و شفقت کے ساتھ ملا کر جدید مسائل پیدا کرتے ہیں۔ مسعود کی نثری داستانوں پر ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب اور اردو مثنوی پر ڈاکٹر محمد اسلم کے مقالے جدید تحقیق کے دو نمونے پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح آمنہ خاتون نے انشاء اللہ خاں کی زندگی اور کلام پر بہت اچھا کام کیا ہے۔ ایک مرتبہ بھی اسی ضمن میں لیا جا سکتا ہے۔ اردو کے بڑے شعراء پر ادھر جو تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں انہیں پڑھ کر ان کی تحقیق کے تقاضوں اور مطالعے کی وسعت اور گہرائی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ نگار کے داغ نمبر میں حیات داغ پر ان کا مضمون، سحر کا مرتبہ کلام (مجلہ سعادت)، سرور ادارہ، حیات مومن (اورینٹل کالج میگزین) اور میر دلی میں ہماری تحقیق میں ایک نئی آواز کو پیش کرتے ہیں۔ ہمارے محققین نے آج تک اس اختصار کے ساتھ کسی بڑے شاعر کی زندگی کا رخ اور مکمل تصویر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ فائق صاحب کے ان مقالوں میں دو خوبیاں ایسی ہیں جو ہمارے زمانے کے کسی ادبی محقق میں بیک وقت نہیں ملتیں۔ ایک تو یہ کہ وہ جس شاعر کو موضوع بناتے ہیں، اس کو اپنے سماجی پس منظر میں دیکھتے ہیں (ہمارے محقق حضرات اس بات کے عادی ہیں کہ سماجی پس منظر کو الگ پیش کیا جائے اور شاعر کو الگ)۔ دوسرے وہ شاعر کے کلام کو اس قدر غور اور توجہ سے پڑھتے ہیں کہ وہی ان کا سب سے بڑا ماخذ بن جاتا ہے (یہ خوبی بہت کم ہمارے محققوں میں خال خال پائی جاتی ہے اور اکثر اوقات غلط نتائج بھی پیدا کرتی ہے)۔

اس جائزے کے بعد ہمیں دیکھنا ہے کہ ارباب تحقیق کی محنت اور شفقت سے ہمیں کیا حاصل ہو سکتا تھا اور کیا واقعتاً حاصل ہوا ہے۔ جس قومی ورثے کو محفوظ کرنے اور نئے دور تک مناسب شکل میں اور تاریخی پس منظر کے ساتھ پہنچانے کا مقصد یہ تحقیق انجام دے سکتی تھی، اس میں سے محض ایک ابتدائی قسم کی کامیابی حاصل ہوئی ہے اور یہ کامیابی بھی زیادہ تر افراد کی مرہون منت ہے۔ ابھی تک اردو زبان و ادب کے بڑے بڑے کارنامے حشرات الارض کی خوراک بن رہے ہیں، بدیسی عجائب گھروں اور کتب خانوں کی زینت بنے ہیں یا غلط ملط انداز میں طبع ہوئے ہیں۔ ان حالات میں عام پڑھنے والوں کے لیے تو کجا، اچھے خاصے نقادوں تک کے لیے ہمارا ادبی ماضی اچھی طرح واضح نہیں ہے۔ تنقیدی کام کرنے والا جب کسی موضوع پر کوئی کام کرنے بیٹھتا ہے تو یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ محقق اس کی کچھ زیادہ مدد نہیں کر سکتا اور اگر اسے یہ کام کرنا ہے تو تعبیر، تشریح اور تاویل وغیرہ کو ملتوی کر کے اسے خود تلاش اور تفحص سے کام لینا پڑے گا۔ اکثر اوقات وہ اپنے اصلی کام کو بھول کر یہ خدمت سرانجام دیتا ہے اور ماضی کی قدر و قیمت متعین کرنے کا فریضہ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔

اردو ادب اور زبان کے بارے میں تحقیق کے کئی شعبے ایسے ہیں جن میں مزید کام کی بے حد گنجائش ہے اور جن کے بغیر نہ اردو ادب اور زبان کے مختلف ادوار کا صحیح نقشہ سامنے آ سکتا ہے، نہ ہمارا ماضی ہمارے لیے کسی فیضان یا تخلیقی تحریک کا باعث بن سکتا ہے۔

سب سے پہلے ماضی کے ادباء و شعراء کے کارناموں کی ترتیب و تدوین ہے۔ اب تک اردو کے کئی ایک اچھے شعراء مثلاً

[illegible] کام [illegible] نہیں تھا۔

[illegible]

[illegible] ہے۔

ہمارے قدیم [illegible] شعراء کی [illegible] لکھی گئی ہیں۔ [illegible] حالی نے غالب کی زندگی [illegible] "یادگار غالب" [illegible] میر کی [illegible] لکھے گئے۔ [illegible] ہے۔

[illegible] کام کے سلسلے میں [illegible] ہمارے ہاں تحقیق [illegible] ہو رہا ہے کسی کی تاریخ وفات متعین کرنے کے سلسلے میں [illegible] مگر [illegible] ابھی [illegible] کام [illegible] دتاسی کے بعد سے دریافت شدہ مواد کو بھی سمیٹ سکے۔

ہمارے قدیم اور اساتذہ شعراء کے بارے میں سوانحی اور تنقیدی مواد فارسی میں موجود ہے۔ اور فارسی زبان کا رواج تو جیسے ہمارے زمانے میں ختم ہی ہو رہا ہے۔ نئی نسل کے محققین کرام کی فاضل طبیعتوں کی بیزاری فارسی سے اُن کو [illegible] تعجب ہے مگر اس کے باوجود ہمارے شعراء کے زیادہ تر تذکروں کا اردو میں ترجمہ نہیں ہوا۔ میر کی خودنوشت سوانح عمری ذکر میر اور انشاء اللہ خاں کی کتاب "دریائے لطافت" کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ مگر پڑھنے والوں کو ان کی خوب قدر [illegible] ہے۔ اردو ادب اور زبان کے بارے میں کچھ کام انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی موجود ہے اور اس کام کا غالب حصہ اب تک اردو میں منتقل نہیں ہوا۔

اردو زبان اور ادب نے برصغیر ہندو پاکستان کی تاریخ کے جس دور میں نشو و نما پائی اس پر دیسی اور بدیسی مورخین نے کسی طرح توجہ نہیں دی ہے۔ اورنگ زیب کے بعد کا عہد چھوٹی چھوٹی سلطنتوں اور بے شمار سیاسی آویزشوں سے بھرا ہے اور اس سے ایک پریشان کن موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب بھی ہمارا کوئی محقق کسی ادیب یا شاعر پر قلم اٹھاتا ہے تو اپنے طور پر اس دور کی تاریخ لکھنے لگ جاتا ہے۔ نہ وہ اس کام کے شایاں محنت کرتا ہے نہ کسی مضبوط تاریخی شعور کا مالک ہوتا ہے۔ چنانچہ تحقیقی کارناموں کے تاریخی حصے بے حد اُلجھے ہوئے اور اصل کام سے جدا جدا لگتے ہیں۔ اردو ادب کا تاریخی پس منظر ایک ایسا موضوع ہے جو کسی ادب دوست مورخ کا منتظر ہے۔

اردو طباعت اور صحافت کی تاریخ بھی ہمارے کئی ایک تحقیقی مسائل کو حل کر سکتی ہے۔ اور ان کے ابتدائی ادوار کو اب تک کسی نے موضوع بنا کر مستقل کام نہیں کیا۔ کئی ایک الجھنیں اور غلط فہمیاں اس کام کے بغیر رفع نہیں ہو سکتیں۔

اُردو زبان کے صرف و نحو اور لغت پر بھی تاریخی اور تحقیقی کام اب تک ملتوی ہوتا رہا ہے۔ زیادہ تر کام جو اُردو زبان کی تاریخ

پڑھتا ہے بلکہ زبان و بیان کی صحت کا مطالبہ کرتا ہے۔ شیرانی مرحوم نے "پنجاب میں اردو" لکھی تو بہت سے لوگوں کی توجہ ادھر ہوئی لیکن اس کے مواز
جائزوں کی صرف مستند مثال بن گئی۔ شیرانی مرحوم کا ایک تو پنجاب سے کوئی جذباتی تعلق نہ تھا دوسرے انھوں نے جذباتی عناصر کے زور
سے بھی اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی مگر ان کے بعد آنے والے لوگ اس قسم کے خطروں سے نہ بچ سکے۔ پھر بھی لسانیات کے
میدان میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور، مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، احتشام حسین، اسعد علی اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کے کام کی
کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور ہے۔ "دکنیات" کے علاوہ دو ایک موضوع ہیں جن پر ہمارے محققین نے کوئی خدمت انجام دی ہے
ایک تو اس خدمت کو وسیع ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کام اس انداز میں لکھنے کی ضرورت ہے کہ اردو زبان اور ادب کو نیا
راستہ ملے۔

———

بوڑھا اور رات

ابوسعید قریشی

سفید برف پوش پہاڑوں کے پیچھے شفق پھیلی ہوئی تھی اور کھیت میں [illegible] سب کچھ ایک سا
لگ رہا تھا [illegible] جیسے تصویروں کے نقشے [illegible]
بوڑھے سپاہی کا گھر بھی اسی منظر کا حصہ تھا۔
اس کے صحن [illegible] کی لکڑیاں [illegible]
کھیت کے چاول پک کر [illegible] ہو گئی تھی [illegible]
اس کی [illegible] اب بھی اس [illegible] کا کام [illegible]
کو بند باندھنا اور زمین کا سینہ چیرنا تھا۔

اس کے خاندان میں سپاہی کا پیشہ مقدس فریضے کی طرح چلا آتا تھا۔ ہر کنبے میں ایک جوان اسلحہ [illegible] کی نوکری کرتا
اس کے کسی بزرگ کا قول تھا کہ یہی [illegible] بھروسہ [illegible] کب [illegible] ضرورت پڑ جائے۔
فتح محمد خود بھی جنگ کے کئی میدان دیکھ چکا تھا اور اس کے بدن پر کرچوں، سنگینوں اور گولیوں کے کئی نشان تھے۔
اور اس روز اپنے بیٹے فتح علی کو رخصت کرتے وقت بوڑھے [illegible] تو اس نے فتح علی کا سر
چوما تھا۔ بیٹے کو سینے سے لگاتے وقت اس کو محسوس ہوا جیسے مجاہدوں کا ایک لشکر بھی وہی نعرے لگا رہا ہے:

"علی علی! بہادر رہو!
علی علی! دلاور رہو!"

"جب تک اس نعرے کی گونج باقی ہے بیٹا!" بوڑھے نے کہا، "تمہیں کوئی خوف نہیں ہونا چاہیے۔"
نوجوان نے اپنے باپ کے ہاتھ چومے، انہیں آنکھوں سے لگایا اور رخصت ہوتے ہوئے کہا: "ابا! رات اندر ہی
باندھا کرو [illegible] خوشبو آ جاتی ہے اور کھیت میں الاؤ جلاتے رکھنا [illegible] تین چار دن
سے [illegible] پرندوں کے پیچھے۔"
"اللہ کے سپرد! اللہ کے سپرد! وہی رکھوالا ہے سب کا ——!" بوڑھے نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

کہا ——"اب جاؤ! خدا تمھاری مرادیں پوری کرے۔"

شبر کو جانے والی پگڈنڈی چٹانوں کے پیچھے چھپ گئی۔ بڑھے نے چشمے کے کنارے چیڑ کے پتوں پر شکرانے کے دو نفل پڑھے کہ اللہ نے آج میرے بیٹے کو بھی اس قابل کیا —— اور وہ پھر کام میں لگ گیا حتیٰ کہ سورج سفیدوں کے پیچھے چھپ گیا اور چاند چیڑھوں کے جھنڈ سے ابھرا۔

عشا کی نماز کے بعد اس نے اپنے بیٹے اور مجاہدوں کی سرخروئی کے لیے ہاتھ اٹھائے جو سپاہیانہ اپنے وطن کے اس حصے کی آزادی کے لیے لڑ رہے تھے جس پر غیر مسلم قبضہ جمانا چاہتے تھے۔ دعا کے بعد اس کو اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا اور مصلے پر ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

لیکن یکایک ڈربے کی جانب سے مرغیوں کا شور بلند ہوا اور اس کے ساتھ ہی گدی کتے کی کھچ سنائی دی —— بڑھا سمجھ گیا کہ لومڑی آئی ہے۔

اس کا ہاتھ اپنی بندوق کی طرف بڑھا لیکن جب وہ باہر پہنچا تو چاند اور الاؤ کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ لومڑی کی گردن کتے کے منہ میں ہے۔

"فاحشہ —— اب کہاں جائے گی بچ کر!" —— وہ دروازے میں کھڑا لومڑی اور کتے کا تماشہ دیکھتا رہا حتیٰ کہ لومڑی کی جدوجہد ختم ہو گئی۔

"موتی!"

موتی نے لومڑی کو چھوڑ دیا اور دُم ہلاتا ہوا اپنے مالک کی طرف بھاگا۔

"شاباش موتی شاباش!" بڑھے نے کتے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "جیتے رہو! جیتے رہو!"

ڈربے کے باہر لومڑی کی لاش پگھلی چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔ بڑھے کو وہ میمیں یاد آ گئیں جو عالمگیر جنگ ختم ہونے کے بعد اتحادی فوجیوں کے پیچھے پیچھے گھوما کرتی تھیں اور جن کے ہونٹ مرغ کھائی ہوئی لومڑیوں کی طرح لال تھے۔

مکار! ایک بات تو مجھ کو بھی بھا نساد ے گئی تھی فتے! تو یہ ہے —— کیسی ظالم مہک آ رہی تھی کافر کے کپڑوں سے —— خوشبو پاک پروردگار —— آپ ہی چلا تھا شیطان کے بہلانے ہیں' پر اس وقت وہ یاد آ گئی تھی جنتی —— یوں لگ رہا تھا جیسے پاس کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے" اپنے بیٹے کی ماں کو بھول گئے؟ —— اور پل بھر کو اس کی آنکھوں کے آگے پانی بھری دھند چھا گئی۔

مگر موتی غرایا جیسے پوچھ رہا ہو اب کیا حکم ہے۔ لومڑی کی خوبصورت چمکدار کھال پھر بڑھے کے سامنے ابھری۔ لومڑی کا چھوٹا سا خوبصورت منہ کھلا ہوا تھا۔

گلوبند بنتا ہے کھال کا —— ولایت میں تو سالیاں اس طرح پہنے پھرتی تھیں جیسے انھی کی کھال ہو۔ اری مرتو تا رہیگو جانور کا —— پر نہیں وہ بھی رہے گا۔ فیشن! فیشن! —— اور کبھی کبھی تو یہ بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون سا منہ کس کا ہے۔ یہ عورت ہے یا بھوکی لومڑی —— وہ تو بیچاری بھوکی تھی اس وطن والی —— کتنا تو کھانا کھا گئی تھی —— بھوکی نہ ہوتی تو کالے آدمی کے پیچھے کیوں آتی کم بخت! —— ایسی جنگ سے بچا لیو مولا جس میں جیت نہ ہو —— فتے! فتے! اللہ نہ کرے جو آج تیرے وطن پر بھی کسی کا قبضہ ہو جائے تو تیری بیٹیاں

بیٹیاں بھی۔ — وہ اپنے تصور سے کانپ اٹھا — اس دن سے پہلے ہو — اس دن سے پہلے موت آ جائے!

اور اس کے ساتھ اس کے دل میں بیٹوں کے خلاف بغاوت کا جذبہ بیدار ہوتا جا رہا تھا۔ یہ جاہل ہیں، گنوار ہیں — ملک سے غدار ہیں کی کھال پر یوں ہاتھ پھیرنے لگا جیسے کسی بھی ذلیل خوار کو سہلا رہا ہے — سب کے سب نکمے، بے غیرت، خود غرض ہیں — وہ سب کا سب سب پاجی — بیویوں کی ماں ہے شفقت — چاہے وہ دولت کی ہو چاہے محبت کی ایک رشتے کی ہے دولت کی، محبت کی! ذرا معلوم نہیں کہ گھٹے ہیں، بڑھتے ہی نہیں — وہ شیطان بھی لڑکے ہی کا دھرم ہے ہمارے! یہ ہاتھوں کے سر چھپے بیٹھے ہیں، تو اپنے بیٹ کھلیان اور جھونپڑی کی خاطر۔

اچھا بھئی موتی! اب اس کو شاباش دے لو تم — وہ سب تو دوستی کی حرف شکایت کرتے ہوئے تھا۔ کمال کی نمائش تھی — اپنے بیٹے — باتیں سب تیرا — اس سنسان میں تو — صبح ہو گئی — کہ یہ آدمی جو کہ جانور پیٹ بھرنے کے لیے سب کام کرتا ہے۔

بوڑھی کی کھال آنے سننے کے بعد اس نے اپنے سر سے دھوتی اتاری، پھر کے نیچے رکھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

اچھا بھئی موتی! ذرا دھیان رکھنا!

اپنا کام ختم کرنے سے تو موتی اور تو تا جیسے بوڑھے کی بات سمجھ گیا ہو۔

یہ تو جانوروں کی دنیا سے بڑے ساتھی! ہمیشہ بس بڑھاپے کا کرم تم اب تو دن میں بھی اونگھ جاتا ہے اور ایک وہ بھی عمر تھی کہ بھی ساری رات کا پہرہ دیتا اور پلک نہ جھپکتی۔ تنخواہ سے پیسے بھی تو نہیں مل جاتے۔ جس نے ماں کو کھل کر بیچا اس کو ملی بیل — ارے ہیٹ ہو گیا موتی!

وہ ہنسا، جمائی لی اور سو گیا جیسے یہ سوچا اب اور جرأت لینے لگا۔

دفعتاً کہیں دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آئیں۔ — بوڑھا بڑبڑایا — کم بختوں نے جب حملہ کر دی لیکن کتوں کا کام ہی بھونکنا ہے — اور پھر وہ کروٹ بدل کے سو گیا۔

مگر کتوں کی آوازیں بلند ہوتی گئیں۔ اب کے ان میں موتی کی آواز بھی شامل تھی۔

شور قریب آ گیا۔ موتی کی آواز میں غصہ تھا، وحشت تھی۔ — یکایک اس کے فاصلے بدلنے لگے۔

بوڑھا چونک پڑا۔

چاند کی روشنی میں ایک سیاہ گولا مکئی کے کھیت میں گھوم رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ مکئی کے ڈنٹھل ٹوٹنے کی آواز آ رہی تھی جیسے سؤر پر جانوروں کی ٹولی کھیت میں گھس آئی تھی۔ موتی کبھی سائے کی ایک طرف دکھائی دیتا کبھی دوسری طرف جیسے وہ موقع تلاش کر رہا تھا کہ کب اور کہاں حملہ کروں — اور پھر ریچھ اور کتا آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ بوڑھے سپاہی کا ہاتھ بندوق کی لبلبی پر تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کب فائر کروں۔ اس کو ڈر تھا کہ کہیں کتا گولی کی زد میں نہ آ جائے لیکن اتنے میں دونوں جانور آنکھ سے اوجھل ہو گئے اور پھر کھیت کے پیچھے کرنے سے ایک وحشیانہ چیخ سنائی دی۔ بوڑھا سمجھ گیا کہ موتی کا پلہ بھاری ہے اور ریچھ کے بدن میں موتی کے گڑے ہوتے دانتوں کے تصور سے اس کے اپنے دانت بھی کچکچا اٹھے جیسے وہ بھی وحشی کے گوشت میں گڑے ہوئے تھے۔

ایک اور بچہ ——— سور کا بچہ فتح محمد کے سامنے کھیت سے نکل کر بیری کی جھاڑیوں کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ بڑھے کی بندوق سے ایک شعلہ لپکا، ایک اور دوسرا بچہ سور کا بچہ دور تک کے سایوں کی طرف بڑھا، سوکھی ٹہنیاں ٹوٹنے کی آواز آئی اور پھر خاموشی چھا گئی اور بڑھا ہی کھڑا جائزہ لے رہا تھا۔

کیا ہوا ملی! ادھر آ۔ ۔ ۔ ارے! ۔ ۔ ۔ بڑھے سپاہی کی پیشانی پر ان گنت جھریاں ابھر آئیں ——— داڑھی کے گیلے بال ہلتے جاتے۔ اوہ ذرا دیکھ تو پیٹ سے بابا۔ تیرے بغیر تو میرا دل ہی نہیں لگ سکتا ۔ ۔ ۔ ہوں نہ! کوئی بات نہیں، خیر ہے، بچارہ بچہ ہی! ایسے ہی ناحق ٹلا ہے، جوں تو ابھی بند ہو جاتے گا۔ ۔ ۔ اس نے چپکی بجائی ——— ابھی، شیر کی ماں کیا کہے:

اس نے اپنی جیب سے پرانی ململ کا ایک ٹکڑا نکالا جس کو وہ رومال کے طور پر استعمال کرتا تھا اور اس کی پٹی باندھی۔

ہم نے ——— کیسا ہی زخم ہو خون بند کرنے کے لیے اس سے بہتر دوا نہیں، انگریز بہادر بھی نہیں جانتا۔ ۔ ۔ ۔ مولا فضل کرے گا ایسا ——— اور اس دو دن سے یہاں کل بیٹھ لوں گا۔ اول تو ایل ہی نے دن نکلنے سے پہلے ہی اس کا دھڑن تختہ کر دیا ہوتا۔ اب تو نکل گیا ہے ناگرو گرو۔

سیدھا ہو بیٹے دو ذرا، پھر دیکھیو تماشہ۔ بہادر بنا ہوگی، نا جانے بات ہی کیا ہوئی۔ ۔ ۔

اور اب اس بڑھیا کے منہ بھی کچھ ڈال دیں ——— اس نے بندوق سے خالی کارتوس نکال کر نیا کارتوس بھرتے ہوئے کہا۔

فتح علی کیا کہہ رہا تھا اس دن ——— ہاں! کہہ رہا تھا کہ بابا اب تو رائفلیں ہیں اور اس کو آرام سے بیٹھ کر فتح محمد نے ماسے۔ مار کے کہہ کر ٹال دیا تھا کہ بیٹا! اس کا میرا پرانا ساتھ ہے۔ اتنا برا کہ تیرے باپ کی بھی اتنی نہیں ہو گی ابھی۔ تو اچھا فتح علی پورا ہو جائے گا۔ مائی تو ایک تو اس کے ساتھ کچھ انسیت ہو گئی ہے، دوسرے اصل بات یہ نہیں ہوتی کہ بندوق نئی ہے یا پرانی، اصل چیز تو نشانہ باندھنے والی آنکھ ہے اور انگلی جو یہ جانتی ہے کہ لبلبی کب دبے گی۔ ——— نہیں سمجھے، خیر کوئی بات نہیں، ایک روز آپ سے آپ سمجھ جاؤ گے، اس کا بھی وقت مقرر ہوتا ہے جیسے برفوں کے پگھلنے، انگور کی بیل پر بور اور بالی کے خوشوں پر دانے پڑنے کا وقت، فصلوں کی کٹائی اور پن چکیوں کے چلنے کی تیاری اور حملہ کرنے کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ جس نے یہ بھید پا لیا وہ زندگی میں کبھی خطا نہیں کھائے گا۔ ۔ ۔ ۔ یہی رائفل، تو فوج میں تو خیر ٹھیک ہے کہ جتنی دور سے مار کر سکو اتنا اچھا ——— وہ بھی ہوں کہ آج کل کی جنگیں ہی ایسی ہیں، لیکن گھر میں، بیٹھنے کے لیے بارہ بور ہی اچھی۔ رائفل میں مہینوں کا ایک عیب تو یہی ہے کہ خدا نہ کرے نشانہ بال برابر بھی چوک گیا تو گولی کہاں سے کہاں نکل گئی اور کون جانے کہیں کوئی بچہ پھول ہی چن رہا ہو یا کوئی مسافر ہی سستا رہا ہو پیڑ کی چھاؤں میں ——— نا بابا رائفل کو دور ہی رکھو گھر سے ——— اب تم کہو گے کہ بارہ بور بھی کیسی ہے تو دو نالی کیوں نہ ہو ——— سو اس میں بھی بھید ہے۔ دو نالی ہوتی تو خطرہ کم ہو گیا نا کہ ایک نہیں تو دوسرا کارتوس تیار ہے، یہی نا ——— لیکن جب خطرہ ختم ہو گیا تو بات ہی کیا رہ گئی بیٹے ——— نہیں سمجھے! کھانا ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے۔

کارتوس بھرتے وقت اس کو یہ سب باتیں یاد آ گئیں ——— اور اب وہ وقت قریب آ رہا ہے بیٹا جب یہ ساری باتیں آپ سے آپ تیری سمجھ میں آ جائیں گی اور جو کہ خطرے میں مزا آنے لگے گا ——— کیوں ہوتی ہے خطرہ نہ ہوتا تو آدمی جانور رہ جاتا ——— کھاؤ پیو اور جگالی کرو ———

جگالی کے تصور سے اس کو اپنی گائے کی بچھیا کا دھیان آ گیا اور اس کی مونچھیں پھڑک اٹھیں ——— بچھیا یعنی گائے!

[illegible] سوچنے لگا کہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

اس کو دیکھتا رہا [illegible] بات واضح ہو گئی۔

کیا سوچ رہا تھا [illegible]

[illegible]

اس نے اپنی بندوق [illegible] اور اپنی جیب [illegible] کرنے لگا ——— جو [illegible] ایک آدھ [illegible]

تو تو کل تک [illegible] دیکھ رہا تھا کہ یہ [illegible] بیٹے کی [illegible] کہتا ہی رہ گیا کہ اللہ کے بندے ایسا کوئی ٹھیک نہیں [illegible] کے انتظار نے پر بھی کھل سکتی ہے [illegible] کل یہ کمال ہوئی بات ——— اب منڈا [illegible] بیٹھ کے :

گھمسے پھر ڈکارا — دراصل وہ بدستور ڈکار رہی تھی لیکن اپنے خیالات میں محو بڈھا سا ہی [illegible] اس کے وجود سے بے خبر ہو گیا تھا، اس کی آواز سے سینہ پھٹا جا رہا تھا۔

اللہ تجھ کو صبر دے ——— اس نے گوری کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ——— اور پھر سوچنے لگا کہ اس بے زبان جانور نے آخر کیا قصور کیا تھا جس کی یہ سزا ہے ——— اور جیسے اپنے سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے اس نے رات کی طرف دیکھا۔

ڈھلتی رات کے اندھیروں نے اس کے ذہن کو اور بھی دھندلا دیا ——— دیواروں کی پھیلی ہوئی باہیں دھند میں پھیلی ہوئے

پہاڑوں کی چوٹیاں اور جھینگروں کی متواتر جھائیں جھائیں سوال کرتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

بابا یہ بھیڑ کیوں ہی جا رہے تھے؟ —— لڑکی اس چکر میں پڑ گیا ہے —— جو کام تم کو سونپا گیا ہے تم اسی کو تو دیکھ لے بہت ہے۔

دور کسی خارش زدہ بکرا وادی ہر پہاڑوں کے سامنے پھیل گئے اور سامنے خلا پر رات کا جادو طرف ہو کر چھا گیا۔

ناگن بیل والی بستی پہاڑوں کی رات، اسی ہی رات، برسوں پہلے ایک عورت کو اٹھا کر لے گئی تھی اور اس کے نوزائدہ بچے کو پھر اٹھا کر لے گئی تھی اور وہ رات بھر کرتے تھی اور ماں کو بیو کرتا چھوڑ گئی تھی۔

بڈھے سپاہی کا مٹکا ہوا جسم جھنجھوڑا اور اس کے گلے سے ایسی آواز نکلی جس طرح برسوں سے سوئی ہوئی توپ کا دہانہ گرج رہا ہے۔

بکروں کا بچہ ہے! —— اور پھر وہ بڑبڑانے لگا —— جانوروں کی معصوم کہانیاں اور روح کو جھنجھوڑتی —— مرد تو بیچارا انصاف کیوں نہیں آتا۔

پہاڑوں کے پیچھے ایک سفید کلیری پھیل گئی —— اور بڑھا سوچنے لگا کہ سورج کے بین کیں ہوئے جیسے ایسا کیوں ہوا؟ مگر گائے بدستور بیں کر رہی تھی اور بچی اس کے ارد گرد گھوم رہا تھا اور بھونک رہا تھا کبھی وہ اس کی ٹانگیں چاٹنے لگتا اور کبھی اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا جیسے وہ سہارا دے رہا ہو۔

جانوروں کو بھی تو معلوم ہوتا ہے نا —— بڈھے نے کہا۔ یہ بھی باتیں کرتے ہیں —— سمجھ کی بات اور ہے وہ تو آدمی بھی کبھی آدمی کی بات نہیں سمجھتا۔

کاشی کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہہ رہے تھے۔

صبر کر بیٹی، صبر کر —— بڈھے نے کہا —— آدمی بھی تو آخر یہ کہتا ہے نا —— ہر آدمی آدمی ہے —— ویسے یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، درد ہو گا تو رونا ضرور آئے گا۔ آدمی ہو یا جانور —— اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ رونے سے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے۔ میں بھی رویا تھا جب فتح علی کی ماں چلی گئی تھی، تو بھی رو —— اس نے کاشی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا —— اور اب ڈیوٹی!

اس نے اپنے ٹرنک کا ڈھکنا صاف کیا جس پر مٹے مٹے رنگوں میں اس کی پلٹن کا بسکوٹ اور شاب پر نواں رہا تھا صندوق سے اس نے گرم پٹیوں کا جوڑا نکالا اور اپنی پنڈلیاں کسنے لگا جیسے برسوں گزرے پریڈ پر جاتے ہوئے کیا کرتا تھا۔ اس کے کانوں میں بگل کی آواز گونج اٹھی۔

مگر یہ رونے کی آواز کہاں سے آ رہی تھی؟ —— وہ چلتے چلتے چونک پڑا کوئی بڑھیا بین کر رہی ہو جیسے —— مر گیا ہو جیسے کوئی کسی کا۔

اس کے قدم آپ سے آپ رک گئے، اپنے خیالات میں مگن وہ کالے جنگل کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا اور اب اس کے سامنے کالے بیروں کی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ بھورے ریچھ بیر کھانے کے لیے اکثر ادھر آ نکلتے ہیں۔ فتح محمد کو یقین تھا کہ ایل جی کے سپاہی نے نوزی کو ان جھاڑیوں سے ادھر نہیں جانے دیا ہو گا۔

اس نے ایک مدت ہوئی دنیا کو تج دیا تھا اور جب سے اس کی سنگت کی وقت بسر ہو گئی تھی جھاڑیوں کی جانب
منہ پھیر کے بیٹھے سے ہی کو بیٹھی ہو تب کے دیکھا، نزدیک ہی سب۔

کیا لوگ نکالا اور اس کے سارے بدن میں جنبش ہوئی اور ایک لمحہ ... وہ کھڑا ہوا بوڑھے کی طرف دیکھا جیسے کوئی
تازہ دھماکہ پڑا تھی۔

بوڑھا پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے مٹی نم ... دیکھو سب سے پہلے آدمی کے چہرے پر حملہ کرتا ہے کیونکہ اس کو خوب پتہ
ہے سے ولایت ہے۔

[illegible]
حملہ کرنے وقت دیکھو یہ پھیل جاتا ہے ... سچ مجھ کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی جنگل اسان اور ...
کھڑا ہے ———

بوڑھے سادھو کی ساری رعب جذبہ تھی کتے سے نیچے اس نے ... ہٹ آئی اور شعلہ بن گئی۔
... روشنی کی قوم تھی ... اس کی کھوپڑی سے نکل گیا اور وہ بوڑھے سے چند گز کے فاصلے پر جا بیٹھا۔
... بوڑھے نے مڑ کر ... تجھ کو شکر ... نے ہنس کے کہا۔ تو کھا سکتا ... فاصلوں پر ... کرتا ہے ——— اور
پھر ہرنی سے مخاطب ہو کر ——— تیرا بھی بدلہ لے لیا ... بے پرواہ ... ہے تو ... میں اب اس کو لیکر جاؤنگا ...
اس وقت جو پہاڑ ہے اُدھر چلتا ہے۔ ... یہ حرامی اُدھر ہی سے آتے ہیں خانہ خراب!

کتا چلتے چلتے رُک گیا، زمین کو سونگھنے لگا اور اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

کہیں ہرنی مل گئی کھوج! شاباش اب زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا۔

دفعتاً ایک پہاڑی کے موڑ پر اسے آبشار کا شور سنائی دیا ——— بس وہ ہے نا مرتی ... یہیں آتا ہوگا وہ حرامی پانی
پینے کے لیے ... کمینہ، رذیل، چھپ کر حملہ کرتا ہے سفلہ ... پہ مجھ کو تو معلوم ہی ہے میری برادری سے تو اس کی پرانی دشمنی ہے
——— تیار ہو جا اب!

یکایک اس کا چہرہ بھیگ گیا اور وہ سمجھ گیا کہ آبشار آگیا۔

پگھلی چاندی کی ایک چادر پہاڑ کے اوپر پھیلی ہوئی تھی اور اس کے اوپر رنگوں کی پھوار اڑ رہی تھی۔ بوڑھے نے ہاتھ بڑھا کر
روشنی کی اس پھوار کو پکڑنا چاہا اور اپنی اس حرکت پر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ یہ پھوار سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کو یوں محسوس ہوا جیسے میں بھی
اسی کا جزو ہوں، میں بھی پھوار ہوں اور یہ ساری دنیا رنگوں کا کھیل ہے جس کی حقیقت صرف روشنی ہے۔

گڈریے اس آبشار کو پریوں کا جھرنا بھی کہتے تھے، اس کا پانی اوپر سے گرتا اور تھوڑی دور زمین کے متوازی بہتا ہوا یکایک
غائب ہو رہا تھا۔ یہاں زمین کی سطح پر کچھ ایسے سوراخ تھے کہ پانی کے اوپر غبار سے تیرتے ہوئے نظر آتے اور چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بجتیں۔
مشہور تھا کہ ان بلبلوں پر پریاں ناچتی ہیں۔ ان کی پازیبوں کی صدا بے خبر سیاحوں کو ادھر کھینچ لاتی ہے اور جب وہ پاؤں دھونے کے لیے پانی
میں اترتے ہیں تو پریاں انہیں نیچے کھینچ لیتی ہیں۔

جل ترنگ کی آواز سے بڈھے کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔

شمالی سے سونی آنکھنے [illegible] بجا رہی ہیں، جو بھاگ ہو [illegible] اور بہاروں کی اوڑھنیوں سے رنگ ہیں۔ — یہاں — وہ یہاں — [illegible] سب جھکولے ہیں [illegible] بار — [illegible] مزدور ہو رہا ہے۔ — روشنا رش ہوا کرتا تھا جیسے۔

یہی لگتا تھا [illegible] کا عزم بستی کی طرح بکھر گیا۔ تھا ہوا کیا جو ابھی ابھی پانی پینے کے لیے بڑھا تھا اچھا کہ سے دیکھنے والے کہیں نہ تب ہو گا۔

پہلے تو اس نے پوچھا اور اب تو — کون ہو — بڈھے نے کہا — آج ہی تو ٹھیک ہو گئے ہو — خیر — تو میرا یہیں تک کا ساتھ تھا — کیا سا ہو — جیسے فوج کے سپاہی کو اپنی کمان کا کرتی کمان کا — کام ختم اور پھر چھٹی — بڑھا کا وہ ابھی باقی ہے تیری مجھ — حسن اب وہ کہ جیسی زندہ ہے بچ کر بھی نہیں جا سکتی — پرندوں کا ہوا ابھی بھی بڑا تو نے — تب آدمی اب اکیلا ہی رہ جاتا ہے جاتے ہیں — ایک سا آ جاتے سامنے — پھر ساتھ — ایک ایک بڑھ کر انگور ان بھائی کو پوچھتے ہو ہوا ہو گا۔

اس نے ماحول کا جائزہ لیا، کچھ عجیب تھا۔ یہ جگہ نہیں تھی جس پر سبزے کا نشان تک نہیں تھا اور ساری ابھی وہ ایسے سبزہ زار بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا کہ زمین نظر آتی تھی۔ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ یہ کوئی دوسرا ہی طرف ہے اور یہ کہیں کہیں برف کی چٹانیں چمک رہی تھیں جیسے کسی نے انہیں خوامخواہ یہ کاٹ کر وہاں لگا دیا تھا۔

ہر طرف یہ اس طلسمات کا عالم تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون سی دنیا ہے۔ سفید چٹانوں کی سلوں سے پانی کے جھرنے بہ رہے تھے جیسے اس کی کاٹ کے ٹکڑوں سے دودھ کی دھاریں بہا کرتی تھیں۔

گاتے نے تصور سے اس کو پکارا تھا۔

سنی اشتی! تجھ کو اس معصوم پر بھی رحم نہ آیا — جڑوں سے ناخن نکال دیتے تیرے تو تجھے کو باپ نہ کہیو — جبڑا چیر کر رکھ دوں گا خدا کی قسم — ایک ذرا سامنے آ جا۔

آگے چل کر پہاڑوں کے اندر ستون بنے ہوئے نظر آئے۔ کچھ نیچے سے اوپر جاتے ہوئے جیسے چھت کو اٹھانے کے لیے جھوم رہے ہیں اور کچھ اوپر سے نیچے آتے ہوئے جیسے فرش کو سہارا دینے کے لیے — اور ان کے نیچے روشنیاں جھلملا رہی تھیں اور بیائے تھیں دھنتی رہی تھی اور ہوا بانسری بجا رہی تھی۔

آج تو کس دنیا میں آ نکلا بندے؟ آنا ہی تھا ادھر تو چالیس برس پہلے آیا ہوتا۔ یہاں تو میں بھی مان لوں کہ پریاں رہتی ہیں اور چالیس برس پہلے تو ہر جوان عورت پری لگتی پیارے — فتح علی کی ماں ساتھ ہوتی اور یہیں کسی غار میں ڈیرہ ہو جاتا تو یہی پرستان تھا۔

یکایک اس کا پاؤں کسی چیز سے پھسلا۔

انتڑیوں کا ڈھیر اور کھال کا ایک ٹکڑا۔

کھال سفید تھی۔

بوڑھے کے چہرے پر درشتی چھا گئی جیسے ان حسین پہاڑوں اور غاروں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور ان کے بجائے بنجر پہاڑ پھیلے ہوئے تھے۔

جب [illegible] بچھا ہوا شکاری کے جھکنے ۔۔۔ اس سے آہستہ سے [illegible] جیسے اس کے ساتھ [illegible] ہو گیا تھا ۔۔۔ پھر [illegible] پھلانگ کر قدم رکھنے لگا جیسے جلتی ہوئی زمین [illegible] کے اوپر پر۔

شاکا اس کو [illegible] جہاں سے [illegible] ۔۔۔ اور پھر [illegible] میں [illegible] گر گیا۔

[illegible] تب اس کا وقت [illegible]۔

[illegible] سے [illegible] ۔۔۔ لیکن اس نے [illegible] جانے کا [illegible] نہیں [illegible]۔

بوڑھے [illegible] کو [illegible] کے پیچھے [illegible]۔

چیتا [illegible] ۔۔۔ [illegible] ہو گئی [illegible] کا [illegible] سے [illegible] ۔۔۔ لیکن [illegible] تھا ۔۔۔ [illegible] آواز کے بجائے صرف چیتے [illegible] سنائی دی۔

پھر ملنے لگا ۔۔۔ [illegible] اور [illegible] ۔۔۔ [illegible] ہو گئے۔

یکایک بوڑھے نے ہاتھ [illegible] کے منہ میں ٹھونس دیا ۔۔۔ اس کا دوسرا ہاتھ اپنے [illegible] کی طرف بڑھا اور چاقو [illegible] چیتے کے پیٹ میں اتر گیا

بوڑھے کا خیال تھا کہ چیتے کے سر میں ہاتھ ڈالنے سے [illegible] کا سانس رک جائے گا لیکن چیتے کے دانت [illegible] اس کی کہنی تک اتر گئے ۔۔۔ کسی کے بس [illegible] اور [illegible] طرف [illegible]۔

شاکا اس کو اپنی حالت کا احساس ہوا اور [illegible] معلوم [illegible] اس کو اپنے اندر ابھرتی ہوئی محسوس ہوئی اور اس کے منہ سے پھر وہی نعرہ بلند ہوا [illegible] میدان جنگ میں [illegible] طاری ہو جایا کرتی تھی اور [illegible] بجلی بھر جاتی تھی

"یا علی ۔۔۔!"

آسمان کے گنبدوں، پہاڑوں کی چوٹیوں، آبشار کی لہروں، غاروں کی گہرائیوں ۔۔۔ جنگلوں، [illegible]، وادیوں، میدانوں سے گونجتی ہوئی، مرد کے [illegible] سارے میں پھیل گئی۔

نعرے کے ساتھ ہی اس نے چیتے کو جسم پر سے پھینک دیا اور جس طرح دبا ہوا پہلوان اکھاڑے میں غیر متوقع طور پر اوپر آ جاتا ہے، چیتا نیچے تھا اور بوڑھا اوپر۔

اس کا چاقو والا ہاتھ پھر بلند ہوا۔

مردود!

لعین!

کوڑھی!

لیکن اس کا دوسرا ہاتھ اب تک چیتے کے منہ میں تھا ۔۔۔ چیتے نے ایک موت کی جھرجھری لی اور ایک خوفناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ اس کا منہ کھل گیا۔

ہر شخص نے پیچھا ڈنڈا کھینچنا چاہا لیکن درد کا ایک ریلا آیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

اور بہت دنوں بعد جب کوہ پیماؤں کی ایک جماعت ادھر سے گزری تو انھوں نے دیکھا کہ برف کے نیچے دو ڈھانچے پڑے ہیں ——!

ان میں سے ایک نے جو بہت سے خونخوار جنگلی جانوروں کا شکار کر چکا تھا کہا، کہ اتنا بڑا درندہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔
اور اتنا بہادر انسان! —— اس کے دوسرے ساتھی نے کہا، جس کے بال برف کی طرح سفید تھے اور جو اس بات کی تحقیق کر رہا تھا کہ انسان کی قوتِ برداشت کی حد کیا ہے —— کائنات میں آدمی کا کیا مقام ہے۔



ہماری کتابیں

نبی اُمیؐ عمر ابو النصر قیمت تین روپے	**خدیجہؓ** عبدالحمید زہراوی قیمت چار روپے	**خالدؓ** عباس محمود العقاد قیمت چار روپے
عرب کے تین مدبر عمر ابو النصر قیمت تین روپے	**مضامین جمال الدین افغانی** نیا اڈیشن قیمت پانچ روپے	**ہماری داستانیں** سید وقار عظیم قیمت پانچ روپے
صاحب محمد طفیل مدیر نقوش قیمت تین روپے	**باغ و بہار** سید عبدالحمید عدم کی تازہ غزلوں کا نیا مجموعہ ہر غزل سرور و کیف سے معمور قیمت دو روپے آٹھ آنے	**انداز سے** فراق گورکھپوری قیمت پانچ روپے
انتقاد سید عابد علی عابد قیمت تین روپے		**بھابی** شوکت تھانوی قیمت چار روپے آٹھ آنے
نمک مرچ شوکت تھانوی قیمت تین روپے	**نیلوفر** شوکت تھانوی قیمت چھ روپے	**غزالہ** شوکت تھانوی قیمت چھ روپے
قول و قرار سید عبدالحمید عدم قیمت دو روپے آٹھ آنے	**روزن** قتیل شفائی قیمت تین روپے	**پیچ و خم** سید عبدالحمید عدم قیمت تین روپے

ادارہ فروغِ اردو، لاہور